اِنعامُ الباری

دُروسِ بُخاری شریف

افادات

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ

جامعہ دار العلوم کراچی میں درسِ بخاری شریف کے دوران
حضرت شیخ الحدیث کی جامع، بصیرت افروز اور رُوح پرور تقاریر

صَحِیح البُخَارِی : الجزء الأوّل
کِتَابُ الصَّلَاۃ، کِتَابُ مَوَاقِیتِ الصَّلَاۃ،
کِتَابُ الأذَان
رقم الحدیث : ۳۴۹ - ۸۷۵

جلد - ۳

ضبط و ترتیب تخریج و مراجعت
محمد انور حسین عفی عنہ
فاضل و متخصص جامعہ دار العلوم کراچی 14

مکتبۃ الحراء
Phone: +9221-35031039, Cell: 0300-3360816
E-mail: maktabahera@yahoo.com

انعام الباری

﴿ دروس بخاری شریف ﴾

افادات

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ

جامعہ دارالعلوم کراچی میں درسِ بخاری شریف کے دوران

حضرت شیخ الحدیث کی جامع، بصیرت افروز اور روح پرور تقاریر

جلد- ۳۰

صحیح البخاری : الجزء الأول

کتاب الصلاة ، کتاب مواقیت الصلاة ، کتاب الأذ ن

رقم الحدیث : ۳۴۹ - ۸۷۵

ضبط وترتیب تخریج و مراجعت

محمد انور حسین عفی عنہ

فاضل ومتخصّص جامعہ دارالعلوم کراچی۔

Publisher :	8/131,36-A,Double Room, "K" Area Korangi,Karachi.
Maktabatul Hera	Contact: 0092 21 35031039,Mob:0092 300-3360816 Email:maktabahera@yahoo.com&info@deeneislam.com www.deeneislam.com

نام کتاب : انعام الباری دروس صحیح البخاری جلد ۳
افادات : شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ
ضبط وترتیب تخریج ومراجعت : محمد انور حسین (فاضل ومتخصص جامعہ دار العلوم کراچی نمبر۱۴)
ناشر : مکتبۃ الحراء، ۱۳۱/ ۸، ڈبل روم "K" ایریا کورنگی، کراچی، پاکستان۔
باہتمام : محمد انور حسین عفی عنہ
کمپوزنگ : حراء کمپوزنگ سینٹر فون نمبر: 35031039 21 0092

ناشر: مکتبۃ الحراء
8/131 سیکٹر 36A ڈبل روم، "K" ایریا، کورنگی، کراچی، پاکستان۔
فون: 35031039 موبائل: 03003360816
E-Mail:maktabahera@yahoo.com&info@deeneislam.com
website:www.deeneislam.com

ملنے کے پتے

مکتبۃ الحراء۔ فون: 35031039 ، موبائل: 03003360816
E-Mail:maktabahera@yahoo.com

☆ ادارہ اسلامیات، موہن روڈ، چوک اردو بازار کراچی۔ فون 32722401 021
☆ ادارہ اسلامیات، ۱۹۰، انارکلی، لاہور۔ پاکستان۔ فون 3753255 042
☆ ادارہ اسلامیات، دینا ناتھ منشن مال روڈ، لاہور۔ فون 37324412 042
☆ مکتبہ معارف القرآن، جامعہ دار العلوم کراچی نمبر۱۴۔ فون 35031565-6 021
☆ ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم کراچی نمبر۱۴۔ فون 35032020 021
☆ دار الاشاعت، اردو بازار کراچی۔ فون 32631861 021
☆

افتتاحیہ

از: شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم العالی

شیخ الحدیث جامعہ دار العلوم کراچی

الحمد لله رب العالمين ، و الصلاة و السلام على خير خلقه سيدنا و مولانا محمد خاتم النبيين و إمام المرسلين و قائد الغر المحجلين ، و على آله و أصحابه أجمعين ، و على كل من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين .

أما بعد :

۲۹/ذی الحجہ ۱۴۱۹ھ بروز ہفتہ کو بندے کے استاذ معظم حضرت مولانا "سحبان محمود" صاحب قدس سرہ کا حادثۂ وفات پیش آیا تو دار العلوم کراچی کے لئے یہ ایک عظیم سانحہ تھا۔ دوسرے بہت سے مسائل کے ساتھ یہ مسئلہ بھی سامنے آیا کہ صحیح بخاری کا درس جو سالہا سال سے حضرتؒ کے سپرد تھا، کس کے حوالہ کیا جائے؟ بالآخر یہ طے پایا کہ یہ ذمہ داری بندے کو سونپی جائے۔ میں جب اس گرانبار ذمہ داری کا تصور کرتا تو وہ ایک پہاڑ معلوم ہوتی۔ کہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی یہ پرنور کتاب، اور کہاں مجھ جیسا مفلس علم اور تہی دست عمل؟ دور دور بھی اپنے اندر صحیح بخاریؒ پڑھانے کی صلاحیت معلوم نہ ہوتی تھی۔ لیکن بزرگوں سے سنی ہوئی یہ بات یاد آئی کہ جب کوئی ذمہ داری بڑوں کی طرف سے حکماً ڈالی جائے تو اللہ جل جلالہ کی طرف سے توفیق ملتی ہے۔ اس لئے اللہ جل جلالہ کے بھروسے پر یہ درس شروع کیا۔

عزیز گرامی مولانا محمد انور حسین صاحب سلمہ مالک مکتبۃ الحراء، فاضل و **متخصص** جامعہ دار العلوم کراچی نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے یہ تقریر ضبط کی، اور پچھلے چند سالوں میں ہر سال درس کے دوران اس کے مسودے میری نظر سے گزرتے رہے۔ کہیں کہیں بندے نے ترمیم و اضافہ بھی کیا ہے۔ طلبہ کی ضرورت کے پیش نظر مولانا محمد انور حسین صاحب نے اس کے **"کتاب بدء الوحی"** سے **"کتاب البیوع"** آخر تک کے حصوں کو نہ صرف کمپیوٹر پر کمپوز کرالیا، بلکہ اس کے حوالوں کی تخریج کا کام بھی کیا جس پر ان کے بہت سے اوقات، محنت اور مالی وسائل صرف ہوئے۔

دوسری طرف مجھے بھی بحیثیت مجموعی اتنا اطمینان ہوگیا کہ ان شاء اللہ اس کی اشاعت فائدے سے خالی

نہ ہوگی، اور اگر کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں گی تو ان کی تصحیح جاری رہ سکتی ہے۔ اس لئے میں نے اس کی اشاعت پر رضامندی ظاہر کردی ہے۔ لیکن چونکہ یہ نہ کوئی باقاعدہ تصنیف ہے، نہ میں اس کی نظرثانی کا اتنا اہتمام کر سکا ہوں جتنا کرنا چاہئے تھا، اس لئے اس میں قابلِ اصلاح امور ضرور رہ گئے ہوں گے۔ اہل علم اور طلبہ مطالعے کے دوران جو ایسی بات محسوس کریں، براہ کرم بندے کو یا مولانا محمد انور حسین صاحب کو مطلع فرمادیں تاکہ اس کی اصلاح کردی جائے۔

تدریس کے سلسلے میں بندے کا ذوق یہ ہے کہ شروع میں طویل بحثیں کرنے اور آخر میں روایت پر اکتفا کرنے کے بجائے سبق شروع سے آخر تک توازن سے چلے۔ بندے نے تدریس کے دوران اس اسلوب پر عمل کی حتی الوسع کوشش کی ہے۔ نیز جو خالص کلامی اور نظریاتی مسائل ماضی کے ان فرقوں سے متعلق ہیں جواب موجود نہیں رہے، ان پر بندے نے اختصار سے کام لیا ہے، تاکہ مسائل کا تعارف تو طلبہ کو ضرور ہوجائے، لیکن ان پر طویل بحثوں کے نتیجے میں دوسرے اہم مسائل کا حق تلف نہ ہو۔ اسی طرح بندے نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ جو مسائل ہمارے دور میں عملی اہمیت اختیار کر گئے ہیں، ان کا قدرے تفصیل کے ساتھ تعارف ہوجائے، اور احادیث سے اصلاحِ اعمال و اخلاق کے بارے میں جو عظیم روایات ملتی ہیں اور جو احادیث پڑھنے کا اصل مقصود ہونی چاہئیں، ان کی عملی تفصیلات پر بقدر ضرورت کلام ہوجائے۔

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ بندۂ ناکارہ اور اس تقریر کے مرتب کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ جزاھم اللہ تعالیٰ۔

مولانا محمد انور حسین صاحب سلمہٗ نے اس تقریر کو ضبط کرنے سے لیکر اس کی ترتیب، تخریج اور اشاعت میں جس عرق ریزی سے کام لیا ہے، اللہ جل جلالہ اس کی بہترین جزا انہیں دنیا و آخرت میں عطا فرمائیں، ان کی اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرما کر اسے طلبہ کے لئے نافع بنائیں، اور اس ناکارہ کے لئے بھی اپنے فضل خاص سے مغفرت و رحمت کا وسیلہ بنادے۔ آمین۔

جامعہ دارالعلوم کراچی ۱۴

۱۲ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ

۱۹ فروری ۲۰۱۰ء بروز جمعہ

بندہ محمد تقی عثمانی

جامعہ دارالعلوم کراچی

عرضِ ناشر

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم

أمّا بعد ۔ جامعہ دار العلوم کراچی میں صحیح بخاری شریف کا درس سالہا سال سے استاذ معظم شیخ الحدیث حضرت مولانا **سحبان محمود** صاحب قدس سرہ کے سپرد رہا۔ ۲۹ ر ذی الحجہ ۱۴۱۹ھ بروز ہفتہ کو جب شیخ الحدیث کا سانحۂ ارتحال پیش آیا تو یہ درس ۴ ر محرم الحرام ۱۴۲۰ھ سے شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے سپرد ہوا۔ اسی روز صبح ۸ بجے سے مسلسل ۲ سال تک کے یہ دروس ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے ضبط کئے گئے۔ یہ سب کچھ احقر نے اپنی ذاتی دلچسپی اور شوق سے کیا، استاد محترم نے جب یہ صورتحال دیکھی تو اس خواہش کا اظہار کیا کہ یہ مواد کتابی شکل میں آجائے تو بہتر ہوگا اور یہ کہ ٹیپ ریکارڈر سے نقل کر کے تحریر شدہ شکل میں مجھے دکھایا جائے تا کہ میں اس پر سبقاً سبقاً نظر ڈال سکوں، چنانچہ ان دروس کو تحریر میں لانے کا بنام باری تعالیٰ آغاز ہوا اور اب بحمد اللہ اس کی سات جلدیں ''انعام الباری'' کے نام سے طبع ہو چکی ہیں۔

یہ کتاب ''انعام الباری'' جو آپ کے ہاتھوں میں ہے: یہ بڑا قیمتی علمی ذخیرہ ہے، استاذ موصوف کو اللہ ﷻ نے جس تبحر علمی سے نوازا ہے اس کی مثالیں کم ملتی ہیں، حضرت جب بات شروع فرماتے ہیں تو علوم کے دریا بہنا شروع ہو جاتے ہیں، علوم و معارف کا جو بہت ساری کتابوں کے چھاننے کے بعد عطر نکلتا ہے وہ ''انعام الباری'' میں دستیاب ہے، آپ دیکھیں گے کہ جگہ جگہ استاذ موصوف کا تفقہ علمی تشریحات، ائمہ اربعہ کے فقہی اختلافات پر محققانہ مدلل تبصرے علم و تحقیق کی جان ہیں۔

صاحبانِ علم کو اگر اس کتاب میں کوئی ایسی بات محسوس ہو جو ان کی نظر میں صحت و تحقیق کے معیار سے کم ہو اور ضبط و نقل میں ایسا ہونا ممکن بھی ہے تو اس نقص کی نسبت احقر کی طرف کریں اور از راہ عنایت اس پر مطلع بھی فرمائیں۔

دعا ہے کہ اللہ ﷻ اسلاف کے ان علمی امانتوں کی حفاظت فرمائے، اور ''انعام الباری'' کے باقی ماندہ جلدوں کی تکمیل کی جلد از جلد توفیق عطا فرمائے تا کہ حدیث و علوم حدیث کی یہ امانت اپنے اہل تک پہنچ سکے۔

آمین یارب العالمین . و ما ذلک علی الله بعزیز

بندہ: محمد انور حسین عفی عنہ

فاضل و متخصص جامعہ دار العلوم کراچی ۱۴

۱۲ ر ربیع الاول ۱۴۳۱ھ بمطابق ۱۹ ر فروری ۲۰۱۰ء۔ جمعہ

خلاصة الفهارس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین أصطفی .

عرض مرتّب

اساتذۂ کرام کی درسی تقاریر کو ضبط تحریر میں لانے کا سلسلہ زمانۂ قدیم سے چلا آرہا ہے ابنائے دار العلوم دیوبند وغیرہ میں **فیض الباری ، فضل الباری ، أنوار الباری ، لامع الدراری ، الکوکب الدری ، الحل المفھم لصحیح مسلم ، کشف الباری** ، تقریر بخاری شریف اور درس بخاری حسینی تصانیف اکابر کی ان درسی تقاریر ہی کی زندہ مثالیں ہیں اور علوم نبوت کے طالبین ہر دور میں ان تقاریر دل پذیر سے استفادہ کرتے رہیں اور کرتے رہیں گے۔

جامعہ دار العلوم کراچی میں صحیح بخاری کی مسند تدریس پر رونق آراء شخصیت شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم (سابق جسٹس شریعت اپیلٹ بینچ سپریم کورٹ آف پاکستان) علمی وسعت ، فقیہانہ بصیرت ، فہم دین اور شگفتہ طرز تفہیم میں اپنی مثال آپ ہیں ، درس حدیث کے طلبہ اس بحرِ بے کنار کی وسعتوں میں کھو جاتے ہیں اور بحث ونظر کے نئے نئے افق ان کے نگاہوں کو خیرہ کر دیتے ہیں ، خاص طور پر جب جدید تمدن کے پیدا کردہ مسائل سامنے آتے ہیں تو شرعی نصوص کی روشنی میں ان کا جائزہ ، حضرت شیخ الاسلام کا وہ میدان بحث ونظر ہے جس میں ان کا ثانی نظر نہیں آتا۔

آپ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ بانی دار العلوم دیوبند کی دعاؤں اور تمناؤں کا مظہر بھی ہیں ، کیونکہ انہوں نے آخر عمر میں اس تمنا کا اظہار فرمایا تھا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں انگریزی پڑھوں اور یورپ پہنچ کر ان دانایان فرنگ کو بتاؤں کہ حکمت وہ نہیں جسے تم حکمت سمجھ رہے ہو بلکہ حکمت وہ ہے جو انسانوں کے دل ودماغ کو حکیم بنانے کے لئے حضرت خاتم النبیین ﷺ کے مبارک واسطے سے خدا کی طرف سے دنیا کو عطا کی گئی۔

افسوس کہ حضرتؒ کی عمر نے وفا نہ کی اور یہ تمنا تشنۂ تکمیل رہی ، لیکن اللہ رب العزت اپنے پیاروں کی تمناؤں اور دعاؤں کو رد نہیں فرماتے ، اللہ جل جلالہ نے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تمنا کو دور حاضر میں شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ کی صورت میں پورا کر دیا کہ آپ کی علمی وعملی کاوشوں کو دنیا بھر کے مشاہیر اہل علم وفن میں سراہا جاتا ہے خصوصاً اقتصادیات کے شعبہ میں اپنی مثال آپ ہیں کہ قرآن وحدیث ، فقہ وتصوف اور تدین وتقوی کی جامعیت کے ساتھ ساتھ قدیم اور جدید علوم پر دسترس اور ان کو دور حاضر کی زبان پر سمجھانے کی صلاحیت آپ کو منجانب اللہ عطا ہوئی ہے۔

جامعہ دارالعلوم کراچی کے سابق شیخ الحدیث حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ جب یہ میرے پاس پڑھنے کے لئے آئے تو بمشکل ان کی عمر گیارہ/ بارہ سال تھی مگر اسی وقت سے ان پر آثار ولایت محسوس ہونے لگے اور رفتہ رفتہ ان کی صلاحیتوں میں ترقی و برکت ہوتی رہی، یہ مجھ سے استفادہ کرتے رہے اور میں ان سے استفادہ کرتا رہا۔

سابق شیخ الحدیث حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے مجھ سے مجلس خاص میں مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کا ذکر آنے پر کہا کہ تم محمد تقی کو کیا سمجھتے ہو، یہ مجھ سے بھی بہت اوپر ہیں اور یہ حقیقت ہے۔

ان کی ایک کتاب علوم القرآن ہے اس کی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی حیات میں تکمیل ہوئی اور چھپی اس پر مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے غیر معمولی تقریظ لکھی ہے۔ اکابرین کی عادت ہے کہ جب کسی کتاب کی تعریف کرتے ہیں تو جانچ تول کر بہت جچے تلے انداز میں کرتے ہیں کہ کہیں مبالغہ نہ ہو مگر حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ لکھتے ہیں کہ:

> یہ مکمل کتاب ماشاء اللہ ایسی ہے کہ اگر میں خود بھی اپنی تندرستی کے زمانے میں لکھتا تو ایسی نہ لکھ سکتا تھا، جس کی دو وجہ ظاہر ہیں:
>
> پہلی وجہ تو یہ کہ عزیز موصوف نے اس کی تصنیف میں جس تحقیق وتنقید اور متعلقہ کتابوں کے عظیم ذخیرہ کے مطالعہ سے کام لیا، وہ میرے بس کی بات نہ تھی، جن کتابوں سے یہ مضامین لئے گئے ہیں ان سب مأخذوں کے حوالے بقید ابواب وصفحات حاشیہ میں درج ہیں، انہی پر سرسری نظر ڈالنے سے ان کی تحقیقی کاوش کا اندازہ ہوسکتا ہے۔
>
> اور دوسری وجہ جو اس سے بھی زیادہ ظاہر ہے وہ یہ کہ میں انگریزی زبان سے ناواقف ہونے کی بناء پر مستشرقین یورپ کی ان کتابوں سے بالکل ہی ناواقف تھا، جن میں انہوں نے قرآن کریم اور علوم قرآن کے متعلق زہر آلود تلبیسات سے کام لیا ہے، برخوردار عزیز نے چونکہ انگریزی میں بھی ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی اعلیٰ نمبروں میں پاس کیا، انہوں نے ان تلبیسات کی حقیقت کھول کر وقت کی اہم ضرورت پوری کردی۔

اسی طرح شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمہ اللہ نے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے بارے میں

تحریر کیا:

لقد من الله تعالى بتحقيق هذه الأمنية الغالية الكريمة ، وطبع هذا الكتاب الحديثي الفقهي العجاب ،في مدينة كراتشي من باكستان ،متوجا بخدمة علمية ممتازة ، من العلامة المحقق المحدث الفقيه الأريب الأديب فضيلة الشيخ محمد تقي العثماني ،نجل سماحة شيخنا المفتي الأكبر مولانا محمد شفيع مد ظله العالي في عافية وسرور.

فقام ذاك النجل الوارث الألمعي بتحقيق هذا الكتاب والتعليق عليه،بما يستكمل غاياته ومقاصده،ويتم فرائده وفوائده ، في ذوق علمي رفيع ،وتنسيق فني طباعي بديع ،مع أبهى حلة من جمال الطباعة الحديثة الراقية فجاء المجلد الأول منه تحفة علمية رائعة .تتجلى فيها خدمات المحقق اللوذعي تفاحة باكستان فاستحق بهذا الصنيع العلمي الرائع : شكر طلبة العلم والعلماء .

کہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی کتاب شرح صحیح مسلم جس کا نام **فتح الملهم بشرح صحيح مسلم** اس کی تکمیل سے قبل ہی اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔تو ضروری تھا کہ آپ کے کام اور اس حسن کارکردگی کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں اسی بناء پر ہمارے شیخ ،علامہ مفتی اعظم حضرت مولانا محمد شفیع رحمہ اللہ نے ذہین وذکی فرزند، محدث جلیل ،فقیہ ،ادیب واریب مولانا محمد تقی عثمانی کی اس سلسلہ میں ہمت وکوشش کو ابھارا کہ **فتح الملهم شرح مسلم** کی تکمیل کرے، کیونکہ آپؒ حضرت شیخ شارح شبیر احمد عثمانیؒ کے مقام اور حق کو خوب جانتے تھے اور پھر اس کو بھی بخوبی جانتے تھے کہ اس باکمال فرزند کے ہاتھوں انشاء اللہ یہ خدمت کما حقہ انجام کو پہنچے گی۔

اسی طرح عالم اسلام کی مشہور فقہی شخصیت ڈاکٹر علامہ یوسف القرضاوی "**تكملة فتح الملهم**" پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وقد ادخر القدر فضل اكماله وإتمامه – إن شاء الله – لعالم

جليل من أسره علم و فضل "ذرية بعضها من بعض " هو الفقيه ابن الفقيه ،صديقنا العلامة الشيخ محمد تقى العثماني ،بن الفقيه العلامة المفتي مولانامحمدشفيع رحمه الله وأجزل مثوبته ،و تقبله في الصالحين .

وقد أتاحت لى الأقدار أن أتعرف عن كثب على الأخ الفاضل الشيخ محمد تقي، فقد التقيت به في بعض جلسات الهيئة العليا للفتوى والرقابة الشرعية للمصارف الإسلامية ،ثم في جلسات مجمع الفقه الإسلامي العالمي ، وهو يمثل فيه دولة باكستان، ثم عرفته أكثر فأكثر ، حين سعدت به معي عضوا في الهيئة الشرعية لمصرف فيصل الإسلامي بالبحرين ، والذي له فروع عدةفي باكستان .

وقد لمست فيه عقلية الفقية المطلع على المصادر،المتمكن من النظر والاستنباط،القادر على الاختيار والترجيح ، والواعي لما يدور حوله من أفكار و مشكلات – أنتجها

هذا العصر الحريص على أن تسود شريعة الاسلام وتحكم في ديار المسلمين .

ولا ريب أن هذه الخصائص تجلت في شرحه لصحيح مسلم ، وبعبارة أخرى : في تكملته لفتح الملهم .

فقد وجدت في هذا الشرح :حسن المحدث ، وملكة الفقيه ،وعقلية المعلم، وأناة القاضي،ورؤية العالم المعاصر،جنبا إلى جنب.

ومما يذكر له هنا: أنه لم يلتزم بأن يسير على نفس طريقة شيخه العلامة شبير أحمد، كما نصحه بذلك بعض أحبابه، وذلك لوجوه وجيهة ذكرها في مقدمته.

ولا ريب أن لكل شيخ طريقته وأسلوبه الخاص، الذى يتأثر بمكانه وزمانه ولثقافته، وتيارات الحياة من حوله. ومن التكلف الذى لايحمد محاولة العالم أن يكون نسخة من غيره،وقد خلقه الله مستقلا.

لقد رأيت شروحا عدة لصحيح مسلم،قديمة وحديثة، ولكن هذا الشرح للعلامة محمد تقى هو أول اها بالتنويه ، وأوفاها بالفوائد والفرائد،وأحقهابأن يكون هو (شرح العصر) للصحيح الثانى.

فهو موسوعة بحق ،تتضمن بحوثا وتحقيقات حديثية ،وفقهية ودعوية وتربوية. وقد هيأت له معرفته بأكثر من لغة ،ومنها الإنجليزية ،وكذلك قراء ته لثقافة العصر،واطلاعه على كثير من تياراته الفكرية،أن يعقد مقارنات شتى بين أحكام الإسلام وتعاليمه من ناحية ، وبين الديانات والفلسفات والنظريات المخالفة من ناحية أخرى وأن يبين هنا أصالة الإسلام وتميزه الخ—

انہوں نے فرمایا کہ مجھے ایسے مواقع میسر ہوئے کہ میں برادر فاضل شیخ محمد تقی کو قریب سے پہچانوں ۔ بعض فتوؤں کی مجالس اور اسلامی محکموں کے نگراں شعبوں میں آپ سے ملاقات ہوئی پھر مجمع الفقہ الاسلامی کے جلسوں میں بھی ملاقات کے مواقع آتے رہے، آپ اس مجمع میں پاکستان کی نمائندگی فرماتے ہیں ۔ الغرض اس طرح میں آپ کو قریب سے جانتا رہا اور پھر یہ تعارف بڑھتا ہی چلا گیا جب میں آپ کی ہمراہی سے فیصل اسلامی بینک (بحرین) میں سعادت مند ہوا آپ وہاں ممبر منتخب ہوئے تھے جس کی پاکستان میں بھی کئی شاخیں ہیں ۔

تو میں نے آپ میں فقہی سمجھ خوب پائی اس کے ساتھ مصادر و مآخذ فقہیہ پر بھر پور اطلاع اور فقہ میں نظر وفکر اور استنباط کا ملکہ اور ترجیح و اختیار پر خوب قدرت محسوس کی ۔

اس کے ساتھ آپ کے ارد گرد جو خیالات ونظریات اور مشکلات منڈلا رہی ہیں جو اس زمانے کا نتیجہ ہیں ان میں بھی سوچ سمجھ رکھنے والا پایا اور آپ ماشاء اللہ اس بات پر حریص رہتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ کی بالادستی قائم ہو اور مسلمان علاقوں میں اس کی حاکمیت کا دور دورہ ہو اور بلاشبہ آپ کی یہ خصوصیات آپ کی شرح صحیح مسلم (تکملہ فتح الملہم میں خوب نمایاں اور روشن ہے۔

میں نے اس شرح کے اندر ایک محدث کا شعور، فقیہ کا ملکہ، ایک معلم کی ذکاوت، ایک قاضی کا تدبر اور ایک عالم کی بصیرت محسوس کی۔ میں نے صحیح مسلم کی قدیم وجدید بہت سی شروح دیکھی ہیں لیکن یہ شرح تمام شروح میں سب سے زیادہ قابل توجہ اور قابل استفادہ ہے، یہ جدید مسائل کی تحقیقات میں موجودہ دور کا فقہی انسائکلوپیڈیا ہے اور ان سب شروح میں زیادہ حق دار ہے کہ اس کو صحیح مسلم کی اس زمانے میں سب سے عظیم شرح قرار دی جائے۔

یہ شرح قانون کو وسعت سے بیان کرتی ہے اور سیر حاصل ابحاث اور جدید تحقیقات اور فقہی، دعوتی، تربیتی مباحث کو خوب شامل ہے۔ اس کی تصنیف میں حضرت مؤلف کو کئی زبانوں سے ہم آہنگی خصوصاً انگریزی سے معرفت کام آئی ہے اسی طرح زمانے کی تہذیب وثقافت پر آپ کا مطالعہ اور بہت سی فکری رجحانات پر اطلاع وغیرہ میں بھی آپ کو دسترس ہے۔ ان تمام چیزوں نے آپ کے لئے آسانی کردی کہ اسلامی احکام اور اس کی تعلیمات اور دیگر عصری تعلیمات اور فلسفے اور مخالف نظریات کے درمیان فیصلہ کن رائے دیں اور ایسے مقامات پر اسلام کی خصوصیات اور امتیاز کو اجاگر کریں۔

احقر بھی جامعہ دار العلوم کراچی کا خوشہ چین ہے اور بحمد اللہ اساتذۂ کرام کے علمی دروس اور اصلاحی مجالس سے استفادے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور ان مجالس کی افادیت کو عام کرنے کے لئے خصوصی انتظام کے تحت گذشتہ چودہ (۱۴) سالوں سے ان دروس ومجالس کو آڈیو کیسٹس میں ریکارڈ بھی کر رہا ہے۔ اس وقت سمعی مکتبہ میں اکابر کے بیانات اور دروس کا ایک بڑا ذخیرہ احقر کے پاس جمع ہے، جس سے ملک و بیرون ملک وسیع پیمانے پر

استفادہ ہورہا ہے؛ خاص طور پر درس بخاری کے سلسلے میں احقر کے پاس اپنے دو اساتذہ کے دروس موجود ہیں۔

استاذ الاساتذہ شیخ الحدیث حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا درس بخاری جو دو سو کیسٹس میں محفوظ ہے اور شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ کا درس حدیث تقریباً تین سو کیسٹس میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔

انہیں کتابی صورت میں لانے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ کیسٹ سے استفادۂ عام مشکل ہوتا ہے، خصوصاً طلبا کرام کے لئے وسائل وسہولت نہ ہونے کی بناء پر سمعی بیانات کو خریدنا اور پھر حفاظت سے رکھنا ایک الگ مسئلہ ہے جب کہ کتابی شکل میں ہونے سے استفادہ ہر خاص وعام کے لئے سہل ہے۔

چونکہ جامعہ دار العلوم کراچی میں صحیح بخاری کا درس سالہا سال سے استاذ معظم شیخ الحدیث حضرت مولانا سحبان محمود صاحب قدس سرہ کے سپرد رہا۔ ۲۹ رذی الحجہ ۱۴۱۹ھ بروز ہفتہ کو شیخ الحدیث کا حادثۂ وفات پیش آیا تو صحیح بخاری شریف کا یہ درس مؤرخہ ۴ رمحرم الحرام ۱۴۲۰ھ بروز بدھ سے شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے سپرد ہوا۔ اُسی روز صبح ۸ بجے سے مسلسل ۲ سالوں کے دروس ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے ضبط کئے۔ انہی لمحات سے استاذ محترم کی مؤمنانہ نگاہوں نے تاک لیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ یہ مواد کتابی شکل میں موجود ہونا چاہئے، اس بناء پر احقر کو ارشاد فرمایا کہ اس مواد کو تحریری شکل میں لاکر مجھے دیا جائے تاکہ میں اس میں سبقاً سبقاً نظر ڈال سکوں، جس پر اس کام (انعام الباری) کے ضبط وتحریر میں لانے کا آغاز ہوا۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ کیسٹ میں بات منہ سے نکلی اور ریکارڈ ہوگئی اور بسا اوقات سبقت لسانی کی بناء پر عبارت آگے پیچھے ہو جاتی ہے (فالبشر یخطئ) جن کی تصحیح کا ازالہ کیسٹ میں ممکن نہیں۔ لہٰذا اس وجہ سے بھی اسے کتابی شکل دی گئی تاکہ حتی المقدور غلطی کا تدارک ہو سکے۔ آپ کا یہ ارشاد اس حزم واحتیاط کا آئینہ دار ہے جو سلف سے منقول ہے'' کہ سعید بن جبیرؒ کا بیان ہے کہ شروع میں سیدنا حضرت ابن عباسؓ نے مجھ سے آموختہ سننا چاہا تو میں گھبرایا، میری اس کیفیت کو دیکھ کر ابن عباسؓ نے فرمایا کہ:

أو ليس من نعمة الله عليك أن تحدث وأنا شاهد فإن اصبت فذاك وإن اخطأت علمتك.

(طبقات ابن سعد: ص: ۱۷۹، ج: ۶ و تدوین حدیث: ص: ۱۵۷)

کیا حق تعالیٰ کی یہ نعمت نہیں ہے کہ تم حدیث بیان کرو اور میں موجود ہوں، اگر صحیح طور پر بیان کروگے تو اس سے بہتر بات کیا ہو سکتی ہے اور اگر غلطی کروگے تو میں تم کو بتادوں گا۔

اس کے علاوہ بعض بزرگان دین اور بعض احباب نے سمعی مکتبہ کے اس علمی اثاثے کو دیکھ کر اس خواہش

کا اظہار کیا کہ درس بخاری کو تحریری شکل میں بھی پیش کیا جائے اس سے استفادہ مزید سہل ہوگا ''درس بخاری'' کی یہ کتاب بنام ''انعام الباری'' جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، اسی کاوش کا ثمرہ ہے۔

حضرت شیخ الاسلام حفظہ اللہ کو بھی احقر کی اس محنت کا علم اور احساس ہے اور احقر سمجھتا ہے کہ بہت سی مشکلات کے باوجود اس درس کی سمعی ونظری تکمیل وتحریر میں پیش رفت حضرت ہی کی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔

احقر کو اپنی تہی دامنی کا احساس ہے یہ مشغلہ بہت بڑا علمی کام ہے، جس کے لئے وسیع مطالعہ، علمی پختگی اور استحضار کی ضرورت ہے، جبکہ احقر ان تمام امور سے عاری ہے، اس کے باوجود ایسی علمی خدمت کے لئے کمربستہ ہونا صرف فضل الٰہی، اپنے مشفق اساتذہ کرام کی دعاؤں اور خاص طور پر موصوف استاذ محترم دامت برکاتہم کی نظر عنایت، اعتماد، توجہ، حوصلہ افزائی اور دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

ناچیز مرتّب کو مراحل ترتیب میں جن مشکلات ومشقت سے واسطہ پڑا وہ الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے اور ان مشکلات کا اندازہ اس بات سے بھی بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ کسی موضوع پر مضمون وتصنیف لکھنے والے کو یہ سہولت رہتی ہے کہ لکھنے والا اپنے ذہن کے مطابق بنائے ہوئے خاکہ پر چلتا ہے، لیکن کسی دوسرے بڑے عالم اور خصوصاً ایسی علمی شخصیت جس کے علمی تبحر وبرتری کا معاصر مشاہیر اہل علم وفن نے اعتراف کیا ہو ان کے افادات اور دقیق فقہی نکات کی ترتیب ومراجعت اور تعیین عنوانات مذکورہ مرحلہ سے کہیں دشوار وکٹھن ہے۔ اس عظیم علمی اور تحقیقی کام کی مشکلات مجھ جیسے طفل مکتب کے لئے کم نہ تھیں، اپنی بے مائیگی، نا اہلی اور کم علمی کی بناء پر اس کے لئے جس قدر دماغ سوزی اور عرق ریزی ہوئی اور جو محنت وکاوش کرنا پڑی مجھ جیسے نا اہل کے لئے اس کا تصور بھی مشکل ہے البتہ فضل ایزدی ہر مقام پر شامل حال رہا۔

یہ کتاب ''انعام الباری'' جو آپ کے ہاتھوں میں ہے: یہ سارا مجموعہ بھی بڑا قیمتی ہے، اس لئے کہ حضرت استاذ موصوف کو اللہ تعالیٰ نے جو تبحر علمی عطا فرمایا وہ ایک دریائے ناپید کنارہ ہے، جب بات شروع فرماتے تو علوم کے دریا بہنا شروع ہوجاتے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو وسعت مطالعہ اور عمق فہم دونوں سے نوازا ہے، اس کے نتیجہ میں حضرت استاذ موصوف کے اپنے علوم ومعارف جو بہت ساری کتابوں کے چھاننے کے بعد خلاصہ وعطر ہے وہ اس مجموعہ انعام الباری میں دستیاب ہے، اس لئے آپ دیکھیں گے کہ جگہ جگہ استاذ موصوف کی فقہی آراء وتشریحات، ائمۂ اربعہ کی موافقات ومخالفات پر محققانہ مدلل تبصرے علم وتحقیق کی جان ہیں۔

یہ کتاب (صحیح بخاری) ''کتاب بدء الوحی سے کتاب التوحید'' تک مجموعی کتب ۹۷، احادیث ''۷۵۶۳'' اور ابواب ''۳۹۳۰'' پر مشتمل ہے، اسی طرح ہر حدیث پر نمبر لگا کر احادیث کے مواضع ومتکررہ کی نشان دہی کا بھی التزام کیا ہے کہ اگر کوئی حدیث بعد میں آنے والی ہے تو حدیث کے آخر میں [أنظر] نمبروں کے ساتھ اور اگر حدیث گزری ہے تو [راجع] نمبروں کے ساتھ نشان لگادیئے ہیں۔

بخاری شریف کی احادیث کی تخریج **الکتب التسعة** (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ، موطاء مالک، سنن الدارمی اور مسند احمد) کی حد تک کردی گئی ہے، کیونکہ بسا اوقات ایک ہی حدیث کے الفاظ میں جو تفاوت ہوتا ہے ان کے فوائد سے حضرات اہل علم خوب واقف ہیں، اس طرح انہیں آسانی ہوگی۔

قرآن کریم کی جہاں جہاں آیات آئی ہیں ان کے حوالہ معہ ترجمہ، سورۃ کا نام اور آیتوں کے نمبر ساتھ ساتھ دیدئے گئے ہیں۔ شروح بخاری کے سلسلے میں کسی ایک شرح کو مرکز نہیں بنایا بلکہ حتی المقدور بخاری کی مستند اور مشہور شروح کو پیش نظر رکھا گیا، البتہ مجھ جیسے مبتدی کے لئے **عمدة القاری** اور **تکملة فتح الملهم** کا حوالہ بہت آسان ثابت ہوا۔ اس لئے جہاں **تکمله فتح الملهم** کا کوئی حوالہ مل گیا تو اسی کو حتمی سمجھا گیا۔

رب متعال حضرت شیخ الاسلام کا سایہ عاطفت عافیت وسلامت کے ساتھ عمر دراز عطا فرمائے، جن کا وجود مسعود بلاشبہ اس وقت ملت اسلامیہ کے لئے نعمت خداوندی کی حیثیت رکھتا ہے اور امت کا عظیم سرمایہ ہے اور جن کی زبان وقلم سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن وحدیث اور اجماع امت کی صحیح تعبیر وتشریح کا اہم تجدیدی کام لیا ہے۔

رب کریم اس کاوش کو قبول فرما کر احقر اور اس کے والدین اور جملہ اساتذۂ کرام کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے، جن حضرات اور احباب نے اس کام میں مشوروں، دعاؤں یا کسی بھی طرح سے تعاون فرمایا ہے، مولائے کریم اس محنت کو ان کے لئے فلاح دارین کا ذریعہ بنائے اور خاص طور پر استاذ محترم شیخ القراء حافظ قاری مولانا عبدالملک صاحب حفظہ اللہ کو فلاح دارین سے نوازے جنہوں نے ہمہ وقت کتاب اور حل عبارات کے دشوار گزار مراحل کو احقر کے لئے سہل بنا کر لائبریری سے بے نیاز رکھا۔

صاحبان علم کو اگر اس درس میں کوئی ایسی بات محسوس ہو جوان کی نظر میں صحت وتحقیق کے معیار سے کم ہو۔ اور ضبط ونقل میں ایسا ہونا ممکن بھی ہے تو اس نقص کی نسبت احقر کی طرف کریں اور از راہ عنایت اس پر مطلع بھی فرمائیں۔

دعا ہے کہ اللہ جل جلالہ اسلاف کی ان علمی امانتوں کی حفاظت فرمائے، اور ''انعام الباری'' کے باقی ماندہ حصوں کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے تا کہ علم حدیث کی یہ امانت اپنے اہل تک پہنچ سکے۔

آمین یا رب العالمین . وماذلک علی الله بعزیز

بندہ: محمد انور حسین عفی عنہ

فاضل ومتخصص جامعہ دارالعلوم کراچی ۱۴

۱۲ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ

بمطابق ۱۹ فروری ۲۰۱۰ء بروز جمعہ

كتاب الصلوٰة

٣٤٩ - ٥٢٠

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۸ ۔ کتاب الصلاۃ

(۱) باب کیف فرضت الصلاۃ فی الإسراء،

شبِ معراج میں نماز کس طرح فرض کی گئی

"وقال ابن عباس : حد ثني أبو سفيان في حديث هر قل فقال : يأمرنا يعني النبي ﷺ بالصلاۃ والصدق والعفاف".

لفظ "صلوٰۃ" کے معنی اور وجہ تسمیہ

صلوٰۃ کے لغوی معنی "دعا" کے آتے ہیں، بعد میں اس کا اطلاق ارکان مخصوصہ کی ادائیگی پر ہونے لگا۔

بعض لوگوں نے یہ مناسبت تلاش کی ہے کہ صلوٰۃ صلوین سے نکلا ہے، آدمی کے کولہے کی ہڈیوں کو صلوین کہتے ہیں، کیونکہ نماز میں آدمی کے کولہے کی ہڈیاں حرکت میں آتی ہیں یعنی تحریک الصلوین ہوتا ہے، اس لئے اس کا نام صلوٰۃ رکھ دیا گیا، لیکن یہ بہت دور از کار قسم کی مناسبت ہے۔

بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ صلوٰۃ کا نام صلوٰۃ اس لئے رکھا گیا ہے، کہ جب گھوڑوں میں گھڑ دوڑ ہوتی تھی تو اس میں سب سے پہلے نمبر پر آنے والے گھوڑے کو سابق اور دوسرے نمبر پر آنے والے کو مصلّی کہا جاتا

تھا، تقریباً دس نام یکے بعد دیگرے الگ الگ رکھے ہیں۔

(۱)	سابق	(۲)	مصلّی
(۳)	مجلّی	(۴)	مقفّی
(۵)	عاطف	(۶)	مرتاح
(۷)	حظّی	(۸)	مؤمّل
(۹)	لطیم	(۱۰)	سُکیت

اس میں دوسرے نمبر پر جو آتا ہے اس کو "**مصلّی**" کہتے ہیں۔"**مصلّی**" ایسا ہوتا ہے کہ "سابق" آگے ہے تو "**مصلّی**" کا جو منہ ہے وہ اس کی پشت کے قریب ہوتا ہے، تو کہتے ہیں کہ نماز پڑھنے کے اندر بھی جب جماعت ہوتی ہے تو جو آدمی پیچھے ہوتا ہے وہ اپنے امام کے ساتھ اس طرح ہوتا ہے کہ جس طرح مصلّی سابق کے ساتھ ہوتا ہے، یہ مناسبت بھی بعض حضرات نے بیان کی ہے، اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس کو "فیض الباری" میں ترجیح بھی دی ہے۔ [۱]

مجھے یوں لگتا ہے کہ اصل میں صلوٰۃ کے معنی "دعا" کے بھی آتے ہیں خواہ وہ کسی قسم کی بھی ہو، بعد میں اس لفظ کا اطلاق نماز کے معنی میں ہونے لگا اور صرف نماز ہی کے معنی میں نہیں بلکہ قرآن کریم میں اس کا اطلاق ہر طریقِ عبادت پر کیا گیا ہے، کوئی بھی شخص عبادت کا کوئی ایسا طریقہ اختیار کرے جس میں اللہ جل شانہ کی تعظیم اور اجلال مقصود ہو تو اس کو صلوٰۃ کہہ دیا جیسے "**وَ مَا كَانَ صَلاتهم عند البيت الا مكاءً و تصديةً**" تو اب ظاہر ہے کہ وہ نماز تو نہیں پڑھتے تھے لیکن ان کی عبادت کا خاص طریقہ تھا، جس کو وہ انجام دیتے تھے، اس واسطے مطلق عبادت کے طریقہ کو بھی صلوٰۃ کہہ دیا جاتا ہے، کیونکہ اسلام میں جو اہم ترین عبادت کا طریقہ مقرر کیا گیا ہے وہ یہی ہے، اس واسطے اس کو صلوٰۃ کہہ دیتے ہیں۔ [۲]

---

[۱] سميت الصلاة صلاة لكونها متبعا بها فعل الامام .فان التالى للسابق من الخالى يستمه مصلياً نكون رأسه صلوى السابق كذا ذكره الباقلانى،وهو الوجه عندى فى سميتها لا أنها من تحريك الصلوين ،فان المقتدى يصلى خلف الامام ويتبع فعله و يجرى معه الخ .فيض البارى،ج: ۲،ص: ۱ .

[۲] ثم معنى الصلاة فى اللغة الغالبة الدعاء .قال تعالىٰ : وَصَلِّ عَلَيهِم [التوبة :۱۰۳]أى : أدع لهم .وفى الحديث، فى اجابة الدعوة: وان كان صائماً فليصل ،أى: فليدع لهم بالخير والبركة. كذا ذكره العينى فى العمدة ، ج:۳،ص:۲۳۷ دارالفكر، بيروت.

کیفیتِ مشروعیت نماز

امام بخاری رحمہ اللہ نے باب قائم کیا ہے کہ سب سے پہلے یہ پانچ نمازیں اسراء کے موقع پر فرض ہوئیں، یعنی معراج کے موقع پر، لیکن اس پر کلام ہوا ہے کہ آیا معراج سے پہلے یعنی ان پانچ نمازوں کی فرضیت سے پہلے بھی کوئی نماز فرض تھی یا نہیں؟ [۳]

امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا تہجد کی نماز بالکل ابتداء اسلام سے فرض ہوگئی تھی جس کی دلیل یہ ہے کہ سورۂ مزمل میں تہجد کی نماز کا حکم دیا گیا "**یا أیها المُزَّمِّل قم اللیل الا قلیلاً**" اور سورۂ مزمل نزول کے اعتبار سے بالکل ابتدائی سورتوں میں سے ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ اس وقت میں نماز مشروع ہو چکی تھی اور وہ رات کی نماز تھی، البتہ اس میں لوگوں نے کلام کیا ہے کہ تہجد کی نماز فرض تھی یا نفل تھی، تو اس میں زیادہ تر محققین کا کہنا یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے لئے تو فرض تھی اور بقیہ امت کے لئے فرض نہیں تھی۔ [۴]

حضور اقدس ﷺ تہجد کے علاوہ بھی کوئی نماز پڑھا کرتے تھے؟

تو روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ معراج سے پہلے بھی دو نمازیں پڑھی جاتی تھیں، ایک فجر کی نماز اور دوسری عشاء کی نماز۔ اور "**وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ بِالْعَشِیِّ وَ الْاِبْكَارِ**" [آل عمران: ۴۱] اس میں جو حکم آیا ہے یہ فجر اور عشاء کی نماز کے لئے آیا ہے، یہ نمازیں پہلے بھی پڑھی جاتی تھیں اور متعدد روایات اس پر شاہد ہیں کہ یہ نمازیں (فجر و عشاء) پہلے بھی پڑھی جاتی تھیں، البتہ بعض حضرات نے فرضیت کا اور بعض نے نفل ہونے کا قول اختیار کیا ہے، لیکن جو حضرات کہتے ہیں فرض ہوگئی تھیں وہ اس کی دلیل میں یہ بات پیش کرتے ہیں کہ اس زمانے کی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دو نمازیں بھی باقاعدہ صف بندی کے ساتھ جماعت سے ادا کی جاتی تھیں، اور شریعت میں معہود یہ ہے کہ صف بندی کے ساتھ ادا کی جانے والی نماز فرض ہوتی ہے، لہٰذا یہ نماز فرض تھی، لیکن یہ فرضیت پر یقینی دلیل نہیں ہے، البتہ اس کے بارے میں محقق بات یہ ہے کہ اتنی بات تو روایت سے ثابت ہے کہ حضور علیہ السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسراء سے پہلے ہی فجر اور عشاء پڑھا کرتے تھے لیکن یہ بات یقین سے کہنا مشکل ہے کہ یہ دو نمازیں فرض تھیں یا نفل؟ اور سب سے پہلے پانچ نمازیں "**لیلة الاسراء**"

---

[۳] وفی شرح النکایة، کان فرض الصلوات الخمس لیلة المعراج، البحر الرائق، ج: ۱، ص: ۲۵۷۔

[۴] واختلف ایضاً هل کان فرضاً علی النبی ﷺ وحده أو علیه وعلی من کان قبله من الانبیاء أو علیه وعلی أمته. ثلاثة أقوال. الأوّل قول سعید ابن جبیر لتوجه الخطاب الیه خاصةً. الثانی قول ابن عباس قال کان قیام اللیل فریضةً علی النبی ﷺ وعلی الأنبیاء. الثالث قول عائشة و ابن عباس ایضاً .... فقالت ألست تقرأ یا ایها المزمل الخ، تفسیر القرطبی، ج: ۱۹، ص: ۳۴، دار الشعب، القاهرہ۔

میں فرض ہوئیں۔

واقعہ "لیلۃ الاسراء" کے وقوع میں اقوال شتّی

"لیلۃ الاسراء" کب ہوئی؟

اس کے بارے میں اصحاب سیر، حضرات محدثین اور مؤرخین کے درمیان خاصا اختلاف ہے کہ کس سال آپ ﷺ کو معراج ہوئی؟ علماء کے اس بارے میں دس اقوال ہیں۔

(۱) ہجرت سے چھ ماہ قبل معراج ہوئی

(۲) ہجرت سے آٹھ ماہ پیشتر۔

(۳) ہجرت سے گیارہ ماہ پیشتر۔

(۴) ہجرت سے ایک سال پیشتر۔

(۵) ہجرت سے ایک سال اور دو ماہ پیشتر۔

(۶) ہجرت سے ایک سال اور تین ماہ پیشتر۔

(۷) ہجرت سے ایک سال اور پانچ ماہ پیشتر۔

(۸) ہجرت سے ایک سال اور چھ ماہ پیشتر۔

(۹) ہجرت سے پانچ سال پیشتر

اور

(۱۰) ہجرت سے تین سال پیشتر۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی رائے

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے اس کو ترجیح دی ہے کہ نبوت کے بارہویں سال یعنی ہجرت سے ایک سال پہلے **"لیلۃ الاسراء"** کا واقعہ پیش آیا۔

مقصود امام بخاری رحمہ اللہ

پہلا باب امام بخاری رحمہ اللہ نے اسی اسراء کی کیفیت کو بیان کرنے کے لئے قائم کیا ہے اور فرمایا **"باب کیف فرضت الصلوٰۃ فی الاسراء"** کہ اسراء کے موقع پر نماز کیسے فرض کی گئی اور ساتھ میں عبداللہ بن عباس ؓ کا اثر نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ مجھے ابوسفیان نے دربار ہرقل سے متعلق حدیث بیان کرتے

ہوئے یہ کہا کہ "**یأمرنا یعنی النبی ﷺ بالصلوٰۃ والصدق والعفاف**" کہ نبی کریم ﷺ ہمیں نماز، سچائی اور پاکدامنی کا حکم فرماتے ہیں۔

اس کو لانے کا منشأ یہ ہے کہ ابوسفیان نے یہ قول ہرقل کے دربار میں کہا تھا یا اگر چہ بعد الہجرت ہے (یعنی ابوسفیان ہرقل کے دربار میں اس وقت گیا تھا جب نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ ہجرت فرما چکے تھے، لیکن ابوسفیان کی حضور اقدس ﷺ سے ایسی ملاقات جس میں آنحضرت ﷺ ان کو نماز کا حکم فرما سکیں، یہ ہجرت کے بعد کا واقعہ نہیں بلکہ ہجرت سے پہلے کی بات ہے)[۵] لہٰذا امام بخاری رحمہ اللہ کا اس کو لانے کا منشأ یہ ہے کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی فرضیت مکہ مکرمہ ہی میں آچکی تھی، اور حضور اقدس ﷺ ہجرت سے پہلے ہی نماز کا حکم فرمایا کرتے تھے۔[۶]

۳۴۹۔ حدثنا یحیی بن بکیر قال: حدثنا اللیث، عن یونس، عن ابن شهاب، عن انس بن مالک قال: کان ابو ذر یحدث أن رسول اللّٰه ﷺ قال: "فرج عن سقف بیتي وأنا بمکة، فنزل جبریل ففرج صدري ثم غسله بماء زمزم، ثم جاء بطست من ذهب ممتلئ حکمة وإیمانا فأفرغه في صدري، ثم أطبقه، ثم أخذ بیدي فعرج بي إلى السماء الدنیا، فلما جئت إلى السماء الدنیا قال جبریل لخازن السماء: افتح، قال: من هذا؟ قال: جبریل قال: هل معک أحد؟ قال: نعم، معي محمد ﷺ، فقال: أأرسل إلیه؟ قال: نعم، فلما فتح علونا السماء الدنیا فإذا رجل قاعد على یمینه أسودة وعلى یساره أسودة، إذا نظر قبل یمینه ضحک، وإذا نظر قبل یساره بکى، فقال: مرحبا بالنبی الصالح، والابن الصالح، قلت لجبریل: من هذا؟ قال: هذا آدم، وهذه الأسودة عن یمینه وشماله نسم بنیه، فأهل الیمین منهم أهل الجنة، والأسودة التی عن شماله أهل النار، فإذا نظر عن یمینه ضحک، وإذا نظر قبل شماله بکى، حتى عرج بي إلى السماء الثانیة، فقال لخازنها: افتح، فقال له خازنها مثل ما قال الاول ففتح"، قال انس: فذکر انه وجد فی السموات آدم، وإدریس، وموسى، وعیسى، وإبراهیم صلوات اللّٰه علیهم، ولم یثبت کیف منازلهم غیر أنه ذکر أنه وجد آدم في السماء الدنیا، وإبراهیم في السماء

---

[۵] فیه اشارة إلى أن الصلوٰة فرضت بمکة قبل الهجرة لأن أبا سفیان لم یلق النبی ﷺ بعد الهجرة إلى الوقت الذی اجتمع فیه بهرقل الخ، فتح الباری ج: ۱، ص: ۴۶۰.

[۶] ولا خلاف بین أهل العلم وجماعة أهل السیر أن الصلوٰة إنما فرضت على النبی ﷺ بمکة فی حین الإسراء الخ، تفسیر القرطبی ج: ۱۰، ص: ۲۰۸.

السادسة . قال أنس : فلما مر جبريل بالنبي ﷺ بإدريس قال : "مرحبا بالنبي الصالح والأخ الصالح ، قلت : من هذا؟ قال : هذا موسى ، ثم مررت بعيسى فقال : مرحبابالأخ الصالح والنبي الصالح ، قلت : من هذا؟ قال : هذاعيسى ، ثم مررت بإبراهيم فقال : مرحبابالنبي الصالح والا بن الصالح ، قلت : من هذا؟ قال : هذا إبراهيم " ، قال ابن شهاب : فأخبرني ابن حزم أن ابن عباس ، وأبا حبة الأنصاري ، كانا يقولان : قال النبي ﷺ : "ثم عرج بي حتى ظهرت لمستوى أسمع فيه صريف الأقلام" ، قال ابن حزم ، وأنس ابن مالک : قال النبي ﷺ : "ففرض الله على أمي خمسين صلاة ، فرجعت بذلک حتى مررت على موسى ، فقال : مافرض الله لک على أمتک؟ قلت : فرض خمسين صلاة ، قال موسىٰ : فارجع إلى ربک ، فإن أمتک ؟ لاتطيق ذلک ، فراجعني فوضع شطرها ، فرجعت إلى موسى ، قلت : وضع شطرها، قال : راجع ربک فإن أمتک لا تطيق ، فراجعت ، فوضع شطرها، فرجعت إليه فقال : ارجع إلى ربک فإن أمتک لا تطيق ذٰلک ،فرجعته ، فقال : هن خمس وهن خمسون ، لا يبدل القول لدي ، فرجعت إلى مو سى ، فقال : راجع ربک ، فقلت : استحييت من ربي ، ثم انطلق بي حتى انتهى بي إلى سدرة المنتهى ، وغشيها ألوان لا أدري ماهي ، ثم أدخلت الجنة ، فإذا فيها حبايل اللؤ لؤ ، وإذا ترابها المسک" . [أنظر : ۱۶۳۶، ۳۳۴۲] ۷

یہ حدیث صحیح بخاری شریف میں گیارہ مختلف مقامات پر آئی ہے، کہیں اختصار کے ساتھ، کہیں تفصیل سے اور کہیں متوسط درجہ کی تفصیل کے ساتھ آئی ہے ان میں یہ پہلا مقام ہے، اس حدیث سے اور بھی بہت سی مباحث متعلق ہیں، جن میں سے بعض کا تعلق سیرت سے ہے، بعض کا تعلق احکام فقہیہ سے اور بعض کا تعلق علم کلام کے مسائل سے ہے، علامہ زرقانی رحمہ اللہ نے **" شرح المواهب اللّدنيه"** میں اس حدیث میں جو بحث کی ہے وہ تقریباً دوسو صفحات پر مشتمل ہے۔

علامہ قسطلانی رحمہ اللہ نے سیرت پر مشتمل کتاب **" المواهب اللّدنيه"** لکھی اور اس کی شرح علامہ زرقانی رحمہ اللہ نے **" شرح المواهب اللّدنيه"** لکھی، **" شرح الزرقاني على المواهب "** کے

---

۷ وفي صحيح مسلم ، كتاب الايمان ، باب الاسراء برسول الله الى السموات وفرض الصلوات ، رقم :۲۳۷ وسنن الترمذي ، كتاب الصلوٰة ، باب كم فرض الله على عباده من الصلوات ، رقم :۱۹۷ وسنن النسائي ، كتاب الصلاة ، باب فرض الصلاة وذكر اختلاف الناقلين في اسناد حديث ، رقم :۴۴۵، ۴۴۶ ومسند أحمد ، باقي مسند المكثرين ، باب مسند أنس بن مالک، رقم:۱۲۱۸۰ ومسند الأنصار ، باب حديث جابر بن سمرة، رقم : ۲۰۲۱۱، ۲۰۳۲۶.

بکثرت حوالے آپ نے دیکھے ہوں گے، لیکن ظاہر ہے کہ ان مباحث کو مکمل طور پر یہاں بیان کرنا ممکن ہے، اور نہ مختصر وقت میں بیان ہو سکتے ہیں، کیونکہ یہاں امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود اس حدیث کو لانے سے یہ ہے کہ معراج کی رات میں نمازیں فرض کی گئیں، لہٰذا اس حد تک اپنے آپ کو محدود رکھتے ہوئے یہاں پر چند باتوں کا ذکر مناسب ہے اور باقی مباحث متعلقہ مقامات پر انشاء اللہ تعالیٰ آتے رہیں گے۔

اسراء اور معراج میں فرق

پہلی بات جو اس حدیث سے متعلق ہے وہ یہ ہے کہ محدثین اور اصحاب سیر کی اصطلاح میں حضور اقدس ﷺ نے جو سفر مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک کیا اس کو اسراء اور پھر وہاں سے ساتوں آسمان پر تشریف لے گئے اس کو معراج کہتے ہیں، اسراء اور معراج میں یہ فرق ہے۔

بعض محدثین یہ نہیں مانتے بلکہ ان کے نزدیک شروع سے آخر تک جو کچھ ہوا وہ سب اسراء ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا مسلک یہی ہے، یعنی امام بخاری رحمہ اللہ پورے سفر کو "اسراء" مانتے ہیں، اور وہ اس تفریق کے قائل نہیں کہ مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک سفر کو "اسراء" اور بیت المقدس سے ساتوں آسمان کے سفر کو "معراج" کہیں۔ اس واسطے یہاں پر جو لفظ استعمال کیا وہ ہے **"کیف فرضت الصلوٰۃ فی الاسراء"** حالانکہ نمازیں معراج میں فرض ہوئیں لیکن اس کے باوجود "اسراء" کا لفظ استعمال کیا، تو معلوم ہوا کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک پورا سفر "اسراء" کہلاتا ہے اور یہ ان حضرات کے مخالف ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بیت المقدس کے سفر کو "اسراء" کہتے ہیں اور بعد والے سفر کو "معراج" کہتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ: معراج جسمانی تھی یا روحانی؟

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ یہ اسراء اور معراج کا واقعہ، آیا یہ جسمانی طور پر پیش آیا تھا یا روحانی طور پر۔

جمہور اہل سنت والجماعت کا عقیدہ

جمہور اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ معراج جسمانی ہے، اور نبی کریم ﷺ کو جسد اطہر کے ساتھ بیت المقدس تک لے جایا گیا تھا اور پھر وہاں سے ساتوں آسمان تک۔[8]

---

[8] وهذا مصير من المصنف إلى أن المعراج كان في ليلة الاسراء وقد وقع في ذلك اختلاف فقيل كانا في بليلة واحدة في يقظته ﷺ وهذا هوا لمشهور ثم الجمهور الخ، فتح الباری ج: ۱، ص: ۴۶۰۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کی رائے

البتہ محققین نے یہ موقف اختیار کیا ہے، جس میں علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ بھی داخل ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کو دو مرتبہ معراج ہوئی ہے، ایک مرتبہ منام میں اور دوسری مرتبہ یقظہ میں ہوئی، اور یہاں اسی کا ذکر ہے، اور منام میں اس سے پہلے ہوئی، تو آپ کو یہ واقعہ پہلے دکھایا جا چکا تھا تا کہ آپ ﷺ اس کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو جائیں، بعد میں پھر جسمانی طور پر اسراء اور معراج کا واقعہ پیش آیا۔[۹]

حدیث کی تشریح

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں **"قال کان ابو ذر یحدث ان رسول اللہ ﷺ قال"**: یہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، لیکن وہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث براہ راست نبی کریم ﷺ سے نہیں سنی بلکہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ یہ حدیث سنایا کرتے تھے کہ **"فرج عن سقف بیتی وانا بمکۃ"** کہ میرے گھر کی چھت میں شگاف ڈالا گیا جبکہ میں مکہ مکرمہ میں تھا۔

"فنزل جبرئیل" تو جبرئیل علیہ السلام اس شگاف میں نازل ہوئے اور اس مرتبہ آنے کا یہی طریقہ اختیار کیا گیا کہ آپ کے مکان کی چھت میں شگاف ڈال کر وہ تشریف لائے، حالانکہ پہلے بھی حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لایا کرتے تھے اور ان کو باقاعدہ شگاف ڈالنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی تھی۔

علماء کرام فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ کو پہلے ہی سے یہ پتہ چل جائے کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے والا ہے، اس لئے چھت میں سے حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے۔

شقِ صدر اور اس کی حکمت

"ففرج صدری" انہوں نے میرا سینہ کھولا **"ثم غسلہ بماء زمزم"** پھر اس کو زمزم کے پانی سے دھویا **"ثم جاء بطست من ذھب ممتلئی حکمۃ وایمانا"** پھر وہ ایک طشت لے کر آئے جو حکمت اور ایمان سے بھرا ہوا تھا۔ **"فافرغہ فی صدری"** پھر اس ایمان وحکمت کو میرے سینے میں انڈیل دیا۔ **"ثم اطبقہ"** پھر سینہ کو بند کر دیا۔ گویا یہ شق صدر کیا گیا اور اس شق صدر میں حکمت وایمان نبی کریم ﷺ کے سینے میں انڈیل دیا گیا، شق صدر کا پہلا واقعہ بنو سعد میں بچپن میں پیش آچکا تھا جب کہ آپ ﷺ کی تربیت ہو رہی تھی۔

اس وقت شق صدر کا مقصد یہ تھا کہ آپ کے سینہ اقدس میں سے ایک لوتھڑا نکالا گیا اور کہا کہ یہ شیطان کا

---

۹ فتح الباری، ج: ۱، ص۴۶۰.

حصہ ہے جو نکال دیا گیا یعنی شیطان جس حصہ کو اغواء کا ذریعہ بناتا ہے وہ نبی کریم ﷺ کے جسدِ اطہر سے اس شق صدر کے ذریعہ الگ کر دیا گیا، اور یہاں مقصود یہ تھا کہ اب اس کو ایمان وحکمت سے مزید بھرا جائے تو دونوں شق صدر اپنی اپنی جگہ پر الگ الگ اغراض ومقاصد کے لئے تھے: ایک مقصد تخلیہ تھا، اور دوسرے کا تحلیہ اس لئے محدثین کی بڑی جماعت اس بات کی قائل ہے کہ نبی کریم ﷺ کا شق صدر ایک سے زائد مرتبہ ہوا ہے۔

شق صدر کتنی مرتبہ ہوا؟ مختلف اقوال

شق صدر کا واقعہ حضور ﷺ کو اپنی عمر مبارک میں چار مرتبہ پیش آیا۔

پہلی بار...... زمانہ طفولیت میں پیش آیا، جب آپ ﷺ حلیمہ سعدیہ کی پرورش میں تھے اور اس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک چار سال کی تھی۔

دوسری بار...... شق صدر کا واقعہ آپ ﷺ کو دس سال کی عمر میں پیش آیا۔

تیسری بار...... یہ شق صدر کا واقعہ بعثت کے وقت پیش آیا۔

اور

چوتھی بار...... یہ واقعہ معراج کے وقت پیش آیا۔

روایات معراج میں بچپن کے شق صدر کا ذکر نہیں یا دوسری بعض روایتوں میں اس شق صدر کا ذکر نہیں۔ یہ اس کے غیر معتبر ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتی، ہر صحابی کی روایت میں کچھ ایسے امور کا ذکر ہے کہ دوسرے صحابہ کی روایت میں اس کا ذکر نہیں، راوی نے کسی جگہ فقط معراج کے شق صدر کا ذکر کیا اور کسی جگہ فقط طفولیت کے شق صدر کو بیان کیا، اور کسی جگہ دونوں کو جمع کیا اور ہر شق صدر کا زمان اور مکان مختلف ہے، اور ہر ایک جداگانہ واقعہ ہے، فقط ایک واقعہ کا ذکر دوسرے غیر مذکورہ واقعہ کی نفی پر دلالت نہیں کرتا۔

شق صدر سے متعلق متجدّ دین کا خیال خام

بہر حال یہ اللہ ﷻ کی حکمتیں ہیں وہی بہتر جاننے والے ہیں، لیکن یہ بات ثابت ہے کہ شق صدر کا واقعہ پیش آیا ہے، بعض ظاہر بین اور تجدد پسند اس واقعہ کا انکار کرتے ہیں، کیونکہ ان کا اصول یہ ہے کہ جو چیز سمجھ میں نہ آئے اس کا انکار کردو۔ تو بھئی! تمہاری سمجھ میں نہیں آتا تو اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ وہ چیز واقعہ کے خلاف ہے ۔

اذا لم تر الهلال فسلّم لأناس راؤه بالأبصار

اگر تم نے چاند نہیں دیکھا تو جنہوں نے دیکھا ان کی بات ماننی چاہئے، تو حضور اقدس ﷺ کا شق صدر صحیح

احادیث سے ثابت ہے اس کو بلاوجہ مجاز اور استعارہ پر محمول کرنا اس کا کوئی جواز نہیں۔ ہر بات کی حکمت ہمارے سامنے نہیں آسکتی، اللہ ﷻ کے افعال اور ان کی حکمتیں وہی بہتر جانتے ہیں، اور زیادہ اس خوض میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ حکمت کیا تھی؟ اللہ ﷻ نے اپنے حضور ﷺ کے ساتھ جو تصرفات فرمائے ان کی حکمت وہی بہتر جانتے ہیں۔

آگے ارشاد فرمایا" **فعرج بی الی السماء الدنیا** "۔

پھر مجھے لے کر آسمان کی طرف چڑھ گئے۔ اب یہاں بیت المقدس تک کے سفر کا ذکر ہی نہیں ہے، اس کی وجہ سے بعض لوگوں نے کہا کہ یہ واقعہ عام معراج سے الگ ہے، کیونکہ یہاں بیت المقدس کا ذکر نہیں ہے، لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے، صحیح بات یہ ہے کہ راوی نے یہاں پر اختصار سے کام لیا اور بیت المقدس والے حصہ کا ذکر یہاں نہیں کیا، درحقیقت واقعہ وہی ہے۔

"**فلما جئت الی السماء الدنیا قال جبرئیل لخازن السماء : افتح**"۔ جب میں "**سماء الدنیا**" کے پاس پہنچا، "**السماء الدنیا**" سے نزدیک والا آسمان مراد ہے، اگر دنیا کا آسمان کہتے تو بغیر الف لام کے "**سماء الدنیا**" کہتے، لیکن یہاں الف لام کے ساتھ "**السماء الدنیا**" ہے جب نزدیک والے آسمان پر پہنچے تو جبرئیل علیہ السلام نے آسمان کے خازن سے کہا "**افتح**" کھولو۔ "**قال من ھذا**" اندر سے پوچھا بھئی کون ہے؟ "**قال : جبرئیل قال : ھل معک أحد قال نعم معی محمد** (ﷺ) **فقال : أرسل الیہ**" انہوں نے پوچھا کیا ان کو مبعوث کر دیا گیا، "**قال : نعم**" تو انہوں نے کہا کہ ہاں۔

سوال: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خازن کو حضور اقدس ﷺ کے مبعوث ہونے کا علم نہیں تھا؟

جواب: اس کے جواب میں بعض حضرات نے کہا کہ شاید وہ خازن دن رات اپنے ذکر و تسبیح میں مشغول رہے، تو اس واسطے ان کو پتہ نہیں چلا کہ حضور اقدس ﷺ مبعوث ہوئے۔

لیکن زیادہ صحیح بات میرے نزدیک یہ ہے کہ یہاں "**ارسل الیہ**" کے معنی مبعوث ہونے کے نہیں ہیں، بلکہ پیغام بھیجے جانے کے ہیں کہ کیا آپ کو یہاں پر بلانے کی دعوت دیدی گئی تھی؟ یعنی آپ کے یہاں آنے میں اللہ ﷻ کا اذن اس میں شامل ہے؟ تو انہوں نے کہا ہاں "**فلما فتح علونا السماء الدنیا**" جب دروازہ کھول دیا گیا تو ہم سماء دنیا کے اوپر چڑھ گئے۔

آسمان کے وجود سے متعلق سائنسدانوں کا نظریہ

اس سے پتہ چلا کہ آسمان ایک جرم ہے اور اس کے دروازے بھی ہیں، اور قرآن مجید میں جو آیا ہے کہ "**لا تفتح لھم ابواب السماء**" اس میں ابواب سے مراد حقیقی ابواب ہیں نہ کہ کوئی مجاز اور استعارہ، چونکہ

آج کل کے سائنسدان یہ کہتے ہیں کہ آسمان کا کوئی وجود نہیں، سب خلاء ہی خلاء ہے اور جتنے سیارے ہیں وہ سب ایک خلاء میں تیر رہے ہیں ﴿ **کل فی فلک یسبحون** ﴾ تو یہ کسی جرم کے اندر نہیں ہیں بلکہ خلاء میں تیر رہے ہیں اور جو چیز نیلی نیلی نظر آتی ہے یہ ہماری حدنگاہ ہے، حقیقت میں آسمان نہیں ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ہم تو چلے گئے لیکن کہیں آسمان کا کوئی وجود نہیں ملا، تو سارے سیارے، ساری کہکشائیں اس خلاء میں دوڑ رہی ہیں، اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو چھت کی مانند سب پر سایہ کئے ہوئے ہو، آج کل سائنسدانوں کا یہی نظریہ ہے

اس وجہ سے بعض لوگ قرآن مجید میں اس کی بنیاد پر تاویل کے درپے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں جہاں "**ابواب السماء**" آیا ہے تو اس سے مراد حقیقی ابواب نہیں ہیں بلکہ مجاز اور کنایہ ہے "**لا تفتح لهم ابواب السماء**"۔

آسمان کا وجود یقینی ہے

لیکن حدیثِ باب صراحۃً کہہ رہی ہے کہ باقاعدہ دروازہ کھلوایا گیا، دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئے، اور بھی بہت سی آیات واحادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ آسمان باقاعدہ جرم ہے۔

سائنسدانوں کا یہ کہنا کہ آسمان کا کوئی وجود نہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کو کوئی دلیل مل گئی ہو، بلکہ اس کے موجود نہ ہونے پر صرف اتنی بات ہے کہ آسمان کا وجود ابھی تک دریافت نہیں ہوا اور وہ ابھی تک آسمان کو دریافت نہیں کرسکے اور کسی جرم اور جسم کی چھت کی مانند ان کو علم اور مشاہدہ میں نہیں آیا۔

عدم علم الشیٔ عدم وجود الشیٔ کو مستلزم نہیں

ان کے مشاہدہ میں نہ آنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ نفس الامر میں آسمان کا وجود ہی نہ ہو، اور اب انہوں نے اجرام فلکیہ کے مشاہدہ کے لئے سب سے بڑی دوربین بنائی ہے، وہ کہتے ہیں کہ وہ ایک لاکھ نوری سال تک کا فاصلہ دیکھ سکتی ہے (روشنی ایک سال میں جتنا سفر طے کرے اس کو نوری سال کہتے ہیں) بس اب اس سے اندازہ لگاؤ کہ سورج ہم سے ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل دور ہے اور سورج کی روشنی زمین پر آنے میں آٹھ سیکنڈ لگتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ روشنی آٹھ سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کا فاصلہ طے کرتی ہے تو ایک سال مسلسل سفر کرتی رہے تو جتنا سفر طے کرے گی وہ ایک نوری سال کہلاتا ہے، چونکہ اجرامِ فلکیہ کی پیائش کے لئے جو ہمارا گنتی کا موجودہ نظام ہے وہ فیل ہوگیا، کیونکہ یہ زیادہ سے زیادہ ارب، کھرب تک جاتا ہے، کھرب سے آگے تو کوئی گنتی ہے نہیں، تو اس واسطے اس گنتی کی خاطر انہوں نے نوری سال کی یہ اصطلاح بنائی ہے۔

اب جو دوربین بنائی ہے وہ ایک لاکھ نوری سال تک کے فاصلہ کو دیکھ لیتی ہے، اس واسطے بعض ایسے

ایسے ستارے اور کہکشائیں دریافت ہوئی ہیں جو پہلے معلوم نہیں تھیں۔

تو ٹھیک ہے، ایک لاکھ نوری سال تک تم نے دیکھ لیا اور اس میں دیکھ لیا کہ یہ ستارے ہیں، یہ کہکشائیں ہیں، لیکن اس سے آگے تو ابھی نہیں پہنچے، جہاں تک بھی پہنچو گے اور جتنے بھی آگے پہنچو گے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اب وہ حد آگئی کہ جس کے بعد آگے کچھ نہیں ہے، تو اس واسطے یہ کہنا کہ چونکہ ہمیں ابھی تک آسمان دریافت نہیں ہوا، لہٰذا آسمان کا کوئی وجود ہی نہیں، یہ بالکل غلط بات ہے۔

کوئی بھی صحیح معنی میں سائنس کا علم رکھنے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ آسمان کا وجود ناممکن ہے یا آسمان کا عدمِ وجود ثابت ہو گیا ہے۔ صرف اتنا ہے کہ وجود ابھی تک مشاہدہ میں نہیں آیا، تو آپ کے مشاہدہ میں آجانا کسی شئی کے وجود کی دلیل نہیں ہوتی، لہٰذا یہ محض قیاسات اور تخمینے ہیں، اور اللہ ﷻ کا کلام اور اللہ کے رسول ﷺ کا کلام ان تمام تخمینوں سے بالاتر ہے۔

حضرت علامہ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں، یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ یہاں سے لے کر سماء دنیا تک جو کچھ بھی ہے وہ ایک طبقہ ہے، اور پھر سماء دنیا کے بعد اسی قسم کا دوسرا طبقہ ہو۔[۱۰]

تو یہ جو سارے کے سارے تخمینے لگائے جاتے ہیں یہ صرف اپنے زعم کے مطابق ہیں، اب بھی سائنسدان اس بات کے معترف ہیں کہ اتنے اونچے جانے کے بعد بھی ابھی تک ہم کائنات کا کروڑواں حصہ بھی دریافت نہیں کر سکے، کیونکہ جتنا دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کائنات کی وسعت تو لامتناہی نظر آتی ہے، اور کہتے ہیں کہ ابھی تک ایسے ستارے موجود ہیں کہ جب سے وہ پیدا ہوئے ہیں اس وقت سے ان کی روشنی مسلسل سفر میں ہے، آج تک زمین تک نہیں پہنچی۔ تو اب اندازہ لگاؤ کہ اس کائنات کا آغاز انہی کے اندازوں کے مطابق ایک کروڑ سال تصور کر لیا جائے، واللہ اعلم، تو ایک کروڑ نوری سال سے بھی آگے ستارے ہیں جن کی روشنی ابھی بھی زمین تک نہیں پہنچی۔

سائنس عاجز ہے

اس وسعت کو اگر آدمی اپنی ان چھوٹی سی دوربینوں سے، چھوٹی سی آنکھوں سے اور چھوٹی سی عقل سے سمجھنے کی کوشش کرے تو یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ تو وہی بتائے گا جس نے اس کائنات کو پیدا کیا، یا جس نے اس کائنات کا علم کسی ہستی (نبی کریم ﷺ) کو عطا فرمایا، لہٰذا ان تخمینوں کی بنیاد پر قرآن وحدیث کا انکار کرنا یا ان

---

[۱۰] قولہ: سماء : انکر وجودہ المتنوّرون، وقالوا لیس فوقنا الاجوہراً لطیفاً غیر متناہ، والنجوم تجری فیہا سابحۃ بنفسہا، قلت: ولا دلیل علیہ عند ہم، لم لا یجوز أن یکون ہذا الجو علی طبقات، کل طبقۃ منہا تسمی سماء، حتی تکون سبع سموٰت کما أخربہ النص، فیض الباری، ج: ۲، ص: ۳.

میں تأویل کرنا کہ یہ حقیقت پر محمول نہیں ہیں، بلکہ مجاز پر محمول ہیں، یہ کوئی عقل کی بات نہیں۔ جو کچھ حضور اقدس ﷺ اور قرآن کریم نے فرمایا وہ برحق ہے اور ساری سائنس اپنے سارے کرشمے دکھانے کے بعد بھی اس تک بعض اوقات پہنچنے سے عاجز ہو جاتی ہے تو اس وقت اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ پہلے غلط سمجھ رہے تھے، اب حقیقتِ حال واضح ہوئی ہے۔

"سنريهم آيتنا في الآفاق وفي انفسهم حتى يتبيّن لهم انه الحق"۔

تو کسی بھی بنیاد پر قرآن و حدیث میں تأویل کرنا یہ صحیح موقف نہیں ہے، لہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ آسمان باقاعدہ جسمانی وجود رکھتا ہے۔

آگے فرمایا ﴿ **فاذا رجل قاعد** ﴾ وہاں سماء دنیا پر میں نے جا کے دیکھا کہ ایک صاحب بیٹھے ہیں "**على يمينه اسودة وعلى يساره اسودة**" ان کے دائیں بھی کچھ جماعتیں ہیں اور بائیں بھی کچھ جماعتیں ہیں "**اسودة**" جمع "**سواد**" کی ہے، سواد جماعت کو کہتے ہیں، وہ صاحب جب دائیں طرف دیکھتے ہیں تو ہنستے ہیں اور جب بائیں طرف دیکھتے ہیں تو روتے ہیں، انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا "**مرحباً بالنبی الصالح والابن الصالح**" میں نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا، یہ کون ہیں؟ انہوں نے کہا کہ یہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور دائیں بائیں جو لوگ بیٹھے ہیں یہ ان کی اولاد کی روحیں ہیں، ان میں سے جو دائیں طرف بیٹھے ہیں یہ اہل جنت ہیں اور جو بائیں طرف بیٹھے ہیں یہ اہل جہنم ہیں، اس لئے جب دائیں طرف دیکھتے ہیں تو ہنستے ہیں اور جب بائیں طرف دیکھتے ہیں تو روتے ہیں اور پہلے آسمان پر آدم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی اور ان کے دائیں بائیں ان کی اولاد تھی۔

ارواح پہلے آسمان پر کیسے پہنچیں؟

سوال: سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ روحیں وہاں کیسے پہنچ گئیں، کیونکہ دوسری روایات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ارواح کا مستقر خود قبر ہوتی ہے یا اہل جنت کے لئے علیین ہے اور اہل جہنم کے لئے سجین ہے، تو یہاں سماء دنیا پر ساری روحیں کیسے جمع ہو گئیں؟

جواب: اس میں شراح حدیث بڑے حیران و پریشان رہے ہیں اور بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ ایسا لگتا ہے کہ ویسے تو ان کا مستقر وہی ہے جو دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے یعنی قبر یا علیین یا سجین، لیکن اس خاص موقع پر حضور اقدس ﷺ کو دکھانے کے لئے تمام ارواح کو سماء دنیا پر جمع کر لیا گیا اور یہ اتفاقی واقعہ تھا، اس کے بعد پھر اپنے اپنے مستقر پر بھیج دی گئیں۔

اشکال: اس پر اشکال ہوتا ہے کہ مومنوں کی ارواح مان لیا کہ آسمان پر چلی گئیں لیکن کافروں کے

بارے میں تو کہا گیا ہے **"لا تفتح لهم ابواب السماء"** آسمان کے دروازے ان کے لئے نہیں کھولے جاتے، تو پھر ان کی روحیں کیسے پہنچ گئیں؟

پہلا جواب: اس کا جواب یہ دیا کہ یہ حضور اقدس ﷺ کو دکھانے کے لئے ایسا کیا اور **"علی سبیل الاستثناء"** سب داخل کر دی گئیں۔

دوسرا جواب: بعض حضرات نے دوسرا جواب دیا کہ درحقیقت یہ روحیں ان ابنائے آدم کی تھیں جو آئندہ آنے والے تھے اور جو پیدا ہو چکے تھے اور جو مر گئے تھے وہ نہیں تھے، لہٰذا اس میں اس بات کا سوال نہیں ہے کہ وہ کیسے قبروں سے یا اپنے مستقر سے اُٹھ کر آ گئے بلکہ وہ تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے تھے، اس وجہ سے ان کی روحیں دکھا دی گئیں، جیسے حضرت آدم علیہ السلام کو سب انسانوں کی روحیں ان کے پیدا ہونے سے پہلے دکھا دی گئی تھیں۔[۱۱]

تیسرا جواب: مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم کہ اس ساری تدقیق کی ضرورت نہیں، یہ واقعات جو حضور اقدس ﷺ کو معراج کے موقع پر دکھائے گئے اس میں بہت سے واقعات کا تعلق عالمِ مثال سے ہے، اور عالم مثال میں جو چیز دکھائی جاتی ہے وہ بسا اوقات حقیقت میں جو چیز ہوتی ہے اس کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ عالم مثال میں یہ کچھ ہو رہا ہے۔ یہ بات سمجھنے کی ہے۔

اور یہ جو بعض مرتبہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص کہیں جا رہا تھا راستہ گم کر گیا اور ہلاکت تک پہنچ گیا، اچانک دیکھا کہ وہ پیر صاحب جن سے وہ بیعت تھا اور جو انتقال کر گئے تھے، وہ آئے اور ہاتھ پکڑ کر راستہ بتا گئے۔ بعض لوگ اس قسم کے واقعات کو کہتے ہیں کہ یہ سب شرک ہے، اس لئے کہ مرنے کے بعد بڑے سے بڑا پیر اور بڑے سے بڑا ولی بھی کسی کی مدد اس طرح نہیں کر سکتا، لہٰذا جو اس بات کا قائل ہو تو وہ مشرک ہے اور بعض لوگ اس کا انکار کر دیتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہونا عین ممکن ہے اور ممکن اس طرح ہے کہ درحقیقت مدد تو اللہ جل جلالہ کی طرف سے ہوتی ہے اور اللہ جل جلالہ ہی مدد فرماتے ہیں، لیکن ایک (لطیفہ غیبی) فرشتہ بھیج دیتے ہیں اور وہ ایسی شکل میں بھیج دیتے ہیں جس سے وہ شخص مانوس ہوتا ہے تاکہ اس پر وہ بھروسہ اور اعتماد کر سکے، اگر کوئی اجنبی آدمی آ جائے تو آدمی سوچتا ہے کہیں یہ مجھے لے جا کر ہلاک تو نہیں کر دیگا اس لئے کسی مانوس شکل میں بھیج دیتے ہیں اور قبر میں جو حقیقی پیر ہے اس کو پتہ بھی نہیں کہ میری کوئی شکل پہنچی ہے اور اس سے اللہ جل جلالہ نے یہ کام لیا ہے، اس کے علم، وہم وخیال میں بھی نہیں ہوتا۔

تو حقیقت میں جو کچھ بھی ہے اللہ جل جلالہ کی طرف سے ہے کسی مخلوق کی طرف سے نہیں، لیکن اللہ جل جلالہ اس نصرت کو ایسی شکل میں متشکل فرماتے ہیں جس سے وہ مانوس ہو، تو یہ عالمِ مثال ہوتا ہے، اسی طرح معراج کے

[۱۱] من أراد التفصيل فليراجع: فيض الباري، ج: ۲، ص: ۲، وفتح الباري، ج: ۱، ص: ۴۶۱.

اندر جو بہت سے واقعات پیش آئے ہیں ان کا تعلق بھی عالم مثال سے ہے اور یہ جو ارواح دائیں بائیں دکھائی گئیں، ہوسکتا ہے کہ یہ بھی عالم مثال سے ہوں اور ان روحوں کو ان کے مستقر سے منتقل نہ کیا گیا ہو، مقصود یہ تھا کہ یہ دکھایا جائے کہ آدم علیہ السلام اپنے دونوں قسم کی اولاد کو دیکھ رہے ہیں اور دائیں طرف والوں کو دیکھ کر ہنس رہے ہیں اور بائیں طرف والوں کو دیکھ کر رو رہے ہیں۔

"حتی عرج بی الی السماء الثانیة...... ولم یثبت کیف منازلهم".

پھر مجھے دوسرے آسمان کی طرف لے جایا گیا، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث مجھے سنائی تھی تو انہوں نے یہ بتایا تھا کہ ان آسمانوں میں حضرت نبی کریم ﷺ نے حضرت آدم علیہ السلام، حضرت ادریس علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا لیکن یہ نہیں بتایا کہ کون سے آسمان میں کون سے نبی تھے، یعنی اس روایت میں یہ صراحت نہیں کی، البتہ اتنا بتایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو آسمانِ دنیا میں اور ابراہیم علیہ السلام کو آسمانِ سادسہ میں پایا۔

اس حدیث میں اگرچہ صراحت نہیں ہے کہ کونسا نبی کون سے آسمان پر تھا لیکن دوسری روایات میں یہ تفصیل آئی ہے کہ پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام سے، دوسرے آسمان پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے، تیسرے آسمان پر حضرت یوسف علیہ السلام سے، چوتھے آسمان پر حضرت ادریس علیہ السلام سے، پانچویں آسمان پر حضرت ہارون علیہ السلام سے، چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔

کون سے نبی سے کس آسمان پر ملاقات ہوئی؟

پہچان کا آسان طریقہ

بعض حضرات نے اس کو یاد کرنے کے لئے کہہ دیا ہے کہ **"اعیاهم"** یہ کلمہ اگر یاد رکھو تو اس سے ترتیب یاد ہوجاتی ہے۔ **"اعیاهم"** میں پہلے ہمزہ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں، "ع" سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اس میں یحییٰ کا بھی اضافہ کرلو اور "ی" سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف، "الف" سے حضرت ادریس علیہ السلام کی طرف، "ھا" سے حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف اور "میم" سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے اور پھر آگے یہ طے ہے کہ ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے، البتہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اس روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ چھٹے آسمان میں ہیں، جبکہ دوسری تمام روایات میں یہ ہے کہ ساتویں آسمان میں ہیں اور ساتویں آسمان پر ہونے کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ وہاں یہ کہا گیا ہے کہ وہ بیت المعمور سے پشت لگائے بیٹھے تھے اور بیت المعمور کے بارے میں یہ طے ہے کہ وہ ساتویں آسمان پر ہے۔

لہٰذا وہ روایت راجح ہوئی، اس کے علاوہ اس روایت میں یہ بھی صراحت ہے کہ حضرت ابوذر غفاری ﷛ نے ترتیب پوری طرح یاد نہیں رکھی، پوی طرح نہیں بتائی اور دوسری روایتوں میں ترتیب صراحۃً بتائی گئی، **"فمن حفظہ مقدم علی من لم یحفظ"** لہٰذا جس نے ترتیب یاد رکھی ان کا قول ان لوگوں کے قول پر مقدم ہے، جنہوں نے ترتیب یاد نہیں رکھی۔ بعض حضرات نے تطبیق دینے کی کوشش کی ہے اور یہ کہا کہ سادسہ بھی صحیح ہے اور سابعہ بھی صحیح اور ہوا یہ تھا کہ حضرت ابراہیم ؈ تھے تو سابعہ پر لیکن حضور اقدس ﷺ کے استقبال کے لئے سادسہ پر آگئے اور پھر ان کے ساتھ سابعہ تک گئے لیکن اس تطبیق کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

فرمایا کہ **"قال انس فلما مرّ جبریل" الخ** اب جو **"ثم"** آرہا ہے یہ ترتیبِ حقیقی کے بیان کے لئے نہیں بلکہ یہ محض ترتیبِ بیانی کے لئے آرہا ہے۔

"ثم مررت بموسیٰ فقال مرحباً" الخ اور سب نے تو **"اخی الصالح"** کہا لیکن حضرت ابراہیم ؈ نے اور حضرت آدم ؈ نے **"الابن الصالح"** فرمایا کیونکہ حضور اقدس ﷺ براہ راست حضرت آدم ؈ اور حضرت ابراہیم ؈ کی نسل سے تھے۔

"قال ابن شھاب" یہاں تک جو روایت تھی وہ حضرت انس ﷛، حضرت ابوذر غفاری ﷛ سے روایت کررہے تھے، آگے زہری کہتے ہیں: **"فاخبرنی ابن حزم الخ"** حضرت عبداللہ بن عمرو بن حزم جو قاضی تھے اور امام زہری رحمہ اللہ کے ہمعصر تھے اور جن کو عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے تدوینِ حدیث کا حکم دیا تھا، انہوں نے مجھے بتایا کہ عبداللہ بن عباس اور ابوحبۃ الانصاری ﷛ یہ کہا کرتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ساتویں آسمان کے بعد پھر مجھے اوپر چڑھایا گیا۔ **"حتی ظھرت لمستوی"** یہاں تک کہ میں ایسی سطح تک آگیا کہ جہاں قلموں کی تحریر کی آوازیں سنتا تھا، کوئی عالم تھا جہاں پر ملائکہ اعمال لکھ رہے ہونگے یا لکھی ہوئی تقدیر کے مطابق تنفیذِ احکام لکھ رہے ہوں گے، بہر حال اللہ ﷻ ہی بہتر جانتا ہے۔

میانِ عاشق و معشوق رمزیست ۔۔۔ کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

خلاصہ یہ ہے کہ صریف الاقلام کی آواز نبی کریم ﷺ نے سنی ہے۔ **"قال ابن حزم و انس بن مالک الخ"۔**

پہلے تو عبداللہ بن عباس اور ابوحبہ انصاری ﷛ کی روایت بیچ میں داخل کردی تھی، اب حضرت انس بن مالک ﷛ اور ابن حزم کی روایت لاتے ہیں کہ **" قال النبی ﷺ ففرض الخ"**۔

میری امت پر اللہ ﷻ نے پچاس نمازیں فرض کیں، میں وہ حکم لے کر واپس آیا، یہاں تک کہ حضرت موسیٰ ؈ پر گذر ہوا تو آپ نے فرمایا: **"مافرض اللہ لک علی أمتک؟" قلت : "فرض خمسین صلوٰۃ"۔**

قال موسیٰ " فارجع الی ربک فان امتک لاتطیق ذلک".

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ کام کر کے اس امت پر شفقت فرمائی اور فرمایا کہ پچاس نمازوں کا تحمل امت نہیں کر سکے گی، واپس جا کر کم کراؤ۔

سوال: اس واقعہ سے کئی سوال پیدا ہوتے ہیں، ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ جل جلالہ کو معاذ اللہ خیال نہ آیا کہ امت کے لئے گراں ہوں گی یہاں تک کہ حضور اقدس ﷺ وہ حکم لے کر چلے بھی آئے، پھر موسیٰ علیہ السلام نے سمجھایا اور پھر واپس گئے اور جا کر کم کرائیں، تو اللہ میاں نے کم کر بھی دیں، تو یہ کیا قصہ ہے کہ جس بات کا ادراک موسیٰ علیہ السلام نے کر لیا، اللہ جل جلالہ نے فرض کرتے ہوئے نہیں کیا؟

جواب: سب کچھ علم الٰہی اور تقدیر الٰہی سے ہے لیکن بعض اوقات اللہ جل جلالہ کسی امر کی تنفیذ کے لئے ایسا طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ جس میں کسی بات کی تعلیم مقصود ہوتی ہے یا کوئی اور مصلحت مقصود ہوتی ہے، مثلاً جو عید الفطر والی حدیث ہے تو اس میں آتا ہے کہ اللہ جل جلالہ فرشتوں سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ اس مزدور کا اجر کیا ہوگا جس نے اپنا کام پورا کر لیا ہو، تو کیا اللہ جل جلالہ کو پتہ نہیں کہ کیا اجر ہوگا؟ جو فرشتوں سے پوچھ رہے ہیں، یا حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی بندہ اللہ جل جلالہ کے سامنے پیش ہوگا اور اس کی نمازوں میں نقص ہوگا تو فرشتوں سے پوچھیں گے کہ اس کے نامۂ اعمال میں نوافل بھی ہیں یا نہیں؟ یہ مطلب نہیں کہ اللہ جل جلالہ کو پتہ نہیں، وہ تو سب کچھ جانتے ہیں لیکن بعض اوقات کسی امر کی تنفیذ کے لئے طریقہ ایسا اختیار کیا جاتا ہے جو عام آدمی کی سمجھ کے قریب ہو جاتا ہے۔

دراصل بات یہ تھی کہ شروع ہی سے پانچ نمازوں کو فرض کرنا تھا اور یہی مقصود بھی تھا اور یہی اللہ جل جلالہ چاہتے بھی تھے، لیکن اس تک پہنچنے کے لئے یہ طریقہ اختیار فرمایا۔ کئی مصلحتیں سمجھ میں آتی ہیں اور کئی ایسی بھی ہوں گی جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔

ایک مصلحت یہ ہے کہ امت کو پتہ چل جائے کہ اصل تو یہ بات تھی کہ تمہارے اوپر پچاس ہونی چاہیئے تھیں لیکن پانچ ہو گئیں تو اللہ جل جلالہ کا شکر ادا کرو، اب کم از کم ان پانچ کو تو ٹھیک سے پڑھ لو، اگر شروع ہی سے پانچ نمازیں فرض کی جاتیں تو یہ احساس پیدا نہ ہوتا۔

دوسری یہ کہ اللہ جل جلالہ نے فرمایا ہے کہ یہ تو پانچ نمازیں ہیں لیکن ثواب پچاس ہی کا ملے گا، تو یہ مزید کرم بالائے کرم کہ اس واقعہ کے نتیجہ میں پانچ نمازوں پر پچاس کا اجر ملے گا، پھر اس سے موسیٰ علیہ السلام کا اس امت پر شفقت کا مظاہرہ ہوا، یہ ساری حکمت تو وہ ہے جو ظاہری طور پر نظر آرہی ہے اور نہ جانے کتنی ہوں گی، ان حکمتوں کی بناء پر تنفیذ کا یہ طریقہ اختیار فرمایا اور شروع ہی سے علمِ الٰہی اور تقدیر الٰہی میں وہی پانچ نمازیں ہی فرض کرنی مقصود بھی تھیں۔

سوال: سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے علاوہ کسی کو خیال نہ آیا، ابراہیم علیہ السلام نے بھی نہیں ٹوکا؟

پہلا جواب: اس کی بھی بہت سی حکمتیں ہوں گی جو اللہ ﷻ جانتے ہیں، لیکن علماء کرام نے جو باتیں بیان فرمائیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اور سارے انبیاء کرام کا تعلق اللہ ﷻ کے ساتھ ایسا تھا، جس میں تادیب کا پہلو بہت غالب تھا اس کی وجہ سے اللہ ﷻ کے ساتھ براہ راست مکالمہ اور تبادلۂ کلام کی ان کو ہمت نہیں ہوتی تھی، لیکن موسیٰ علیہ السلام کو یہ خصوصیت بخش دی گئی تھی کہ وہ "**کلم اللّٰہ موسیٰ تکلیماً**" تھے کہ ان کو اللہ ﷻ سے براہ راست کلام کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا اور اللہ ﷻ سے باتوں میں ذرا بے تکلفی بھی کر لیتے تھے، ہر ایک کی شان الگ اور رنگ الگ ہوتا ہے، تو بے تکلفی کا مظاہرہ بھی کر لیتے تھے، لہٰذا ان کو یہ خیال آ گیا۔

دوسرا جواب: دوسری بات یہ کہ اپنی امت یعنی بنی اسرائیل جس سے سابقہ پڑا تھا اس کے رنگ ڈھنگ دیکھ چکے تھے اور ان کو تجربہ ہو چکا تھا کہ ان پر ذرا کوئی حکم شاق ہوتا تھا تو ان کی کیا کیفیت ہوتی تھی تو اس واسطے انہوں نے کہا۔

تیسرا جواب: بعض حضرات نے ایک اور لطیف بات بھی کہی ہے، وہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ ﷻ سے کہا تھا "**رب ارنی انظر الیک**" تو اللہ ﷻ نے فرمایا "**لن ترانی**" تو "**لن ترانی**" کا مطلب یہ ہے کہ رؤیت سے انکار کر دیا گیا اور بے ہوش ہو کر گر پڑے، اور رؤیت نہ ہو سکی اور نبی کریم ﷺ جب معراج میں تشریف لے گئے تو باقاعدہ رؤیت ہوئی جیسا کہ علماء کرام کی ایک بڑی جماعت اس بات کی قائل ہے کہ رؤیت ہوئی ہے، آگے "کتاب التوحید" میں ان شاء اللہ تعالیٰ تفصیل آئے گی۔

اہلِ عشق کے لئے عجیب نکتہ

تو موسیٰ علیہ السلام نے سوچا کہ میری تو رؤیت ہو نہ سکی اور ان کو رؤیت کا شرف عطا ہو گیا، تو میں اگر اس کو نہ دیکھ سکوں جس کو دیکھنا چاہتا ہوں تو کم از کم اس کو تو دیکھ لوں جس نے اس کو دیکھا ہے، اس واسطے سوچا کہ بار بار جائیں اور پھر بار بار آئیں تو اس سے مجھے بالواسطہ اللہ ﷻ کی رؤیت کا شرف حاصل ہوتا رہے گا، یہ نکتہ بھی بعض لوگوں نے بیان کیا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

آگے فرمایا "**فراجعت فوضع شطرها**" میں گیا تو اللہ ﷻ نے اس کا ایک حصہ کم کر دیا "**شطر**" کے معنی اصل میں ایک حصہ کے ہوتے ہیں، بعض مرتبہ اس کا اطلاق نصف پر بھی آتا ہے اور بعض مرتبہ مطلق حصہ پر ہوتا ہے، تو یہاں مراد نصف حصہ نہیں بلکہ مراد بعض حصہ ہے، چونکہ دوسری روایات کی روشنی میں راجح یہ ہے کہ پانچ پانچ کر کے کمی ہوئی، یہاں تک کہ پانچ تک آ گئیں۔

"فقال راجع ربک" الخ

آخر میں جب میں پہنچا تو اللہ ﷻ نے فرمایا "**هنّ خمس و هنّ خمسون**" کہ پانچ ہیں لیکن اجر

کے اعتبار سے یہ پانچ نمازیں پچاس کے حکم میں ہوں گی اور یہ بھی فرمایا **"لایبدل القول لدیّ"** قول میرے سامنے بدلتا نہیں، اس کا کیا معنی؟ اس کا ظاہری معنی تو یہ ہے کہ جب میں نے پچاس کہہ دی تو پچاس ہی ہیں یعنی اجر کے اعتبار سے اور باطنی طور پر اس طرف بھی اشارہ تھا کہ بس اب آگے نہیں بدلا جائے گا۔ **"فرجعت الیٰ موسیٰ فقال"**......

انہوں نے پھر کہا واپس جایئے، تو میں نے کہا کہ مجھے شرم آ گئی اور ساتھ میں **"لایبدل القول لدیّ"** میں لطیف اشارہ تھا کہ بس اب اسی پر معاملہ مستقر ہوگا اس لئے آپ پھر تشریف نہیں لے گئے۔

سوال:

بعض علماء سے بحوالہ مرقات سنا ہے کہ حضور ﷺ کی ملاقات تمام انبیاء کرام علیہم السلام سے سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اجسام مثالیہ کے ساتھ ہوئی؟

جواب:

یہ بحث آگے آئے گی ان شاء اللہ وہاں عرض کروں گا، ویسے دونوں قول ہیں، بعض حضرات کہتے ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی ملاقات اجسام مثالیہ سے ہوئی، بعض نے کہا کہ حقیقیہ سے ہوئی ہے، زیادہ تر علماء اہل سنت والجماعت اس طرف گئے ہیں کہ اجسام حقیقیہ سے ہوئی ہے، لیکن اپنے مقامات سے اُٹھ کر کیسے گئے ہیں یہ بحث ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

آگے فرمایا **"ثم انطلق حتی انتھی بی إلی سدرۃ المنتھی"** پھر مجھے لے جایا گیا یہاں تک کہ سدرۃ المنتہیٰ تک مجھے پہنچا دیا گیا، سدرۃ المنتہیٰ ایک درخت ہے آسمانِ سابع سے اوپر کہیں اس کی جڑیں ہیں اور اس کی شاخیں عرش الٰہی تک گئی ہیں۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا فرمان

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے بعض روایات کی روشنی میں یہ معلوم ہوا ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ سے نیچے یعنی یہ دنیا اور دنیا کے بعد سات آسمان یہ سارا عالم جہنم ہے اور ہم جس پر بیٹھے ہیں یہ بھی جہنم ہے **"العیاذ باللہ العلی العظیم"** اس قول کے مطابق یہاں سے لے کر ساتوں آسمان تک سارا جہنم ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ وقت آئے گا (اللہ جل جلالہ معاف کرے) یہ سب جہنم ہوگا اور ساتویں آسمان سے اوپر جنت کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے اور پھر وہ غیر متناہی ہے، اللہ جل جلالہ ہی جانے کہاں تک گیا وہ سارا جنت کہلاتا ہے۔ تو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سدرۃ المنتہیٰ اس لئے کہتے ہیں کہ جہاں تک اس کی جڑیں ہیں وہاں جہنم کے علاقے کا منتہیٰ ہے۔

پھر فرمایا کہ مجھے وہاں تک لے جایا گیا۔ **"فغشیها الوان لاادری ماهی"** یعنی سدرۃ المنتہیٰ کو ایسے رنگ ڈھانپے ہوئے تھے کہ جن کی حقیقت کا کسی کو پتہ نہیں یعنی جتنے رنگ ہم نے دنیا میں دیکھے ہیں، جانتے ہیں کہ یہ سرخ ہے، یہ سبز یا ہرا ہے لیکن وہ سارے الوان عجیب وغریب تھے کہ ان کے لئے انسانی لغت نے کوئی الفاظ وضع نہیں کئے تھے۔

"ثم ادخلت الجنة الخ" پھر مجھے جنت میں داخل کیا گیا، تو میں نے دیکھا کہ اس میں موتی کی لڑیاں اور ہار ہیں اور اس کی مٹی مشک ہے۔

''حبائل'' کا مطلب

"حبائل" کیا چیز ہے؟ بعض نے کہا ہے یہ حبائل سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا لفظ ہے، کیونکہ حبائل عام طور پر جو استعمال ہوتا ہے وہ **"حبیلة"** کی جمع ہے جو جال کو کہتے ہیں جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ **"النساء حبائل الشیطان"** کہ عورتیں شیاطین کے پھینکے ہوئے جال ہیں۔ اب موتی کے جال کیسے ہونگے؟

بعض نے کہا کہ یہاں تصحیف ہوگئی ہے اصل میں جنابذ تھا حبائل نہیں تھا اور جنابذ جنبذ کی جمع ہے، اور جنبذ ''قبہ'' کو کہتے ہیں، تو **"جنابذ اللؤلؤ"** کے معنی موتیوں کے قبے ہوئے، لیکن دوسرے حضرات نے کہا کہ کوئی مشکل بات نہیں ہے جس طرح حبائل جمع حبیلہ کی آتی ہے اسی طرح جمع حبالہ کی بھی آتی ہے جس کے معنی لڑیاں، قلادۃ اور ہار کے آتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے کسی مقام پر لٹکے ہوئے ہار دیکھے تو فرمایا کہ اس میں موتیوں کے ہار ہیں اور اس کی مٹی مشک ہے۔

حدیثِ اسراء جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں روایت کی ہے اس کی باقی تفصیل معراج کے واقعہ میں آئے گی جو اس کا صحیح محل ہے۔

۳۵۰ ۔ حدثنا عبد اللہ بن یوسف قال : أخبرنا مالک عن صالح بن کسیان عن عروۃ بن الزبیر ، عن عائشة أم المؤمنین قالت : فرض اللہ الصلاۃ حین فرضها رکعتین رکعتین في الحضر و السفر فأقرت صلاۃ السفر و زید في صلاۃ الحضر . [أنظر : ۱۰۹۰ ، ۳۹۳۵] [۱۲]

---

[۱۲] وفی صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین وقصرها، باب صلاۃ المسافرین وقصرها، رقم: ۱۱۰۵، وسنن النسائی کتاب الصلاۃ ، باب کیف فرضت الصلاۃ ، رقم : ۴۴۹ ، وسنن أبی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ المسافر، رقم: ۱۰۱۳، ومسند أحمد، باقی مسند الأنصار، باب باقی المسند السابق، رقم: ۲۴۷۷۶، ۲۴۸۴۹، ۲۵۰۸۰، ۲۵۱۳۳، وموطأ مالک، کتاب النداء للصلاۃ، باب قصر الصلاۃ فی السفر، رقم: ۳۰۴، وسنن الدارمی، کتاب الصلاۃ، باب قصر الصلاۃ فی السفر، رقم: ۱۴۷۰.

مشروعیتِ نماز کا ابتدائی حصہ

یہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ اللہ ﷻ نے جب نماز فرض کی تھی تو سفر و حضر دونوں میں دو دو رکعتیں فرض کی تھیں یعنی تمام نمازیں دو دو تھیں سوائے مغرب کے کہ وہ تین تھیں، "**فاقرت صلوٰۃ السفر و زید فی صلوٰۃ الحضر**" پھر سفر کی نماز تو اپنے حال پر برقرار رکھی گئی اور حضر کی نماز میں اضافہ کر دیا گیا، یعنی حضر کی نماز دو رکعتوں کے بجائے چار رکعتیں کر دی گئیں۔[۱۳]

سفر میں قصر کرنا عزیمت ہے

اس حدیث سے حنفیہ نے استدلال کیا ہے کہ سفر میں قصر عزیمت ہے، رخصت نہیں، لہٰذا سفر میں قصر واجب ہے، اتمام جائز نہیں، اس واسطے کہ اس حدیث میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ سفر میں بھی اور حضر میں بھی اصل رکعتیں دو ہی فرض کی گئی تھیں، تو سفر کی حالت میں دو رکعتیں برقرار رہیں اور حضر میں اضافہ ہو گیا۔[۱۴]

معلوم ہوا کہ سفر میں جو دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں وہ اپنی اصل پر ہیں اور اس میں کوئی کمی نہیں کی گئی، جس کی بنا پر یہ کہا جائے کہ وہ رخصت تھی۔ یہ مسئلہ ان شاء اللہ تعالیٰ "**ابواب تقصیر الصلوٰۃ**" میں سفر کی نماز میں تفصیل سے آئے گا۔

ضعیف استدلال

یہاں اس حدیث کے بارے میں صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ حنفیہ نے اس سے استدلال کیا ہے لیکن

---

[۱۳] **وقد یخطر بالبال أن ماروته عائشة رضی اللہ عنها محمول علی الزمان الذی کان یصلی فیه الصلاتین فقط، الفجر والعصر، وذلک قبل الاسراء ولعلها کانتا اذ ذاک رکعتین رکعتین کما وصفتها، فلما فرضت فی الاسراء، فرضت ابتداء علی الشاکلة التی رواها ابن عباس رضی اللہ عنهما الخ، فیض الباری، ج: ۲، ص: ۶.**

[۱۴] **واحتج أصحابنا بهذا الحدیث، أعنی: قول عائشة رضی اللہ عنها، المذکور فی هذا الباب، علی أن القصر فی السفر عزیمة لا رخصة، وبما رواه مسلم أیضاً عن مجاهد عن ابن عباس، قال: فرض اللہ الصلاة علی لسان نبیکم فی الحضر أربع رکعات، وفی السفر رکعتین، وفی الخوف رکعة ورواه الطبرانی فی معجمه بلفظ: "افترض رسول اللہ ﷺ رکعتین فی السفر کما افترض فی الحضر أربعاً. وبما رواه النسائی وابن ماجه عن عبدالرحمٰن بن أبی لیلی عن عمر ؓ. قال: صلاة السفر رکعتان، وصلاة الأضحی رکعتان وصلاة الفطر رکعتان، وصلاة الجمعة رکعتان، تمام غیر قصر علی لسان نبیکم محمد ﷺ ورواه ابن حبان فی: صحیحه ولم یقدحه بشی، عمدة القاری، ج: ۳، ص: ۲۵۶.**

استدلال اتنا قوی نہیں، اس کی ایک وجہ تو حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ دوسری روایتوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شروع میں بیشک دو دو رکعتیں تھیں لیکن جب معراج میں پانچ نمازیں فرض کی گئیں تو اس میں چار رکعتیں ہی فرض کی گئیں تو گویا حضر کے اندر دو رکعتوں سے چار رکعتیں ہوگئیں اور وہ کہتے ہیں کہ قصر کا حکم مدینہ طیبہ میں آیا تو ایسا نہیں ہے کہ سفر کی نماز اپنی جگہ برقرار رہی ہو اور پھر فوراً حضر میں اضافہ ہو گیا ہو، بلکہ بیچ میں فاصلہ ہے کہ ایک زمانہ ایسا آیا جب کہ سفر کا کوئی حکم تھا ہی نہیں، اس واسطے کہ قصر کے احکام نہیں آئے تھے اور حضر کی نماز میں اضافہ کر کے چار کر دی گئیں، پھر مدینہ طیبہ میں قصر کے احکام آئے تو اس وقت میں چار کو پھر دو کی طرف منتقل کر دیا گیا، اس واسطے اس سے استدلال پوری طرح واضح نہیں۔[۱۵]

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی رائے

اور دوسری اس وجہ سے کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ''فیض الباری'' میں فرمایا کہ مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرما رہی ہیں کہ شروع میں دو دو رکعتیں فرض تھیں بعد میں چار کی گئیں، اس سے مراد وہ دو رکعتیں ہیں جو اسراء کے واقعہ سے پہلے مسلمان عشاء کی نماز میں پڑھا کرتے تھے، تو اس وقت دو دو رکعتیں تھیں لیکن جب اسراء کا واقعہ پیش آیا تو اس وقت میں دو دو رکعتوں کے بجائے چار رکعتیں ہی فرض کی گئیں۔

تو اس واسطے یہ جو واقعہ بیان کر رہی ہیں یہ فرضیتِ صلوٰۃ خمسہ سے پہلے کا ہے کہ دو دو رکعتیں پڑھی گئیں لہٰذا اس سے استدلال اتنا واضح اور تام نہیں ہے، حنفیہ کے پاس دوسرے دلائل ہیں جو ان شاء اللہ تعالیٰ متعلقہ باب میں آجائیں گی۔[۱۶]

(۲) باب وجوب الصلاة في الثياب

کپڑے پہن کر نماز پڑھنا فرض ہے

وقول الله تعالى: ﴿ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ [الأعراف: ۳۱]

و من صلى ملتحفا في ثوب واحد، ويذكر عن سلمة بن الأكوع أن النبي ﷺ قال: "يزره ولو بشوكة"، في إسناده نظر، ومن صلى في الثوب الذى يجامع فيه مالم ير أذى،

---

[۱۵] راجع: فتح الباری، ج: ۱، ص: ۴۶۴، دار المعرفة، بیروت.

[۱۶] انظر: حاشیہ ۱۳

وأمر النبی ﷺ أن لا يطوف بالبيت عريان.

۳۵۱ ۔ حدثنا موسى بن إسماعيل قال : حدثنا يزيد بن إبراهيم ، عن محمد ، عن أم عطية قالت : أمرنا أن تخرج الحيض يوم العيدين وذوات الخدور فيشهدن جماعة المسلمين ودعوتهم ، ويعتزل الحيض عن مصلاهن ، قالت امرأة : يا رسول الله إحدانا ليس لها جلباب ، قال : "لتلبسها صاحبتها من جلبابها"، وقال عبد الله بن رجاء : حدثنا عمران قال : حدثنا محمد بن سيرين قال : حدثتنا أم عطية : سمعت النبي ﷺ بهذا. [راجع : ۳۲۴]

مقصود امام بخاری رحمہ اللہ

"باب وجوب الصلاۃ فی الثیاب" الخ

یہ باب قائم فرمایا "باب وجوب الصلاۃ فی الثیاب وقول اللّٰہ تعالیٰ: "خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ" مقصد یہ ہے کہ پہلے باب میں نماز کی فرضیت کا بیان تھا کہ نماز کب فرض ہوئی ؟ کس طرح فرض ہوئی ؟ اور اب یہاں سے امام بخاری رحمہ اللہ نماز کی جو شرائط ہیں، ان کا بیان شروع کر رہے ہیں، ان میں سب سے پہلے اہم شرط ستر عورت ہے، ستر عورت نماز کی صحت کے لئے لازم ہے، تو اس واسطے اب ستر عورت کے متعلق ابواب آرہے ہیں، پہلا باب ہے "باب وجوب الصلوٰۃ فی الثیاب" اس کا مقصد یہ ہے کہ ستر عورت ضروری ہے اور کپڑے پہن کر نماز پڑھنا ضروری ہے، اس کے بارے میں ترجمۃ الباب میں آیت ذکر کی ہے کہ "خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ" تمام مفسرین کے نزدیک زینت سے مراد لباس ہے یعنی ہر مسجد کے پاس تم لباس پہن کر جایا کرو، اور یہ اس سیاق میں نازل ہوئی کہ مشرکین بعض اوقات بالکل ثلاثی مجرد ہو کر طواف کرتے تھے، کپڑے نہیں پہنتے تھے۔ وہ (مشرکین) کہتے تھے کہ ہم بیت اللہ کا طواف اس لباس میں نہیں کریں گے جس لباس میں گناہ کئے ہیں، تو یہ صرف حمس کے لئے جائز ہے (یعنی عرب کے بعض وہ قبائل جو مجاورِ بیت اللہ تھے یعنی بیت اللہ کے قریب رہ کر اس کی خدمت بھی کرتے تھے تو اس کو حمس کہا جاتا تھا) ان میں قریش، کنانہ وغیرہ چند قبائل تھے جن میں قریش بھی داخل ہیں۔

حمس اس لئے کہا جاتا تھا کہ مجاور ہونے کی وجہ سے ان کے کچھ مخصوص احکام انہوں نے خود بنا کر اپنے اوپر عائد کر رکھے تھے، مثلاً گوشت نہیں کھاتے تھے اور جب حج کو جاتے تھے تو وقوف عرفات نہیں کرتے تھے بلکہ مزدلفہ میں وقوف کرتے تھے کیونکہ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم بیت اللہ کے مجاور ہیں، لہٰذا حرم سے باہر نہیں جائیں گے اور عرفات چونکہ حرم سے باہر ہے اس واسطے وقوف عرفات میں کرنے کی بجائے مزدلفہ میں کرتے تھے، اس طرح

کے بہت سے احکام اپنے لئے مقرر کر رکھے تھے۔

حُمس کے ساتھ عرب کا عقیدہ

حُمس کے بارے میں عرب کا عقیدہ تھا کہ حُمس کے لئے تو جائز ہے کہ اپنے لباس میں وہ طواف کریں، کیونکہ انہوں نے اپنے اوپر ایسی پابندیاں عائد کی ہیں جس کی وجہ سے وہ گناہ نہیں کرتے حالانکہ بہت کچھ کرتے تھے لیکن جن کو وہ گناہ سمجھتے تھے تو وہ نہیں کرتے، یہ لوگ اپنے لباس میں طواف کر سکتے تھے اور اگر دوسرے قبیلہ کا کوئی آدمی آئے تو وہ ان (حمس) کا لباس اگر پہن لے تو طواف کر سکتا ہے یعنی حُمس میں سے کسی کا لباس مستعار لے کر طواف کر سکتا ہے لیکن اگر نہ تو خود حمس میں سے ہو، نہ حُمس کے کپڑے ملے ہوں تو پھر بہتر یہ ہے کہ عریاں ہو کر طواف کرے، چنانچہ جو لوگ عرب کے مختلف علاقوں سے حج یا عمرہ کرنے کے لئے آتے تھے تو پہلے وہ کوشش کرتے تھے کہ حُمس میں سے کسی کے کپڑے مل جائیں، اگر کسی کو مل گئے تو وہ کپڑے پہن کر طواف کرتا اور اگر کپڑے نہ ملتے تو وہ اپنے کپڑے سے دستبردار ہو کر ثلاثی مجرد ہو کر طواف کرتا، تو ان کا یہ طریقہ تھا، آیت کریمہ **"خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ"** نے اُس طریقہ کو منع فرمایا اور حکم دیا کہ مسجد کے نزدیک اپنا لباس اختیار کرو اور طواف کرو۔

طوافِ عریاں کی ممانعت

حضور اقدس ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ۹ ھ میں جو احکام حج دے کر بھیجا تھا تو اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا **"لا يطوف بالبيت عريان"** کہ اب کوئی آدمی بیت اللہ کا ننگا طواف نہیں کرے گا۔

امام بخاری رحمہ اللہ یہاں اس آیتِ کریمہ اور حدیث کو لا کر ترجمۃ الباب میں اس بات پر استدلال کر رہے ہیں کہ جب طواف کے اندر کپڑے پہننے کو ضروری قرار دیا گیا، حالانکہ طواف ایسی عبادت ہے جس میں پابندیاں کم ہوتی ہیں تو نماز کے اندر بطریقِ اولیٰ کپڑے پہننا ضروری ہوگا کیونکہ نماز کی پابندیاں طواف کے مقابلے میں زیادہ ہیں، تو فرمایا **قول الله عزوجل: "خذوا زينتكم عند كلّ مسجدٍ"** آگے فرمایا **"ومن صلّى ملتحفاً في ثوب واحد"** یہ بتلانا مقصود ہے کہ اصل جو نماز کی شرط ہے وہ سترِ عورت ہے کہ آدمی کے عورت کا حصہ ہے وہ ڈھکا ہوا ہو اور ساتھ میں مسنون یہ ہے کہ جسم کے باقی اعضاء جو عورت نہیں ہیں، وہ بھی ڈھکے ہوئے ہوں۔

مقصود اصلی سترِ عورت ہے، کپڑوں کی تعداد کی قید نہیں

یہ مقاصد جس طرح بھی حاصل ہو جائیں اس میں کپڑوں کی تعداد کی کوئی قید نہیں ہے کہ ایک کپڑا ہو یا

دو ہوں یا تین ہوں بلکہ اگر سارے جسم کو چھپا لیا گیا تو بس وہ مقصد حاصل ہوگیا، لہٰذا اگر ایک کپڑے کے اندر بھی کوئی نماز پڑھے تو اس میں لپٹ کر نماز پڑھنا جائز ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ تنبیہ اس لئے فرمائی کہ بعض روایات میں ایک کپڑے کے اندر لپٹ کر نماز پڑھنے کو منع کیا گیا ہے یعنی اس میں اشتمال الصماء سے منع کیا گیا ہے لیکن اشارہ کر دیا گیا کہ جو منع کیا گیا ہے وہ اس وجہ سے نہیں کہ کپڑوں کی کوئی تعداد نماز کیلئے مقرر ہے بلکہ اس لئے منع کیا گیا ہے کہ اشتمال الصماء کے اندر آدمی بالکل اس طرح ایک کپڑے کے اندر ہاتھ پاؤں کو اس طرح سے بند کر لے کہ اگر کسی ضرورت کے وقت نکلنا پڑے تو پھنس جائے، تو یہ امر ارشاد کا ہے ورنہ فی نفسہ نماز کے اندر اگر ایک ہی کپڑا ہو اور وہ ساتر ہو تو وہ کافی ہے، پھر ایک کپڑے میں بھی نماز ہو جاتی ہے۔ تو اس میں تین مختلف حالتیں ہیں جن کو امام بخاری رحمہ اللہ نے تین مختلف ابواب میں بیان کیا ہے۔

پہلی حالت:- ایک حالت یہ ہے کہ کپڑا بہت کشادہ ہو یعنی ایک کپڑا یا ایک چادر ہے لیکن وہ بہت کشادہ ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب آدمی اس کو اوڑھے اور اس کا ایک پلو ایک کندھے پر ڈال دے تاکہ پورا جسم چھپ جائے اور کوئی حصہ کھلا ہوا نہ رہے۔

دوسری حالت:- اگر وسیع ہے لیکن بہت زیادہ وسیع نہیں بلکہ متوسط درجے کا ہے تو اس صورت میں اگر کندھے پر ڈالے گا تو عین ممکن ہے کہ کندھے کے نیچے تک زیادہ نہیں جا رہا ہو تو کسی وقت کھل کر گر جانے کا امکان ہے ایسی صورت میں اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دونوں پلو لے کر باہر قفا کے اوپر دونوں کو آپس میں باندھ لے تاکہ گرنے کا اندیشہ نہ رہے۔

تیسری حالت:- اگر کپڑا تنگ ہے تو اب اگر اس کو اوپر لے جائیگا تو تنگ اتنا ہے کہ وہ دونوں کاندھوں پر نہیں آئے گا تو اس صورت میں بجائے اس کے کہ پورا جسم ڈھانکے، پھر صرف تہبند کے طور پر استعمال کر لے یعنی ازار کے طور پر اس کو نیچے باندھ لے اور ناف سے اوپر کا حصہ کھلا رہے تو بھی نماز ہو جائے گی۔

چنانچہ پہلا باب جو امام بخاری رحمہ اللہ نے یہاں آگے قائم کیا ہے **"باب عقد الإزار علی القفا فی الصلوٰۃ"** اور دوسرا باب **"باب الصلوٰۃ فی الثوب الواحد ملتحفاً بہ"**۔

" قال الزھری فی حدیثہ : الملتحف المتوشح ، وھو المخالف بین طرفیہ علی عاتقیہ، وھو الإشتمال علیہ منکبیہ ، قال : وقالت أم ھانی : التحف النبی ﷺ بثوب ، وخالف بین طرفیہ علی عاتقیہ۔ "

یہ اس صورت میں ہے جب کہ بہت کشادہ ہو، اور جب متوسط ہو تو **"عقد الأزار علی القفا فی الصلوٰۃ"** اور پھر آگے تیسرا باب قائم کیا ہے کہ **"باب اذا کان الثوب ضیّقا"** یعنی کپڑا تنگ ہو تو اس

صورت میں صرف اِزار کے طور پر استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

خلاصۂ بحث

خلاصہ یہ ہے کہ حتی الامکان آدمی کو چاہئے کہ "تَسَتُّر" جتنا زیادہ کر سکے اتنا بہتر ہے۔ اگر چہ فرض تو یہ ہے کہ صرف عورت کا تستر ہو جائے لیکن جتنا اس سے زیادہ تستر کر سکتا ہو تو وہ کر لے۔ کپڑوں کی تعداد کی کوئی قید نہیں ہے۔ **"ویذکر عن سلمة بن الاکوع أن النبی ﷺ قال: یزره ولو بشوکه"** یعنی حضرت سلمۃ بن الاکوع رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر آدمی ایک کپڑے کے دو پلووں میں لپٹا ہوا ہے تو ایسے کپڑے کے اندر بٹن لگا لے، چاہے کانٹے ہی کا کیوں نہ ہو یعنی دو پرت کپڑے کے اندر ایسے ہیں کہ ان کو اگر ایک کے اوپر کر لے گا تو رکوع میں جاتے وقت یا سجدے میں جاتے وقت ان کے ہٹ جانے کا احتمال ہے۔ تو ان دونوں کے کناروں کو آپس میں ایک دوسرے سے باندھ لے جیسے بٹن لگائے جاتے ہیں، چاہے ایک کانٹے کے ذریعے کیوں نہ ہو۔ **"وفی اسناده نظر"** لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس حدیث کی سند میں کلام ہے۔

حالت مجامعت میں پہنے ہوئے کپڑے کا حکم

"ومن صلّى فی الثوب الذی یجامع فیه"

اس میں بھی اور ترجمۃ الباب میں بھی یہ مسئلہ بیان کر دیا گیا ہے کہ اگر کپڑا ساتر ہے تو اس میں نماز پڑھ لینی چاہئے، اور اگر اسی کپڑے میں اپنی بیوی سے مجامعت بھی کی ہو تو بھی اس کپڑے میں نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے **"مالم یر فیه اذیً"** جب تک اس میں کوئی نجاست نہ دیکھے۔ یہ درحقیقت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا تھا کہ:

"هل کان رسول الله ﷺ یصلی فی الثوب الذی یجامعها فیه".

تو حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

"نعم اذامالم یر فیه اذیً".

ابن حبان رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور صحیح ابن حبان میں مروی ہے۔[۷۱]

منی کی نجاست پر حنفیہ کا استدلال

اس سے معلوم ہوا کہ جس کپڑے میں آدمی نے مجامعت کی ہو تو اس کے اندر نماز پڑھنا جائز ہے جبکہ اس

---

[۷۱] صحیح ابن حبان، رقم: ۲۳۳۱، ج: ۶، ص: ۱۰۱، دار النشر مؤسسة الرسالة، بیروت، سنة النشر: ۱۴۱۴ھ.

کے اندر نجاست نہ لگی ہو۔ اس سے حنفیہ منی کی نجاست پر استدلال کرتے ہیں کیونکہ یہاں ''اذی'' سے مراد منی ہے تو معنی یہ ہوا کہ اگر منی لگی ہوئی ہے تو پھر نماز نہیں پڑھ سکتے، معلوم ہوا کہ منی نجس ہے۔ [۱۸]

''**لتلبسها صاحبتها من جلبابها**'' اس حدیث کو یہاں پر لانے کا منشأ یہ ہے کہ ایک عورت نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ جس عورت کے پاس جلباب نہ ہو تو کیا وہ عید کی نماز کے لئے جا سکتی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی ساتھن (ساتھی) اس کو جلباب دے دے۔ تو یہاں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جب عورت نماز کے لئے جائے تو جلباب ضروری ہے، کیونکہ عورت کے مقامہائے عورت زیادہ ہیں، عورت کا پورا جسم عورت ہے، سوائے وجہ اور کفین کے، اس واسطے اس کے لئے جلباب بھی ضروری ہونا چاہیئے تاکہ جسم کا کوئی حصہ کھلا نہ رہے۔

(۳) بابُ عقد الإ زار على القفا في الصلوة،

نماز میں تہبند کا پشت پر باندھنے کا بیان

''**وقالَ أبُوْ حَازِمٍ عَنْ سهلٍ: صَلَّوْا مع النَّبِيِّ ﷺ عاقِدِ ا زْ رِهِمْ عَلى عَوَا تِقِهِمْ**''.

ابو حازم حضرت سہل سے روایت کرتے ہیں کہ لوگوں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز اس حالت میں پڑھی کہ انہوں نے اپنی ازاروں کو اپنے عواتق (کندھوں) پر باندھا ہوا تھا۔

۳۵۲ ـ حدثنا أحمد بن يونس قال: حدثنا عاصم بن محمد قال: حدثني واقد بن محمد، عن محمد بن المنكدر، قال صلى جابر فى إزار قد عقده من قبل قفاه، و ثيابه موضوعة على المشجب، قال له قائل: تصلي فى إزار واحد؟ فقال: إنما صنعت ذلک ليراني أحمق مثلک، و أينا كان له ثوبان على عهد النبى ﷺ؟
[أنظر: ۳۵۳، ۳۶۱، ۳۷۰] [۱۹]

۳۵۳ ـ حدثنا مطرف أبو مصعب قال: حدثنا عبدالرحمن بن أبي الموالي، عن

---

[۱۸] قوله: "ولم يرفيه أذى "وهذا ايضاً دليل على أنه ذهب الى نجاسة المنى، فيض البارى، ج: ۲، ص: ۹.

[۱۹] و فى صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب الصلاة فى ثوب واحد وصفه لبسه، رقم: ۸۰۵، وسنن أبى داؤد، كتاب الصلاة باب فى الرجل يصلى فى قميص واحد، رقم: ۵۳۸، ومسند أحمد، باقى مسند المكثرين، باب مسند جابر بن عبد اللّٰه، رقم: ۱۳۶۰۶، ۱۳۶۸۷، ۱۳۸۲۴، ۱۳۹۴۵، ۱۳۹۹۳، ۱۴۰۶۷، ۱۴۱۶۸، ۱۴۲۶۲، ۱۴۳۱۵، ۱۴۴۹۲، ۱۴۵۲۴، ۱۴۵۹۹، ۱۴۶۲۷، ۱۴۶۷۱، وموطأ مالک، كتاب النداء للصلاة، باب الرخصة فى الصلوٰة فى الثوب الواحد، رقم: ۲۹۳.

محمد بن المنكدر قال: رأيت جابر بن عبد الله يصلي في ثوب واحد، وقال: رأيت النبي ﷺ يصلي في ثوب. [راجع: ۳۵۲]

بغرض تعلیم کوئی کام کرنے کا حکم

فرماتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ایک ایسی ازار میں نماز پڑھی کہ اس کو انہوں نے اپنی گدی کے پیچھے باندھ رکھا تھا اور انہوں نے کپڑے **"مشجب"** پر ڈال رکھے تھے۔ **"مشجب"** اس کو کہتے ہیں کہ دونوں طرف تکون کی طرح تین لکڑیوں کو کھڑا کر دیتے ہیں تا کہ اس پر کپڑے ڈالے جاسکیں۔ پھر کسی کہنے والے نے کہا کہ آپ صرف ایک ہی ازار میں پڑھ رہے ہیں؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے جان بوجھ کر اس طرح اس لئے کیا تا کہ تم جیسا احمق مجھے دیکھے (اور ہم میں سے کسی کسی کے پاس حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں دو کپڑے ہوتے تھے لیکن عام طور سے ایک ہی کپڑا ہوا کرتا تھا) تا کہ لوگوں کو یہ مسئلہ معلوم ہو جائے کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنا مکروہ یا ناجائز نہیں ہے، اگرچہ سنت یہ ہے کہ آدمی ایسے کپڑوں میں نماز پڑھے کہ جن کو پہن کر دوسروں کے سامنے جاسکتا ہو، لہٰذا اگر آدمی کے پاس اچھے کپڑے ہیں تو ان کو چھوڑ کر خراب کپڑوں میں نماز پڑھنا پسندیدہ نہیں ہے، لیکن یہاں چونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو مسئلہ بتلانا مقصود تھا کہ ایسا کرنا بھی جائز ہے، اس لئے انہوں نے باوجود کپڑے وہاں پر لٹکے رہنے کے ایک کپڑے کے اندر نماز پڑھ لی۔

(۴) باب الصلوة في الثوب الواحد ملتحفا به،

صرف ایک کپڑے کو لپیٹ کر نماز پڑھنے کا بیان

قال الزهري في حديثه: الملتحف المتوشح، وهو المخالف بين طرفيه على عاتقيه، وهو الاشتمال عليه منكبيه، قال: وقالت أم هانی: التحف النبی ﷺ بثوب، وخالف بين طرفيه على عاتقيه.

۳۵۴ ــ حدثنا عبيدالله بن موسى قال: حدثنا هشام بن عروة، عن أبيه عن عمر بن ابی سلمة أن النبی ﷺ فی ثوب واحد قد خالف بين طرفيه. [أنظر: ۳۵۵، ۳۵۶] [۲۰]

---

[۲۰] وفی صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب الصلاة فی ثوب واحد وصفة لبسه، رقم: ۸۰۲، وسنن الترمذی، کتاب الصلاة باب ماجاء فی الصلاة فی الثوب الواحد، رقم: ۳۱۱، وسنن النسائی، کتاب القبلة، باب الصلاة فی الثوب الواحد رقم: ۷۵۶، وسنن أبی داؤد، کتاب الصلوة، باب جماع أثواب مایصلی فیه، رقم: ۵۳۳، وسنن ابن ماجه، کتاب اقامة الصلاة والسنة فیها، باب الصلاة فی الثوب الواحد، رقم: ۱۰۳۹، ومسند أحمد، أوّل مسند المدنیین أجمعین، باب حدیث عمر بن أبی سلمة، رقم: ۱۵۷۳۷، وموطأ مالک، کتاب النداء للصلاة، باب الرخصة فی الصلاة فی الثوب الواحد، رقم: ۲۹۱.

۳۵۵ ۔ حدثنا محمد بن المثنی قال: حدثنا یحیی قال: حدثنا هشام قال: حدثنی أبی عن عمر بن أبي سلمة أنه رأى النبي ﷺ يصلي فی ثوب واحد فی بیت أم سلمة، قد ألقی طرفيه على عاتقيه. [راجع: ۳۵۴]

۳۵۶ ۔ حدثنا عبيد بن إسماعيل قال: حدثنا أبو أسامه، عن هشام، عن أبيه أن عمر بن أبي سلمة أخبره قال: رأيت رسول الله ﷺ يصلي فی ثوب واحد مشتملا به في بيت أم سلمة واضعا طرفيه على عاتقيه. [راجع ۳۵۴]

۳۵۷ ۔ حدثنا إسماعيل بن أبي أويس قال: حدثني مالک، عن أبي النضر مولی عمر بن عبيدالله أن أباه مرة مولى أم هانی بنت ابی طالب أخبره أنه سمع أم هاني بنت أبي طالب تقول: ذهبت إلى رسول الله ﷺ عام الفتح فوجدته يغتسل وفاطمة ابنته تستره، قالت فسلمت عليه، فقال: (من هذه؟) فقلت: أنا أم هانئ بنت أبي طالب، فقال: (مرحبا بأم هانئ) فلما فرغ من غسله قام فصلى ثماني ركعات ملتحفا فی ثوب واحد، فلما انصرف قلت: یارسول زعم ابن أمي أنه قاتل رجلا قد أجرته، فلان بن هبيرة، فقال رسول الله ﷺ: (قد أجرنا من أجرت يا أم هانئ)، قالت أم هانئ: وذاک ضحی. [راجع ۲۸۰]

حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر صلوٰۃ الضحیٰ پڑھنے کا واقعہ ماقبل میں گزرا ہے لیکن یہاں ایک جملہ کا اضافہ ہے کہ جب آپ ﷺ نماز پڑھ چکے تو میں نے کہا کہ "زعم ابن امّی انہ قاتل رجلا" الخ یعنی میرے بھائی نے ارادہ کیا ہوا ہے کہ وہ ایک آدمی کو قتل کرے گا حالانکہ میں نے اس کو پناہ دیدی ہے اور اس کا نام فلاں ابن ہبیرہ ہے۔

(یہ فتح مکہ کا واقعہ ہے اور یہ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کے سسرالی رشتہ دار تھے جب حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا مکہ مکرمہ میں داخل ہوئی تو انہوں نے ان کو امان دیدی، لیکن ان کے بھائی باوجود امان دینے کے اس کو قتل کرنا چاہتے ہیں) تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قد اجرنا من اجرت یا ام ھانی" کہ اے امّ ہانی جس کو تم نے امان دی ہم نے بھی اس کو امان دیدی۔ ویسے تو قاعدہ یہ ہے کہ "ذمة المسلمين واحدة يسعى بها ادناهم" تمام مسلمانوں کی ذمہ داری برابر ہے تو ادنی درجہ کا مسلمان بھی اگر کسی کو امان دیدے تو سارے مسلمانوں پر اس کی ذمہ داری واجب ہے۔ تو جب حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا نے امان دیدی تھی تو ان کے بھائی کو ان کے قتل کا ارادہ کرنا درست نہیں تھا، لیکن آنحضرت ﷺ نے مزید تاکید کے لئے فرمایا کہ ہم نے بھی اس کو امان دی تھی۔

۳۵۸ ۔ حدثنا عبد الله بن يوسف قال: أخبرنا مالک، عن إبن شهاب، عن

سعيد ابن المسيب ، عن أبي هريرة : أن سائلا سأل رسول الله ﷺ عن الصلاة في ثوب واحد ، فقال رسول الله ﷺ : (أو لكلكم ثوبان ؟) . [أنظر :۳۶۵]

(۵)باب إذا صلى في الثوب الواحد فليجعل على عاتقيه

جب ایک کپڑے کا میں نماز پڑھے، تو چاہیئے کہ اس کا کچھ حصہ اپنے شانے پر ڈال لے

۳۵۹ ــ حدثنا أبو عاصم ، عن مالک ، عن أبي الزناد ،عن عبد الرحمن الأعرج ،عن أبي هريرة قال: قال النبي ﷺ (لايصلي أحدكم في الثوب الواحد ليس على عاتقيه شئی).[أنظر: ۳۶۰] [۱۲]

۳۶۰ــ حدثنا أبو نعيم قال: حدثنا شيبان ، عن يحيى بن أبي كثير ، عن عكرمة قال: سمعته أو كنت سألته قال: سمعت أباهريرة يقول :أشهد أني سمعت رسول الله ﷺ يقول:(من صلى في ثوب فليخالف بين طرفيه). [راجع : ۳۵۹]

حدیث باب کی تشریح

پہلے حدیث میں یہ فرمایا کہ اس حالت میں نماز نہ پڑھے کہ اس کے کندھے پر کچھ بھی نہ ہو، کیونکہ دونوں طرف سے جب کندھے پر کچھ نہیں تو ایسے ہی کندھے کے نیچے ڈال دیا ہے تو جب رکوع میں جائے تو کھل جانے کا اندیشہ ہے، اس لئے دوسری آنے والی حدیث میں اس کا طریقہ بتا رہے ہیں کہ **"فليخالف بين طرفيه"**.

(۶) باب اذا كان الثوب ضيقا

جب کپڑا تنگ ہو تو کس طرح نماز پڑھے

۳۶۱ ــ حدثنا يحيى بن صالح قال: حدثنا فليح بن سليمان ،عن سعيد بن الحارث قال: سألنا جابر بن عبدالله عن الصلاة في الثوب الواحد؟فقال: خرجت مع النبي

---

[۱۲] وفی صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ فی ثوب واحد وصفۃ لبسہ، رقم: ۸۰۱، وسنن النسائی ، کتاب القبلۃ، باب صلاۃ الرجل فی الثوب الواحد لیس علی عاتقہ منہ، رقم: ۷۶۱، وسنن أبی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب جماع أثواب ما یصلی فیہ، رقم: ۵۳۱، ۵۳۲، ومسند أحمد، باقی مسند المکثرین، باب مسند أبی ہریرۃ، رقم: ۷۰۶۲، ۷۱۵۴، ۷۲۹۰، ۹۱۴۷، ۹۶۰۱، ۱۰۳۳۰، وسنن الدارمی ، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ فی الثوب الواحد، رقم: ۱۳۳۶.

ﷺ في بعض أسفاره فجئت ليلة لبعض أمري، فوجدته يصلي وعلي ثوب واحد، فاشتملت به وصليت إلى جانبه، فلما انصرف قال: (ما السرى يا جابر؟) فأخبرته بحاجتي فلما فرغت قال: (ما هذا الاشتمال الذي رأيت؟) قلت: كان ثوب قال: ((فان كان واسعا فالتحف به، وان كان ضيقا فاتزر به)). [راجع: ۳۶۱]

ثوبِ واحد میں نماز کا حکم

سعید بن حارث رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت جابر ﷺ سے ہم نے پوچھا کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

انہوں نے کہا کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ اپنے کسی کام سے کسی سفر میں تھا، ایک رات میں آپ ﷺ کے پاس آیا "**فوجدته يصلي وعلي ثوب واحد**" اور صرف ایک ہی کپڑا تھا "**فاشتملت به**" میں اس میں لپٹا ہوا تھا "**وصليت الى جانبه**" اور آپ کے برابر میں کھڑے ہو کر نماز شروع کر دی "**قال ما السرى يا جابر**" کہ آپ ﷺ نے کہا اے جابر! رات کو آنے کا کیا مقصد ہے؟

سُریٰ کہتے ہیں رات کے وقت میں چلنا، تو یہ تم کیوں آئے ہو؟ "**فاخبرته بحاجتی فلما فرغت قال ما هذا الاشتمال الذی رأيت**"؟ یہ جو تم ایک ہی کپڑے میں لپٹ کر نماز پڑھ رہے تھے کیا بات تھی؟ تو میں نے کہا "**كان ثوب**" میرے پاس ایک ہی کپڑا تھا "**قال فان كان واسعاً فالتحف به، فان كان ضيقاً فاتزر به**".

آپ نے فرمایا کہ اگر کپڑا واسع ہو تب تو اس میں اس طرح لپٹ جاؤ کہ وہی دونوں طرف ڈال لو اور اگر تنگ ہو تو پھر یہ تکلف کرنے کی ضرورت نہیں، اس کو ازار بنا کر استعمال کر لو تا کہ جو عورت ہے وہ چھپ جائے اور جو حصہ اوپر کا ہے وہ ننگا رہے تو بھی کوئی حرج نہیں۔

۳۶۲۔ حدثنا مسدد قال: حدثنا يحيى عن سفيان قال: حدثني أبو حازم، عن سهل قال: كان رجال يصلون مع النبي ﷺ عاقدي أزرهم على اعناقهم كهيئة الصبيان وقال للنساء: لا ترفعن رؤسكن حتى يستوي الرجال جلوسا. [أنظر: ۸۱۴، ۱۲۱۵] [۲۲]

---

[۲۲] وفي صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب أمر النساء المصليات وراء الرجال أن لا يرفعن، رقم: ۶۶۵، وسنن النسائي، كتاب القبلة، باب الصلاة في الازار، رقم: ۷۵۸، وسنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب الرجل يعقد الثوب في قفاه ثم يصلي، رقم: ۵۳۵، ومسند أحمد، مسند المكيين، باب من مسند سهل بن سعد الساعدي، رقم: ۱۵۰۱۱، وباقي مسند الأنصار، باب حديث أبي مالک سهل بن سعد الساعدي، رقم: ۲۱۷۴۴.

شریعت کی دور اندیشی

حضرت سہل بن ساعد ؓ فرماتے ہیں کہ لوگ نبی کریم ﷺ کے ساتھ اس حال میں نماز پڑھا کرتے تھے کہ انہوں نے اپنی ازاریں اپنی گردنوں پر باندھی ہوئی تھیں **"کھیئۃ الصبیان"** جیسے بچوں کو مائیں باندھ دیتی ہیں تا کہ بچہ گرے نہیں۔ اور عورتوں سے کہا جاتا ہے کہ **"لا ترفعن رؤسکن حتی یستوی الرجال جلوسا"** کہ تم اپنے سر اس وقت تک سجدے سے نہ اٹھانا جب تک مرد بیٹھ نہ جائیں یعنی جب مرد آگے نماز پڑھ رہے ہوں اور پیچھے عورتیں نماز پڑھ رہی ہوں تو ایسی صورت میں عورتوں کو کہا جاتا تھا کہ تم اپنا سر اس وقت تک سجدہ سے نہ اٹھانا جب تک مرد بیٹھ نہ جائیں اور اس سے مقصد یہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مرد کی عورت (شرمگاہ) کا کوئی حصہ ظاہر ہو جائے۔

سوال: بعض لوگ مساجد میں نماز کے لئے ٹوپیاں رکھتے ہیں جبکہ وہ ٹوپی عام حالات میں نہیں پہنتے۔

جواب: آدمی کو چاہئے کہ اپنی ٹوپی خود اپنے پاس رکھے، لیکن اگر بالفرض اس وقت کسی کے پاس ٹوپی نہیں ہے، تو دو خرابیاں لازم آئیں گی۔

(۱) وہ ننگے سر نماز پڑھے۔

(۲) ایسی ٹوپی میں نماز پڑھے جو عام طور سے وہ نہیں پہنتا۔

ان میں پہلے کے مقابلہ میں دوسری خرابی اھون ہے اس لئے ننگے سر پڑھنے کے مقابلے میں بہتر ہے کہ وہی لیلے اور نماز پڑھ لے، لیکن (حقیقت میں) دونوں باتیں غلط ہیں۔

لفظ ''ابن'' کے پڑھنے میں ایک اہم غلطی پر تنبیہ

سوال:- یہ سوال کیا جاتا ہے کہ عام طور پر فضائل اعمال کی تعلیم میں حدیث بیان کرتے وقت اور اردو پڑھتے وقت ''عبداللہ ابن مسعود ؓ'' کہتے ہیں حالانکہ یہ صحیح نہیں، اس وجہ سے عربی میں بھی پڑھتے ہیں؟

جواب:- اردو اور فارسی میں اس لئے غلط نہیں ہے کہ اس میں اعراب کا لحاظ نہیں ہوتا کیونکہ یہاں ہر حالت میں مضاف مکسور ہوتا ہے، خواہ اعرابی حالت کوئی بھی ہو جیسے ابنِ مسعود ؓ، ابنِ عمر ؓ وغیرہ۔

اس واسطے وہاں پر کسی غلط معنی کا احتمال نہیں، بخلاف عربی کے کہ یہاں حالاتِ اعرابیہ مختلف ہوتی ہیں، ذرا سے اعراب کے فرق سے یعنی زیر و زبر سے معنی میں زمین و آسمان کی تبدیلی ہو جاتی ہے۔

لہٰذا جب عربی میں پڑھ رہے ہوں اور **"عبدُ اللّٰہ"** حالت رفعی میں ہو تو اس وقت میں ابنِ پڑھنا بالکل حرام ہے، لیکن جب آدمی اردو یا فارسی میں بولے تو اس کی گنجائش ہے۔

(۷) باب الصلاة في الجبة الشامية،

جبہ شامیہ میں نماز پڑھنے کا بیان

"وقال الحسن في الثياب ينسجها المجوسي: لم يربها بأسا، وقال معمر: رأيت الزهري يلبس من ثياب اليمن ما صبغ بالبول، وصلى علي في ثوب غير مقصور".

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب جبہ شامیہ میں نماز پڑھنے کے حکم کے بارے میں قائم کیا ہے اور اس میں حدیث بھی وہ لے کر آئے ہیں جس میں نبی کریم ﷺ کا شام کے بنے ہوئے جبّے میں نماز پڑھنا مذکور ہے۔

ترجمۃ الباب سے امام بخاریؒ کا مقصود

اس ترجمۃ الباب سے تین مسائل متعلق ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود ان تینوں مسئلوں کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

پہلا مسئلہ: کفار کے ساتھ وضع قطع میں مشابہت کا حکم

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ کفار کی وضع قطع کا لباس پہننا جائز ہے یا نہیں کہ جو عام طور سے کفار پہنتے ہیں؟

اس مسئلہ کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ لباس ان (کفار) کا شعار ہے تب تو وہ پہننا جائز نہیں جیسا کہ ہندوؤں کی دھوتی اور زنار (یہ ان کا شعار ہے) یہ پہننا جائز نہیں، لیکن اگر شعار نہیں ہے بلکہ عادۃً پہنتے ہیں اور عادت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اور کافر اس جگہ میں سب ہی پہنتے ہیں، تو پھر اس کے پہننے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

دوسرا مسئلہ: کفار کے بنائے ہوئے کپڑوں کا حکم

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کفار کا بنایا ہوا لباس چاہے اس کی وضع قطع کچھ بھی ہو، یعنی کپڑا انہوں نے بنایا اور بُنا اور خود سلائی کی تو کافر کے ہاتھ اُس کو لگ گئے اور کافر کا اس کی صنعت میں دخل ہے، آیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جائز ہے، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے شام کا بُنا ہوا جبہ پہنا، جب کہ شام میں اس وقت کافروں کی حکومت تھی اور وہ کرتہ شام کا بُنا ہوا تھا۔[۲۳]

---

[۲۳] وكان هذا في غزوة تبوك، والشام إذ ذاك كانت بلاد كفر، ولم تفتح بعد، وإنما أولنا بهذا لأن الباب معقود لجواز الصلاة في الثياب التي تنسجها الكفار مالم تتحقق نجاستها. عمدة القاری، ج: ۳، ص: ۲۸۰.

تیسرا مسئلہ: کفار کے استعمال شدہ کپڑوں کا حکم

اور تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ کافروں کے لباس میں یہ احتمال ہوتا ہے کہ شاید وہ نجس ہو، کیونکہ کافر نجاست اور طہارت کا خیال نہیں کرتے، تو احتمال ہے کہ وہ نجس ہو، تو ایسی صورت میں اس کا پہننا جائز ہے یا نہیں؟

اس میں فقہائے کرام نے تفصیل یوں کی ہے کہ اگر کپڑا نیا ہے، وہاں سل کر یا بُن کر آیا ہے اور کسی کا مستعمل نہیں ہے تو ظاہر حال یہ ہے کہ وہ پاک ہوگا، جب تک اس پر کسی نجاست کا ظن غالب یا یقین نہ ہو جائے تو اس کا پہننا جائز ہے اور جو کپڑا مستعمل ہو، یعنی کافروں نے اس کو استعمال کیا ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ پہلے اس کو دھولیا جائے، کیونکہ ظن غالب یہ ہے کہ جب استعمال کیا ہوگا تو کسی وقت نجاست لگی ہوگی، تو اس کو پہلے دھویا جائے پھر اس کو استعمال کیا جائے۔[۲۴]

"وقال الحسن فی الثیاب ینسجها المجوسی لم یر بها باسا" حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا جو کپڑے مجوسی لوگ بُنتے ہیں ان کے پہننے میں حرج نہیں۔

"وقال معمر رأیت الزهری یلبس من ثیاب الیمن ما صبغ البول"۔

حضرت معمر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے زہری کو دیکھا کہ وہ یمن کے ایسے کپڑے پہنتے تھے جو پیشاب سے رنگے ہوئے ہوتے تھے اور پھر ظاہر ہے کہ وہ پہن کر نماز بھی پڑھتے ہونگے۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہاں بعض لوگوں نے کہا ہے کہ بول سے مراد **"بول مایؤکل لحمہ"** ہے۔ اور امام زہری **"بول مایوکل لحمہ"** کی طہارت کے قائل تھے، لہٰذا اس سے رنگے ہوئے کپڑوں میں نماز پڑھنے کو جائز سمجھتے تھے، لیکن حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام زہری رحمہ اللہ بھی اِن لوگوں میں سے ہیں جو **"بول مایؤکل لحمہ"** کو طاہر نہیں سمجھتے تھے، لہٰذا یہ تأویل درست نہیں ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ ابتدا میں کپڑے اگر چہ پیشاب سے رنگے گئے تھے، لیکن جب امام زہری رحمہ اللہ کے پاس آئے ہوں گے تو امام زہری رحمہ اللہ نے اس کو دھویا ہوگا اور دھو کر پہنا ہوگا، تو اصلاً اگر چہ پیشاب سے رنگے گئے تھے، لیکن بعد میں مسلمان اس کو دھو کر پہنتے تھے۔ فرض کریں کہ اگر کسی کافر نے کپڑے پر نجاست لگا بھی دی تو جب مسلمان کے پاس آئے تو اس کو دھو کر پہن لے تو جائز ہے۔

آگے فرمایا **"وصلی علی فی ثوب غیر مقصور"۔**

---

[۲۴] قلت وقال الحافظ رحمہ اللہ تعالیٰ أن الترجمة معقودة لجواز الصلاة فی ثیاب الکفار مالم تتحقق بنجاستها، وروی عن أبی حنیفة رحمہ اللہ تعالیٰ کراهیة الصلاة فیها إلا بعد الغسل ،وعن مالک إلفعل یعید فی الوقت انتهیٰ مختصراً، فیض الباری، ج: ۲، ص: ۱۱۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسے کپڑے میں نماز پڑھی جو دھلا ہوا نہیں تھا (کورا کپڑا) حالانکہ کپڑا باہر یعنی غیر مسلموں کا بنایا ہوا تھا، اس کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو دھوئے بغیر انہوں نے نماز پڑھ لی۔

۳۶۳۔ حدثنا یحیی قال: حدثنا أبو معاویة، عن الاعمش، عن مسلم، عن مسروق، عن مغیرة بن شعبة قال: کنت مع النبي ﷺ في سفر فقال: (یا مغیرة، خذ الا داوة) ، فأ خذ تها، فا نطلق رسول اللہ ﷺ حتی تواری عني فقضی حاجته و علیه جبة شامیة، فذهب لیخرج یده من کمها فضاقت، فأخرج یده من أسفلها فصببت علیه فتوضأ وضوء ه للصلاة ومسح علی خفیه ثم صلی. [راجع: ۱۸۲]

حدیث کا مطلب

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا" خذ الا داوة " یہ مشکیزہ لے لو میں نے لے لیا اور آپ ﷺ چلے یہاں تک کہ مجھ سے چھپ گئے۔ آپ ﷺ نے قضاء حاجت فرمائی اور آپ ﷺ پر ایک شامی جبہ تھا۔ آپ ﷺ نے اس کی آستین سے ہاتھ مبارک نکالنا چاہا، لیکن وہ تنگ پڑگئی تو آپ ﷺ نے اپنا دستِ مبارک اس کے نیچے سے نکال لیا پھر میں نے آپ ﷺ پر پانی ڈالا تو آپ ﷺ نے وضو فرمایا۔ گو یہاں مقصود یہ ہے کہ آپ ﷺ نے جبہ شامیہ زیب تن فرمایا اور اس کی آستین بھی تنگ تھیں اور اتنی تنگ تھیں کہ اوپر چڑھا نہیں سکے تو آپ ﷺ نے ہاتھ باہر نکالے۔

(۸) باب کراهیة التعري في الصلاة

نماز میں اور غیر نماز میں ننگے ہونے کی کراہت کا بیان

۳۶۴۔ حدثنا مطر بن الفضل قال: حدثنا روح قال: حدثنا زکریا بن اسحاق قال: حدثنا عمرو بن دینار قال: سمعت جا بر بن عبداللہ یحدث أن رسول اللہ ﷺ کان ینقل معهم الحجارة للکعبة وعلیه إزاره، فقال له العباس عمه: یا ابن أخي، لو حللت إزارک فجعلت علی منکبیک دون الحجارة، قال: فحله فجعله علی منکبیه، فسقط مغشیا علیه، فما رؤ ي بعد ذلک عریا نا ﷺ [أنظر: ۱۵۸۲، ۳۸۲۹] ۲۵

حضور ﷺ قریش کے ساتھ کعبہ کے لئے پتھر اُٹھا اُٹھا کر لا رہے تھے (یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب

۲۵ وفي صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب الاعتناء بحفظ العورة، رقم: ۵۱۴، ۵۱۵، ومسند أحمد، باقي مسند المکثرین، باب مسند جابربن عبداللہ، رقم: ۱۳۶۲۶، ۱۳۸۱۳، ۱۴۰۵۱، ۱۴۵۳۷.

قریش نے آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے کعبۃ اللہ کی تعمیر کی تھی تو اس تعمیر کے وقت میں آپ ﷺ بچے تھے آپ ﷺ بھی اس تعمیر میں شامل تھے اور پتھر اٹھا کر لا رہے تھے۔)

"وعلیہ إزارہ" اور آپ ﷺ کے اوپر ازار تھی، تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو آپ ﷺ کے چچا ہیں، انہوں نے کہا **"یا ابن اخی لو حللت إزارک"** کہ آپ ﷺ اپنا ازار کھول لیں اور اپنے منکبین مبارکین پر رکھ لیں **"دون الحجارۃ"** پتھروں کو روکنے کے لئے کیونکہ پتھر کندھے پر رکھنے کی وجہ سے خراش پیدا کرتا ہے، اس وجہ سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم اپنی ازار کھول کر یہاں رکھ لو تا کہ پتھر اس کے اوپر رکھ سکو اور تمہارے جسم کو تکلیف نہ پہنچے **"قال فحلّہ"** آپ ﷺ نے ان کے کہنے پر کھول دیا اور اپنے کندھے مبارک پر ازار رکھ لیا۔

"فسقط مغشیا علیہ" فوراً آپ ﷺ پر غشی طاری ہوگئی اور آپ ﷺ گر گئے **"فما رؤی بعد ذلک عریانا"** اس کے بعد آپ ﷺ کو عریاں نہیں دیکھا گیا۔

چچا کے کہنے پر آپ ﷺ نے یہ عمل تو کیا لیکن عمل کرنے کے نتیجے میں تعری لازم آئی تھی اور اللہ جل جلالہ نے آپ ﷺ کی حفاظت فرمائی تھی تو اس واسطے آپ ﷺ کو بعثت سے پہلے ایسے امور سے محفوظ رکھا جو باعث عار ہوتے ہیں، اس واسطے غشی طاری ہوگئی اور گویا اس عمل کو جاری نہ رکھ سکے۔

انبیاء قبل البعثت بھی معصوم ہوتے ہیں

اس سے معلوم ہوا کہ انبیائے کرام علیہم السلام بعثت سے پہلے بھی معصوم ہوتے ہیں۔ اللہ جل جلالہ کی طرف سے ان کی حفاظت ہوتی ہے، البتہ اس میں کلام ہوا ہے کہ آیا صغائر اور کبائر دونوں سے معصوم ہوتے ہیں یا صرف کبائر سے۔ اس کے متعلق دونوں قول ہیں اللہ جل جلالہ ہی بہتر جانتے ہیں، لیکن ظاہر یہ ہے کہ دونوں قسم کے گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں اور باعث ننگ و عار کاموں سے معصوم رکھا جاتا ہے۔

وضاحت

یہ وہ واقعہ نہیں جس میں آپ ﷺ نے حجر اسود رکھا تھا۔ یہ واقعہ اس سے پہلے کا ہے جس میں کعبۃ اللہ کی مرمت وغیرہ کی جا رہی تھی، لیکن حجر اسود کو رکھ کر جو نزاع ختم کیا تھا وہ بعثت سے پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے۔

(۹) باب الصلاۃ في القمیص والسراویل والتبان والقباء

قمیص، سراویل، تبان اور قبا میں نماز پڑھنے کا بیان

۳۶۵ ۔ حدثنا سلیمان بن حرب قال: حدثنا حماد بن زید، عن أیوب، عن محمد، عن أبی ھریرۃ قال: قام رجل إلی النبي ﷺ فسألہ عن الصلوۃ في الثوب الواحد، فقال:

(أكلكم يجد ثوبين؟)، ثم سأل رجل عمر فقال: إذا وسع الله فأوسعوا، جمع رجل عليه ثيابه، صلى رجل في إزار و رداء، في إزار و قميص، في إزار و قباء، في سراويل و رداء، في سراويل و قميص، في سراويل و قباء، في تبان و قباء، في تبان و قميص، قال: وأحسبه قال: في تبان و رداء. [راجع: ۳۵۸]

۳۶۶ ۔ حدثنا عاصم بن علي قال: حدثنا ابن أبي ذئب، عن الزهري، عن سالم، عن ابن عمر، قال: سأل رجل رسول الله ﷺ فقال: (لا يلبس القميص، ولا السراويل، ولا البرنس، ولا ثوبا مسه زعفران ولا ورس، فمن لم يجد نعلين فليلبس الخفين، و ليقطعهما حتى يكونا أسفل من الكعبين) وعن نافع عن ابن عمر عن النبي ﷺ مثله. [راجع: ۱۳۴]

مقصود بخاری رحمہ اللہ

"تبـــان" کہتے ہیں جانگیا کو (نیکر، کچھا) جس میں آدھی رانوں تک کپڑا ہوتا ہے اور آدھی رانیں کھلی ہوتی ہیں، اس کو جانگیا بولتے ہیں۔ یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ جانگیا پہن کر بھی نماز پڑھ سکتے ہیں بشرطیکہ اس کے ساتھ کوئی کپڑا بھی ہو جو عورت کے لئے ساتر ہو مثلاً قباء، تاکہ رانیں بھی ڈھک جائیں اور رانوں کا حکم آگے مستقل باب میں آرہا ہے۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "اذا وسع الله فاوسعوا" جب اللہ جل جلالہ نے وسعت دی ہے تو وسعت پر عمل کرو، یعنی پھر ایک کپڑا پہن کر نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں بلکہ زیادہ کپڑے استعمال کرے۔

"جمع رجل عليه ثيابه" یعنی ایک شخص نے اپنے اوپر کپڑے جمع کر کے رکھے تھے، تو کسی نے ازار اور رداء میں نماز پڑھی، کسی نے ازار اور قمیص میں پڑھی، کسی نے ازار اور قباء میں پڑھی، کسی نے سراویل اور قمیص میں پڑھی، کسی نے سراویل اور قباء میں پڑھی۔ ساتھ میں تبان بھی تھا جہاں بھی تبان ہے وہاں اس کے ساتھ کوئی اور چیز ضرور ہوتی ہے قمیص یا رداء، تو تنہا تبان میں پڑھنا کہیں ثابت نہیں۔

(۱۰) باب ما يستر من العورة

ستر عورت کا بیان

۳۶۷ ۔ حدثنا قتيبة بن سعيد قال: حدثنا ليث، عن ابن شهاب، عن عبيدالله بن عبدالله بن عتبة، عن أبي سعيد الخدري أنه قال: نهى رسول الله ﷺ عن اشتمال الصماء وأن يحتبي الرجل في ثوب واحد ليس على فرجه منه شيء. [أنظر: ۱۹۹۱، ۲۱۴۴،

۲۱۴۷، ۵۸۲۰، ۵۸۲۲، ۶۲۸۴] ۲۶

”اشتمالُ الصَّمَاء“ کی تفسیر اور حکم

”**اشتمال الصّماء**“ اس کو کہتے ہیں کہ آدمی ایک کپڑے میں اپنے آپ کو اس طرح لپیٹ لے اور اپنے آپ کو بالکل اس طرح بند کرلے کہ جس میں نہ ہاتھ ہلا سکتا ہو اور نہ پاؤں ہلا سکتا ہو۔

آنحضرت ﷺ نے ”**اشتمال الصّماء**“ سے صرف نماز ہی میں نہیں بلکہ عام حالات میں بھی منع فرمایا ہے، کیونکہ عام حالات میں اگر آدمی بیٹھا ہے، اچانک آگ لگ جائے یا بچھو یا سانپ آجائے تو اس وقت آدمی کو اس کپڑے سے نکلنا بہت مشکل ہو جائے گا، اس واسطے اس سے منع کیا گیا ہے۔

”**وأن يحتبي الرجل في ثوب واحد ليس على فرجه منه شيء**“ اور دوسرے اس سے منع کیا گیا ہے کہ کوئی شخص ایک کپڑے میں اس طرح ”احتباء“ کرلے کہ اس کی فرج پر کوئی چیز نہ ہو۔

”احتباء“ کا طریقہ اور اس سے وجہ ممانعت

”احتبــــاء“ اس کو کہتے ہیں کہ عرب لوگ بعض اوقات گھٹنے کھڑے کر کے کمر کے ساتھ کسی کپڑے کو ایسے باندھتے تھے کہ پھر نیچے فرج پر کوئی کپڑا نہ رہتا تھا اور بعض اوقات ہاتھوں کو بھی باندھ لیتے تھے، کہ ذرا کوئی حرکت کرے تو کشفِ عورت ہوگا اس واسطے اس سے منع فرمایا۔

۳۶۸ ــ حدثنا قبيصة بن عقبة قال: حدثنا سفيان، عن أبي زناد، عن الأعرج، عن أبي هريرة قال: نهى النبي ﷺ عن بيعتين، عن اللماس و النباذ، و أن يشتمل الصماء، و أن يحتبي الرجل في ثوب واحد. [أنظر ۵۸۴، ۵۸۸، ۱۹۹۳، ۲۱۴۵، ۲۱۴۶، ۵۸۱۹، ۵۸۲۱] ۲۷

---

۲۶ وفي سنن النسائي، كتاب الزينة، باب النهي عن اشتمال الصماء، رقم: ۵۲۴۵، ۵۲۴۶، وسنن أبي داؤد، كتاب الصوم، باب في صوم العيدين، رقم: ۲۰۶۴، وسنن ابن ماجه، كتاب اللباس، باب مانهي عنه من اللباس، رقم: ۳۵۴۹، ومسند أحمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند ابي سعيد الخدري، رقم: ۱۰۵۹۹، ۱۰۶۷۲، ۱۰۹۹۸، ۱۱۲۰۴.

۲۷ وفي سنن الترمذي، كتاب البيوع عن رسول الله، باب ماجاء في الملامسة والمنابذة، رقم: ۱۲۳۱، وسنن النسائي كتاب البيوع، باب بيع الملامسة، رقم: ۴۴۳۳، ۴۴۳۷، ۴۴۳۱، وسنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب ماجاء في النهي عن المنابذة والملامسة، رقم: ۲۱۶۰، وكتاب اللباس، باب مانهي عنه من اللباس، رقم: ۳۵۵۰، ومسند أحمد، باقي مسند المكثرين، باب باقي المسند السابق، رقم: ۷۹۰۳، ۸۵۷۹، ۹۰۶۶، ۹۲۱۴، ۹۵۴۷، ۹۶۰۳، ۹۷۶۴، ۹۸۳۸، ۹۹۷۵، ۱۰۰۳۷، ۱۰۱۳۱، ۱۰۲۱۴، ۱۰۳۳۲، ۱۰۴۲۶، وموطا مالک، كتاب البيوع، باب الملامسة والمنابذة، رقم: ۱۱۷۶، وكتاب الجامع، باب ماجاء في لبس الثياب، رقم: ۱۴۳۱.

۳۶۹ ـ حدثنا إسحاق قال : حدثنا يعقوب بن إبراهيم قال : حدثنا ابن أخي ابن شهاب ، عن عمه قال : أخبرني حميد بن عبد الرحمٰن بن أن أبا هريرة قال : بعثني أبو بكر في تلك الحجة في مؤذنين يوم النحر نؤذن بمنى : أن لا يحج بعد العام مشرک ، و لا يطوف بالبيت عريان ، قال حميد بن عبد الرحمٰن : ثم أردف رسول الله ﷺ عليًّا فأمره أن يؤذن بـ ﴿بَرَاءَةٌ﴾ ، قال أبو هريرة : فأذن معنا علي في أهل منى يوم النحر : لايحج بعد العام مشرک و لا يطوف بالبيت عريان .
[أنظر : ۱۶۲۲ ، ۳۱۷۷ ، ۴۳۶۳ ، ۴۶۵۵ ، ۴۶۵۶ ، ۴۶۵۷] [۲۸]

مشرکین کو حج کرنے اور ننگے طواف کرنے سے ممانعت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجھے کچھ منادی کرنے والوں کے ساتھ یوم نحر کے دن بھیجا تاکہ ہم اعلان کریں کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے۔

یہ واقعہ ۹ھ کے حج کا واقعہ ہے کہ اس وقت حضور اقدس ﷺ خود تشریف نہیں لے گئے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا تھا، تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا" **ولا يطوف بالبيت عريان قال حميد بن عبد الرحمٰن : ثم أردف رسول الله ﷺ عليا فأمره أن يؤذن ببراءة** " اور نہ کوئی ننگی حالت میں طواف کرے گا۔ حمید بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پیچھے بھیجا، یعنی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پہلے بھیج دیا تھا بعد میں ان کے پیچھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔

"أردف" یہاں پیچھے بٹھانے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہاں پر اس کا معنی "اس کے بعد بھیجا" کے ہیں اور ان کو حکم دیا کہ وہ براءۃ کا اعلان کریں یعنی احکام براءت کا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یوم النحر کو منیٰ میں ہمارے ساتھ اعلان کیا تھا کہ " **لا يحجّ بعد العام مشرک و لا يطوف بالبيت عريان** ".

---

[۲۸] وفي صحيح مسلم ، كتاب الحج ، باب لايحج البيت مشرک و لا يطوف بالبيت عريان و بيان يوم الحج الأكبر ، رقم : ۲۴۰۱ ، و سنن النسائي ، كتاب مناسک الحج ، باب قوله عز و جل خذوا زينتكم عند كل مسجد رقم : ۲۹۰۸ ، ۲۹۰۹ ، و سنن أبي داؤد ، كتاب المناسک ، باب يوم الحج الأكبر ، رقم : ۱۶۶۲ ، و مسند أحمد ، باقي مسند المكثرين ، باب مسند أبي هريرة ، رقم : ۷۶۳۶ ، و سنن الدارمي ، كتاب الصلاة ، باب النهي عن دخول المشرک المسجد الحرام ، رقم : ۱۳۹۴ .

(۱۱) باب الصلاة بغير رداء

بغیر چادر کے نماز پڑھنے کا بیان

۳۷۰ ۔ حدثنا عبد العزيز بن عبد الله قال: حدثنا ابن أبي الموالي، عن محمد ابن المنكدر قال: دخلت على جابر بن عبد الله و هو يصلي في ثوب ملتحفا به، و رداؤه موضوع، فلما انصرف قلنا: يا عبدالله، تصلي و رداؤك موضوع؟ قال: نعم، أحببت أن يراني الجهال مثلكم، رأيت النبي ﷺ يصلي كذا. [راجع: ۳۵۲]

یہ وہی حدیث ہے جو پہلے بھی گزری تھی اور اس میں وہی حکم بیان کیا گیا ہے۔

(۱۲) باب ما يذكر في الفخذ

ران کے بارے میں جو روایتیں آتی ہیں ان کا بیان

و يروى عن ابن عباس و جرهد و محمد بن جحش عن النبي ﷺ (الفخذ عورة)، و قال أنس: حسر النبي ﷺ عن فخذه، و حديث أنس أسند، وحديث جرهد أحوط حتى يخرج من اختلافهم، وقال: أبوموسى: غطى النبي ﷺ ركبتيه حين دخل عثمان، وقال زيد بن ثابت: أنزل الله على رسوله ﷺ وفخذه على فخذي، فثقلت علي حتى خفت أن ترض فخذي.

"باب مايذكر فی الفخذ"

یہاں سے امام بخاری رحمہ اللہ اس مسئلہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ **"فخذ"** عورت میں داخل ہے یا نہیں؟ اور نماز میں اس کا ستر واجب ہے یا نہیں؟

اس مسئلہ میں فقہاء کرام کے درمیان اختلاف ہے۔

حنفیہ کا مسلک:

امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ دونوں کی طرف سے ایک ہی روایت ہے کہ **"فخذ"** عورت میں داخل ہے، اور حنفیہ اور شافعیہ دونوں اس بات کے قائل ہیں کہ مرد کی **"عورة ما بين السرة والركبة"** ہے، البتہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ کے درمیان اس میں اختلاف ہے کہ رکبہ اور سرّہ ستر میں داخل ہے

یا نہیں تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک رکبہ عورت میں داخل ہے لیکن سرّۃ عورت میں داخل نہیں بلکہ سرّہ سے نیچے عورت شروع ہوتی ہے۔[۲۹]

شوافع کا مسلک:

امام شافعی رحمہ اللہ اس کے برعکس فرماتے ہیں یعنی وہ سرّہ کو عورت شمار کرتے ہیں اور رکبہ کو عورت نہیں سمجھتے، لیکن ان دونوں کے درمیان کا جو حصہ ہے اس کو دونوں متفق علیہ طور پر عورت سمجھتے ہیں۔[۳۰]

حنابلہ کا مسلک:

امام احمد رحمہ اللہ سے دو روایتیں ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ "فخذ" عورت ہے اور دوسری روایت یہ ہے کہ عورت نہیں ہے۔[۳۱]

---

۲۹ - فأما الفخذ عورة عندنا ـ

ثـم بدأ الكتاب بمسائل النظر وهو ينقسم أربعة أقسام نظر الرجل إلى الرجل و نظر المرأة إلى المرأة والمرأة إلى الرجل والرجل إلى المرأة أمابيان القسم الاول فانه يجوز للرجل أن ينظر إلى الرجل إلا إلى عورته وعورته مابين سرته حتى يجاوز ركبتيه لحديث عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده رضي الله عنهم أن النبي ﷺ قال عورة الرجل مابين سرته إلى ركبته وفي رواية مادون سرته حتى يجاوز ركبته وبهذا تبين أن السرة ليست من العورة بخلاف ما يقوله أبو عصمة سعد بن معاذ أنه أحد حدى العورة فيكون من العورة كالركبة بل هو أولىٰ لأنه في معنى الاشتهاء فوق الركبة

وحجتنا في ذلك ماروى عن ابن عمرؓ أنه كان اذا اتزر أبدى عن سرته وقال أبو هريره للحسن رضي الله عنهما أرني الموضع الذي كان يقبله رسول الله ﷺ منك فأبدى عن سرته فقبلها أبو هريرةؓ والتعامل الظاهر فيما بين الناس أنهم إذا اتزروا في الحمامات أبدوا عن السرة نكير منكر دليل على أنه ليس بعورة فأما مادون السرة عورة في ظاهر الرواية للحديث الذي روينا وكان أبوبكر محمد بن الفضل رحمه الله تعالىٰ يقول إلى موضع نبات الشعر ليس من العورة أيضاً لتعامل العمال في الإبدأ عن ذلك الموضع ثم الانزار وفي النزع عن العارة الظاهرة نوع حرج.

وهذا بعيد لأن التعامل بخلاف النص لا يعتبر وانما يعتبر فيما لانص فيه،فأما الفخذ عندنا .وأصحاب الظواهر يقولون العورة من الرجل موضع السرة،وأما الفخذ ليس بعورة لقوله تعالىٰ بدت لهما سوآتهما والمراد منه العورة وفي الحديث أن النبي ﷺ كان رجل من الأنصار وقد دلى ركبته في ركية وهو مكشوف الفخذ إذ دخل أبوبكرؓ فلم يتزحزح ثم دخل عمرؓ فلم يتزحزح ثم دخل عثمانؓ فتزحزح و غطى فخذه فقيل له في ذلك فقال ألا أستحي من تستحي منه الملائكة فلو كان الفخذ من العورة لما كشفه بين يدى أبي بكر و عمر رضي الله عنهما وحجتنا في ذلك الخ ،المبسوط للسرخسي،ج:۱۰،۱۴۶.

مالکیہ کا مسلک:

امام مالک رحمہ اللہ کی طرف بھی یہ نسبت کی گئی ہے کہ وہ "فخذ" کو عورت نہیں سمجھتے ہیں، لیکن دوسری روایت ان کی یہ ہے کہ "فخذ" عورت ہے۔[۳۲]

دیگر ائمہ کا مسلک:

ائمہ اربعہ کے علاوہ علامہ ابن ابی ذئب، ابن جریر طبری اور شافعیہ میں سے علامہ اصطخری رحمہم اللہ کی طرف یہ منسوب کیا گیا ہے کہ وہ "فخذ" کو عورت قرار نہیں دیتے، ان کے نزدیک ران تک عورت نہیں ہے۔[۳۳]

لیکن تحقیق یہ ہے کہ امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ کی طرف اس مسلک کی نسبت درست نہیں کیونکہ وہ بھی "فخذ" کو جمہور کے قول کے مطابق عورت قرار دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی کتاب **"تھذیب الآثار"** میں یہ بات واضح ہے کہ "فخذ" عورت ہے، لہٰذا امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ کی طرف اس کی نسبت کرنا درست نہیں۔[۳۴]

امام مالک رحمہ اللہ کے بارے میں بھی یہ کہا گیا ہے، لیکن علامہ ابنِ رشد رحمہ اللہ نے (جو خود مالکی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں) اپنی کتاب **"بدایۃ المجتھد"** میں "فخذ" کو عورت قرار دینے کے مسئلہ میں تینوں ائمہ کرام امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام مالک رحمہم اللہ کا مسلک یہ بیان کیا ہے کہ "فخذ" عورت ہے اس کی بنا پر بعض لوگوں نے کہا کہ امام مالک رحمہ اللہ کی طرف اس قول کی نسبت درست نہیں ہے۔[۳۵]

۳۰،۳۱،۳۲،۳۳ أما القوم الذين ذهبوا إلى أن الفخذ ليس بعورة فهم: محمد بن عبدالرحمٰن بن أبي ذيب واسماعيل بن علية و محمد بن جرير الطبري و داؤد الظاهري وأحمد في رواية، ويروى ذلك أيضاً عن الأصطخري من أصحاب الشافعي حكاه الرافعي عنه.

وأما الآخرون الذين هم خالفوهم وقالوا: الفخذ عورة، فهم جمهور العلماء من التابعين ومن بعدهم، منهم: أبوحنيفة ومالك في أصح أقواله والشافعي وأحمد في أصح روايتيه وأبويوسف و محمد وزفربن الهذيل، حتى قال أصحابنا: إن الصلاة مكشوف العورة فاسدة. عمدة القاري، ج:۳، ص:۲۹۶، والمبسوط للسرخسي، ج:۱۰، ص:۱۴۶، وفتح الباري، ج:۱، ص:۴۸۱، دارالمعرفة.

۳۴ وقال الطبري في كتاب "تهذيب الآثار": والأخبار التي رويت عن النبي صلى الله عليه وسلم انه دخل عليه أبوبكر وعمر وهو كاشف فخذه، واهية الأسانيد لايثبت بمثلها حجة في الدين، والاخبار والواردة بالأمر بتغطية الفخذ والنهي عن كشفها أخبار صحاح. عمدة القاري، ج:۳، ص:۲۹۷.

۳۵ وهو حد العورة من الرجل فذهب مالك والشافعي إلى أن حد العورة منه ما بين السرة الى الركبة وكذلك قال أبوحنيفة، بداية المجتهد، ج:۱، ص:۸۳، دارالفكر بيروت.

اگر چہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے مؤطا کی شرح میں یہ لکھا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک "فخذ" عورت نہیں اور پھر خود اسی قول کو ترجیح بھی دی ہے، لیکن ابن رشد رحمہ اللہ نے "بدایۃ المجتہد" میں جہاں امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب بیان کیا ہے (حالانکہ وہ خود مالکی ہیں) وہاں انہوں نے "فخذ" کو جمہور کے قول کے مطابق عورت قرار دیا۔

تحقیق مسئلہ

میں نے خود مالکیہ کی کتابوں میں اس کی تحقیق کی، تو پتہ چلا کہ اصل میں امام مالک رحمہ اللہ کے ہاں عورت ہونے کے دو مفہوم ہیں، ایک عورت ہونے کا مفہوم ان کے نزدیک یہ ہے کہ اس کے ستر کے بغیر نماز ہی درست نہ ہو۔ اور دوسرا عورت ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا چھپانا واجب تو ہے لیکن اگر کوئی نہ چھپائے تو اس کے بغیر نماز درست ہو جائے۔

امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ وہ پہلی قسم کی عورت جس کے چھپائے بغیر نماز ہی درست نہ ہو یعنی جس کا چھپانا شرائط صحت صلوٰۃ میں سے ہے وہ صرف قُبل اور دُبُر ہیں، لہٰذا وہ یہ کہتے ہیں کہ قُبل اور دُبر اور دبر میں بھی حلقۃ الدبر یہاں تک کہ وہ کہتے ہیں کہ الیتین اگر کھلے ہوئے ہوں تو نماز صحیح ہو جائے گی اور اگر عورتین میں سے کوئی چیز کھلی ہوئی ہے جس کو عورتِ غلیظہ کہتے ہیں، تو اس صورت میں تو نماز ہی درست نہ ہوگی، لہٰذا اس کا چھپانا واجب ہوگا۔

الیتین کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ الیتین اگر کھلے ہوئے ہوں تو وقت کے اندر اندر اس نماز کا اعادہ واجب ہوگا لیکن اگر وقت گزر گیا تو اس کا اعادہ بھی واجب نہیں اور الیتین کے علاوہ یعنی "فخذ" کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ دوسری قسم کی عورت ہے یعنی اس کا چھپانا واجب ہے، عام حالات میں بھی واجب ہے اور نماز کی حالت میں بھی واجب ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس واجب کو ترک کر دے تو واجب کو ترک کرنے سے نماز کا اعادہ اس کے ذمہ واجب نہیں، نہ وقت میں اور نہ وقت کے بعد۔ یہ تفصیل امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک ہے۔

جن لوگوں نے کہا کہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک بھی عورت ہے، انہوں نے پہلا معنٰی مراد لئے ہیں اور جن لوگوں نے کہا کہ عورت نہیں ہے انہوں نے دوسرے معنٰی مراد لئے ہیں، یعنی وہ ایسی عورت قرار دیتے ہیں جس کے چھپائے بغیر نماز ہی صحیح نہ ہو، بلکہ اس کے چھپائے بغیر نماز ان کے نزدیک درست ہو جاتی ہے، البتہ اس کا چھپانا واجب ہے اگر کوئی شخص نہ چھپائے گا تو گناہ گار ہوگا لیکن نماز کی صحت اس سے متأثر نہیں ہوتی، یہ امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب کی تحقیق ہے۔[۳۶]

---

۳۶ الشرح الکبیر، ج: ۱، ص: ۲۱۴، دار الفکر، بیروت۔

خلاصۂ بحث واختلافِ مذاہب

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جمہور فقہاء "فخذ" کے عورت ہونے کے قائل ہیں، البتہ جن لوگوں کا مذہب یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ "فخذ" کے عورت ہونے کے قائل نہیں وہ محمد بن ابی ذئب رحمہ اللہ اور شافعیہ میں سے امام اصطخری رحمہ اللہ ہیں اور امام مالک رحمہ اللہ اس معنی میں عورت ہونے کے قائل نہیں کہ اس کے چھپائے بغیر نماز درست نہ ہو، بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص نہ چھپائے تو نماز درست ہو جائے گی اگر چہ گناہگار ہوگا۔

مسلۂ مذکورہ میں وجہ اختلاف

اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ احادیث میں اختلاف ہے۔ بعض احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "فخذ" عورت نہیں اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت ہے۔ [۳۷]

"فخذ" کو عورت میں داخل نہ ماننے والوں کے دلائل

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ نے جو حدیث مسنداً روایت کی ہے وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، یہی ان کی پہلی دلیل ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں کہ "**إن ركبتي لتمس فخذ النبي ﷺ ثم حسر الإزار عن فخذه حتى إني أنظر إلى بياض فخذ نبي الله ﷺ**" کہ آنحضرت ﷺ نے ازار کو اپنے "**فخذ**" مبارکہ سے ہٹا دیا یہاں تک کہ میں نے آپ کی "**فخذ**" مبارکہ کی بیاض کو دیکھا۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے "فخذ" کو کھول دیا، اگر یہ عورت ہوتی تو اس کا کھولنا جائز نہیں ہوتا، جب آپ نے اسے کھول دیا تو معلوم ہوا کہ "فخذ" کا کھولنا جائز ہے اور یہ عورت میں داخل نہیں۔

اس کے عورت نہ ہونے کے قائلین کا اس مشہور واقعہ سے استدلال ہے جو متعدد کتب حدیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ بیٹھے ہوئے تھے اور آپ کا اِزار "فخذ" سے ہٹا ہوا تھا (اسی اثنا میں) حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور آپ اسی طرح بیٹھے رہے، حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ تشریف لائے آپ ﷺ

---

[۳۷] **وقد بان بما قدمناه أنه لم يدخل على البخاري حديث في حديث بل هما قصتان متغايرتان في إحداهما كشف الركبة وفي الأخرى كشف الفخذ، والاولىٰ من رواية أبي موسىٰ وهي المعلقة هنا والأخرى من رواية عائشة ووافقها حفصة ولم يذكرهما البخاري كذا ذكره الحافظ في الفتح، ج: ۱، ص: ۴۷۹.**

اسی طرح بیٹھے رہے، لیکن جب حضرت عثمان غنی ؓ تشریف لانے لگے تو آپ نے اپنا کپڑا "فخذ" کے اوپر ڈھک لیا اور جب پوچھا گیا کہ آپ ﷺ نے پہلے دو حضرات کے آنے پر تو ڈھکا نہیں لیکن حضرت عثمان غنی ؓ کے آنے پر ڈھک لیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اس شخص سے کیوں حیا نہ کروں جس سے ملائکہ بھی حیا کرتے ہیں۔

اس روایت میں آنحضرت ﷺ کا "فخذ" کھول کر بیٹھنا مذکور ہے۔ اس سے استدلال یوں ہے کہ اگر "فخذ" عورت ہوتی تو آنحضرت ﷺ اس کو کھول کر نہ بیٹھتے، معلوم ہوا کہ یہ عورت نہیں۔

البتہ حضرت عثمان غنی ؓ کے آنے پر آپ ﷺ نے زیادہ تستر کو مناسب سمجھا، اس واسطے کہ ان کے اندر حیا بہت زیادہ تھی اور کامل الحیا والایمان تھے، تو ان کے اور ان کی حیا کے احترام کے طور پر آپ ﷺ نے زیادہ تستر اختیار فرمایا، فی نفسہٖ کھولنا جائز تھا ورنہ آپ ﷺ پہلے کھولے ہوئے نہ بیٹھے ہوتے، یہ دو روایتیں ہیں جن سے "فخذ" کے عورت نہ ہونے پر بنیادی طور پر استدلال کیا جاتا ہے۔ [۳۸]

"فخذ" کو عورت قرار دینے والوں کے دلائل

جو حضرات "فخذ" کو عورت قرار دیتے ہیں ان کے دلائل کی طرف امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب میں اشارہ کر دیا ہے اور یہ فرمایا ہے "**یروی عن ابن عباس وجرهد ومحمد بن جحش عن النبی ﷺ الفخذ عورة**" یہ تین صحابہ کرام ؓ سے مروی ہے، ایک عبداللہ بن عباس ؓ دوسرے حضرت جرہد ؓ اور تیسرے محمد بن جحش ؓ سے کہ نبی کریم ﷺ نے "فخذ" کو عورت قرار دیا ہے۔

ان میں سے جو عبداللہ بن عباس ؓ کی حدیث ہے وہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کی ہے اس میں بھی "فخذ" کے عورت ہونے کا ذکر ہے، اور دوسری حدیث جو حضرت جرہد ؓ سے مروی ہے وہ بھی امام ترمذی نے روایت کی ہے اور امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا کے بعض نسخوں میں بھی روایت کی ہے، نیز ابن حبان رحمہ اللہ نے بھی اپنی صحیح میں اسے روایت کیا ہے۔ تو جرہد ؓ کی حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ ان کے پاس سے گذرے تو ان کی ران کھلی ہوئی تھی، آپ نے ان سے فرمایا کہ "**فخذک فان الفخذ عورة او کما قال علیه الصلوٰة والسلام**" کہ اپنی "فخذ" کو ڈھانکو کہ "فخذ" عورت ہے۔

حضرت جرہد ؓ کی حدیث کو ترمذی نے حسن قرار دیا ہے، لہٰذا اس سے استدلال درست ہے۔ حضرت ابن عباس ؓ کی حدیث کو بھی امام ترمذی رحمہ اللہ نے ایک مقام پر "**حسن غریب**" کہا ہے، اور "**حسن غریب**" سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ حدیث حسن ہونے کی وجہ سے قابلِ استدلال ہے، اگرچہ بعض حضرات

---

[۳۸] شرح معانی الآثار، ج: ۱، ص: ۴۷۳، دار الکتب العلمیة، بیروت، سنة النشر ۱۳۹۹ھ۔

نے اس پر کلام کیا ہے کہ اس کے ایک راوی یحیٰ القتات ہیں جو متکلم فیہ ہیں، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ یحیٰ القتات مختلف فیہ راوی ہیں اور اسی وجہ سے امام ترمذی رحمہ اللہ نے ان کی حدیث کو صحیح تو نہیں قرار دیا، لیکن حسن قرار دیا ہے اور بعض طرق اس کے ایسے بھی ہیں کہ جن کے اوپر بعض محدثین نے صحت کا حکم لگایا ہے۔[۳۹]

تیسری روایت محمد بن جحش ﷺ کی ہے اور ان کی حدیث امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے[۴۰] مسند اور حاکم نے[۴۱] مستدرک میں روایت کیا ہے۔ اس کے اندر آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک صحابی حضرت معمر ﷺ کے پاس سے گزرے تو ان کو دیکھا کہ ان کی ران کھلی ہوئی ہے، آپ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ اپنی ران ڈھکو، آپ ﷺ نے ان کو ڈھکنے کا حکم دیا، اس حدیث سے بھی یہ بات معلوم ہوئی کہ ران کو ڈھکنا واجب ہے اور یہ عورت میں داخل ہے۔

تینوں روایتوں کے بارے میں امام بخاریؒ کا فیصلہ

ان تینوں حدیثوں کی طرف امام بخاری رحمہ اللہ نے اشارہ کیا ہے، آگے امام بخاریؒ نے یہ فرمایا:

"وقال انس حسر النبی ﷺ عن فخذہ" حضرت انس ﷺ نے یہ روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی ران سے کپڑا اٹھایا پھر آگے فرمایا کہ:

"وحدیث انس اسند وحدیث جرھد أحوط" کہ حضرت انس ﷺ کی روایت سند کے اعتبار سے زیادہ قوی ہے اور صحیح کے مرتبہ تک پہنچتی ہے، بخلاف جرہد ﷺ کی حدیث کے، کہ وہ سند کے اعتبار سے اس مقام پر نہیں جس مقام پر حضرت انس ﷺ کی حدیث ہے، لیکن ساتھ میں کہتے ہیں کہ وہ اُحوط ہے یعنی احتیاط کے زیادہ مناسب ہے کہ آدمی "فخذ" کو ڈھکے۔ انہوں نے گویا دونوں روایتوں میں ایک طرح سے تعارض قرار دیتے ہوئے کہا کہ ایک وجہ ترجیح حضرت انس ﷺ کی حدیث کو حاصل ہے یعنی سند کی قوت کے لحاظ سے۔

دوسری وجہ ترجیح حضرت جرہد ﷺ کی حدیث کو حاصل ہے، اس واسطے کہ وہ زیادہ احوط ہے، تو جرہد ﷺ کی حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے ضعیف نہیں کہا، بلکہ یہ کہا کہ سند کے اعتبار سے حضرت انس ﷺ کی روایت کے مقابلے میں کم رتبہ ہے۔

---

[۳۹] قال أبو عیسیٰ ھذا حدیث حسن ما أری اسنادہ بمتصل، سنن الترمذی، ج:۵، ص:۱۱۰، داراحیا التراث العربی، بیروت، وعمدۃ القاری، ج:۳، ص:۲۹۴.

[۴۰] مسند احمد، ج:۵، ص:۲۹۰، دارلنشر مؤشۃ قرطبۃ، مصر.

[۴۱] المستدرک علی الصحیحین، ج:۳، ص:۷۳۸، دارلکتب العلمیۃ، بیروت ۱۴۱۱ھ.

''فخذ'' کے عورت قرار دینے والوں کی طرف سے

حدیثِ انس رضی اللہ عنہ کا جواب

جو حضرات ''فخذ'' کے عورت ہونے کے قائل ہیں وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کا یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ خیبر کو جاتے ہوئے سفر کا واقعہ ہے، آنحضرت ﷺ اس وقت سوار تھے تو جب سواری پر آدمی سفر کرتا ہے تو ہوا سے اور جانور کی حرکت وغیرہ سے بسا اوقات کپڑا اپنی جگہ سے ہٹ جاتا ہے، لہٰذا یہ ''حسر'' اختیاری نہیں تھا بلکہ غیر اختیاری تھا اور اس کی دلیل یہ ہے کہ بعض روایتوں میں '' **انحسر** '' کا لفظ آیا ہے یعنی ''**انحسر الازار عن فخذه**'' اور ''**انحسر**'' کے معنی ہیں بغیر اختیار کے خود بخود کھل گیا اور ہٹ گیا۔

اگر یہ روایت لی جائے جس میں ''**حسر**'' آیا ہے تو بعض حضرات کہتے ہیں کہ مجرد میں بھی ''**حسر**'' بعض اوقات لازم کے معنی میں آتا ہے، تو یہاں ''**حسر**'' بمعنی ''**انحسر**'' ہے، اگر اس کو ''**انحسر الازار**'' پڑھا جائے یعنی ازار نبی کریم ﷺ کے ''**فخذ**'' سے کھل گیا۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ غیر اختیاری طور پر آپ کی ''**فخذ**'' مبارک کھل گئی۔ جب غیر اختیاری طور پر کھل گئی تو اس پر کسی قسم کے احکام متفرع نہیں کئے جاسکتے۔

''فخذ'' کو عورت قرار دینے والوں کی طرف سے

واقعۂ عثمان رضی اللہ عنہ کا جواب

دوسرا استدلال جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے تھا کہ آنحضرت ﷺ نے ''**فخذ**'' کھولی ہوئی تھی اور اتنے میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ آئے تو آپ نے ''**فخذ**'' ڈھک لی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت کے متن میں راویوں کا اختلاف ہے، بعض راویوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ران کھولی ہوئی تھی' اور بعض راویوں نے ''**عن فخذه او عن ساقه**'' شک کے ساتھ ذکر کیا ہے یعنی راوی کو شک ہے کہ آپ ﷺ نے ''**فخذ**'' کھولی ہوئی تھی یا ساق کھولی ہوئی تھی، چونکہ شک ہے، اس لئے شک کی حالت میں کوئی حکم مستنبط نہیں کیا جاسکتا۔ ہوسکتا ہے کہ ساق والی بات درست ہو۔

''**اذاجاء الاحتمال بطل الاستدلال**''.

ایک روایت میں یہ ہے کہ ''**رکبة**'' کھولا ہوا تھا۔ اس میں بھی ہوسکتا ہے کہ ''**رکبة**'' کا آخری حصہ

کھولا ہوا ہوا اور اس سے آگے نہ کھولا ہو، جبکہ "رکبۃ" والی روایت بڑی قوی سند کے ساتھ آئی ہے۔

اس واسطے اس سے استدلال تام نہیں، لہٰذا ان دونوں مرفوع حدیثوں سے استدلال درست نہیں جبکہ حضرت جرہد ﷺ، حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ اور حضرت محمد بن الجحش ﷺ کی حدیثیں "فخذ" کے عورت ہونے پر صریح ہیں۔

ایک عقلی دلیل اور ترجیحات کا قاعدہ

دوسرے یہ دونوں واقعے واقعات جزئیہ ہیں اور حضرت جرہد ﷺ اور حضرت محمد بن جحش ﷺ کی حدیث میں آپ نے ایک قاعدہ کا بیان فرمایا کہ "فخذ" عورت ہے اور جب کسی واقعہ جزئیہ میں اور قاعدہ کلیہ میں تعارض ہو جائے تو ترجیح ہمیشہ قاعدہ کلیہ کو ہوتی ہے پھر محرم اور مبیح میں تعارض ہو جائے تو محرم کو ترجیح ہوتی ہے۔ قولی اور فعلی میں تعارض ہو جائے تو قولی کو ترجیح ہوتی ہے۔ یہ سارے مرجحات ان کے ساتھ موجود ہیں، اس واسطے "فخذ" کے عورت ہونے کا قول زیادہ راجح ہے۔

احناف کے نزدیک "رکبۃ" عورت میں داخل ہے۔

"رکبۃ" کے سلسلے میں حنفیہ رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ رکبۃ بھی عورت میں داخل ہے، اس میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل معجم طبرانی میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے جس میں نبی کریم ﷺ کی طرف یہ جملہ منسوب کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یوں فرمایا **"فان مابین السّرة الی الرکبة عورة"** کہ "سرّہ" سے "رکبۃ" تک عورت ہے۔[۴۲]

حنفیہ کہتے ہیں کہ یہاں غایۃ مغیا میں داخل ہے۔ اس واسطے کہ قاعدہ یہ ہے کہ جب غایہ اسقاط ماعدا کیلئے آرہی ہو تو اس وقت غایہ مغیا میں داخل ہوتی ہے جیسے **"وأيديكم الى المرافق"** یہاں اگر **"الى المرافق"** نہ آتا تو ہاتھ کندھوں تک دھونا واجب ہوتا جب **"إلى المرافق"** اسقاط ماعدا کے لئے آیا ہے تو **"غاية مغيا"** میں داخل ہے، اسی طرح اگر **"إلى الركبة"** نہ ہوتا تو ماتحت السرۃ کا پورا پورا عورت ہوتا۔ یہاں **"إلى الركبة"** کا لفظ اسقاط ماعدا کیلئے آیا ہے، لہٰذا غایۃ مغیا میں داخل ہے اور **"الركبه"** عورت

---

۴۲ حدثنا محمد بن عون السيرا في بالبصرة...... قلت بعد الله بن جعفر بن أبي طالب حدثنا شيئاً سمعته من رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ما بين السرة والركبة عورة. كمارواه الطبراني في "المعجم الصغير" رقم الحديث ۱۰۳۳ ج:۲، ص:۲۰۵، دارالنشر المكتبة السلامي، دار عمار، بيروت، عمان سنة النشر ۱۴۰۵ هـ.

سمجھا جائے گا۔

"رکبۃ" عورت میں داخل نہ ہونے پر شوافع کی دلیل

اس کے برخلاف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں تین الفاظ ہیں "**فخذ، ساق**" اور "**رکبۃ**" جس میں آیا ہے وہ روایت سنداً قوی ہے۔ تو اس کی وجہ سے امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کا "**رکبۃ**" کھولنا اس بات کی دلیل ہے کہ "**رکبۃ**" عورت نہیں۔ اور وہاں وہ کہتے ہیں کہ جس روایت میں "**إلی الرکبۃ**" کہا گیا ہے' اس میں دونوں احتمال ہوتے ہیں کہ غایہ مغیا میں داخل ہو یا غایہ مغیا میں داخل نہ ہو۔ اور دوسری حدیث میں چونکہ حضور ﷺ کا "**رکبۃ**" کھولنا ثابت ہے اس واسطے ہم وہاں کہیں گے کہ غایۃ مغیا میں داخل نہیں۔ یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔[۴۳]

بہر حال فقہاء حنفیہ نے جس دلیل کی بنیاد پر رکبہ کو عورت قرار دیا ہے وہ اتنی صریح نہیں ہے اور حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی روایت اس کے خلاف موجود ہے، اس واسطے رکبہ کا عورت ہونا اتنا مؤکد نہیں ہے جتنا "**مافوق الرکبۃ**" کا عورت ہونا مؤکد ہے، بلکہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے "فیض الباری" میں فرمایا کہ "**فخذ**" کا عورت ہونا بھی اتنا مؤکد نہیں ہے۔ "**فخذ**" ہے تو عورت' لیکن اس کا عورت ہونا اتنا مؤکد نہیں ہے جتنا "**مافوق الفخذ**" کا ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقامِ فہم اور مراتبِ شرعیہ سے متعلق ایک نفیس بحث

یہاں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بڑی نفیس بحث فرمائی ہے کہ احکام شرعیہ کے مراتب ہوتے ہیں، یعنی ایک مراتب تو وہ ہیں جو حضرات فقہائے کرام رحمہم اللہ نے متعین و مرتب کر دیئے ہیں کہ یہ فرض ہے، واجب ہے، سنت ہے، مباح ہے اور مستحب ہے، لیکن خود ان میں سے ہر مرتبہ کے اندر مراتب ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ جن کو فرض کہا گیا ہے وہ سب فرض تو ہیں، لیکن فرضیت کے بھی مراتب ہیں کسی کی فرضیت زیادہ مؤکد ہے اور کسی کی اس کے مقابلے میں کم مؤکد ہے اگرچہ ہیں دونوں فرض۔

---

[۴۳] قال الشیخ أبو حامد نص الشافعی علی أن عورۃ الحرو العبد ما بین سرتہ، ورکبتہ وأن السرۃ والرکبۃ لیستا عورۃ فی "الام" و "الإملاء" الخ، المجموع ج:۳، ص: ۱۷۱، دارالنشر دارالفکر، بیروت الاولیٰ سنۃ النشر، ۱۴۱۷ھ.

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس کی مثال یوں دی ہے کہ جیسے پانچ نمازیں بھی فرض ہیں اور جمعہ بھی فرض ہے لیکن جمعہ کی فرضیت زیادہ مؤکد ہے بنسبت صلوٰات خمسہ کے۔

اسی طرح واجبات میں ہے کہ بعض کا وجوب زیادہ مؤکد ہے، اوراس کے مقابلے میں بعض کا وجوب کم مؤکد ہے اسی طرح منہیات میں بھی جو چیزیں حرام ہیں، منہیات ہیں تو سب حرام لیکن ان کی حرمتوں کے اندر مراتب ہیں کہ کسی کی حرمت زیادہ مؤکداور شنیع ہے، اور کسی کی اس کے مقابلے میں کم مؤکد ہے۔

دلیل: اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا **"الغیبة اشد من الزنا"** کہ غیبت زنا سے بھی اشد قرار دیا، حالانکہ ہیں دونوں حرام، لیکن غیبت کو فرمایا کہ وہ زنا سے زیادہ شدید ہے۔ تو معلوم ہوا کہ حرام کے اندر بھی مراتب ہیں۔

اسی طرح جن کو ہم مکروہ تحریمی اور ناجائز کہتے ہیں ان میں بھی مراتب ہیں۔ بعض میں کراہت زیادہ ہے اور بعض کراہت کم ہے۔

تو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ عورت تو عورتِ غلیظہ بھی ہے اور **"فخذ"** بھی اور رکبہ بھی، تینوں کو ڈھکنا واجب ہے۔ چنانچہ عورت غلیظہ کو کھولنا بے انتہا زیادہ شنیع ہے، اور **"فخذ"** اس کے مقابلے میں کم ہے اور **"رکبة"** کا کھولنا اس سے بھی کم ہے۔ اگر چہ جب حکم لگایا جائے گا تو تینوں پر یہی حکم ہے کہ تینوں کو کھولنا ناجائز ہے۔

یہاں پر حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نازک بات فرمائی ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ جو احکام میں تخفیف آئی ہے جیسے **"رکبة"** کا عورت ہونا اتنا مؤکد نہیں ہے جتنی اوپر کے اعضاء کی عورت مؤکد ہے۔ یہ تخفیف صرف تعارضِ ادلّہ کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ عام طور سے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ تخفیف تعارضِ ادلّہ کی وجہ سے آتی ہے کہ راویوں میں اختلاف ہوا۔ کسی نے یوں روایت کیا، کسی نے یوں روایت کیا تو اس اختلاف رُواۃ کی وجہ سے تخفیف آ گئی۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نہیں بلکہ یہ تخفیف خود شارع کی طرف سے ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ شارع نہ تو اس میں کھلی چھٹی دینا چاہتے ہیں اور شارع کا یہ منشأ بھی نہیں ہوتا کہ لوگ اس بارے میں بہت زیادہ تنگی میں مبتلا ہوں۔ اس واسطے اگر کبھی ایک آدھ موقع پر اس مکروہ شئی کا ارتکاب ہو جائے تو شارع اس کے اوپر اتنی تنگی نہیں کرتے، لیکن اگر یہ کہہ دیں کہ یہ مکروہ نہیں ہے تو لوگ جری ہو جائیں اور دھڑا دھڑ اس کا ارتکاب شروع کر دیں، کھلی چھٹی مل جائے۔

لہٰذا نہ تو کھلی چھٹی دیتے ہیں اور نہ اتنی تنگی کرتے ہیں۔ ایسے موقع پر کوئی دلیل شارع خود پیدا کر دیتے ہیں کہ جس کے ذریعے اختلاف رائے اجتہادی پیدا ہو جائے اور اس کے نتیجے میں تخفیف آ جائے۔ یہ بڑی عجیب

اور لطیف بات فرمائی۔ یہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا ہی مقام ہے کہ وہ یہ بات فرما رہے ہیں اور کسی کے بس کا کام نہیں تھا۔

مراتبِ احکام کا لحاظ رکھنا ضروری ہے

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عجیب نکتہ بیان فرمایا کہ اس سے درحقیقت شارع کا منشأ یہ ہے کہ ایک طرف امت حرج میں مبتلا نہ ہو، اور اس کے اوپر زیادہ سختی نہ ہو، اور دوسری طرف اگر اس کو کھلی چھوٹ دیدیں تو اندیشہ ہے کہ لوگ اس معاملہ میں بہت زیادہ بے پرواہ ہو جائیں گے۔

اس واسطے کھلی چھٹی تو نہیں دیتے، لیکن کبھی ایک آدھ مرتبہ عمل ایسا کرلیا کہ جس کے نتیجے میں اجتہادی اختلاف کی گنجائش نکل آئی تاکہ اختلاف اجتہادی کی بنا پر پھر تخفیف پیدا ہو اور تخفیف کے نتیجے میں لوگوں کو سہولت مل جائے، اس لئے فرماتے ہیں کہ ان مراتب احکام کا لحاظ رکھنا بڑا ضروری ہے۔ اس کو حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ "مراتب الاحکام" کے نام سے یاد فرماتے ہیں، اور جو شخص مراتب الاحکام کا لحاظ نہ رکھے تو وہ تفقہ سے محروم ہے، یہ بڑی عجیب وغریب بات ہے۔[۴۴]

مراتب الاحکام کی نظیر

ہمارے ہاں بعض حضرات نے یہ فتویٰ دیا کہ داڑھی منڈوانا جس طرح حرام ہے اسی طرح داڑھی کٹوانا بھی حرام اور ناجائز ہے، اور ایک قبضہ سے کم رکھنا بھی ناجائز ہے۔

لہٰذا انہوں نے کہا کہ داڑھی منڈوانے والے میں اور کٹوانے والے میں کوئی فرق نہیں، یعنی گناہ کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں چاہے منڈوائے یا کٹوائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض لوگ جو اس بات کی ہمت کر رہے تھے کہ تھوڑی بہت رکھ لیں، انہوں نے کہا جب دونوں میں کوئی فرق نہیں تو پھر منڈوا دو، رکھنے کی ضرورت نہیں۔

یہ جو مؤقف ہے کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں یہ مراتب احکام سے ناواقفیت کی دلیل ہے، مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا کہ چھوٹی داڑھی رکھنا داڑھی منڈوانے سے یقیناً اھون ہے، اور جس شخص کو پوری داڑھی رکھنے کی ہمت نہ ہو رہی ہو اس سے یہ کہا جائیگا کہ جتنی رکھ سکو رکھ لو باقی کے لئے یہ سمجھو کہ ناجائز کر رہا ہوں، لیکن جب اللہ ﷻ توفیق دیں گے تو مکمل رکھ لوں گا نہ رکھنے سے تو کچھ رکھنا بہتر ہے، گویا نبی اکرم ﷺ کے حکم سے اتنا بُعد نہیں ہے جتنا بُعد بالکل منڈوانے والے کو ہے، لہٰذا یہ سمجھنا کہ دونوں برابر ہیں، یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ دونوں گناہ

---

[۴۴] تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیں: فیض الباری، ج: ۲، ص: ۱۳-۱۷۔

تو ہیں، لیکن گناہوں میں بھی باہم مراتب کا فرق ہے۔

مثال کے طور پر ایک عورت اس قدر بے پردہ ہے کہ بالکل شتر بے مہار کی طرح پھر رہی ہے، نہ برقعہ پہنے، نہ چادر پہنے، اور نہ صحیح طریقہ سے دوپٹہ پہنے۔ اور ایک وہ عورت ہے جس نے جسم کو ڈھک لیا، چادر سے یا کوٹ سے سر بھی ڈھک لیا، لیکن چہرہ اور ہاتھ کھلے رہے، اگر چہ متاخرین کا فتویٰ یہ ہے کہ عورت کے لئے سترِ وجہ بھی واجب ہے اور یہ وجوب بطور حجاب نہیں ہے، بلکہ بطور ازالۂ فتنہ کے متاخرین حنفیہ نے واجب قرار دیا ہے۔ تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ چہرہ کا کھولنا بھی ناجائز ہوگا، لیکن ایک عورت سارا جسم کھولے پھر رہی ہے اور ایک وہ ہے جو صرف چہرہ کھولے پھر رہی ہے تو دونوں کے مقابلہ میں یہ اھون ہوگی۔

اب جہاں اس بات کا امکان ہو کہ عورتیں پورے پردہ کی طرف نہیں آسکتیں تو کم از کم اس طرف (یعنی صرف چہرہ کھولنے پر) تو آسکتی ہیں۔ اب وہاں پر اگر یہ کہہ دیا جائے کہ اِس بے پردہ اور اُس بے پردہ میں کوئی فرق نہیں تو یہ بات صحیح نہیں ہوگی، بلکہ مراتبِ احکام کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

نکیر میں بھی مراتب محرّمات کا لحاظ ضروری ہے

یہی معاملہ نکیر کا ہے کہ اس منکر پر نکیر ہوتی ہے جو متفق علیہ طور پر منکر ہو، اور جس میں اختلاف ہو یعنی مختلف فیہ مسئلہ ہو تو اس پر اس درجے کی نکیر نہیں ہوگی جس درجہ کی متفق علیہ منکر پر ہوتی ہے یعنی جو محرّماتِ قطعیہ پر ہوتی ہے۔

اس بات کو مدّ نظر نہ رکھنے سے بہت سے لوگ ایسے مقامات پر نکیر کرتے ہیں کہ جہاں نکیر کا اس درجہ کا موقع نہیں ہوتا۔ جو معاملہ مجتہد فیہ ہے یا ایسا ہے کہ جس میں شریعت میں اتنا تشدّد نہیں ہوتا' اس پر نکیر اس درجہ کی گئی جیسا کہ محرمات قطعیہ پر نکیر کی جاتی ہے تو اس سے وہ شریعت کا مزاج مختل ہو جاتا ہے اور شریعت کے جو مقاصد ہیں وہ فوت ہو جاتے ہیں، لہٰذا ہر چیز پر نکیر اس کے مناسب ہونی چاہئے۔ اگر معاملہ محرمات قطعیہ کا ہے تو نکیر شدید ہے اور اگر معاملہ محرمات قطعیہ کا نہیں ہے بلکہ مکروہات تحریمیہ کا ہے تو نکیر اس سے اخف ہے اور اگر ایسا ہے جو مختلف فیہ ہے اور مجتہد فیہ ہے تو نکیر اور اخف ہے، لہٰذا اس کے اوپر ایسی نکیر کرنا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ یہ بالکل حرام قطعی ہے تو یہ بھی تفقہ اور مقاصد شرعیہ سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

ہمارے ماحول میں مراتبِ احکام کا یہ فرق بسا اوقات ملحوظ نہیں رہتا، نکیر بعض اوقات ایسی چیزوں پر کی جاتی ہے جو سنت بھی نہیں ہوتیں، لیکن بزرگوں کا ایک معمول چلا آرہا ہے ٹھیک ہے معمول کہ پابندی کرانی چاہئے بزرگوں کے طریقے کو برقرار رکھنا بڑی برکت کا باعث ہے، لیکن اس کے تارک پر ایسی نکیر کرنا جو کہ تارکِ واجب پر کی جاتی ہے اس میں تو خطرہ ہوتا ہے کہ اس کو بدعت نہ بنا دے۔ اس واسطے ہر چیز کے اندر نکیر اس کے مطابق

ہے۔ جہاں شریعت نے جس چیز کو جو مقام دیا ہے اس کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

کرسیوں پر بیٹھ کر کھانا جائز اور حرام نہیں

ایک جگہ کرسیوں پر کھانا ہو رہا تھا، ایک صاحب نے جا کر کہا کہ میں نہ بیٹھوں گا اور نہ ہی کھاؤں گا، جب تک زمین پر کھانا نہ لگاؤ گے۔

تو ٹھیک ہے زمین پر کھانا اقرب الی السنہ ہے بلکہ سنت یہ ہی ہے کہ آدمی زمین پر بیٹھ کر کھائے، لیکن زمین پر کھانا سنت ضرور ہے مگر کرسیوں پر کھانا حرام نہیں۔ ایک زمانے میں جب یہ طریقہ عام طور سے غیر مسلموں کا تھا اس وقت اسے تشبہ کی بناء پر بہت سے علماء نے منع فرمایا تھا، مگر ساتھ ہی حضرت حکیم الامت قدس سرہ اس وقت کرسی پر پاؤں اٹھا کر بیٹھے اور فرمایا کہ اس طرح تشبّہ یا مشابہت کا شبہ بھی ختم ہو گیا۔ اب یہ طریقہ اتنا عام ہو گیا کہ اس میں تشبّہ نہیں رہا لہٰذا ترغیب کے درجے میں نیچے بیٹھ کر کھانے کا اہتمام ضرور کرنا چاہئے، سنت کی برکات کا حصول معمولی چیز نہیں جس سے بے پروائی برتی جائے، لیکن اگر کوئی کرسی پر بیٹھ کر کھا رہا ہے تو اس پر ایسی نکیر کرنا درست نہیں جیسی محرمات پر ہوتی ہے، یہ نکیر کسی طرح بھی شریعت کے مزاج کے مطابق نہیں۔

مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کا قول

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے (یہ ایک جملہ یاد رکھنے کا ہے) کہ ''غیر منکر پر نکیر کرنا خود منکر ہے'' اور یہ درست نہیں کیونکہ جب شریعت نے ایک چیز کو حرام نہیں کیا تو تم داروغہ بن کر کیسے حرام کہہ سکتے ہو۔ یہ باتیں درحقیقت شریعت کے مزاج کو سمجھنے کی ہیں اور اسی کا نام تفقہ فی الدین ہے اور شریعت کے مزاج کو سمجھنا محض کتاب پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتا، اس کے لئے صحبت کی ضرورت ہوتی ہے، اور صحبت سے انسان کو پتہ چلتا ہے کہ کس جگہ انسان کو کیا مؤقف اختیار کرنا چاہئے، کہاں تشدد اور کہاں نرمی (اختیار کرنی چاہئے)

سوال: جس وقت شارع نے بات کی اس وقت تو اگرچہ مراتب کے مفہوم ہوتے ہونگے، لیکن مجتہدین نے مختلف دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے ایک مؤقف اختیار کر لیا۔ اس مؤقف کو اختیار کر لینے کے بعد تو اب وہ ایک جانب متعین ہو گئی، کیونکہ جب انہوں نے ایک چیز کو حرام کہہ دیا تو اب ہم اس کو حرام ہی سمجھیں گے یا انہوں نے کہا کہ مکروہ ہے تو اب ہم اس کو مکروہ ہی سمجھیں گے، اس میں پھر تخفیف کیسے ہوگی؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے بے شک رکبہ کو عورت میں داخل کر دیا، لیکن ساتھ ہی فقہاء کرامؒ نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ رکبہ کا عورت ہونا یہ اخف ہے بنسبت ''فخذ'' کے عورت ہونے کے۔ اور یہ بھی صراحت کی گئی ہے کہ مسئلہ کے مجتہد فیہ ہونے سے مسئلہ میں تخفیف ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بول

مایؤکل لحمہ میں اختلاف ہوا تو کہہ دیا کہ نجاست غلیظہ نہیں ہے بلکہ خفیفہ ہے۔تو بہت سی جگہوں پر خود انہوں نے صراحت کردی اور بہت سی جگہوں پر صراحت نہیں کی لیکن صراحت نہ کرنے کے باوجود اس کو فہم سامع پر چھوڑ دیا کہ ہمارا موقف تو بے شک یہ ہی ہے لیکن چونکہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے اس لئے نکیر اس درجہ کی نہیں ہوگی جس درجہ کی مجمع علیہ منکر پر کی جاتی ہے۔ یہ گویا مفروغ عنہ سمجھا۔ اس واسطے فقہائے کرام رحمہم اللہ نے یہ بات لکھ دی کہ نکیر ہمیشہ مجمع علیہ امر پر ہونی چاہیئے۔ مجتہد فیہ معاملہ پر نکیر نہیں' فہمائش ہے' یعنی سمجھا دو کہ ایسا کرنا چاہئے، لیکن اس کے اوپر نکیر ایسی جیسے محرمات قطعیہ پر ہوتی ہے وہ درست نہیں ہے، یہ ایک اصول بتا دیا۔

خلاصۂ بحث

خلاصہ یہ نکلا کہ **"فخذ"** کے بارے میں راجح یہ ہے کہ وہ عورت ہے۔

حنفیہ نے رکبہ کے بارے میں بھی اس کو ترجیح دی ہے کہ یہ بھی عورت ہے، لیکن عورت کے ہونے میں مراتب احکام کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

تو فرمایا **"قال أبوعبد اللہ و حدیث أنس أسند وحدیث جرھدأحوط حتی نخرج من اختلافھم"**.

"احوط" کا مطلب

"احوط" کے مطلب ہیں تاکہ ہم فقہاء کے اختلاف سے بالکل نکل جائیں۔

یہاں بھی وہ دونوں احتمالات ہیں:

ایک احتمال یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا منشا یہ ہو کہ اگرچہ دلیل کے لحاظ سے عورت نہ ہونا راجح ہے، لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اس کو عورت سمجھ کر اس کو نہ کھولے۔ گویا کہ کھولنے سے ان کے نزدیک فسادِ صلوٰۃ نہیں، لیکن کہتے ہیں کہ احتیاط یہ ہے کہ ڈھک کر نماز پڑھے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ان کے نزدیک **"اَحْوَطُ"** کا مطلب یہ ہے کہ احتیاط اجتہادی کرے کہ چونکہ دلائل دونوں طرف مساوی ہیں، مختلف جہتیں ہیں۔ تو احتیاط کا مقتضی یہ ہے کہ جانب حرمت کو ترجیح دی جائے تو اس صورت میں ان کے نزدیک بھی عورت ہوگا، اور اس کے کھولنے سے نماز نہیں ہوگی۔

بہر حال یہ بڑا طویل الذیل موضوع ہے۔ میں نے صرف اس باب کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس باب کو مدنظر رکھنا ضروری ہے، اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے **"فیض الباری"** میں متعدد مقامات میں اس پر تنبیہ فرمائی ہے۔

تشریح عبارت

"وقال أبو موسى غطّى النبي ﷺ ركبتيه حين دخل عثمان" ابوموسیٰ کہتے ہیں کہ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ داخل ہوئے تو نبی کریم ﷺ نے اپنی رکبتین کو ڈھکا۔

تو یہ وہی حدیث ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا اور اس کا جواب دیا۔ آگے فرمایا:

"وقال زيدبن ثابت انزل الله على رسوله ﷺ وفخذه على فخذي فثقلت علي حتى خفت أن ترضّ فخذي".

حضرت زید بن ثابت ؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ پر اللہ جل جلالہ نے وحی نازل فرمائی اس حال میں کہ آپ ﷺ کی ران مبارک میری ران پر رکھی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ مجھ پر بہت بوجھ پڑا! **"حتى خفت ان ترض فخذي"** یہاں تک کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ میری ران ٹوٹ جائے گی۔

استدلال یہاں یوں ہے کہ **"فخذه على فخذي"** کہ آپ کی **"فخذ"** میری **"فخذ"** سے ملی ہوئی تھی۔ تو اس کا ظاہر انہوں نے یہ قرار دیا کہ **"فخذ فخذ"** کے ساتھ بلا حائل ملی ہوئی تھی۔ اس سے وہ لوگ استدلال کریں گے جو **"فخذ"** کو عورت نہیں مانتے کہ یہاں حضور ﷺ نے **"فخذ"** کو کھول دیا تھا۔

لیکن جو حضرات **"فخذ"** کو عورت مانتے ہیں وہ کہیں گے کہ یہ کہنا کہ یہ **"فخذ"** بغیر حائل کے تھی یہ بات صحیح روایت سے ثابت نہیں بلکہ ظاہر یہ ہے کہ اس کے اوپر کپڑا ہوگا اور عام طور سے عادت یوں ہی ہے کہ کپڑے کی موجودگی میں ہی پاؤں ملائے جاتے ہیں اور کسی صورت میں نہیں ملائے جاتے، لہٰذا یہ کپڑے کی حالت پر محمول ہے یعنی لباس کے ہوتے ہوئے۔

۳۷۱ ـ حدثنا يعقوب بن إبراهيم قال: حدثنا إسماعيل بن علية قال: حدثنا عبدالعزيز بن صهيب، عن أنس أن رسول الله ﷺ غزا خيبر فصلينا عندها صلاة الغداة بغلس فركب نبي الله ﷺ وركب أبو طلحة وأنا رديف أبي طلحة، فأجرى نبي الله في زقاق خيبر وإن ركبتي لتمس فخذ نبي الله ﷺ، ثم حسر الإزار عن فخذه حتى إني أنظر إلى بياض فخذ نبي الله ﷺ دخل القرية قال: (الله اكبر خربت خيبر، إنا اذا نزلنا بساحة قوم فساء صباح المنذرين)، قالها ثلاثا، قال وخرج القوم إلى اعمالهم فقالوا: محمد، قال: عبد العزيز، وقال بعض أصحابنا: والخميس يعني الجيش ـ قال: فأصبناها عنوة فجمع السبي فجاء دحية فقال: يا نبي الله، أعطني جارية من السبي، قال: (اذهب فخذ جارية) فأخذ صفية بنت حيي فجاء رجل إلى النبي ﷺ فقال: يا نبي الله أعطيت دحية صفية بنت حيي سيدة قريظة

والنضير ، لا تصلح إلا لك ، قال: (ادعوه بها) فجاء بها فلما نظر إليها النبي ﷺ قال: (خذ جارية من السبي غيرها)، قال: فأعتقها النبي ﷺ وتزوجها ، فقال له ثابت : يا أبا حمزة ، ما أصدقها ؟ قال: نفسها ، أعتقها وتزوجها ، حتى إذا كان با لطريق جهزتها له أم سليم ، فأهدتها له من الليل ، فأصبح النبي ﷺ عروسا ، فقال: من كان عنده شيئ فليجئ به ، وبسط نطعا ، فجعل الرجل يجيئ بالتمر ، وجعل الرجل يجيئ بالسمن ، قال: وأحسبه قد ذكر السويق ، قال: فحاسبوا حيسا ، فكانت وليمة رسول الله ﷺ.

[انظر: ۶۱۰، ۹۴۷، ۲۲۲۸، ۲۲۳۵، ۲۸۸۹، ۲۸۹۳، ۲۹۴۳، ۲۹۴۴، ۲۹۴۵، ۲۹۹۱، ۳۰۸۵، ۳۰۸۶، ۳۳۶۷، ۳۶۴۷، ۴۰۸۳، ۴۰۸۴، ۴۱۹۷، ۴۱۹۸، ۴۱۹۹، ۴۲۰۰، ۴۲۰۱، ۴۲۱۱، ۴۲۱۲، ۴۲۱۳، ۵۰۸۵، ۵۱۵۹، ۵۱۶۹، ۵۳۸۷، ۵۴۲۵، ۵۹۶۸، ۶۱۸۵، ۶۳۶۳] ۴۵

تشریح حدیث

مذکورہ حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہ غزوۂ خیبر والی حدیث ہے اور اس میں موضع استدلال یہ ہے کہ :

ثم "حسر الا زازعن فخذه حتى انى انظر الى بياض فخذ نبيّ الله ﷺ"

یہاں بھی "**حسر**" بمعنی "**انحسر**" کے ہے جیسا کہ ماقبل میں بحث گذر چکی۔ یہ حدیث "**کتاب المغازی**" میں غزوۂ خیبر کے اندر ہے اس کے آخر میں ایک واقعہ ذکر ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ تم جا کر قیدیوں میں سے کوئی جاریہ لے لو! تو انہوں نے صفیہ بنت حیی کو لے لیا۔

یہ صفیہ بنت حیی سردار کی بیٹی تھی اور ایک سردار کے نکاح میں تھیں اور جس وقت حضرت نبی کریم

---

۴۵ وفی صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فضل المدینة ودعاء النبی فیها بالبرکة وبیان الخ ، رقم: ۲۴۲۸، وکتاب النکاح ، باب فضیلة اعتاقه أمته ثم یتزوجها، رقم: ۲۵۶۱، ۲۵۶۴، وسنن الترمذی، کتاب السیر عن رسول الله ، باب فی البیات والغارات، رقم: ۱۴۷۰، وسنن النسائی، کتاب المواقیت، باب التغلیس فی السفر ، رقم: ۵۴۴، وکتاب النکاح، باب البناء فی السفر، رقم: ۳۳۲۷، وسنن ابی داؤد، کتاب الخراج والإمارة والفئی، باب ماجاء فی سهم الصفی رقم: ۲۶۰۴، وسنن ابن ماجه، کتاب النکاح ، باب الرجل یعتق أمته ثم یتزوجها، رقم: ۱۹۴۷، ومسند أحمد، باقی مسند المکثرین ، باب مسند أنس بن مالک، ۱۱۵۵۴، ۱۱۷۷۰، ۱۱۹۶۰، ۱۲۱۵۵، ۱۲۲۰۸، ۱۲۵۵۴، ۱۳۰۸۶، ۱۳۲۷۲، ۱۳۳۵۹، وموطأ مالک، کتاب الجهاد، باب ماجاء فی الخیل والمسابقة بینها والنفقة فی الغزو، رقم: ۸۹۱.

ﷺ نے خیبر پر حملہ کا ارادہ فرمایا تو انہوں (حضرت صفیہؓ) نے خواب میں دیکھا کہ آسمان سے چاند آکر میری گود میں گر گیا اور غالباً یہ بھی دیکھا کہ جنوب کی طرف سے چاند آیا۔ تو صبح اٹھ کر انہوں نے اپنے شوہر سے ذکر کیا تو شوہر نے طمانچہ مارا اور کہا کہ تم یہ خواب دیکھ رہی ہو کہ مدینے کے سلطان (نبی کریم ﷺ) کے نکاح میں چلی جاؤ۔ بعد میں نبی کریم ﷺ نے حملہ فرمایا اور خیبر فتح ہوا اور یہ حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آگئیں تو **"فجاء رجل الی النبی ﷺ"** ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آئے اور کہا:

"فقال یا نبی اللہ اعطیت دحیة صفیة بنی حییّ سیدة قریظة والنضیر"۔

کہ آپ ﷺ نے صفیہ جیسی خاتون دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو دیدی ہے جو کہ قریظہ اور نضیر دونوں قبیلوں کی سردار ہیں۔

"لاتصلح اِلّالَکَ قال "ادعوہ بھا" فجاء بھا فلما نظر الیھا النبی ﷺ قال "خذ جاریة من السبی غیرھا" تو دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اب ان کے علاوہ کوئی اور جاریہ تم لے لو۔

اب یہ دو صورتیں ہو سکتی ہیں:۔

ایک صورت یہ ہے کہ ان کا لینا ابھی تقسیم سے پہلے تھا، لہٰذا ابھی ان کی ملکیت مؤکد نہیں ہوئی تھی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر تقسیم ہو بھی گئی ہو تو پھر آپ ﷺ نے ان سے گویا خرید لیا۔

دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دس باندیاں ان کے عوض میں دیدیں۔ روایات میں آتا ہے کہ دس رؤوس دیئے۔ دس رؤس دے کر ان کو خرید لیا۔ تو:

"قال: فاعتقھا النبی ﷺ وتزوجھا" آپ ﷺ نے ان کو آزاد فرمایا اور نکاح کر لیا۔

اس کی تفصیل **"مسند احمد"** کی روایت میں ہے[۲۶] کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ میں تمہیں اختیار دیتا ہوں کہ اگر تم اپنے گھر والوں کے پاس جانا چاہو تو میں تمہیں اپنے گھر والوں کے پاس بھیج دیتا ہوں یعنی آزاد کر دیتا ہوں اور اگر تم چاہو تو آزاد کرنے کے بعد میں تم سے نکاح کر لوں اور پھر تم میرے پاس رہو تو انہوں نے دوسری شق کو اختیار کیا اور اس کے نتیجے میں آنحضرت ﷺ نے ان سے نکاح کر لیا۔

"فقال له ثابت :یا أبا حمزة 'ما أصدقھا ؟قال نفسھا ،أعتقھا وتزوجھا"۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا مہر

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ ﷺ نے صفیہ رضی اللہ عنہا کو مہر دیا تھا **"قال نفسھا"** کہا کہ انہی کا نفس یعنی **"اعتقھا وتزوجھا"۔**

---

[۲۶] فی مسند أحمد، باقی مسند المکثرین، رقم:الحدیث ۱۱۹۶۰۔

اس کی تشریح حنابلہ یوں کرتے ہیں کہ بغیر مہر کے نکاح کر لیا یا عتق کو صداق قرار دیا[۴۷]۔ ہمارے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ عتق علی المال کیا اور اس مال کو حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے لئے مہر بنایا۔[۴۸]

"حتى إذا كان بالطريق جهزتها له أم سليم، فأهدتها له من الليل، فأصبح النبي ﷺ عروسا، فقال: من كان عنده شيء فليجيء به".

حضرت نبی کریم ﷺ کا ولیمہ

ولیمہ اس طرح ہوا کہ لوگوں سے کہا کہ جس کے پاس جو کچھ ہو وہ لے آئے **"وبسط نطعاً"** ایک چمڑے کا دسترخوان بچھایا تو ایک شخص تمر لے کر آیا اور ایک شخص گھی لے کر آیا تو کہنے لگے کہ میرا خیال ہے کہ بعض لوگوں نے ستو کو بھی ذکر کیا تھا۔

"قال فحاسوا حيساً" تو سب نے مل کر ایک حلوہ بنایا۔

"حیس" کہتے ہیں ایسے طعام کو جس میں بہت ساری چیزیں ملا کر اکھٹی کر دی گئی ہوں۔ یہ آپ ﷺ کا ولیمہ تھا۔

سوال:

امام بخاری رحمہ اللہ کی عادت ہے کہ صرف مقصود پر اکتفا کرتے ہیں اور زائد روایت کو حذف کر دیتے ہیں حالانکہ مذکورہ روایت میں زائد کو حذف نہیں کیا گیا، اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب:

یہ طریقہ امام ترمذی رحمہ اللہ کا ہے کہ مقصود والے حصّہ کو لے لیتے ہیں اور باقی کو حذف کر دیتے ہیں، لیکن بعض اوقات امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد صرف ایک فقرہ ہوتا ہے لیکن پوری صفحہ ڈیڑھ صفحہ کی حدیث لے آتے ہیں تو اس پر اشکال کی کوئی وجہ نہیں۔

---

[۴۷] وقال ابن حزم: اتفق ثابت وقتادہ وعبدالعزیز بن صهيب عن أنس أنه ﷺ: عتق صفية وجعل عتقها صداقها، وبه قال قتادة في رواية، وأخذ بظاهره أحمد والحسن وابن المسيب، ولا يجب لها مهر غيره الخ، عمدة القاری، ج:۳، ص:۳۰۵.

[۴۸] وقال الليث بن سعد وابن شبرمة وجابر بن زيد وأبو حنيفة ومحمد وزفر ومالک، ليس لأحد غير رسول الله ﷺ أن يفعل هذا فيتم له النكاح بغير صداق، وانما كان ذالک لرسول الله ﷺ خاصة، لأن الله تعالى لما جعل له أن يتزوج بغير صداق كان له أن يتزوج على العتاق الذي ليس بصداق، ثم ان فعل هذا وقع العتاق ولها عليه مهر المثل الخ، عمدة القاری ج:۳، ص:۳۰۵، ۳۰۶.

(۱۳) باب : في كم تصلي المراة من الثياب؟

عورت کتنے کپڑوں میں نماز پڑھے

"وقال عكرمة : لو وارت جسدها في ثوب جاز".

عورت کے لئے دوران نماز مستحب کپڑے

اس بات پر یہ باب قائم کیا ہے کہ عورت کتنے کپڑوں میں نماز پڑھے؟

اس مسئلہ میں فقہاء کرامؒ نے مختلف باتیں کہی ہیں، کسی نے کہا کہ دو کپڑے ہونے چاہئیں، کسی نے کہا کہ تین کپڑے ہونے چاہئیں کسی نے کہا کہ چار کپڑے ہونے چاہئیں۔

لیکن بظاہر یہ سب اقوال اس بات سے متعلق ہیں کہ مستحب کپڑے کتنے ہیں، اس پر شاید کسی کا اختلاف نہیں کہ اگر ایک ہی کپڑا ہو اور عورت سر سے لے کر پاؤں تک سوائے چہرے کے اپنے سارے جسم کو ڈھک لے تو نماز ہو جائے گی بشرطیکہ وہ کپڑا اشفاف یعنی باریک نہ ہو اور اتنا چست بھی نہ ہو کہ اس سے اعضاء نظر آئیں، ڈھیلا ڈھالا ایک کپڑا پہن لے بس کافی ہے۔ اسی واسطے عکرمہؒ کا قول نقل کیا کہ **" لو وارت جسدها في ثوب جاز".**

۳۷۲ ـ حدثنا أبو اليمان قال : أخبرنا شعيب ، عن الزهرى ، قال : أخبرني عروة أن عائشة قالت : لقد كان رسول الله ﷺ يصلي الفجر فيشهد معه نساء من المؤمنات متلفعات في مروطهن ثم يرجعن إلى بيوتهن ، مايعرفهن أحد. [أنظر: ۵۷۸، ۸۶۷، ۸۷۲][۴۹]

حدیث کی تشریح

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ:

---

[۴۹] وفی صحیح مسلم ، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ ، باب استحباب التبکیر بالصبح فی اول وقتها الخ رقم: ۱۰۲۰، وسنن الترمذی ، کتاب الصلاۃ ، باب ماجاء فی التغلیس بالفجر ، رقم: ۱۴۱ . وسنن النسائی ، کتاب المواقیت ، باب التغلیس فی الحضر ، رقم: ۵۴۲، وکتاب السهو ، باب الوقت الذی ینصرف فیه النساء من الصلاۃ ، رقم: ۱۳۴۵، وسنن أبی داؤد ، کتاب الصلاۃ ، باب فی وقت الصبح ، رقم: ۳۵۹، وسنن ابن ماجة ، کتاب الصلاۃ ، باب وقت صلاۃ الفجر ، رقم: ۶۷۱، ومسند أحمد ، باقی مسند الانصار ، باب حدیث السیدۃ عائشة ، رقم: ۲۲۹۲۲، ۲۲۹۶۷، ۲۴۹۱۵، ۲۵۰۲۵، وموطأ مالک کتاب وقوت الصلاۃ ، باب وقوت الصلاۃ ، رقم: ۳، وسنن الدارمی ، کتاب الصلاۃ ، باب التغلیس فی الفجر ، رقم: ۱۱۹۰ .

"لقد كان رسول الله ﷺ يصلي الفجر فيشهد معه نساء من المؤمنٰت متلفعات في مروطهن".

یعنی آپ ﷺ کے ساتھ خواتین نماز فجر میں حاضر ہوتی تھیں اس حالت میں کہ وہ اپنی چادر میں لپٹی ہوئی ہوتی تھیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ درحقیقت اس کو یہاں اس بنا پر لائے ہیں کہ اس میں اختلاف ہے کہ کوئی عورت سارے جسم پر ایک ہی چادر لپیٹ کر آئے تو اس کی نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

اس حدیث میں یہ احتمال نکلتا ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے، اس طرح نماز ہو جاتی ہے، لیکن اس روایت میں بظاہر مطلب یہ ہے کہ عورتیں نماز میں اس طرح عام کپڑوں کے اوپر دوسری چادروں میں لپٹ کر آتی تھیں بہر حال مقصود یہ ہے کہ جسم اور عورت کا ستر باقی رہے، خواہ وہ جس طرح سے بھی ہو حاصل ہو جائے۔

"ثم یرجعهن الی بیوتهن مایعرفهن احد".

"غلس" میں نماز فجر کی ادائیگی

پھر عورتیں اپنے گھروں کو چلی جاتی تھیں اور ان کو کوئی پہچانتا بھی نہیں تھا۔ دیکھئے! یہاں **"من الغلس"** کا لفظ نہیں ہے، لہٰذا اس سے حنفیہ کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو کہہ رہی ہیں کہ کوئی پہچانتا بھی نہیں تھا، اس کی وجہ یہ نہیں کہ اندھیرا ہوتا تھا بلکہ وہ چادروں میں لپٹی ہوئی ہوتی تھیں، اس وجہ سے ان کو پہچانتا نہیں تھا، لہٰذا بعض شافعیہؒ نے اس سے **"غلس"** میں نماز فجر پڑھنے پر جو استدلال کیا ہے وہ استدلال تام نہیں ہے۔

اور ابن ماجہ کی روایت میں صراحت ہے کہ **"من الغلس"** کا لفظ جو ترمذی وغیرہ میں آیا ہے یہ راوی کا ادراج ہے۔ ورنہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بات یہاں ختم ہو جاتی ہے۔[۵۰]

(۱۴) باب: إذا صلى في ثوب له أعلام ونظر إلى علمها

ایسے کپڑوں میں نماز پڑھنے کا بیان، جس میں نقش و نگار ہوں اور ان پر نظر پڑے

۳۷۳ ـ حدثنا أحمد بن یونس قال: حدثنا إبراهیم بن سعد قال: حدثنا ابن شهاب عن عروة، عن عائشة: أن النبي ﷺ صلى في خمیصة لها أعلام، فنظر الی اعلامها نظرة،

---

۵۰ انظر: حاشیة ۴۹.

فلما انصرف قال: (اذهبو بخميصتى هذه إلى أبي جهم ،والتوني يابنجانيةأبي جهم ، فإنها ألهتى انفا عن صلاتى) .قال هشام بن عورة ،عن أبيه ،عن عائشة :قال النبي ﷺ (كنت أنظر إلى علمها وأنا في الصلاة فأخاف أن تفتنني).[أنظر: ۷۵۲، ۵۸۱۷] ۵؎

منقش مخل فی الصلاۃ اشیاء پرنماز کا حکم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک ایسے کمبل میں نماز پڑھی جس میں کچھ نقش ونگار تھے۔ "**خمیصة**" کمبل یا کھیس کو کہتے ہیں۔آپ نے جب اس کے نقش ونگار کو دیکھا ایک نظر ڈالی اور جب آپ فارغ ہوئے تو فرمایا کہ میرا یہ کمبل ابی جہم کے پاس لے جاؤ اور ابی جہم کی "**انبجانیة**" میرے لئے لے آؤ۔"**انبجانیة**" اس کمبل کو کہتے ہیں جس میں نقش ونگار نہ ہوں۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ "**انبجانیة**" کوئی جگہ تھی اس کی طرف یہ منسوب تھا۔بہرحال مراد اس سے وہ کمبل ہے جس میں نقش ونگار نہ ہوں۔

تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ابوجہم کا "**انبجانیة**" لے آؤ، کیونکہ اس نے مجھے نماز سے غافل کر دیا،تو "**انبجانیة**" منگوائی اور یہ واپس بھیج دی۔

بعض حضرات نے فرمایا اور بعض روایتوں میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ اصل میں یہ نقش ونگار والا کمبل ابوجہم ہی نے رسول کریم ﷺ کے پاس بطور ہدیہ بھیجا تھا، آپ ﷺ نے اس میں نماز پڑھ لی لیکن چونکہ آپ نے محسوس فرمایا کہ یہ خشوع فی الصلوۃ میں رکاوٹ بن رہا ہے اس واسطے آپ نے وہ بھیج دیا، اور ان کی دل شکنی نہ ہونے کے لئے فرمایا کہ کوئی "**انبجانیة**" ایسی بھیج دیں جس میں نقش ونگار نہ ہوں۔اب ان کی دل شکنی بھی نہ ہوئی اور ہدیہ کو رد کرنا بھی لازم نہ آیا۔

معلوم ہوا کہ ایسے نقش ونگار جو انسان کی توجہ نماز کی طرف سے ہٹادیں چاہے کپڑے میں ہوں، دیوار پر ہوں وہ پسندیدہ نہیں۔آپ نے نماز نہیں لوٹائی، جس سے پتہ چلا کہ نماز فاسد نہیں ہوتی لیکن بہتر یہ ہے کہ آدمی ایسی جگہ، ایسے کپڑے اور ایسے مصلے پر نماز پڑھے جس میں نقش ونگار انسان کے ذہن کو ہٹانے والے نہ ہوں۔

۵؎ وفي صحيح مسلم ، كتاب المساجد ومواضع الصلاة ، باب كراهة الصلاة في ثوب له اعلام ، رقم :۸۶۳، وسنن النسائي ، كتاب القبلة ، باب الرخصة في الصلاة في خميصة لها اعلام ، رقم:۷۶۳، وسنن أبي داؤد ، كتاب الصلاة ، باب النظر في الصلاة ، رقم:۷۸۰، ومسند أحمد ، باقي مسند الأنصار ، باب حديث السيدة عائشة ، رقم:۲۲۹۵۸، ۲۳۰۶۰، ۲۴۲۷۳، ۲۴۴۵۴، ۲۴۵۵۲، وموطأ مالک ، كتاب النداء للصلاة ، باب النظر في الصلاة الى مايشغلک عنها، رقم:۲۰۴.

(۱۵) باب: إن صلى في ثوب مصلب أو تصاوير هل تفسد صلاته؟ وما ينهى من ذلك؟

اگر کسی کپڑے میں صلیب یا دیگر تصاویر بنی ہوں اور اس میں نماز پڑھے تو کیا نماز اس کی فاسد ہو جائے گی؟ اور اس کی مخالفت کا بیان

۳۷۴ ۔ حدثنا أبو معمر عبد الله بن عمرو قال: حدثنا عبد الوارث قال: حدثنا عبدالعزيز بن صهيب، عن أنس قال: كان قرام لعائشة سترت به جانب بيتها، فقال النبي ﷺ (أميطي عنا رامك هذا فإنه لا تزال تصاوير تعرض في صلاتي). [أنظر: ۵۹۵۹] [۵۲]

تصویر والے کپڑے میں نماز کا حکم

فرمایا "**في ثوب مصلب أو تصاوير**" کسی ایسے کپڑے میں جس میں صلیب کی تصویر بنی ہوئی ہو یا اس میں تصویریں بنی ہوں تو کیا نماز فاسد ہو جائے گی؟ اور اس کے اوپر جو نہی وارد ہوئی ہے اس کا ذکر بھی اس میں آیا ہے۔ "**هل تفسد صلاته**" سے اشارہ کر دیا کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔

بعض فقہاء کرام رحمہم اللہ یہ کہتے ہیں کہ اگر تصویر والے کپڑے میں نماز پڑھ لی تو نماز فاسد ہوگی اور بعض کہتے ہیں کہ نماز فاسد تو نہیں ہوگی لیکن ایسا کرنا منع ہے، ناجائز ہے۔

حدیث کا ترجمہ

اس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے آپ نے فرمایا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک پردہ تھا جس کے ذریعے انہوں نے اپنے گھر کی ایک جانب کو چھپا رکھا تھا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"**أميطي عنا قرامك هذا**" کہ ہم سے اپنے اس پردے کو دور کر دو، اس واسطے کہ اس کی تصویریں مسلسل میری نماز میں حارج ہوتی رہتی ہیں، اس طرح آپ ﷺ نے وہ پردہ ہٹوا دیا۔

اس حدیث میں دو مسئلہ ہیں:۔

۱۔ ایک تو تصویر کا فی نفسہ حکم۔ وہ ان شاء اللہ آگے "**كتاب اللباس**" میں آئے گا، وہاں تفصیل سے بحث ہوگی۔

---

[۵۲] وفي مسند أحمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند انس بن مالك، رقم: ۱۲۰۷۳، ۱۳۵۱۱.

تصویر والی جگہ نماز پڑھنے کا حکم

دوسرا جو مقصود باب ہے، وہ یہ ہے کہ اگر کپڑے پر تصویر ہو، سامنے ہو، یا دائیں یا بائیں ہو، تو کیا اس صورت میں نماز ہو جائے گی یا نہیں؟ اس میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ ایسی جگہ پر نماز پڑھنا جہاں تصویریں ہوں منع ہے، ایسی جگہ نماز نہیں پڑھنی چاہیئے، اگر کوئی پڑھ لے گا تو اس کی نماز مکروہ تحریمی ہوگی جس کا حاصل یہ ہے کہ فریضہ تو اس کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا، لیکن نماز مکروہ تحریمی ہوگی اور جب کراہتِ تحریمی آجاتی ہے تو حنفیہ کا قاعدہ یہ ہے کہ **"کل صلوۃ أدیت مع الکراھۃ تجب اعادتھا"** تو اس کا اعادہ واجب ہوتا ہے۔ حنفیہ کا مسلک یہی ہے جو عام طور سے کتبِ فقہیہ میں لکھا ہوا ہے، البتہ بعض فقہاء نے اس کو اس صورت پر محمول کیا ہے جب کراہت صلب صلوۃ میں اگر خارج صلوۃ کسی سبب سے کراہت ہو تو اعادہ واجب نہیں ہوتا، اس اصول پر نماز واجب الاعادہ نہ ہونی چاہئے۔

(۱۶) بابُ من صَلّی في فروج حریر ثم نزعه

حریر کا جبہ پہن کر نماز پڑھنا پھر اس کو مکروہ سمجھ کر اتار پھینک دینا

۳۷۵ ـ حدثنا عبداللہ بن یوسف قال: حدثنا اللیث، عن یزید، عن أبي الخیر، عن عقبة بن عامر قال: أهدي إلی النبي ﷺ فروج حریر فلبسه فصلی فیه ثم انصرف فنزعه شدیدا کالکاره له، وقال: لا ینبغي هذا للمتقین. [أنظر: ۵۸۰۱] ۵۳

ریشم کی شناعت

آپ ﷺ نے ایک ریشم کا کوٹ پہنا۔

"فروج" ایک ایسی قبا ہوتی ہے کہ اس کے پیچھے شگاف ہوتا ہے قریب اور زیادہ نیچے تک نہیں ہوتی۔ اس زمانہ میں ایسا ہوتا تھا۔ یہ کوٹ کے مشابہ ایک چیز ہوتی تھی۔ تو آپ نے ریشم کا فروج پہنا اور اس میں نماز پڑھی، پھر آپ فارغ ہوئے تو آپ نے اس کو سختی سے نکالا **"کالکاره له"** جیسے اس کو ناپسند کر رہے ہوں، اور فرمایا کہ یہ متقیوں کے شایانِ شان نہیں۔

---

۵۳ وفی صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینة، باب تحریم استعمال اناء الذھب والفضة علی الرجال، رقم: ۳۸۶۸، وسنن النسائی، کتاب القبلة، باب الصلاة فی الحریر، رقم: ۷۶۲، ومسند أحمد، مسند الشامیین، باب حدیث عقبة بن عامر الجھنی عن النبی، رقم: ۱۶۶۵۵، ۱۶۷۰۳.

یہ اس وقت کا واقعہ ہے کہ جب مردوں کے لئے حریر کی حرمت کا حکم نہیں آیا تھا۔ تو یہیں سے حریر کی شناعت کا آغاز ہوا، کہ پہلے پہن لیا، لیکن پہننے کے بعد اس کو پسند نہیں فرمایا اور فرمایا کہ یہ متقیوں کے لئے پسند نہیں ہے۔

(۱۷) باب الصلاة في الثوب الأحمر

سرخ کپڑے میں نماز پڑھنے کا بیان

۳۷۶ ۔ حدثنا محمد بن عرعرة قال: حدثني عمر بن أبي زائدة، عن عون بن أبي جحيفة، عن أبيه قال: رأيت رسول الله ﷺ في قبة حمراء من أدم، ورأيت بلالا أخذ وضوء رسول الله ﷺ ورأيت الناس يبتدرون ذاك الوضوء، فمن أصاب منه شيأتمسح به، ومن لم يصب منه شيأأخذ من بلل يد صاحبه ثم رأيت بلالاً أخذ عنزوة فركزها، وخرج النبي ﷺ في حلة حمراء مشمرا صلى إلى العنزة بالناس ركعتين، ورأيت الناس والدواب يمرون بين يدى لعنزة. [راجع: ۱۸۷]

مردوں کے لئے سرخ کپڑے کا حکم

حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو ایک چمڑے کے سرخ قبہ (خیمہ) میں دیکھا، اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ حضور ﷺ کے وضوء کا بچا ہوا پانی لے رہے ہیں اور میں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ حضور ﷺ کے بچے ہوئے پانی کی طرف دوڑ رہے ہیں، جس کو جو کچھ مل گیا اس نے اس کو اپنے جسم پر مل لیا اور جس کو کچھ نہیں ملا تو اس نے اپنے ساتھی کے ہاتھ پر جو تری تھی وہ لے لی، یعنی عالمِ عشق میں اگر چہ حضور ﷺ کا بچا ہوا پانی مل جائے، وہ نہ ملے تو کسی اپنے ساتھی کے ہاتھ پر جو لگا ہوا تھا وہی لے لیا۔

"ثم رأيت" پھر میں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ انہوں نے چھڑی لی اور اس کو گاڑا، اور حضور ﷺ ایک سرخ جوڑے میں نکلے۔

"حلة حمراء" کا لفظ یہ موضع ترجمہ ہے۔

اس سے امام بخاری رحمہ اللہ استدلال کرنا چاہتے ہیں کہ مردوں کیلئے سرخ کپڑا پہننا اور اس میں نماز پڑھنا جائز ہے، کیونکہ حضور ﷺ سے سرخ جوڑا پہننا منقول ہے۔

اور حدیث میں یعنی نص صریح میں آنے کی بناء پر حنفیہ کے ہاں حکم میں تفصیل یوں ہے کہ عصفر اور زعفران کا رنگ منع ہے۔ البتہ سرخ رنگ کے کپڑے کے بارے میں حکم یہ ہے کہ احمر قانی جو بالکل سرخ ہو وہ مکروہ

تنزیہی ہے، اور احمر قانی اگر نہ ہو بلکہ ہلکا سرخ ہو یا اس میں دھاریاں ہوں تو اس میں کراہتِ تنزیہیہ بھی نہیں ہے، یہاں حملۃ حمراء میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر احمر قانی ہے تو زیادہ سے زیادہ مکروہ تنزیہی ہوگا اور یہ بھی جواز کا ایک شعبہ ہوتا ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حمراء مخطط ہو اور یہ مخطط ہونا راجح ہے۔[۵۴]

اس واسطے کہ "احکام القرآن لابن العربی" میں ایک روایت نقل کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جوڑا دھاری دار تھا اور مکمل طور پر سفید تھا۔ "مشمّراً" یعنی آپ نے اپنے پائینچے اس وقت چڑھائے ہوئے تھے۔[۵۵]

(۱۸) باب الصلاة في السطوح، والمنبر، والخشب،

چھتوں پر اور منبر اور لکڑیوں پر نماز پڑھنے کا بیان

"قال أبو عبد الله: ولم یر الحسن بأسا أن یصلی علی الجمد و القناطر و إن جری تحتها بول أو فوقها أو أمامها إذا کان بینهما سترة و صلی أبو هریرة علی ظهر المسجد بصلاة الامام، وصلی ابن عمر علی الثلج".

کیا جائے نماز کا جنس ارض سے ہونا ضروری ہے؟

چھتوں پر، منبر پر اور لکڑی پر نماز پڑھنے کا حکم

یہاں سے دو باتیں بیان کرنا مقصود ہے:۔

ایک مسئلہ یہ کہ جنسِ ارض کے علاوہ دوسری چیزوں پر نماز پڑھنا بھی بلا کراہت جائز ہے۔

اس کو بیان کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ حضرت امام مالک رحمہ اللہ کی طرف یہ بات منسوب ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نماز یا تو زمین پر ہو یا زمین کی جنس سے جو چیزیں ہوں، ان پر ہو۔

یعنی زمین کی جنس سے جو اگنے والی ہوں یا اس سے بنی ہوئی ہوں مثلاً یہ جو کھجور کا مصلّٰی ہوتا ہے اس پر

[۵۴، ۵۵] والحافظ ابن تیمیة رحمه الله تعالیٰ یاخذ نقول الحنفیة من هذا الکتاب، فدل علی اعتباره عنده، وحاصل مالحصت فی تلک المسألة: أن اللون ان کان من الزعفران أو العصفر کره تحریما للرجال، وغیرهما ان کان احمر قانیا کره تنزیها والا لا، وان کان مخططا بخطوط حمراء جاز بلا کراهة، وقال بعضهم باستحبابه وجاز الکل للنساء، قوله: حلة حمراء: قالوا انها کانت مخططة، قلت: ووجدت له روایة بعد تتبع بالغ فی احکام القرآن لابن العربی، فیض الباری ج:۲، ص:۱۶.

نماز ٹھیک ہے، لیکن وہ چیزیں جو جنسِ ارض سے نہ ہوں مثلاً کپڑا یا بستر تو ان کی مصلی پر نماز کو مکروہ کہتے ہیں۔ ان کی تردید کرنے کے لئے یہ بتلا دینا مقصود ہے کہ جما ہوا پانی جنس ارض سے نہیں، مگر اس پر حسن بصری رحمہ اللہ نماز کو جائز سمجھتے ہیں۔

ایک تو مقصود بالترجمہ یہ ہے اور اس مقصد کو کئی ابواب میں ظاہر کیا ہے۔ اس واسطے کہیں ''**صلوۃ علی الخمرۃ**'' فرمایا، کہیں ''**صلوۃ علی الحصیر**'' فرمایا، کہیں ''**صلوۃ علی الفراش**'' فرمایا۔

امام اور مقتدی کے اختلاف مقام کا حکم

دوسرا مسئلہ جو یہاں بطور مقصود بیان کرنا ہے وہ یہ ہے کہ امام اونچی جگہ پر ہو اور مقتدی نیچے ہوں، تو ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو فرمایا کہ یہ صورت بھی نماز کے لئے جائز ہے کہ امام اونچا کھڑا ہو جیسے منبر پر اور مقتدی نیچے ہوں۔ اس کی تفصیل میں بعض حضرات نے کہا ہے کہ ایک ذراع اونچا ہونے میں کوئی حرج نہیں، کسی نے کہا ایک بالشت اونچا ہونے میں کوئی حرج نہیں، کسی نے کہا ایک قدِ آدم کی حد تک اونچا ہونے میں کوئی حرج نہیں۔

لیکن خلاصۂ حکم یہ ہے کہ بلا عذر امام کا بلند ہونا کراہت سے خالی نہیں، لیکن اگر کوئی عذر ہو تو پھر اگر اتنی بلندی ہو جائے کہ انتقالاتِ امام کی خبر مقتدیوں کو ہو رہی ہے اور دونوں کے درمیان کوئی ایسا حائل نہیں ہے جو انتقالاتِ امام سے مقتدیوں کو بے خبر کر دے تو یہ جائز ہے۔ [۵۶]

تیسرا مسئلہ اس باب میں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ نماز کے لئے جو طہارت مکان شرط ہے اس سے مراد وہ مکان ہے جو مصلی سے متصل ہو لہٰذا اگر مصلی سے متصل مکان پاک ہے تو اس مکان سے نیچے یا اوپر یا آگے اگر کوئی نجاست بھی ہو تو نماز کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

جنس ارض کے شرط نہ ہونے پر تائید اول

اور فرمایا ''**و قال أبو عبد اللہ و لم یر الحسن بأسا أن یصلی علی الجمد و القناطر**'' کہ حسن بصری رحمہ اللہ نے اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا کہ کوئی آدمی ''**جمد**'' پر نماز پڑھے۔

طہارت مکان کی احترازی صورت

''**جمد**'' جمے ہوئے پانی کو کہتے ہیں جیسے سردیوں میں ٹھنڈے علاقوں میں پانی جم جاتا ہے، برف کی

---

۵۶ بذلک الی الجواز والخلاف فی ذلک عن بعض التابعین وعن المالکیۃ فی المکان المرتفع لمن کان اماماً قولہ قال ابوعبد اللہ ھو المصنف الخ، فتح الباری ج:۱،ص:۴۸۶، دار النشر دار المعرفۃ، بیروت سنۃ النشر ۱۳۷۹ھ، وفیض الباری ج:۲،ص:۲۴.

شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس کے اوپر نماز پڑھنے میں انہوں نے کوئی حرج نہیں سمجھا، حالانکہ وہ جنس ارض نہیں ہے۔

"والقناطر" اور پلوں پر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں یعنی اگرچہ ان کے نیچے پیشاب بہہ رہا ہو۔ یہاں سے تیسرا مسئلہ ثابت کرنا مقصود ہے۔ عام طور پر یہ ہوتا تھا کہ مثلاً گاڑیوں کے گذرنے کے لئے کوئی پل ہے اس کے نیچے مویشی وغیرہ گذرتے ہیں اور ان کے پیشاب وغیرہ وہاں بہتے رہتے ہیں یا نیچے کوئی گندا نالہ بہہ رہا ہے جس میں پیشاب بھی ہے تو اگر کوئی پل پر نماز پڑھے جبکہ نیچے پیشاب پڑا ہے، تو نیچے پیشاب پڑا ہونے کی وجہ سے پل پر نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہوگا، نماز صحیح ہو جائے گی۔

تو طہارت مکان سے مراد صرف اس مکان کی طہارت شرط ہے جہاں پر آدمی نماز پڑھ رہا ہو۔ اس کے نیچے، اس کے اوپر اگر کوئی نجس چیز ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ **"او فوقها"** اس کے اوپر اگر پیشاب ہو مثلاً پل نیچے ہو اوپر کوئی عمارت بنی ہوئی ہے اور اس کے اندر پائخانہ ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ **"أو أمامها"** یا قنطرہ کے سامنے پیشاب پڑا ہو اور آدمی قنطرہ پر نماز پڑھ رہا ہو جبکہ دونوں کے درمیان کوئی سترہ ہو۔ سترہ سے مراد یہ ہے کہ کوئی طاہر چیز بیچ میں حائل ہو۔

دوسرے مسئلہ کی دلیل

"وصلى أبو هريرة على ظهر المسجد بصلوٰة الامام".

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے چھت پر امام کی نماز کے ساتھ نماز پڑھی یعنی امام نیچے کھڑا نماز پڑھا رہا ہے اور یہ چھت پر پڑھ رہے تھے۔

"وصلى ابن عمر على الثلج" اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے نماز برف کے اوپر پڑھی۔

تو ان سب سے معلوم ہوا کہ مصلی اور جائے نماز کا جنس ارض سے ہونا ضروری نہیں ہے۔

۳۷۷ ۔ حدثنا علي بن عبد الله قال : حدثنا سفيان قال : حدثنا أبوحازم قال : سألوا سهل بن سعد : من أي شئي المنبر ؟ فقال : ما بقي بالناس أعلم مني ، هو من أثل الغابه عمله فلان مولى فلانة لرسول ﷺ ، و قام عليه رسول ﷺ حين عمل و وضع ، فاستقبل القبلة ، كبر و قام الناس خلفه فقرأ ، و ركع الناس خلفه ، ثم رفع رأسه ثم رجع القهقرى فسجد على الأرض ، ثم عاد إلى المنبر ثم ركع رأسه ثم رجع القهقرى حتى سجد بالأرض ، فهذا شأنه .

قال أبو عبدالله : قال علي ابن المديني : سألني أحمد بن حنبل رحمة الله عن هذا الحديث قال : فإنما أردت أن النبي ﷺ كان أعلى من الناس ، فلابأس أن يكون

الإمام أعلى من الناس بهذا الحديث قال : فقلت : إن سفيان بن عيينة كان يسأل عن هذا كثيراً ،فلم تسمعه منه؟قال: لا .[أنظر :۴۴۸،۹۱۷، ۲۰۹۴، ۲۵۶۹] ۵۷

منبر نبوی کی تفصیل

حدیث کا ترجمہ

لوگوں نے سہل بن سعد ﷛ سے پوچھا کہ حضور ﷺ کا منبر کس چیز سے بنا ہوا تھا؟ تو انہوں نے کہا کہ اب لوگوں میں اس منبر کو مجھ سے زیادہ کوئی جاننے والا باقی نہیں رہا۔

"**هو من أثل الغابة**" یعنی وہ جھاؤ کے درخت سے بنایا گیا تھا۔

"**غـــابة**" میں "بن" کو کہتے ہیں یعنی ایسی جگہ جہاں پر گھنے درخت ہوں، لیکن غابہ کے نام سے مدینہ طیبہ میں ایک جگہ بھی تھی، یہاں وہ مراد ہے۔

"**اثل**" جھاؤ کے درخت کو کہتے ہیں، اسی جھاؤ کے درخت سے نبی کریم ﷺ کا منبر بنا تھا۔

"**وعـمـله فلان مولى فلانة لرسول الله ﷺ**" اور نام لیا کہ "**فلان مولى فلانة**" نے اس کو رسول اللہ ﷺ کے لئے بنایا تھا۔

"**وقام عليه رسول الله ﷺ حين عمل و وضع فاستقبل القبلة كبر**".

یعنی جب پہلی بار یہ منبر بن کر آیا تو آپ ﷺ نے قبلہ کی طرف رخ فرمایا "**وكبّر**" اور تکبیر کہی۔ "**وقام الناس خلفة**" اور لوگ آپ ﷺ کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔

آپ ﷺ منبر پر کھڑے تھے اور لوگ نیچے آپ ﷺ کے پیچھے کھڑے ہو گئے، تو آپ نے قرأت کی، اور رکوع کیا لوگوں نے بھی آپ کے پیچھے رکوع کیا "**ثـم رفـع رأسـه**" پھر آپ ﷺ نے سر مبارک اٹھایا "**ثـم رجـع القهقرى**" یعنی پھر منبر سے اتر گئے۔ "**فـسـجد على الارض**" پس زمین پر سجدہ کیا "**ثـم عاد على الـمنبر**" پھر دوبارہ منبر پر تشریف لے گئے۔ "**ثـم قـرأ ثـم رفـع رأسـه ثـم رجع قهقرحتى مسجد**

---

۵۷ وفي صحيح مسلم ، كتاب المساجد ومواضع الصلاة ، باب جواز الخطوة والخطوتين في الصلاة رقم: ۸۴۷، وسنن النسائي ، كتاب المساجد ، باب الصلاة على المنبر ، رقم: ۷۳۱، وسنن أبي داؤد ، كتاب الصلاة ، باب في اتخاذ المنبر ، رقم: ۹۱۲، وسنن ابن ماجه ، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها ، باب ما جاء في بدء شأن المنبر ، رقم: ۱۴۰۶، ومسند أحمد ، باقي مسند الانصار ، باب حديث أبي مالك سهل بن سعد الساعدي ، رقم: ۲۱۷۳۵، ۲۱۷۸۶، ۲۱۸۰۱، وسنن الدارمي ، كتاب الصلاة ، باب الامام يصلي بالقوم وهو أنشز من أصحابه ، رقم: ۱۲۳۰ .

بالارض فهذا شانه ".

یہ عمل نبی کریم ﷺ نے اس لئے فرمایا تا کہ تمام صحابہ کرام ﷺ آپ کی نماز کی کیفیت دیکھ سکیں جب آپ ﷺ نیچے کھڑے ہوتے تھے جو روزمرہ کا معمول تھا تو صرف صفِ اول والے تو دیکھ لیتے تھے، لیکن پیچھے کے لوگ اچھی طرح نہیں دیکھ پاتے تھے۔ تو آپ ﷺ نے یہ عمل کیا تا کہ سب لوگ دیکھ لیں۔

عمل قلیل مفسد صلوۃ نہیں

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قلیل عمل مفسدِ صلوۃ نہیں۔ چنانچہ ایک دو قدم چلنا مفسدِ صلوۃ نہیں اور ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ منبر کی دوسری سیڑھی پر کھڑے تھے اور نیچے اترنے کے لئے آپ ﷺ کو صرف دو قدم پیچھے ہٹنا پڑا۔ تو دو قدم آگے یا پیچھے ہو جائے تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی، یہ عمل قلیل میں داخل ہے۔[۵۸]

آگے فرمایا: " **و قال أبو عبد الله قال علی بن المدینی سألنی أحمد بن حنبل عن هذا الحدیث**" امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام علی بن المدینی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مجھ سے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اس حدیث کے بارے میں پوچھا: " **قال و انما اردت أن النبی ﷺ کان أعلی من الناس** " امام علی بن مدینی رحمہ اللہ نے کہا کہ میری مراد یہ تھی کہ نبی کریم ﷺ لوگوں سے اوپر تھے۔

اور حضرت شاہ صاحب اور حضرت شیخ الحدیث رحمہما اللہ نے "لامع" میں ترجیح اس کو دی ہے کہ یہ مقولہ علی بن مدینی کا نہیں بلکہ امام احمد رحمہ اللہ کا ہے، یعنی میں اس حدیث کے بارے میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ اس سے امام کا بلند ہونے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

"**فلابأس أن یکون الامام أعلی من الناس بهذا الحدیث**" لہٰذا اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر امام لوگوں سے اونچا کھڑا ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ "**قال فقلت: فان سفیان کان یسأل عن هذا کثیر: فلم تسمعه منه قال لا**" امام علی بن مدینی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے کہا کہ سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ سے اس لئے یہ مسئلہ کثرت سے پوچھا جاتا تھا کہ امام اگر اوپر ہو اور مقتدی نیچے ہوں تو کیا حکم ہے؟ تو کیا آپ نے ان سے نہیں سنا؟ تو انہوں نے کہا "**لا**" کہ میں نے ان سے نہیں سنا۔

۳۷۸ ۔ حدثنا محمد بن عبد الرحیم قال: حدثنا یزید بن هارون قال: أخبرنا حمید الطویل، عن أنس بن مالک: أن رسول الله ﷺ سقط عن فرسه فجحشت ساقه أو کتفه، و الی من نسائه شهراً فجلس في مشربة له درجتها من

---

[۵۸] **قلت: أما مذهب أبی حنیفة فی هذا ماذکره صاحب " البدائع " فی بیان العمل الکثیر الذی یفسد الصلاة والقلیل الذی لایفسدها: فالکثیر ما یحتاج فیه الی استعمال الیدین، والقلیل مالایحتاج فیه الی ذلک الخ، عمدة القاری ج:۳، ص:۲۰۶.**

جذوع ، فأتاه أصحابه يعودونه ، فصلى بهم جالسا و هم قيام ، فلما سلم قال : (انما جعل الأمام ليؤتم به فإكبر فكبروا ، و إذا ركع فاركعوا و إذا سجد فاسجدوا ، و إن صلى قائما فصلوا قياما) ، و نزل لتسع و عشرين ، فقالو : يا رسول الله ، إنک اليت شهرا ، فقالوا : (إن الشهر تسع و عشرون) . [أنظر : ۶۸۹، ۷۳۲، ۷۳۳، ۸۰۵، ۱۱۱۴، ۱۹۱۱، ۲۴۶۹، ۵۲۰۱، ۵۲۸۹، ۶۶۸۴] ۵۹

”سقوط عن الفرس“ کا واقعہ

یہاں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے ایک گھوڑے سے ساقط ہو گئے تھے (گر گئے تھے) **”فجحشت ساقه او كتفه“** تو آپ ﷺ کی پنڈلی مبارک یا فرمایا کہ آپ ﷺ کا کندھا زخمی ہو گیا تھا۔

یہ واقعہ ۵ھ کا ہے اور حضور اقدس ﷺ غابہ کے مقام پر گھوڑے پر تشریف لے جا رہے تھے، تو گھوڑا بھاگ گیا اور کھجور کے درخت کی جڑ میں جا کر حضور ﷺ کو گرا دیا تو اس وقت آپ ﷺ کی دائیں کروٹ زخمی ہو گئی تھی۔ ۶۰

”وآلى من نسانه شهراً“.

اور یہ دوسرا واقعہ ہے کہ اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی تھی۔ یہ ایلاء لغوی تھا نہ کہ اصطلاحی، کیونکہ ایلاء اصطلاحی کے لئے ضروری ہے کہ چار مہینے کی قسم کھائے۔ یہاں آپ ﷺ نے ایک مہینہ کی قسم کھائی تھی۔

---

۵۹ وفي صحيح مسلم ، كتاب الصلاة ، باب ائتمام المأموم بالامام ، رقم: ۶۲۲ ، وسنن الترمذي ، كتاب الصلاة ، باب ماجاء اذا صلى الامام قاعداً فصلوا قعوداً ، رقم: ۳۲۹ ، وسنن النسائي ، كتاب الامامة ، باب الائتمام بالامام ، رقم: ۷۸۶ وكتاب التطبيق ، رقم: ۱۰۵۱ ، باب ما يقول المأموم ، وسنن أبي داؤد ، كتاب الصلاة ، باب الامام يصلي من قعود ، رقم: ۵۰۹ ، وسنن ابن ماجه ، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها ، باب ماجاء في انما جعل الامام ليؤتم به ، رقم: ۱۲۲۸ ، ومسند أحمد ، باقي مسند المكثرين ، باب باقي المسند السابق ، رقم: ۱۲۵۹۸ ، وموطأ مالک ، كتاب النداء للصلاة ، باب صلاة الامام وهو جالس ، رقم: ۲۸۰ ، وسنن الدارمي ، كتاب الصلاة ، باب فيمن يصلي خلف الامام والامام جالس ، رقم: ۱۲۲۸ ۔

۶۰ وكان سقوطه ﷺ عن الفرس في شهر ذي الحجة آخر سنة خمس من الهجرة الخ ، صحيح ابن حبان ج: ۵ ، ص: ۴۹۲ ، دار النشر مؤسسة الرسالة ، بيروت سنة النشر ۱۴۱۴ هـ۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی مسامحت

بعض حضرات نے یہ سمجھا جن میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ بھی شامل ہیں کہ یہ دونوں ایک ہی واقعہ میں شامل ہیں یعنی آپ ﷺ نے ازواج مطہرات ؓ کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی اور اسی حالت میں آپ ﷺ گھوڑے سے گرنے کی وجہ سے زخمی ہو گئے اور اس حالت میں آپ ﷺ نے بالا خانہ میں قیام فرمایا۔ "**مشربة**" کہتے ہیں بالا خانہ کو کہتے ہیں۔

حالانکہ مذکورہ دونوں واقعات الگ الگ ہیں۔ سقوط عن الفرس کا واقعہ الگ ہے، اس میں آنحضرت ﷺ نے معذوری کی وجہ سے بالا خانہ میں قیام فرمایا اور پھر نمازیں بھی وہیں پڑھتے رہے، مسجد نبوی میں نماز کے لئے تشریف نہیں لاتے تھے۔

اور دوسرا واقعہ ایلاء کا ہے کہ جب آپ ﷺ نے ازواج مطہرات ؓ کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی اور آپ مشربہ میں جا کر کچھ دن کے لئے مقیم ہو گئے۔ اس وقت کوئی معذوری نہیں تھی چنانچہ آپ ﷺ واپس مسجد نبوی میں تشریف لاتے تھے، لیکن راوی نے محض یہاں ادنیٰ مناسبت کی وجہ سے ذکر کر دیا کہ سقوط عن الفرس کے واقعہ میں آپ مشربہ میں مقیم رہے اور ایلاء کے واقعہ میں بھی۔ دونوں کو اکٹھا ذکر کر دیا گیا، لیکن ایسا نہیں ہے کہ دونوں ایک ہی واقعہ ہوں۔[۱۶]

"**فجلس فی مشربة لهٗ**" آپ اپنے بالا خانہ میں تشریف فرما تھے "**درجتها من جذوع**" اس کی سیڑھیاں کھجور کے شہتیروں کی بنائی ہوئی تھیں "**فاتاه أصحابه یعودونه**" تو آپ ﷺ کے صحابہ آپ کی عیادت کے لئے آئے "**فصلی بهم جالساً**" تو آپ ﷺ نے بیٹھ کر نماز پڑھائی "**وهم قیام**" اور صحابۂ کرام ؓ کھڑے تھے۔ آپ ﷺ چونکہ معذور تھے تو بیٹھ کر نماز پڑھائی، جبکہ صحابۂ کرام ؓ کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔

---

[۱۶] أن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال انما جعل الامام لیؤتم به ، الحدیث لیس فیه قصة الفرس الخ ، نصب الرایة ج: ۲ ص: ۴۳، دارالنشر دارالحدیث ، مصر سنة النشر ۱۳۵۷ ،

قال ابن حبان ، وهی واقعة السنة الخامسة ، وقال الحافظ : فی المجلد الثامن وحاصله : انها فی التاسعة قلت : وهو قطعی البطلان ، وأتعجب من مثل هذا الحافظ أنه کیف غفل عنه ولعله دعاه الیه ذکر ایلاء النبی ﷺ فی تلک الواقعة ، وکان فی السنة التاسعة ، فجعل سقوط الفرس أیضاً فیها ، والذی تحقق عندی أن قصة السقوط عن الفرس وایلاءه ﷺ ، واقعتان فی عامین مختلفین ، وانما جمعهما الراوی فی حدیث واحد لجلوسه ﷺ فی المشربة فیهما ، أما فی السقوط فلأن أصحابه یجیئون لعیادته ، وأما فی قصة الایلاء فللتخلی والتجنب عنهن قصداً ..... وهذا کله یدل علی المغایرة بین القصتین ، فکیف غفل عنه الحافظ رحمه اللّٰه تعالیٰ وجعلها فی السنة التاسعة ؟ فیض الباری ج: ۲، ص: ۲۲، ۲۱ .

بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم

"فلما سلم قال: انما جعل الامام ليؤتم به فاذا كبّر فكبّروا ،وإذا ركع فاركعوا،وإذاسجد فاسجدوا وإن صلى قائماًفصلّوا قياماً"

بعد میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ امام چونکہ اقتدا کے لئے بنایا ہے، لہٰذا اس کی اقتدا کرنی چاہئے، اگر وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھے تو تم بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور اگر وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔

مسئلۂ مذکورہ میں مذہبِ حنابلہ

اس حدیث سے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اس بارے میں استدلال فرمایا ہے کہ امام مجبوری کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھا رہا ہے تو مقتدیوں پر بیٹھ کر نماز پڑھنا لازم ہے، کھڑے ہو کر پڑھنا جائز نہیں، اس لئے کہ آپ ﷺ نے یہاں منع فرمایا ہے۔[۶۲]

جمہور کا مسلک

جمہور رحمہم اللہ کا کہنا ہے کہ اگر مقتدی معذور نہیں ہیں تو وہ کھڑے ہو کر اقتدا کریں، خواہ امام بیٹھ کر نماز پڑھا رہا ہو۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ حضور ﷺ مرضِ وفات میں بیٹھ کر امامت فرما رہے تھے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور پوری قوم پیچھے کھڑی تھی اور یہ بالکل آخری زمانہ کا واقعہ ہے، لہٰذا یہ اس حدیثِ باب کے لئے ناسخ ہے۔[۶۳]

"نزل لتسع وعشرين" آپ ﷺ بالا خانہ سے انتیس دن پورے کر کے اتر گئے۔

فقال: "یارسول ، انک آلیت شهراً"

یارسول اللہ! آپ نے تو ایک مہینہ کی قسم کھائی تھی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ مہینہ انتیس کا ہے، لہٰذا آپ ﷺ انتیس دن کے بعد اتر گئے اور یہ بالا خانہ زمین سے بلند تھا۔

انتیس دن کی حکمت

یہ جو فرمایا کہ مہینہ انتیس دن کا ہے حالانکہ کبھی تیس کا ہوتا ہے۔ تو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ایک لطیفہ نقل

۶۲، ۶۳ واعلم أن صلاة القائم خلف القاعد جائزة عندنا وعند الشافعية ، وعند أحمد رحمه الله لاتجوز ، بل تجب على القوم أن يقعدوا أيضاً وان لم يكونوا مرضىٰ لأجل هذا الحديث ، ثم قالوا : ان قعودالامام ان كان طارئاً يسع للقوم أن يقوموا ، وعند مالك : لايجوز اقتداؤه مطلقا فذهب الحنفية والشافعية الى نسخه الخ ، فيض الباری ج:۲، ص:۲۳ و" درس ترمذی" : ج:۲، ص: ۱۳۱ ۔ ۱۳۸.

کیا ہے کہ جس وقت آپ نے ازواجِ مطہرات کے پاس نہ جانے کی قسم اٹھائی، اس وقت نو ازواجِ مطہرات تھیں اور ایک باندی تھی۔ تو دوسری طرف تین دن سے زیادہ ہجران منع ہے۔ تو نو بیویوں کا ہجران تین تین دن شمار کیا جائے تو یہ ہو گئے ستائیس دن اور حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا باندی تھیں ان کے دو دن تو کل انتیس دن ہوئے۔

ایلاء کی وجہ

ایلاء کی وجہ یہ تھی کہ حضور ﷺ بعض امور پر تنبیہ کرنا چاہتے تھے، اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ازواج مطہرات نے نفقہ کی زیادتی کا مطالبہ کیا تھا، ایک واقعہ شہد والا ہے جو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے متعلق تھا، ایک واقعہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کا تھا۔ یہ مختلف واقعات تھے جن پر نبی کریم ﷺ تنبیہ فرمانا چاہتے تھے۔

(۱۹) باب :إذا أصاب ثوب المصلي امرأته إذا سجد

جب نماز پڑھنے والے کا اس کی عورت کو سجدہ کرتے وقت چھو جائے

۳۷۹ ـ حدثنا مسدد، عن خالد قال: حدثنا سليمان الشيباني، عن عبد الله بن شداد، عن ميمونه قالت : كان رسول الله ﷺ يصلي وأنا حذاءه و أنا حائض ، وربما أصابني ثوبه إذا سجد، قالت : وكان يصلي على الخمرة .[راجع :۳۳۳]

یہاں پر صرف اتنا مقصود ہے "**ربما اصابنی ثوبه اذا سجد**" کہ جب آپ ﷺ سجدے میں جاتے تو آپ کا کپڑا کبھی کبھی مجھے لگ جایا کرتا تھا، حالانکہ میں حائضہ تھی، سامنے لیٹی ہوئی تھی، تو معلوم ہوا کہ اگر کچھ مصلی کا کپڑا لگ جائے تو اس سے نماز میں کچھ فرق نہیں پڑتا اور یہ بھی بتلایا کہ آپ ﷺ خمرہ پر نماز پڑھتے تھے "**الخمرة**" چھوٹے مصلے کو کہتے ہیں۔

(۲۰) باب الصلاة على الحصير

چٹائی پر نماز پڑھنے کا بیان

"وصلى جابر بن عبد الله وأبو سعيد في السفينة قائما ،قال الحسن: قائما مالم تشق على أصحابك تدور معها وإلا فقاعدا".

"كيفية صلوة على السفينة".

حصیر یعنی چٹائی پر نماز پڑھنے کے حکم کے بارے میں یہ باب قائم کیا ہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ

اور حضرت ابو سعید خدری ﷺ نے سفینہ میں **"قائما"** کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔

سفینہ میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا جائز ہے اور بیٹھ کر بھی جائز ہے، اور اگر کھڑے ہو کر پڑھ سکتا ہو اور اس سے دورانِ راس نہ ہو تو ٹھیک ہے اور اگر دورانِ راس کا اندیشہ ہو تو بیٹھ کر پڑھ لے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سفینہ میں بیٹھ کر نماز پڑھنا علی الاطلاق جائز ہے کیونکہ اس میں غالب یہ ہے کہ سفینہ ڈولتی ہے۔

صاحبین رحمہما اللہ فرماتے ہیں اس پر مدار ہے کہ اگر کھڑے ہو کر پڑھنے پر قادر ہے تو کھڑا ہونا واجب ہے ورنہ بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے۔

امام صاحب رحمہ اللہ بھی کہتے ہیں کہ سفینہ میں چونکہ غالب یہ ہے کہ وہاں دَورانِ راس ہوتا ہے، اس واسطے غالب کو حقیقت کے قائم مقام کر دیا جائے گا، لہٰذا ہر حالت میں بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے۔

اور یہ اس زمانہ کی بات ہے جب بادبانی کشتیاں ہوا کرتی تھیں، بہت ڈولتی تھیں لیکن جب سے یہ مشین والے جہاز ایجاد ہوئے ہیں تو اس میں اس سہولت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہئے، کیونکہ اس میں آدمی کھڑے ہو کر آرام سے نماز پڑھ سکتا ہے۔[۶۴]

ریل اور بس کا بھی یہی حکم ہے کہ اگر کھڑے ہو کر پڑھ سکتا ہے، قدرت ہے تو کھڑے ہو کر ہی پڑھے، لیکن اگر قدرت نہیں ہے تو بیٹھ کر پڑھنے سے نماز ہو جائے گی، لہٰذا ریل اور بس میں اس کا لحاظ ضرور کرنا چاہئے کہ قریب میں اگر کوئی ایسا اسٹاپ آنے والا ہے، نماز کا وقت گزرنے سے پہلے آدمی وہاں پر پہنچ سکتا ہے اور نیچے اتر کر نماز پڑھ سکتا ہے تو پھر بیٹھ کر نماز نہ پڑھے۔ ہاں اگر قریب میں کوئی اسٹاپ آنے والا نہیں ہے اور نماز کا وقت نکل جانے کا اندیشہ ہے اور گاڑی میں کھڑے ہو کر پڑھنے کی کوئی جگہ مسافروں سے درخواست کے باوجود نہیں ملتی تو پھر بیٹھ کر پڑھ لینی چاہئے۔ یہی حکم ہوائی جہاز کا بھی ہے کہ اس میں اگر خیال ہو کہ ہم ایسے موقع پر اتر جائیں گے جہاں پر اتر کر وقت پر نماز پڑھ سکیں گے تو نماز کو مؤخر کر دینا چاہئے، اگر کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکے اور اگر

---

۶۴ وقال أبو حنيفة : تجوز قائماً وقاعداً بعذر وبغير عذر ، وبه قال الحسن بن مالک وأبوقلابة وطاوس ، روى عنهم ابن أبى شيبة ، وروى أيضا عن مجاهد أن جنادة بن أبى أمية قال : كنا نغزو معه لكنا نصلى فى السفينة قعوداً " أو لأن الغالب دوران الرأس فصار كالمحقق ، والاولىٰ أن يخرج ان استطاع الخروج منها ، وقال أبو يوسف ومحمد : لايجوز قاعداً الا من عذر ، لأن القيام ركن فلايترک الا من عذر ، والخلاف فى غير المربوطة ، فلوكانت مربوطة لم تجز قاعداً اجماعاً ، وقيل : تجوز عنده فى حالتى الاجراء والارساء ويلزمه التوجه عند الافتتاح كلما دارت السفينة لأنها فى حقه كالبيت ، حتى لايتطوع فيها مؤميا مع القدرة على الركوع والسجود ، بخلاف راكب الدابة ، عمدة القارى ج:۳، ص:۳۳۶.

کھڑے ہو کر پڑھنے پر قادر ہے تو پھر وقت کے اندر وہیں پڑھ لینا چاہئے۔ جہاز میں بعض جگہیں ایسی بنی ہوتی ہیں کہ اس میں آدمی کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتا ہے وہاں پر کھڑے ہو کر نماز پڑھ لینی چاہئے لیکن جب کھڑے ہو کر پڑھنے کی بالکل قدرت نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھ لینا بھی جائز ہے، لیکن احتیاط یہ ہے کہ بعد میں قضا بھی کرے کیونکہ جہاز اور سفینہ میں فرق یہ ہے کہ سفینہ میں بیٹھ کر پڑھنے کی صورت میں بھی سجدہ زمین پر ہو سکتا ہے مگر سیٹ پر بیٹھ کر نہیں ہو سکتا لیکن صریح حکم موجود نہیں۔ رہا یہ مسئلہ کہ جہاز میں فی نفسہ نماز جائز ہے کہ نہیں؟

تو بعض علمائے کرام نے یہ فرمایا کہ جہاز میں نماز نہیں ہوتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہاء کرام نے سجدے کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ: "**وضع الجبهة على الارض او على مايستقر على الهواء**" اور ہوا مستقر علی الارض نہیں، کیونکہ وہ طالب علو ہے۔ اس واسطے اس کو مستقر علی الارض نہیں کہتے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ جہاز میں بھی نماز ہو جاتی ہے۔

اور فقہاء نے جو فرمایا کہ "**وضع الجبهة على الأرض أو على مايستقر على الأرض**" اس میں ارض سے مراد وہ ہے کہ اس وقت جس ماحول میں انسان ہے اس ماحول میں اس کو ارض کہتے۔ تو جہاز کی ارض اس کا فرش ہے اس طرح وہاں سجدہ اس لئے متحقق ہو جاتا ہے، لہٰذا صحیح یہ ہے کہ جہاز میں نماز ہو جاتی ہے۔ کھڑے ہو کر قدرت ہے تو کھڑے ہو کر پڑھے اور کھڑے ہو کر قدرت نہیں ہے تو بیٹھ کر پڑھے، لیکن اس صورت میں احتیاط یہ ہے کہ بعد میں اعادہ بھی کرے۔ پس یہ اس کا خلاصہ ہے۔

البتہ یہ ہے کہ حتی الامکان قبلے کی رعایت بھی رکھے اور تحری بھی کرے۔ جہاز میں پتہ لگانا بالکل مشکل نہیں ہوتا۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ آدمی پائلٹ سے پوچھ لیتا تھا۔ اب تو مستقل نقشہ آتا رہتا ہے، اس نقشہ میں جہاز جہاں جہاں حرکت کرتا ہے اس کی سب باتیں لکھی ہوتی ہیں کہ ہم اب فلاں جگہ پہنچ گئے ہیں وغیرہ وغیرہ تو اس میں آدمی پتہ لگا سکتا ہے کہ جہت قبلہ کیا ہے۔

البتہ اگر جہت قبلہ کی طرف استقبال کی قدرت نہ ہو کہ کھڑے ہو کر پڑھنے کی جگہ باوجود کوشش کے نہیں ملی، بیٹھ کر پڑھ رہا ہے تو سیٹ پر بیٹھا ہے تو اسی پر بیٹھ کر پڑھ سکتا ہے تو اس صورت میں اس وقت نماز بیٹھ کر پڑھ لینی چاہئے، لیکن بعد میں قضا بھی کر لینا چاہئے۔

۳۸۰ ـ حدثنا عبد الله قال: أخبرنا مالك، عن إسحاق بن أبي طلحة، عن أنس بن مالك، أن جدته مليكة دعت رسول الله ﷺ لطعام صنعته له، فأكل منه، ثم قال: (قوموا فلأصلي لكم)، قال أنس: فقمت إلى حصير لنا قد أسود من طول ما لبس، فنضحته بماء، فقام رسول الله ﷺ وصففت أنا واليتيم وراءه والعجوز من ورائنا فصلى لنا رسول الله ﷺ ركعتين ثم انصرف. [أنظر ۷۲۷، ۸۶۰،

۸۷۱، ۸۷۴، ۱۱۶۴] ۶۵

ملیکہ حضرت انس ﷛ کی دادی ہیں انہوں نے ایک کھانا بنا کر رسول اللہ ﷺ کی دعوت کی، آپ ﷺ نے تناول فرمایا اور پھر فرمایا کہ میں تمہیں نماز پڑھاؤں۔ مقصد یہ تھا کہ ان کے گھر میں حضور ﷺ کی نماز کی برکت ہو۔

حضرت انس ﷛ کہتے ہیں کہ اپنی ایک چٹائی کی طرف میں کھڑا ہوا جو **"من طول مالبس"** یعنی **"من طول ماخلط من طول ما استعمل"** کثرت استعمال سے وہ سیاہ پڑ گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ میں اس کی طرف کھڑا ہوا۔ **"فنضحته بماء"** اور پانی ڈال کر اس کو صاف کیا۔

" فقام رسول اللہ ﷺ "۔

آپ کھڑے ہوئے میں نے اور یتیم نے آپ ﷺ کے پیچھے صف بنائی۔ **"یتیم"** حضرت انس ﷛ کے بھائی کا نام ہے۔ تو کہتے ہیں کہ ہم آپ ﷺ کے پیچھے تھے

"والعجوز من ورائنا" یعنی دادی ملیکہ ہمارے پیچھے کھڑی تھیں۔

تو رسول اللہ ﷺ نے دو رکعتیں پڑھائیں اور پھر تشریف لے گئے۔

حضرات شافعیہ نے اس سے جماعت فی النوافل کے جواز پر استدلال کیا ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ جماعتِ نوافل عام حالات میں مکروہ تحریمی ہے، البتہ بغیر تداعی کے ہو تو جائز ہے۔

اور تداعی کی تفصیل یہ کی ہے کہ اگر امام کے علاوہ تین آدمی ہوں تو تداعی سمجھی جائے گی، یہاں چونکہ دو ہی آدمی تھے۔ حضور ﷺ کے زمانے میں صرف دو تین واقعات ہیں۔ ایک یہ ہے اور ایک تہجد کی نماز میں حضرت ابن عباس ﷛ آپ ﷺ کے پیچھے تہجد کی نماز میں جا کے کھڑے ہو گئے تھے۔ تو دو سے زیادہ کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، اس واسطے حنفیہ کہتے ہیں کہ نوافل کی جماعت مکروہ تحریمی ہے۔ ۶۶

---

۶۵ وفی صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب جواز الجماعۃ فی النافلۃ والصلاۃ علی حصیر وخمرۃ، رقم: ۱۰۵۳، وسنن الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی الرجل یصلی ومعہ الرجال والنساء رقم: ۲۱۷، وسنن النسائی، کتاب الامامۃ، باب اذا کانوا ثلاثۃ وامراۃ، رقم: ۷۹۲، وسنن أبی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب اذا کانوا ثلاثۃ کیف یقومون، رقم: ۵۱۷، ومسند أحمد، باقی مسند المکثرین، باب مسند أنس بن مالک، رقم: ۱۱۷۵۴، ۱۱۸۹۰، ۱۲۰۴۹، ۱۲۲۱۹، وموطأ مالک، کتاب النداء للصلاۃ، باب جامع سبحۃ الضحیٰ، رقم: ۳۲۶، وسنن الدارمی، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الرجل خلف الصف وحدہ، رقم: ۱۲۵۶۔

۶۶ ولا جماعۃ فیہ عندنا وکرہ لہ التداعی ... وفسرہ الحلوانی بما فوق الثلاث ... فان قلت: ان صلاۃ الکسوف والاستسقاء والتراویح سنۃ فلزم أن لاتکون جماعۃ قلت: کأن تلک مستثناۃ من ذلک علی أنہ صرح فی الغایۃ بوجوب صلاۃ الکسوف.

فائدۃ: قال الفقہاء ان الجماعۃ فی النوافل مکروہۃ الا فی رمضان ولم یفہم مرادہم بعض الأغبیاء فحملہ علی جواز الجماعۃ فی النفل المطلق فی رمضان مع أن مرادہم التراویح لا غیر فافہمہ فان العلم لایتحصل الا بعد السیر، فیض الباری ج:۲، ص: ۲۳۲۔

(۲۱) باب الصلوة على الخمرة

خمرہ پر نماز پڑھنے کا بیان

۳۸۱۔ حدثنا أبو الوليد قال: حدثنا شعبة قال: سليمان الشيباني، عن عبد الله بن شداد عن ميمونة قالت: كان النبي ﷺ يصلي على الخمرة. [راجع: ۳۳۳]

(۲۲) باب الصلاة على الفراش

فرش پر نماز پڑھنے کا بیان

وصلى أنس فراشه وقال أنس: كنا نصلي مع النبي ﷺ فيسجد أحدنا على ثوبه.

۳۸۲۔ حدثنا إسماعيل قال: حدثني مالك عن أبي النضر مولى عمر بن عبيد الله، عن أبي سلمة بن عبد الرحمٰن، عن عائشة زوج النبي ﷺ أنها قالت: كنت أنام بين يدى رسول الله ﷺ و رجلاي في قبلته، فإذا سجد غمزني فقبضت رجلي، فإذا قام بسطتهما، قالت: و البيوت يومئذ ليس فيها مصابيح. [أنظر: ۳۸۳، ۳۸۴، ۵۰۸، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۹، ۹۹۷، ۱۲۰۹، ۶۲۷۶] ٦٧

۳۸۳۔ حدثنا يحيى بن بكير قال: حدثنا الليث، عن عقيل عن ابن شهاب قال: أخبرني عروة أن عائشة أخبرته أن رسول الله ﷺ كان يصلي وهي بينه وبين القبلة، على فراش أهله اعتراض الجنازة. [راجع: ۳۸۲]

۳۸۴۔ حدثنا عبدالله بن يوسف قال: حدثنا الليث، عن يزيد، عن عراک، عن عروة أن النبي ﷺ كان يصلي و عائشة معترضة بينه، و بين القبلة على الفراش انوى ينامان عليه [راجع ۳۸۲]

منشأ حدیث

یہ وہ معروف حدیث ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ اس حدیث کو لانے کا

---

٦٧ وفى صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب الاعتراض بين يدى المصلى، رقم: ٧٩٦، وسنن النسائى، كتاب الطهارة، باب ترک الوضوء من مس الرجل امرأته من غير شهوة، رقم: ١٦٨، ومسند أحمد، باقى مسند الانصار، باب باقى المسند السابق، رقم: ٢٤٦٩٧، وموطأ مالک، كتاب النداء للصلاة، باب ماجاء فى صلاة الليل، رقم: ٢٣٨.

منشأ یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے خود حضرت عائشہؓ کے بستر پر نماز پڑھی اور یہ فرمایا کہ اس وقت گھروں میں چراغ نہیں ہوتے تھے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت اندھیرا ہوتا تھا کہ مجھے پتہ نہیں چلتا کہ کب سجدہ کے لئے تشریف لائیں گے ورنہ میں خود پاؤں نہ پھیلاتی۔

اور یہ حدیث حنفیہ کی جانب سے مس امراۃ کے ناقض وضوء نہ ہونے کی دلیل ہے۔[۶۸]

(۲۴) باب الصلوٰۃ فی النعال

جوتیوں کے ساتھ نماز پڑھنے کا بیان

ماقبل حدیث سے **"صلوٰۃ فی النعلین"** کا جواز معلوم ہوتا ہے اور نعلین سے مراد چپل ہیں اور جہاں تک بوٹ اور جوتے کا تعلق ہے تو ان میں نماز مکروہ ہے، کیونکہ اس میں پاؤں زمین پر نہیں لگتے۔

تو حضور اقدس ﷺ نے پہلے نعال میں نماز پڑھ کر بتادیا کہ نعال میں نماز جائز اور مباح ہے۔ اگر نعال پاک ہوں تو بعض حضرات نے اس کو مستحب کہا ہے، بات دراصل یہ ہے کہ اصلاً یہ عمل جائز تھا اور ادب کے تحت کوئی شخص جوتے اتار کر نماز پڑھے تو یہ زیادہ اوفق بالتعظیم والادب ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ **"فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى"** حکم تو دیا گیا تھا اس وجہ سے کہ یہ طریقہ زیادہ ادب اور اوفق بالتعظیم تھا لیکن یہودیوں نے سمجھا کہ یہ امر وجوب کے لئے ہے، لہٰذا انہوں نے کہہ دیا کہ ہر حالت میں جوتے پہن کر نماز پڑھنا حرام ہے۔ تو یہود کی تردید کے لئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہودیوں کی مخالفت کرو اور نعال میں نماز پڑھو، دراصل یہود کی مخالفت بتانی مقصود تھی، یہ نہیں کہ اصلاً نعال میں پڑھنا مستحب تھا بلکہ اس عارض کی وجہ سے آپ نے اس کا حکم دیا تھا۔ اصل یہ ہے کہ وہ مباح ہے۔

اب اس کو واجب، مستحب یا مسنون سمجھنا اور اس کی تاکید یا اس کی ترغیب دینا، یہ اس پس منظر سے ناواقفیت کی دلیل ہے **"کما یفعله بعض الناس"**.

(۲۵) بابُ الصلاۃ في الخفاف

موزے پہنے ہوئے نماز پڑھنے کا بیان

۳۸۷ ۔ حدثنا آدم قال: حدثنا شعبة عن الأعمش قال: سمعت إبراهيم يحدث

---

۶۸ أن المرأة لاتبطل صلاة من صلى اليها، ولا من مرت بين يديه، وهو قول جمهور الفقهاء سلفاً وخلفاً. منهم أبو حنيفة و مالك والشافعي، ومعلوم أن اعتراضها بين يديه أشد من مرورها الخ عمدة القاری ج:۳، ص:۳۴۳.

عن همام بن الحارث قال: رأيت جرير بن عبد الله بال، ثم توضأ ومسح على خفيه، ثم قام فصلى، فسئل فقال: رأيت النبي ﷺ صنع مثل هذا، قال إبراهيم: فكان يعجبهم لأن جريرا كان من آخر من أسلم. ۷۹

۳۸۸ ـ حدثنا إسحاق بن نصر قال: حدثنا أبو أسامة، عن الأعمش، عن مسلم، عن مسروق، عن المغيرة بن شعبة قال: وضأت النبي ﷺ فمسح على خفيه وصلى. [راجع: ۱۸۲]

خفین پر مسح کا حکم

امام بخاری رحمہ اللہ نے موزے پہن کر نماز پڑھنے کے بارے میں باب قائم کیا جس میں حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے۔

اس کے آخر میں یہ ہے کہ علماء کرام کو حضرت جریر رضی اللہ عنہ کی حدیث پسند آتی تھی، کیونکہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں جو آخر میں اسلام لائے۔ مطلب یہ ہے کہ جو روافض مسح علی الخفین کی احادیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ سورۂ مائدہ کی آیتِ وضو سے منسوخ ہیں، تو ان کا یہ قول باطل ہے، اس واسطے کہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ سورۂ مائدہ کے نزول کے بعد آخر میں اسلام لائے۔ تو آیتِ وضو پہلے نازل ہو چکی تھی اور انہوں نے حضور ﷺ کو خفین پر مسح کرتے ہوئے دیکھا اور اس کے اوپر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔

(۲۶) باب: إذا لم يتم السجود

جب کوئی شخص سجدہ پورا نہ کرے

۳۸۹ ـ أخبرنا الصلت بن محمد، أخبرنا مهدي عن واصل، عن أبي وائل، عن حذيفة أنه رأى رجلا لا يتم ركوعه ولا سجوده، فلما قضى صلاته قال له حذيفة: ما صليت؟ قال: وأحسبه قال: لو مت مت على غير سنة محمد ﷺ.

---

۷۹ وفي صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب المسح على الخفين، رقم: ۴۰۱، وسنن الترمذي، كتاب الطهارة عن رسول الله، باب في المسح على الخفين، رقم: ۸۲، وسنن النسائي، كتاب الطهارة، باب المسح على الخفين، رقم: ۱۱۷، وسنن أبي داؤد، كتاب الطهارة، باب المسح على الخفين، رقم: ۱۳۲، وسنن ابن ماجه، كتاب الطهارة وسننها، باب ماجاء في المسح على الخفين، رقم: ۵۳۶، ومسند أحمد، اوّل مسند الكوفيين، باب ومن حديث جرير بن عبد الله عن النبي رقم: ۱۸۳۷۷.

[أنظر: ۷۹۱، ۸۰۸] ۷۰

(۲۷) باب: يبدى ضبعية ويجافي في السجود

سجدہ میں اپنے شانوں کو کھول دے اور اپنے دونوں پہلو علیحدہ رکھے

۳۹۰ ـــ أخبرنا يحيي بن بكير قال: حدثنا بكر بن مضر، عن جعفر، عن ابن هرمز، عن عبدالله بن مالک بن بحينة أن النبي ﷺ كان إذا صلى فرج بين يديه حتى يبدو بياض إبطيه. وقال الليث: حدثني جعفر بن ربيعة نحوه. [أنظر: ۸۰۷، ۳۵۶۴] ۷۱

یہاں دو باب ایک ساتھ ذکر کئے ہیں۔ دونوں ابواب کا مقصد الگ الگ ہے۔

سجدہ کی کیفیت کا بیان

پہلا باب اس بارے میں ہے کہ اگر کوئی شخص سجدہ تام نہ کرے یعنی اس میں تعدیل ارکان نہ ہو تو اس کی نماز تام نہیں ہوتی اور اس میں مشہور حدیث روایت کی ہے کہ حضرت حذیفہ ؓ نے ایک شخص کو دیکھا جو رکوع وسجود پورا نہیں کر رہا تھا۔ جب اس نے نماز پوری کی تو حضرت حذیفہ ؓ نے ان سے کہا کہ "**ماصليت**" کہ تو نے نماز نہیں پڑھی۔ قال: "**لومت مت على غير سنة محمد ﷺ**"۔

اسی طرح دوسرے باب: "**باب يبدى ضبعيه ويجافى فى السجود**" میں یہ مسئلہ بیان ہوا ہے کہ جب آدمی سجدہ میں جائے تو اپنے بازوؤں کو باہر نکال لے اور اس کو اپنے پہلو سے الگ کرلے۔ تو اس میں حضرت عبداللہ بن مالک بن بحینہ ؓ کی روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز پڑھتے تھے تو "**فرج بين يديه**" اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان فاصلہ رکھتے تھے۔ "**حتى يبدو بياض ابطيه**" یہاں تک کہ آپ کے ابطین مبارکتین کی سفیدی ظاہر ہوتی تھی۔

بلا مناسبت آنے والے دو باب

ان دونوں بابوں کا تراجم ابواب سے کوئی تعلق نظر نہیں آرہا، اس واسطے کہ اب تک جو بات چل رہی تھی

---

۷۰ وفي مسند أحمد، باقي مسند الأنصار، باب حديث حذيفة بن اليمان عن النبي، رقم: ۲۲۱۷۲، ۲۲۲۷۱.

۷۱ وفي صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب ما يجمع صفة الصلاة وما يفتتح به ويختم به الخ رقم: ۷۶۴، وسنن النسائي، كتاب التطبيق، باب صفة السجود، رقم: ۱۰۹۴، ومسند أحمد، باقي مسند الانصار، باب حديث عبد الله بن مالک ابن بحينة، رقم: ۲۱۸۴۵.

وہ سترِ عورت سے متعلق تھی اور آگے جو احادیث اور ابواب آرہے ہیں وہ استقبال قبلہ سے متعلق ہیں اور یہ دو باب بیچ میں آگئے۔ جن میں "**باب اذلم یتم السجود**" میں گویا سجدہ کی کیفیت کا بیان ہے کہ سجدہ کس طرح ہونا چاہیئے تو اس کا صحیح محل وہ ہے جو ابواب آگے آئیں گے اور جن میں صلوٰۃ اور سجدہ کی صفت کا بیان ہے وہاں پر یہ آنے چاہئیں اور وہاں یہ بعینہ آئے بھی ہیں، اس واسطے بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ یہ نسّاخ کی غلطی ہے۔ کہیں غلط فہمی ہوئی ہے کہ وہاں سے یہ منتقل ہو کر یہاں آگئے ہیں۔ بعض حضرات نے کہا کہ نہیں یہ اپنی جگہ پر ہیں اور دو راز کار قسم کی توجیہات بیان کی ہیں کہ جس سے اس کا تعلق کچھ سترِ عورت وغیرہ سے نکل آئے لیکن یہ توجیہات بہت دور کی ہیں، ایسے ہی ہیں جیسے ۔

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا

کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

تو اس قسم کی توجیہات کی گئیں ہیں جو خواہ مخواہ کی ہیں، اس میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

ظاہر یہ لگتا ہے کہ یہ غلطی نساخ سے ہوئی ہے۔ چنانچہ بعض بخاری کے نسخے ایسے ہیں کہ ان میں یہاں پر یہ دو باب نہیں ہیں اور آگے جا کر آئے ہیں، لہٰذا ظاہر یہی لگتا ہے کہ ناسخ کی غلطی سے ایسا ہو گیا ہے۔

(۲۸) باب فضل استقبال القبلة

استقبال قبلہ کی فضیلت کا بیان

" قاله أبو حميد عن النبي ﷺ ".

۳۹۱ ـ حدثنا عمرو بن عباس قال : حدثنا ابن المهدي قال : حدثنا منصور بن سعد ، عن ميمون بن سياه ، عن أنس بن مالك ، قال : قال رسول الله ﷺ : (من صلى صلاتنا واستقبل قبلتنا وأكل ذبيحتنا فذلك المسلم الذي له ذمة الله وذمة رسوله، فلا تخفروا الله في ذمته). [أنظر: ۳۹۲، ۳۹۳]

۳۹۲ ـ حدثنا نعيم قال: حدثنا ابن المبارك، عن حميد الطويل ، عن أنس بن مالک قال : قال رسول الله ﷺ : (أمرت أن أقاتل الناس حتى يقولوا: لا إله إلا الله ، فإذا قالوها وصلوا صلاتنا، واستقبلوا قبلتنا، وذبحوا ذبيحتنا فقد حرمت علينا دماؤ هم وأموالهم إلا بحقها وحسابهم على الله). [راجع: ۳۹۱]

۳۹۳ ـ وقال ابن أبي مريم : أخبرنا يحيى قال : حدثنا حميد قال : حدثنا

أنس عن النبي ﷺ . و قال علي بن عبد الله : حدثنا خالد بن الحارث قال : حدثنا حميد قال : سأل ميمون بن سياه أنس بن مالک قال : يا أبا حمزة ، ما يحرّم دم العبد و ماله ؟ فقال : من شهد أن لا إله إلاّ الله و استقبل قبلتنا ، و صلى صلاتنا ، و أكل ذبيحتنا فهو المسلم له ما للمسلم ، و عليه ما على المسلم .۲۷

نماز کی دوسری شرط استقبال قبلہ کا بیان

یہاں سے امام بخاری رحمہ اللہ نماز کی شرائط میں سے نماز کی دوسری شرط استقبال قبلہ کا بیان فرما رہے ہیں۔ ستر عورت کے ابواب ختم ہو گئے اور اب استقبالِ قبلہ کے متعلق ابواب شروع ہو رہے ہیں۔ استقبال قبلہ کی فضیلت کے بیان میں باب قائم کیا اور اس میں فرمایا **"یستقبل باطراف رجلیه القبلة"** کہ اپنے پاؤں کی انگلیوں کو بھی قبلہ رخ کرے، یعنی آدمی کو چاہیئے کہ وہ اپنے پاؤں کی انگلیوں کو بھی قیام میں اور رکوع وسجود میں قبلہ رخ کر لے۔ قیام میں کھڑا ہو تو بھی رجلین کی اصابع قبلہ کی جانب ہونی چاہئیں، لہٰذا اس طرح کھڑا ہونا چاہیئے کہ انگلیوں کا رخ قبلہ کی جانب ہو۔ **"قاله ابو حميد عن النبی ﷺ"**.

حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ نے یہ بات نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے اور آگے خود بھی آجائیگی **انشاء اللہ** تو رکوع میں بھی اسی طریقے سے اور سجدہ میں بھی۔ سجدہ میں اس واسطے انگلیوں کو موڑنے کا حکم ہے کہ انگلیوں کو موڑ کر قبلہ رخ کر لیا جائے تاکہ جسم کے زیادہ سے زیادہ اعضاء کا رخ قبلہ کی طرف ہو۔

اِسلام میں عہد و پیمان کی اہمیت

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: **"من صلی صلوٰتنا"** جو ہماری نماز پڑھے۔

"واستقبل قبلتنا" اور ہمارے قبلہ کا استقبال کرلے: **"واكل ذبيحتنا"** اور ہمارا ذبیحہ کھائے۔ تو وہ مسلمان ہے۔ جس کے لئے اللہ اور رسول اللہ کا ذمہ ہے یعنی اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے اس کے خون، جان و مال عزت وآبرو کی ذمہ داری لی ہے۔

---

۲۷ وفی سنن الترمذی ، کتاب الایمان عن رسول اللہ ، باب ماجاء أمرت أن أقاتل الناس حتی یقولوا لااله الا اللہ الخ رقم: ۲۵۳۳، وسنن النسائی ، کتاب التحریم الدم ، رقم: ۳۹۰۳، وکتاب الایمان وشرائعه ، باب صفة المسلم ، رقم: ۴۹۱۱، وسنن أبی داؤد ، کتاب الجهاد ، باب علی مایقاتل المشرکون رقم: ۲۲۷۱، ومسند أحمد ، باقی المسند المکثرین ، باب باقی المسند السابق ، رقم: ۱۲۵۸۳، ۱۲۸۶۹ .

"فلا تخفرو اللہ فی ذمتہ" لہٰذا اللہ تعالیٰ کی جو ذمہ داری ہے اس میں اس کی بے حرمتی نہ کرو۔

"لاتخفرو اللہ: اخفر یخفر" کے معنی اصل میں ہوتے ہیں بدعہدی کرنا۔

تو اللہ ﷻ کے ذمہ کی بدعہدی نہ کرو یعنی جب اللہ ﷻ نے ان کی جان، مال، عزت وآبرو کا تحفظ کیا ہے اور اس کو اپنی ذمہ داری قرار دیا ہے تو پھر اگر تم اس کی جان یا مال یا آبرو پر حملہ کرو گے تو وہ اللہ ﷻ کے ساتھ بدعہدی ہوگی، اللہ ﷻ کے عہد کو توڑنا ہوگا، اس لئے ایسا نہ کرو۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص ان ظاہری شعائر کے ذریعہ مسلمان نظر آرہا ہو تو اس کو تم یہ نہ سمجھو کہ یہ منافق ہے کہ اس کو قتل کردو یا اس کے مال کو چھین لو یا اس کی آبرو پر حملہ آور ہو تو یہ جائز نہیں۔

یہاں اس حدیث کو لانے کا منشأ استقبال قبلہ کی فضیلت بیان کرنا ہے۔ ترجمۃ الباب بھی وہی قائم کیا ہے کہ **"باب فضل استقبال القبلة"**۔

حدیث کی ترجمۃ الباب سے مناسبت

اس سے استقبالِ قبلہ کی فضیلت اس طرح نکل رہی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے استقبال قبلہ کو شعائرِ اسلام میں سے قرار دیا ہے اور مسلمان کی بنیادی علامتوں میں سے ایک علامت قرار دیا ہے، اُن علامتوں میں اس کا شمار کیا ہے جس کے ذریعہ مسلمان، مسلمان پہچانا جاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ استقبالِ قبلہ ایک حکم تو ہے ہی، لیکن حکم ہونے کے ساتھ ساتھ یہ شعائر اسلام میں سے بھی ہے، جس کے ذریعے مسلمان کی پہچان ہوتی ہے۔ تو یہ استقبالِ قبلہ کی فضیلت پر دلالت کرتا ہے۔

حدیثِ باب کا صحیح مطلب ومفہوم

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ حدیث مبارک **"من صلّی صلو تنا واستقبل قبلتنا وأكل ذبيحتنا"**۔

اس میں جو تین باتیں بیان کی گئی ہیں ان کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو آدمی یہ تین کام کرلے تو وہ لازماً مسلمان ہوگا، چاہے دوسرے ضروریاتِ دین کا انکار کرتا ہو، یہ مراد نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ تین باتیں اس بات کی علامت ہیں کہ وہ ضروریاتِ دین کا قائل ہے۔ تو جب تک اس کے خلاف کوئی بات ثابت نہ ہو۔ اس وقت تک ان علامتوں کو اس کے ضروریات دین کے قائل ہونے کی علامت سمجھا جائے گا اور اس پر مسلمان کے احکام جاری ہونگے۔

لیکن اس کے باوجود یہ مطلب نہیں کہ سارا دین ان تین چیزوں میں منحصر ہے اور اگر کوئی نماز پڑھے اور استقبالِ قبلہ کرلے اور مسلمانوں کا ذبیحہ کھائے تو وہ ہر حالت میں مسلمان ہے، چاہے وہ کھلم کھلا حضور ﷺ کی رسالت

کا یا آخرت کا یا ملائکہ کا انکار کرے، مثلاً کوئی نماز تو پڑھ رہا ہے لیکن روزہ اور حج کا منکر ہے تو وہ مسلم نہ ہوگا۔

حدیث باب سے مرزائی اور منکرین حدیث کا باطل استدلال

لہٰذا اس حدیث کو جو قادیانیوں یا منکرینِ حدیث نے پیش کیا ہے اور اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ دیکھو حضور ﷺ تو فرماتے ہیں کہ جو کوئی نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کا استقبال کرے اور ذبیحہ کھائے تو وہ مسلمان ہے اور ہمیں خواہ مخواہ لوگ کافر کہتے ہیں۔ ہم تو نماز بھی پڑھتے ہیں۔ قادیانی جو ہیں نماز پڑھتے ہیں اور قبلہ کا استقبال بھی کرتے ہیں اور مسلمانوں کا ذبیحہ بھی کھاتے ہیں۔

منکرینِ حدیث بھی ایسے ہی ہیں لیکن ان پر کفر کا فتویٰ عائد کیا گیا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ دیکھو جی! باوجود ان تین چیزوں کی پابندی کے ہم پر کفر کا فتویٰ عائد کیا گیا ہے۔

اسلام اور کفر کا صحیح معیار

تو یہ فتویٰ اس لئے عائد کیا گیا ہے کہ یہ علامتیں ہیں، یہ جامع مانع تعریف نہیں ہے۔ مسلمانوں کی جامع مانع تعریف وہ ہے کہ جو دوسری احادیث (مسلم وغیرہ) میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمائی کہ **"ان یؤمنو بی وبما جئت به"** آدمی ہر اس چیز پر ایمان لائے جو میں لے کر آیا ہوں۔ تو جس چیز کا دین میں ہونا ضروریات دین میں سے ہے، اس میں سے کسی چیز کا انکار موجود ہے تو وہ موجب کفر ہوگا، چاہے یہ علامت اس میں پائی جا رہی ہو، کیونکہ علامت کے وجود سے ذوالعلامۃ کا وجود لازم نہیں ہوتا۔[۳۷]

(۲۹) باب قبلة أهل المدينة وأهل الشام والمشرق،

مدینہ اور شام والوں کا قبلہ اور مشرق والوں کا قبلہ

ليس في المشرق ولا في المغرب قبلة لقول النبي ﷺ: (لا تستقبلوا القبلة بغائط أو بول، ولكن شرقوا أو غربوا)

اس باب کی تشریح میں شراحِ بخاری کافی حیران و پریشان اور سرگرداں ہوئے ہیں۔ اس واسطے کہ ترجمۃ الباب کا فقرہ کچھ عجیب و غریب قسم کا نظر آتا ہے، اس کی ترتیب کیا ہے؟ اور کیا مقصود ہے؟ یہ واضح نہیں ہوتا۔ اس واسطے لوگوں نے اس کی مختلف توجیہات کی ہیں۔

---

۳۷ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: فیض الباری ج:۲، ص:۲۹، باب فضل استقبال القبلة.

ترجمۃ الباب سے مقصودِ بخاری

پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ترجمۃ الباب کے قائم کرنے سے امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ قبلہ سارے عالم کے لئے کسی ایک جہت میں واقع نہیں ہے یعنی یہ نہیں کہہ سکتے کہ قبلہ ہر جگہ مغرب میں ہے یا ہر جگہ مشرق میں ہے یا ہر جگہ شمال میں ہے۔ یا ہر جگہ جنوب میں ہے۔ بلکہ جہاں بھی انسان رہتا ہے۔ یا جہاں انسان موجود ہے اس سے قبلہ کسی جہت بھی ہو وہ قبلہ ہوگا یعنی کعبۃ اللہ جس جہت میں بھی ہو وہ قبلہ ہے، چاہے وہ مغرب میں ہو، مشرق میں ہو، شمال میں ہو یا جنوب میں ہو۔

اب ہمارے اطراف میں یہ قبلہ مغرب میں ہے اور مدینہ طیبہ میں جنوب میں ہے، یورپ چلے جاؤ تو وہاں مشرق میں ہے۔ امریکہ چلے جاؤ تو وہاں شمال مشرق میں ہے۔ اگر کوئی افریقہ کی طرف چلا جائے تو وہاں سے قبلہ شمال میں ہوگا۔

اس واسطے ہر جگہ کا قبلہ اور اس کی جہت مختلف ہو سکتی ہے۔ اصل مقصود ترجمۃ الباب کے قائم کرنے سے یہ بیان کرنا ہے، جو اس ترجمۃ الباب کی صحیح تشریح ہے۔

علامہ ابن بطال رحمہ اللہ کی توجیہ

اب یہ مقصد کس طرح حاصل کیا جائے، اس میں ایک توجیہ تو علامہ ابن بطال رحمہ اللہ نے کی ہے۔

علامہ ابن بطال رحمہ اللہ بڑے فاضل بزرگ اور مالکی عالم ہیں اور بخاری کے بہترین شارح ہیں، لیکن اس جگہ انہوں نے ایسی توجیہ کی ہے کہ تمام شراح نے اس توجیہ کی تردید کی ہے۔

ابن بطال رحمہ اللہ نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ یہ کہ **"اھل الشام والمشرق"** سے ساری دنیا کے مشرق والے مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ہر جگہ مشرق یا مغرب کی طرف رخ کر کے قضاء حاجت جائز ہے، سوائے ان مقامات کے جو مکہ مکرمہ میں مشرق سے مغرب کی طرف جانے والے خط پر واقع ہوں، کہ ان کے لئے قضاء حاجت کے وقت مشرق یا مغرب کی طرف رخ کرنا جائز نہ ہوگا، کیونکہ قبلہ عین مشرق یا عین مغرب میں ہوگا، لہٰذا ترجمۃ الباب میں ان بلاد کا ذکر ہے جو اس خط پر واقع نہ ہوں، لیکن اس توجیہ کو اس لئے درست قرار نہیں دیا گیا کہ ترجمۃ الباب ان بلاد پر منطبق نہیں ہوتا، جو مکہ مکرمہ کے خط مشرق و مغرب پر واقع ہوں۔

صحیح توجیہ

اس کی صحیح تشریح علامہ عینی اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ نے بیان فرمائی ہے کہ اس کی دو توجیہ ہو سکتی ہیں:

پہلی توجیہ:۔پہلی توجیہ یہ ہے کہ "**بابٌ**" یہ تنوین کے ساتھ ہے۔ یہ "**بابٌ**" مابعد کے لئے مضاف نہیں ہے۔ بلکہ "**بابٌ**" منوّن ہے اور مستقل جملہ ہے کہ "**ھذا باب**" اور عبارت یہ ہے کہ "**قبلة اهل المدينة واهل الشام والمشرق ليس فى المشرق ولافى المغرب**".

اور آخر میں جو "**قبلة**" لکھا ہے یہ لفظ "**قبلة**" غلط ہے۔

چنانچہ بعض نسخوں میں یہ لفظ "**قبلة**" یہاں پر موجود نہیں ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے کہ "**بابٌ قبلة أهل المدينة وأهل الشام والمشرق ليس فى المشرق ولافى المغرب**".

تو "**قبلة أهل المدينة وأهل الشام والمشرق**" مبتدا ہے، اور "**ليس فى المشرق ولافى المغرب**" اس کی خبر ہے۔

کیا معنی کہ اہلِ مدینہ، اہل شام اور اہلِ مشرق کا قبلہ نہ مشرق میں ہے نہ مغرب میں ہے، اہلِ مدینہ کا قبلہ اور اہل شام کا قبلہ اور تمام اہل مشرق اس لئے کہا کہ مدینہ منورہ سے جتنے بھی ملک مشرق کی جانب واقع ہیں مسلمانوں کی زیادہ آبادی اسی مشرق کی طرف تھی، اگرچہ مغرب کا بھی حکم یہی ہے، لیکن مغرب میں چونکہ زیادہ تر مسلمان آباد نہیں تھے، بلکہ زیادہ تر مسلمان مشرق کی سمت میں تھے، اس واسطے خاص طور سے مشرق کا ذکر کر دیا اور مغرب کا ذکر نہیں کیا ورنہ حکم اس کا بھی یہی ہے، چاہے قبلہ ہو اہل مدینہ کا، یا اہلِ شام کا، یا اہل مشرق کا۔ وہ نہ مشرق میں ہے نہ مغرب میں ہے یعنی دائماً یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہر آدمی کا قبلہ مشرق میں ہے یا ہر ایک کا مغرب میں ہے بلکہ ان سب حضرات کا جو قبلہ ہے، مثلاً اہلِ مدینہ کا جنوب میں ہے، اہلِ شام کا بھی جنوب میں ہے، اہل مشرق میں جو لوگ سیدھے مشرق میں رہتے ہیں یعنی مکہ مکرّمہ سے تو ان کا قبلہ مغرب میں ہوگا جیسے ہم لوگ اور اگر کوئی دائیں بائیں ہٹ گیا ہے تو اسی حساب سے اس کا قبلہ بنے گا، کہیں شمال مغرب، کہیں جنوب مغرب۔

تو اس توجیہ کا حاصل یہ ہے "**بابٌ**" منوّن ہے اور آخر میں جو "**قبلة**" کا لفظ لکھا ہوا ہے وہ غلط ہے کسی کاتب کی غلطی ہے۔

اور "**قبلة أهل المدينة و أهل الشام و المشرق**" مبتدا ہے۔

اور "**ليس فى المشرق ولافى المغرب**" اس کی خبر ہے۔

دوسری توجیہ:۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ "**بابُ**" منوّن نہیں ہے بلکہ یہ مضاف ہے مابعد کی طرف اور آخر میں "**قبلةٌ**" کا لفظ صحیح ہے۔ تو تقدیر عبارت یوں ہے کہ:

"**باب قبلة اهل المدينة واهل الشام والمشرق**" یعنی "**ھذا باب قبلة اهل المدينة واهل الشام والمشرق**" یہ باب قبلہ کے بیان میں ہے، یہ باب کا عنوان قائم کر دیا۔[۴۷]

---

[۴۷] فتح الباري ج:۱، ص:۴۹۸، دارالمعرفة، عمدة القاري ج:۳، ص:۳۶۴.

آگے جیسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ ہوتا ہے کہ ترجمۃ الباب میں کوئی حکم شرعی بھی بیان کر دیتے ہیں تو اس حکم شرعی کے بیان کرنے کے طور پر آگے کہہ دیا کہ **"لیس في المشرق ولافي المغرب قبلة"** کہ مشرق میں یا مغرب میں قبلہ نہیں ہے، بلکہ اصل اعتبار اس کا ہے کہ مصلّی سے کعبہ کس جہت میں واقع ہے، جس جہت میں بھی واقع ہو وہاں قبلہ ہو جائیگا۔

تو اس صورت میں باب کا عنوان پورا ہوا۔ **"باب قبلة أهل المدينة وأهل الشام والمشرق"۔**

آگے پھر یہ قاعدہ بیان کر دیا کہ نہ مشرق میں کوئی قبلہ ہے نہ مغرب میں ہمیشہ کوئی قبلہ ہے بلکہ ہر جگہ کے مناسب اس جگہ کی جہت کے اعتبار سے ہوگا۔ یہ دوسری توجیہ ہے اور یہ دونوں توجیہیں ٹھیک ہیں اور صحیح توجیہات یہ دو ہی ہیں اور مقصود بھی یہی ہے کہ دائمی اور ابدی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ساری دنیا کے لئے قبلہ کسی خاص ایک جہت میں ہے، بلکہ ہر جگہ کے لحاظ سے قبلہ کی جہت بدلتی رہتی ہے:

"لقول النبی ﷺ لا تستقبلوا القبلة بغائط أوبول"۔

اس واسطے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ غائط اور بول کے وقت میں استقبال قبلہ نہ کرو۔

"ولكن شرّقوا أوغرّبوا"

لیکن یا مشرق کا رخ کرو یا مغرب کا۔ تو مقصود ہے استنجا کے وقت میں کعبہ کے استقبال واستدبار سے ممانعت کرنا کہ کعبہ کا استقبال واستدبار نہ کرو، اور پھر کہا گیا کہ مشرق کا رخ کرو یا مغرب کا۔

تو معلوم ہوا کہ مشرق ومغرب کی جہت میں قبلہ نہیں ہے کیونکہ اگر مشرق ومغرب میں قبلہ ہوتا تو آنحضرت ﷺ اس کی طرف استنجا کے وقت میں رخ کرنے کی اجازت نہ دیتے، کیونکہ آپ نے خود استنجا کے وقت میں استقبال قبلہ کی ممانعت فرمائی۔ آگے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی ہے۔

۳۹۴۔ حدثنا علي بن عبدالله قال: حدثنا سفيان قال: حدثنا الزهري عن عطاء ابن يزيد عن أبي أيوب الأنصاري أن النبي ﷺ قال: (إذا أتيتم الغائط فلا تستقبلوا القبلة ولا تستدبروها، ولكن شرّقوا أوغرّبوا)

قال أبو أيوب: فقدمنا الشام فوجدنا مراحيض بنيت قبل القبلة فننحرف ونستغفر الله تعالى. وعن الزهري، عن عطاء، قال: سمعت أباأيوب عن النبي ﷺ مثله. [راجع: ۱۴۴]

اس میں جو اختلاف فقہاء کرام ہے وہ تفصیل سے ترمذی شریف میں مذکور ہے، اور اس میں یہی ہے کہ **"ولكن شرّقوا اوغرّبوا"۔**

(۳۰) باب قوله تعالى:

﴿وَاتَّخِذُوْا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى﴾ [البقرة: ۱۲۵]

اللہ جل جلالہ کا فرمانا کہ مقام ابراہیم کو مصلّٰی بناؤ

تشریح باب

یہ باب بھی بظاہر استقبالِ قبلہ کے متعلق معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ یہاں یہ کہا جارہا ہے کہ مقامِ ابراہیم پر نماز پڑھو، اور طواف کے بعد وہاں پر نماز پڑھی جاتی ہے، لیکن یہاں امام بخاری رحمہ اللہ اس باب کو اس لئے لائے ہیں کہ اس آیتِ کریمہ کی ایک تفسیر بعض حضرات نے یہ فرمائی ہے کہ مقامِ ابراہیم سے مراد پورا حرم ہے، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہاں کھڑے ہوکر بیت اللہ کی تعمیر کی تھی، لہٰذا وہ خاص پتھر مراد نہیں ہے بلکہ پورا حرم مراد ہے اور "مصلّٰی" سے مراد قبلہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ مقام ابراہیم کو یعنی حرم کو قبلہ بناؤ۔ تو اس آیتِ کریمہ کی ایک تفسیر تو یہ ہے کہ یہ استقبالِ قبلہ کا حکم دینے کیلئے آئی ہے اور مقام ابراہیم سے مراد حرم ہے اور "مصلّٰی" سے مراد قبلہ ہے، لہٰذا مطلب یہ ہے کہ مقامِ ابراہیم کو قبلہ بناؤ، حرم کو قبلہ بناؤ۔ اگرچہ مشہور تفسیر وہی ہے کہ مقامِ ابراہیم سے مراد پتھر ہے جس پر کھڑے ہوکر ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ شریف کی تعمیر کی تھی اور وہ اب بھی موجود ہے، اور اسی جگہ پر ہے جہاں آپ ﷺ نے رکھا تھا۔[۵۷]

طواف کے بعد نماز کا حکم

مقام ابراہیم پر طواف کے بعد نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے کہ طواف کے بعد کی دو رکعتیں واجب طواف ہیں، معروف تفسیر یہی ہے اور اس معروف تفسیر کے مطابق آگے جو حدیث آئی ہے وہ اسی کے مطابق لائے ہیں۔

لیکن اس معروف تفسیر کے مطابق سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ استقبالِ قبلہ سے اس کا کوئی واضح جوڑ نظر نہیں آتا، البتہ ایک مخفی قسم کا جوڑ ہے اور وہ یہ کہ وہاں مقام ابراہیم پر طواف کے بعد جو نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اس

---

[۵۷] وهذا بنا على أن المراد بمقام ابراهيم الحجر الذى فيه آثر قدميه هو موجود الى الآن، وقال مجاهد: المراد بمقام ابراهيم الحرم كله والأوّل أصح، فتح البارى، ج: ۱، ص: ۴۹۹.

کا طریقہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ مصلی اس طرح نماز پڑھے کہ مقام ابراہیم اس کے اور کعبہ کے درمیان آجائے۔ تو جب مقام ابراہیم کو درمیان میں لے کر نماز پڑھے گا تو استقبال قبلہ کا ہوگا تو **"واتخذوا من مقام ابراهيم مصلى"** سے لازمی طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قبلہ کا استقبال کرنا چاہیئے، اس لحاظ سے اس کو باب سے مناسبت ہے۔

۳۹۵ ۔ حدثنا الحميدي قال : حدثنا سفيان قال : حدثنا عمرو بن دينار قال: سألنا ابن عمر عن رجل طاف بالبيت العمرة و لم يطف بين الصفا و المروة، أيأتي امرأته؟ فقال : قدم النبي ﷺ فطاف بالبيت سبعا و صلى خلف المقام ركعتين، و طاف بين الصفا و المروة، و قد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة. [أنظر: ۱۶۲۳، ۱۶۲۷، ۱۶۴۵، ۱۶۴۷، ۱۷۹۳]

۳۹۶ ۔ و سألنا جابر بن عبد الله فقال : لا يقربنها حتى يطوف بين الصفا و المروة . [أنظر : ۱۶۲۴، ۱۶۴۶، ۱۷۹۴] ۷۶

عمرہ کی ادائیگی میں سعی سے پہلے مجامعت کا حکم

عمرو بن دینار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک شخص کے بارے میں پوچھا جس نے عمرہ کے لئے بیت اللہ شریف کا طواف کر لیا تھا یعنی اس نے عمرہ کا احرام باندھا تھا اور بیت اللہ کا طواف کر لیا **"ولم يطف بين الصفا والمروة"** لیکن صفا اور مروہ کے درمیان ابھی سعی نہیں کی۔

"أيأتي إمرأته :" تو کیا اس حالت میں جبکہ طواف کر چکا ہے ابھی سعی نہیں کی اپنی بیوی کے پاس جا سکتا ہے؟ یعنی اگر کوئی اتنا جلد باز آدمی ہو کہ اس کو سعی کرنے کا بھی انتظار نہ ہو اور طواف کر کے ہی مجامعت کرنا چاہتا ہے، آیا اس کے لئے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ حرم میں تشریف لائے۔

"فطاف بالبيت سبعاً ": سات چکر بیت اللہ کے لگائے۔ **"وصلى خلف المقام ركعتين"** مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھی یہ ہے موضع ترجمہ کہ اس سے استقبال قبلہ لازم آیا۔

"وطاف بين الصفا والمروة" : پھر آپ نے سعی فرمائی۔

---

۷۶ وفي صحيح مسلم ، كتاب الحج، باب ما يلزم من احرم بالحج ثم قدم مكة من الطواف ، رقم: ۲۱۷۲، وسنن النسائي كتاب مناسك الحج ، باب طواف من اهل بعمرة ، رقم: ۲۸۸۱، ومسند أحمد ، باقي مسند المكثرين ، باب مسند جابر بن عبد الله رقم: ۱۳۷۹۷.

تو مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے دونوں کے درمیان کوئی فصل نہیں کیا اور عمرے کی تکمیل سعی پر ہوئی۔

"لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة و سألنا الخ" یعنی یہ ہی مسئلہ (مذکورہ) عمرو بن دینار نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ **"لا يقربنها"** اس کے قریب بھی نہ جائے جب تک کہ صفا و مروہ کی سعی نہ کر لے۔ چنانچہ اس بات پر تمام فقہاء متفق ہیں کہ عمرے کی تکمیل سے پہلے مجامعت جائز نہیں ہے۔

۳۹۷ ـ حدثنا مسدد قال : حدثنا يحيىٰ، عن سيف ، قال : سمعت مجاهداً قال : أتي ابن عمر فقيل له : هذا رسول الله ﷺ دخل الكعبة ، فقال ابن عمر : فأقبلت و النبي ﷺ قد خرج و أجد بلالاً قائماً بين البابين ، فسألت بلالاً فقلت : أصلى النبي ﷺ في الكعبة ؟ قال : نعم ، ركعتين بين الساريتين على يساره اذا دخلت ، ثم خرج فصلى في وجه الكعبة ركعتين . [أنظر :۴۶۸، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۱۱۶۷، ۱۵۹۸، ۱۵۹۹، ۲۹۸۸، ۴۲۸۹، ۴۴۰۰]

حدیث کا ترجمہ

"أتي ابن عمر فقيل له :هذا رسول الله دخل الكعبة " یعنی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ لوگ آئے اور ان سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کعبہ میں داخل ہوئے ہیں یعنی کسی نے آکر ابن عمر رضی اللہ عنہ کو خبر دی کہ آپ یہاں بیٹھے ہیں اور حضور اکرم ﷺ تو کعبہ میں تشریف لے گئے ہیں۔

تو ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں کعبہ کی طرف آیا جبکہ آپ ﷺ کعبہ سے نکل چکے تھے تو میں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ دونوں دروازوں کے درمیان کھڑے ہیں یعنی دروازے کے دونوں کواڑوں کے درمیان، تو میں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ نے کعبے میں نماز پڑھی تو انہوں نے کہا کہ ہاں دو رکعتیں پڑھی ہیں اور جب آپ کعبہ میں داخل ہوں تو آپ کے بائیں طرف جو دو ستون ہیں ان کے درمیان یہ دو رکعت پڑھی ہیں۔

"ثم خرج فصلي في وجه الكعبة ركعتين" یعنی پھر باہر نکلنے کے بعد آپ ﷺ نے کعبہ کے مواجہ میں استقبال قبلہ کے ساتھ دو رکعتیں پڑھیں۔

روایات میں تعارض

یہاں اس مذکورہ روایت میں یہ مذکور ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی رکعتوں کی تعداد بھی

عبداللہ بن عمر ﷜ کو بتادی کہ دو رکعتیں پڑھی ہیں، لیکن زیادہ تر روایات میں آیا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمر ﷜ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت بلال ﷜ سے یہ تو پوچھا تھا کہ کیا آپ ﷺ نے نماز پڑھی یا نہیں لیکن کتنی رکعت پڑھی یہ میں نے حضرت بلال ﷜ سے نہیں پوچھا تھا، لہٰذا بظاہر اس مذکورہ حدیث کا ان روایات سے تعارض معلوم ہوتا ہے۔

روایتوں میں تطبیق

ان روایات میں اگر چہ بظاہر تعارض معلوم ہو رہا ہے لیکن دونوں میں تطبیق اس طرح ہے کہ جن روایات میں ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن عمر ﷜ نے حضرت بلال ﷜ سے یہ پوچھا کہ آپ ﷺ نے کعبہ کے اندر نماز پڑھی ہے؟ تو حضرت بلال ﷜ نے اشارہ کر کے یعنی سر ہلا کر اور ہاتھ کا اشارہ کر کے جواب دیا کہ ہاں پڑھی ہے، تو اگر چہ زبان سے دو رکعت کا لفظ تو نہیں کہا لیکن اشارہ کر کے بتلا دیا کہ دو رکعتیں پڑھی ہیں اور یہاں اس اشارے کو لفظوں میں بیان کر دیا۔

اور جس حدیث میں یہ آیا ہے کہ میں نے رکعتوں کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ لفظوں میں سوال و جواب نہیں ہوئے یعنی یہ نہیں ہوا کہ میں نے لفظوں میں پوچھا ہو کہ آپ ﷺ نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں تو انہوں نے کہا ہو کہ دو رکعتیں پڑھی ہیں۔ ایسا نہیں ہوا۔

۳۹۸ ـ حدثنا إسحاق بن نصر قال: حدثنا عبد الرزاق قال: أخبرنا ابن جريج، عن عطاء قال: سمعت ابن عباس قال: لما دخل النبي ﷺ البيت دعا في نواحيه كلها و لم يصل حتى خرج منه فلما خرج ركع ركعتين في قبل الكعبة و قال: (هذه القبلة) [أنظر: ۱۶۰۱، ۳۳۵۱، ۳۳۵۲، ۴۲۲۸] ۷۷

اس مذکورہ روایت میں حضرت عبداللہ ابن عباس ﷜ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے بیت اللہ شریف میں نماز نہیں پڑھی۔

تعارض

ماقبل میں روایت گزری ہے کہ جس میں حضرت بلال ﷜ کہتے ہیں آپ ﷺ نے بیت اللہ میں نماز پڑھی ہے جبکہ حضرت اسامہ ﷜ اور عبداللہ ابن عباس ﷜ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے نماز نہیں پڑھی، لہٰذا اس سے روایات میں تعارض واقع ہو رہا ہے۔

---

۷۷ وفي صحيح مسلم، كتاب الحج، باب استحباب دخول الكعبة للحاج وغيره والصلاة فيها، رقم: ۲۳۶۴، وسنن النسائي، كتاب مناسك الحج، باب التكبير في نواحي الكعبة، رقم: ۲۸۶۴، وسنن أبي داؤد، كتاب المناسك، باب الصلاة في الكعبة، رقم: ۱۷۳۲، ومسند أحمد، ومن مسند بني هاشم، باب بداية مسند عبد الله بن العباس، رقم: ۲۴۳۱.

جوابِ تعارض

اس مذکورہ تعارض کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں یہ بات روایات سے ثابت ہے کہ جب آپ ﷺ کعبہ میں تھے تو آپ ﷺ نے ان کو پانی لانے کے لئے کعبہ سے باہر بھیج دیا تھا، لہٰذا یہ کچھ دیر کے لئے باہر چلے گئے تھے تو آپ ﷺ نے ان کی غیر موجودگی میں نماز پڑھ لی اور ان کو پتہ نہیں لگ سکا۔

اس کے علاوہ جہاں تک حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا معاملہ ہے تو ان کے بارے میں یہ بات صراحت سے نہیں ملتی کہ یہ حضور اقدس ﷺ کے ساتھ اندر گئے تھے، لیکن اگر ترجیح کا طریقہ اختیار کیا جائے تو **"المثبت مقدم علی النافی"** اور اگر تطبیق کا طریقہ اختیار کیا جائے تو بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ حضور اقدس ﷺ کا دخول کعبہ دو مرتبہ ہوا ہے، ایک فتح مکہ کے موقع پر اور دوسرا حجۃ الوداع کے موقع پر۔ آپ ﷺ جب فتح مکہ کے موقع پر کعبہ میں داخل ہوئے تو نماز پڑھی تھی، اسی کا ذکر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا اور حجۃ الوداع کے وقت جب آپ ﷺ کعبہ میں داخل ہوئے تو نماز نہیں پڑھی تھی، اور اس کا ذکر عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کو علامہ عینی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔ [۸۷]

اور اس میں یہ سب تفصیل موجود ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ کعبہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے نماز پڑھی لیکن جب دوسری مرتبہ داخل ہوئے تو نماز نہیں پڑھی بلکہ صرف تکبیر فرمائی۔ لہٰذا اگر یہ روایت ثابت ہو تو اس سے یہ اشکال بالکلیہ رفع ہو جاتا ہے۔

(۳۱) باب التوجه نحو القبلة حيث كان

جہاں بھی ہو قبلہ کی طرف منہ کرنے کا بیان

وقال أبو هريرة : قال النبي ﷺ : (استقبل القبلة و كبر)

---

[۸۷] وقال بعض العلماء به يحتمل أنه ﷺ دخل البيت مرتين ، فمرة صلى فيه ، ومرة دعا فلم يصل ، ولم تتضاد الاخبار ، قلت: روى الدار قطني : من حديث ابن عباس قال : دخل رسول الله ﷺ البيت فصلى بين الساريتين ركعتين ثم خرج فصلى بين الباب والحجر ركعتين ، ثم قال : هذه القبلة ، ثم دخل مرة أخرى فقام فيه يدعوا ثم خرج ولم يصل كما رواه الدارقطني في سننه ج :۲، ص:۵۲، باب صلاة النبي ﷺ في الكعبة واختلاف الروايات فيه ، رقم : ۳، دارالنشر دار المعرفة ، بيروت، سنة النشر ، ۱۳۸٦، ۱۹٦٦ء.

ترجمۃ الباب کا مطلب

"التوجہ نحو القبلۃ حیث کان" یعنی قبلہ کی طرف رخ کرنا جہاں بھی آدمی ہو۔ اس کے دو مطلب ہیں:

ایک تو یہ ہے کہ انسان دنیا میں جس جگہ بھی ہو، اس کو قبلہ کی طرف رُخ کرنا چاہیئے ﴿**و حیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہ**﴾

دوسرا مطلب یہ ہے کہ نفل پڑھنے کے وقت یعنی جب دابہ پر نفل پڑھ رہا ہے تو چاہے کسی طرف بھی ہو یا اس کے علاوہ کسی ایسی حالت میں ہے کہ جس میں استقبال قبلہ متعذر رہے تو آدمی جس طرف بھی رُخ کر کے نماز پڑھے اس کی نماز ہو جائے گی، لیکن اس کی نیت و توجہ قبلے کی طرف ہونی چاہیئے، اگرچہ قبلہ اس کی جہت مقابل میں موجود نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ سفر کی نفلی نماز کے اندر استقبال قبلہ ضروری نہیں ہوتا، البتہ دل اس کا قبلے کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔

"وقال أبو هريرة ﷺ: قال النبي ﷺ استقبل القبلة و كبّر" یعنی ابو ہریرہؓ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ قبلہ کا استقبال کرو اور تکبیر کہو یعنی وہ شخص جو **"مسیئ فی الصلوٰۃ"** تھا جس نے نماز میں گڑبڑ کی تھی تو جب آپ ﷺ نے اس کو نماز کی تعلیم دی تو سب سے پہلے یہ فرمایا کہ قبلے کا استقبال کرو اور تکبیر کہو۔

فرائض میں استقبال قبلہ حالت سفر میں بھی ضروری ہے

آپ ﷺ اپنی راحلہ پر نفلی نماز پڑھتے رہتے تھے چاہے وہ جس طرف بھی رُخ کرے، لیکن جب آپ ﷺ فریضے کا ارادہ فرماتے تو راحلہ سے اتر کر باقاعدہ استقبال کرتے۔ معلوم ہوا کہ فرائض میں استقبال قبلہ حالت سفر میں بھی فرض ہے، البتہ نوافل میں جبکہ آدمی سواری پر سفر کر رہا ہو تو اس صورت میں استقبال قبلہ کی فرضیت باقی نہیں رہتی، اور جو حکم دابہ کا ہے وہی پہیوں والی سواری کا بھی ہے یعنی بس، ریل، کار وغیرہ، تو اس میں نفلی نماز آدمی کے لئے اشارے سے بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے۔

حالت سفر ہو یا حضر نفلی نماز سواری پر پڑھ سکتے ہیں

امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ یہ اجازت صرف حالت سفر کے اندر ہے اور اگر آدمی حضر میں ہو تو پھر اجازت نہیں ہے۔ ۹ے

امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مصر ہو یا غیر مصر، سفر ہو یا حضر، نفلی نماز ہر حالت میں دابہ پر پڑھنا

جائز ہے۔ ان کا استدلال وہ روایات ہیں کہ جن میں آتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ مدینہ منورہ میں ایک حمار پر سوار ہو کر غابہ کی طرف تشریف لے گئے اور آپ ﷺ نے حمار کے اوپر نماز پڑھی (غابہ مدینہ منورہ ہی کا ایک حصہ تھا) اس روایت کی سند ضعیف ہے۔[۸۰]

ایک اور روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ کو مدینہ منورہ کی گلیوں میں دیکھا گیا کہ آپ ﷺ حمار پر سوار نماز پڑھ رہے تھے۔ اس روایت کی سند نسبتاً بہتر ہے۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول کی تائید ان روایات سے ہوتی ہے،[۸۱]

لہٰذا ان کا قول اس لحاظ سے قابل ترجیح ہے اور خاص طور سے آج کل کے شہر کافی بڑے بڑے ہو گئے ہیں ،ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں بعض اوقات کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں، لہٰذا امام ابو یوسفؒ کے قول پر عمل کرتے ہوئے آدمی بس وغیرہ میں سفر کرتے ہوئے شہر ہی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہوئے نفلی نماز پڑھ سکتا ہے۔

۴۰۱ ـ حدثنا عثمان قال : حدثنا جرير ، عن منصور ، عن إبراهيم ، عن علقمة قال: قال عبد الله: صلّى النبي ﷺ ، قال إبراهيم : لا أدري زاد أو نقص فلما سلم قيل لهُ: يا رسول الله أحدث في الصّلاة شيء ؟ قال: (و ما ذاک ؟) قالوا: صلّيت كذا و كذا فثنى رجلهُ و استقبل القبلة و سجد سجدتين ثم سلم ، فلما أقبل علينا بوجهه قال: (إنهُ لو حدث في الصلاة شيء لنبأتكم به ، و لكن إنما أنا بشر مثلكم ، أنسى كما تنسون ، فإذا نسيت فذكروني ، و إذا شک أحدكم في صلاته فليتحر الصواب ، فليتم عليه ، ثم يسلم ثم يسجد سجدتين) .[أنظر: ۴۰۴، ۱۲۲۶، ۶۶۷۱، ۷۲۴۹] [۸۲]

[۷۹، ۸۰، ۸۱] واما التنفل على الدابة فى الحضر فلا يجوز عند أبى حنيفة ومحمد والاصطخرى من الشافعية ،

ويجوز عند أبى يوسف وعن محمد : يجوز ولكن يكره ، والأحاديث الدالة على جواز التنفل على الدابة وردت فى السفر ، ففى رواية جابر: كانت فى غزوة أنمار ، وهى غزوة ذات الرقاع ... والحاصل أنها كانت مرات كلها فى السفر،فان قلت:روى عن أبو يوسف فى جوازه فى المدينة أيضا،فقال،حدثنى فلان ، ورفع الاسناد ، الخ ، عمدة القارى ج:۳، ص:۳۷۶.

[۸۲] وفى صحيح مسلم ، كتاب المساجد ومواضع الصلاة ، باب السهو فى الصلاة والسجود له رقم: ۸۸۹. ۸۹۵، وسنن الترمذى ، كتاب الصلاة ، باب ماجاء فى سجدتى السهو بعد السلام والكلام رقم: ۳۵۸، وسنن النسائى ، كتاب السهو ، باب التحرى ، رقم : ۱۲۲۵ ، ۱۲۲۷ ، وسنن أبى داؤد ، كتاب الصلاة، باب اذا صلى خمساً، رقم: ۸۶۱، وسنن ابن ماجه ، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها ، باب السهو فى الصلاة ، رقم: ۱۱۹۳ ، ومسند أحمد ، مسند المكثرين من الصحابة ، باب مسند عبد الله بن مسعود ، رقم: ۳۳۸۵، ۳۴۲۰، ۳۷۷۸، ۳۸۲۷، ۳۹۵۶، ۴۰۱۶، ۴۱۱۸، ۴۱۸۶، ۴۱۹۹، وسنن الدارمى ، كتاب الصلاة باب فى سجدتى السهو من الزيادة رقم: ۱۴۶۰.

موضع ترجمہ

حدثنا عثمان .... عن علقمہ قال..... لاأدري زاد أو نقص فلما سلم قيل لهُ: يارسول الله أحدث في الصّلاة شيء؟ قال: (وما ذاک؟) قالوا: صلّيت كذا وكذا ،فثنى رجلهُ واستقبل القبلة وسجد سجدتين........ الخ

اس روایت میں "**فثنی رجلہ واستقبل القبلة**" یہ جملہ موضع ترجمہ ہے اور اسی کی وجہ سے یہاں پر اس حدیث کو لائے ہیں۔

اس روایت میں ایک مشہور واقعہ مذکور ہے کہ حضور اقدس ﷺ سے نماز میں بھول ہوگئی تھی تو آپ نے دو سجدے سہو کے فرمائے اور پھر سلام پھیرلیا۔

یہاں اس روایت میں سجدۂ سہو قبل السلام ہے اور اسی پر شافعیہ کا عمل ہے، اور بعض روایات میں سجدۂ سہو بعد السلام ہے اور حنفیہ اس پر عمل کرتے ہیں، دونوں طریقے جائز ہیں۔

فليتحر الصواب

"**فليتحر الصواب**" یعنی جب کسی کو نماز میں شک ہو جائے تو تحری کرے اور یہی حنفیہ کا مسلک ہے، البتہ امام شافعی رحمہ اللہ تحری کے قائل نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ مصلی ہر حال میں بنا علی الاقل کرے۔[۸۳]

عصمت کا مطلب

تحری کے مسئلہ میں بعض احناف کی شوافع کے خلاف دلیل یہ ہے کہ اولاً پہلا کام یہ ہے کہ آدمی تحری کرے کیونکہ نسیان امور طبعیہ میں سے ہے، لہٰذا جس طرح بیاری عصمت انبیاء کے منافی نہیں ہے اسی طرح نسیان بھی عصمت انبیاء کے منافی نہیں ہے، خطا ہو سکتی ہے لیکن خطا پر برقرار نہیں رکھا جاتا، بتادیا جاتا ہے اور یہ گناہ نہیں ہوسکتا، کیونکہ گناہ وہ ہوتا ہے کہ جو جان بوجھ کر کیا جائے۔

لہٰذا عصمت کا مطلب یہ ہے کہ گناہ کا صدور انبیاء کرام علیہم السلام سے نہیں ہوسکتا، البتہ خطا اور نسیان دونوں ہوسکتے ہیں، لیکن اس پر برقرار نہیں رکھا جاتا۔[۸۴]

---

۸۳ وقصد الصواب في البناء على غالب الظن عند أبي حنيفة وعند الشافعي: الاخذ باليقين، عمدة القاری ج:۳، ص: ۳۷۸.

۸۴ ومنها: أن فيه جواز النسيان في الأفعال على الانبياء عليهم الصلاة والسلام واتفقوا على انهم لايقرون عليه بل يعلمهم الله تعالىٰ به، عمدة القاری ج:۳، ص: ۳۷۹.

(۳۲)باب ماجاء في القبلة ، ومن لم ير الإعادة على من سها فصلى إلى غير القبلة

قبلہ کے متعلق جو منقول ہے اور جنہوں نے بھول کر غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھنے والے کے لئے اعادہ ضروری خیال نہیں کیا

وقد سلم النبي ﷺ في ركعتي الظهر وأقبل على الناس بوجهه ثم أتم مابقي:

مندرجہ بالا باب کا پہلا حصہ قبلہ کے بیان میں ہے اور اس کے ساتھ پھر یہ بھی ذکر ہے کہ جو شخص بھول کر غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھ لے تو اس پر اعادہ واجب نہیں ہے۔

مختلف فیہ مسئلہ

مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص جنگل میں ہے اور اسے قبلے کا پتہ نہیں چل رہا تو حکم یہ ہے کہ تحری کرے اور تحری کرنے کے نتیجے میں اگر ذہن کا خیال اس طرف آیا کہ قبلہ اس طرف ہے، لہٰذا اس نے تحری کے مطابق نماز پڑھ لی، لیکن جب نماز ختم کر چکا تو بعد میں پتہ چلا کہ قبلہ تو مخالف سمت میں تھا تو اب آیا وہ پہلی نماز ہوگئی یا اس کا اعادہ واجب ہے؟

احناف کا قول وامام بخاری رحمہ اللہ کا مسلک

مذکورہ مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نماز ہوگئی ہے، اعادہ واجب نہیں ہوگا اور یہی امام بخاری رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر تحری کرنے کے بعد یقینی طور پر یہ بات معلوم ہوگئی کہ میں نے غلط رُخ پر نماز پڑھی تھی اور قبلہ مخالف سمت میں تھا تو وقت کے اندر اس پر اعادہ واجب ہے اور اگر وقت گزر چکا ہو تو اس پر اعادہ نہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر یقین سے غلطی واضح ہوگئی تو اعادہ واجب ہے، اور بظاہر ان کے

نزدیک وقت کے بعد غلطی واضح ہونے پر بھی اعادہ واجب ہے۔[۸۵]

امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال

امام بخاری رحمہ اللہ واحناف کا قول یہ تھا کہ تحری کے ذریعہ جو نماز پڑھی گئی ہے چاہے اس کی خطا یقینی طور پر ظاہر ہو جائے تب بھی جو نماز پڑھی ہے وہ نماز ہوگئی ہے، لہٰذا اس کا اعادہ ضروری نہیں اور اس قول کی تائید میں امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ تعلیق نقل کی ہے کہ **"وقد سلّم النبي ﷺ في ركعتي الظهر وأقبل على الناس بوجهه ثم أتم ما بقي"** یعنی حضور اقدس ﷺ نے ظہر کی رکعتوں میں دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا تھا یہ سمجھتے ہوئے کہ چار پوری پڑھ لی ہیں، پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہوگئے پھر باقی دو رکعتوں کو پورا کیا۔

اس واقعہ سے استدلال اس طرح ہے کہ جس وقت آنحضرت ﷺ نے دو رکعت پڑھنے کے بعد یہ سمجھتے ہوئے سلام پھیر دیا کہ چار رکعت پڑھ لی ہیں اور پھر مصلیوں کی طرف متوجہ بھی ہوگئے، تو اس متوجہ ہونے سے استقبال قبلہ فوت ہو گیا پھر بعد میں پتہ چلا کہ نماز پوری نہیں ہوئی تھی تو آپ ﷺ نے اس نماز کو پورا کیا اور جو پہلی دو رکعتیں تھیں ان کے اوپر ہی بنا فرمائی اس کے باوجود کہ درمیان میں ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ جس میں استقبال قبلہ فوت ہو چکا تھا، لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ کسی اجتہادی غلطی کی بنا پر اگر استقبال قبلہ فوت ہو جائے تو اس کا اعادہ ضروری نہیں ہے، لہٰذا تحری کے اندر بھی اگر غلطی ہو جائے تو اعادہ واجب نہ ہوگا کیونکہ یہ بھی اجتہادی غلطی ہے۔

اگرچہ حنفیہ کے نزدیک بھی یہی مسئلہ ہے کہ اعادہ واجب نہیں لیکن جو استدلال امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے وہ احناف کے طریقے پر درست نہیں، کیونکہ احناف کے نزدیک تحری کی صورت میں اگر کوئی شخص غلطی کر جائے تو نماز واجب الاعادہ نہیں ہوتی، لیکن اس صورت میں کہ چار رکعتیں تھیں اور دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا اور قبلہ کی طرف سے رخ پھیر کر نمازیوں کی طرف متوجہ ہوگئے اور پھر سابق دو رکعتوں پر بنا کر لینا یہ جائز نہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے جس واقعہ سے استدلال کیا ہے یہ ذوالیدین کا واقعہ ہے اور یہ واقعہ احناف

---

[۸۵] وهذا باب فيه الخلاف، وهو أن الرجل اذا اجتهد في القبلة فصلى الى غيرها فهل يعيد أم لا ؟ فقال ابراهيم النخعي والشعبي وعطاً وسعيد بن المسيب وحماد : لايعيد ، وبه قال الثوري وأبو حنيفة وأصحابه ، واليه ذهب البخاري وعن مالك كذلك ، وعنه : يعيد في الوقت استحسنا .

وقال الشافعي : ان فرغ من صلاته ثم بان له أنه صلى الى المغرب استانف الصلاة ، وان لم يبن له ذلك الا باجتهاده فلا اعاده عليه ، وفي التوضيح : وقال الشافعي : ان لم يتيقن الخطأ فلا اعادة عليه والا أعاد، عمدة القاري ج:۳، ۳۸۵. ۳۸۴، المجموع ، ج :۳ ، ص: ۲۰۱.

کے نزدیک منسوخ ہے کیونکہ آپ ﷺ نے قبلہ سے رُخ موڑلیا تو استقبال قبلہ فوت ہوگیا اور پھر آپ ﷺ نے باتیں بھی کی تھیں تو یہ عمل کثیر ہوا اور پھر ان تمام چیزوں کے باوجود آپ ﷺ نے سابق دو رکعتوں پر بنا فرمائی، تو یہ واقعہ حنفیہ کے نزدیک منسوخ ہے، لہٰذا اس سے احناف کا استدلال درست نہیں ہوگا۔

احناف کا استدلال

احناف کا اس مسئلہ میں استدلال ترمذی وابن ماجہ کی اس حدیث سے ہے کہ جب حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک سفر میں تھے اور رات کا وقت تھا اور رات اتنی تاریک تھی کہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ قبلہ کس سمت میں ہے تو ہر شخص نے اپنے اپنے حساب سے نماز پڑھ لی اور پھر آپ ﷺ سے ذکر فرمایا کہ ہم نے اس طرح نماز پڑھی ہے کہ کسی کا رُخ اُس طرف تھا اور کسی کا رُخ اِس طرف، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ سب کی نماز ہوگئی۔[۸۶]

لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ تحری کے ساتھ جب نماز پڑھ لی جاتی ہے تو وہ نماز ہو جاتی ہے اور تحری کے غلط ثابت ہو جانے پر بھی واجب الاعادہ نہیں ہوتی ہے۔

۴۰۲ ـ حدثنا عمرو بن عون قال: حدثنا هشيم، عن حميد، عن أنس قال: قال عمر: وافقت ربي في ثلاث، قلت: يا رسول الله لو اتخذنا من مقام إبراهيم مصلّى؟ فنزلت: ﴿وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَقَامِ إِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى﴾ [البقرة:۱۲۵] و آية الحجاب، قلت، يا رسول الله لو أمرت نساءك أن يحتجبن فإنهُ يكلّمهن البر و الفاجر، فنزلت آية الحجاب، و اجتمع نساء النبي ﷺ في الغيرة عليه، فقلت لهن: ﴿عَسَى رَبُّه إِنْ طَلَّقَكُنَّ أَنْ يُبْدِلَه أَزْوَاجاً خَيْرًا مِنْكُنَّ﴾ [التحريم:۵] فنزلت هذه الآية. [أنظر: ۴۴۸۳، ۴۷۹۰، ۴۹۱۶]

و قال ابن أبي مريم قال: أخبرنا يحيى بن أيوب قال: حدثني حميد قال: سمعت أنسا بهٰذا. [۸۷]

---

۸۶ في سنن الترمذي، ج:۲، ص:۱۷۶، باب ماجاء في الرجل يصلي لغير القبلة في الغيم، رقم:۳۴۵، دار النشر دار احياء التراث العربي، بيروت، وسنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلوة والسنة فيها، باب من يصلي لغير القبلة وهو لايعلم، رقم:۱۰۱۰.

۸۷ وفي صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عمر، رقم:۴۴۱۲، وسنن الترمذي، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله، باب ومن سورة البقرة، رقم: ۲۸۸۵، وسنن ابن ماجه، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب القبلة رقم: ۹۹۹، ومسند أحمد، مسند العشرة المبشرين بالجنة باب اوّل مسند عمر بن الخطاب، رقم: ۱۵۲، وسنن الدارمي، كتاب المناسك، باب الصلاة خلف المقام، رقم: ۱۷۷۷.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رب ذوالجلال کے ساتھ تین چیزوں میں موافقت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تین چیزوں میں میں نے اپنے پروردگار کی موافقت کی یعنی میں نے اپنی سمجھ سے ایک رائے دی اور اللہ جل جلالہ نے بعد میں اس کی تائید میں آیت نازل فرمادی۔

ایک آیت **"واتخذوا من مقام ابراهيم مصلى"** ہے

دوسری آیت وہ ہے کہ جس میں ازواج مطہرات کو حجاب کا حکم دیا گیا ہے۔

اور تیسری آیت وہ ہے جب آپ ﷺ کی ازواج نے مل کر ایک ساتھ آپ ﷺ سے کچھ مطالبات کئے تھے تو کہتے ہیں کہ میں نے ان سے جا کر کہا تھا کہ **"عسى ربه إن طلّقكنّ أن يبدله أزواجاً خيراً مِنكنّ"** **(الآية)** تو اللہ جل جلالہ نے بعینہ یہی الفاظ نازل فرمادیئے۔

گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی سعادت بیان کررہے ہیں کہ تین مقامات پر اللہ جل جلالہ نے میری موافقت فرمائی۔

حدیث کو لانے کا منشأ

امام بخاری رحمہ اللہ کا اس حدیث کو یہاں لانے کا منشأ حدیث میں مذکور آیت ہے کہ **"واتخذوا من مقام ابراهيم مصلى"** اور اس کی مناسبت ماقبل میں گذر چکی ہے۔

۴۰۳ ـ حدثنا عبد الله بن يوسف قال: أخبرنا مالك بن أنس، عن عبدالله بن دينار، عن عبد الله بن عمر قال: بينا الناس بقباءٍ في صلاة الصبح إذ جاء هم آت فقال: إن رسول الله ﷺ قد أنزل عليه الليلة قرآن، وقد أمر أن يستقبل الكعبة، فاستقبلوها، وكانت وجوههم إلى الشام فاستداروا إلى الكعبة. [أنظر: ۴۴۸۸، ۴۴۹۰، ۴۴۹۱، ۴۴۹۳، ۴۴۹۴، ۷۲۵۱] ۸۸

---

۸۸ وفي صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب تحويل القبلة من القدس الى الكعبة، رقم: ۸۲۰، وسنن النسائي، كتاب الصلاة، باب استبانة الخطأ بعد الاجتهاد، رقم: ۴۸۹، وكتاب القبلة، باب استبانة الخطأ بعد الاجتهاد، رقم: ۷۳۷، ومسند المكثرين من الصحابة، باب مسند عبد الله بن عمر بن الخطاب رقم: ۴۴۱۳، ۵۵۶۴، ۵۷۶۴، وموطأ مالك، كتاب النداء للصلاة، باب ماجاء في القبلة، رقم: ۴۱۱، وسنن الدارمي، كتاب الصلاة، باب في تحويل القبلة من بيت المقدس الى الكعبة، رقم: ۱۲۰۶.

امام بخاری رحمہ اللہ کا منشأ

مذکورہ حدیث کی تشریح وغیرہ ماقبل میں گذر چکی ہے۔ یہاں امام بخاری رحمہ اللہ کا منشأ اس حدیث کولانے کا یہ ہے کہ یہ حضرات جو مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے، یہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ رہے تھے، اتنے میں ایک آنے والے نے خبر دی کہ قبلہ بدل گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ قبلے کے بدلنے کا حکم تو ان کے نماز شروع کرنے سے پہلے آچکا تھا، لہٰذا ان پر اسی وقت فرض تھا کہ وہ کعبہ کا استقبال کریں لیکن چونکہ ان کو معلوم نہیں تھا تو گویا انہوں نے اپنے اجتہاد سے استصحابِ حال کی بنیاد پر بیت المقدس کی طرف نماز شروع کردی، درمیان میں اطلاع ملی کہ قبلہ بدل گیا ہے تو انہوں نے وہیں سے رُخ بدل لیا اور اپنی سابقہ نماز کا اعادہ نہیں کیا اور نہ ہی آپ ﷺ نے ان کو اعادہ کا حکم دیا۔

لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اجتہاد کی بنا پر یا استصحابِ حال کی بنا پر کسی ایک جانب منہ کر کے نماز پڑھ لیتا ہے اور پھر بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ قبلہ اُس طرف نہیں تھا تو اس کے ذمہ اعادہ واجب نہیں ہے۔

۴۰۴ ـــ حدثنا مسدد قال : حدثنا يحيي ، عن شعبة ، عن الحكم ، عن إبراهيم ، عن علقمة عن عبد الله قال : صلّى النبي ﷺ الظهر خمسا ، فقالوا : أزيد في الصلاة ؟ قال : (وما ذاک ؟) قالوا : صليت خمسا ، فثنى رجليه و سجد سجدتين. [راجع: ۴۰۰]

(۳۳) باب حک البزاق باليد من المسجد

تھوک کا ہاتھ کے ذریعے مسجد سے صاف کردینے کا بیان

۴۰۵ ـــ حدثنا قتيبة قال : حدثنا إسماعيل بن جعفر عن حميد ، عن أنس أن النبي ﷺ رأى نخامة في القبلة فشق ذالک عليه حتى رؤي في وجهه ، فقام فحكه بيده . فقال : (إن أحدكم إذا قام في صلاته فإنه يناجي ربه أو إن ربه بينه و بين القبلة فلا يبزقن أحدكم قبل قبلته و لكن عن يساره أو تحت قدمه) ثم أخذ طرف ردائه فبصق فيه ، ثم رد بعضه على بعض ، فقال : (أويفعل هكذا) . [راجع: ۲۴۱]

۴۰۶ ـــ حدثنا عبد الله بن يوسف قال : أخبرنا مالک ، عن نافع ، عن عبد الله بن عمرأن رسول الله ﷺ رأى بصاقا في جدار القبلة فحكه ، ثم أقبل على الناس

فقال: (إذا كان أحدكم يصلي فلا يبصق قبل وجهه ، فإن الله قبل وجهه إذا صلى) . [أنظر: ۷۵۳، ۱۲۱۳، ۶۱۱۱] ۸۹

۴۰۷ ـ حدثنا عبد الله بن يوسف قال : أخبرنا مالك ، عن هشام بن عروة عن أبيه ، عن عائشة أم المؤمنين أن رسول الله ﷺ رأى في جدار القبلة مخاطا أو بصاقا أو نخامة فحكه .

مساجد کے احکام

امام بخاری رحمہ اللہ یہاں سے مساجد کے احکام شروع کر رہے ہیں اور تقریباً پچپن ابواب میں مساجد کے احکام یعنی مسجد کے آداب، مسجد کی تعظیم، مسجد کے اندر کیا کام جائز ہے اور کیا کام ناجائز ہے وغیرہ ذکر کئے ہیں اور شروع کے چند ابواب ایک ہی موضوع سے متعلق ہیں کہ اگر کسی کو تھوک آجائے یا ناک کی ریزش ہو تو اس صورت میں اس کو کیا کرنا چاہیئے؟

لہٰذا اس سلسلے میں بعض جگہ فرمایا کہ اگر خشک ہے تو اس کو رگڑ کر صاف کر دے اور اگر تر ہے تو کس طرح دھوئیے؟ خود آپ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ مسجد کو گندا کر گیا ہے، تو بعض روایات میں آتا ہے کہ خود اپنے دست مبارک سے صاف کیا اور بعض روایات میں آتا ہے کہ عصا سے صاف کیا۔

(۳۴) باب حك المخاط بالحصى من المسجد،

رینٹ کا بذریعہ کنکریوں کے مسجد سے صاف کر دینے کا بیان

وقال ابن عباس :إن وطئت على قذر رطب فاغسله وإن كان يابسا فلا.

۴۰۸، ۴۰۹ ـ حدثنا موسى بن إسماعيل قال: أخبرنا إبراهيم بن سعد قال:

---

۸۹ وفي صحيح مسلم ، كتاب المساجد ومواضع الصلاة ، باب النهي عن البصاق في المسجد في الصلاة وغيرها ، رقم: ۸۵۲، وسنن النسائي ، كتاب المساجد ، باب النهي عن أن يتنخم الرجل في قبلة المسجد رقم: ۷۱۶،وسنن أبي داؤد ، كتاب الصلاة ، باب في كراهية البزاق في المسجد ، رقم: ۴۰۵، وسنن ابن ماجه ، كتاب المساجد والجماعات الباب كراهية النخامة في المسجد ، رقم: ۷۵۵، ومسند أحمد ، مسند المكثرين من الصحابة ، باب مسند عبد الله بن عمر بن الخطاب ، رقم: ۴۲۸۰، ۴۶۰۹، ۴۶۴۵، ۴۶۷۳، ۴۹۰۵، ۵۰۸۳، ۵۱۵۱، ۵۴۸۶، ۵۹۸۳، ۶۰۲۴، وموطأ مالك ، كتاب النداء للصلاة ، باب النهي عن البصاق في القبلة ، رقم: ۴۰۹، وسنن الدارمي ، كتاب الصلاة ، باب كراهية البزاق في المسجد ، رقم: ۱۳۶۱.

أخبرنا ابن شهاب ،عن حميد بن عبد الرحمٰن أن أباهريرة وأبا سعيد حدثاة أن رسول الله ﷺ رأى نخامة في جدار المسجد فتناول حصاة فحكها،فقال: (إذاتنخم أحدكم فلا يتنخمن قبل وجهه،ولا عن يمينه،وليبصق عن يساره أو تحت قدمه اليسرى) .
[أنظر: ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۴، ۴۱۶] ۹۰

"نخامة" ناک کی ریزش کونخامہ کہتے ہیں۔آپ ﷺ نے مسجد کی دیوار میں نخامہ دیکھی تو آپ ﷺ نے کچھ سنگ ریزے لئے اوراس کورگڑ دیا۔

آنحضرت ﷺ کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جوشخص مقتدا ہواس کوبھی اس قسم کا کام خوداپنے ہاتھ سے کرلینا چاہئے، یہاں آپ ﷺ دوسروں کوبھی حکم دے سکتے تھے کہ یہ صاف کردواور صحابۂ کرام ﷺ میں سے جس کسی کوبھی یہ حکم دیا جاتا وہ اس کوبہت شرف سمجھتا لیکن آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے صاف کرنا پسند فرمایا اور یہ تعلیم دی کہ اگرکوئی شخص مقتداابن جاتا ہےتو وہ یہ نہ سمجھے کہ میں اس قسم کے کاموں سے بالکل مستثنیٰ ہوگیا ہوں اورپھر یہ بات بھی ہے کہ جب مقتدااپنے ہاتھ سے یہ کام کرتا ہےتولوگوں کواس بات کا زیادہ احساس ہوتا ہے کہ ہمیں آئندہ ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیئے۔

(۳۵) باب: لايبصق عن يمينه في الصلاة

نماز میں دائیں طرف نہ تھوکے

۴۱۰، ۴۱۱ ــ حدثنا يحيى بن بكير قال: حدثنا الليث ، عن عقيل ، عن ابن شهاب ، عن حميد بن عبد الرحمٰن أن أباهريرة و أبا سعيد أخبراه : أن رسول الله ﷺ رأى نخامة في حائط المسجد فتناول رسول الله ﷺ حصاة فحتها ، ثم قال : (إذاتنخم أحدكم فلا يتنخم قبل وجهه،ولا عن يمينه ،وليبصق عن يساره أوتحت قدمه

۹۰ وفى صحيح مسلم ، كتاب المساجد ومواضع الصلاة ،باب النهى عن البصاق فى المسجد فى الصلاة وغيرها ، رقم: ۸۵۳، وسنن النسائى ، كتاب المساجد ،باب النهى عن ان يتنخم الرجل فى قبلة المسجد ، رقم: ۷۱۷، وسنن أبى داؤد ، كتاب الصلاة ،باب فى كراهية البزاق فى المسجد ، رقم: ۴۰۳، وسنن ابن ماجه ، كتاب المساجد والجماعات ،باب كراهية النخامة فى المسجد ، رقم: ۷۵۳، ومسند أحمد ، باقى مسند المكثرين ، رقم: ۷۲۱۷، ۷۲۹۱، ۷۸۸۶، ۷۹۴۶، ۹۸۱۵، ۱۰۶۰۱، ۱۱۱۲۵، ۱۱۴۱۰، ۱۱۴۴۵ ، وسنن الدارمى ، كتاب الصلاة، باب كراهية البزاق فى المسجد ، رقم: ۱۳۶۲ .

اليسرى) [راجع: ۴۰۸، ۴۰۹]

۴۱۲ ۔ حدثنا حفص بن عمر قال: حدثنا شعبة قال: أخبرني قتادة قال: سمعت أنسا قال: قال النبي ﷺ (لايتفلن أحدكم بين يديه ولا عن يمينه ولكن عن يساره أو تحت رجله). [راجع: ۲۴۱]

(۳۶) باب: ليبصق عن يساره أو تحت قدمه اليسرى

حالت نماز میں اگر تھوکنے کی ضرورت ہو تو اپنے بائیں جانب یا اپنے بائیں پیر کے نیچے تھوکنا چاہیے

۴۱۳ ۔ حدثنا آدم قال: حدثنا شعبة قال: حدثنا قتادة قال: سمعت أنس بن مالک قال: قال النبي ﷺ: (إن المؤ من إذا كان في الصلوة فإنما يناجي ربه، فلا يبزقن بين يديه ولا عن يمينه، ولكن عن يساره أو تحت قدمه). [راجع: ۲۴۱]

۴۱۴ ۔ حدثنا علي قال: حدثنا سفيان قال: حدثنا الزهري، عن حميد بن عبدالرحمن، عن أبي سعيد أن النبي ﷺ أبصر نخامة في قبلة المسجد فحكها بحصاة، ثم نهى أن يبزق الرجل بين يديه أو عن يمينه، ولكن عن يساره أو تحت قدمه اليسرى. وعن الزهري سمع حميداً عن أبي سعيد نحوه. [راجع: ۴۰۹]

(۳۷) باب كفارة البزاق في المسجد

مسجد میں تھوکنے کے کفارہ کا بیان

۴۱۵ ۔ حدثنا آدم قال: حدثنا شعبة قال: حدثنا قتادة قال: سمعت أنس بن مالک قال: قال النبي ﷺ: (البزاق في المسجد خطيئة وكفارتها دفنها)

(۳۸) باب دفن النخامة في المسجد

مسجد میں بلغم کے دفن کردینے کا بیان

۴۱۶ ۔ حدثنا إسحاق بن نصر قال: حدثنا عبدالرزاق، عن معمر، عن همام: سمع أبا هريرة عن النبي ﷺ قال: (إذا قام أحدكم إلى الصلاة فلا يبصق أمامه فإنما يناجي

اللہ مادام في مصلاه، ولا عن يمينه فإن عن يمينه ملكا، وليبصق عن يساره، أوتحت قدمه، فيدفنها[راجع: ۴۰۸]

(۳۹) باب إذا بدره البزاق فليأخذ بطرف ثوبه

جب تھوکنے پر مجبور ہو جائے تو اس کو اپنے کپڑے میں لے لینا چاہئے

۴۱۷ ـ حدثنا مالک بن إسماعيل قال: حدثنا زهير قال: حدثنا حميد عن أنس: أن النبي ﷺ رأى نخامة في القبلة فحكها بيده، ورؤي منه كراهية أورؤى كراهيته لذلک وشدته عليه، وقال: (إن أحدكم إذا قام في صلاته فإنما يناجي ربه، أوربه بينه وبين قبلته، فلا يبزقن في قبلته، ولكن عن يساره أوتحت قدمه)، ثم أخذ طرف ردائه فبزق فيه ورد بعضه على بعض، قال: (أو يفعل هكذا). [راجع: ۲۴۱]

مذکورہ روایت میں راوی کو یہ شک ہے کہ یا تو "فانما يناجي ربه" کہا تھا یا "ربه بينه وبين قبلته" کہا تھا یعنی مطلب یہ ہے کہ قبلہ کی طرف تھوکنا نہیں چاہئے، بلکہ اپنے بائیں طرف یا پاؤں کے نیچے تھوک دے یا پھر اگر کوئی اور صورت ممکن نہ ہو تو اپنی چادر کے اندر تھوک لے اور پھر اس کو ایک دوسرے سے مل لے۔

(۴۰) باب عظة الإمام الناس في إتمام الصلاة وذكر القبلة

امام کا لوگوں کو نصیحت کرنا کہ وہ اپنی نماز کو مکمل کریں اور قبلہ کا ذکر

۴۱۸ ـ حدثنا عبداللہ بن يوسف قال: أخبرنا مالک، عن أبي الزناد، عن الأعرج، عن أبي هريرة أن رسول اللہ ﷺ قال: (هل ترون قبلتي هاهنا؟ فواللہ ما يخفى علي خشوعكم ولا ركوعكم إني لأ راكم من وراء ظهري). [أنظر: ۷۴۱] [۱۹]

۴۱۹ ـ حدثنا يحيى بن صالح قال: حدثنا فليح بن سليمان، عن هلال بن علي، عن أنس بن مالک قال: صلى بنا النبي ﷺ صلاة ثم رقي المنبر فقال في الصلاة وفي

---

[۱۹] وفي صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب الأمر بتحسين الصلاة وإتمامها والخشوع فيها، رقم: ۶۴۳، ومسند أحمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند أبي هريرة، رقم: ۶۹۰۱، ۷۶۸۱، ۷۹۰۷، ۸۴۱۶، ۸۵۲۲، ۹۲۲۰، ۹۴۳۰، ۱۰۱۶۱، وموطأ مالک، كتاب النداء للصلاة، باب العمل في جامع الصلاة، رقم: ۳۶۱۔

الركوع : (إني لأ راكم من ورائي كما أراكم). [أنظر: ۴۱۸، ۷۴۲، ۶۶۴۴]

"**هل ترون قبلتي ههنا**" یعنی کیا تم دیکھتے ہو میرا قبلہ اس طرف ہے، مقصود یہ ہے کہ شاید تم یہ سمجھتے ہو کہ میں چونکہ قبلہ کے رُخ مُنہ کر کے نماز پڑھ رہا ہوں، لہٰذا بس مجھے قبلہ کی جانب ہی کی خبر ہے اور چیزوں کا پتہ نہیں۔

"**فو الله مايخفى علي خشوعكم ولا ركوعكم**" یعنی اللہ کی قسم مجھ پر تمہارا خشوع اور رکوع مخفی نہیں ہے، اگرچہ میرا رُخ قبلہ ہی کی جانب کیوں نہ ہو اور میری نظریں سامنے ہی کی طرف کیوں نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "**إني لأراكم من وراءِ ظهري**" یعنی میں تم کو اپنی پشت کے پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں۔

"وراء ظهری" کا مطلب

حضرات علماء کرام نے اس پر بحث کے دروازے کھول دیئے ہیں کہ نبی کریم ﷺ پشت کے پیچھے سے کس طرح دیکھتے تھے؟

اس سلسلے میں لوگوں نے اپنے اپنے تخیلات بیان فرمائے ہیں اور بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کی ایک آنکھ پیچھے بھی تھی یعنی باقاعدہ آنکھ کا اثبات کیا کہ جس طرح دو آنکھیں آگے تھیں تو ایک آنکھ پیچھے بھی تھی، حالانکہ دیکھنے کیلئے آنکھ کا ہونا کوئی ضروری نہیں کیونکہ جس خالق نے آنکھ میں دیکھنے کی قوت عطا فرمائی ہے وہ جب چاہے کسی اور شئی میں قوت بینائی عطا فرما دے اس کی قدرت سے کیا بعید ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کا واقعہ

حضرت تھانوی رحمہ اللہ ایک مرتبہ سفر میں جا رہے تھے تو ایک ریلوے اسٹیشن پر انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے تو ایک جدید تعلیم یافتہ صاحب پہنچ گئے اور جب اس قسم کے لوگوں کو کوئی مولوی مل جاتا ہے تو وہ اپنے دماغ کے سارے خیالات اس مولوی کے اوپر انڈیلنا چاہتے ہیں، یہ صاحب بھی حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے پوچھنے لگے کہ قرآن میں ہے کہ قیامت کے دن ہاتھ اور پاؤں بولیں گے اور یہ گواہی دیں گے تو یہ ہاتھ اور پاؤں بغیر زبان کے کیسے بولیں گے؟

اس پر حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ زبان بغیر زبان کے کیسے بولتی ہے، اگر بولنے کے لئے زبان ضروری ہے تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ اس زبان کے لئے بھی ایک زبان ہونی چاہیئے اور پھر اس زبان کے لئے ایک زبان چاہیے، پھر اس زبان کے لئے ایک زبان چاہیے، "**وهلمّ جرّا**" پھر فرمایا کہ زبان کو جو بولنے کی قوت دی ہے وہ اللہ جل جلالہ نے دی ہے تو وہ اگر ہاتھ کو بھی بولنے کی قوت دے دے تو کیا بُعد ہے۔ تو ایک جملہ پر بات ختم

کردی کہ زبان بغیر زبان کے کیسے بولتی ہے، لہٰذا اعضاء کا بولنا عقلاً ممکن ہے اور نقلاً مخبر صادق نے خبر دی ہے۔

اس پر وہ صاحب کہنے لگے کہ ایسا کبھی ہوا بھی ہے؟ تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آپ دلیل پوچھتے ہیں یا نظیر پوچھتے ہیں کیونکہ اگر نظیر پوچھتے ہیں تو کوئی بھی ایسا واقعہ ثابت نہ ہو سکے گا جو اس سے پہلے نہ ہوا ہو، لہٰذا کسی واقعہ کے ثبوت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ پہلے بھی ہوا ہو، یہ جتنی بھی ایجادات ہو رہی ہیں کیا پہلے تھیں؟ لہٰذا فرمایا کہ دلیل پوچھتے ہو یا نظیر، تو ضرورت دلیل کی ہے نظیر کی ضرورت نہیں ہے۔

اسی طرح یہاں یہ کہنا کہ نبی کریم ﷺ کے پیچھے کی طرف آنکھ تھی اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جس اللہ جل جلالہ نے آنکھ میں قوتِ بینائی پیدا فرمائی ہے وہ اگر زبان میں بینائی کی طاقت پیدا فرما دے تو کیا بُعد ہے اور یہ سب اس وقت ہے جب رؤیت کو رؤیت حقیقیہ پر محمول کیا جائے۔

بعض حضرات نے اس رؤیت کو رؤیتِ علم کے معنی میں بھی لیا ہے اور اس کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ اللہ جل جلالہ بذریعہ وحی پیچھے کے حالات سے بھی نبی کریم ﷺ کو باخبر فرما دیتے تھے۔

لہٰذا اس میں کوئی اشکال کی بات نہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ **"انی لأ راکم من وراء ظهري"** یہ ہر وقت ہو، بلکہ عین ممکن ہے کہ اللہ جل جلالہ خاص حالات میں آپ ﷺ کو بطور معجزہ یہ کیفیت عطا فرما دیتے ہوں اور بعض اوقات نہ بھی عطا فرمائیں۔ تو دونوں باتیں ممکن ہیں۔

(۴۱) باب: هل يقال: مسجد بني فلان؟

کیا بنی فلاں کی مسجد کہنا جائز ہے یا نہیں؟

یعنی کیا کسی مسجد کو کسی محلّہ یا قبیلے والوں کی طرف منسوب کر سکتے ہیں کہ یہ فلاں قبیلے کی مسجد ہے؟

باب قائم کرنے کا مقصد

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب اس لئے قائم کیا ہے کہ بعض اسلاف جیسے حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ وغیرہ سے منقول ہے کہ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ مسجد کو کسی انسان یا قبیلے کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

اور یہ حضرات استدلال کرتے ہیں آیت قرآنی:

﴿ و أن المسٰجد لله ﴾

سے کہ مسجد اللہ کی ہیں، لہٰذا کسی شخص کی طرف منسوب کرنے سے ایہام لازم آتا ہے کہ مسجد اس کی مملوک ہے، اس لئے وہ اس کو مکروہ سمجھتے ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے ان کی تردید کے لئے یہ مذکورہ باب قائم کیا ہے کہ **"مسجد بنی فلاں"** کہنا یہ جائز ہے اور اس سے مقصد محض تعارف ہے یہ مقصد نہیں ہوتا کہ یہ بنی فلاں کی مملوک ہے، لہٰذا اگر یہ کہہ یا کہ فلاں والوں کی مسجد، یا دارالعلوم والوں کی مسجد تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ دارالعلوم والوں کی ملکیت ہے بلکہ دارالعلوم کی طرف یہ نسبت تعریف کے لئے ہے۔

۴۲۰ ـ حدثنا عبد الله بن يوسف قال: أخبرنا مالك، عن نافع، عن عبد الله بن عمر أنّ رسول الله ﷺ سابق بين الخيل التي أضمرت: من الحفياء، و أمدها ثنية الوداع، و سابق بين الخيل التي لم تضمر من الثنية إلى مسجد بني زريق، وأن عبدالله بن عمر كان فيمن سابق بها. [أنظر: ۲۸۶۸، ۲۸۶۹، ۲۸۷۰، ۷۳۳۶] [۹۲]

امام بخاری کا استدلال

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے قول کی تائید میں حضرت عبداللہ بن عمر ﷺ کی حدیث نقل کی ہے۔ یہ مذکورہ حدیث مسابقہ سے متعلق ہے کہ آنحضرت ﷺ نے گھوڑوں کی دوڑ کروائی **"حفیاء"** کے مقام سے **"ثنیۃ الوداع"** تک اور جو گھوڑے مضمّر نہیں تھے ان کی مسابقت ثنیۃ الوداع سے مسجد بنی زریق تک کروائی۔

لہٰذا استدلال یہ ہے کہ مسجد بنی زریق کا لفظ خود صحابیؓ نے استعمال کیا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ کہنا کہ **"مسجد بنی فلاں"** وغیرہ یہ جائز ہے۔

(۴۲) باب القسمة وتعليق القنو في المسجد،

مسجد میں کسی چیز کا تقسیم کرنا اور خوشہ لٹکانے کا بیان

قال أبو عبد الله: القنو: العذق و الاثنان: قنوان، و الجماعة أيضا: قنوان مثل صنو و صنوان.

---

[۹۲] وفی صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب المسابقة بین الخیل وتضمیرها، رقم: ۳۴۷۷، وسنن الترمذی، کتاب الجهاد عن رسول الله، باب ماجاء فی الرهان والسبق، رقم: ۱۶۲۱، وسنن النسائی، کتاب الخیل، باب غایة السبق للتی لم تضمر، رقم: ۳۵۲۷، ۳۵۲۸، وسنن أبی داؤد، کتاب الجهاد، باب فی السبق، رقم: ۲۲۱۱، ومسند أحمد، مسند المکثرین من الصحابة، باب مسند عبد الله بن عمر بن الخطاب، رقم: ۴۲۵۷، ۴۳۶۶، ۴۹۳۴، وموطأ مالک، کتاب الجهاد، باب ماجاء فی الخیل والمسابقة بینها والنفقة فی الغزو، رقم: ۸۸۸. وسنن الدارمی، کتاب الجهاد، باب فی السبق، رقم: ۲۳۲۲.

ترجمۃ الباب سے مقصد

امام بخاری رحمہ اللہ یہاں سے یہ بیان کرنے کیلئے کہ کون سے افعال مسجد میں جائز ہیں اور کون سے ناجائز ہیں، یہ ابواب لا رہے ہیں اور کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر مال غنیمت مجاہدین کے درمیان تقسیم کرنا پڑے تو یہ تقسیم مسجد کے اندر ہو سکتی ہے۔

"وتعليق القنو في المسجد" یعنی امام بخاری رحمہ اللہ یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ ضرورت کے وقت کھانے پینے کا انتظام بھی مسجد میں ہوسکتا ہے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

القنوُ: العِذق الخ "قنو" کھجور کے خوشے کو کہتے ہیں اور اس کی تثنیہ اور جمع **"قنوانِ"** ہے، فرق صرف یہ ہے کہ تثنیہ **"قنوانِ"** ہے بکسر نون اور جمع **"قنوانُ"** بضم نون ہے مثل **"صنو صنوانِ"**۔

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک اس سلسلے میں یہ ہے کہ مسجد میں وہ کام جو خالص دنیا کے کام ہیں نہ کیے جائیں اور بلا عذر ایسے کام مسجد کے اندر کرنا مکروہ ہیں، لہٰذا اگر مال باہر تقسیم کرنا ممکن ہو تو باہر تقسیم کیا جائے، اسی طرح اگر کھانا کھلانا ہے تو مسجد سے باہر کھلایا جائے۔[۹۳]

مسئلہ کی توضیح

حنفیہ کے یہ احکام کہ مسجد میں مال تقسیم کرنا یا کھانا کھلانا یہ مکروہ ہے، اس سے مراد مسجد شرعی ہے یعنی وہ حصہ جس کے بارے میں بانی مسجد نے مسجد ہونے کی نیت کی ہو جس میں اعتکاف کیا جا سکتا ہے لیکن مسجد کی جو فنا ہے جس کے مسجد ہونے کی بانی مسجد نے نیت نہیں کی یا جیسے وضو خانہ ہے یا کوئی مدرسہ بنا ہوا ہے اور یہ سب اگر چہ مسجد کے احاطہ میں ہیں لیکن یہاں یہ سب کام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا پہلا استدلال

امام بخاری رحمہ اللہ یہاں دو باتوں سے استدلال فرما رہے ہیں۔ ایک تو اس باب کے تحت ہی حدیث ذکر کی ہے کہ جس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بحرین سے آیا ہوا مال غنیمت مسجد میں کھڑے ہو کر تقسیم کیا، لہٰذا اس سے استدلال کر رہے ہیں کہ مال غنیمت کی تقسیم مسجد میں جائز ہے۔

---

۹۳ ، ۹۴ فیض الباری، ج: ۲، ص: ۳۸.

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا جواب

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ تقسیم عین مسجد میں نہیں تھی بلکہ صُفّہ میں تھی اور جہاں صُفّہ ہے وہ حصہ باقاعدہ مسجد شرعی کا حصہ نہیں تھا، لہٰذا وہاں پر کھڑے ہو کر تقسیم کرنے سے عین مسجد میں تقسیم کرنا لازم نہیں آتا۔۹۴

امام بخاری رحمہ اللہ کا دوسرا استدلال

امام بخاری رحمہ اللہ **"تعلیق القنو فی المسجد"**.

سے دوسرا استدلال فرما رہے ہیں، اگرچہ اس کے بارے میں کوئی حدیث یہاں براہِ راست منقول نہیں ہے، لیکن اس واقعہ کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ لوگ اصحابِ صفہ کے لئے کھجور کے خوشے لاکر مسجد کے ستون میں ٹانگ دیتے تھے (اور آج بھی مسجد نبوی میں اس ستون پر علامت بنی ہوئی ہے کہ اس ستون میں ٹانگا کرتے تھے)۔

اس سے امام بخاری رحمہ اللہ استدلال فرما رہے ہیں کہ اس طرح ٹانگنے میں اور کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ وہاں پر ٹانگنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ اصحابِ صفہ کھائیں، تو کھانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

جواب: اس کا جواب بھی شاہ صاحب رحمہ اللہ کے قول کے مطابق یہ ہے کہ یہ صفہ کا علاقہ تھا جو کہ عین مسجد میں نہیں ہے، لہٰذا وہاں پر کھانے میں کوئی حرج نہیں، البتہ جہاں عینِ مسجد ہو تو وہاں بغیر کسی عذر کے یہ کام نہیں کرنے چاہیئے۔

عذر یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی اور جگہ رکھنے کی نہ ہو، لہٰذا اگر یہ مان لیا جائے کہ آپ ﷺ نے عین مسجد میں تقسیم فرمایا تھا تو وہ عذر کی وجہ سے ہو سکتا ہے کیونکہ بیت المال کا کوئی باقاعدہ شعبہ قائم نہیں تھا اور حضور ﷺ اپنے گھر میں رکھنا پسند نہیں فرماتے تھے، اور اگر کسی صحابی کے گھر میں لیجا کر رکھیں تو بھی دشواری کہ ان کے گھر میں آئے یا نہ آئے، اور دوسرے لوگوں کو شبہات پیدا ہوں کہ فلاں کے گھر میں سارا خزانہ رکھدیا۔ تو یہ سارے اعذار موجود تھے۔

لہٰذا اگر عین مسجد کے اندر بھی تقسیم کیا گیا تو کوئی حرج نہیں تھا، لیکن جہاں اس کے خلاف ممکن ہو اور کوئی جگہ موجود ہو تو وہاں پر راجح یہ ہے کہ یہ کام باہر کیا جائے تا کہ مسجد شور و شغب وغیرہ سے محفوظ رہے۔

۴۲۱ــ وقال إبراهيم. يعني ابن طهمان. عن عبد العزيز بن صهيب، عن أنس ﷺ قال: أتي رسول الله ﷺ بمال من البحرين فقال: (انثروه في المسجد) وكان أكثر مال أتي به رسول الله ﷺ فخرج رسول الله ﷺ إلى الصلاة و لم يلتفت إليه. فلما قضى الصلاة جاء

فجلس إليه، فما كان يرى أحداً إلا أعطاه إذجاء العباس ﷺ فقال: يارسول الله، أعطني فإني فاديت نفسي وفاديت عقيلاً، فقال له رسول الله ﷺ: (خذ)، فحثى في ثوبه ثم ذهب يقله فلم يستطع، فقال: يارسول الله، مر بعضهم يرفعه إلي. قال: (لا)، قال: فارفعه أنت علي. قال: (لا)، فنثر منه ثم ذهب يقله فقال: يارسول الله اؤمر بعضهم يرفعه. قال: (لا). قال: فارفعه أنت علي. قال: (لا). فنثر منه ثم احتمله فألقاه على كاهله ثم انطلق فمازال رسول الله ﷺ يتبعه بصره حتى خفي علينا عجبا من حرصه، فما قام رسول الله ﷺ وثم منها درهم.

[أنظر: ٣٠٤٩، ٣١٦٥]

بحرین کا مال

حضرت انس ﷺ سے یہ روایت تعلیقاً نقل ہے کہ آپ ﷺ کے پاس بحرین سے کچھ مال آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسجد میں بکھیر دو۔ "**وكان اكثر مال أتي به رسول الله ﷺ**" یعنی اور یہ سب سے زیادہ وہ مال تھا جو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لا گیا یعنی اس سے پہلے اتنا مال غنیمت کبھی نہیں آیا تھا۔ "**فخرج رسول الله ﷺ إلى الصلاة ولم يلتفت اليه**".

حضرت انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی تائید

اس مذکورہ جملہ سے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی بات کی تائید ہو رہی ہے کہ مال موجود تھا اور نماز پڑھی گئی تو معلوم ہوا کہ مال نماز کی جگہ سے کہیں دور تھا۔ "**فجلس اليه**" یعنی آپ ﷺ تقسیم کے لئے بیٹھ گئے۔ "**فما كان يرى احداً الا أعطاه**": یعنی جس کسی کو دیکھتے اس کو کچھ دے دیتے۔ "**اذجاء العباس** ﷺ: اتنے میں آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس ﷺ آ گئے۔

"**فقال: يارسول الله، اعطني فاني فاديت نفسي وفاديت عقيلا**" یعنی حضرت عباس ﷺ نے فرمایا یا رسول اللہ! مجھے دیجئے کہ میں نے اپنے آپ کا بھی فدیہ دیا تھا اور عقیل کا بھی فدیہ دیا تھا یعنی بدر کے قیدی سب فدیہ دے کر آزاد ہوئے تھے، مطلب یہ ہے کہ میری خدمات ہیں۔ جنگ بدر میں جب یہ قیدی بن کر آئے تھے تو آنحضرت ﷺ نے ان سے اپنے علاوہ عقیل اور حارث کا فدیہ بھی دینے کو کہا تھا، انہوں نے کہا کہ میں کنگال ہو جاؤں گا، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ مال کہاں ہے جو آپ بدر میں آتے وقت ام الفضل کے پاس رکھوا کر آئے تھے یہ سن کر حضرت عباس ﷺ حیران ہو گئے کیونکہ اس بات کا علم ان کے اور ام الفضل کے سوا کسی کو نہیں تھا، چنانچہ آپ ﷺ کے اس فرمانے پر اسلام ان کے دل پر گھر کر گیا، اور یہ دل سے مسلمان ہو گئے اگرچہ اعلان بعد میں کیا "**كذا ذكره في "سيرت ابن هشام"**".

تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ لے لو تو انہوں نے اپنی جھولی بھر لی، پھر اٹھانے لگے لیکن اٹھا نہ سکے تو عرض کیا یا رسول اللہ! کسی کو کہہ دیجئے کہ یہ میرے لئے اٹھا کر لے جائے یعنی مجھ سے اٹھایا نہیں جا رہا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "نہیں" **فارفعه أنت علي: قال: "لا"**

یعنی حضرت عباس رضی اللہ عنہ چونکہ چچا تھے اور آپ ﷺ بھتیجے تھے تو کہا کہ اچھا آپ ہی اٹھا لیجئے، یعنی میرے اوپر اٹھا کر رکھ دیجئے تو آپ ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا۔

آپ ﷺ کی مدد سے انکار کرنے کی وجہ

حضرت عباس رضی اللہ عنہ جس انداز سے جھولیاں بھر کر لے جا رہے تھے، تو اس طرح سے مال کی طرف غیر ضروری رغبت کا اظہار ہو رہا تھا، لہٰذا آپ ﷺ کے انکار کرنے کا منشأ یہ تھا کہ اتنا مال لیتے کیوں ہو جس کو اٹھا نہ سکو بلکہ اتنا لو جس کو اٹھا سکو، اتنے زیادہ حرص کرنے کی ضرورت نہیں، لہٰذا مقصد یہ تھا کہ جب یہ اُٹھا نہ سکیں گے تو کچھ نہ کچھ چھوڑ کر جائیں گے۔

"**فنثر منه**" یعنی حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اس میں سے کچھ تھوڑا پھینک دیا۔

"**ثم ذهب يقلّه فقال: .... الخ**" یعنی پھر اٹھا کر جانے لگے تو نہ لے جا سکے، پھر دوبارہ بات دہرائی تو آپ ﷺ نے دوبارہ منع فرمایا، تو انہوں نے کچھ اور کم کر دیا۔ "**ثم احتمله**" یعنی پھر اٹھا لیا کیونکہ اب ہلکا ہو گیا تھا۔ "**فالقاه على كاهله ثم انطلق**" **الخ** یعنی پھر اس کو اپنے کندھے پر رکھ لیا اور چل پڑے اور آپ ﷺ ان کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے یہاں تک کہ وہ ہم سے پوشیدہ ہو گئے اور آپ ﷺ بار بار ان کو دیکھتے رہے یعنی ان کی حرص پر تعجب کر رہے تھے کہ یہ کیسی حرص ہے کہ دوسروں کی مدد سے اتنا بھر کے جانا چاہ رہے ہیں۔

"**فما قام رسول الله ﷺ**" **الخ** یعنی آپ ﷺ جب کھڑے ہوئے تو ایک درہم بھی باقی نہ تھا یعنی سب مال درہم وغیرہ تقسیم فرما دیئے۔

(۴۳) باب من دعی لطعام في المسجد و من أجاب منه

جس کو کھانے کی دعوت مسجد میں دی جائے اور جس شخص نے اسے قبول کرلیا

۴۲۲ ۔ حد ثنا عبد الله بن يوسف قال : أخبرنا مالک ، عن إسحاق بن عبدالله ، سمع أنسا : و جدت النبي ﷺ في المسجد معه ناس فقال نعم فقال لي: (أأرسلک أبوطلحة؟) قلت : نعم، قال: (لطعام؟) قلت : نعم، فقال لمن حوله: (قوموا)، فانطلق وانطلقت

بين أيديهم .]أنظر: ۳۵۸۷، ۵۳۸۱، ۵۴۵۰، ۶۶۸۸] ۹۵

باب کا مقصد

مسجد میں رہتے ہوئے کھانے کی دعوت قبول کرنا، یعنی کوئی اگر مسجد میں آ کے دعوت دے کہ ہمارے ساتھ کھانا کھالو اور کوئی آدمی اس دعوت کو قبول کر لے تو یہ جائز ہے۔

اس سلسلے میں امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ اسحٰق بن عبداللہ ﷺ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس ﷺ سے سنا کہ نبی کریم ﷺ مسجد میں بیٹھے تھے اور آپ ﷺ کے ساتھ کچھ لوگ بھی تھے، میں کھڑا ہوا تھا کہ آپ ﷺ نے پوچھا، کیا تمہیں ابوطلحہ ﷺ نے بھیجا ہے؟ تو میں نے کہا جی ہاں، تو آپ ﷺ نے ان سے کہا چلو۔ **"فانطلق وانطلقت بين ايديهم"**.

یہاں اس روایت میں مسجد کے اندر حضرت انس ﷺ کا آ کر دعوت دینا اور حضور اقدس ﷺ کا دعوت قبول کرنا اور چلے جانا یہ مذکور ہے۔

(۴۴) باب القضاء واللعان في المسجد

مسجد میں مقدمات کا فیصلہ اور لعان کرانے کا بیان

۴۲۳ ــ حدثنا يحيى قال: أخبرنا عبدالرزاق قال: أخبرنا ابن جريج قال: أخبرني ابن شهاب عن سهل بن سعد: أن رجلا قال: يارسول الله، أرأيت رجلا وجد مع امرأته رجلا أيقتله؟ فتلاعنا في المسجد وأنا شاهد.[أنظر: ۴۷۴۵، ۴۷۴۶، ۵۲۵۹، ۵۳۰۸، ۵۳۰۹، ۶۸۵۴، ۷۱۶۵، ۷۱۶۶، ۷۳۰۴] ۹۶

۹۵ وفي صحيح مسلم ، كتاب الأشربة ، باب جواز استتباعه غيره الى دار من يثق برضاه بذلك ، رقم: ۳۸۰۲، وسنن الترمذي ، كتاب المناقب عن رسول الله ، باب في آيات اثبات نبوة النبي وما قد خصه الله عزوجل ، رقم: ۳۵۶۳، ومسند أحمد ، باقي مسند المكثرين ، باب مسند أنس بن مالك ،رقم: ۱۲۰۳۴، ۱۲۸۰۶، ۱۲۹۴۶، ۱۳۰۵۸، وموطأ مالك ، كتاب الجامع ،باب جامع ما جاء في الطعام والشراب ، رقم: ۱۴۵۱ ، وسنن الدارمي ، كتاب المقدمة ، باب ما اكرم به النبي في بركة طعامه ، رقم: ۴۳.

۹۶ وفي صحيح مسلم ، كتاب اللعان ، رقم: ۲۷۴۱، وسنن النسائي ، كتاب الطلاق ، باب الرخصة في ذلك ، رقم: ۳۳۴۹، وسنن أبي داؤد ، كتاب الطلاق، باب في اللعان ، رقم: ۱۹۱۷ ، وسنن ابن ماجه ، كتاب الطلاق ، باب اللعان ، رقم: ۲۰۵۶، ومسند أحمد ، باقي مسند الأنصار ، باب حديث أبي مالك سهل بن سعد الساعدي ، رقم: ۲۱۷۳۸، وموطأ مالك ، كتاب الطلاق ، باب ماجاء في اللعان ، رقم: ۱۰۳۵ ، وسنن الدارمي ، كتاب النكاح ، باب في اللعان ، رقم: ۲۱۳۲.

باب کا مقصد

اس باب کو قائم کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ قضاء اور لعان مسجد میں ہو سکتی ہے یعنی آپ ﷺ نے مجلسِ قضاء مسجد میں قائم فرمائی اور لعان فرمایا، اور اس بات پر اتفاق ہے کہ قضاء مسجد میں ہو سکتی ہے۔

(۴۵) باب: إذا دخل بيتا يصلّي حيث أمر، ولا يتجسّس

کسی کے گھر میں داخل ہو تو جہاں چاہے نماز پڑھ لے یا جہاں اس سے کہا جائے، زیادہ چھان بین نہ کرے

۴۲۴ ـ حدثنا عبد الله بن مسلمة قال: حدثنا إبراهيم بن سعد، عن ابن شهاب، عن محمود بن الربيع، عن عتبان بن مالک: أن النبي ﷺ أتاه في منزله فقال: (أين تحب أن أصلي لک من بيتک؟) قال: فأشرت له إلى مكان، فكبر النبي ﷺ و صففنا خلفه، فصلى ركعتين. [أنظر: ۴۲۵، ۶۶۷، ۶۸۶، ۸۳۸، ۸۴۰، ۱۱۸۶، ۴۰۰۹، ۴۰۱۰، ۵۴۰۱، ۶۴۲۳، ۶۹۳۸] ۹۷

ترجمۃ الباب کا مقصد

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب قائم کیا ہے کہ جب کسی کے گھر میں داخل ہو تو جہاں چاہے نماز پڑھ لے یا جہاں پر اس کو حکم دیا جائے وہاں پڑھے۔ یعنی دو مختلف حالتیں بیان کی ہیں کہ جہاں چاہے پڑھ لے یا جہاں صاحبِ دار کہیں وہاں پڑھ لے۔

مندرجہ بالا دو مختلف باتیں دو مختلف حالات پر محمول ہیں اور دونوں کی حدیث بھی موجود ہے یعنی "**يصلّي حيث شاء**" اس کی دلیل اگرچہ یہاں بیان نہیں کی گئی، لیکن ماقبل میں گزر گئی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی دادی ملیکہ نے آپ ﷺ کی دعوت کی تھی تو آپ ﷺ جب ان کے گھر گئے تو خود فرمایا کہ چلو تمہارے

---

۹۷ وفي صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب الدليل على أن من مات على التوحيد دخل الجنة قطعات، رقم: ۴۸، وكتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب الرخصة في التخلف عن الجماعة بعذر، رقم: ۱۰۵۲، وسنن ابي داود، كتاب الصلاة، باب في الرجل يسمع السجدة وهو راكب وفي غير الصلاة، رقم: ۱۲۰۲، وسنن ابن ماجه، كتاب المساجد والجماعات، باب المساجد في الدور، رقم: ۷۴۶.

گھر میں نماز پڑھ لیں۔ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ کہاں پڑھ لوں بلکہ جہاں چاہا وہاں پڑھ لی۔

"أو حیث أمر" اس کی دلیل یہ مذکورہ روایت ہی ہے کہ عتبان بن مالک کہتے ہیں کہ میری بینائی کمزور ہوگئی تھی اور میرا گھر مسجد سے دور تھا، لہٰذا میرے لئے آنا مشکل ہوتا تھا۔ تو میں نے آپ ﷺ سے کہا کہ آپ ایک دن آکر میرے گھر میں کسی جگہ نماز پڑھ لیں تاکہ برکت ہوجائے، پھر اس کے بعد میں وہاں پر نماز پڑھ لیا کرونگا، لہٰذا آپ ﷺ تشریف لے گئے اور فرمایا کہ نماز کہاں پڑھوں؟ تو آپ ﷺ نے یہاں صاحب دار سے پوچھا، لہٰذا معلوم ہوا کہ جب خود سے نماز پڑھنے کا ارادہ ہو تو جہاں موقع ملے وہاں پڑھ لے اور جہاں صاحب دار نے درخواست کی ہو کہ آپ آکر نماز پڑھ لیں تو پھر اس سے پوچھنا چاہئے کہ کہاں پڑھوں، لہٰذا یہ دو باتیں ترجمۃ الباب میں کہہ دی ہیں۔

"ولا یتجسس" اور ترجمۃ الباب کے آخر میں یہ نتیجہ بھی نکال دیا کہ تجسس نہ کرے یعنی آپ کسی کے گھر گئے، اس نے آپ کو مہمان بنایا، لہٰذا اس میزبان کا یہ حق ہے کہ تم جا کر اس کے گھر کے بھید لینا نہ شروع کردو کہ اس کا گھر کیسا ہے؟ کہاں کیا چیز رکھی ہے؟ کہاں یہ نماز پڑھتے ہے؟ کہاں سوتا ہے؟ یہ تجسس نہ کرے بلکہ جہاں میزبان بٹھادے وہاں بیٹھ جائے، جہاں نماز پڑھنے کو کہے وہاں نماز پڑھ لے۔

"قال: فأشرت له إلى مكان الخ".

اسی وجہ سے فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کے گھر دعوت میں جائے تو وہ جس جگہ بیٹھنے کو کہے وہاں بیٹھے، مہمان بعض اوقات اپنی مرضی چلاتا ہے حالانکہ میزبان کی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ یہ اس جگہ بیٹھے تاکہ بے پردگی نہ ہو وغیرہ وغیرہ اور دوسری مصلحتیں بھی ہوسکتی ہیں، لہٰذا اس کی مصلحت کے تابع ہونا چاہئے اس "ولا یتجسس" سے یہ ادب سکھادیا گیا۔

(۴۶) باب المساجد في البيوتِ

گھروں میں مسجدیں بنانے کا بیان

"وصلى البراء بن عازب في مسجده في داره جماعة".

گھر کے اندر مسجد بنانا

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب قائم کیا ہے کہ مساجد گھر کے اندر بنانا، یعنی آدمی گھر میں ایسی جگہ بنائے جہاں پر نماز پڑھ سکے اور فرمایا ہے کہ "حضرت براء بن عازبؓ نے اپنے گھر کی مسجد میں جماعت سے نماز پڑھی،

لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ گھر میں جماعت سے نماز پڑھنا بھی جائز ہے۔

فقہاء کرام فرماتے ہیں اور "منیۃ المصلی" میں بھی یہ مسئلہ لکھا ہوا ہے کہ گھر کے اندر جماعت کرانے سے اگر چہ جماعت کی جو تاکید ہے اس پر عمل بھی ہو جاتا ہے اور جماعت کی فضیلت بھی حاصل ہو جاتی ہے لیکن مسجد کی فضیلت حاصل نہیں ہوتی، تو گویا گھر میں جماعت کرانا خلاف اولیٰ ہے۔

۴۲۵ ـ حدثنا سعيد بن عفير قال: حدثني الليث قال: حدثني عقيل، عن ابن شهاب قال: أخبرني محمود بن الربيع الأنصاري أن عتبان بن مالک، وهو من أصحاب رسول الله ﷺ ممن شهد بدراً من الأنصار، أنه أتى رسول الله ﷺ فقال: يارسول الله، قد أنكرت بصري وأنا أصلي لقومي، فإذا كانت الأمطار سال الوادي الذي بيني وبينهم، لم أستطع أن آتي مسجدهم فاصلي بهم، وودت يارسول الله أنک تأتيني فتصلي في بيتي فأتخذه مصلى، قال: فقال له رسول الله ﷺ: (سأفعل إن شاء الله)، قال عتبان: فغدا رسول الله ﷺ وأبوبكر حين ارتفع النهار فاستأذن رسول الله ﷺ فأذنت له فلم يجلس حين دخل البيت، ثم قال: (أين تحب أن أصلي من بيتک؟) قال: فأشرت له إلى ناحية من البيت، فقام رسول الله ﷺ فكبر، فقمنا فصففنا فصلى ركعتين ثم سلم، قال: وحبسناه على خزيرة صنعنا هاله، قال: فثاب في البيت رجال من أهل الدار ذوو عدد فاجتمعوا فقال قائل منهم: أين مالک بن الدخيشن أو ابن الدخشن؟ فقال بعضهم: ذلک منافق لايحب الله ورسوله، فقال رسول الله ﷺ: (لاتقل ذلک، ألا تراه قد قال لاإله إلا الله، يريد بذلک وجه الله؟) قال: الله ورسوله أعلم، قال فإنا: نرى وجهه ونصيحته إلى المنافقين، قال رسول الله ﷺ: (فإن الله قد حرم على النار من قال لاإله إلا الله، يبتغي بذلک وجه الله، قال ابن شهاب: ثم سألت الحصين بن محمد الأنصاري وهو أحد بني سالم، وهو من سراتهم عن حديث محمود بن الربيع فصدقه بذلک. [راجع: ۴۲۴]

حدیث کی تشریح

مذکورہ حدیث کے شروع کے حصہ میں حضرت عتبان بن مالک کے گھر میں آپ ﷺ کا تشریف لیجانا اور نماز پڑھنا منقول ہے۔

"خزیرۃ": سالن، گوشت اور کچھ آٹا ملا کر کچھ بنایا جاتا تھا، اس زمانے میں اس قسم کے سالن کو خزیرہ کہتے تھے۔

"قال فثاب في البيت رجال من اهل الدّار" یعنی جب کچھ کھانا وغیرہ کھایا تو محلے کے کچھ لوگ گھر میں جمع ہو گئے۔ **"ثاب"** کے معنی ہیں۔ جمع ہو گئے۔ **"اهل الدار"** سے مراد محلے کے کچھ لوگ، یعنی محلے والے۔ **"ذوو عدد"**: یعنی اچھے خاصے لوگ، اچھے خاصے عدد والے۔

"فقال قائل منهم اين مالک بن الدخيشن" یعنی کسی نے کہا کہ مالک بن دخیشن یا ابن الدخشن آج کل کہاں ہیں۔

"ذلک منافق لايحب الله ورسوله،فقال رسول الله ﷺ: لاتقل ذلک"۔

تو کسی نے کہہ دیا کہ وہ تو منافق ہے اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا مت کہو کیا تم نہیں دیکھتے کہ انہوں نے کلمہ نہیں پڑھا یعنی انہوں نے تو اللہ ﷻ کو راضی کرنے کے لئے کلمہ پڑھا ہے۔ لوگوں نے کہا اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں، لیکن ہم جو ان کے بارے میں منافق ہونے کا کہہ رہے تھے، وہ اس وجہ سے کہہ رہے تھے کہ ان کا رُخ اور ان کی نصیحتیں منافقین کے لئے ہوتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ منافقین کے ساتھ کافی اٹھتے بیٹھتے ہیں اور ان کے ساتھ کافی میل جول ہے، لہٰذا اس وجہ سے ہم نے سمجھا کہ وہ منافقین میں سے۔

اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

"فان الله قد حرّم على النّار من قال لا إله الا الله، يبتغي بذلک وجه الله"۔

ظاہر حال کی بنا پر کسی کو منافق نہیں کہہ سکتے

صحابہ کرام ﷺ نے ظاہر احوال کی بناء پر کہ وہ منافقین کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے، یہ سمجھا کہ یہ بھی منافق ہیں اس پر آپ ﷺ نے تنبیہ فرمائی کہ ظاہر حال کی بناء پر کسی کو منافق نہیں کہہ سکتے، البتہ ظاہر حال کی بناء پر کسی کو مسلمان کہہ سکتے ہیں، لہٰذا جب تک تحقیق نہ ہو کسی کو منافق کہنا صحیح نہیں ہے۔

حضرت مالک بن دخشن ﷺ بدری صحابی ہیں۔ آپ ﷺ نے جن لوگوں کو مسجد ضرار گرانے کے لئے بھیجا تھا، ان میں حضرت مالک بن دخشن ﷺ بھی تھے، لہٰذا ان پر خواہ مخواہ منافق ہونے کا الزام لگانا درست نہیں جب تک کہ تحقیق نہ ہو جائے۔

(۴۷) باب: التيمن في دخول المسجد وغيره،

مسجد کے اندر داخل ہونے اور دوسرے کاموں میں دائیں طرف سے ابتدا کرنے کا بیان

"و كان ابن عمر يبدأ برجله اليمنىٰ، فإذا خرج بدأ برجله اليسرى"۔

ترجمۃ الباب کا مقصد

امام بخاری رحمہ اللہ نے باب قائم کیا ہے کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت دایاں پاؤں پہلے رکھنا چاہئے اور چونکہ کوئی حدیث مرفوع امام بخاری رحمہ اللہ کی شرائط پر نہیں تھی اس وجہ سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث کا اثر ذکر کیا کہ عبداللہ بن عمرؓ جب مسجد میں داخل ہوتے، دایاں پاؤں پہلے رکھتے تھے اور جب باہر نکلتے تو بایاں پاؤں پہلے باہر نکالتے تھے۔

مستدرک حاکم وغیرہ میں حضرت انسؓ کی حدیث آتی ہے کہ **"أنه كان يقول من السنة اذا دخلت المسجد أن تبدأ برجلك اليمنى الخ"** اور جب کوئی صحابی **"السنة كذا"** کہے تو وہ مرفوع کے حکم میں ہوتا ہے۔[۹۸]

۴۲۶ــ حدثنا سليمان بن حرب قال: حدثنا شعبة، عن الأشعث بن سليم، عن أبيه، عن مسروق، عن عائشة رضي الله عنها قالت: كان النبي ﷺ يحب التيمن ما استطاع في شأنه كله، في طهوره وترجله وتنعله. [راجع: ۱۶۸]

اس مذکورہ روایت سے امام بخاری رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ ہر چیز میں تیمن کا خیال رکھتے تھے۔

(۴۸) باب: هل تنبش قبور مشركي الجاهلية ويتخذ مكانها مساجد،

کیا جاہلیت کے مشرکوں کی قبریں کھود ڈالنا اور ان کی جگہ مسجد بنانا جائز ہے

لقول النبي ﷺ: (لعن الله اليهود، اتخذوا قبور أنبيائهم مساجد)؟ وما يكره من الصلاة في القبور، ورأى عمر أنس بن مالك يصلي عند قبر فقال: القبر القبر، ولم يأمره بالإعادة.

ترجمۃ الباب کا مقصد

امام بخاری رحمہ اللہ نے باب قائم کیا ہے کہ جاہلیت کے مشرکین جہاں دفن ہوں تو کیا ان کی قبروں کو

---

[۹۸] عن أنس بن مالك أنه كان يقول من السنة اذا دخلت المسجد أن تبدأ برجلك اليمنى وإذا خرجت أن تبدأ برجلك اليسرى هذا حديث صحيح الخ، المستدرك على الصحيحين ج: ۱، ص: ۳۳۸، دار الكتب العلمية، بيروت، سنة النشر، ۱۴۱۱ھ، ۱۹۹۰ء.

اکھاڑ کر مسجد بنا سکتے ہیں؟ مقصد یہ ہے کہ مسجد بنا سکتے ہیں، یہ جائز ہے۔ چنانچہ مسجد نبوی علی صاحبھا الصلوۃ والسلام بھی اسی طرح تعمیر ہوئی تھی، البتہ چونکہ اس میں امام اوزاعی رحمہ اللہ کا اختلاف تھا جو یہ فرماتے ہیں کہ قبر اکھاڑ کر مسجد بنانا جائز نہیں اس لئے ترجمۃ الباب میں **"ھل"** کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

"لقول النبي ﷺ لعن الله اليهود اتخذ واقبور أنبيائهم مساجد؟" یعنی اللہ تعالیٰ لعنت کریں یہود پر کہ جنہوں نے انبیاء کی قبروں کو مساجد بنا دیا۔

اعتراض

یہ مسئلہ تو سمجھ میں آ گیا کہ قبورِ مشرکین کو اکھاڑ کر وہاں مسجد بنانا جائز ہے، لیکن **"لعن الله اليهود اتخذ وا قبور أنبيائهم مساجد؟"** سے امام بخاری رحمہ اللہ نے جو استدلال فرمایا ہے، اس میں وجہ استدلال کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں شراح نے مختلف توجیہات کی ہیں:

توجیہ: علامہ کرمانی رحمہ اللہ نے اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا منشأ یہ ہے کہ اللہ جل جلالہ نے یہودیوں پر لعنت کی اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو اکھاڑ کر ان کی جگہ مساجد بنالیں، تو ان پر لعنت اس وجہ سے ہوئی کہ یہ انبیاء قابل تعظیم تھے اور ان انبیاء کی قبور کو اکھاڑنا جائز نہیں تھا، اس وجہ سے ان پر لعنت فرمائی۔

تو اس کا مفہوم مخالف یہ نکلا کہ اگر یہ انبیاء نہ ہوتے اور قابل تعظیم نہ ہوتے تو قبریں اکھاڑنے میں کوئی حرج نہیں تھا، لہٰذا مشرکین چونکہ قابل تعظیم نہیں اس وجہ سے ان کی قبریں اکھاڑ کر اگر مساجد بنادیں تو کوئی حرج نہیں۔

ایک اور توجیہ

یہ مذکورہ توجیہ مجھے امام بخاری رحمہ اللہ سے بہت بعید لگتی ہے کہ وہ **"لعن الله اليهود الخ"** کے معنی یہ بیان کریں کہ انہوں نے انبیاء کرام کی قبروں کو اکھاڑ کر وہاں مسجدیں بنالیں تھیں کیونکہ اس حدیث کا سیاق یہ ہے کہ انہوں نے انبیاء کرام علیہم السلام کی تعظیم کی خاطر قبروں کو اکھاڑا نہیں تھا بلکہ عین انکی قبروں پر مسجدیں تعمیر کر دی تھیں، اور وہ گویا ایک طرح سے ان قبروں کی پرستش کرنے لگ گئے تھے، حدیث کا اصل مفہوم یہ ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے انبیاء کرام علیہم السلام کی قبروں پر مسجد بنانے کی جو وعید بیان فرمائی وہ دونوں صورتوں کو شامل ہے، یعنی اگر انبیاء کرام علیہم السلام کے اجساد مبارک قبروں میں موجود ہوں، پھر ان پر مسجد بنائی جائے تو یہ عبادت قبور کے مشابہ ہونے کی بناء پر قابل وعید ہے، اور اگر (معاذ اللہ) ان کی قبروں کو اکھاڑ کر بنائی جائے تو ان کی اہانت کی بناء پر قابل وعید ہے، لیکن اس

دوسری صورت پر وعید اسی وقت ہوسکتی ہے جب صاحب قبر قابل تعظیم ہو، مشرکین میں یہ علت نہیں پائی جاتی اس لئے ان کی قبر اکھاڑ کر مسجد بنانے میں کچھ حرج نہیں ہے، یہی توجیہ علامہ قسطلانی رحمہ اللہ نے بھی کی ہے۔

حضرت گنگوہی قدس سرہ نے اس کی توجیہ دوسری طرح فرمائی ہے ان کا فرمانا یہ ہے کہ انبیاء کرام کی قبور پر مسجد بنانے کی ممانعت کی علت **"تشبہ بعبادۃ الأوثان"** ہے، یہ علت اسی وقت پائی جاسکتی ہے جب قبر اونچی ہو اور نظر آئے، لیکن اگر اسے زمین کے برابر کر دیا جائے تو وہاں تشبہ نہیں رہے گا، اب زمین کے برابر کرنا دوطرح ممکن ہے:

ایک یہ کہ صاحب قبر کا جسم قبر میں رہے، اور اسی حالت میں قبر زمین کے برابر کر دی جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جسم اور ہڈیوں کو باہر نکال دیا جائے مشرکین کے معاملے میں یہ دوسری صورت انسب ہے، اسلئے اس سے پتہ چلا کہ ایسا کرنا جائز ہے۔

(۴۹) باب الصلاة في مرابض الغنم

بکریوں کی بندھنے کی جگہ میں نماز پڑھنے کا بیان

۴۲۹ ـ حدثنا سليمان بن حرب قال: حدثنا شعبة عن أبي التياح، عن أنس قال: كان النبي ﷺ يصلي في مرابض الغنم ثم سمعته بعد يقول (كان يصلي في مرابض الغنم قبل أن يبنى المسجد: [راجع ۲۳۴]

(۵۰) باب الصلاة في مواضع الإبل

اونٹوں کی بندھنے کی جگہ میں نماز پڑھنے کا بیان

۴۳۰ ـ حدثنا صدقة بن الفضل قال: حدثنا سليمان بن حيان قال: حدثنا عبيد الله، عن نافع قال: رأيت ابن عمر يصلي إلى بعيره، وقال: رأيت النبي ﷺ يفعله. [أنظر: ۵۰۷] [۹۹]

---

[۹۹] وفي صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب سترة المصلي، رقم: ۷۷۲، وسنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ماجاء في الصلاة الى الراحلة، رقم: ۳۲۰، وسنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب الصلاة الى الراحلة، رقم: ۵۹۳، ومسند أحمد، مسند المكثرين من الصحابة، باب مسند عبد الله بن عمر بن الخطاب رقم: ۴۲۳۸، ۴۵۶۲، ۵۵۵۹، ۵۸۰۲.

''مرابض الغنم'' میں نماز پڑھنے کا حکم

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ نے دو باب قائم فرمائے ہیں:

ایک ''**باب الصلوٰة في مرابض الغنم**''۔

اور دوسرا ''**باب الصلوه في مواضع الإبل**''۔

پہلے باب میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ بکریوں کے باڑوں میں نماز پڑھ لیتے تھے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے ابوالتیاح ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے بعد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس وقت مسجد نبوی تعمیر نہیں ہوئی تھی تو آپ ﷺ مرابض غنم میں نماز پڑھ لیتے تھے۔

''مواضع ابل'' میں نماز پڑھنے میں امامؒ کا مسلک

دوسری سنن کی احادیث میں وارد ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مرابض غنم میں نماز پڑھنے کی تو اجازت دی لیکن معاطن ابل یعنی اونٹوں کے باڑوں میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا۔ وہ احادیث جن میں معاطن ابل یا مواضع ابل میں نماز پڑھنے کی ممانعت کی گئی ہے وہ امام بخاری رحمہ اللہ کی شرط پر نہیں تھیں اس واسطے انہوں نے یہاں روایت نہیں کی، لیکن اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ مرابض غنم میں حضور اقدس ﷺ سے نماز پڑھنا ثابت ہے اور مواضع ابل میں نماز پڑھنا اس طرح ثابت ہے کہ اونٹ سامنے کھڑا ہوا ہے، اونٹ کو سترہ بنا کر نماز پڑھنا جو کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ:

''**رأيت ابن عمر يصلي إلى بعيره ،وقال :رأيت النبي ﷺ يفعله**''۔

امام بخاری رحمہ اللہ کے اس طریقہ کار سے بعض حضرات نے تو یہ سمجھا کہ امام بخاری رحمہ اللہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جس روایت میں معاطن ابل میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے وہ امام بخاری رحمہ اللہ کی شرط کے مطابق نہیں ہے، لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ معاطن ابل میں بھی نماز پڑھنا جائز ہے اور دلیل میں یہ بات ثابت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے بعیر کھڑا ہوا تھا اس کو سترہ بنا کر نماز پڑھی تو معلوم ہوا کہ قریب میں اگر اونٹ ہو تو اس سے نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔

توجیہات

بعض حضرات نے اس کی توجیہ یوں کی ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ معاطن ابل میں نماز پڑھنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے، اگرچہ وہ ان کی شرط کے مطابق نہیں ہے اس واسطے

حدیث بھی نہیں لائے، لیکن ممانعت کو فی الجملہ تسلیم کرتے ہیں اور باب میں یہ حدیث لانے اور باب قائم کرنے کا منشأ یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ سے جو جواز منقول ہے وہ صرف اتنا ہے کہ سامنے بعیر ہو اور آدمی اس کو سترہ بنا کر نماز پڑھ لے، اتنا جواز منقول ہے، بخلاف مرابض غنم کے کہ مرابض میں نماز پڑھنے کا ثبوت ہے، تو گویا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غنم میں اور ابل میں یہ تفریق ہے کہ مرابض غنم کے اندر تو آپ ﷺ کا نماز پڑھنا ثابت ہے، لیکن ابل کے معاطن میں نماز پڑھنا ثابت نہیں زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہے وہ یہ کہ سامنے اونٹ کھڑا ہوا ہے اور اس کی طرف رخ کر کے آپ ﷺ نے نماز پڑھی۔

نماز پڑھنا اور معاطن میں نماز پڑھنا، دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اس واسطے کہ معاطن میں ابل کثرت سے ہوتے ہیں اور وہاں جب وہ اپنے معاطن کے اندر ہوتے ہیں تو وہ شرارت وغیرہ کر سکتے ہیں، اس واسطے آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا لیکن ایک اپنا اونٹ ہے، اپنی ہی سواری ہے اور اس کو آگے کھڑا کر دیا اور اس کے پیچھے نماز پڑھ لی، اس کا ثبوت ہے، اس واسطے یہاں پر ترجمۃ الباب میں جو لفظ استعمال کیا ہے وہ **"باب الصلوة فی مواضع الابل"** کہا معاطن نہیں کہا ابل کے مواضع میں یعنی جہاں پر اونٹ کو بٹھایا ہے وہاں پر نماز پڑھتے تھے۔

دوسری توجیہ:

بعض حضرات محدثین نے حدیث باب کی توجیہ یوں کی ہے کہ دونوں حدیثیں ثابت ہیں مرابض غنم میں نماز پڑھنے کا جواز بھی اور معاطن ابل میں ممانعت بھی، لیکن بعض نے تو اس کو ظاہر پر محمول کیا ہے اور یہ کہا کہ معاطن ابل میں نماز پڑھنا بالکل جائز نہیں ہے اور بعض حضرات نے اس نہی کو نہی تنزیہی اور نہی ارشادی پر محمول کیا ہے اور معنی یہ ہے کہ کیونکہ ابل ذرا شرارت پسند طبیعت رکھتا ہے تو اس واسطے اگر معاطن ابل میں نماز پڑھے گا تو اس میں خطرہ ہے کہ کہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے اور اس نقصان کے خطرے سے انسان کا خشوع فوت ہو جائے گا، اس واسطے اس سے منع کیا گیا، ورنہ فی نفسہ ممانعت نہیں ہے کیوں کہ **"جعلت لی الارض کلها مسجداً"** کے تحت جائز ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی ایک توجیہ

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے ایک توجیہ کی ہے جو بعض روایتوں سے مؤید ہے کہ اصل میں مدینہ منورہ کی جو زمین تھی وہ ہموار نہیں تھی، اونچی نیچی تھی، لیکن جو مرابض غنم ہوتے تھے جہاں بکریوں کو باندھا جاتا تھا ان کو ہموار کرنے کا اہتمام کیا جاتا تھا وہ خاص طور پر ہموار کی جاتی تھیں، تو حضور اکرم ﷺ نے مرابض غنم

میں نماز پڑھنے کو جائز قرار دیا، اس واسطے کہ وہ ہموار زمین ہے اور معاطن ابل میں منع فرمایا، اس وجہ سے کہ اس میں ہموار کرنے کا اتنا اہتمام نہیں ہوتا تھا اس میں زمین برابر نہیں ہوتی تھی، تو اس میں گویا سجدہ کرنے میں پاؤں کہیں ہے اور سر کہیں ہے تو انسان کی ہیئت خراب ہو جاتی تھی اس ناہمواری کی وجہ سے منع فرمایا۔

یہی وجہ ہے کہ حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ مسجد کے بنانے سے پہلے آپ ﷺ مرابض غنم میں نماز پڑھاتے تھے، تو مطلب یہ کہ وہ چونکہ ہموار کی جاتی تھی اس واسطے ہموار جگہ پر جماعت کی جاتی تھی، معاطن ابل میں یہ صورت حال نہیں تھی، اس واسطے وہاں پر جماعت نہیں کراتے تھے۔

لہٰذا یہ جو نہی ہے یہ نہی دراصل تحریمی نہیں ہے بلکہ ایک عارض کی وجہ سے ہے اور عارض یہ کہ معاطن ابل میں ہموار زمین نہیں تھی اور مرابض غنم میں ہموار زمین ہوتی تھی۔[۱۰۰]

چوتھی توجیہ

بندے کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ معاطن ابل میں نماز کی نہی والی احادیث کو درست تسلیم کرتے ہیں، لیکن حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث لا کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نہی کی علت اونٹ کا سامنے یا قریب ہونا نہیں ہے، کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اونٹ کو سامنے رکھ کر نماز پڑھی ہے، جبکہ علت کچھ اور ہے۔ اب وہ علت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ معاطن ابل ہموار نہیں ہوتے تھے جیسا کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بیان فرمایا، اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ معاطن میں اونٹوں کی کثرت کی وجہ سے ان کے باہم لڑنے اور شرارت کرنے کا امکان زیادہ ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

(۵۱) باب من صلی و قدامه تنور أو شیئ مما یعبد فأراد به وجه اللہ تعالیٰ

جس شخص نے تنور یا آگ یا کوئی ایسی چیز جس کی پرستش کی جاتی ہے اس کے سامنے کھڑے ہو کر نماز پڑی اور اس نماز میں ذات الٰہی کی رضامندی پیش نظر رہی

وقال الزهري : أخبرني أنس قال : النبي ﷺ : (عرضت على النار وأنا أصلي)

[۱۰۰] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں : فیض الباری ج:۲، ص:۴۴، وعمدة القاری، ج:۳، ص:۴۳۶.

۴۳۱۔ حدثنا عبد اللہ بن مسلمۃ، عن مالک، عن زید بن أسلم، عن عطاء بن یسار، عن عبد اللہ بن عباس قال: انخسفت الشمس فصلی رسول اللہ ﷺ، ثم قال: (أریت النار فلم أر منظرا کالیوم قط أفظع).[راجع: ۲۹]

یہ ترجمۃ الباب قائم کیا ہے کہ کوئی شخص اس حالت میں نماز پڑھے کہ اس کے سامنے تنور، چولہا، آگ ہو یا کوئی ایسی چیز ہو جس کی عبادت کی جاتی ہے لیکن اس کا اپنا مقصد اللہ ﷻ کی عبادت ہو ان چیزوں کی عبادت نہ ہو۔

مسئلۃ الباب میں امام بخاریؒ کا مسلک:

امام بخاری رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر سامنے آگ ہو یا تنور ہو یا کوئی اور ایسی چیز ہو جس کی کافر عبادت کرتے ہیں جیسے پیپل کا درخت ہے یا گائے، ہندو اس کی عبادت کرتے ہیں وہ سامنے ہو تو اس سے نماز میں خلل نہیں آتا، جبکہ مصلّی کا مقصد اللہ ﷻ کی عبادت کرنا ہو، ان اشیاء کی عبادت مقصود نہ ہو۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال

اس مقصد پر حضرت انس بن مالک ؓ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ **"عرضت علی النار وانا اصلی"** میرے پاس آگ پیش کی گئی جبکہ میں نماز پڑھ رہا تھا'' اور اس کی تفصیل عبد اللہ بن عباسؓ کی حدیث میں ہے کہ سورج کو گرہن لگا تو نبی کریم ﷺ نے صلوۃ کسوف پڑھی اور پھر فرمایا کہ مجھے آگ دکھائی گئی، میں نے آج اس سے زیادہ گھبرا دینے والا کوئی منظر نہیں دیکھا، آج جو جہنم کا منظر دیکھا اس سے زیادہ خوفناک منظر کوئی نہیں دیکھا۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال یہ ہے کہ حضور ﷺ پر نماز کی حالت میں جہنم کی آگ پیش کی گئی، گویا آپ کے سامنے آگ تھی معلوم ہوا کہ اگر آگ سامنے ہو تو نماز پڑھنا جائز ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر سامنے کوئی آگ وغیرہ یا انگیٹھی ہو جس میں آگ جل رہی ہو تو نماز میں کراہت تنزیہی آتی ہے، اس واسطے کہ اس میں" **عبدۃ النار** "کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے، اس لئے اس سے منع کرتے ہیں اور یہاں حدیثِ باب سے امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال تام نہیں۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ یہاں جو آپ ﷺ کے سامنے آگ پیش کی گئی تھی اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ ﷺ کے اختیار کے بغیر تھی، ایسا نہیں تھا کہ پہلے آگ جل رہی ہو اور آپ ﷺ نے وہاں نماز پڑھنا شروع کی ہو، بلکہ جس وقت آپ ﷺ نے نماز شروع کی اس وقت کوئی آگ آپ کے سامنے نہیں تھی، پھر آپ کے اوپر جنت بھی پیش کی گئی اور جہنم بھی پیش کی گئی۔ یہ آپ کے اختیار کے بغیر تھی اور جو کچھ کلام ہے وہ اس صورت میں ہے جبکہ آدمی اپنے اختیار سے آگ کے سامنے نماز پڑھے، لہٰذا اس حدیث سے استدلال پورا تام نہیں ہوتا۔[۱۰۱]

دوسری وجہ: حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عالم کشف میں جو مناظر دکھائے جاتے ہیں وہ درحقیقت عالم غیب سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے بھی استدلال تمام نہیں۔

عالم حس اور عالم غیب میں فرق

حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک عالم حس ہوتا ہے کہ جس کو انسان اپنے حواس سے محسوس کر سکے اور ایک عالم غیب ہوتا ہے جس کو ہم اپنے حواس سے محسوس نہیں کر سکتے۔ اگر چہ وہاں پر بھی جو واقعات ہو رہے ہوتے ہیں وہ بھی حقیقی ہیں، محض فرضی نہیں ہیں لیکن ہم اپنے حواس سے ان کا ادراک نہیں کر پاتے۔

مثال: حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ اس کی مثال دیتے ہیں کہ حدیث میں آتا ہے کہ قبر کے اندر میت کو جب عذاب ہوتا ہے تو اس کے چیخنے کی آوازیں انسان اور جنات کے سوا ساری مخلوق سنتی ہے تو بھئی! اس کو عذاب ہو رہا ہے اور واقعی چیخ رہا ہے اور آوازیں نکل رہی ہیں تو ہم کیوں نہیں سنتے؟ جنات اور انسان کیوں نہیں سنتے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ جنات اور انسان کا تعلق عالم حس سے ہے اور مردوں کو جو عذاب ہو رہا ہے وہ عالم غیب میں ہو رہا ہے اگر چہ ہے حقیقی اور جسم پر ہو رہا ہے یعنی ایسا نہیں کہ جسم پر نہ ہو روح پر ہو جیسے بعض لوگ کہتے ہیں۔ جسم ہی پر ہے لیکن عالم غیب میں ہے اور اس وجہ سے اس کی آواز ہم اور آپ اپنے حواس کے ذریعے نہیں سن سکتے، تو اسی طرح عالم حس میں اور عالم غیب میں بڑا فرق ہے اور عالم غیب میں ہونے والی چیز اگر واقعتاً ہو رہی ہوتی ہے لیکن حواس اس کا ادراک نہیں کر پاتے، اتنا فرق ہوتا ہے تو یہ جو آپ کو جہنم اور جنت کا مشاہدہ کرایا گیا اس کا تعلق عالم غیب سے تھا، یہی وجہ ہے کہ دوسرے صحابہ کرام ﷺ جو آپ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے ان کو منظر نظر نہیں آیا، حالانکہ حقیقتاً آپ کو آگ پیش کی گئی، اس وجہ سے کہ اس کا تعلق عالم حس سے نہیں تھا بلکہ عالم

---

[۱۰۱] عمدة القاری، ج:۳، ص:۴۴۱.

غیب سے تھا تو عالم غیب کے اوپر جو احکام عائد ہوتے ہیں ان پر عالم حس کے احکام کو قیاس نہیں کیا جا سکتا، اس واسطے امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال تام نہیں ہے۔[۱۰۲]

(۵۲) باب كراهية الصلاة في المقابر

مقبروں میں نماز پڑھنے کی کراہت کا بیان

۴۳۲ ـ حدثنا مسدد قال : حدثنا يحيىٰ عن عبيد الله قال : أخبرني نافع ، عن ابن عمر عن النبي ﷺ قال : (اجعلوا في بيوتكم من صلاتكم و لا تتخذوها قبوراً) [أنظر: ۱۱۸۷] [۱۰۳]

گھروں میں نماز پڑھنے کی ترغیب

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث نقل کی ہے فرمایا کہ **"اجعلوا في بيوتكم من صلوٰتكم"** کہ اپنے گھروں میں نماز کے لئے کوئی جگہ بناؤ یا یہ کہ کچھ نمازیں گھر میں بھی پڑھا کرو **"ولا تتخذوها قبوراً"** اور گھروں کو قبریں مت بناؤ یعنی وہ جگہ جہاں نماز بالکل نہ پڑھی جائے وہ قبر کے مشابہ ہے وہ زندوں کی جگہ نہیں ہے مردوں کی جگہ ہے، یعنی جس طرح قبر میں مردے عالم حس کے اندر نماز نہیں پڑھتے ،اسی طریقے سے تم اپنے گھر کے اندر نماز نہیں پڑھو گے تو تمہارے گھر قبروں کے مشابہ ہو جائیں گے۔

میں نے (استاذ نا) یہ قید لگا دی کہ عالم حس میں، لہٰذا اگر عالم غیب میں نماز پڑھیں تو وہ اس کے منافی نہیں جب کہ موسیٰ علیہ السلام کا قبر کے اندر نماز پڑھنا حدیث سے ثابت ہے، تو مقصود یہ ہے کہ اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ اور قبرستان بنانے کے معنی یہ ہیں کہ ان میں نماز نہ پڑھی جائے جیسا کہ قبر میں مردے نماز نہیں پڑھتے ہیں۔

---

[۱۰۲] فيض الباری ، ج : ۲ ، ص : ۴۵ .

[۱۰۳] وفي صحيح مسلم ، كتاب صلاة المسافرين وقصرها ، باب استحباب صلاة النافلة في بيته وجوازها في المسجد ، رقم: ۱۲۹۶ ، وسنن الترمذی ، كتاب الصلاة ، باب ماجاء في فضل صلاة التطوع في البيت ، رقم: ۴۱۳ ، وسنن النسائی، كتاب قيام الليل وتطوع النهار ، باب الحث على الصلاة في البيوت والفضل في ذلک ، رقم: ۱۵۸۰ ، وسنن أبی داود ، كتاب الصلاة ، باب في فضل التطوع في البيت ، رقم : ۱۲۳۶ ، وسنن ابن ماجه ، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها ، باب ماجاء في التطوع في البيت، رقم: ۱۳۶۷ ، ومسند أحمد ، مسند المكثرين من الصحابة ، باب مسند عبد الله بن عمر بن الخطاب ، رقم: ۴۲۸۲، ۴۴۲۴، ۵۷۷۲.

امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سے اس بات پر مزید استدلال کیا ہے کہ قبرستان میں نماز پڑھنا جائز نہیں، چنانچہ فرمایا کہ **"باب كراهية الصلوة فى المقابر"** اس لئے کہ گویا حضور اقدس ﷺ نے پہلے یہ بات مفروغ عنہ اور یہ بات طے قرار دی کہ قبریں نماز کی جگہ نہیں ہیں۔ پھر فرمایا کہ تم اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو اور اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ، تو معلوم ہوا کہ قبرستان میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، ورنہ اس گھر کو جس میں نماز نہ پڑھی جائے قبرستان سے تشبیہ نہ دی جاتی۔

قبرستان میں نماز پڑھنے کے بارے میں حنفیہ کا مؤقف

اس باب میں حنفیہ کا مؤقف یہ ہے کہ قبر کے اوپر نماز پڑھنا جائز نہیں اور اگر قبر کے سامنے اس طرح پڑھی جائے کہ قبر اور مصلی کے درمیان کوئی سترہ نہ ہو تو بھی جائز نہیں، لیکن اگر قبر اس طرح سامنے ہو کہ سامنے سترہ ہے یا قبر کے دائیں یا بائیں نماز پڑھی جائے تو حنفیہ کے نزدیک جائز ہے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور جہاں نماز پڑھنے کی ممانعت آئی ہے وہ اس صورت پر محمول ہے جبکہ قبر کو بالکل اس طرح سامنے رکھا جائے کہ مصلّی اور اس کے درمیان کوئی سترہ نہ ہو۔[۱۰۴]

ہیٹر وغیرہ کے سامنے نماز کا حکم

سوال: سردیوں میں ہیٹر وغیرہ جلا دیئے جاتے ہیں اور اس کے سامنے نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: جو فقہاء حنفیہ نے اس کو مکروہ کہا ہے کراہت تنزیہی اور یہ بھی اس ماحول کے اندر ہوگی جہاں اس چیز کو عبادت کے لئے استعمال کیا جاتا ہو اور جو لوگ آتش پرست ہیں وہ ہیٹر وغیرہ کو استعمال نہیں کرتے وہ باقاعدہ آگ جلاتے ہیں، لہٰذا کراہیت صرف خالص آگ کی ہوگی، ہیٹر عبادت میں استعمال نہیں ہوتا، لہٰذا اس میں کراہت بھی نہیں ہوگی۔

(۵۳) باب الصلاة في مواضع الخسف والعذاب

خسف اور عذاب کے مقامات میں نماز پڑھنے کا بیان

ويذكر أن عليا كره الصلوة بخسف بابل .

---

۱۰۴ انه اذا وضع بينه وبين القبر سترة لايكره والا كره ، وان كان القبر فى جوانبه لايكره ، فيض البارى ج: ۲، ص: ۴۵.

۴۳۳ ۔ حدثنا إسماعيل بن عبد الله قال: حدثني مالك، عن عبد الله بن دينار، عن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما: أن رسول الله ﷺ قال: (لا تدخلوا على هؤلاء المعذبين إلا أن تكونوا باكين، فإن لم تكونوا باكين فلا تدخلوا عليهم، لا يصيبكم ما أصابهم) [أنظر: ۳۳۸۰، ۳۳۸۱، ۴۴۱۹، ۴۴۲۰، ۴۷۰۲] ۱۰۵

مقصود بخاری رحمہ اللہ

یہ باب قائم کیا کہ" **باب الصلوة في مواضع الخسف والعذاب** "ان جگہوں پر نماز پڑھنا جہاں پر کسی قوم کو خسف کیا گیا ہو یعنی زمین میں دھنسا دیا گیا ہو یا ان کے اوپر عذاب نازل کیا گیا ہو، یعنی مواضع عذاب میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ مقصود ہے۔ اس میں تعلیقاً یہ نقل کیا ہے " **ويذكر ان علياً كره الصلوة بخسف بابل** " کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بابل کے کھنڈرات میں نماز پڑھنے کو مکروہ سمجھا ہے۔

تہذیب وتمدن کا تاریخی شہر بابل

بابل عراق کا علاقہ ہے، جو کسی زمانہ میں بہت بڑی تہذیب تھی اور نمرود اسی تہذیب کا بادشاہ تھا اور عرصہ دراز تک یہ بابل بہت بڑا تمدن کا مرکز رہا، نمرود کے زمانے میں یہ سحر کا بھی مرکز رہا ہے، جادو بہت ہوتا تھا بعد میں اس شہر کے اوپر عذاب آیا، نمرود نے خدائی کا دعویٰ کیا، وہاں اس کے کچھ کھنڈرات ابھی تک باقی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب عراق کے اس علاقے سے گزرے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے منع کیا کہ یہاں نماز نہ پڑھو بلکہ آگے چل کر نماز پڑھیں گے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال

اس سے امام بخاری رحمہ اللہ استدلال کررہے ہیں کہ مواضع عذاب میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ حنفیہ کا مؤقف یہی ہے کہ وہاں پر نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے۔

ویسے تو یہ ہے کہ:

---

۱۰۵ وفي صحيح مسلم، كتاب الزهد والرقائق، باب لا تدخلوا مساكن الذين ظلموا أنفسهم الا ان تكونوا، رقم: ۵۲۹۲. ومسند أحمد، مسند المكثرين من الصحابة، باب مسند عبد الله بن عمر بن الخطاب، رقم: ۴۳۳۳، ۴۹۷۴، ۵۰۹۰، ۵۱۴۷، ۵۱۸۴، ۵۱۸۷، ۵۳۸۷، ۵۴۴۷، ۵۶۶۱، ۵۷۱۲، ۵۹۳۴.

"جعلت لی الارض کلها مسجداً"۔

لیکن اس مقام پر چونکہ اللہ ﷻ کا عذاب نازل ہوا تو اللہ ﷻ ہی جانے وہاں پر کیا زہریلے اثرات ہوں گے، جو انسان کے اوپر متوجہ ہو جائیں، تو اسی واسطے حضور ﷺ تبوک جاتے ہوئے صالح علیہ السلام کی بستی (مدائن) سے گزرے تو آپ ﷺ نے اپنی سواریوں کو تیز کرنے کا حکم دیا اور پھر فرمایا کہ یہاں کے پانی سے اپنا آٹا بھی مت گوندھو وغیرہ وغیرہ۔

وہی حدیث پھر آگے امام بخاری رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ **"لا تدخلوا علی ھؤلاء المعذّبین"** یہ اسی وقت کا واقعہ ہے جب آپ ﷺ تبوک تشریف لے جارہے تھے، راستے میں مدائن صالح پڑتے تھے اور اب بھی ان کے کھنڈرات باقی ہیں۔

اس جگہ پر فرمایا کہ ان معذبین کے اوپر داخل نہ ہو" **الا أن تکونوا باکین** "مگر روتے ہوئے **"فان لم تکونوا باکین فلا تدخلوا علیھم"** اگر نہ روؤ تو مت جاؤ **"الا یصیبکم ما أصابھم"** کہ تم کو وہ عذاب نہ پہنچے جو ان کو پہنچا تھا۔ تو معلوم ہوا کہ معذب بستیوں میں ٹھہرنا پسندیدہ نہیں ہے۔

اس سے استدلال کر رہے ہیں کہ جب ٹھہرنے کی ممانعت ہے تو معنی یہ ہوئے کہ نماز بھی نہ پڑھو، اس واسطے کہ نماز پڑھنا تو اس وقت ہوگا کہ کہیں آدمی اس جگہ پر اترے اور اس جگہ کو اپنی منزل بنائے یا جائے اقامت بنائے تب نماز پڑھے گا، آپ ﷺ نے جائے اقامت بنانے سے ہی منع فرمایا تو اس سے معلوم ہوا کہ نماز پڑھنا بھی مکروہ ہے۔[۱۰۶]

(۵۴) باب الصلاة في البيعة،

گرجا میں نماز پڑھنے کا بیان

"وقال عمر رضی اللہ عنہ: إنا لا ندخل كنا ئسكم من أجل التماثيل التي فيها الصور، وكان ابن عباس يصلي في البيعة إلا بيعة فيها تماثيل.

---

۱۰۶ هذا الحديث مطابق لأثر علي من حيث عدم النزول من النبي صلى الله عليه وسلم لما مر بالحجر ديار ثمود في حال توجهة الى تبوك، ومن علي كذالك حيث لم ينزل لما أتى خسف بابل، فأثر علي رضي الله تعالىٰ عنه، مطابق للترجمة للوجه الذي ذكرناه، فكذلك حديث ابن عمر مطابق للترجمة، لان المطابق للمطابق للشئ مطابق لذلك الشئ، وعدم نزولهما فيها مستلزم لعدم الصلاة فيهما، وعدم الصلاة لأجل الكراهة، والباب معقود لبيان الكراهة، فحصلت المطابق فافهم، عمدة القاري ج:۳، ص: ۴۵۱.

۴۳۴۔ حدثنا محمد قال: أخبرنا عبدة ،عن هشام بن عروة عن أبيه ،عن عائشة أن أم سلمة ذكرت لرسول الله ﷺ كنيسة رأتها بأرض الحبشة يقال لها: مارية ،فذكرت له ما رأت فيها من الصور ، فقال رسول الله ﷺ (أولئک قوم إذا مات فيهم العبد الصالح أو الرجل الصالح بنوا على قبره مسجدا وصوروا فيه تلک الصور أولئک شرار الخلق عند الله) .[راجع: ۴۲۷]

البيعة

"**بيعة**" معبد کو کہتے ہیں جمع اس کی بیع آتی ہے اور قرآن پاک میں بھی آیا ہے۔

بعض اوقات نصاریٰ کے معبد کو بھی کہتے ہیں اور بعض اوقات یہودیوں کے معبد کو کہتے ہیں۔ یہودیوں یا نصاریٰ کے معبد کو بیعہ کہا جاتا ہے، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "**إنا لا ندخل كنا ئسكم**".

حضرت عمرؓ کا دعوت میں جانے سے انکار

ایک نصرانی نے حضرت عمرؓ کی دعوت کی تھی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہم نہیں جائیں گے، کیوں کہ ہم تمہارے معبد میں اس لئے داخل نہیں ہوتے "**من أجل التماثيل التی فيها الصوّر**" اس میں جو تماثیل ہیں جن کے اندر انبیاء علیہم السلام وغیرہ کی تصویریں بنا رکھی ہیں۔ ان کی وجہ سے ہم اس میں نہیں جائیں گے یعنی اندر نہیں جائیں گے۔

بیعہ میں نماز پڑھنے کی مطلقاً ممانعت نہیں

"**وكان ابن عباس ؓ يصلی فی البيعة الا بيعة فيها تماثيل**".

عبداللہ بن عباسؓ بیعہ میں نماز پڑھ لیتے تھے سوائے اس بیعہ کے جس میں تصویریں ہوں، تو معلوم ہوا کہ نماز پڑھنے کی جو ممانعت ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ سامنے تصویر ہوتی ہے تو عبادت صور یا عبادت اصنام کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے، لیکن اگر یہ عارض نہ ہو تو مجرد بیعہ اگر ہے تو ان کے بیعہ ہونے کی وجہ سے نماز پڑھنے میں کراہت نہیں ہے "**جعلت لی الأرض كلها مسجدًا**".

اور آج تو مغربی ممالک میں مسلمان نصرانیوں کے جو کنیسہ ہیں ان کو خرید خرید کر مسجدیں بنا رہے ہیں جو پہلے کنیسہ تھے ان کو مسلمان خریدتے ہیں، ان کے ہاں اپنے کنیسہ کو بیچنا جائز ہے ویسے بھی مذہب پر عمل کرنے کی گرفت لوگوں کے اوپر کم ہے کنیسہ یہ ویران پڑے ہوئے ہیں تو کنیسہ یہ کے لوگ ان کو بیچ دیتے ہیں اور مسلمان

خریدتے ہیں پھران کو مسجد بنالیتے ہیں اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اس واسطے کہ زمین تو اللہ ﷻ کی ہے اور اس کو غلط طور پر استعمال کیا جارہا تھا اب اس کو صحیح طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔

(۵۵) باب :

۴۳۵،۴۳۶ ــ حدثنا أبواليمان قال : أخبرنا شعيب ، عن الزهري قال : أخبرني عبيد الله بن عبد الله بن عتبة أن عائشة و عبد الله بن عباس قالا : لما نزل برسول الله ﷺ طفق يطرح خميصة له على وجهه ، فإذا اغتم بها كشفها عن وجهه فقال و هو كذلک : (لعنة الله على اليهود و النصارى اتخذوا قبور أنبيائهم مساجد) يحذر ما صنعوا . [أنظر : ۱۳۳۰، ۱۳۹۰، ۳۴۵۳، ۳۴۵۴، ۴۴۴۱، ۴۴۴۳، ۴۴۴۴، ۵۸۱۵، ۵۸۱۶] ۱۰۷

۴۳۷ ــ حدثنا عبد الله بن مسلمة ، عن مالک ، عن ابن شهاب ، عن سعيد بن المسيب ، عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ قال : (قاتل الله اليهود ، اتخذوا قبور أنبيائهم مساجد)

روایت باب سے مقصود بخاریؒ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ ابن عباس ﷺ دونوں روایت کرتے ہیں کہ **"لما نزل برسول الله ﷺ"** جب رسول اللہ ﷺ پر اتاری گئی "نُزل" مجہول کا صیغہ ہے) یعنی آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو **"طَفِقَ يَطرَحُ خَمِيصَةً له على وجهه"** آپ ﷺ تکلیف میں تھے تو آپ ﷺ اپنا کمبل اپنے چہرہ مبارک پر ڈال دیتے تھے **"فاذا اعلم بها"** جب اس میں گھٹن محسوس فرماتے تو **"كشفها عن وجهه"** تو چہرے سے ہٹا لیتے تھے جیسے آدمی بے چینی میں کرتا ہے کہ کبھی اوڑھ لیا اور کبھی ہٹالیا۔

"فقال وهو كذلک" اسی حالت میں آپ تھے کہ ارشاد فرمایا کہ **"لعنة الله على اليهود**

---

۱۰۷ وفي صحيح مسلم ، كتاب المساجد ومواضع الصلاة ، باب النهي عن بناء المساجد على القبور واتخاذ الصور ، رقم: ۸۲۲، وسنن النسائي ، كتاب المساجد ، باب النهي عن القبور مساجد ، رقم: ۶۹۶، ومسند أحمد ، ومن مسند بني هاشم ، باب بداية مسند عبد الله بن العباس ، رقم: ۱۷۸۶ ، وباقي مسند الأنصار ، باب حديث السيدة عائشة ، رقم: ۲۲۹۳۱، ۲۳۳۷۲، ۲۳۷۴۸، ۲۴۹۵۳، ۲۴۹۸۲، وسنن الدارمي ، كتاب الصلاة ، باب النهي عن اتخاذ القبور مساجد ، رقم: ۱۳۶۷ .

والنصاریٰ" یہود ونصاریٰ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو کہ "**اتخذوا قبور أنبیائهم مساجد**" کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنالیا کہ باقاعدہ ان کو سجدے کرنے شروع ہو گئے، لیکن تم ایسا نہ کرنا کہ میری وفات کے بعد میری قبر کو سجدہ گاہ بنالو۔ یہاں لانے کا امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ قبروں کو سجدہ گاہ بنانا یا قبروں کی طرف سجدہ کرنا یہ منع ہے۔

(۵۶) باب قول النبي ﷺ "جعلت لي الأرض مسجدا وطهورا"

نبی ﷺ کا یہ فرمایا کہ زمین میرے لئے مسجد اور پاک کرنے والی بنائی گئی ہے

۴۳۸ ۔ حدثنا محمد بن سنان قال: حدثنا هشيم قال: حدثنا سيار هو أبو الحكم قال: حدثنا يزيد الفقير قال: حدثنا جابر بن عبد الله قال: قال رسول الله ﷺ: (أعطيت خمسا لم يعطهن أحد من الأنبياء قبلي: نصرت بالرعب مسيرة شهر، وجعلت لي الأرض مسجدا وطهورا، وأيما رجل من أمتي أدركته الصلاة فليصل، وأحلت لي الغنائم، وكان النبي يبعث إلى قومه خاصة وبعثت إلى الناس كافة وأعطيت الشفاعة). [راجع: ۳۳۵][۱۰۸]

(۵۷) باب نوم المرأة في المسجد

عورت کا مسجد میں سونے کا بیان

ترجمۃ الباب سے مقصود بخاریؒ

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس پر ترجمۃ الباب قائم کیا کہ "**نوم المرأة فی المسجد**" لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا مسجد میں سونا جائز ہے، کیونکہ اس عورت کے لئے حضور اقدس ﷺ نے مسجد ہی کے اندر خیمہ قائم کر دیا تھا اور وہیں پر وہ رہتی تھی ظاہر ہے کہ جب وہ رہتی تھی تو سوتی بھی ہوگی، لہٰذا معلوم ہوا کہ عورت کا مسجد میں سونا جائز ہے۔

۴۳۹ ۔ حدثنا عبيد بن إسماعيل قال: حدثنا أبو أسامه، عن هشام، عن أبيه، عن

---

[۱۰۸] مذکورہ حدیث کی روشنی میں خصائص نبوی ﷺ کی تفصیل: **رقم الحديث: ۳۳۵، كتاب التيمم، انعام الباری، ج: ۲، ص: ۵۲۴**. میں ملاحظہ فرمائیں۔

عائشة:أن وليدة كانت سوداء لحي من العرب فأعتقوها فكانت معهم .قالت: فخرجت صبية لهم عليها وشاح أحمر من سيور ،قالت :فوضعته أووقع منها فمرت به حدياة وهو ملقى فحسبته لحما فخطفته ،قالت : فالتمسوه فلم يجدوه ،قالت :فاتهموني به.قالت: فطفقوا يفتشون حتى فتشوا قبلها .قالت :والله إني لقائمة معهم إذامرت الحدياة فألقته ،قالت :فوقع بينهم، قالت:فقلت هذاالذي اتهمتموني به زعمتم وأنا منه بريئة وهو ذاهو،قالت:فجاء ت إلى رسول الله ﷺ فأسلمت ،قالت: فكانت لها خباء في المسجد أوحفش ،قالت :فكانت تأتيني فتحدث عندي ،قالت فلاتجلس عندي إلا قالت: ويوم الوشاح من تعاجيب ربنا ألا إنه من بلدة الكفر أنجاني قالت عائشة فقلت لها :ماشأنک لا تقعدين معي مقعداإلا قلت هذا؟قالت فحدثتني بهذاالحديث.[أنظر :۳۸۳۵] ۱۰۹

عجیب واقعہ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک لڑکی تھی **"كانت سوداء"** سیاہ رنگ کی یعنی سانولے رنگ کی **"لحيّ من العرب"** عرب کے کسی قبیلہ سے تعلق رکھتی تھی اور ان کی باندی تھی **"فاعتقوها"** مالکوں نے اس کو آزاد کر دیا **"فكانت معهم"** آزاد ہونے کے بعد بھی وہ اسی قبیلے کے لوگوں کے ساتھ رہتی رہی۔ ایک طرف تو یہ ہوا، آگے دوسرا واقعہ یہ ہوا **"قالت فخرجت صبيّة لهم عليها و شاح احمر من سيور"** کہ قبیلہ والوں کی ایک بچی گھر سے نکلی جس پر سرخ رنگ کے چمڑے کا ہار تھا اور اس میں کچھ موتی وغیرہ لگا دیئے ہونگے، **"وشاح"** عام طور سے اس ہار کو کہتے ہیں جس میں موتی جڑے ہوئے ہوں، **"سيور"** جمع **"سير"** کی ہے اور **"سير"** کے معنی چمڑے کے تسمہ کے آتے ہیں تو چمڑے کے تسمہ پر موتی جڑے ہوئے تھے، **"قالت فوضعته"** اس بچی نے وہ ہار کسی جگہ جا کر اتار دیا **"وقع منها"** یا ویسے ہی بغیر اختیار کے اس سے گر گیا **"فمرت به حدياة"** تو وہاں اوپر سے ایک چیل گزری **"وهو ملقى"** جبکہ وہ ہار نیچے پڑا ہوا تھا **"فحسبته لحما"** تو چیل سمجھی کہ یہ گوشت ہے، **"فخطفته"** وہ اچک کر لے گئی، **"قالت فالتمسوه"** اب قبیلہ والوں کو تلاش ہوئی کہ بچی کے گلے میں ہار تھا وہ کہاں گیا جب تلاش کرنا شروع کیا، **"فلم يجدوه"** لیکن وہ ملا نہیں، **"قالت فاتهموني به"** تو اب وہ کنیز کہنے لگی کہ لوگوں نے مجھے اس ہار کے بارے میں متہم کر دیا کہ میں نے چوری کیا ہے اور بچی سے چھین کر اپنے قبضہ میں کر لیا ہے، **"فطفقوا يفتشون"** میری تلاشی لینی شروع

---

۱۰۹ انفرد به البخاری .

کردی، **"حتی فتشوا قبلها"** یہاں تک کہ اس کی شرم گاہ کی بھی تلاشی لی **"قالت واللہ انی لقائمۃ معھم"** میں لوگوں کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی، **"إذامرت الحدیاۃ فألقتہ"** وہی چیل جو اٹھا کر لے گئی تھی وہ پاس سے گزری اور وہ ہاران کے سامنے ڈال دیا **"قالت فوقع بینھم"** تو وہ ہاران کے سامنے جا کر گر گیا۔

"قالت فقلت ھذاالذی اتھمتمونی بہ زعمتم وانا منہ بریئۃ" یہ ہے وہ ہار جس کے بارے میں تم مجھ پر تہمت لگا رہے تھے، تم نے دعوی کیا تھا کہ میں نے لیا ہے حالانکہ میں اس سے بری ہوں **"وھو ذاھو"** دیکھو یہ پڑا ہے یہاں تک قصہ ختم ہوگیا۔

مطلب یہ ہے کہ کس طرح اللہ ﷻ نے اس کی برأت لوگوں پر ظاہر کرادی کہ اس نے چوری نہیں کی تھی بعد میں یہ باندی اپنے قبیلے سے سفر کر کے نبی کریم ﷺ کے پاس آگئی اور آ کر مسلمان ہوگئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ **"فکانت لھا خباء فی المسجد"** کہ مسجد میں اس کا خیمہ لگا ہوا تھا **"او قال حفش"** یا یہ کہ **"حفش"** تھا **"حفش"** جھونپڑی اور چھوٹے خیمے کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جب وہ مسلمان ہوگئیں تو رسول اللہ ﷺ نے سوچا کہ اس کو کہاں رکھیں تو میں نے مسجد کے اندر اس کے لئے خیمہ یا جھونپڑی ڈال دی تھی **"فکانت تاتینی"** حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ وہ میرے پاس آیا کرتی تھی **"فتحدث عندی"** مجھ سے باتیں کیا کرتی تھی **"قالت فلا تجلس عندی مجلس"** حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب بھی وہ میرے پاس آ کر بیٹھتی تھی **"الاقالت"** تو یہ شعر پڑھا کرتی۔

ویوم الوشاح من تعاجیب ربنا — الا إنہ من بلدۃ الکفر أنجانی

وہ ہاروالا دن ہمارے پروردگار کی عجیب وغریب باتوں میں سے ہے اور اس دن کے واقعات نے مجھے کفر سے نجات دلائی **"قالت عائشۃ"** (عائشہؓ) کہتی ہیں، میں نے اس سے کہا **"ماشأنک"** کہ کیا بات ہے **"لاتقعدین معی مقعدا الا قلت ھذا"** جب بھی تم میرے پاس بیٹھتی ہو تو یہ شعر پڑھتی ہو۔

"قالت فحد ثتنی بھذا الحدیث" اس نے یہ واقعہ سنایا کہ اس طرح میرے ساتھ واقعہ پیش آیا تھا اس کی وجہ سے میں یہ شعر پڑھتی ہوں۔

(۵۸) باب نوم الرجال في المسجد،

مسجد میں مردوں کے سونے کا بیان

وقال أبوقلابۃ عن أنس: قدم رھط من عکل علی النبي ﷺ فکانوا في الصفۃ، وقال عبدالرحمن بن أبي بکر: کان أصحاب الصفۃ الفقراء.

۴۴۰ ۔ حدثنا مسدد قال : حدثنا يحيي ، عن عبيد الله قال : حدثني نافع قال: أخبرني عبدالله بن عمر أنه كان ينام وهو شاب أعزب لا أهل له في مسجد النبي ﷺ .
[أنظر: ۱۱۲۱، ۱۱۵۶، ۳۷۳۸، ۳۷۴۰، ۷۰۱۵، ۷۰۲۸، ۷۰۳۰][۱۰]

"نوم فی المسجد" سے متعلق امام بخاریؒ اور شوافع کا مسلک

امام بخاری رحمہ اللہ نے باب قائم کیا ہے "**باب نوم الرجال فی المسجد**" کہ مسجد کے اندر مَردوں کا سونا بھی جائز ہے جس کے لئے تین روایتیں لائے ہیں ایک عرنیین کی کیونکہ عرنیین کو شروع میں مسجد میں ٹھہرایا گیا تھا تو وہ وہاں پر سوئے بھی ہونگے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت نقل کی ہے کہ میں نوجوان تھا اور کنوارا تھا میرا کوئی گھر نہیں تھا تو وہیں مسجد نبوی کے اندر سویا کرتا تھا۔

تو ان دونوں روایتوں کے نقل کرنے سے امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ مسجد کے اندر سونا مرد کے لئے بھی جائز ہے، اور عورت کے لئے بھی جائز ہے اور یہی مسلک امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے کیونکہ ان کے ہاں نوم فی المسجد مطلقاً جائز ہے۔[۱۱]

حنفیہ اور مالکیہ کا مسلک

امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ مسجد کے اندر سونا مکروہ ہے اور جب مردوں کے لئے مکروہ ہے تو عورتوں کے لئے بطریق اولیٰ مکروہ ہوگا کیونکہ ان کے سونے میں تو اور زیادہ فتنہ ہے اس واسطے مکروہ ہے، البتہ کوئی مسافر ہو جس کا کوئی اور ٹھکانہ نہ ہو تو وہ مسجد میں سو سکتا ہے یا کوئی ایسا شخص ہے جو۔بے گھر ہے تو وہ بھی مسجد میں سو سکتا ہے یا معتکف ہے تو وہ بھی حالت اعتکاف میں مسجد میں سو سکتا ہے۔

لیکن عام حالت میں جب کہ آدمی نہ مسافر ہو نہ معتکف ہو نہ بے گھر ہو تو ایسی صورت میں اس کے لئے مسجد کے اندر سونا مکروہ ہے۔[۱۲]

---

[۱۰] وفی صحیح مسلم ، کتاب فضائل الصحابة ، باب فقه فضائل عبد الله بن عمر ، رقم : ۴۵۲۸، وسنن الترمذی ، کتاب الصلاة ، باب ماجاء فی النوم فی المسجد ، رقم: ۲۹۵ ، وسنن النسائی ، کتاب الصلاة ، باب النوم فی المسجد ، رقم: ۷۱۴، وسنن ابن ماجه ، کتاب المساجد والجماعات ، باب النوم فی المسجد ، رقم: ۷۴۳، وکتاب تعبیر الرؤیا ، رقم: ۳۹۰۹، ومسند أحمد ، مسند المكثرين من الصحابة ، باب مسند عبد الله بن عمر بن الخطاب ، رقم: ۴۲۶۵، ۴۳۷۸، ۵۵۷۵، ۶۰۴۸ ، وسنن الدارمی ، کتاب الصلاة ، باب النوم فی المسجد ، رقم: ۱۳۶۴ ، وکتاب الرؤیا ، باب فی القمص والبئر واللبن والعسل والسمن والتمر وغیرہ رقم: ۲۰۵۹ .

[۱۱، ۱۲] وفيه : جواز النوم فی المسجد ، ولا کراهة فيه عند الشافعي . ومالک وابن القاسم يكرهان المبيت فيه للحاضر القوی وجوزه ابن القاسم للضعيف الحاضر الخ ، عمدة القاری ج:۵، ص:۴۴۷.

حنفیہ دلیل میں یہ بات پیش کرتے ہیں کہ حضرت ابوذر غفاری ﷺ روایت کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ مسجد میں سو گیا تو حضور اکرم ﷺ تشریف لائے اور آپ نے مجھے لات مار کر اٹھایا۔ لات مار کر اٹھانا اس بات کی دلیل ہے کہ مسجد کے اندر سونے کو آپ ﷺ نے پسند نہیں فرمایا اور مکروہ قرار دیا۔[۱۳]

روایتِ باب کا محمل اور جواب

جتنی روایتیں جواز کی آئی ہیں جیسے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہاں پر ذکر کی ہیں وہ یا تو مسافر ہیں یا بے گھر ہیں کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمر ﷺ خود کہہ رہے ہیں کہ میرا کوئی گھر نہیں تھا۔ عرنیین مسافر لوگ تھے اور بے گھر تھے، یہ خاتون جو تھیں یہ بھی انتہائی ضرورت کی وجہ سے اکیلی آئی تھی اور آ کر مسلمان ہوگئی تھی، اس نے قبیلہ کو چھوڑا تھا، تو اس کو کوئی جگہ دینے والا نہیں تھا، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے وقتی طور پر مسجد میں جھونپڑی ڈال دی۔

تو ان وقتی احکام کو جو کسی ضرورت سے پیش آئے ایک عام قاعدہ بنا لینا اور اس کی وجہ سے اتنا توسع کرنا کہ مسجد میں سونا بلا کراہت مردوں کیلئے بھی اور عورتوں کیلئے بھی جائز ہے، یہ مناسب نہیں، جہاں جو چیز جس ماحول میں، جس سیاق میں وارد ہوئی ہے، اسی سیاق میں اس کو رکھنا چاہئے۔

یہ ساری توجیہات جو میں (استاذنا) نے کی ہیں یہ اس وقت ہیں جب کہ کہا جائے کہ یہ خیمہ عین مسجد کے اندر گاڑھا گیا تھا یا عرنیین اور عبداللہ بن عمر ﷺ عین مسجد میں سوتے تھے، لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مسجد کی جو فنا ہے اس میں یہ واقعات ہوئے ہوں۔

۴۴۱ ـ حدثنا قتيبة بن سعيد قال: حدثنا عبدالعزيز بن أبي حازم عن أبي حازم، عن سهل بن سعد، قال: جاء رسول الله ﷺ بيت فاطمة فلم يجد عليا في البيت، فقال: أين ابن عمك؟ قالت: كان بيني وبينه شيء فغاضبني فخرج فلم يقل عندي. فقال رسول الله ﷺ لإنسان: (انظر أين هو) فجاء فقال: يا رسول الله هو راقد في المسجد. فجاء رسول الله ﷺ وهو مضطجع قد سقط رداؤه عن شقه وأصابه تراب، فجعل رسول الله ﷺ يمسحه عنه ويقول: (قم أبا تراب، قم أبا تراب). [أنظر: ۳۷۰۳، ۶۲۰۴، ۶۲۸۰][۱۴]

---

[۱۳] عن أبی ذر قال أتانی نبی الله صلی الله علیه وسلم وأنا نائم فی المسجد فضربنی برجله قال ألا أراک نائماً فیه قلت یانبی الله غلبتنی عینی، کذا ذکره الدارمی فی "سننه" باب النوم فی المسجد، رقم: ۱۳۹۹، ج: ۱، ص: ۳۷۹، دارالنشر دارالکتب العربی، بیروت، سنة النشر ۱۴۰۷ھ.

[۱۴] وفی صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی بن أبی طالب رقم: ۴۴۲۶.

حدیث کا پس منظر

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ ایک مرتبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے تو وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نہیں پایا حضور ﷺ نے پوچھا **"این ابن عمک"** تمہارے چچا کا بیٹا کہاں گیا؟ حالانکہ یہ حضرت فاطمہؓ کے چچا کے بیٹے نہیں تھے بلکہ حضور ﷺ کے چچا کے بیٹے تھے۔

بعض اوقات جو رشتہ داری باپ کی طرف سے ہوتی ہے، اولاد کو بھی اسی رشتہ داری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جیسے باپ کے چچا کو چچا کہتے ہیں اسی طرح باپ کے ماموں کو ماموں کہتے ہیں تو اسی طرح باپ کے ابن عم کو بھی بیٹی کا ابن عم قرار دیا۔

تو حضرت فاطمہ نے عرض کیا **"کَانَ بَینِیْ وَبَیْنَہٗ شَیْءٌ"** میرے اور ان کے درمیان کچھ کھٹ پٹ ہوگئی تھی **"فَغَاضَبَنِیْ"** تو وہ مجھ سے غصہ ہوگئے **"فَخَرَجَ"** اور چلے گئے **"فَلَمْ یَقِلْ عِنْدِی"** اور میرے پاس قیلولہ بھی نہیں کیا **"قَالَ یَقِیلُ"** سے ہے یعنی قیلولہ کرنا **" فقال رسول اللہ ﷺ لانسان: انظر این ھو"** آپ نے فرمایا جا کے دیکھو کہ کہاں ہیں **"فجاء فقال یارسول اللہ ﷺ ھو فی المسجد راقد"** تو اس نے آکر بتایا کہ وہ مسجد میں سو رہے ہیں۔

"فجاء رسول اللہ ﷺ وھو مضطجع قد سقط رداءہ عن شقہ" دیکھا کہ وہ لیٹے ہوئے ہیں اور چادر ان کے کروٹ سے ہٹ گئی ہے **"واصابہ تراب"** اور اس کی وجہ سے ان کے جسم کو مٹی لگ گئی تھی **"فجعل رسول اللہ ﷺ یمسحہ عنہ"** آپ وہ مٹی ان سے صاف کرنے لگے اور فرمانے لگے **"قم اباتراب، قم اباتراب"** ابوتراب کنیت رکھنے کی وجہ اور پس منظر یہ ہے، کیونکہ اس موقع پر حضور ﷺ نے محبت سے ان کو ابوتراب فرمایا کہ مٹی والے اٹھ جا، مٹی والے اٹھ جا۔

موضع ترجمہ

یہاں موضع ترجمہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد میں سو رہے تھے تو حضور اکرم ﷺ نے سونے پر کوئی نکیر نہیں فرمائی معلوم ہوا کہ سونا جائز ہے۔

جو حضرات **"نوم فی المسجد"** کو مکروہ کہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت تھی حضور اقدس ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مسجد نبوی کے بارے میں ایسی خصوصیت حاصل تھی جو کسی دوسروں کو حاصل نہیں تھی چنانچہ ترمذی شریف میں حدیث آئی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ **"لایُجنِبُ فی ھذا المسجد غیری وغیرک"**۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علی ﷺ کو مسجد نبوی سے وہ کچھ خصوصیت وابستہ تھی جو حضور ﷺ کو بھی تھی، ان کے علاوہ کسی کو نہیں تھی، لہٰذا ان کے سونے سے عام لوگوں کے سونے کے جواز پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۵

۴۴۲ ـ حدثنا يوسف بن عيسى قال: حدثنا ابن فضيل، عن أبيه، عن أبي حازم، عن أبي هريرة قال: رأيت سبعين من أصحاب الصفة مامنهم رجل عليه رداء، إما إزار وإما كساء، قد ربطوا في أعناقهم، فمنها ما يبلغ نصف الساقين، ومنها مايبلغ الكعبين، فيجمعه بيده كراهية أن ترى عورته. ۱۶

اس حدیث میں حضرت ابو ہریرہ ﷺ اصحاب صفہ کا حال بیان فرما رہے ہیں کہ اصحاب صفہ کو میں نے دیکھا کہ ان میں سے کوئی شخص ایسا نہیں تھا کہ جس کے اوپر چادر ہو یا تو صرف ازار پہنے ہوئے ہوتے تھے یا ایک کمبل جو اپنے گردنوں میں باندھا ہوا ہوتا تو ان میں سے کوئی ایسا ہوتا تھا کہ جو نصف ساق تک پہنچ جاتا، کوئی ایسا ہوتا تھا کہ جو کعبین تک پہنچ جاتا، تو وہ صحابی اس کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر رکھتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کشف عورت ہو جائے۔

موضع ترجمہ

یہاں موضع ترجمہ یہ ہے کہ اصحاب صفہ مسجد ہی میں مُقیم تھے جب مقیم تھے تو سوئے بھی ہونگے، لیکن اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ صفہ ضروری نہیں کہ مسجد ہی کا حصہ ہو، ہو سکتا ہے کہ مسجد کے باہر شمار کیا جاتا ہو اور دوسرا یہ ہے کہ اگر اس کو مسجد کا حصہ تسلیم کیا جائے تو یہ حضرات سب مسافر تھے تو تحصیلِ علم کے لئے آئے تھے، لہٰذا ان کے لئے ایسا کرنا جائز ہے۔

(۵۹) باب الصلاة إذا قدم من سفر

سفر سے واپس آنے پر نماز پڑھنے کا بیان

وقال كعب بن مالك: كان النبي ﷺ إذا قدم من سفر بدأ بالمسجد فصلى فيه.

---

۱۵ عن ابی سعید قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لعلی یاعلی لایحل لأحد یجنب فی هذا المسجد غیری وغیرک قال علی بن المنذر قلت لضرار بن صرد ما معنی هذا الحدیث قال لایحل لأحد یستطرقه جنبا غیری وغیرک قال ابو عیسیٰ هذا حدیث حسن غریب لا نعرفه الا من هذا الوجه وسمع منی محمد بن اسماعیل هذا الحدیث فاستغربه، سنن الترمذی ج:۵، ص: ۶۳۹، رقم: ۳۷۲۷، کتاب المناقب عن رسول الله، باب مناقب علی بن أبی طالب.

۱۶ انفرد به البخاری.

۴۴۳ ـ حدثنا خلاد بن يحيى قال: حدثنا مسعر قال: حدثنا محارب بن دثار، عن جابر بن عبدالله قال: أتيت النبي ﷺ وهو في المسجد. قال مسعر: أراه قال: ضحى. فقال: صل ركعتين. وكان لي عليه دين فقضاني وزادني .[انظر: ۱۸۰۱، ۲۰۹۷، ۲۳۰۹، ۲۳۸۵، ۲۳۹۴، ۲۴۰۶، ۲۴۷۰، ۲۶۰۳، ۲۶۰۴، ۲۷۱۸، ۲۸۶۱، ۲۹۶۷، ۳۰۸۷، ۳۰۸۹، ۳۰۹۰، ۴۰۵۲، ۵۰۷۹، ۵۰۸۰، ۵۲۴۳، ۵۲۴۴، ۵۲۴۵، ۵۲۴۶، ۵۲۴۷، ۵۳۶۷، ۶۳۸۷]۱۱۷

”تحیة السفر“ مستحب ہے

سفر سے آتے وقت دو رکعتیں پڑھنا مستحب ہے، یہ تحیۃ الوضو یا تحیۃ المسجد کے علاوہ ہے، سفر سے قدوم کی دو رکعتیں ہیں۔

(۶۰) باب: إذا دخل المسجد فليركع ركعتين

جب کوئی مسجد میں داخل ہو تو دو رکعت نماز پڑھ لے

۴۴۴ ـ حدثنا عبدالله بن يوسف قال: أخبرنا مالك، عن عامر بن عبدالله بن الزبير، عن عمرو بن سليم الزرقي، عن أبي قتادة السلمي أن رسول الله ﷺ قال: (إذا دخل أحدكم المسجد فليركع ركعتين قبل أن يجلس). [انظر: ۱۱۶۳]

تحیۃ المسجد کا افضل طریقہ

حنفیہ اور اکثر علماء کے نزدیک افضلیت کی قید یہ ہے کہ تحیۃ المسجد کی یہ دو رکعتیں بیٹھنے سے پہلے پڑھی جائیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اگر بیٹھ گیا تو تحیۃ المسجد فوت ہوگئی، البتہ اول طریقہ حاصل نہ ہو سکا، لہٰذا بیٹھنے کے بعد بھی اگر آدمی کو یاد آئے اور موقع ہو تو تحیۃ المسجد پڑھ سکتا ہے۔

---

۱۱۷ وفي صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب استحباب تحية المسجد بركعتين وكراهة الجلوس قبل، رقم: ۱۱۶۸، وسنن النسائي، كتاب البيوع، باب الزيادة في الوزن، رقم: ۴۵۱۳، وسنن أبي داود، كتاب البيوع، باب في حسن القضاء، رقم: ۲۹۰۵، ومسند أحمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند جابر بن عبد الله، رقم: ۱۳۹۱۰.

(۶۱) باب الحدث في المسجد

مسجد میں بے وضو ہو جانے کا بیان

۴۴۵ ۔ حدثنا عبد الله بن يوسف قال : أخبرنا مالک عن أبي الزناد ، عن الأعرج ، عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ قال : (الملائكة تصلي على أحدكم مادام في مصلاه الذي صلى فيه مالم يحدث . تقول : اللّٰهم اغفرله ، اللّٰهم ارحمه). [راجع: ۱۷۶] ۱۱۸

(۶۲) باب بنيان المسجد

مسجد کی تعمیر کا بیان

" و قال أبو سعيد : كان سقف المسجد من جريد النخل ، و أمر عمر ببناء المسجد و قال : أكن الناس من المطر و إياک تحمر أو تصفر فتفتن الناس . و قال أنس : يتباهون بهاثم لايعمرونها إلا قليلا . و قال ابن عباس : لتزخرفنها كما زخرفت اليهود و النصارى .

تعمیر مسجد کی ترغیب

یہ باب مسجد کی تعمیر کے بارے میں قائم کیا ہے اور اس میں ابوسعید خدری ﷺ کا قول تعلیقاً نقل کیا ہے:

"كان سقف المسجد من جريد النخل ،وأمر عمر ببناء المسجد".

کہ مسجد نبوی کی چھت کھجور کے شاخوں کی تھی اور حضرت عمر ﷺ نے مسجد کی بنا کا حکم دیا اور فرمایا کہ:

" أكن الناس من المطر".

کہ میں لوگوں کو بارش سے بچانا چاہتا ہوں یعنی مقصود تعمیر سے صرف یہ ہے کہ لوگوں کو بارش اور دھوپ وغیرہ سے بچایا جائے ، یہ نہیں کہ اس کے اوپر عالیشان عمارت قائم کر کے اس کو زخرف کیا جائے۔

"واياک تحمر أو تصفر".

اور فرمایا کہ اس بات سے بچو کہ اس پر سرخ رنگ کرو یا پیلا رنگ کرو۔

---

۱۱۸ حدیث کی تشریح واختلاف فقہاء ملاحظہ فرمائیں: انعام الباری ، ج:۲، ص:۲۹۸، کتاب الوضوء ، رقم : ۱۷۶ .

"فتفتن الناس"۔

لوگوں کو فتنہ میں بتلا کر دو گے کیوں کہ سرخ یا پیلا رنگ کرنے کے بعد لوگ جب نماز پڑھیں گے تو ان کو خشوع حاصل نہ ہوگی۔

مساجد کو مزین کرنے کی حد

"قال أنس: يتبا هون بها ثم لايعمرونها إلا قليلا"۔

حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ لوگ مساجد کے بارے میں آپس میں مفاخرت کرتے ہیں کہ دیکھو ہم نے اتنی شاندار مسجد بنائی ہے، پھر اس کو بہت کم آباد کرتے ہیں، ویسے تو فخر کے لئے بڑی عالیشان مسجدیں بنا دیں اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی لیکن جو اس کی حقیقی آبادی ہے یعنی نماز اور ذکر اللہ سے، وہ آباد نہیں کرتے مگر بہت کم۔

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایمان کی حرارت والوں نے من اپنا پرانا پاپی برسوں میں نمازی بن نہ سکا

عبداللہ بن عباس ؓ فرماتے ہیں **"لتزخرفنها كما زخرفت اليهود و النصارى"** کہ تم مساجد کو اسی طرح آراستہ کرو گے جس طرح یہود و نصاریٰ نے اپنے معابد کو آراستہ کیا۔ **"زخرفة" زخرف** ۔ سے نکلا ہے زخرف کے اصل معنی سونے کے آتے ہیں اور زخرف کے معنی کسی چیز کو سونا چڑھانا یعنی مزین اور آراستہ کرنا۔

مطلب یہ ہے کہ ایسی آراستہ پیراستہ مسجدیں بنائیں گے جیسے کہ یہود و نصاریٰ نے بنائیں تھیں۔ تو ان سارے اقوال سے خواہ حضرت عمر ؓ کا ہو یا حضرت انس ؓ کا یا حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کا ان سے یہ پتہ چلا کہ مسجدوں میں ایسا نقش و نگار جو لوگوں کو خشوع سے منع کر دے، یہ مکروہ ہے۔

تعمیر مسجد کے دو اہم مسئلے

یہاں دو الگ الگ مسئلے ہیں، ان کو سمجھنا چاہئے:

ایک مسئلہ ہے مسجد کو پختہ بنانا تو بعض روایتوں میں پختہ بنانے کی بھی ممانعت آئی ہے۔

دوسرا ہے اس پر نقش و نگار بنانا۔

جہاں تک پختہ بنانے کا مسئلہ ہے تو اس کے بارے میں زیادہ تر علماء نے یہ فرمایا ہے کہ یہ ابتداء اسلام کی بات ہے جب کہ عام طور پر لوگوں کے مکانات بھی کچے ہوتے تھے، تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ مسجد کو پکا بنانے کی ضرورت نہیں ہے جیسے اور لوگوں کے مکانات ہیں یہ بھی کچی رہے، بعد میں حضرت عثمان ؓ نے مسجد کو پکا بنایا:

"کان ذالک من محضر من الصحابه فلم ینکر علیه احد" کسی نے اس کے اوپر نکیر نہیں کی۔

علمائے کرام نے فرمایا ہے کہ بعد میں جب لوگوں نے اپنے مکانات پختہ بنانے شروع کر دیئے تو مساجد کو بھی پختہ کرنے کی اجازت مل گئی تو جیسے لوگوں کے مکانات ہیں کم از کم ویسی مسجدیں تو ہوں اور جہاں تک زخرفہ کا تعلق ہے تو اس کو آراستہ و پیراستہ کرنا اور اس کے اندر نقش و نگار بنانا وغیرہ وغیرہ اس کی جو کراہت کی علت ہے یعنی فوت خشوع، تو جہاں فوت خشوع کا اندیشہ ہو تو ایسے نقش و نگار درست نہیں، لیکن اگر سادگی ہے اور ساتھ خوبصورتی بھی ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

دوسرا پہلو علمائے کرام نے ذکر کیا ہے کہ مسجد کو عام رہنے والوں کے گھروں سے فروتر رکھنا یہ بھی مطلوب نہیں یعنی مطلب یہ ہے کہ آس پاس رہنے والے کوٹھی، بنگلے اور عالیشان گھر رہنے کے لئے بنائے ہوئے ہیں اور مسجد جھونپڑا یا بالکل کچی بنائی تو یہ بات بھی درست نہیں، ابھی جب آپ نے گھر بنائے ہیں کم از کم ایسی معیار کی مسجد بھی ہونی چاہئے تو اس حد تک کوئی مضائقہ نہیں۔

ہاں البتہ نقش و نگار پر جو خرچ کیا جائے عام چندے سے نہ ہو بلکہ صرف اسی مقصد کے تحت کوئی چندہ دے یا کوئی اپنے ذاتی خرچ سے اس کو بنائے، لیکن مسجد کے عام چندے سے محض نقش و نگار پر خرچ کرنا درست نہیں۔[۱۱۹]

۴۴۶۔ حدثنا علي بن عبد الله قال: حدثنا يعقوب بن إبراهيم قال: حدثني أبي، عن صالح بن كيسان قال: حدثنا نافع أن عبدالله أخبره أن المسجد كان على عهد رسول الله ﷺ مبنيا باللبن وسقفه الجريد، وعمده خشب النحل، فلم يزد فيه أبو بكر شيئا، وزاد فيه عمر وبناه على بنيانه في عهد رسول الله ﷺ باللبن والجريد، وأعاد عمده خشبا، ثم غيره عثمان فزاد فيه زيادة كثيرة وبنى جداره بالحجارة المنقوشة والقصة، وجعل عمده من حجارة منقوشة وسقفه بالساج.

---

۱۱۹ قلت: اوّل من زخرف المساجد الوليد بن عبد الملک بن مروان، وذلک فی أواخر عصر الصحابة، رضی الله تعالیٰ عنهم، وسکت کثیر من أهل العلم عن انکار ذلک خوفاً من الفتنة، وقال ابن المنیر: لما شید الناس بیوتهم وزخرفوها فانتدب أن یصنع ذلک بالمساجد صوناً لها عن الاستهانة، وقال بعضهم: ورخص فی ذلک بعضهم، وهو قول أبی حنیفة اذا وقع ذلک علی سبیل التعظیم للمساجد، ولم یقع الصرف علی ذلک من بیت المال، قلت: مذهب اصحابنا ان ذلک مکروه، وقول بعض أصحابنا: ولا بأس بنقش المسجد، معناه: ترکه اولیٰ، ولا یجوز من مال الوقف، ویغرم الذی یخرجه سواء کان ناظراً أو غیره، عمدة القاری ج:۳، ص:۴۷۱، وفیض الباری ج:۲، ۵۱.

"قصة" کے معنی گچ کے آتے ہیں جس سے مکان کو پکا کیا جاتا ہے۔

(۶۳) باب التعاون في بناء المسجد

مسجد کی تعمیر میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا بیان

﴿ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِين أَنْ يَعْمُرُوا مَسَاجِدَ اللهِ شَاهِدِيْنَ عَلى أَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ أُولَئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وَ فِي النَّارِ هُمْ خَالِدُون . إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللهِ مَنْ آمَنَ بِاللهِ وَالْيَومِ الآخِرِ وَ أَقَامَ الصَّلاةَ وَ آتَى الزَّكَاةَ وَلَم يَخْشَ إِلَّا اللهَ فَعَسَى أُوْلَئِكَ أَنْ يَكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِينَ ﴾ [التوبة :۱۷]

۴۴۷ ۔ حدثنا مسدد قال: حدثنا عبد العزيز بن مختار قال: حدثنا خالد الحذاء، عن عكرمة: قال لي ابن عباس ولا بنه علي: انطلقا إلى أبي سعيد فاسمعا من حديثه، فانطلقنا فإذا هو في حائط يصلحه، فأخذ رداءه فا حتبى، ثم أنشأ يحدثنا حتى أتى على ذكر بناء المسجد فقال: كنا نحمل لبنة لبنة، وعمار لبنتين لبنتين، فرآه النبي ﷺ فينفض التراب عنه ويقول: (ويح عمار، يدعوهم إلى الجنة ويدعونه إلى النار). قال: يقول عمار: أعوذ بالله من الفتن. [أنظر: ۲۸۱۲] [۱۲۰]

ماقبل سے مناسبت

اس سے پہلے امام بخاری رحمہ اللہ نے باب قائم کیا تھا "باب بنيان المسجد" جس میں مسجد کی تعمیر کی فضیلت اور اس کا مسنون طریقہ بیان کیا گیا تھا۔

اس باب میں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ جب مسجد کی تعمیر ہو رہی ہو تو اس میں کسی بھی جہت سے تعاون کرنا اور مسجد کی تعمیر میں حصہ لینا بھی بڑی فضیلت کی چیز ہے، اس لئے فرمایا کہ "باب التعاون في بناء المسجد" اور پھر قرآن کریم کی آیت ذکر فرمائی ہے کہ ﴿ماكانَ لِلْمُشرِكين أن يعمروا مساجد الله﴾.

علامہ عینی رحمہ اللہ کا ارشاد

علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہاں پر یہ آیت ذکر کی ہے، اس سے بہتر یہ تھا

[۱۲۰] وفي صحيح مسلم، كتاب الفتن واشراط الساعة، باب لا تقوم الساعة حتى يمر الرجل بقبر الرجل فيتمنى، رقم: ۵۱۹۲، ومسند أحمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند أبي سعيد الخدري، رقم: ۱۰۵۸۸، ۱۰۷۸۹، ۱۱۴۲۹.

کہ اس سے اگلی آیت ذکر کرتے **"انما یعمر مساجد اللہ من امن با للہ و الیوم الآخر"** کیونکہ یہاں پر تعاون کا ذکر ہو رہا ہے، ظاہر ہے کہ مسلمان تعاون ہی کریں گے، مشرکین تعاون تو نہیں کرتے، تو اس واسطے علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ اس کے بجائے اگلی آیت ذکر کرتے تو زیادہ مناسب تھا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی توجیہ

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اصل میں امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد اِس آیت کو ذکر کرنے سے یہ ہے کہ **"یعمروا مساجد اللہ"** کا جو لفظ ہے اس میں دو احتمال ہیں:

ایک احتمال تو یہ ہے کہ عمارت سے مراد بناء فی التعمیر ہو یعنی عمارت جس طرح اردو میں ہم عمارت کہتے ہیں اس سے تعمیر مراد ہو اور مساجد سے مراد مساجد ہی ہو۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ مساجد سے مراد مطلق وہ جگہیں ہوں جہاں پر نماز قائم کی جاتی ہے، چاہے وہ فقہی اعتبار سے مسجد ہو یا نہ ہو، ویسے نماز پڑھنے کی جگہ ہو، اس کو بھی بعض اوقات مسجد کہہ دیا جاتا ہے اور عمارت سے مراد اس کو ذکر اللہ، نماز، عبادت سے آباد کرنا ہو۔

اِن دو احتمالوں میں سے امام بخاری رحمہ اللہ نے پہلے احتمال کو ترجیح دینے کے لئے یہ آیت یہاں پر لائے ہیں کہ تعاون فی بناء المسجد۔ "بناء" کا لفظ استعمال کرکے اور پھر آیت ذکر کرکے اس میں اشارہ کر دیا کہ عمارت سے مراد بناء ہے اور مساجد سے مراد مساجد اصطلاحیہ ہیں نہ کہ مطلق اماکنِ صلوٰۃ۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہاں اس آیت کی یہ توجیہ کی ہے، لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی توجیہ ذرا دور از کار قسم کی ہے اور پوری طرح بیٹھتی نہیں۔

بعض حضرات کی توجیہ

بعض لوگوں نے یہ کہا ہے **"مَا کَانَ لِلْمُشْرِکِین أن یعمروا مَسَاجِدَ اللہِ"** میں جو یہ کہا گیا ہے کہ مساجد کی تعمیر کرنا مشرکین کا کام نہیں ہے۔ تو اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ مؤمنین کا کام ہے، تو مؤمنین کا جب کام ہے تو اس میں تعاون کرنا باعث اجر و ثواب ہے اور یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے آیت کا پہلا حصہ ذکر کیا ہے اور آگے الآیہ کہہ دیا تو مقصود دوسرا حصہ ہے کہ **" انما یعمر مساجد اللہ من امن باللہ و الیوم الآخر"** تو اس طرح گویا کہ ترجمۃ الباب سے اس کی مطابقت ہے۔

طلبِ علم کا شوق

آگے اس میں حضرت عکرمہ ﷺ کی روایت نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے اور اپنے بیٹے علی سے

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا یعنی عکرمہ خود حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور علی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں۔ تو کہتے ہیں کہ ہم دونوں سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ **"انطلقا إلى أبي سعيد"** کہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ **"فاسمعا من حديثه"** اور ان کی باتیں سنو، یعنی وہ جو حدیثیں روایت کررہے ہیں وہ ان سے جا کر سنو۔ **"فانطلقنا"** کہتے ہیں کہ ہم یعنی میں اور علی ابن عبداللہ ابن عباس دونوں گئے **"فاذا هو حائط يصلحه"** تو جا کر دیکھا کہ وہ ایک باغ میں ہے، اُس کی وہ مرمّت کررہے ہیں اس کو ٹھیک ٹھاک کررہے ہیں **"فأخذ رداء ه فاحتبى"** انہوں نے اپنی چادر لی اور احتباء کر کے بیٹھ گئے، **"ثم أنشأ يحدثنا"** پھر ہمیں حضور اکرم ﷺ کے زمانے کے واقعات سنانے لگے **"حتى أتى على ذكر بناء المسجد"** یہاں تک کہ وہ مسجد نبوی کی تعمیر کے ذکر تک پہنچے کہ مسجد نبوی کس طرح تعمیر ہوئی۔

حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے ساتھ حب نبوی

"فقال" تو فرمایا **"كنّا نحمل لبنةً لبنةً وعمّار لبنتين لبنتين"** کہ جب مسجد کی تعمیر ہورہی تھی تو ہم میں سے ہر شخص مسجد کی تعمیر کے لئے ایک ایک اینٹ اٹھا کر لیجارہا تھا اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ دودو اینٹ اٹھا کر لیجارہے تھے، **"فرآه النبي ﷺ فجعل ينفض التّراب عنه"** حضور اقدس ﷺ نے ان کو دیکھا کہ دودو اینٹیں اٹھا کر لیجارہے ہیں تو اُن کے جسم پر جو مٹی لگی ہوئی تھی اس کو اپنے دستِ مبارک سے جھاڑا **"ويقول"** اور ساتھ میں یہ بھی فرمایا **"ويح عمّار تقتله الفئة الباغية"** عمار پر افسوس ہے کہ ان کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی۔ **"يدعوهم الى الجنّة"** یہ ان کو جنت کی طرف دعوت دے رہے ہونگے اور وہ جہنم کی طرف دعوت دے رہے ہونگے۔ تو اس پر حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے فرمایا **"أعوذ بالله من الفتن"** میں فتنوں سے اللہ جل جلالہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

یہاں اصل باب جو مقصود بالترجمہ ہے وہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے ذوق وشوق کا ہے جو انہوں نے بناءِ مسجد کے اندر ظاہر فرمایا کہ دوسرے لوگ تو ایک ایک اینٹ لیکر جارہے تھے اور یہ دودو اینٹ اٹھا کر لیجارہے تھے اس موقع پر حضرت رسول کریم ﷺ نے حضرت عمار سے محبت کا بھی اظہار فرمایا کہ ان کے جسم پر جو مٹی لگ رہی تھی وہ خود اپنے دستِ مبارک سے صاف فرمایا جو حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے ساتھ خصوصی تعلق اور محبت کی دلیل ہے۔

حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بارے میں پیشن گوئی

دوسرے ایک ایسا فقرہ ارشاد فرمایا جو آئندہ سے متعلق تھا: آئندہ کی پیشین گوئی تھی وہ یہ کہ ان کو باغیوں کی ایک جماعت قتل کرے گی اور واقعہ یہ پیش آیا کہ بعد میں جب جنگ صفّین ہوئی جو حضرت علی

ؓ اور حضرت معاویہ ؓ کے درمیان تھی تو اس میں یہ حضرت علی ؓ کے ساتھ لڑائی میں شریک تھے۔ دوسری طرف حضرت معاویہ ؓ کا لشکر تھا اور اسی جنگ کے اندر مشہور روایت کے مطابق یہ حضرت معاویہ ؓ کے لشکر کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

تو اس حدیث کو ایک طرح سے اس بات کی صریح دلیل قرار دیا گیا ہے کہ حضرت علی ؓ اور حضرت معاویہ ؓ کے درمیان جو جنگ ہوئی اس میں حضرت علی ؓ حق پر تھے اور حضرت معاویہ ؓ کا حکم حضرت علی ؓ کے نزدیک اس باغی جماعت کا حکم تھا۔

مشاجرات صحابہ ؓ میں احتیاطی پہلو

یہ مشاجرات صحابہ یعنی صحابہ کرام ؓ کے درمیان جو آپس میں جنگیں، لڑائیاں اور اختلافات پیش آئے، یہ بڑا نازک مسئلہ اور ایک دریائے خون ہے جس کے بارے میں تذکرہ اور تبصرہ کرتے ہوئے بڑی احتیاط لازم ہے، کیونکہ دونوں طرف صحابہ کرام ؓ ہیں اور صحابہ کرام ؓ کے بارے میں نصوصِ قطعیہ سے یہ بات واضح ہے کہ تمام صحابہ ؓ عدول ہیں **"الصحابة کلهم عدول"** اور یہ بات کہ وہ عدول ہیں صرف روایتِ حدیث کی حد تک نہیں بلکہ اپنی عام زندگی میں بھی۔ بعض صحابہ کرامؓ سے لغزشیں بھی ہوئیں، گناہ بھی سرزد ہوئے جیسے کہ حضرت ماعز ؓ سے یا غامدیہ سے، لیکن گناہوں پر ان کو باقی نہیں رکھا گیا وہ انبیاء کی طرح معصوم نہیں تھے غلطیاں ہوئیں اور بعض گناہ بھی سرزد ہوئے لیکن گناہوں پر ان کو باقی نہیں رکھا گیا، وہ تائب ہوئے اور تائب ہونے کے بعد بحیثیتِ مجموعی ان کی زندگی عادل کی زندگی رہی اور تمام صحابہ اس میں شامل ہیں کسی کا اس میں استثنیٰ نہیں۔

اشکال:

یہاں اشکال واقع ہوتا ہے کہ اس لشکر کو **"الفئة الباغية"** کہا گیا جس نے حضرت عمار ؓ کو قتل کیا اور پھر اسی پر بس نہیں بلکہ آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ **"یدعوهم الی الجنة ویدعونه الی النار"** اس سے بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ حضرت معاویہ ؓ کے لشکر کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے یہ تبصرہ فرمایا ہے کہ وہ حضرت علی ؓ کے لشکر کو جہنم کی طرف بلا رہے تھے۔

مشاجرات صحابہ سے متعلق اہل سنت والجماعت کا عقیدہ

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ ان مشاجرات میں اور خاص طور سے حضرت علی ؓ اور حضرت

معاویہ رضی اللہ عنہ کے باہم جنگوں میں حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم نوا اور ان کے رفقاء سے اجتہادی غلطی ہوئی تھی۔

روافض کی کارستانی

صحیح بات یہ ہے کہ اس مسئلے کے اندر روافض کی ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں غلط سلط روایات کا تاریخ میں ایک انبار لگ گیا ہے۔ اس کی وجہ سے جو حقیقت ہے اس کا چہرہ روپوش ہوگیا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دونوں جماعتیں اپنے اپنے خیال کے مطابق اللہ جل جلالہ کی رضا کی خاطر، اللہ جل جلالہ کے دین کے احکام پر عمل کرنے کی کوشش کررہی تھی جس طرح دو مجتہدوں کے درمیان اختلاف ہوتا ہے تو اُن میں سے ہر مجتہد اپنے طور پر، اپنی بساط کے مطابق حق تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور اس لحاظ سے وہ باعث اجر بھی ہوتا ہے " **ان اصابه المجتهد فله اجر ان وان اخطأ ه فله اجر واحد**" تو اگر غلطی بھی ہو جائے تو چونکہ اس نے نیت یہ کی تھی کہ وہ اللہ جل جلالہ کی صحیح رضا کو حاصل کرے گا، اس واسطے ایک اجر سے وہ بھی محروم نہیں ہوتا ہے۔ یہی معاملہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان تھا، دونوں کے مؤقف اپنی اپنی جگہ اجتہاد پر مبنی تھے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا مؤقف

حضرت معایہ رضی اللہ عنہ کا مؤقف یہ تھا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد تھے ان کو کچھ باغیوں نے آکر قتل کردیا، تو ایک خلیفہ راشد کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے اور بالخصوص ان حالات میں جبکہ اس سے پہلے اس قسم کا کوئی واقعہ عالم اسلام میں پیش نہیں آیا تھا تو گویا مسلمانوں کے درمیان تلوار چلانے کی سب سے پہلی بنیاد ڈالی گئی تھی، لہٰذا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ مؤقف تھا کہ سب سے پہلا کام یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص لیا جائے، چنانچہ ان کا مطالبہ شروع میں خلافت کا نہیں تھا بلکہ ان کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص لیا جائے اور جب تک ان سے قصاص نہیں لیا جاتا تو اس وقت تک ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اس لئے بیعت نہیں کریں گے کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے گروہ کے بہت سے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قریب پہنچ گئے تھے یعنی ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور مشاورت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اس واسطے کہتے ہیں کہ ان کے ہاتھ پر بیعت ہم اس وقت تک نہیں کریں گے جب تک کہ وہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو پہلے پکڑیں اور پکڑ کر قصاص لیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مؤقف

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مؤقف یہ تھا کہ قصاص لینا یہ میرا حق ہے اور پہلے امیر مقرر ہو جائے اور اس کی حکومت

مستحکم ہو جائے تب ہی قصاص لے سکتا ہے۔ ہر ایک آدمی کا کام تو نہیں ہے کہ وہ قصاص لے۔ پہلے امارت وخلافت قائم ہونی چاہئے، اس کو استحکام حاصل ہونا چاہئے پھر وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ فتنہ کا زمانہ تھا تو اس فتنہ کے زمانہ میں وہی لوگ جو قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ تھے ان کا بڑا جتھہ اور بڑا گروہ تھا۔ تو ان پر ایک دم سے ہاتھ ڈالنا مشکل تھا، یہ اسی وقت ممکن تھا کہ ایک مرتبہ سارے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا امیر مقرر کرلیں، ان کے ہاتھ پر بیعت کرلیں، ان کے ہاتھ مضبوط کریں اور مضبوط کرنے کے بعد پھر وہ ان لوگوں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لیں، اس لئے کہ وہ بڑے قوی جتھہ کے لوگ تھے۔

تو دونوں نقطۂ نظر اپنی اپنی جگہ اجتہاد پر مبنی تھے۔

علماء اہل سنت کا فیصلہ

اگر چہ علماء اہل سنت نے یہ قرار دیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مؤقف نفس الامر میں صحیح تھا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ **"بیعت بعد میں کریں گے قصاص پہلے لو"** یہ اصول کے خلاف تھا، کیونکہ پہلے امارت منعقد ہونی چاہئے وہی قصاص لے گی، لیکن بہر حال حضرتِ معاویہ رضی اللہ عنہ پر ملامت اس لئے نہیں کہ انہوں نے یہ مؤقف اپنے اجتہاد کی بنیاد پر قائم کیا تھا۔

منافقین کی ریشہ دوانیاں

ایک طرف تو دونوں کے درمیان یہ اجتہادی اختلاف تھا، دوسری طرف منافقین کی ریشہ دوانیاں تھیں یعنی دونوں طرف ایسے لوگ لگے ہوئے تھے جو ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکاتے اور مختلف قسم کی خبریں ایک دوسرے کو پہنچاتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ خبر پہنچاتے کہ دیکھو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ آپ کے مقابل آگئے ہیں اور خلافت کا دعویٰ کرنے والے ہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ خبریں پہنچاتے کہ دیکھو قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بالکل دست و بازو بنے ہوئے ہیں اور ان کے قریب ہیں، لہٰذا ان کا ارادہ قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے کا نہیں ہے۔

تو اس قسم کی ریشہ دوانیوں کے سلسلہ میں دونوں فریقوں میں بُعد پیدا ہوتا گیا اور بالآخر جنگ پر منتج ہوا۔ تو اصل میں حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پیشِ نظر دین کے کسی نہ کسی حکم کی تعمیل تھی اور منافقین کے ریشہ دوانیوں کے نتیجہ میں یہ بعد بڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ جنگِ صفین پر منتج ہوا اور دونوں فریقوں کے درمیان بڑی افسوس ناک جنگ ہوئی۔

حضور ﷺ کی پیشین گوئی اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت

اس موقع پر جب حضرت عمار رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کے لوگوں نے یہ کہا کہ دیکھو ہمارے حق پر ہونے کی بالکل واضح اور قطعی دلیل سامنے آگئی، اس واسطے کہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہ **"تقتله الفئة الباغية"** یہ معروف ومشہور تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی جانتے تھے کہ حضور ﷺ نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا ہے۔ تو جب حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر والوں نے اس کو بطور حجت کے پیش کیا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف یہ حجتِ قاطعہ سمجھی گئی۔

حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ارشاد

روایات میں یہ آتا ہے کہ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ بات پیش کی گئی کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ شہید ہوگئے ہیں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ **"تقتله الفئة الباغية"** تو روایات میں آتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ **"أنحن قتلناه انّما قتله الذين جاء وابه"** کہ کیا ہم نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو قتل کردیا؟ قتل تو انہوں نے کیا ہے جو ان کو لے کر آئے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ارشاد کی دوراز کار تأویل

اس کا مطلب بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ انہوں نے یہ کہا کہ گویا حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کو اپنے ساتھ ہمارے مقابلہ پر نہ لاتے تو یہ شہید نہ ہوتے۔ یہ ان کو اپنے ساتھ لیکر آئے تو درحقیقت وہ ان کے قاتل ہیں کہ ان کو اپنے ساتھ ایک غلط مقصد کے لئے لے کر آئے، تو اس کے نتیجے میں ان کی شہادت واقع ہوئی تو یہ تأویل بڑی دوراز کار ہے۔ تو اِس کے نتیجہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ دیکھو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس حضور ﷺ کا ارشاد صریح آگیا ہے، اس کے باوجود انہوں نے ایسی دوراز کار تأویل کی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے اِس قول کا مقصد یہ نہیں تھا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا مقصد

ان کے قول کا مقصد یہ تھا کہ درحقیقت ان کو قتل کرنے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کے بعض افراد ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ان کو ہمارے لشکر کے آدمیوں نے قتل نہیں کیا بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کے بعض آدمیوں نے قتل کیا تاکہ اس کو ہمارے خلاف حجت بنایا جاسکے۔

تو اس واسطے ان کا کہنا یہ تھا کہ " **فئة باغية** " درحقیقت وہ ہے کہ جس نے حضرت عثمان ؓ کو شہید کر دیا اور اسی کے بعض افراد حضرت علی ؓ کے گروہ میں شامل ہو گئے، انہوں نے حضرت عمار ؓ کو قتل کرایا اور قتل اس لئے کیا تا کہ ہمارے خلاف حجت بنا سکیں۔ تو ان کا دعویٰ یہ تھا کہ حضرت عمار ؓ کو قتل کرنے والا ہمارے لشکر کا کوئی آدمی نہ تھا بلکہ اسی لشکر کا کوئی آدمی تھا۔ تو ان کی جو تاویل ہے وہ اتنی بدیہی البطلان نہیں جیسا کہ سمجھا جاتا ہے، بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عثمان ؓ کے قاتلوں کا جو گروہ ہے اُن میں سے کسی نے حضرت عمار ؓ کو قتل کیا ہے۔ اور یہ اس ماحول کے اندر اتنا کچھ بعید بھی نہ تھا۔

اس وقت بھی یہ صورت حال پیش آئی کہ حضرت عمار ؓ کی شہادت کے موقع پر حضرت معاویہ ؓ کا مؤقف یہ تھا کہ ان کو قتل کرنے والے وہ ہیں تو اس طرح انہوں نے کہا کہ یہ ہمارے خلاف کوئی نص صریح نہیں ہے بلکہ یہ اُن کے خلاف بنتی ہے جنہوں نے قتل کیا ہے۔

"**انما قتله الذين جاء وابه**" تو بہر حال یہاں پر بھی بات ایسی ہے کہ اس کو بالکلیہ سو فیصد رد کرنا مشکل ہے۔ اس واسطے اجتہاد کی گنجائش دونوں طرف موجود تھی۔

پیشین گوئی کا دوسرا جملہ

اب جو اگلا جملہ ہے:

"**يدعوهم الى الجنة ويدعونه الى النار**".

کہ حضرت عمار ؓ ان کو جنت کی دعوت دے رہیں ہیں اور وہ جہنم کی دعوت دے رہے ہیں۔

اس کی توجیہ تین طریقہ سے کی گئی ہے:

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی توجیہ

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرا خیال یہ ہے کہ یہ فقرہ "**يدعوهم الى الجنة ويدعونه الى النار**" اس کا تعلق فئہ باغیہ سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ان مشرکین سے ہے جنہوں نے ابتداء اسلام میں حضرت عمار ؓ کو اذیت پہنچائی تھی گویا حضور اکرم ﷺ نے حضرت عمار ؓ کو اس حالت میں دیکھ کر دو جملے ارشاد فرمائے، ایک تو آئندہ سے متعلق کہ آئندہ ایسا ہوگا کہ ان کو "**فئة باغيه**" قتل کرے گی اور دوسرا فقرہ ان کی ماضی سے متعلق ارشاد فرمایا کہ ان کی ماضی اس حالت میں گزری ہے کہ مشرکینِ مکہ نے ان کو صرف ان کے کلمہ پڑھنے کی وجہ سے اذیتیں پہنچائیں۔ یہ ان کو جنت کی دعوت دے رہے تھے اور وہ مشرکین ان کو جہنم کی دعوت دے رہے تھے تو اس کا تعلق ان کی ماضی کی زندگی سے ہے، جو انہوں نے مشرکین کے ہاتھ سے اسلام میں

اذیتیں اٹھائیں۔[۱۲۱]

علامہ کرمانی رحمہ اللہ کی توجیہ

بعض حضرات جیسے کہ علامہ کرمانی رحمہ اللہ نے یہ توجیہ کی ہے کہ یہ **"یدعوھم الی الجنۃ ویدعونہ الی النار"** کا تعلق خوارج سے ہے یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کو سمجھانے کے لئے ان کو بھیجا تھا اور خوارج کو سمجھانے کے نتیجہ میں وہ ان کو جنت کی دعوت دے رہے تھے اور خوارج ان کو جہنم کی دعوت دے رہے تھے۔[۱۲۲]

لیکن یہ توجیہ اس لئے نہیں بنتی کہ خوارج تو صفین کے بعد ہی پیدا ہوئے ہیں۔ جنگ صفین کے نتیجہ میں جب تحکیم کا مسئلہ پیش آیا تو اس کے بعد خوارج نے تحکیم سے انکار کیا اور **"ان الحکم إلا للہ"** کا نعرہ لگا دیا۔ وہاں سے خوارج کا فتنہ شروع ہوا۔ تو جس وقت جنگ صفین کا آغاز ہوا تھا جس میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی اس وقت خوارج وجود میں ہی نہیں آئے تھے، لہٰذا خوارج کے یہاں مراد ہونے کا کوئی موقع ہی نہیں۔[۱۲۳]

تیسری توجیہ

تیسری توجیہ یہ ہے کہ درحقیقت یہ فقرہ اس حدیث میں موجود ہی نہیں بلکہ حدیث **"تقتلہ الفئۃ الباغیۃ"** پر ختم ہوگئی ہے، چنانچہ بخاری کے متعدد نسخوں میں یہ جملہ موجود نہیں اور کسی ناسخ سے غلطی ہوئی ہے اور اس نے کسی اور حدیث کا ٹکڑا لاکر یہاں غلطی سے جوڑ دیا، تو درحقیقت یہ جملہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد نہیں فرمایا۔ یہ تین توجیہات عام طور سے شراح حدیث نے کی ہیں۔[۱۲۴]

ایک اور توجیہ

چوتھی بات یہ ہے کہ اگر بالفرض اس نسخہ کو تسلیم کرلیا جائے جس نسخہ میں یہ جملہ یہاں موجود ہے اور اس کو فئۃ باغیہ سے بھی متعلق قرار دیا جائے جیسا کہ ظاہراً نظر آرہا ہے تو صورت حال یہ ہے کہ جنت کنایہ ہے حق سے اور نار کنایہ ہے باطل سے، کیونکہ حق کا اصل تقاضا یہ ہے کہ وہ جنت تک لے جانے والا ہو اور باطل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ نار تک لے جانے والا، لیکن حق کا موجب جنت ہونا اور باطل کا موجب نار ہونا یہ اس وقت ہوتا

---

[۱۲۱] انظر : فیض الباری ج: ۲، ص: ۵۲.

[۱۲۲] شرح الکرمانی ج: ۴، ص: ۱۰۷.

[۱۲۳] ولکن لایصح ھذا ، لان الخوارج انما خرجوا علی علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ، بعد قتل عمار بلا خلاف بین أھل العلم بذلک ، لأن ابتداء أمرھم کان عقیب التحکیم بین علی ومعاویۃ ، ولم یکن التحکیم الا بعد انتھاء القتال بصفین ، وکان قتل عمار قبل ذلک قطعاً، عمدۃ القاری ج: ۳، ص: ۴۷۶.

ہے جبکہ کوئی مانع نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ **"من قال لا إلٰه الا الله دخل الجنة"** تو **"لا إلٰه الا الله"** کا تقاضا یہ ہے کہ جنت کا موجب ہو لیکن اس کے جنت کے موجب ہونے کے لئے کیا شرط ہے؟ موانع مرتفع ہوں اور موانع کیا ہیں کہ معصیتوں کا ارتکاب نہ ہو۔ اگر معصیتوں کا ارتکاب بھی ہوا تو **"لا إلٰه الا الله"** موجب جنت ہونے کے باوجود جنت تک نہیں لے جا سکتا، جنت میں دخول اولی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً فرمایا کہ **"الراشی والمرتشی کلاھما فی النار"** کہ رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں نار میں، تو اس کا تقاضا ہے کہ دونوں فوراً جہنم میں جائیں لیکن یہ جہنم میں جانا ارتفاع موانع پر موقوف ہے۔ اور مانع کیا ہے؟ کہ توبہ کر لی، اور حق جو ہے وہ حق دار کو دے دیا، یا اللہ جل جلالہ نے مغفرت فرمادی، ورنہ ہر گناہ موجب نار ہوتا ہے، شرط یہ ہے کہ موانع نہ ہوں تو ہر باطل موجب نار ہے۔

تو یہاں جو حضرات اجتہادی غلطی میں مبتلا تھے، تو اس اجتہادی غلطی میں مبتلا ہونے کا معنی کیا ہے کہ ان کا مؤقف حق نہیں تھا، باطل تھا، تو باطل اپنے باطل ہونے کی حیثیت سے نار تھا اگر چہ ایک مانع کی وجہ سے ان کے حق میں موجب نار نہ ہوا۔ اور وہ مانع کیا ہے؟ ان کا اجتہاد، کہ انہوں نے اجتہاد کی اور یہ مؤقف اختیار کیا تھا اگر چہ باطل تھا اور باطل ہونے کی حیثیت سے موجب نار تھا لیکن چونکہ انہوں نے اجتہاد کی وجہ سے حاصل کیا ہوا تھا، اس لئے ان کے حق میں موجب نار نہ ہوا، لیکن جو شخص اپنے اجتہاد سے اس کو باطل ہی سمجھتا ہے اس کے حق میں اب بھی موجب نار ہے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء نے جو مؤقف اختیار کیا تھا وہ باطل ہونے کی وجہ اصلاً موجب نار تھا۔ بغاوت موجب نار ہے لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں مانع پیش آ گیا اور وہ ان کا اجتہاد ہے، لہٰذا ان کے حق میں انشاء اللہ موجب نار نہیں ہوگا لیکن جو لوگ ان کے مؤقف کے قائل نہیں اور ان کے اجتہاد کے مطابق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اجتہاد درست نہیں، جیسا کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ، ان کے حق میں وہ کیا مؤقف ہے؟ ان کے حق میں وہ مؤقف نار ہے، تو مطلب یہ ہے کہ وہ ان کو بلا رہے تھے ایک ایسے مؤقف کی طرف جو عمار رضی اللہ عنہ کے لئے نار ہوتا کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ اگر اس مؤقف کو اس حالت میں قبول کر لیتے جبکہ وہ خود اپنے اجتہاد سے اس کے قائل نہیں تھے تو جہنمی ہوتے اور نار میں چلے جاتے۔ **"یدعوھم الی النار"** کا یہ معنی ہے۔

تقریب الی الفہم کے لئے تمثیل

اس کی مثال یوں سمجھ لینا چاہیے کہ کتا کھانا ہمارے نزدیک حرام ہے اور امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حرام نہیں ہے تو کتا کھانا مؤجب جنت ہے یا موجب جہنم ہے؟ موجب جہنم ہوگا کیونکہ حرام کیا ہے لیکن امام مالک رحمہ اللہ نے اپنے اجتہاد کی وجہ سے اس کو حلال کہا۔ تم بھی اس اجتہاد کے قائل ہو یا نہیں؟

کیونکہ امام مالک رحمہ اللہ اجتہاد کی بنا پر کتے کو حلال کہہ رہے ہیں، لہٰذا اگر چہ کتا کھانا نفس الأمر میں حرام ہوا اور موجب نار ہوا لیکن امام مالک رحمہ اللہ کے حق میں اس لئے نہیں کہ انہوں نے اپنے اجتہاد سے یہ بات فرمائی ہے۔

اُن کا استدلال قرآن کریم کی آیت ہے: ﴿ **قل لا أجد فيما أوحيى الى محرما على الخ** ” اس آیت سے استدلال کر کے انہوں نے کتے کو حلال کہا لیکن تم اگر کتے کو حرام سمجھنے کے باوجود کوئی مالکی آپ سے کہے کہ بھائی کتا کھاؤ اور آپ کتا کھائیں تو آپ باوجود اس کو حرام سمجھنے کے اگر کتا کھائیں گے تو یہ موجب نار ہو جائے گا تو وہاں یہ کہنا درست ہو جائیگا کہ وہ مالکی جو ہے وہ اس کو آگ کی طرف بلا رہا ہے۔اس کے حق میں تو آگ نہیں لیکن جس کو وہ بلا رہا ہے اس (مالکی) کے حق میں آگ ہے، اس واسطے کہ اس کا اجتہاد اس کی اجازت نہیں دیتا۔

لہٰذا یہ جملہ اگر اپنی جگہ پر ہو بھی اس کا تعلق **”فئة باغية“** سے ہو تب بھی اس سے یہ مطلب نکالنا درست نہیں کہ العیاذ باللہ حضرت معاویہؓ اور ان کے رفقاء جہنمی تھے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ عمل فی نفسہ باطل ہونے کی وجہ سے موجب نار تھا۔تو جناب! یہ اس ساری بحث کا خلاصہ ہے۔[۱۲۵]

سوال: حضرت معاویہ ﷺ نے منافقین کو جو قاتل ٹھہرائے تھے، کیا ان سے حضرت معاویہ ﷺ کی تائید نہیں ہوتی، کیونکہ صحابہ کے شان میں دعوت إلی النار مناسب نہیں؟

جواب: مطلب یہ ہے کہ **”یدعوهم إلى النار“** اس کا حاصل یہ ہے کہ ایسے عمل کی طرف دعوت دے رہے تھے جو فی نفسہ موجب نار تھا، اگر چہ ان کے اجتہاد کی وجہ سے نار نہ ہو تو جملہ کا یہ معنی اگر لیا جائے تو پھر حضرت علی ﷺ کا استدلال درست ہوگا اس میں وہ احتمال بھی ہے جو سوال میں ہے اسی واسطے حضرت معاویہ ﷺ نے اس کو اختیار کیا۔

یہی اجتہاد ہوتا ہے کہ دونوں میں سے کوئی فریق بھی کسی فریق کو عقلی طور پر نہیں کہہ سکتے، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ **”مذهبنا صواب يحمل الخطاء مذهبهم خطأيحتمل الصواب“**.

۱۲۴، ۱۲۵ **وقال الحميدى** : لعل هذه الزيادة لم تقع للبخارى ، اذ وقعت فحذفها عمداً ولم يذكر ها فى الجمع ، قال : وقد اخرجها الاسماعيلى والبرقانى فى هذا الحديث ، والجواب الصحيح فى هذا أنهم كانوا مجتهدين ظانين أنهم يدعونه الى الجنة، وان كان فى نفس الامر خلاف ذلك ، فلا لوم عليهم فى اتباع ظنونهم ، فان قلت : المجتهد اذا اصاب فله أجران ، واذا اخطأ فله اجر ، فكيف الأمر ههنا ؟ قلت : الذى قلنا جواب اقناعى فلا يليق أن يذكر فى حق الصحابة خلاف ذلك ، لأن الله تعالىٰ أثنى عليهم وشهد لهم بالفضل ، بقوله : كنتم خير امة اخرجت للناس ، آل عمران : ۱۱۵ ، قال المفسرون :هم اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم ، عمدة القارى ج:۳، ص:۴۷۶.

اہم نکتہ

ایک اہم نکتہ جو سمجھنے کا ہے وہ یہ ہے کہ یہ بات تو صحیح ہے کہ حضرت علی ؓ کی ابتدائی خلافت میں انہوں نے قصاص نہیں لیا جس کی وجہ استحکام خلافت مقصود تھا اور مستحکم ہو جاتے تو پھر قصاص لیتے، لیکن ہوا یہ کہ حضرت علی ؓ کے آخر دور تک حضرت عثمان ؓ کا قصاص نہیں لیا گیا۔ تو سوال یہ ہے کہ پورا دور خلافت اس طرح گزر گیا کہ اتنی قوت حاصل نہیں ہوئی تھی کہ قاتلین عثمان ؓ سے قصاص لیا جا سکے؟ اس بارے میں دو باتیں سمجھنے کی ہیں:

بعض حضرات نے تو یہ کہا ہے کہ اصل میں حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی ؓ کا پورا زمانہ فتنوں ہی کی نذر ہو گیا۔ اب آپ دیکھئے! اس دور میں جنگ جمل ہوئی اور جنگ صفین ہوئی، اوپر سے خوارج کا فتنہ کھڑا ہو گیا تو گویا ان کو آخر دم تک ان فتنوں سے نمٹنے کی مہلت ہی نہیں ملی اور اس کے علاوہ حضرت علی ؓ کا دور خلافت اتنا لمبا چوڑا بھی نہیں تھا، اس لئے وہ اطمینان کے ساتھ اس مسئلہ پر غور نہ کر سکے۔

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ قصاص تو لینا برحق ہے لیکن قصاص کے لئے اس کی کچھ شرعی شرائط بھی ہیں، اس لئے کم از کم دو عینی گواہ ہوں، جو اس بات کی گواہی دیں کہ فلاں نے قتل کیا ہے۔ حضرت عثمان ؓ کی شہادت ایک بلوے کے نتیجے میں واقع ہوئی تھی کہ ایک ہجوم گھس آیا اور آ کے حضرت کو شہید کر دیا۔ اب یہ ہے کہ کس شخص کی حرکت سے اور کس کے فعل سے حضرت عثمان ؓ کی شہادت واقع ہوئی اس بات کا تعین مشکل تھا، زبانی باتیں بہت سی کہی گئی ہیں کہ محمد بن ابی بکر نے جا کے داڑھی پکڑی اور وہ قاتل ہے، کوئی کہتا ہے کہ عمرو بن الحمق نے قتل کیا۔

مختلف روایات میں مختلف لوگوں کے نام مروی ہیں، تو جب تک شہادت مکمل نہ ہو کہ فلاں شخص نے قتل کیا ہے اس وقت تک ان سے قصاص نہیں لیا جا سکتا تھا، تو ان کو شہادت پوری میسر نہ تھی کہ جس کی وجہ سے وہ قصاص لیتے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس پورے گروہ کا حضرت عثمان ؓ پر حملہ آور ہونا یہ بغاوت ہی ہے اور بغاوت کی سزا ان سب کو دینی چاہیے، لیکن یہ اتنا بڑا طاقتور گروہ تھا کہ اس طاقتور گروہ کے لئے مسلمانوں کا متحد ہونا ضروری تھا اور وہ اتحاد آخر دم تک حاصل نہ ہو سکا اس واسطے اس گروہ کا مقابلہ حضرت علی ؓ نہ کر سکے۔

بہر حال یہ ایک خلا تو ہے اور اس خلا کی توجیہ آسان بھی نہیں۔

ایک ہندو شاعر گذرا ہے، اس نے ایک جملے میں تین چار شعروں میں بڑی حکیمانہ بات کہی ہے اور یہ درحقیقت حضرت علی ؓ کے ایک ارشاد کا ترجمہ ہے:

ایک روز مرتضٰی سے کسی نے عرض کی　　اے نائبِ رسول امیں دام ظلکم!
بوبکرؓ اور عمرؓ کے زمانے میں چین تھا　　عثمانؓ کے بھی عہد میں لبریز تھا یہ خُم

کیوں آپ ہی کے عہد میں جھگڑے یہ پڑ گئے اپنی تو عقل ہوگئی اس مسئلے میں گُم
کہنے لگے: یہ بات کوئی پوچھنے کی ہے ان کے مشیر ہم تھے، ہمارے مشیر تم

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ مقولہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ اس قسم کے فتنے کے دور میں ایک ذمہ دار حکومت کن حالات سے دوچار ہوتی ہے، اس کے سامنے کیا مسائل ہوتے ہیں اور ان مسائل کی بنا پر بعض اوقات ایک عام آدمی ان کے اعمال وافعال پر اعتراض کرتا ہے لیکن اس عام آدمی کو پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کن مجبوریوں سے دوچار ہے، اس واسطے یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ بات کم ازکم ناقابل تصوّر ہے کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت میں حصہ دار ہوں، العیاذ باللہ، یا قصاص سے جان بوجھ کر قدرت کے باوجود عدول یا اعراض کیا ہو۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کی وجہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر یہ اعتراض تھا کہ انہوں نے اپنے قبیلے اور خاندان کے لوگوں کو مختلف جگہوں کا گورنر مقرر کر دیا، اور ان کو گورنر مقرر کرنے کی وجہ سے لوگوں نے ایک طوفان کھڑا کیا اور ایسے ایسے غلط سلط الزام لگائے۔

تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مؤقف یہ تھا کہ جب تک کوئی بات پوری طرح ثابت نہ ہو تو میں کسی گورنر کو معزول نہیں کرسکتا، آخر کار انہوں نے چڑھائی کر دی کہ ہمارا مطالبہ مانا جائے جیسا کہ آج کل ہوتا ہے کہ اگر ہمارا مطالبہ منظور نہ کیا گیا تو چڑھائی کر دیں گے۔

اس چڑھائی کو اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ چاہتے تو فوج کے ذریعے روک سکتے تھے، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں پہلا وہ شخص نہیں بننا چاہتا ہوں جو مسلمانوں کے اوپر تلوار چلائے، وہ خاموش رہے اور صبر کرتے رہے۔ اس صبر کا انہوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔

(۶۴) باب الاستعانة بالنجار والصناع في أعواد المنبر والمسجد

منبر اور مسجد کی لکڑیوں میں بڑھئی اور کاریگروں سے مدد لینے کا بیان

۴۴۸ ـ حدثنا قتیبة قال: حدثنا عبد العزیز، عن أبي حازم، عن سهل قال: بعث رسول الله ﷺ إلى امرأة أن (مری غلامک النجار یعمل لي أعوادا أجلس علیهن).

[راجع:۳۷۷]

۴۴۹ ۔ حدثنا خلاد قال : حدثنا عبد الواحد بن أيمن ، عن أبيه ، عن جابر : (أن امرأة قالت : يا رسول الله ، الا أجعل لک شيئا تقعد عليه ؟ فإن لى غلاماً نجارا . قال : إن شئت ، فعملت المنبر) [أنظر : ۹۱۸، ۲۰۹۵، ۳۵۸۴، ۳۵۸۵]

حضور اقدس ﷺ نے ایک عورت کے پاس پیغام بھیجا کہ اپنا جو بڑھئی غلام ہے اس سے کہو کہ میرے لئے کچھ لکڑیاں بنادے جس میں میں بیٹھوں گا یعنی منبر، اور اگلی روایت میں یہ آرہا ہے کہ خود عورت نے یہ پیش کش کی تھی کہ میں آپ کے لئے منبر بنوادوں گی۔

دونوں روایتوں میں تطبیق

دونوں روایتوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ عورت نے پہلے خود پیش کش کی تھی اور جب ذرا کچھ تاخیر ہوئی تو حضور اقدس ﷺ نے خود کہلوایا کہ جا کر اپنے غلام سے بنوادو اور پھر طریقہ بھی بتایا کہ وہ منبر بنانا ہے اور منبر اس طرح کا بناؤ۔

(٦٥) باب من بنى مسجدا

جو شخص مسجد بنائے اس کا بیان

۴۵۰ ۔ حدثنا يحيى بن سليمان قال: حدثني ابن وهب : أخبرني عمرو: أن بكيرا حدثه أن عاصم بن عمر بن قتادة حدثه أنه سمع عبيدالله الخولاني، أنه سمع عثمان ابن عفان ﷺ يقول عند قول الناس فيه حين بنى مسجد الرسول ﷺ :إنكم أكثرتم وإني سمعت النبي ﷺ يقول: (من بنى مسجدا. قال بكير: حسبت أنه قال: يبتغي به وجه الله. بنى الله له مثله في الجنة).[۱۲٦]

تعمیر مسجد کی فضیلت

حضرت عثمان بن عفان ﷺ کو مسجد نبوی کی تعمیر کرتے وقت فرماتے ہوئے سنا ہے کہ لوگ ان کے

---

[۱۲٦] وفی صحيح مسلم ، كتاب المساجد ومواضع الصلاة ، باب فضل بناء المساجد والحث عليها ، رقم: ۸۲۸، وكتاب الزهد والرقائق ، رقم: ۵۲۹۷، وسنن الترمذى ، كتاب الصلاة ، باب فضل بناء المساجد ، رقم: ۲۹۲، وسنن ابن ماجه ، كتاب المساجد والجماعات ، باب من بنى لله مسجداً ، رقم: ۷۲۸، ومسند أحمد ، مسند العشرة المبشرين بالجنة ، باب مسند عثمان بن عفان ، رقم: ۴۰۷، وسنن الدارمى ، كتاب الصلاة ، باب من بنى لله مسجداً، رقم: ۱۳۵۶ .

بارے میں مختلف باتیں کرتے تھے، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے دو مرتبہ مسجد کی توسیع فرمائی تھی تو جب مسجد نبوی کے اندر تعمیر کر رہے تھے تو بعض لوگ اعتراض کرنے والے ہوتے ہیں، کہنے لگے کہ حضور اقدس ﷺ کے زمانے کی مسجد میں تغیر کر رہے ہیں۔ تو اس کے جواب میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سنائی **"وانکم کم اکثر تم"** ارے بھائی! تم نے بھی مجھ پر اعتراض کرنے میں حد سے تجاوز کیا اور میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ **"من بنی مسجدا"** اور بکیر نے کہا کہ میرے خیال میں یہ بھی کہا تھا **"یبتغی به وجه الله"** اور مسجد بنائے اور رضائے الٰہی مقصود ہو **"بنی الله له مثله في الجنة"** تو اللہ جل جلالہ اس کے لئے اس جیسا گھر جنت میں بنائے گا۔

اعتراض سے کوئی ذات محفوظ نہیں رہی

اس میں بعض حضرات کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر جو اعتراض تھا وہ یہ تھا کہ آپ نبی اکرم ﷺ کے زمانے کی مسجد میں تبدیلی فرما رہے ہیں اور بعض کا اعتراض یہ تھا کہ حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں مسجد کی عمارت پختہ نہیں تھی اور آپ نے اس کو پختہ بنایا اور اس زمانے کے لحاظ سے اس کو ذرا آراستہ بھی کیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس سے استدلال کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی مسجد بنائے گا اللہ جل جلالہ اس کے لئے جنت میں اس جیسا گھر بنائے گا **"مثله"** فرمایا، معنی یہ ہوئے کہ جو کچی مسجد بنائے گا تو کچا گھر ملے گا اور پکی مسجد بنائے گا تو پکا گھر ملے گا، لہٰذا جب **"مثله"** فرمایا تو یہاں اچھی سے اچھی مسجد بنانی چاہئے، تاکہ وہاں پر اچھے سے اچھا گھر ملے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ مسجد کا کام اپنے ذاتی خرچے سے کیا تھا، بیت المال سے کوئی رقم نہیں لی تھی۔

(٦٦) باب: يأخذ بنصول النبل إذا مر في المسجد

جب مسجد سے گذرے تو تیر کا پھل پکڑے رہے

۴۵۱ ـ حدثنا قتيبة قال: حدثنا سفيان قال: قلت لعمرو: أسمعت جابر ابن عبد الله يقول: مر رجل في المسجد و معه سهام، فقال له رسول الله ﷺ: (أمسک بنصالها). [أنظر ۷۰۷۳، ۷۰۷۴]

(٦٧) باب المرور في المسجد

مسجد میں کس طرح گذرنا چاہیئے

۴۵۲ ۔ حدثنا موسی بن إسماعیل قال: حدثنا عبدالواحد قال: حدثنا أبو بردة ابن عبدالله قال: سمعت أبا بردة عن أبیه عن النبي ﷺ قال: (من مر في شيء من مساجدنا أو أسواقنا بنبل فلیأخذ علی بصالها، لا یعقر بکفه مسلما). [أنظر: ۷۰۷۵] [۱۲۷]

ترجمۃ الباب سے مقصود بخاریؒ

پہلے باب "باب: یأخذ بنصول النبل إذا مر في المسجد" میں امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص مسجد سے گزرے اور اس کے ہاتھ میں تیر وغیرہ ہوں تو اس کی دھار پکڑ کر رکھے، ایسا نہ ہو کہ وہ کسی دوسرے کو لگ جائے اور اس سے اس کو تکلیف پہنچ جائے، اصل مقصود اس باب سے یہی ہے۔

روایت باب سے مقصود

پھر دوسرا باب قائم کیا "باب المرور في المسجد" اس میں بھی وہی حدیث لائے ہیں لیکن اس میں مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ مسجد کے اندر سے گزرنا درست ہے یا نہیں؟ یعنی کوئی شخص مسجد میں بغرض عبادت نہیں جاتا بلکہ اس کو ایک راستہ کے طور پر استعمال کرتا ہے اور مقصد کہیں اور جانا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

مرور فی المسجد میں اختلاف ائمہ

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس میں کوئی حکم بیان نہیں کیا بلکہ مطلق چھوڑ دیا، کیونکہ اس میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس طرح گزرنے میں کوئی حرج نہیں۔

حنفیہ کا مسلک

حضرات حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ مسجد کو راستہ بنانا مکروہ ہے یعنی اگر اکا دکا مرتبہ گزر گیا تو اس کی گنجائش ہے لیکن اس خیال سے عام عادت بنالے کہ راستہ قریب پڑے گا تو اس کو فقہاء حنفیہ نے مکروہ قرار دیا ہے۔

---

[۱۲۷] وفي سنن أبي داؤد، کتاب الجهاد، باب في النبل یدخل به المسجد، رقم: ۲۲۲۰، وسنن ابن ماجه، کتاب الأدب، باب من کان معه سهام فلیأخذ بنصالها، رقم: ۳۷۶۸.

حنفیہ کا استدلال

حنفیہ نے اس مسئلے میں ایک حدیث سے استدلال کیا ہے جو ابن ماجہ میں آئی ہے اور اس میں یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے مسجد کو طریق بنانے سے منع فرمایا ہے۔[۱۲۸]

اس کی سند اگرچہ ضعیف ہے لیکن متعدد آیات و احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ مساجد عبادت کے لئے بنائی گئی ہیں ان کو اگر کوئی شخص راستہ بنالے تو یہ ان کا غلط استعمال ہے، اس لئے حنفیہ نے ان احادیث اور آیات کی روشنی میں باوجود اس حدیث کے ضعیف ہونے کے اس پر عمل کیا ہے۔[۱۲۹]

قائلین جواز کی دلیل

اور امام بخاری رحمہ اللہ نے یہاں جو حدیث ذکر فرمائی ہے اس میں یہ ہے کہ **"من مرّ فی شیٔ من مساجدنا أو أسواقنا بنبل فلیأخذ علی نصالها"** کہ جب کوئی شخص مسجد کے اندر تیروں کے ساتھ گزرے تو اس کی دھار پر ہاتھ رکھ لے تاکہ دوسروں کو تکلیف نہ ہو، تو یہاں چونکہ مرور کا ذکر ہے اس لئے اس سے ان حضرات کے مسلک پر ایک طرح سے استدلال کیا جا رہا ہے جو مرور کے قائل ہیں۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں حدیث میں اس بات کی صراحت نہیں ہے کہ جو آدمی گزر رہا ہے وہ محض راستہ بنانے کے لئے گزر رہا ہے بلکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے کے لئے آیا ہو اور مسلح بھی ہے اور تیر اس کے ہاتھ میں ہے، تو اس واسطے مرور یہاں محض راستہ بنانے کے معنی میں نہیں ہے، جس سے یہ استدلال کیا جائے کہ آنحضرت ﷺ نے اس کو راستہ بنانے کی اجازت دی ہے۔

(۶۹) باب أصحاب الحرب في المسجد

حرب والوں کا مسجد میں داخل ہونے کا بیان

۴۵۴ ۔ حدثنا عبد العزیز بن عبد اللہ قال: حدثنا إبراهیم بن سعد، عن صالح

---

[۱۲۸] عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال خصال لا تنبغی فی المسجد لا یتخذ طریقاً ولا یشهر فیه سلاح ولا ینبض فیه بقوس ولا ینشر فیه نبل ولا یمر فیه بلحم نئی ولا یضرب فیه حد ولا یقتص فیه من آحد ولا یتخذ سوقا ، سنن ابن ماجه رقم: ۷۴۸، ج: ۱، ص: ۲۴۷. دار الفکر ، بیروت ، والفردوس بمأثور الخطاب ، رقم : ۲۷۲۴، ض: ۲، ص: ۲۴۵.

[۱۲۹] رواه من هذا الوجه باسناد لا بأس به کذا قال عبد العظیم المنذری الخ ، مصباح الزجاجة ج: ۱، ص: ۹۵، دار العربیة ، بیروت ، سنة النشر ، ۱۴۰۳ھ.

عن ابن شهاب قال: أخبرني عروة بن الزبير أن عائشة رضي الله عنها قالت: لقد رأيت رسول الله ﷺ يوما على باب حجرتي والحبشة يلعبون في المسجد، ورسول الله ﷺ يسترني بردائه أنظر إلى لعبهم. [أنظر ۴۵۵، ۹۵۰، ۹۸۸، ۲۹۰۶، ۳۵۲۹، ۳۹۳۱، ۵۱۹۰، ۵۲۳۶] [۱۳۰]

۴۵۵ ـ و زاد إبراهيم بن المنذر: حدثنا ابن وهب، أخبرني يونس، عن ابن شهاب عن عروة، عن عائشة قالت: (رأيت النبي ﷺ و الحبشة يلعبون بحرابهم) [راجع: ۴۵۴]

مسجد میں نیزہ بازی کا ثبوت؟

یہ مشہور و معروف حدیث ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے حجرے کے دروازے پر دیکھا، جبکہ حبشہ کے لوگ **"یلعبون فی المسجد"** مسجد میں نیزہ بازی کے کرتب دکھا رہے تھے **"ورسول الله ﷺ یسترنی بردائه"** آپ ﷺ نے مجھے اپنی چادر سے چھپایا ہوا تھا۔ **"أنظر إلی لعبهم"** ان کے اُس کرتب کو میں دیکھ رہی تھی اور آگے دوسری روایت میں کہا کہ **"رأیت النبی ﷺ والحبشة یلعبون بحرابهم"** وہ اپنے نیزوں سے کھیل رہے تھے۔ تو اس سے امام بخاری رحمہ اللہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ نیزہ بازی مسجد میں کی جاسکتی ہے۔

بعض حضرات نے یہ کہا کہ یہاں مسجد سے مراد فناء مسجد ہے، اور یہ بات امام مالک رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے، [۱۳۱]

لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کی تائید کی ہے کہ دوسری روایت میں صراحتاً یہ آیا ہے کہ مسجد کے فناء میں نہیں بلکہ عین مسجد میں یہ ہو رہا تھا اور چونکہ نیزہ بازی اور تلوار بازی یہ سب جہاد کی تیاری ہے، اس کے مسجد میں ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ اس کو مستقل مسجد کا مشغلہ نہیں بنانا چاہئے، احیاناً ایک مرتبہ واقعہ پیش آیا تھا ایسا احیاناً اگر ہو جائے تو امید ہے کہ انشاء اللہ قابل گرفت نہیں ہوگا لیکن اس کو با قاعدہ کھیل کا میدان بنانا کہ

---

[۱۳۰] وفي صحيح مسلم، كتاب صلاة العيدين، باب الرخصة في اللعب الذي لا معصية فيه ايام العيد، رقم: ۱۴۸۰، وسنن النسائي، كتاب صلاة العيدين، باب اللعب في المسجد يوم العيد ونظر النساء الى ذلك، رقم: ۱۵۷۷، ومسند أحمد، باقي مسند الأنصار، باب حديث السيدة عائشة، رقم: ۲۳۳۹۲، ۲۴۱۶۸، ۲۴۹۰۶، ۲۵۱۲۳.

[۱۳۱] قلت وثبت عندي عن مالك رحمه الله تعالىٰ أنه كان خارج المسجد لاداخله، وظاهر كلام المصنف رحمه الله تعالىٰ أنه حمله على داخل متن المسجد، فيض الباري ج: ۲، ص: ۵۵.

مستقل مسجد میں یہ کام ہو، یہ درست نہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ کرتب دکھایا۔ اس میں حضور اکرم ﷺ کا اہل کے ساتھ حسنِ معاشرت ہے کہ ان کی دلچسپی اتنی رکھتے کہ حضرت عائشہؓ کو یہ کرتب دکھایا اور اسی سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے کہ عورت کا مرد کو دیکھنا منع نہیں ہے، "الا" یہ کہ فتنے کا اندیشہ ہو۔

(۷۰) باب ذكر البيع والشراء على المنبر في المسجد

مسجد کے منبر پر خرید وفروخت کا ذکر جائز ہے

۴۵۶ ـ حدثنا علي بن عبد الله قال: حدثنا سفيان، عن يحي، عن عمرة، عن عائشة قالت: أتتها بريرة تسألها في كتابتها. فقالت إن شئت أعطيت أهلك ويكون الولاء لي. وقال أهلها: إن شئت أعطيتها ما بقي. وقال سفيان مرة: إن شئت أعتقتها ويكون الولاء لنا. فلما جاء رسول الله ﷺ ذكرته ذلك فقال النبي ﷺ: (ابتاعيها فأعتقيها فإن الولاء لمن أعتق)، ثم قام رسول الله ﷺ على المنبر فقال: (مابال أقوام يشترطون شروطا ليس في كتاب الله: من اشترط شرطا ليس في كتاب الله فليس له وإن شترط مائة مرة) رواه مالك عن يحيي عن عمرة أن بريرة ولم يذكر: فصعد المنبر. قال علي: قال يحي وعبد الوهاب، عن يحي، عن عمرة، وقال جعفر بن عون عن يحي قال: سمعت عمرة قالت: سمعت عائشة رضى الله عنها. [أنظر: ۱۴۹۳، ۲۱۵۵، ۲۱۶۸، ۲۵۳۶، ۲۵۶۰، ۲۵۶۱، ۲۵۶۳، ۲۵۶۴، ۲۵۶۵، ۲۵۷۸، ۲۷۱۷، ۲۷۲۶، ۲۷۲۹، ۲۷۳۵، ۵۰۹۷، ۵۲۷۹، ۵۲۸۴، ۵۴۳۰، ۶۷۱۷، ۶۷۵۱، ۶۷۵۴، ۶۷۵۸، ۶۷۶۰] ۱۳۲

مقصود بخاری رحمہ اللہ

یہاں باب کا مقصد یہ ہے کہ بیع وشراء کا محض ذکر منبر پر کیا جا سکتا ہے، نہ کہ بیع وشراء۔ یہ معروف حدیث ہے بخاری میں متعدد مقامات پر آئی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا آئی

---

۱۳۲ وفي صحيح مسلم، كتاب العتق، باب انما الولاء لمن اعتق، رقم: ۲۷۶۱، وسنن الترمذي، كتاب البيوع عن رسول الله باب ماجاء في اشتراط الولاء والزجر عن ذلك، رقم: ۱۱۷۷، وسنن أبي داؤد، كتاب العتق، باب في بيع المكاتب اذا فسخت الكتابة، رقم: ۳۴۲۸، وموطأ مالك، كتاب العتق والولاء، باب مصير الولاء لمن اعتق رقم: ۱۲۷۵.

یہ کسی اور کی کنیزہ تھی اور حضرت عائشہؓ سے انہوں نے اپنی کتابت کے بارے میں سوال کیا کہ مجھے میرے مولیٰ نے مکاتب بنایا ہے کہ پیسے لے آؤ تو تمہیں آزاد کردیں گے۔

کوئی ایسی صورت پیدا کردیں کہ میرا بدلِ کتابت ادا ہو اور میں آزاد ہو جاؤں، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا "**إن شئت أعطيت أهلك ويكون الولاء لي**" کہ اگر تم چاہو تو میں ایسا کرلوں کہ تمہارے اہل کو بدل کتابت دے دوں اور تمہاری "**ولاء**" مجھے ملے اور ان کے اہل (مولیٰ) نے کہا کہ "**إن شئت أعطيتها ما بقي**" کہ اگر تم چاہو تو ایسا کرو کہ جتنا بدل کتابت باقی ہے وہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو دیدو اور حضرت بریرہؓ ہمیں دیدیں اور حضرت بریرہؓ کو ہم آزاد کردیں گے" **وقال سفيان مرة : إن شئت أعتقتها ويكون الولاء لنا**" دوسری مرتبہ سفیان نے کہا تھا کہ حضرت بریرہؓ کے مولیٰ نے یہ کہا تھا کہ اگر تم چاہو تو ان کو خرید کر آزاد کرلو لیکن "**ولاء**" ہمیں ملے۔

"ثم "**قام رسول الله ﷺ على المنبر وقال سفيان مرة فصعد رسول الله ﷺ على المنبر فقال: مابال أقوام يشترطون شروطا ليس في كتاب الله الخ**".

لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ بیع میں ایسی شرطیں لگاتے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں ہیں جس نے ایسی شرط لگائی جو کتاب اللہ میں نہیں ہے تو اس کے لئے نہیں" **و إن اشترط مأة مرّة**" اگرچہ سو مرتبہ بھی لگائے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ بیع شرط کے ساتھ فاسد نہیں ہوئی۔ اس مسئلے کی تفصیل "**کتاب البیوع**" کے اندر آئے گی۔

یہاں پر بیان کا مقصود یہ ہے کہ منبر پر کھڑے ہو کر بیع وشراء ذکر فرمایا تو معلوم ہوا کہ منبر پر بیع وشراء کا ذکر کرنا جائز ہے، بیع کے شرائط کا مسئلہ انشاء اللہ "**کتاب البیوع**" میں آئے گا۔

(۷۱) باب التقاضي والملازمة في المسجد

مسجد میں تقاضا اور قرض دار کے پیچھے پڑنے کا بیان

۴۵۷ ـ حدثنا عبد الله بن محمد قال: حدثنا عثمان بن عمر قال: أخبرنا يونس، عن الزهري، عن عبد الله بن كعب بن مالك، عن كعب: أنه تقاضى ابن أبي حدرد دينا كان له عليه في المسجد، فارتفعت أصواتهما حتى سمعهما رسول الله ﷺ وهو في بيته، فخرج إليهما حتى كشف سجف حجرته، فنادى: (يا كعب)، قال: لبيك يا رسول الله. فقال: (ضع من دينك هذا) وأومأ إليه أي الشطر. قال: لقد فعلت يا رسول الله، قال: (قم

فاقضه).[أنظر : ۴۷۱، ۲۴۱۸، ۲۴۲۴، ۲۷۰۶، ۲۷۱۰] ۱۳۳

مقصود بخاری رحمہ اللہ

اس **"باب التقاضي والملازمة في المسجد"** میں امام بخاری رحمہ اللہ وہ سب امور بیان کررہے ہیں جو مسجد میں جائز ہیں تو ان میں سے ایک کام یہ ہے کہ مقروض سے تقاضا کرنا کہ تم میرا قرض ادا کرو یا اس کے پیچھے لگ جانا، اس کے ساتھ چمٹ جانا کہ تم میرا قرضہ ادا کرو۔

یہاں پر امام بخاری رحمہ اللہ نے جو حدیث روایت کی ہے اس سے مسجد کے اندر اس عمل کا بھی جواز معلوم ہوتا ہے، روایت ہے: **"عَن عبدَ الله بن كَعْب أَنَّهُ تَقَاضىَ ابنَ أَبي حَدْرَدٍ دَيْناً كَانَ لَهُ في المسجد"**.

یہ حدیث امام بخاری رحمہ اللہ نے بہت سی جگہ روایت کی ہے اور آگے بھی کئی جگہ آئے گی کہ حضرت کعب ﷺ کا ابن ابی حدرد پر کوئی قرضہ تھا تو حضرت کعب ﷺ نے ابن ابی حدرد سے مسجد کے اندر اپنے دین کا تقاضا کیا **"فارتفعت اصواتهما"** اس تقاضا میں دونوں کی آوازیں کچھ بلند ہوئیں انہوں نے دینے سے کچھ عذر کیا ہوگا اور انہوں نے کہا ہوگا کہ تمہیں دینا چاہئے اور اسی میں تکرار ہوگئی اور آواز بلند ہوگئی **"حتى سمعهما رسول الله ﷺ وهو فى بيته"** یہاں تک کہ آپ ﷺ نے ان کی آواز سنی جب کہ آپ ﷺ اپنے گھر میں تھے **"فخرج اليهما"** تو آپ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے **"حتى كشف سِجْفَ حجرته"** یہاں تک کہ آپ ﷺ نے اپنے حجرے کا پردہ کھولا **"فنادى"** اور وہیں سے آواز دی **"يا كعب! قال لبيك يا رسول الله قال "ضَعْ من دَينِكَ هذا" وَ أو مأ إليه اى الشطر"** شہادت کی انگلی کے نصف پر انگوٹھا رکھ کر اشارہ فرمایا کہ آدھا قرضہ چھوڑ دو **"قال لقد فعلتُ يا رسول الله ﷺ"** یا تو تقاضا ہو رہا تھا یا حضور اقدس ﷺ نے جس وقت فرمایا کہ آدھا قرضہ چھوڑ دو تو فوراً عرض کیا کہ **"لقد فعلت يا رسول الله"** (ﷺ) کہ یا رسول اللہ! میں نے آدھا قرضہ چھوڑ دیا **"قال قم فاقضه"** آپ نے ابن ابی حدرد سے فرمایا کہ کھڑے ہوجاؤ اور اب یہ قرضہ ادا کردو۔

---

۱۳۳ وفي صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب استحباب الوضع من الدين، رقم: ۲۹۱۲، وسنن النسائي، كتاب آداب القضاة، باب حكم الحاكم في داره، رقم: ۵۳۱۳، وسنن أبي داؤد، كتاب الأقضية، باب في الصلح، رقم: ۳۱۲۱، وسنن ابن ماجه، كتاب الاحكام، باب الحبس في الدين والملازمة، رقم: ۲۴۲۰، ومسند أحمد، مسند المكيين، باب حديث كعب بن مالك الانصاري، رقم: ۱۵۲۰۶، ۱۵۲۳۰، من مسند القبائل، باب حديث كعب بن مالك، رقم: ۲۵۹۲۰، وسنن الدارمي، كتاب البيوع، باب في انظار المعسر، رقم: ۲۴۷۴.

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ کا اس حدیث کو لانے کا مقصد یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت کعب ؓ سے یہ تو فرمایا کہ آدھا قرضہ معاف کردو اور چھوڑ دو لیکن دونوں کو اس بات پر تنبیہ نہیں فرمائی کہ مسجد میں یہ معاملہ کیوں کررہے ہو، تو معلوم ہوا کہ مسجد میں اگر کوئی دائن اپنے مدیون سے قرض کا مطالبہ کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مسئلہ ”ضع و تعجّل“

اس حدیث کے اندر ایک اور مسئلہ زیر بحث آتا ہے وہ یہ ہے کہ کوئی آدمی قرض کا کچھ حصہ چھوڑ کر بقیہ دین کو معجّل کردے تو آیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں، اس کو ”**ضع وتعجّل**“ کہا جاتا ہے۔

یہ مسئلہ اصل میں بیوع سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی دائن یہ کہے کہ میرے دین کی اجل تو مثلاً ایک مہینہ کے بعد ہے اور ایک مہینہ کے بعد اس کی ادائیگی کی تاریخ آنے والی ہے، دائن مدیون سے یہ کہتا ہے کہ میں تمہارے قرضہ کی کچھ رقم معاف کردیتا ہوں اور اس کے بدلے میں پیسے تم آج ہی دے دو، اس کو فقہاء ”**ضع وتعجل**“ کہتے ہیں یعنی مدیون دائن سے یہ کہہ رہا ہے کہ ”**ضع**“ تم اپنے دین میں کمی کرو ”**وتعجل**“ اور پیسے ابھی لے لو مثلاً ایک ہزار روپیہ قرضہ ہے اور ایک مہینہ کے بعد ادائیگی کرنی ہے اب مدیون یہ کہتا ہے کہ تم بجائے ایک ہزار کے مجھ سے آٹھ سو روپیہ ابھی لے لو۔

فقہائے کرام کا اختلاف

”**ضع وتعجل**“ کا یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں، اس میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے، بعض حنابلہ اِس کے قائل ہیں، لیکن جمہور فقہاء کہتے ہیں کہ یہ عمل ناجائز ہے اور یہی مسلک حنفیہ کا ہے اور اکثر شافعیہ اور مالکیہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[۱۳۴]

بعض فقہاء کا استدلال

جو حضرات اس کے جواز کے قائل ہیں، وہ اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ جس وقت آنحضرت ﷺ نے بنونضیر کو مدینہ سے جلاوطن کیا اور یہ حکم دیا کہ وہ مدینہ چھوڑ دیں۔

---

[۱۳۴] **كرهه زيد بن ثابت وابن عمر والمقداد وسعيد بن المسيب وسالم والحسن وحماد والحكم والشافعي ومالك والثوري وهيثم وابن علية وإسحاق وأبوحنيفة الخ، المغني لابن قدامة، ج: ۴، ص: ۵۲، دار النشر، دارالفكر، مدينة النشر، بيروت، سنة النشر: ۱۴۰۵هـ.**

سنن بیہقی میں روایت ہے کہ جس وقت ان کو جانے کا حکم ملا تو حضور اقدس ﷺ سے بعض صحابہ کرام ﷺ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ! "إن لهم علينا ديون لم تحل" کہ ہمارے اوپر ان کے کچھ قرضے ہیں جن کی میعاد ابھی تک پوری نہیں ہوئی، جب یہ چلے جائیں گے تو ہم کیسے ان کو قرضے ادا کرینگے؟ تو آنحضرت ﷺ نے یہود بنی نضیر سے خطاب کر کے فرمایا "ضعوا وتعجّلوا" یعنی کم کر دو اور جلدی لے لو۔ تو آپ نے یہودیوں سے با قاعدہ یہ بات فرمائی تھی۔ ۱۳۵؎

اس سے استدلال کر کے کہتے ہیں کہ قرضے کو کم کرنے کے مقابلے میں معجّل کر دینا یا معجّل کرنے کے مقابلے میں کم کر دینا جائز ہے۔

دوسری دلیل

حدیث باب سے بھی استدلال کیا جاتا ہے کیونکہ یہاں آنحضرت ﷺ نے حضرت کعب ﷺ سے فرمایا کہ آدھا دین ساقط کر دو اور ابن حدرد سے فرمایا کہ تم ابھی ادا کر دو، تو وہی ہوا کہ کمی کر کے ادائیگی فوراً کر دی۔

جمہور فقہاء کا استدلال

جمہور فقہاء جو ناجائز کہتے ہیں، وہ یہ فرماتے ہیں کہ "ضعوا وتعجلوا" کا جو معاملہ ہے یہ درحقیقت اس لئے ہے کہ دین کا کچھ حصہ تعجیل کے عوض میں ساقط کیا جا رہا ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ دینے میں دین کے اندر اضافہ کر دیا جائے یا جیسے زمانۂ جاہلیت کے ربوا کا طریقہ تھا کہ جب دین کی مدت آجاتی تو دائن کہتا تھا کہ "اما ان تقضي واما ان تربي" یا تو تم ابھی پیسے ادا کرو، ورنہ اس کے اوپر اضافہ کر دو، تو وہ مدیون کو مہلت دینے کے عوض میں پیسے وصول کرتا تھا اس کو ربوا قرار دیا گیا، تو یہاں اجل کو ساقط کرنے کے عوض دین ساقط کیا جا رہا ہے تو یہ بھی ربوا کا ایک شعبہ ہے کیونکہ جو دین ساقط ہوا وہ اجل کے مقابلے میں ہوا، اس واسطے یہ ناجائز ہے اور ایک حدیث بھی اس بارے میں بیہقی میں وارد ہے جس میں اس عمل کو ناجائز قرار دیا گیا ہے اور اس کو ربوا کے ہم معنی قرار دیا گیا ہے۔ ۱۳۶؎

۱۳۵؎ ...عن ابن عباس قال لما أمر النبي صلى الله عليه وسلم باخراج بني النضير من المدينة جائه ناس منهم فقالوا يا رسول الله انک أمرت باخراجهم ولهم على الناس ديون لم تحل فقال النبي صلى الله عليه وسلم ضعوا وتعجلوا ، سنن البيهقي الكبرى، ج:۶، ص:۲۸، كتاب البيوع ، باب من عجل له ادنى من حقه قبل محله فقبله ووضع عنه طيبة له أنفسها رقم: ۱۰۹۲۰، دار النشر ، مكتبة دار الباز ، مكة المكرمة، سنة النشر ۱۴۱۴ھ۔

۱۳۶؎ سنن البيهقي الكبرى ، رقم: ۱۰۹۲۲، ۱۰۹۲۳، ج:۶، ص:۲۸۔

اگر چہ دونوں حدیثیں سند کے اعتبار سے ضعیف ہیں "**ضعوا وتعجلوا**" والی حدیث بھی اور یہ حدیث بھی جس سے جمہور نے عدم جواز پر استدلال کیا ہے یہ بھی ضعیف ہے، لیکن جمہور علماء کا کہنا یہ ہے کہ ربوا کے جو قواعد ہیں اس کی رو سے یہ معاملہ جائز نہیں۔

بعض فقہاء کی دلیل کا جواب

اب جہاں تک ربوا بنونضیر کا واقعہ ہے تو اس کی سند کمزور ہے اور بیہقی نے خود اس پر کلام کیا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور اگر کسی صحیح طریقہ سے ثابت ہو بھی جائے، تو اس کی متعدد توجیہات ہو سکتی ہیں:

پہلی بات یہ ہے کہ یہ واقعہ بنونضیر کی جلاوطنی کے وقت کا ہے اور وہ سن دو ہجری میں جلاوطن کئے گئے ہیں جبکہ ربوا کی حرمت بعد میں آئی ہے کیونکہ ربوا کی حرمت میں کم سے کم جو قول آیا ہے وہ غزوۂ احد کے بعد ہے ورنہ بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ یہ حجۃ الوداع کے قریب قریب حرام ہوا ہے، اس واسطے حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ "**أول ربوا اضعه ربوا العباس بن عبدالمطلب**" اس لئے یہ واقعہ اس وقت کا ہے جبکہ ربوا حرام نہیں ہوا تھا، تو اس واقعہ سے جو ربوا کی حرمت سے پہلے کا ہے کسی ربوی معاملہ کی حرمت پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

جمہور کی دوسری دلیل

علامہ واقدی رحمہ اللہ نے ایک روایت نقل کی ہے اس سے دوسرا جواب نکلتا ہے علامہ واقدی رحمہ اللہ کی "**کتاب المغازی**" میں یہ روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے جو فرمایا تھا کہ "**ضعوا وتعجلوا**" معنی یہ نہیں تھے کہ دین کی اصل مقدار میں کمی کر دو اور جلدی لے لو، بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہودیوں نے جو قرضے سود پر دیئے ہوئے تھے تو "**ضعوا**" کا مطلب یہ تھا کہ تم اس کا سود ساقط کر دو اور اصل رقم ابھی لے لو تو "**ضعوا**" سے مراد اصل قرضے کی مقدار کو ساقط کرنا نہیں تھا بلکہ سود کی مقدار کو ساقط کرنا تھا، اور واقدی نے اس پر ایک روایت بھی نقل کی ہے کہ ایک صاحب تھے انہوں نے ایک یہودی سے قرض لیا ہوا تھا اور اس کا سود بہت بڑھ گیا تھا تو آپ نے فرمایا کہ سود ساقط کر دو اور اصل رقم لے لو۔[۱۳۷]

ظاہر ہے کہ اس میں کسی کو بھی اشکال نہیں۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ قرضے کی اصل رقم میں کمی کی جائے، لہٰذا اس واقعہ سے استدلال اس وجہ سے درست نہیں۔

---

[۱۳۷] فكان لابی رافع سلام بن أبی الحقيق علی اسيد ابن حضير عشرون ومائة دينار الی سنة، فصالحه علی أخذ راس ماله ثمانين ديناراً، وأبطل مافضل، كتاب المغازی للواقدی ج: ۱، ص: ۳۷۴، بيروت، ۱۴۰۹ھ.

بعض فقہاء کی دوسری دلیل کا جواب

جہاں تک اس واقعہ کا تعلق ہے جس میں حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ تم آدھا دین ساقط کردو اور ابن ابی حدرد سے فرمایا تھا کہ تم ابھی ادا کرو، اس سے استدلال دو وجہ سے نہیں ہوسکتا:

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہ سارا اختلاف جو ہو رہا ہے یہ اس دین کے بارے میں ہے جو مؤجل ہو اور اس کی اجل ابھی نہ آئی ہو، تو اس وقت یہ اختلاف ہے اور اس میں اکثر فقہاء یہ کہتے ہیں کہ **"ضع وتعجل"** جائز نہیں، لیکن اگر دین شروع ہی سے مؤجل نہیں تھا یا مؤجل تھا لیکن اجل آگئی اور دین حال بن گیا تو اس وقت میں اگر **"ضع وتعجل"** کا معاملہ ہو تو جائز ہے۔

اس لئے کہ جب دین حال ہوگیا تو اب جو اسقاط ہو رہا ہے وہ کسی اجل کے مقابلے میں نہیں ہو رہا، کیونکہ اجل تو ختم ہوگئی، اس واسطے اگر کسی کا دین واجب ہوگیا اور اس کی اجل آگئی اور مدیون کہتا ہے کہ میرے پاس ابھی اتنے پیسے نہیں ہیں، لہٰذا یا تو انتظار کرو جب تک کہ میرے پاس پیسے آئیں اور چاہو تو ابھی لے لو، مگر باقی دین ساقط کردو، تو اگر دائن یہ کہے کہ نہیں ابھی دیدو اور باقی ساقط کردیتا ہوں تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں، یہ جائز ہے، کیونکہ یہ دیون حالّہ ہیں اور ان میں ایسا کرنا جائز ہے۔

یہاں حضرت کعب رضی اللہ عنہ کا دین حال ہوچکا تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ ابن حدرد سے تقاضا کر رہے تھے، اگر حال نہ ہوتا تو تقاضا کیسے کرتے، لہٰذا یہ **"مانحن فیہ"** اور مختلف فیہ مسئلہ میں داخل ہی نہیں، اس واسطے حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے آپ نے فرمایا تھا کہ آدھا ساقط کردو، اور آدھا وصول کرو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ **"ضع وتعجل"** کا معاملہ اس وقت ناجائز ہوتا ہے جبکہ یہ مشروط فی العقد ہو یعنی اجل بھی آئی نہیں اور مدیون کہتا ہے کہ تم اتنا دین ساقط کردو تو میں ابھی ادا کرتا ہوں تو ساقط کرنا اجل کے ساتھ مشروط ہوا اور یہ ناجائز ہے لیکن اگر دائن اپنے طور پر ساقط کردے اور مدیون اپنے طور پر ادا کردے تو معاملہ چونکہ مشروط نہیں ہوا اس واسطے ناجائز نہیں ہوا اور یہاں جس وقت حضور اکرم ﷺ نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ آدھا دین ساقط کردو اس وقت یہ نہیں فرمایا تھا کہ اس کے مقابلے میں تمہیں دین ابھی مل جائے گا بلکہ مطلق فرمایا تھا کہ آدھا ساقط کردو اور انہوں نے کردیا۔ اب ابن ابی حدرد سے فرمایا کہ تم ادا کردو، تو دونوں معاملے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مشروط نہ ہوئے، لہٰذا یہ **"ضع وتعجل"** کی صورت میں داخل ہی نہیں۔[۱۳۸]

---

۱۳۸ ومن أجاز من السلف اذا قال عجل لی واضع عنک فجائز أن یکون أجازوہ اذا لم یجعلہ شرطا فیہ وذلک بأن یضع عنہ بغیر شرط ویعجب الآخر الباقی بغیر شرط ، أحکام القرآن للجصاص ، ج: ۲، ص:۱۸۷، داراحیاء التراث العربی ، بیروت.

خلاصۂ کلام

تو خلاصہ یہ نکلا کہ **"ضع وتعجل"** کی جو ممانعت ہے وہ دیون مؤجلہ میں ہے جبکہ ان کی اجل ابھی نہ آئی ہو اور ان کی تعجیل اسقاط کے ساتھ مشروط ہو، یا اسقاط تعجیل کے ساتھ مشروط ہو، لیکن جہاں ایسا نہ ہو مثلاً دین مؤجل ہی نہیں بلکہ حال ہے مگر اسقاط کو تعجیل کیلئے شرط قرار نہیں دیا گیا تو پھر معاملہ جائز ہوگا۔

قرض "مؤجلِ بالتأجیل" نہیں ہوتا

ایک بات سمجھ لینا چاہئے، وہ یہ ہے کہ قرض کا جو عقد ہوتا ہے وہ حنفیہ اور جمہور کے نزدیک مؤجل ہوتا ہی نہیں قرض ہمیشہ معجّل اور حال ہوتا ہے اور جو دیون ہیں مثلاً آپ نے کسی کو کوئی کتاب بیچی اور اس کی قیمت اس کے ذمہ واجب ہوگئی اور دین ہوگئی یہ دین تو مؤجل ہو جاتا ہے کہ مثلاً وہ عقد بیع میں شرط لگائے کہ میں پیسے دو مہینے بعد ادا کرونگا، تو اب دو مہینے سے پہلے آپ مطالبہ نہیں کر سکتے کیونکہ یہ دین مؤجل ہو گیا لیکن کوئی شخص کہے کہ مجھے ایک ہزار روپے قرضہ دیدو تو یہ کبھی مؤجل نہیں ہوتا۔

یہاں تک کہ اگر عقد قرض میں اجل کو شرط لگا لیا گیا ہو تو وہ شرط بھی باطل ہوتی ہے مثلاً مقروض نے کہا کہ میں دو مہینے بعد قرض ادا کرونگا، قرض دینے والا بھی اس پر راضی ہو گیا کہ ٹھیک ہے دو مہینے بعد دیدینا، تو اس کے باوجود قرض مؤجل نہیں ہوا بلکہ صرف مروّۃً قرض دینے والے کو چاہئے کہ وہ دو مہینے سے پہلے مطالبہ نہ کرے لیکن اگر وہ مطالبہ کرنا چاہے تو ہر وقت کر سکتا ہے اور قاضی کے پاس جا کر کہہ سکتا ہے کہ اس کے ذمہ میرا قرضہ واجب ہے، آج ہی دلوائیں، یہاں تک کہ اگر آج قرضہ دو مہینے کیلئے دیا اور کل کو واپس لے لے تو مقروض کو یہ حق حاصل ہے۔

تو قرض حنفیہ اور جمہور کے نزدیک کبھی **"مؤجل بالتأجیل"** نہیں ہوتا، کیونکہ وہ **"عقود حالۃ"** میں سے ہے، لہٰذا اس میں **"ضع وتعجل"** جائز ہوگا کیونکہ **"ضع وتعجل"** کی ممانعت دیونِ مؤجلہ کے ساتھ مخصوص ہے۔

ہنڈی "Bill Of Exchange" کی حقیقت

ہمارے زمانے میں ایک معاملہ ہوتا ہے وہ دیکھنے میں اس کے قریب نظر آتا ہے جس کو اُردو میں ہنڈی اور بٹہ لگانا کہتے ہیں یا آج کل کی اصطلاح میں بل آف ایکسچینج کہتے ہیں **"Bill Of Exchange"** اور آج کل بینکاری کے نظام میں اس کا بڑا رواج ہے، اس میں یہ ہوتا ہے کہ ایک تاجر کسی کو سامان بیچتا ہے اور سامان کو

بیچتے وقت یہ بات طے ہوئی کہ خریدار اس کی قیمت تین مہینے کے بعد ادا کرے گا تو گویا وہ بیع مؤجل ہوتی ہے اور اس کی بنا پر دین مؤجل ہو جاتا ہے تو خریدار اسی بات کو ثابت کرنے کیلئے ایک پرچہ لکھ دیتا ہے کہ میں نے اس کا فلاں مال خریدا ہے اور اس کی اتنی قیمت میرے ذمہ واجب ہوگئی اور میں تین مہینے کے بعد فلاں تاریخ کو یہ پیسہ ادا کروں گا۔

یہ جو پرچہ اس نے لکھ کر دیا ہے کہ اس سامان کی قیمت کے طور پر تین ماہ بعد میں اتنے پیسے ادا کروں گا یہ پرچہ ہنڈی کہلاتا ہے اور انگریزی میں اسی کو بل آف ایکسچینج بھی کہتے ہیں اور آج کل یہ اصطلاح زیادہ مشہور ہے۔

اب تاجر کے پاس وہ پرچہ آگیا جس کے ذریعے وہ تین مہینے کے بعد خریدار سے پیسوں کا مطالبہ کر سکتا ہے، لیکن اب تاجر یہ چاہتا ہے کہ میں تین مہینے تک انتظار نہ کروں بلکہ مجھے ابھی پیسے مل جائیں تو اس لئے وہ کسی بینک یا ساہوکار کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے پاس یہ ہنڈی ہے تین مہینے کے بعد یہ پختہ ہوگی اور اس کی ادائیگی ہونی ہے، یہ ہنڈی ایک ہزار روپے کی ہے تو تم ایسا کرو کہ یہ ہنڈی مجھ سے لو، میں اس کے اوپر تمہارا نام لکھ دیتا ہوں یعنی وہ دین تمہارے حوالے کر دیتا ہوں، تم جا کر وصول کر لینا اور مجھے اس وقت تم بجائے ایک ہزار روپے کے نوسواسی روپے دیدو، تو بینک اس ہنڈی کے پیچھے دستخط کر دیتا ہے اور نوسواسی روپے اس کو ابھی دیتا ہے اور جب تین مہینے پورے ہو جائیں گے تو پورے ایک ہزار اس خریدار سے وصول کرلیگا اس کو ہنڈی یا بٹہ لگانا کہتے ہیں۔

یہ معاملہ آج کل کے معاشی کاروبار میں پھیلا ہوا ہے خاص طور پر امپورٹ (**Import**) اور ایکسپورٹ (**Export**) کے کاروبار میں یعنی درآمد اور برآمد میں مثلاً ایک شخص نے دوسرے ملک میں سامان برآمد کیا اب وہاں سے پیسے آنے میں تین مہینے لگیں گے تو یہ سوچتا ہے کہ میں تین مہینے تک بیٹھ کر انتظار کرتا رہوں اس کے بجائے مجھے پیسے تھوڑے مل جائیں لیکن ابھی مل جائیں تا کہ میں اور سودا کر کے اتنی دیر میں اور سامان بھیج دوں گا اور نفع کما لوں گا۔

یہ اپنا بل ایکسچینج بینک کے پاس جا کر اس پر بٹہ لگوا لیتا ہے اور بینک وہاں سے پورے پیسے وصول کر لیتا ہے تو وہ بینک کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ بیس روپے اس کو مل جاتے ہیں اور اس برآمد کرنے والے کو یہ فائدہ ہوا کہ پیسے نقد مل گئے اس کو ''ہنڈی یا بٹہ لگانا'' یا ''بل آف ایکسچینج کو ڈسکاؤنٹ کرنا'' کہتے ہیں۔

بٹہ کا معاملہ درحقیقت ربوا ہے

یہ معاملہ اصلاً اگر دیکھا جائے تو یہ بھی ربوی معاملہ ہے اور دو طریقے سے اس کو تعبیر کر سکتے ہیں:

ایک طریقہ تعبیر کرنے کا یہ ہے کہ یہ جو ہنڈی ہے یہ اس دین سے عبارت ہے جو تاجر کیلئے خریدار کے ذمہ واجب ہے کیونکہ یہ اس دین کی رسید ہے تو اگر یہ بینک کو بیع کے طور پر دے رہا ہے تو یہ **"بیع الدین من**

غیر من علیه الدین ''ہو گیا یعنی دین کی بیع ایک ایسے شخص سے ہو گئی جس پر دین واجب نہیں تھا بلکہ مدیون کے علاوہ تیسرا شخص ہے۔

اول تو ''**بیع الدین من غیر علیه الدین**'' ویسے بھی حنفیہ کے نزدیک جائز نہیں، چاہے برابر سرابر ہی کیوں نہ ہو اور اگر برابر نہ ہو مثلاً دین ایک ہزار روپے کا ہو اور اس کو نوسواسّی روپے میں بیچا ہے تو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک ہزار روپے نوسواسی روپے کے بدلے بیچے اور یہ سود ہے اور ناجائز ہے۔[۱۳۹]

دوسری تعبیر اس کی یہ ہو سکتی ہے کہ بینک نے جو نوسواسّی روپے دیئے ہیں وہ اس کو بطور قرضہ کے دیا ہو اور بینک نے اپنے ایک ہزار روپے کے قرضے کا حوالہ کر دیا تو اس صورت میں قرضہ نوسواسی روپے دیئے لیکن تین مہینے بعد پورے ایک ہزار روپے وصول کر رہا ہے، لہٰذا یہ قرض مشروط فی الزیادۃ ہونے کی وجہ سے ربوا میں آ گیا۔ تو دونوں صورتیں ربوا میں داخل ہیں چاہے اس کو بیع کہو، چاہے اس کو قرض اور اس کا حوالہ کہو۔

ہنڈی کے جواز پر بعض ہم عصروں کا استدلال

بعض معاصر لوگوں نے اس کے جواز پر ''**ضعوا وتعجلوا**'' سے استدلال کیا ہے کیونکہ بنونضیر کی جلاوطنی کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے ''**ضعوا وتعجلوا**'' ارشاد فرمایا تھا اور اس کی وجہ سے بعض فقہاء حنابلہ جواز کے قائل ہیں، لہٰذا جب بعض فقہاء حنابلہ جواز کے قائل ہوتے ہیں تو اس میں اتنا تشدد کیوں کیا جائے۔ اور یہ بل آف ایکسچینج بھی ''**ضع وتعجل**'' ہے کہ اس میں بینک نے نوسواسّی روپے جلدی دیدیے اور اس کے بدلے قرض کا کچھ حصہ ساقط کر دیا۔

ہنڈی کو ''ضع وتعجّل'' پر قیاس کرنا یہ قیاس مع الفارق ہے

لیکن یہ استدلال اس لئے غلط ہے کہ اول تو ''**ضع وتعجل**'' کا معاملہ تو ویسے ہی ناجائز ہے جیسا کہ میں نے ابھی تفصیل ذکر کی لیکن اگر بعض حنابلہ کا موقف بھی اختیار کر لیا جائے جو جائز کہتے ہیں تو بھی یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ ''**ضع وتعجل**'' کا معاملہ براہ راست دائن اور مدیون میں ہو رہا ہے، مدیون کہہ رہا ہے ''**ضع یا دائن تعجل منی**'' کوئی تیسرا فریق بیچ میں داخل نہیں اور یہاں ایک تیسرا فریق بیچ میں داخل ہو گیا یعنی بینک اور اس سے کہا گیا کہ تم ہم سے یہ ہنڈی لے لو اور اس کے بدلے روپے ہمیں دیدو تو یہ ''**ضع و**

---

۱۳۹ ... عن ابن المسیب وابن عمر قالا من کان له حق علی رجل الی أجل معلوم فتعجل بعضه وترک له بعضه فهو ربا قال معمر ولا اعلم أحدا قبلنا الا وهو یکرهه، مصنف عبد الرزاق، باب الرجل یضع من حقه ویتعجل، رقم: ۱۴۳۵۴، ج:۸، ص:۷۱، دار النشر المکتب الاسلامی، بیروت، سنة النشر ۱۴۰۳ھ۔

تعجل" نہ ہوا بلکہ یہ **"بیع الدین من غیر من علیہ الدین"** ہو گیا اور وہ بھی زیادتی اور کمی کے ساتھ، لہٰذا اس کو اس معاملہ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، اس لئے یہ حرام ہے۔

سوال: اگر بینک اپنے ڈیپازیٹر سے ان کے مرے ہوئے قرضوں کے بارے میں کہے کہ آپ اگر ابھی ادائیگی کر دیں تو اتنی کمی کر دیں گے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب: اول تو سارے کے سارے قرضے معجّل ہوتے ہیں اور پھر یہ جو آپ کہہ رہے ہیں کہ قرضے مر گئے تو مر جانے کا یہی مطلب ہے کہ وہ حال ہو چکے تھے مگر ادائیگی نہیں کی گئی، جب وہ قرضے حال ہو گئے تو ان میں **"ضع و تعجل"** جائز ہو گیا۔

بل آف ایکسچینج کی متبادل صورت

سوال: بل آف ایکسچینج کے جواز کی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟

جواب: اس معاملے کے جواز کی صورت نہیں، البتہ اس کا متبادل طریقہ ایک ہو سکتا ہے وہ یہ کہ اس کی زیادہ ضرورت برآمد کنندگان کو پیش آتی ہے کیونکہ ان کو پیسے فوراً ملنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا کیونکہ سامان پہلے وہاں جائیگا یا اس کے کاغذات پہنچیں گے پھر بینک کے ذریعے وہاں سے رقم آئے گی اس میں کافی سارا وقت لگ جاتا ہے، اِدھر انہوں نے جو مال بھیجا ہے وہ کہیں سے اکٹھا کیا ہوا ہوتا ہے اور وہ بھی ادھار خریدا ہوتا ہے تو ان کی ادائیگیاں کرنی ہوتی ہیں، اس واسطے ان کو پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے

اصل طریقہ یہ ہے کہ تاجر جب سامان بھیجے تو اس وقت ہی بینک سے شرکت کا معاملہ کرلے کہ یہ جو سامان ہم بھیج رہے ہیں اس میں اتنا پیسہ تم لگاؤ اور اتنا پیسہ ہم لگا رہے ہیں اور یہ معلوم ہے کہ باہر کے آدمی نے یہ سامان منگوایا ہے، اتنی قیمت مقرر ہوئی ہے اور اس پر اتنی لاگت آئے گی اور اس پر اتنا نفع ہوگا، یہ سب باتیں پہلے سے معلوم ہیں جس کی وجہ سے اس میں خطرہ بھی نہیں ہے، لہٰذا یہ مشارکت کا معاملہ کرلیں اور اگر کہیں ناگزیر ضرورت ہو تو ایک طریقہ اور ہو سکتا ہے وہ یہ کہ بینک سے دو معاملے الگ الگ کئے جائیں۔

ایک معاملہ یہ کیا جائے کہ ہمارا قرضہ فلاں شخص کے ذمہ واجب ہے آپ وہ قرضہ ہمارے لئے وصول کرلیں ہم آپ کو وکیل بناتے ہیں اور اس وکالت کی کوئی اجرت اندازاً مقرر کرلی جائے اور پھر اس بینک سے کہا جائے کہ آپ ہمیں کچھ قرضہ بلا سود ابھی دے دیں اور اس قرضے کی توثیق کیلئے یہ ہنڈی رکھیں، مثلاً یہی پچھلی مثال کہ تاجر بینک سے کہے کہ آپ ہمارا قرضہ فلاں سے وصول کریں اس کے ہم آپ کو بیس روپے دینگے اور نو سو اسی روپے تم ہمیں ابھی قرضہ دے دو، چنانچہ وہ قرضہ لے لیا، اب بینک نے وہاں سے پورے ایک ہزار روپے وصول

کئے تو بیس روپے وہ اپنی اجرتِ وکالت کے بدلے میں رکھ لے گا اور نو سو اسی روپے کا قرض مقاصہ کرلے گا تو اس طرح ادائیگی ہوجائے گی۔

لیکن اس میں یہ ضروری ہے کہ وکالت کی جو اجرت مقرر کیجائے اس کا مدت سے کوئی تعلق نہ ہو، لیکن اس وقت جو بٹہ لگایا جاتا ہے اس میں بینک کے ساتھ بٹہ لگانے کی جو شرح مقرر کرتے ہیں وہ اس بات کو مدنظر رکھ کر کرتے ہیں کہ یہ ہنڈی کب واجب الاداہو رہی ہے، مثلاً تین مہینے بعد ادائیگی ہو رہی ہے تو کمیشن زیادہ لگائیں گے۔

غرض یہ کہ مدت کے حساب سے اس کا کمیشن بڑھتا رہتا ہے لیکن یہاں یہ نہیں ہوسکتا بلکہ وکالت کی ایک خاص اجرت مقرر کردے، پھر پیسے لے۔

(۷۲) باب کنس المسجد والتقاط الخراق والقذی والعیدان

مسجد میں جھاڑو دینا اور چیتھڑوں اور کوڑے اور لکڑیوں کے چن لینے کا بیان

یہ باب مسجد میں جھاڑو دینے کے بارے میں ہے۔ **"کنس"** کے معنی جھاڑو دینے کے آتے ہیں **"والتقاط الخرق"** کپڑے کی دھجیاں اٹھانا، **"والقذی"** اور کوڑا اٹھانا، **"والعیدان"** اور لکڑیاں اٹھانا، یعنی مسجد کی صفائی کے لئے ان چیزوں کو دور کرنا۔

۴۵۸ ـ حدثنا سلیم ان بن حرب قال: حدثنا حماد بن زید، عن ثابت عن ابی رافع، عن أبي هريرة أن رجلاً أسود أو مرأة سوداً كان يقم المسجد فمات فسأل النبي ﷺ عنه؟ فقالوا: مات. قال: (أفلا كنتم آذنتموني به؟ دلوني على قبره) أو قال: (على قبرها) فأتى قبره فصلى عليها. [أنظر: ۴۶۰، ۱۳۳۷] [۱۴۰]

اس میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ ایک سیاہ فام شخص یا ایک سیاہ فام عورت **"کان یقم المسجد"** وہ مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی، **"قم یقم"** کے معنی جھاڑو دینا اور **"قمامۃ"** کوڑے کو کہتے ہیں، تو وہ عورت کوڑا صاف کیا کرتی تھی، یہاں راوی کو شک ہے کہ یہ سیاہ فام عورت تھی، یا مرد تھا۔

لیکن دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرد نہیں تھا بلکہ عورت تھی، **"فمات"** ان کا انتقال ہوگیا تو نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ ان کا انتقال ہوگیا، تو آپ نے فرمایا کہ **"افلا**

---

[۱۴۰] وفي صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب الصلاة على القبر، رقم: ۱۵۸۸، وسنن أبي داؤد، كتاب الجنائز، باب الصلاة على القبر، رقم: ۲۷۸۸، وسنن ابن ماجه، كتاب ماجاء في الجنائز، باب ماجاء في الصلاة على القبر، رقم: ۱۵۱۶، ومسند أحمد، باقي مسند المكثرين، باب باقي المسند السابق، رقم: ۸۲۸۰، ۸۶۲۷.

اٰذنتمونی به ” کہ تم نے ان کے انتقال کا مجھے کیوں نہیں بتایا تا کہ میں ان کے اوپر نماز جنازہ پڑھتا؟ اب فرمایا “**دلونی علی قبره**” مجھے ان کی قبر پر لے جاؤ “**أو قال قبرها**” **فاتی قبره فصلی علیها**” تو قبر پر جا کر آپ نے نماز جنازہ پڑھی۔

حدیثِ باب سے شوافع کا استدلال

اس حدیث سے امام شافعی رحمہ اللہ اس بات پر استدلال فرماتے ہیں کہ جس شخص کو کسی کی نماز جنازہ نہ ملی ہو تو وہ قبر پر جا کر اس کی نماز جنازہ پڑھ سکتا ہے۔

مسلک حنفیہ

حنفیہ یہ فرماتے ہیں کہ یہ عمل صرف اس صورت میں جائز ہے جب کسی شخص کو بغیر جنازہ پڑھے دفن کر دیا ہو یا نماز جنازہ بغیر ولی کے پڑھ لی گئی ہو اور وہ بھی صرف اس وقت جائز ہے جب تک کہ یہ خیال ہو کہ میت پھولی پھٹی نہیں ہوگی، جس کی مقدار عام طور سے تین دن بیان کی جاتی ہے لیکن اگر نماز جنازہ پڑھی گئی ہو اور ولی بھی شریک ہو تو پھر کسی کے لئے قبر پر جا کر نماز پڑھنا جائز نہیں اور اگر پھول پھٹ گئی ہو تو ولی کے لئے بھی جائز نہیں۔

حدیثِ باب کا جواب

یہ حدیث جس سے امام شافعی رحمہ اللہ نے استدلال فرمایا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حضور اقدس ﷺ کی خصوصیت تھی، اس لئے کہ اول تو نبی کریم ﷺ کو ولایت عامہ حاصل تھی: “**النبی اولی بالمؤمنین من انفسهم**” تو آپ کا حق تمام اولیاء سے بالا تھا۔

اس واسطے آپ کے بغیر جب نماز جنازہ پڑھی گئی تو آپ نے جا کر دوبارہ نماز جنازہ پڑھی۔[۱۴۱]

دوسری وجہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے اس عمل کی تعلیل میں یہ ارشاد فرمایا جیسا کہ مسند اُحمد و مسلم کی روایت میں ہے “**ان هذه القبور مملوءة ظلمة علی أهلها وان الله عزوجل ینورها بصلاتی علیهم**”[۱۴۲]

---

[۱۴۱] والمسئلة فیها عندنا أنه لو دفن بدون الصلاة یصلی علی قبره مالم یتفسخ، وعیّنه المشائخ بثلاثة أیام وان لم یکن الولی حاضرا فله أن یصلی علیه وان کان قد صلی علیه مرة الخ

وأما فی حدیث الباب فادعی الحنفیة أن النبی صلی الله علیه وسلم کان ولیا فلا بأس باعادته،

والحاصل أن الصلاة بمحضر النبی لاتصح بدونه مالم توجد قرینة الاجازة من جانبه ... ولنا أیضاً أن نعدها من خصائصه صلی الله علیه وسلم، علی ماجاء فی روایة مسلم وأحمد فی مسنده، فیض الباری، ج: ۲، ص: ۵۸-۵۷.

[۱۴۲] صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب الصلاة علی القبر، رقم: ۱۵۸۸، ومسند أحمد، باقی مسند المکثرین رقم: ۸۶۷۲.

کہ یہ قبریں ظلمت سے بھری ہوتی ہیں تو اللہ ﷻ میری نماز کی برکت سے ان میں نور پیدا فرما دیتے ہیں تو یہ الفاظ بھی دلالت کرتے ہیں کہ یہ حضور اکرم ﷺ کی خصوصیت تھی کسی اور کو یہ خصوصیت حاصل نہیں، لہٰذا اس سے استدلال درست نہیں۔

(۷۳) باب تحريم تجارة الخمر في المسجد

مسجد میں شراب کی تجارت کو حرام کہنے کا بیان

۴۵۹ ــ حدثنا عبدان ، عن أبي حمزة ، عن الأعمش ، عن مسلم ، عن مسروق ، عن عائشة قالت : لما أنزلت الآيات في سورة البقرة في الربا خرج النبي ﷺ فقرأهن على الناس ثم حرم تجارة الخمر. [أنظر: ۲۰۸۴، ۲۲۲۶، ۴۵۴۰، ۴۵۴۱، ۴۵۴۲، ۴۵۴۳] ۱۴۳

ترجمۃ الباب سے مقصود بخاریؒ

اس باب کو قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ خمر اگرچہ بڑی مستقذر چیز ہے اور اس کا ذکر بھی شنیع ہے، لیکن اس کی حرمت بیان کرنے کے لئے مسجد میں اس کا ذکر کرنا مسجد کی حرمت کے منافی نہیں، مثلاً اگر کوئی خمر، زنا اور ربا کا نام لے، لیکن ان کا نام لینا حرمت اور شرعی حکم بیان کرنے کے لئے ہو تو یہ مسجد کے آداب کے خلاف نہیں۔

(۷۴) باب الخدم للمسجد

مسجد کے لئے خادم مقرر کرنے کا بیان

وقال ابن عباس ﴿نذرت لک ما في بطني محرراً﴾ [آل عمران: ۳۵] للمسجد يخدمه.

۴۶۰ - حدثنا أحمد بن واقد قال: حدثنا حماد، عن ثابت، عن أبي رافع، عن

---

۱۴۳ وفي صحيح مسلم ، كتاب المساقاة ، باب تحريم بيع الخمر ، رقم: ۲۹۵۸ ، وسنن النسائي ، كتاب البيوع ، باب بيع الخمر ، رقم: ۴۵۸۶ ، وسنن أبي داؤد ، كتاب البيوع ، باب في ثمن الخمر والميتة ، رقم: ۳۰۲۸ ، وسنن ابن ماجة ، كتاب الاشربة ، باب رقم: ۳۳۷۳ ، ومسند أحمد ، باقي مسند الأنصار ، باب ، رقم: ۲۳۰۶۳ ، ۲۳۵۵۱ ، ۲۳۸۱۲ ، ۲۴۳۵۶ ، ۲۴۴۰۰ ، ۲۵۱۷۱ ، وسنن الدارمي ، كتاب البيوع ، باب التجارة في الخمر ، رقم: ۲۴۵۶ .

أبي هريرة أن امراة أو رجلا كان يقم المسجد. ولا أراده إلا امرأة. فذكر حديث النبي ﷺ أنه صلى علی قبره. [راجع: ۴۵۸]

تکرارِ روایت سے مقصود بخاریؒ

یہ روایت دوبارہ لائے ہیں اور اس پر جو باب قائم کیا ہے وہ یہ کہ مسجد کے لئے خادم مقرر کرنا۔ پہلے تو تھا ''مسجد میں صرف جھاڑو دینا'' اب یہ ہے کہ ''باقاعدہ کسی آدمی کو مسجد کا خادم مقرر کرنا'' تو یہ جائز ہے خواہ وہ خادم رضا کارانہ طور پر ہو یا اجرت پر خدمت سرانجام دیتا ہو۔

وقال ابن عباس ﴿نذرت لک مافي بطني محرراً﴾ [آل عمران: ۳۵] للمسجد يخدمه.

اسی کے ذیل میں حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کی تفسیر تعلیقاً نقل کی ہے **''نذرت لک مافی بطنی محرّراً''** امرأۃ عمران نے یہ نظر مانی تھی کہ اے اللہ! جو کچھ میرے پیٹ میں ہے میں نذر مانتی ہوں وہ محرر ہے یعنی اس کو میں نے آزاد کر دیا ہے، ہر کام سے فارغ کر دیا ہے اور میں اس کو مسجد کی خدمت کیلئے وقف کرتی ہوں، تو معلوم ہوا کہ باقاعدہ خدمت کیلئے مقرر کرنا جائز ہے اگرچہ اولاد کی نذر ان کی شریعت میں جائز تھی ہماری شریعت میں نہیں ہے، اگر کوئی باپ یا ماں یہ نظر مانے کہ میرا جو بچہ پیدا ہوگا اس کو میں مسجد کی خدمت کے لئے وقف کروں گی یا کروں گا تو اولاد پر اس نذر کی تعمیل واجب نہیں، اس لئے کہ یہ دوسروں کے اوپر نذر ہے جو ہماری شریعت میں جائز نہیں اور نافذ بھی نہیں، ہاں ان کی شریعت میں تھی۔

(۷۵) باب الأسير أو الغريم يربط في المسجد

قیدی اور قرض دار کے مسجد میں باندھے جانے کا بیان

۴۶۱ ـ حدثنا إسحاق بن إبراهيم قال: أخبرنا روح ومحمد بن جعفر، عن شعبة، عن محمد بن زياد، عن أبي هريرة عن النبي ﷺ قال: (إن عفريتا من الجن تفلت علي البارحة. أو قال: كلمة نحوها. ليقطع علي الصلاة، فأمكنني الله منه، فأردت أن أربطه إلى سارية من سواري المسجد، حتى تصبحوا وتنظروا اليه كلكم، فذكرت قول أخي سليمان ﴿رب غفرلي وهب لى ملكا لاينبغي لأحد من بعدي﴾ [ص: ۳۵] قال روح: فردة خاسئاً. [أنظر: ۱۲۱۰، ۳۲۸۴، ۳۴۲۳، ۴۸۰۸] [۱۴۴]

---

[۱۴۴] وفي صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب جواز لعن الشيطان في أثناء الصلاة والتعوذ منه وجواز، رقم: ۸۴۲، ومسند أحمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند أبي هريرة، رقم: ۷۶۲۸.

قیدی کومسجد میں باندھنے کے جواز پر استدلالِ بخاریؒ

یہ باب کسی قیدی یا مقروض کو مسجد میں باندھنے سے متعلق ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ فرمانا چاہتے ہیں کہ کسی قیدی یا مقروض کو مسجد میں باندھنا جائز ہے۔

جواز پر اس کی دلیل حضرت ابو ہریرہ ؓ کی روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا **"إن عفريتا من الجن تفلت علي البارحة"** کہ جنات میں سے یک عفریت گزشتہ رات اچانک سامنے آ گیا، **"تفلت"** کے معنی ہیں **"فلتة"** یعنی اچانک آجانا **"او كلمة نحوها"** **"تفلت"** کے ہم معنی کوئی اور کلمہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ وہ رات کو میرے سامنے آ گیا **"ليقطع علي الصلوة"** تا کہ میری نماز میں خلل واقع کرے اور میرا خشوع فوت کرے **"فامكنني الله منه"** تو اللہ ﷻ نے مجھے اس پر قابو عطا فرمایا **"وا ردت أن أربطه إلى سارية من سواري المسجد"** اور میرا ارادہ ہوا کہ مسجد کے کسی ستون کے ساتھ اس کو باندھوں **"حتى تصبحوا وتنظروا اليه كلكم"** تا کہ صبح کو اٹھ کے تم سب اس کا تماشا دیکھو **"فذكرت قول اخي سليمان** ؑ**"** تو بعد میں مجھے اپنے بھائی سلیمان ؑ کی دعا یاد آ گئی، انہوں نے یہ دعا مانگی تھی **"رب اغفرلي وهب لي ملكا لاينبغي لأحد من بعدي"** کہ اے اللہ! ایسی سلطنت مجھے عطا فرما دیجئے، جو میرے بعد کسی کو حاصل نہ ہو، تو ان کو جنات پر چرندوں اور جانوروں پر سلطنت حاصل ہوئی، تو انہوں نے یہ دعا مانگی تھی کہ یہ خصوصیت میری ہی رہے بعد میں کسی کو نہ ملے۔

چونکہ مجھے یہ دعا یاد آ گئی اس واسطے میں نے اس کو چھوڑ دیا یہ سوچا کہ اگر باندھوں گا تو حضرت سلیمان ؑ کی اس خواہش کا احترام نہیں ہوگا **"قال روح: فرده خاسئا"** تو نبی کریم ﷺ نے اس کو ذلیل کر کے لوٹا دیا اور باندھا نہیں، اگرچہ آپ باندھ لیتے تب بھی حضرت سلیمان ؑ کی دعا پر کچھ اثر نہ پڑتا کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ سارے چرند، پرند، جنات و شیاطین سب پر حکومت ہو اور اگر اکا دکا کوئی فرد حضور اکرم ﷺ نے باندھا تو کوئی کلی مخالفت اس کی لازم نہیں آتی تھی، لیکن ظاہری طور پر اس کے منافی ایک عمل ہوتا تو حضور اکرم ﷺ نے ایک پیغمبر کی خواہش کا احترام فرمایا تا کہ اس کی ظاہری مخالفت بھی لازم نہ آئے۔

بہر حال حدیث شریف میں آپ نے ارادہ ظاہر فرمایا کہ میرا ارادہ ہوا کہ میں مسجد کے ستون سے اس کو باندھوں، تو امام بخاری رحمہ اللہ اس سے استدلال فرما رہے ہیں کہ قیدی کو مسجد میں باندھنا جائز ہے۔

جنات کو تابع اور مسخر کرنے کا حکم

سوال: آج کل عامل حضرات جو جنات کو قابو کر لیتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: جنات کو تابع کرنا، مسخر کرنا یہ بالکل حرام ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی آزاد آدمی کو اپنا غلام بنائے۔

(۷٦) باب الاغتسال إذا أسلم، وربط الأ سير أيضا في المسجد

جب اسلام لے آئے تو غسل کرنے اور مسجد میں قیدی کے باندھنے کا بیان

"وكان شريع يأمر الغريم أن يحبس إلى سارية المسجد".

۴٦۲ ـ حدثنا عبد الله بن يوسف قال: حدثنا الليث قال: حدثنا سعيد بن أبي سعيد، أنه سمع أبا هريرة قال: بعث النبي ﷺ خيلا قبل نجد، فجاءت برجل من بني حنيفة، يقال له: ثمامة بن أثال، فربطوه بسارية من سواري المسجد، فخرج إليه النبي ﷺ فقال: (أطلقوا ثمامة) فانطلق إلى نخل قريب من المسجد فاغتسل، ثم دخل المسجد فقال: أشهد أن لا إله إلا الله و أن محمداً رسول الله. [أنظر: ۴٦۹، ۲۴۲۲، ۲۴۲۳، ۴۳۷۲] ۱۴۵

ترجمۃ الباب سے مقصود بخاریؒ

اس روایت میں حضرت ثمامۃ ابن اثال ﷺ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ جس وقت صحابہ کرام ﷺ کا ایک لشکر نجد گیا تھا اور وہاں سے بنوحنیفہ کے ایک صاحب ثمامہ بن اثال ﷺ کو گرفتار کر کے لائے تو ان کو لاکر مسجد میں باندھ دیا، بعد میں وہ صاحب مسلمان ہوگئے اور مسلمان ہونے سے پہلے غسل کیا پھر بعد میں مسلمان ہوئے اور بعد میں اسلام کے حق میں بڑے اچھے ثابت ہوئے۔

یہ واقعہ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہاں اختصار کے ساتھ اور مغازی میں تفصیل کے ساتھ نقل فرمایا ہے۔

اس پر باب قائم فرمایا **"باب الاغتسال اذا اسلم و ربط الا سیر یضاً فی المسجد"** اصل باب تو پہلے قائم فرمایا اس باب کو دوبارہ زیادتی کے ساتھ قائم کررہے ہیں اور وجہ زیادتی یہ ہے کہ ایک تو یہ بتلانا مقصود ہے کہ پیچھے جو حدیث لائے تھے وہ **"عفریت من الجن"** سے متعلق تھی اور یہاں جو واقعہ بیان کررہے ہیں وہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں ایک انسان کے ساتھ پیش آیا کہ ان کو باندھا گیا۔

---

۱۴۵ وفي صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب ربط الأسير وحبسه وجواز المن عليه، رقم: ۳۳۱۰، وسنن النسائي، كتاب الطهارة، باب تقديم غسل الكافر اذا أراد أن يسلم، رقم: ۱۸۹، وكتاب المساجد، باب ربط الأسير بسارية المسجد، رقم: ۷۰۵، وسنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب في الأسير يوثق، رقم: ۲۳۰۴، ومسند أحمد، باقي مسند المكثرين، باب باقي المسند السابق، رقم: ۹۴۵۷.

قبول اسلام کے وقت غسل کے حکم کی حیثیت

دوسرا یہ کہ اس کے ضمن میں یہ مسئلہ بھی بیان فرمادیا کہ اسلام لاتے وقت غسل کرنے کا کیا حکم ہے؟ کیونکہ اس میں حضرت ثمامہ بن اثال نے اسلام لانے سے پہلے غسل کیا تھا، اس کی طرف اشارہ کردیا اور چونکہ اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ اسلام لاتے وقت غسل کرنا واجب ہے کہ نہیں؟ چونکہ کوئی حتمی حکم نہیں اس لئے باب میں بھی کوئی حتمی مسئلہ بیان نہیں کیا بلکہ مصدر لائے یعنی **"باب الاغتسال اذااسلم"**۔

ظاہریہ کا مسلک

اہل ظاہر کا قول یہ ہے کہ ہر صورت میں جب بھی اسلام لائے غسل واجب ہے۔[۱۴۶]

اور یہی قول بعض حنابلہ اور بعض مالکیہ کا بھی ہے۔[۱۴۷]

حنفیہ کا مسلک

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں اغتسال کسی بھی حالت میں واجب نہیں، خواہ وہ جنابت ہی کی حالت میں اسلام لایا ہو یعنی کفر کی حالت میں غسل کرکے پھر اسلام لایا ہو تب بھی غسل واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔[۱۴۸]

شوافع کا مسلک

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ شخص جنبی تھا تب تو واجب ہے اور اگر جنابت لاحق نہ ہوئی ہو تو مستحب ہے، حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ اگر جنابت بھی لاحق ہوئی اور کبھی نہ کبھی نہالیا ہو تو یہ کافی ہے غسل میں نیت حنفیہ کے ہاں شرط نہیں، تو چاہے نیت غسل جنابت کی ہو یا نہ ہو، جنابت کا ازالہ ہوگیا، اب اسلام کے بعد اس پر غسل واجب نہیں۔[۱۴۹]

---

[۱۴۶] فلو اغتسل الكافر قبل أن يسلم .... لم يجز هم ذلک من غسل الجنابة وعليهم اعادة الغسل لأنهم بخروج الجنابة منهم صاروا جنبا ووجب الغسل به ، المحلى، ج: ۲، ص: ۴، دار الآفاق الجديدة ، بيروت.

[۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹] مسألة قال واذا أسلم الكافر وجملته أن الكافر اذا أسلم وجب عليه الغسل سواء كان أصليا أو مرتداً اغتسل قبل اسلامه أو لم يغتسل وجد منه في زمن كفره ماىوجب الغسل أو لم يوجد وهذا مذهب مالک وأبي ثور وابن المنذر وقال أبوبكر يستحب الغسل وليس بواجب الا أن يكون قد وجدت منه جنابة زمن كفره فعليه الغسل اذا أسلم سواء كان قد اغتسل في زمن كفره أو لم يغتسل وهذا مذهب الشافعي . ولم يوجب عليه أبوحنيفة الغسل بحال لأن العدد الكثير والجم الغفير اسلموا فلو أمر كل من اسلم بالغسل لنقل نقلا متواتراً أو ظاهراً ولأن النبي صلى الله عليه وسلم لما بعث معاذا الى اليمن قال ادعهم الى شهاد .... على فقرائهم ولو كان الغسل واجباً لأمرهم به لأنه أول واجبات الاسلام ، المغني ج: ۱، ص: ۱۳۲، وسبل السلام ، ج: ۱ ، ص: ۸۷، وعمدة القاری ج: ۳، ص: ۵۱۶، تفسير القرطبي ج: ۲، ص: ۱۴۵.

باب کے اندر "**وربط الاسیر ایضاً فی المسجد**" میں "**ایضاً**" کا لفظ بڑھا کر اشارہ کر دیا کہ اوپر والی بات دوبارہ ایک نئے عنوان اور نئے طریقے سے آرہی ہے، "**وقال شریح یأمر الغریم ان یحبس الی ساریة المسجد**".

قاضی شریح رحمہ اللہ کہتے ہیں بعض اوقات مدیون کو یہ حکم دیتے تھے کہ اس کو مسجد کے ستون سے باندھ دیا جائے، تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسجد کے ستون کے ساتھ باندھنا جائز ہے اور اس میں پھر حضرت ابوہریرہ ﷛ کی حدیث نقل کی ہے کہ "**بعث النبی ﷺ خیلا الی قبل نجد فجاء ت برجل من بنی حنیفة یقال ....وان محمد رسول اللہ**".

(۷۷) باب الخيمة في المسجد للمرضى وغيرهم

مسجد میں بیماروں وغیرہ کے لئے خیمہ کھڑا کرنے کا بیان

۴۶۳ ـ حدثنا زكريا بن يحيي قال: حدثنا عبد الله بن نمير قال: حدثنا هشام، عن أبيه، عن عائشة قالت: أصيب سعد يوم الخندق في الأكحل، فضرب النبي ﷺ خيمة في المسجد ليعده من قريب، فلم يرعهم . وفي المسجد خيمة من بني غفار . إلا الدم يسيل إليهم ، فقالوا: يا أهل الخيمة! ما هذا الذي يأتينا من قبلكم؟ فإذا سعد يغذو جرحه دما، فمات فيها. [أنظر: ۲۸۱۳، ۳۹۰۱، ۴۱۱۷، ۴۱۲۲] [۱۵۰]

مسجد میں بیماروں کیلئے خیمہ لگانے پر امام بخاریؒ کا استدلال

مسجد میں بیماروں وغیرہ کے لئے کوئی خیمہ لگا دینا، امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو جائز قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں یہ حدیث روایت کی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ مسجد کے اندر مختلف افعال انجام دینے کے سلسلے میں الگ الگ ابواب قائم کر رہے ہیں اور اس بارے میں بڑے توسع سے کام لے رہے ہیں کہ مسجد میں یہ کام بھی کیا جا سکتا ہے، یہ کام بھی کیا جا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ، تو اس میں ایک یہ بھی ہے کہ مسجد کے اندر بیماروں کے لئے کوئی خیمہ لگا دینا۔ اور اس کے جواز پر حضرت سعد بن معاذ ﷛ کے واقعہ سے استدلال کیا ہے۔

---

[۱۵۰] وفي صحيح مسلم ، كتاب الجهاد والسير ، باب جواز قتال من نقض العهد وجواز انزال اهل الحصن، رقم: ۳۳۱۶ وسنن أبي داؤد ، كتاب الجنائز ، باب في العيادة مراراً، رقم: ۲۶۹۵ ، ومسند أحمد باقي مسند الأنصار ، باب حديث السيدة عائشة ، رقم: ۲۳۱۵۹.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ذکر ہے کہ''

''اصیبَ سعد یوم الخندق فی الأ کُحَل''.

حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے مراد حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ہیں ان کو خندق کے دن اکحل میں زخم لگا، **''اکحل''** یہ ذراع کے بیچ میں ہاتھ کے اندر جو رگ ہوتی ہے اس کو کہتے ہیں اور اس کو ''رگ حیات'' بھی کہا جاتا ہے، اس کا تعلق براہ راست قلب سے ہوتا ہے تو اس کے اندر اگر وہ رگ پھٹ جائے تو اس سے خون جاری ہوتا ہے اور خون جاری ہونے کے نتیجے میں بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ یہ مہلک ثابت ہوتی ہے تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے ذراع کی رگ پھٹ گئی تھی اور یہاں پر زخم لگ گیا تھا، مشہور واقعہ ہے جو غزوۂ احزاب اور بنو قریظہ کے سلسلے میں مغازی میں گزر چکے ہیں **''فَضَرَبَ النبيّ ﷺ خیمَةً فی المسجد''** تو نبی کریم ﷺ نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے لئے مسجد میں ایک خیمہ لگا دیا، **''لیعودہ مِن قریبٍ''** تاکہ ان کی عیادت کرسکیں۔

''فلم یرعھم'' یہ جو بیچ میں جملہ ہے۔

''وفی المسجد خیمة من بنی غفارٍ'' یہ جملہ معترضہ ہے۔

اس کو پہلے پڑھ لو کہ مسجد میں بنی غفار قبیلے کے لوگوں کا بھی ایک اور خیمہ لگا ہوا تھا **''فلم یرعھم الا الدّمُ''** پس ان بنی غفار کے لوگوں کو نہیں ڈرایا مگر خون نے کہ **''یسیل الیھم''** جو ان کی طرف بہہ کر آ رہا تھا۔ دراصل حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے خون نکلا اور خون نکل کر بہا اور بہہ کر برابر والے خیمے کے اندر پہنچنے لگا **فقالوا** تو بنی غفار نے کہا کہ **''یا اھل الخیمة ماھذا الذی یأتینا مِنْ قبلکم''** اے خیمے والو! آپ کے خیمے کی طرف سے یہ کیا چیز آرہی ہے؟ **''فاذا سعد یغذو جرحہ دماً''** کہ اچانک انہوں نے دیکھا کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ہیں اور ان کا خون زخم سے بہہ رہا ہے **''فمات فیھا''** حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا اسی زخم کی وجہ سے انتقال ہوا۔

استدلالِ بخاری رحمہ اللہ

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ اس واقعہ سے استدلال کر رہے ہیں کہ مسجد میں بیماروں کے لئے خیمے بھی لگائے جاسکتے ہیں بلکہ بنو غفار کا بھی خیمہ لگا ہوا تھا وہ لوگ بیمار نہیں تھے ان کے لئے بھی خیمہ لگا ہوا تھا تو اس سے مسجد میں خیمہ لگانے کی اجازت نکالنا چاہتے ہیں۔

خون کی طہارت پر استدلال

بعض حضرات نے اس سے خون کی طہارت پر استدلال کیا ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا جو زخم تھا اس سے

خون بہہ رہا تھا اس کے باوجود ان کا خیمہ مسجد میں لگایا گیا، جس کا معنی یہ ہے کہ مسجد میں خون بہنے کو گوارا کیا گیا، اگر نجس ہوتا تو اس کو مسجد میں گوارا نہ کیا جاتا۔

دونوں استدلال تام نہیں

یہ دونوں استدلال درحقیقت اس حدیث سے نہیں ہیں، اس واسطے کہ استدلال اس بات پر موقوف ہے کہ مسجد سے مراد مسجد نبوی ہو یا کوئی مسجد اصطلاحی ہو لیکن زیادہ ظاہر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہاں مسجد سے مراد مسجد نبوی نہیں ہے اور نہ کوئی باقاعدہ مسجد اصطلاحی مراد ہے بلکہ یہ وہ جگہ مراد ہے جو بنو قریظہ کے غزوہ کے وقت حضرت محمد ﷺ نے وہاں نماز پڑھنے کے لئے بنائی تھی۔

غزوہ احزاب کے متصل بعد حضرت جبرئیل امین علیہ السلام تشریف لائے اور انہوں نے کہا کہ آپ نے تو ہتھیار اتار لئے ہیں، لیکن ہم نے نہیں اتارے، پہلے جا کر بنو قریظہ پر حملہ کرنا۔ لہٰذا جا کر بنو قریظہ کا محاصرہ کیا اور محاصرہ بہت دنوں تک جاری رہا، اسی دوران حضرت سعد ﷺ کو یہ زخم بھی لگا تھا اور یہ بنو قریظہ کے قلعہ کا محاصرہ جو مسجد نبوی سے چھ میل کے فاصلے پر واقع ہے، تو اس واسطے یہ سمجھنا کہ نبی کریم ﷺ مسجد نبوی میں تھے اور وہاں خیمہ لگوایا تھا یہ اس قصے کے سیاق کے منافی ہے۔

یہ بات بہت بعید ہے کہ حضور ﷺ یہاں پر قیام فرمائیں اور جا کر چھ میل دور مسجد نبوی میں خیمہ لگوائیں، لہٰذا ظاہر یہ ہے کہ مسجد سے مراد یہاں پر وہ جگہ ہے جو آپ نے بنو قریظہ کے محاصرے کے وقت بنالی تھی، لہٰذا اس سے نہ اس پر استدلال ہوسکتا ہے کہ مسجد نبوی میں یا مسجد اصطلاحی میں بیماروں کے واسطے خیمہ لگانا جائز ہے یعنی اس کو ہسپتال میں تبدیل کر دیا جائے اور نہ اس پر استدلال ہوسکتا ہے کہ خون پاک ہے۔ خون کے پاک ہونے کا قائل تو اصل میں کوئی نہیں سوائے بعض شاذ اقوال کے، لیکن مسجد میں خیمہ لگانے کے جو قائل ہیں وہ بھی اس سے استدلال نہیں کر سکتے اور اگر کبھی ایسا ہوا بھی ہو تو وہ بھی جہاد وغیرہ کے موقع پر بہت ہی ضرورت شدیدہ کے وقت ایسا کر لیا جائے تو اس کی گنجائش ہے لیکن اس میں اتنا توسّع کرنا کہ مسجد کے حقیقی مقاصد فوت ہو جائیں اور پیچھے رہ جائیں اور دوسرے کاموں کے لئے اس کو استعمال کیا جانے لگے، یہ مناسب نہیں۔

(۷۸) باب إدخال البعير في المسجد للعلة

ضروت کی بنا پر مسجد میں اونٹ لے جانے کا بیان

وقال ابن عباس: طاف النبي ﷺ على بعير.

۴۶۴ ـ حدثنا عبد الله بن يوسف قال: أخبرنا مالك، عن محمد بن عبدالرحمٰن ابن

نوفل،عن عروة، عن زينب بنت أبي سلمة،عن أم سلمة قالت:شكوت إلى رسول الله ﷺ أني أشتكي ،قال: (طوفي من وراء الناس وأنت راكبة) فطفت ورسول الله ﷺ يصلي إلى جنب البيت،يقرأ بالطور وكتاب مسطور.[أنظر: ۱۶۱۹، ۱۶۲۶، ۱۶۳۳، ۴۸۵۳] ۱۵۱

اونٹ کومسجد میں داخل کرنے کے جواز پر امام بخاریؒ کا استدلال

کسی حاجت کی وجہ سے اونٹ کومسجد میں داخل کرنا یہ بھی گویا امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک جائز ہے کہ اونٹ کوکسی ضرورت کے تحت داخل کرلیا جائے۔

اوراس میں حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کی روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے "بعیر" (اونٹ) پرسوار ہوکر طواف کیااور یہ بات دوسری روایت سے ثابت ہے یہاں تعلیقاً نقل کیا ہے۔

اسی بارے میں حدیث ام سلمہ رضی اللہ عنہا بھی ہے کہ اسی حجۃ الوداع کے موقع پر وہ فرماتی ہیں کہ "**شكوتُ الى رسول الله ﷺ انى أشتكى**" میں نے حضوراقدس ﷺ سے شکایت کی کہ مجھے کچھ تکلیف ہے، بیماری ہے "**قال طوفى من وراء الناس وانت راكبة**" تو آپ نے فرمایا کہ تم لوگوں کے پیچھے سے سوار کر طواف کر لینا۔تو وہ کہتی ہیں کہ میں نے اس حالت میں طواف کیا کہ رسول اللہ ﷺ بیت اللہ کے برابر میں نماز پڑھ رہے تھے "**و الطور و كتاب مسطور**" کی تلاوت فرمارہے تھےتو یہاں بھی ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو اپنے "**بعير**" (اونٹ) پرسوار ہوکر طواف کرنے کی اجازت دی۔اس سے معلوم ہوا کہ "**بعير**" (اونٹ) کومسجد میں داخل کیا جاسکتا ہے۔

"بول مايؤكل لحمه" کی طہارت پراستدلال

اس سے ان حضرات نے بھی استدلال کیا ہے کہ جو "**بول مايؤكل لحمه**" کوطاہر کہتے ہیں کیونکہ جب "**بعير**" کوداخل کیا جائے گا تو پتہ نہیں کہ کس وقت اس کوقضاء حاجت کی ضرورت پیش آجائے،اس کی پہلے سے کوئی پیشگوئی نہیں کی جاسکتی،تو اس سے معلوم ہوا کہ اس کے ارواث کومسجد میں گوارا کیا گیا۔

---

۱۵۱ وفي صحيح مسلم، كتاب الحج، باب جواز الطواف على بعير وغيره واستلام الحجر بمحجن، رقم: ۲۲۳۸، وسنن النسائي، كتاب مناسك الحج، باب كيف طواف المريض، رقم: ۲۸۷۲، وسنن أبي داؤد، كتاب المناسك، باب الطواف الواجب، رقم: ۱۶۰۲، وسنن ابن ماجه، كتاب المناسك، باب المريض يطوف راكباً، رقم: ۲۹۵۲، ومسند أحمد، باقي مسند الأنصار، باب حديث أم سلمه زوج النبي، رقم: ۲۵۲۸۰، ۲۵۳۸۹، وموطأ مالك، كتاب الحج، باب جامع الطواف رقم: ۷۲۸.

دونوں مسئلوں پر استدلال تام نہیں

اس کا جواب علمائے کرام نے جو **"بول مایؤکل لحمہ"** کو طاہر نہیں کہتے جیسے حنفیہ اور شافعیہ، تو انہوں نے جواب یہ دیا ہے کہ حضرت رسول کریم ﷺ کا جو **"بعیر"** تھا وہ سدھا ہوا تھا یعنی **"مدراب"** تھا **"معلّم"** تھا تو آپ کو یہ بات یقین سے معلوم ہوگئی کہ یہ مسجد میں ایسی حرکت نہیں کریگا۔

اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے جو **"بعیر"** استعمال کیا وہ بھی رسول اللہ ﷺ کا ہی ہوگا تو اس واسطے اس بات کا کوئی یقین نہیں ہے کہ یہ ارواث وغیرہ اس کے اندر داخل ہوں گی۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی توجیہ

حضرت انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے ایک بات اور بھی ارشاد فرمائی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ یہ بات ثابت نہیں ہے کہ یہ مطاف حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں مسجد کا حصہ تھا۔ حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں صورت حال یہ تھی کہ بیت اللہ کی تعمیر کے باہر مطاف تھا اور مطاف کے چاروں طرف مکانات تھے، مکانات کے دروازے مطاف کے اندر کھلتے تھے، لوگ مکان سے اتر کر سیدھے مطاف میں آجایا کرتے تھے، تو یہ بات ثابت نہیں ہے کہ وہ مطاف بھی مسجد کا حصہ تھا بلکہ عین ممکن ہے کہ مسجد صرف بیت اللہ ہو اور مطاف مسجد سے خارج ہو۔

اگر یہ بات ثابت ہو تو اس پر مسجد اصطلاحی کے احکام تھے ہی نہیں، لیکن نہ اس کا مسجد ہونا ثابت ہے اور نہ مسجد نہ ہونا ثابت ہے بلکہ قرآن کریم میں مسجد الحرام کا جو لفظ آیا ہے اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مسجد الحرام بیت اللہ سے کوئی مختلف چیز ہے، بیت اللہ مسجد الحرام کے اندر واقع ہے۔

اس سے ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مطاف مسجد کا حصہ تھا بہر حال حضور اقدس ﷺ کا اپنے **"بعیر"** کو اندر لے جانا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر آدمی اپنا اونٹ لے کر مسجد میں پہنچ جائے اور وہ وہاں پر قضاء حاجت بھی کیا کرے اس واسطے اس سے استدلال پوری طرح تام نہیں۔[۱۵۲]

(۷۹) باب

۴۶۵ ۔ حدثنا محمد بن المثنى قال : حدثنا معاذ بن هشام قال: حدثني أبي، عن قتادة قال: حدثنا أنس أن رجلين من أصحاب النبي ﷺ خرجا من عند النبي ﷺ في ليلة مظلمة، ومعهما مثل المصباحين بها حين يضيئان بين أيديهما، فلما افترقا صار مع

---

۱۵۲ فيض الباري، ج:۲، ص:۶۰.

كل واحد منهما واحد، حتى أتى أهله. [أنظر: ۳۶۳۹، ۳۸۰۵] ۱۵۳

حضور اکرم ﷺ کا معجزہ

یہ حضرت انس کی حدیث ہے وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں سے دو حضرات آپ کے پاس سے اٹھ گئے ان میں ایک کا نام عباد بن بشر تھا اور دوسرے کا نام اسید بن حضیر تھا اور یہ اندھیری رات تھی حضور ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے کچھ دیر ہوگئی تو وہاں سے اٹھ کر گئے "**ومعهما مثل المصباحين**" اور ان کے ساتھ دو چراغوں جیسی چیز جلتی رہیں، رات اگرچہ اندھیری تھی لیکن جب وہ دونوں آپ ﷺ کے پاس سے اٹھ کر چلے گئے تو آپ ﷺ کے معجزے کے طور پر دو چراغ ان کے ساتھ چلتے رہے۔

"**يضيئان بين ايديهما**" جو ان کے سامنے روشنی پھیلا رہے تھے "**فلما افترقا**" آگے جا کر جب ان کے راستے جدا ہوگئے "**صار مع كل واحد منهما واحد**" ہر ایک کے ساتھ ایک ایک چراغ الگ چلا گیا "**حتى أتى أهله**" یہاں تک کہ وہ اپنے گھر والوں کے پاس پہنچ گئے یہ درحقیقت نبی کریم ﷺ کا معجزہ تھا کہ آپ کے پاس سے اٹھ کر جب جانے لگے تو رات تاریک تھی تو ان کو اللہ ﷻ نے نور عطا فرما دیا جس کے ذریعے وہ راستہ دیکھتے ہوئے چلے گئے یہاں تک کہ وہ اپنے گھر پہنچ گئے۔

بلا ترجمۃ والے باب کے بارے میں اقوال

یہ حدیث امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کی ہے اور اس پر جو باب قائم کیا ہے اس کے ساتھ کوئی ترجمہ نہیں ہے اور یہ آپ شروع میں پڑھ کر آئے ہیں کہ بعض اوقات امام بخاری رحمہ اللہ باب قائم کرتے ہیں اور اُس کے اوپر کوئی ترجمہ نہیں لگاتے اس کے بارے میں شراح کے مختلف اقوال ہیں:

بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہ طلبہ کو تمرین کرانا چاہتے ہیں کہ اب تم خود اس پر ترجمۃ الباب لگاؤ۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کا تعلق کچھ نہ کچھ ماقبل سے یا مابعد سے ہوتا ہے لیکن امام بخاری رحمہ اللہ اس کے اوپر چاہتے ہیں کہ کوئی ترجمۃ الباب قائم کریں اور سوچ رہے ہوتے ہیں کہ کوئی ترجمۃ الباب قائم کریں مگر موقع نہیں ملا اور ترجمۃ الباب قائم نہیں کر سکے اور اسی حالت میں وفات ہوگئی، اس واسطے یہ باب اس طرح رہ گیا۔

اس "باب" سے امام بخاریؒ کا مقصود

بہر حال عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ جب ایسا باب جو بغیر ترجمہ کے آئے تو اس کا تعلق ماقبل سے یا مابعد سے ہوتا ہے، یہ حدیث یہاں پر جو آئی ہے اس کا بظاہر ماقبل و مابعد سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا ہے۔ کیونکہ پہلے بھی

---

۱۵۳ وفي مسند أحمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند أنس بن مالك، رقم: ۱۱۹۵۵، ۱۳۳۶۷.

اور بعد بھی، مسجد کے احکام چل رہے ہیں کہ مسجد میں کیا کام کیا جاسکتا ہے اور کیا نہیں کیا جا سکتا، اب یہاں سے اتنی بات مذکور ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے پاس سے اٹھ کر گئے تو ان کو اللہ ﷻ نے نور عطا فرما دیا اور اس نور کی روشنی میں وہ اپنے گھر تک پہنچ گئے، لہٰذا کوئی تعلق ماقبل و مابعد سے نظر نہیں آتا، تو شراح حضرات نے تعلق ڈھونڈنے کے لئے بڑی لمبی چوڑی تاویلات اور توجیہات تلاش کی ہیں۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ درحقیقت مراد یہ ہے کہ مسجد کی طرف چل کر آنا یا مسجد سے واپس جانا اگر آدمی اندھیرے میں چل کر آئے تو اللہ ﷻ آخرت میں نور عطا فرمائیں گے لیکن بعض اوقات دنیا کے اندر بھی نور عطا کر دیا جاتا ہے تو گویا درحقیقت تاریکی میں مسجد کی طرف آنے یا مسجد کی طرف جانے کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے۔ چنانچہ دوسری حدیث میں آیا کہ **"بشر المشائین فی الظلم بالنور التام یوم القیامة"** کہ جو لوگ اندھیروں میں چل کر مسجد کی طرف آتے ہیں، ان کو نور تام کی خوشخبری دے دو، اس حدیث کی طرف اشارہ ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ مقصد اس کا یہ ہے کہ یہ جو صحابی تھے یہ جب حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں آئے اور اندھیرے میں واپس گئے، تو اندھیرے میں واپس جانا اسی وقت ممکن ہے جبکہ عشاء کے بعد کچھ دیر حضور ﷺ کے پاس رہے ہوں اور حضور اقدس ﷺ سے باتیں کرتے رہے ہوں گے اور بات کرنے کے نتیجہ میں دیر سے باہر نکلے، تو بیان کرنا یہ مقصود ہے کہ نماز کے بعد اگر تھوڑی دیر کیلئے بیٹھ جائیں اور اس میں کوئی باتیں کر لی جائیں، خاص طور پر وہ باتیں جو دین سے متعلق ہوں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

گویہ ترجمۃ الباب ہونا چاہئے تھا کہ **"باب الکلام فی المسجد"** کہ مسجد کے اندر گفتگو کرنا بعد از صلوٰۃ تو یہ نہ صرف جائز ہے بلکہ حضور اقدس ﷺ سے کلام کے نتیجہ میں اللہ ﷻ نے اس کو دنیا کے اندر ایک معمولی نور بھی عطا فرمایا کہ ان کو نور حاصل ہوا اور اپنے گھر میں آرام سے پہنچ گئے، یہ دو توجیہات ہیں جو زیادہ قریب معلوم ہوتی ہیں اور باقی جتنی توجیہات کی گئی ہیں وہ دور از کار ہیں۔

حضرت مولانا محمد یحییٰ رحمہ اللہ کی توجیہ

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ میرے والد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمہ اللہ ایک اور بات نقل کرتے ہیں کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ جو صحابی تھے جن کو چراغ کا نور نظر آیا وہ کچھ اس طرح نظر آیا کہ جیسے ایک عصا ہو اور اس کے اوپر اونٹ کی شکل کی کوئی چیز بنی ہوئی ہے اور اسی سے نور نکل رہا ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ یہ بعض روایات میں آیا ہے تو یہاں مناسبت اس بات کو پہلے باب سے اس طرح ہے کہ پچھلے

باب میں "ادخال البعیر فی المسجد" کہا تھا یہاں بعیر کی شکل کی ایک چیز مسجد کے اندر سے ان کے ساتھ رہی اور یہاں تک کہ باہر بھی رہی تو اس طرح اس کی ماقبل سے مناسبت ہے۔

شیخ الحدیث صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت مجھے تلاش کرنے سے کہیں ملی نہیں اگر ہو تو مناسبت بہت واضح اور ظاہر ہو جائے گی لیکن نہیں ملی۔

(۸۰) باب الخوخة والممر في المسجد

مسجد میں کھڑکی اور راستہ رکھنے کا بیان

۴۶۶ ـ حدثنا محمد بن سنان قال: حدثنا فليح قال: حدثنا أبو النضر، عن عبيد ابن حنين، عن بسر بن سعيد، عن أبي سعيد الخدري قال: خطب النبي ﷺ فقال: (إن الله سبحانه خير عبداً بين الدنيا وبين ما عنده، فاختار ما عند الله) فبكى أبو بكر ؓ، فقلت في نفسي: ما يبكي هذا الشيخ؟ إن يكن الله خير عبدا بين الدنيا وبين ما عنده، فاختار ما عند الله، فكان رسول الله ﷺ هو العبد، وكان أبو بكر أعلمنا، فقال: (يا أبابكر! لا تبک، إن أمن الناس علي في صحبته و ماله أبوبكر، و لو كنت متخذا خليلا من أمتي لاتخذت أبابكر، ولكن أخوة الإسلام و مودته، لا يبقين في المسجد باب إلا سد إلا باب أبي بكر). [أنظر: ۳۶۵۴، ۳۹۰۴] [۱۵۴]

۴۶۷ ـ حدثنا عبدالله بن محمد الجعفي قال: حدثنا وهب بن جرير قال: حدثنا أبي قال: سمعت يعلى بن حكيم، عن عكرمة، عن ابن عباس قال: خرج رسول الله ﷺ في مرضه الذي مات فيه عاصبا رأسه بخرقة، فقعد على المنبر، فحمد الله وأثنى عليه. ثم قال: (إنه ليس من الناس أحد أمن علي في نفسه وماله من أبي بكر بن أبي قحافة، ولو كنت متخذا من الناس خليلا لاتخذت أبا بكر خليلا، ولكن خلة الإسلام أفضل، سدوا عني كل خوخة في هذا المسجد غير خوخة أبي بكر). [أنظر: ۳۶۵۶، ۳۶۵۷، ۶۷۳۸] [۱۵۵]

---

[۱۵۴] وفي صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل أبي بكر الصديق، رقم: ۴۳۹۰، وسنن الترمذي، كتاب المناقب عن رسول الله، باب كتاب المناقب عن رسول الله، رقم: ۳۵۹۳، ومسند أحمد، باقي مسند المكثرين، رقم: ۱۰۷۱۰، وسنن الدارمي، كتاب المقدمة، باب مسند أبي سعيد الخدري، رقم: ۷۷.

[۱۵۵] وفي مسند أحمد، ومن مسند بني هاشم، باب بداية مسند عبد الله بن العباس، رقم: ۲۳۰۶.

مسجد کی طرف روشن دان یا چھوٹا دروازہ کھولنے کا حکم

مسجد کے اندر خوخہ کھولنا کوئی گذرگاہ کھولنا جائز ہے یا نہیں؟

خوخہ اصل میں روشن دان کو کہتے ہیں اور اگر کوئی کسی گھر میں کوئی چھوٹا سا دروازہ کھول دے جیسے کھڑکی نما دروازے ہوتے ہیں تو اس کو بھی ''خوخہ'' کہا جاتا ہے، تو مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کا گھر مسجد کے متصل واقع ہے اور وہ اپنے گھر میں کوئی خوخہ کھول دے جس کے ذریعے وہ مسجد میں اتر جایا کرے تو ایسا کرنا جائز ہے یہ بیان کرنا مقصود ہے۔

لفظ ''ممر'' کی تحقیق اور اس سے مقصود بخاریؒ

اور ''**ممر**'' کا جو لفظ ہے اس کے بارے میں بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ مصدر میمی ہے ''گزرنے'' کے معنی میں آتے ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسجد کے اندر گزرنا بھی جائز ہے لیکن اگر اس کو مصدر میمی قرار دیا جائے تو یہ تکرار ہوگا کیونکہ پہلے یہ باب گزر گیا ہے کہ ''**باب المرور فی المسجد**'' لہٰذا صحیح یہ ہے کہ مصدر میمی نہیں بلکہ اسم ظرف ہے یعنی جس طرح خوخہ کھولنا جائز ہے اسی طرح مسجد کے اندر گزرگاہ بنانا بھی جائز ہے، امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود بھی یہی ہے اور اس میں حدیث وہ روایت کی ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خوخہ کے علاوہ تمام خوخے بند کر دیئے جائیں۔

صورت حال یہ تھی کہ مسجد نبوی کے برابر میں جس جس کے مکانات تھے تو وہاں کے لوگوں نے اپنی سہولت کے خاطر اپنے گھروں کے اندر خوخے چھوڑ رکھے تھے تاکہ جب نماز کا وقت ہو فوراً جلدی سے خوخے کے ذریعے مسجد کے اندر اتر جائیں، تو آنحضرت ﷺ نے تمام خوخے بند کرنے کا حکم دیا، خوخے بند کرنے کا یہ حکم اس وجہ سے نہیں کہ خوخہ کھولنا کوئی ناجائز تھا، اگر ناجائز ہوتا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا خوخہ کیوں باقی رکھا جاتا، لہٰذا وجہ یہ نہیں تھی کہ خوخہ کھولنا ناجائز ہے بلکہ وجہ یہ تھی کہ مصلحت کے خلاف تھا کہ لوگوں کے اپنے اپنے گھروں میں خوخے کھولے ہوئے ہیں اور اس کے نتیجے میں ہر آدمی گھر سے اتر کر چلا آرہا ہے۔

دوسرا یہ کہ اس گھر سے اترنے کے نتیجے میں یہ بھی ہوتا تھا کہ گھر کا جو کوڑا کرکٹ ہے وہ بھی بعض اوقات مسجد میں گر جاتا ہوگا تو اس واسطے آپ ﷺ نے مصلحت کی خاطر سارے خوخے بند کرا دیئے صرف حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا خوخہ ان کی خصوصیت بتانے کے لئے برقرار رکھا ہے۔

خلافت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف لطیف اشارہ

علماء فرماتے ہیں کہ درحقیقت اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ میرے بعد امامت ان کو حاصل ہوگی، کیونکہ جب ان کو امامت کبریٰ حاصل ہوگی تو امامت صغریٰ بھی ان کو حاصل ہوگی یہی نماز پڑھائینگے، نماز پڑھانے کے لئے ان کو ضرورت ہوگی کہ یہ سہولت کے ساتھ آجایا کریں تو اس واسطے یہ ایک لطیف اشارہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت اور ان کی امامت کی طرف تھا تو اس لئے برقرار رکھا۔

حضرت امام بخاری رحمہ اللہ اس سے استدلال کررہے ہیں کہ یہ نہ سمجھو کہ اوروں کے خوخے جو بند کئے گئے تھے اس کی یہ وجہ نہیں کہ ایسا کرنا شرعاً ناجائز تھا اگر ایسا ہوتا تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا خوخہ نہ باقی رکھا جاتا، لیکن آپ ﷺ نے وہ خوخہ باقی رکھا کیونکہ حضور ﷺ نے فرمادیا تھا کہ باقی سارے خوخے بند کردئے جائیں البتہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا خوخہ برقرار رکھا جائے اور اس امت کے عشق کی بات ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وفات بھی ہوگئی پھر اس خوخے کی ضرورت بھی باقی نہ رہی لیکن امت نے خوخے کو برقرار رکھا کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ یہ خوخہ کھلا رہے گا یہاں تک کہ جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا گھر خود مسجد کے اندر آگیا اور مسجد میں شامل ہوگیا جو اس کے برابر دیوار تھی اس میں بھی ایک خوخہ برقرار رکھا کہ حضور اقدس ﷺ نے اس خوخے کو برقرار رکھنے کا حکم دیا تھا، لہٰذا اس کو بھی برقرار رکھا وہ بھی مسجد میں شامل ہوگیا تو اور پیچھے دیوار چلی گئی، وہاں تک بھی خوخہ برقرار رکھا یہاں تک کہ آج بھی موجود ہے، یہاں پر اب بھی وہ ایک روشن دان ہے حالانکہ بہت دور چلا گیا لیکن اب بھی روشن دان موجود ہے اور لکھا ہوا ہے **"هذه خوخة سيدنا صديق اكبر رضی اللہ عنہ "** تو یہ عقیدت کی بات ہے کہ حضور ﷺ کے اس ارشاد کے احترام میں دور تک گئے اور اس خوخے کو برقرار رکھا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی فراست

روایت نقل کرتے ہوئے امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ خطبے میں فرمایا **" ان الله سبحانه خيّر عبدًا بين الدنيا وبين ماعنده "** کہ اللہ جل جلالہ نے ایک بندے کو اختیار دیا ہے دنیا کے درمیان اور اس عالم کے درمیان جو اللہ جل جلالہ کے پاس ہیں یعنی یہ ایک واقعے کے طور پر ایک بات ذکر کی ہے کہ اللہ جل جلالہ نے ایک بندے کو اختیار دیا کہ چاہو تو دنیا کو اختیار کرو اور چاہو تو آخرت میں جو نعمتیں ہیں ان کو اختیار کرو" **فاختار ما عند الله** " تو اس بندے نے اللہ جل جلالہ کے پاس نعمتوں کو اختیار کیا، یہ ایک واقعہ بیان فرمایا **"فبكىٰ أبو بكر** رضی اللہ عنہ **"** تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ بات سن کر رو پڑے۔ **"فقلت في نفسي"** تو ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں یہ بات یاد آئی کہ یہ بڑے

میاں کیوں رو رہے ہیں کیا چیز ہے جو شیخ کو رُلا رہی ہے "**ان یکن اللہ خیّر عبدًا بین الدنیا وبین ماعنده**" اگر اللہ جل جلالہ نے کسی بندے کو اختیار دے دیا دنیا اور ماعندہ کے درمیان اور اس نے ماعنداللہ کو اختیار کیا تو اس میں رونے کی کیا بات ہے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ "**فکان رسول اللہ ﷺ ہو العبد**" وہ بندہ جس کو اختیار دیا گیا تھا وہ خود رسول اللہ تھے۔

اختیار دینے کے معنی یہ تھے کہ پوچھا گیا تھا کہ بھائی اب مزید دنیا میں رہنا چاہتے ہو یا واپس ہمارے پاس آنا چاہتے ہو، تو حضور ﷺ نے واپس جانے کا اختیار کیا تھا تو اس واسطے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ رو رہے تھے کہ اب حضور ﷺ کے جانے کا وقت قریب آ گیا "**وکان أبوبکر رضی اللہ عنہ أعلم الناس**" اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہم میں سب سے زیادہ جاننے والے تھے تو وہ اس بات کو سنتے ہی یہ محسوس کر گئے کہ حضور ﷺ عنقریب دنیا سے تشریف لے جانے والے ہیں۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی منقبت

"**وقال یا أبابکر لاتبکی**" تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے ابوبکر! روؤ نہیں "**ان امنّ الناس علی فی صحبتہ ومالہ أبوبکر**" اور ان کے تسلی کے لئے فرمایا کہ میں اس شخص کے اوپر سب سے زیادہ بھروسہ کرتا ہوں جس کو سب سے زیادہ امین سمجھتا ہوں اپنے بارے میں ان کی جان کے مقابلے میں اور ان کے مال کے مقابلے میں بھی وہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کی جان و مال دونوں کے اعتبار سے سب سے زیادہ بھروسہ مجھے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر ہے "**ولو کنت متخذ خلیلامن أمتی لاتخذت أبابکر**" اگر میں امت میں سے کسی شخص کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا۔ تو اس کا مطلب ہوا کہ اب تک کسی کو خلیل بنایا نہیں۔ خلیل کے معنی یہاں دوست کے نہیں ہے خلیل کا معنی ہے "**من ینقطع الیہ الرحل**" وہ ایسی ذات یا شخص کہ آدمی اس کی طرف منقطع ہو جائے، منقطع ہونے کے معنی یہ ہیں کہ سارے ماسوا سے اپنے ذہن کو اور اپنی دلچسپیوں کو فارغ کر کے اپنی ساری دلچسپیوں کا مرکز اس کو بنا لے اس کو خلیل کہتے ہیں۔

تو حضور اقدس ﷺ ماسوا سے منقطع ہو کر کسی اور کی طرف متوجہ نہیں ہوئے، اس وجہ سے فرمایا کہ میں نے کسی کو خلیل نہیں بنایا، اگر بناتا تو ابوبکر کو بناتا اور فرمایا "**ولکن اخوۃ فی الاسلام ومودتہ**"، خلیل تو نہیں لیکن میری اخوت اور موّدت محبت ان سے اتنی ہے کہ اور کسی کے ساتھ نہیں۔

"**لایبقینّ فی المسجد باب الاسدّ الاباب أبی بکر**" مسجد میں کوئی دروازہ باقی نہ چھوڑا جائے یعنی اس کو بند کر دیا جائے مگر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دروازے کو بند نہ کیا جائے۔

روافض کا حضرت علی کی خلافت بلا فصل پر استدلال

ایک اور روایت جو متعدد کتب حدیث میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ سب دروازے بند کردئے جائیں سوائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دروازے کے۔ اس میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دروازے کے کھلے رکھنے کا حکم ہے۔[۱۵۶]

اس سے روافض نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلا فصل پر استدلال کیا ہے۔[۱۵۷]

روافض کے استدلال کا جواب

بہت سے حضرات نے یہ فرمایا کہ اس کی سند کمزور ہے بلکہ بعض حضرات نے یہ دعویٰ بھی کردیا کہ درحقیقت وہ روایت روافض کی گھڑی ہوئی ہے کہ انہوں نے جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی یہ منقبت سنی اور یہ دیکھا کہ اہل سنت اس سے ان کی خلافت پر استدلال کررہے ہیں، انہوں نے کہا کہ لاؤ ایسی بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف بھی منسوب کردو تو انہوں نے گھڑ کر یہ حدیث بنادی۔[۱۵۸]

تحقیقی جواب

لیکن محقق محدثین کا کہنا یہ ہے کہ جن میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ بھی داخل ہیں کہ اس روایت کو موضوع کہنا درست نہیں، ابن جوزی رحمہ اللہ نے موضوع کہہ دیا ہے۔[۱۵۹]

---

۱۵۶ المعجم الکبیر ج:۱۲، ص:۹۹، دارالنشر مکتبة العلوم والحکم، مدینة النشر الموصل، وسنةالنشر ۱۴۰۴ ھ۔ وسنن الترمذی رقم: ۳۷۳۲، ج:۵، ص:۶۴۱، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ومیزان الاعتدال فی نقد الرجال، رقم: ۵۶۱۶، ج:۵، ص:۸۲. دار المکتب العلمیة، بیروت، سنة النشر ۱۹۹۵ء.

۱۵۷ واعله ببعض من تکلم فیه من رواته ولیس ذلک بقادح لما ذکرت من کثرة الطرق واعله أیضاً بأنه مخالف للاحادیث الصحیحة الثابتة فی باب أبی بکر وزعم أنه من وضع الرافضة قالوا به الحدیث الصحیح فی باب أبی بکر انتهی.وأخطأ شنیعا فانه سلک فی ذلک رد الاحادیث الصحیحة بتوهمه المعارضة، مع أن الجمع بین القصتین ممکن، فتح الباری، ج:۷، ص:۱۵.

۱۵۸ قال الترمذی: قال هذا حدیث غریب لانعرفه عن شعبة بهذا الاسناد الا من هذا الوجه، ج:۵، ص:۶۴۱ وقال الذهبی فی "میزان الاعتدال فی نقد الرجال" غریب منکر والله اعلم، رقم: ۵۶۱۶، ج:۵، ص:۸۲، وعمدة القاری ج:۳، ص:۵۲۷.

۱۵۹ اخرجه أحمد واسناده حسن وأخرجه النسائی من طریق العلاء بن عرار بمهملات قال "فقلت لابن عمر: أخبرنی عن علی وعثمان۔ فذکر الحدیث وفیه .وأما علی فلا تسأل عنه أحداً وانظر الی منزلته من رسول الله صلی الله علیه وسلم، قدسد أبوابنا فی المسجد وأقر بابه، ورجاله رجال الصحیح الا العلاء وقد وثقه یحییٰ بن معین وغیره وهذا الاحادیث یقوی بعضها بعضاً وکل طریق منها صالح للاحتجاج فضلا عن مجموعها وقد أورد ابن الجوزی هذا الحدیث فی الموضوعات الخ، کذا ذکره الحافظ فی الفتح ج:۷، ص:۱۵، (۳)باب قول النبی صلی الله علیه وسلم سد و الابواب الا باب أبی بکر.

لیکن کہا جاتا ہے کہ ابن جوزی کا تشدد مشہور ہے، اس کو موضوع کہنا درست نہیں۔ اس واسطے کہ بعض طرق اگر چہ ضعیف ہیں لیکن بعض طرق حسن بھی ہیں اور اتنے طرق سے وہ حدیث مروی ہے کہ **"یقوّی بعضها بعضاً"** اس واسطے اس کو ضعیف کہنا اور رد کرنا صحیح نہیں۔

لیکن حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ شروع میں لوگوں نے مسجد کے ارد گرد خوخہ نہیں بلکہ دروازے بنائے ہوتے تھے۔ لوگوں نے با قاعدہ اپنے گھروں سے دروازے کھولے ہوئے تھے، حضور اقدس ﷺ نے اس موقع پر یہ فرمایا کہ تمام دروازہ جو با قاعدہ کھولے ہوئے ہیں وہ بند کر دئے جائیں سوائے حضرت علی ؓ کے، کیونکہ ان کا گھر یعنی آپ ﷺ کا گھر مسجد میں ہے تو وہ دروازہ با قاعدہ باقی رکھا لیکن اس وقت دروازے تو بند کر دئے گئے تھے البتہ خوخہ باقی رکھے گئے تھے تو پھر خوخوں کو بھی بند کرنے کا حکم دیدیا گیا تھا تو اس میں صرف حضرت ابو بکر صدیق ؓ کا خوخہ کھلا رکھنے کا حکم فرمایا گیا تھا۔ یہ حدیثیں مختلف زمانوں سے متعلق ہیں، لہٰذا دونوں میں تطبیق اور جمع کرنا ممکن ہے۔ [۱۶۰]

(۸۱) باب الأبواب والغلق للكعبة والمساجد

کعبہ اور مسجدوں میں دروازے رکھنا اور ان کا بند کر لینا

مساجد کو تالا لگانا جائز ہے

یہ باب قائم کیا کہ کعبہ کے لئے دروازہ بنانا اور غلق بند کرنے والی چیز خواہ تالا ہو یا کوئی اور چیز جس سے کسی چیز کو بند کیا جائے۔ تو بتلانا یہ مقصود ہے کہ کعبہ یا مسجدوں کے اوپر کنڈی لگا کر ان کو بند کر دینا یہ جائز ہے، اس لئے یہ باب قائم کیا۔

ایک شبہے کا جواب

شبہ ہو سکتا تھا کہ مسجد وہ تو ایک ایسی جگہ ہے جو تمام مسلمانوں کے لئے مشترک عبادت گاہ ہے، لہٰذا اس کو بند کیا جائے تو کہیں اس وعید میں داخل نہ ہو جائے کہ **" ومن أظلم ممن منع مساجد الله ان يذكر الخ"** تو اس شبہ کے ازالے کے لئے امام بخاری رحمہ اللہ نے باب بھی قائم فرمایا کہ دروازہ بھی لگا سکتے ہیں اور کنڈی وغیرہ بھی لگا سکتے ہیں۔

---

[۱۶۰] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: فيض الباري، ج: ۲، ص: ۶۳، ۲۶ وفتح الباري ج: ۷، ص: ۱۵۔

قال أبوعبدالله: وقال لي عبدالله بن محمد: حدثنا سفيان عن ابن جريج قال: قال لي ابن أبي مليكة: ياعبدالملك الو رأيت مساجد ابن عباس وأبوابها:

کہتے ہیں کہ "**قال أبو عبدالله وقال عبدالله بن محمد حدثنا........ وأبوابها ابن أبی مليكه**" ابن أبی مليكه نے ابن جریج (عبدالملک) سے کہا کہ اے عبدالملک! کاش کہ تم ابن عباس کی مسجدیں اوران کے دروازے دیکھتے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ طائف میں جا کر مقیم ہو گئے تھے اور وہاں جا کر انہوں نے مسجدیں تعمیر کیں تو کہا کہ اے عبدالملک! اگر تم دیکھتے تو تمہیں نظر آتا کہ انہوں نے وہاں کیسی اچھی مسجد بنائی ہے اور کیسا اچھا دروازہ بنالیا ہے۔ تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی بنائی ہوئی مسجد کی تعریف کرنا مقصود ہے اور یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ انہوں نے اس میں دروازے بنائے ہیں تا کہ اس کو چوروں وغیرہ سے حفاظت کے لئے رات کو بند کر دیا جائے۔ اس سے ترجمۃ الباب ثابت کیا کہ بند کرنا جائز ہے اور آگے حدیث روایت کی ہے۔

۴۶۸ ۔ حدثنا ابو النعمان قتيبة بن سعيد قالا : حدثنا حماد بن زيد ، عن أيوب ، عن نافع ، عن ابن عمر أنّ النبی ﷺ قدم مكة فدعا عثمان بن طلحة ، ففتح الباب ، فدخل النبی ﷺ وبلال ، وأسامة بن زيد ، وعثمان بن طلحة ، ثم أغلق الباب ، فلبث فيه ساعة ، ثم خرجوا قال ابن عمر : فبدرت فسألت بلالا، فقال: صلى فيه ، فقلت : فی أیّ؟ قال: بين الأسطوانتين ، قال ابن عمر : فذهب علیّ أن أساله كم صلّی. [راجع :۳۹۷]

یہ حدیث پہلے بھی گزری ہے۔ اس میں مقصود یہ ہے کہ عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ نے چابی منگوائی اور منگوا کر پھر واپس انہی کو دیدی، اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اس میں تالا لگانا جائز ہے۔

(۸۲) باب دخول المشرك المسجد

مسجد میں مشرک داخل ہونے کا بیان

۴۶۹ ۔ حدثنا قتيبة قال: حدثنا الليث، عن سعيد بن أبي سعيد، أنه سمع أبا هريرة يقول : بعث رسول الله ﷺ خيلا قبل نجد، فجاءت برجل من بني حنيفة، يقال له: ثمامة بن أثال، فربطوه بسارية من سواري المسجد. [راجع: ۴۶۲]

مشرک کے مسجد میں داخل ہونے میں اختلافِ فقہاء

یہ حدیث ثمامہ بن اثال کی ہے۔ اس سے یہ ثابت کیا ہے کہ مشرک کا مسجد میں داخل ہونا جائز ہے،

کیونکہ کئی دن تک ثمامہ بن اثال کو مسجد کے ستون سے باندھ کر رکھا گیا جبکہ وہ کافر تھے، اسلام بعد میں لائے۔ تو اس سے مسجد میں کافر کے داخلے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ حنفیہ کا یہی مسلک ہے۔ اس باب میں البتہ دوسرے فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔[۱۶۱]

مالکیہ اور حنابلہ کا مسلک

مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک کافر اور مشرک کا کسی بھی مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں اور **"یـایهـا الـذین امنوا انما المشرکون نجس الخ"** سے استدلال کیا ہے۔

آیت میں دو جملے ہیں اور یہ علت ہیں اور **"ولا یقربوا المسجد بعد عامهم الخ"** یہ اس کا معلول ہے کیونکہ نجس ہے، لہٰذا مسجد حرام میں داخل نہ ہوں ایک علت اور دوسرے میں مسجد حرام میں داخلے کی ممانعت کی گئی ہے ان بزرگوں نے دونوں باتوں پر عمل کیا کہ مسجد حرام میں داخلہ جائز نہیں اور چونکہ علت یہ بیان کی گئی ہے مشرکین کا نجس ہونا اور یہ علت ہر مسجد میں پائی جاتی ہے، لہٰذا ہر مسجد کے اندر داخلہ منع ہے۔[۱۶۲]

شوافع کا مسلک

امام شافعی رحمہ اللہ ﷺ فرماتے ہیں دوسری مسجدوں کے اندر داخلہ ممنوع نہیں جائز ہے، لیکن مسجد حرام میں داخلہ ناجائز ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے **"فلا یقربوا المسجد الحرام"** والے جملے پر تو عمل کیا لیکن تعلیل میں تأویل کی وہ یہ کہ مشرکین نجس تو ہیں، لیکن نجاست سے نجاستِ حقیقیہ مراد نہیں ہے، بلکہ نجاستِ اعتقادیہ مراد ہے تو نجاستِ اعتقادیہ چونکہ نجاستِ حقیقیہ نہیں ہے، لہٰذا اس کا اثر مسجد حرام تک محدود رہے گا کہ وہاں داخل نہیں ہوسکتا۔[۱۶۳]

حنفیہ کا مسلک

حنفیہ کہتے ہیں کہ ہر مسجد میں مشرک کا داخلہ جائز ہے خواہ مسجد حرام ہو یا اس کے علاوہ کوئی اور مسجد ہو۔

حنفیہ دونوں میں تأویل کرتے ہیں **"انـمـا الـمشـرکون نجس"** اس میں تأویل کرتے ہیں کہ نجاستِ اعتقادیہ مراد ہے اور **"لا یقربوا المسجد الحرام"** میں قرب سے مراد مطلق داخلہ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد طواف ہے یعنی طواف نہ کرے۔

اور ایسا ہی ہے جیسا کہ حائضہ عورتوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ **"فلا تقربوهن حتی یطهرن"** کہ

جب تک پاک نہ ہو جائیں اس وقت تک قریب بھی مت جاؤ۔ تو وہاں پر مراد یہ نہیں ہے کہ اس سے ایک فٹ فاصلہ پر کھڑا ہونا منع ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ اس سے استمتاع، جماع وغیرہ کے ذریعہ قربت جائز نہیں۔

جس کی دلیل یہ ہے کہ جب آیت نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے اس کے اعلان کرنے کا حکم حضرت صدیق اکبر ؓ کو اور حضرت علی ؓ کو دیا اور ارشاد فرمایا کہ **"ولا یحجّ بعد عام"** کہ آج کے سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے تو اس میں قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر کر دی۔

اور ظاہری عموم پر حضرات شافعیہ بھی عمل پیرا نہیں ہے، اس واسطے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ مسجد حرام کے اندر داخل ہونا منع ہے لیکن مسجد حرام کے قریب جانا ان کے نزدیک بھی جائز ہے۔ تو پتہ چلا کہ اس کے حقیقی معنی مراد نہیں ہے۔

استدلال ان روایات سے کرتے ہیں جن میں کافروں کا داخلہ مذکور ہے جیسے یہاں پر ثمامہ بن اثال کی حدیث ہے۔ تو امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب کے ذریعہ بظاہر حنفیہ کے مؤقف کی تائید کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد میں مشرک کا داخلہ جائز ہے۔[164]

(۸۳) باب رفع الصوت في المسجد

مسجد میں آواز بلند کرنے کا بیان

۴۷۰ ـ حدثنا علي بن عبد الله قال: حدثنا يحيي بن سعيد قال: حدثنا الجعيد بن عبد الرحمن قال: حدثني يزيد بن خصيفة، عن السائب بن يزيد قال: كنت قائما في المسجد، فحصبني رجل، فنظرت فإذا عمر بن الخطاب، فقال: اذهب فأتني بهذين، فجئته بهما، فقال: من أنتما؟ أو من أين أنتما؟ قالا: من أهل الطائف، قال: لو كنتما من أهل البلد لأوجعتكما، ترفعان أصواتكما في مسجد رسول الله ﷺ.[165]

مسجد میں آوازیں بلند کرنا جائز نہیں

"حدثني يزيد بن خصيفة، عن السائب بن يزيد قال: كنت قائما في

[161، 162، 163، 164] هذا باب في بيان جواز دخول المشرك المسجد، وفيه خلاف، فعندنا يجوز مطلقا، وعند المالكية والمزني المنع مطلقاً، وعند الشافعية التفصيل بين المسجد الحرام وغيره، ولنا حديث الباب، عمدة القارى ج:۳، ص: ۵۳۱، وفيض البارى ج:۲، ص: ۶۳، وفتح البارى ج: ۱، ص: ۵۶۰.

[165] انفرد به البخارى.

المسجد، فحصبني رجل"

حضرت سائب بن یزید فرماتے ہیں کہ میں مسجد میں کھڑا ہوا تھا کہ مجھے پیچھے سے کسی نے کنکری ماری جب میں نے ادھر دیکھا تو پیچھے حضرت عمرؓ تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ان دونوں آدمیوں کو ذرا بلا کر لاؤ، پس میں دونوں کو بلا کر لایا۔

آپ نے ان دونوں سے پوچھا **"من أنتما"** کس قبیلہ سے ہو، یا یہ پوچھا **"من أين أنتما"** کہاں سے ہو، تو انہوں نے کہا کہ طائف سے ہیں۔

"قال لو كنتما من أهل البلد لأوجعتكما" اگر تم اسی شہر کے ہوتے تو تمہاری پٹائی کر دیتا۔

"ترفعان اصواتكما في مسجد رسول الله ﷺ" کہ حضور اقدس ﷺ کی مسجد مبارک میں تم آوازیں بلند کرتے ہو؟

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسجد میں آواز بلند کرنا یہ جائز نہیں ہے اور حضرت عمرؓ نے اس پر پٹائی کرنے کی دھمکی دی۔

۴۷۱ ـ حدثنا أحمد قال : حدثنا ابن وهب قال : أخبرني يونس بن يزيد ، عن ابن شهاب قال : حدثني عبد الله بن كعب بن مالک ، أن كعب بن مالک أخبره أنه تقاضى ابن أبي حدرد دينا كان له عليه ، في عهد رسول الله ﷺ في المسجد ، فارتفعت أصواتهما حتى سمعها رسول الله ﷺ و هو في بيته ، فخرج إليهما رسول الله ﷺ حتى كشف سجف حجرته ، و نادى (كعب بن مالک !) قال : لبيک يارسول الله ! فأشار بيده أن ضع الشطر من دينک ، قال كعب : قد فعلت يارسول الله قال رسول الله ﷺ : (قم فاقضه) .[راجع:۴۵۷]

یہ حدیث ماقبل میں **"باب التقاضي والملازمة في المسجد"** میں مکمل فقہی مباحث کے ساتھ گزر چکی ہے وہاں ضرور دیکھا جائے۔

یہاں خلاصہ اور مقصود یہ ہے کہ مذکورہ حدیث میں ہے کہ جب حضرت کعب اور ابن حدرد کے درمیان مکالمہ ہوا تو اس میں آوازیں بلند ہوگئیں لیکن حضور اقدس ﷺ نے اس کے اوپر تنبیہ نہیں فرمائی کہ کیوں آوازیں بلند کر رہے ہو، تو اس سے رفع الصوت کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

ان دونوں روایتوں کو لانے کا منشأ یہ ہے کہ رفع الصوت مطلقاً مسجد کے اندر ممنوع نہیں، اگر اس کی غرض صحیح ہو تو جائز ہے جیسا کہ حضرت کعب اور ابن ابی حدرد کے واقعے میں غرض صحیح تھی یعنی مدیون سے مطالبہ کرنا تھا جو اس کا حق تھا تو اس میں تھوڑی سی آواز بلند ہوگئی اس میں مضائقہ نہیں۔

اسی طرح اگر علم وغیرہ کی کوئی بات کرنی ہے، درس یا تکرار ہو رہا ہے اور اس میں آواز بلند ہو جاتی ہے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں اور اگر کوئی غرض صحیح نہیں ہے بلا وجہ لوگ عبث گفتگو کر رہے ہیں اور اس میں آوازیں بلند ہو گئیں تو یہ منع ہے۔

اس کو حضور اکرم ﷺ کی حدیث میں فرمایا جو کہ ترمذی میں ہے کہ **"ایاکم وھیشات الاسواق"** کہ مسجد میں ایسی آوازیں بلند کرنا جیسا کہ بازاروں میں ہوتی ہیں، اس سے بچو۔ اسی سے حضرت عمر فاروقؓ نے بھی منع فرمایا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر غرض صحیح ہو اور بقدر ضرورت ہو تو یہ جائز ہے اور جہاں غرض صحیح نہ ہو یا بقدر ضرورت نہ ہو تو وہ منع ہے اور احترام مسجد کے خلاف ہے۔ اسی سے اس کا بھی جواب نکل آیا کہ جو مساجد میں مختلف مجلسیں ہوتی ہیں۔

(۸۴) باب الحلق والجلوس فی المسجد

مسجد میں حلقہ باندھنے اور بیٹھنے کا بیان

۴۷۲ ۔ حدثنا مسدد قال: حدثنا بشر بن المفضل، عن عبید اللہ، عن نافع، عن ابن عمر قال: سأل رجل النبی ﷺ وھو علی المنبر: ماتری فی صلاۃ اللیل؟ قال: ((مثنیٰ مثنیٰ، فاذا خشیی الصبح صلی واحدۃ، فأوترت لہ ما صلی)) وانہ کان یقول: ((اجعلوا اخر صلاتکم باللیل وتراً، فان النبیّ ﷺ أمر بہ. [أنظر: ۴۷۳، ۹۹۰، ۹۹۳، ۱۱۳۷] ١٦٦

۴۷۳ ۔ حدثنا أبو النعمان قال .... عن ابن عمر .... و ھو فی المسجد. [راجع: ۴۷۲]

١٦٦ وفی صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا، باب صلاۃ اللیل مثنیٰ مثنی والوتر رکعۃ من آخر اللیل، رقم: ۱۲۳۹، وسنن الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء أن صلاۃ اللیل مثنی مثنیٰ، رقم: ۴۰۱، وسنن النسائی، کتاب قیام اللیل وتطوع النھار، باب کیف صلاۃ اللیل، رقم: ۱۶۵۱، وسنن أبی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب کم الوتر، رقم: ۱۲۱۱، وسنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا، باب ماجاء فی صلاۃ اللیل والنھار مثنیٰ مثنیٰ رقم: ۱۳۱۲، ومسند أحمد، مسند المکثرین من الصحابۃ، باب مسند عبد اللہ بن عمر بن الخطاب رقم: ۴۵۶۰، ۴۶۱۵، ۴۷۳۰، ۴۸۳۱، ۴۹۶۷، ۵۱۴۲، ۵۲۱۳، ۵۴۹۹، ۵۵۳۱، ۵۶۶۷، ۵۷۳۶، ۶۰۸۵، ۶۱۳۳، وموطأ مالک، کتاب النداء للصلوۃ، باب الأمر بالوتر، رقم: ۲۴۷.

مقصود امام بخاری رحمہ اللہ

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب مسجد میں بیٹھنے اور حلقہ بنانے کے بارے میں قائم کیا ہے، اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو نماز کے انتظار میں الگ الگ ٹولیاں اور حلقے بنا کر مسجد میں بیٹھنے سے منع فرمایا تھا۔

تو اب بتلانا یہ مقصود ہے کہ یہ ممانعت اس صورت کے ساتھ ہے جب کہ لوگ انتظار صلوٰۃ میں ٹولیاں اور حلقے بنا کر مسجد میں بیٹھے ہوں۔

مساجد میں حلقے اور ٹولیاں بنانے کے مفاسد

اس میں دو مفاسد ہیں:

پہلا مفسدہ یہ ہے کہ جب لوگ ٹولیاں بنا کر بیٹھ جائیں گے تو پھر آپس میں گپ شپ اور دنیاوی باتیں شروع کریں گے، جب کہ مساجد اس کا محل نہیں ہیں۔

دوسرا مفسدہ یہ ہے کہ جب اس طرح کی الگ الگ ٹولیاں بنیں گی تو کوئی ٹولی لسانی بنیاد پر بنے گی یعنی پشتو بولنے والے ایک طرف بیٹھ گئے اور بلوچی بولنے والے ایک طرف بیٹھ گئے اور اردو اور سندھی بولنے والے الگ الگ بیٹھ گئے، یا پھر مختلف نظریات کی بنیاد پر ٹولیاں بنیں گی۔

اس طرح مسلمانوں کے درمیان تفریق پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، اس لئے اس سے منع فرمایا، لیکن جہاں کہیں ایسی بات مقصود ہو جو فی نفسہٖ فائدہ مند ہو اور اس میں کوئی حرج نہ ہو تو اس کی اجازت ہے۔

استدلالِ بخاریؒ

چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے دونوں روایتیں جو ذکر کی ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے مسجد نبوی علی صاحبھا الصلوات والتسلیمات کے منبر پر خطبہ دیا، روایت میں اگرچہ حلقہ بنانے کا ذکر نہیں ہے۔

لیکن امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال یہ ہے کہ دورانِ خطبہ ظاہر ہے کہ لوگ حلقہ بنا کر بیٹھے ہوں گے، اس لئے کہ اگر صف بنا کر بیٹھیں تو جو لوگ صف کے آخری کنارے پر ہیں وہ بہت دور ہو جائیں گے اور ان تک آواز نہیں پہنچ سکے گی، اس کے برخلاف اگر حلقہ بنا کر بیٹھیں تو سب لوگوں کا مواجہہ حضور اقدس ﷺ کی طرف واضح طور پر ہوگا، تو اس وجہ سے ظاہر ہے کہ صحابہ کرام ﷢ حلقہ بنا کر بیٹھے ہوں گے اور یہ حلقہ بنا کر بیٹھنا وعظ اور نصیحت سننے کے لئے تھا جس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

عبداللہ بن عمر ﷺ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور نبی کریم ﷺ سے سوال کیا جب کہ آپ منبر پر تھے، یہ موضع ترجمہ ہے "**وهو على المنبر**" اور حضور نبی کریم ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے۔

سوال کیا کہ "**ماترى فى صلوة الليل**" کہ صلوٰۃ اللیل کے بارے میں کیا رائے ہے؟

تو آپ نے فرمایا "**مثنى مثنى**" دو دو رکعت کر کے پڑھ لو۔ جب تم میں سے کسی کو صبح صادق طلوع ہونے کا اندیشہ ہو تو ایک رکعت ساتھ ملالے۔

"**فاوترت له ماصلّى**" تو یہ ایک رکعت جو کچھ اس نے پڑھا اس کو وتر بنادے گی۔

حضرت عبداللہ بن عمر ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ حضور اقدس ﷺ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اپنی آخری نماز کو وتر بناؤ، اس لئے کہ حضور ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے۔ اس کا تعلق وتر سے ہے، صلوٰۃ اللیل سے نہیں ہے، اس کا ذکر ان شاء اللہ العزیز وہاں پر آئے گا۔

۴۷۴ ــ حدثنا عبد الله بن يوسف قال: أخبرنا مالك، عن اسحاق بن عبدالله بن أبى طلحة ان أبامرة مولى عقيل بن أبى طالب، أخبره عن أبى واقد الليثى قال: بينما رسول الله ﷺ فى المسجد فأقبل ثلاثة نفر، فأقبل اثنان الى رسول الله ﷺ و ذهب واحد. فاما أحدهما فراى فرجة فجلس، و أما الآخر فجلس خلفهم، وأمّا الآخر فأدبر ذاهباً فلما فرغ رسول الله ﷺ قال ((الا اخبركم عن الثلاثة؟ امّا أحدهم فأوى الى الله فآواه الله، وأما الاخر فاستحيا فاستحيا الله منه، وأما الآخر فأعرض الله عنه))[راجع: ٦٦]

روایتِ باب کی تشریح

ابو واقد لیثی ﷺ فرماتے ہیں کہ اس دوران کہ حضور اقدس ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے۔

"**فاقبل ثلاثة نفر**" تین آدمی آئے، ان میں سے دو نبی کریم ﷺ کی طرف آگے بڑھے جو دو آگے بڑھے تھے، ان میں سے ایک نے "**فراى فرجة**" خالی جگہ دیکھ لی "**فجلس**" تو وہاں جا کر بیٹھ گیا۔

"**وأما الأخر فجلس خلفه**" اور دوسرے صاحب جہاں حلقہ ختم ہو رہا تھا وہاں جا کر ان کے پیچھے بیٹھ گیا۔

"**وأما الأخر**" ان میں سے جو تیسرے صاحب تھے۔

"**فا دبر ذاهباً**" انہوں نے دیکھا کہ اب جگہ نہیں ہے تو وہ واپس چلے گئے۔

"**فلما فرغ رسول الله ﷺ**" جب رسول اللہ ﷺ خطبہ سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ کیا میں نہ

بتاؤں ان تین آدمیوں کے بارے میں کہ ان میں سے ایک نے اللہ جل شانہ کی طرف ٹھکانہ لیا" **فاٰوٰه اللہ**" اللہ جل جلالہ نے اس کو ٹھکانہ دے دیا۔

یہ وہ شخص ہے جس نے فرجہ (خالی جگہ) دیکھا اور وہاں جا کر بیٹھ گیا۔ دوسرے جو صاحب تھے اس نے اس چیز سے حیا کی کہ میں لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے بڑھوں، اس کے بجائے وہ تواضعاً وہاں پر بیٹھ گئے۔

تو "**فاستحیی اللہ عنہ**" اللہ ﷻ نے بھی حیا کی کہ ان کا مؤاخذہ کرے، ان کے اس عمل میں کوئی خرابی نہیں ہے کہ اللہ ﷻ اس کا مؤاخذہ کرے۔

"**واما الأخر فأعرض فأعرض اللہ عنہ**" تیسرے صاحب نے اعراض کیا تو اللہ ﷻ نے بھی اس سے اعراض کیا، حالانکہ یہ شخص بھی حضور اقدس ﷺ کی مجلس میں شرکت کے لئے آئے تھے لیکن مناسب جگہ نہ ملنے پر واپس چلے گئے اور نبی کریم ﷺ کی مجلس سے اعراض کیا، اس واسطے اللہ ﷻ نے بھی اعراض کیا۔

موضع ترجمہ

یہاں موضع ترجمہ یہ ہے کہ اس میں بھی حلقہ بنا کر بیٹھنے کا ذکر ہے۔
تو اس سے معلوم ہوا کہ مسجد میں وعظ اور پند و نصیحت کیلئے حلقہ بنا کر بیٹھنا جائز ہے۔

(۸۵) باب الاستلقاء فی المسجد

مسجد میں چت لیٹنے کا بیان

۴۷۵ ۔ حدثنا عبد اللہ بن مسلمة، عن مالک عن ابن شهاب، عن عباد بن تمیم، عن عمه أنه رأی رسول اللہ ﷺ مستلقیاً فی المسجد، واضعاً احدی رجلیه علی الأخری.

وعن ابن شهاب، عن سعید بن المسیب قال: کان عمر و عثمان یفعلان ذلک. [أنظر ۵۹۶۹، ۶۲۸۷] [۱۶۷]

[۱۶۷] وفی صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینة، باب فی اباحة الاستلقاء ووضع احدی الرجلین علی، رقم: ۳۹۲۱، وسنن الترمذی، کتاب الادب عن رسول اللہ، باب ماجاء فی وضع احدی الرجلین علی الاخری مستلقیاً، رقم: ۲۶۸۹، وسنن النسائی، کتاب المساجد، باب الاستلقاء فی المسجد، رقم: ۷۱۳، وسنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی الرجل یضع احدی رجلیه علی الاخریٰ رقم: ۴۲۲۴، ومسند أحمد، اول مسند المدنیین أجمعین، باب حدیث عبد اللہ بن زید بن عاصم المازنی، رقم: ۱۵۸۳۵، ۱۵۸۴۹، وموطأ مالک، کتاب النداء للصلاة، باب جامع الصلاة، رقم: ۳۷۸، وسنن الدارمی، کتاب الاستئذان، باب فی وضع احدی الرجلین علی الاخریٰ، رقم: ۲۵۴۱.

ترجمۃ الباب اور روایت باب سے مقصد امام بخاریؒ

انہوں نے دیکھا کہ حضور ﷺ مسجد میں لیٹے ہوئے ہیں اور اپنا ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر رکھا ہوا ہے۔ ترجمۃ الباب اور حدیث باب سے امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود یہ ہے کہ بعض روایتوں میں آپ علیہ الصلوت والتسلیمات نے ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں پر رکھ کر لیٹنے سے منع فرمایا ہے۔

تو امام بخاری رحمہ اللہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ روایتوں میں موجود نہی عام نہیں ہے بلکہ معلول بعلت ہے اور علتِ نہی یہ ہے کہ اس طرح ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں پر رکھ کر لیٹنے سے کشفِ عورت کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لئے آپ نے فرمایا ہے۔

استلقاء کی ممنوع صورت

محققین نے فرمایا ہے کہ ایک پاؤں کو دوسری پاؤں پر رکھ کر لیٹنے کی دو صورتیں ہوتی ہیں:

ایک صورت تو یہ ہے کہ ایک پاؤں کھڑا کیا ہوا ہے اور اس کے اوپر دوسرا پاؤں ایسے رکھ لیا ہے جیسے بعض لوگ بڑے ٹھاٹھ سے لیٹتے ہیں، تو یہ ممانعت اس طریقے کی ہے، بالخصوص اس وقت جبکہ تہبند پہنا ہوا ہو، کیونکہ اس میں کشف عورت کا احتمال رہتا ہے، لیکن اگر شلوار پہنی ہوئی ہے تو اس میں ممانعت نہیں ہے، البتہ ذرا بدہیئتی ضرور ہے، اس واسطے بلا ضرورت اس طرح لیٹنے میں کچھ نہ کچھ کراہت تنزیہی شاید اس میں بھی ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی لیٹا ہوا ہے اور دونوں پاؤں پھیلے ہوئے ہیں اور ایک پاؤں پر دوسرا پاؤں رکھ لیا ہے تو یہ (خواہ تہبند پہنا ہوا ہو یا شلوار پہنی ہوئی ہو) ہر صورت میں جائز ہے اور حضور ﷺ کا لیٹنا جو یہاں مذکور ہے وہ اسی دوسری قسم کا لیٹنا ہے، اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

(۸۶) باب المسجد یکون فی الطریق من غیر ضرر بالناس

مسجد میں راستہ ہو اور لوگوں کا اس میں نقصان نہ ہو تو کچھ حرج نہیں

وبه قال الحسن وأیوب ومالک

اراضی مباحہ میں مسجد بنانے کا جواز مشروط بشرط ہے

یہ باب قائم کیا ہے کہ جو مسجد راستہ میں ہو جبکہ دوسرے لوگوں کو ضرر واقع نہ ہو۔ بتایا کہ ویسے تو مسجد ہمیشہ ایسی جگہ بنانی چاہئے جو باقاعدہ مسجد کی ملک ہو، کسی دوسرے کی ملک میں مسجد بنانا جائز نہیں، البتہ جو مباح

زمینیں ہیں جیسے راستہ وغیرہ تو وہ چونکہ مباح عام ہے، ہر انسان کو اس سے انتفاع کا حق حاصل ہے اور مسجد بھی مباح عام ہوتی ہے، ہر انسان کو وہاں عبادت کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے، لہٰذا اراضی مباحہ میں مسجد بنانا جائز ہے، صرف ایک شرط ہے وہ یہ کہ اس مباح زمین میں مسجد بنانے سے لوگوں کو تکلیف نہ ہو، ورنہ جائز نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا یہی مقصود ہے۔

۴۷۶۔ حدثنایحییٰ بن بکیر قال: حدثنا اللیث ، عن عقیل ، عن ابن شهاب ، قال: أخبرني عروة بن الزبير أنّ عائشة زوج النبي ﷺ قالت: لم أعقل ابویّ الا وهما يدينان الدين ، ولم يمرّ علينا يوم الا يأتينا فيه رسول الله ﷺ طرفي النهار بكرة وعشية ، ثم بدأ لأبي بكر فابتنى مسجداً بفناء داره ، فكان يصلي فيه ويقرأ القرآن فيقف عليه نساء المشركين وأبناوهم يعجبون منه وينظرون اليه ، وكان أبو بكر رجلاً بكّاءً لايملك عينيه اذا قرأ القرآن، فأفزع ذلك أشراف قريش من المشركين .[أنظر :۲۱۳۸، ۲۲۶۳، ۲۲۹۷، ۳۹۰۵، ۴۰۹۳، ۵۸۰۷، ۶۰۷۹] [۱۶۸]

روایت باب کی تشریح

اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ معروف حدیث روایت کی ہے جو واقعہ ہجرت پر مشتمل ہے "**کتاب الھجرت**" میں یہ حدیث ان شاء اللہ تعالیٰ تفصیل کے ساتھ آئے گی، اس کا ایک چھوٹا سا حصہ یہاں روایت کیا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ "**لم اعقل ابوی الّا هما يدينان دينا**" میں نے اپنے ماں باپ کو نہیں دیکھا مگر یہ کہ شروع ہی سے وہ دین کے پابند تھے۔ حضرت صدیق اکبر ﷛ تو بالکل ابتداہی میں اسلام لائے تھے، اس لئے میں نے اپنے ماں باپ کو ہمیشہ اسلام کا پابند پایا۔

"**ولم يمّر علينا يوم الّا يأتينا فيه رسول الله ﷺ**" کوئی دن نہیں گزرتا تھا کہ جس میں حضور اقدس ﷺ ہمارے پاس نہ آتے ہوں "**طرفي النهار**" دن کے دونوں وقتوں میں "**بكرة وعشيّا**" ایک مرتبہ صبح ایک مرتبہ شام۔ پھر فرماتی ہیں کہ پھر حضرت صدیق اکبر ﷛ کی رائے یہ ہوئی۔ "**بدا له**" کے معنی (رائے ہوجانا) کے آتے ہیں، "**فابتنى مسجداً في فناء داره**" تو انہوں نے اپنے گھر میں مسجد بنائی۔

موضعِ استدلال

یہیں سے امام بخاری رحمہ اللہ استدلال کررہے ہیں کہ اس زمانے میں گھر اتنی بڑی حویلی نہیں ہوتی

---

[۱۶۸] وفي مسند أحمد ، باقي مسند الأنصار ، باب باقي المسند السابق ، رقم: ۲۴۴۴۵، ۲۴۵۹۲.

تھی کہ اس کے اندر چار دیواری ہو اور اس میں فناء ہو، بلکہ گھر راستہ پر تھا، تو گھر کی فناء راستہ بنا، گویا کہ انہوں نے راستہ میں مسجد بنائی، لہٰذا راستہ جو مباح عام ہے اس میں مسجد بنانا جائز ہے، بشرطیکہ گزرنے والوں کو اس سے ضرر لاحق نہ ہو۔

"فکان یصلّی فیه" اس کے بعد صدیق اکبرؓ اس میں نماز پڑھتے تھے **"ویقرء القرآن"** اور قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے، تو مشرکین کی عورتیں اور ان کے بچے کھڑے ہو کر دیکھتے تھے، **"فیعجبون منه وینظرون الیه وکان أبوبکر رجلاً بکاءً"** وہ اس سے تعجب کرتے تھے اور اس کی طرف دیکھا کرتے تھے اور ابوبکرؓ پر کثرت سے گریہ طاری ہوتی رہتی تھی، **"ولا یملک عینیه"** وہ اپنی آنکھوں کو قابو میں نہیں رکھ سکتے تھے یعنی تلاوتِ قرآن کریم کے وقت آنسو جاری ہوتے تھے۔

"إذاقراء القرآن فافزع ذالک اشراف قریش من المشرکین" تو مشرکین کے جو بڑے بڑے چوہدری لوگ تھے، ان کو اس بات سے پریشانی لاحق ہوئی کہ یہ روتے بھی ہیں اور ان کی آواز بھی ایسی ہے اور عورتیں اور بچے ان کے ارد گرد جمع بھی ہوتے ہیں، تو رفتہ رفتہ یہ متاثر ہوں گے اور اسلام قبول کرلیں گے، اس لئے انہوں نے سازش کر کے حضرت صدیق اکبرؓ کو جلاوطن کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ اس کے بعد لمبا قصہ ہے جو ان شاء اللہ العزیز ہجرت کے باب میں آئے گی۔

(۸۷) باب الصلاۃ فی مسجد السوق

بازار کے مقام میں نماز پڑھنے کا بیان

مقصود امام بخاریؒ بقول بعض شراح

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب قائم فرمایا ہے کہ **"باب الصلوٰۃ فی مسجد السوق"** بازار کی مسجد میں نماز پڑھنا، بعض شراح نے اس باب کو قائم کرنے کا مقصد یہ بتایا ہے کہ حدیث میں بازار کو **"ابغض البقاع"** قرار دیا گیا ہے، تو اب اس باب کو قائم کر کے اس شبہ کی تردید کرنا چاہتے ہیں کہ بعض لوگوں کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ سوق جو **"ابغض البقاع"** ہے اس میں نماز پڑھنا اور مسجد بنانا شاید پسندیدہ نہ ہو کیونکہ مسجد **"خیر البقاع"** ہے۔ تو امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کی تردید کردی ہے کہ نہیں سوق میں بھی مسجد بنائی جاسکتی ہے اور اس میں نماز پڑھی جاسکتی ہے۔

مقصود امام بخاریؒ بقول بعض حضرات

بعض حضرات نے یہ کہا کہ یہاں مسجد سے مراد مسجد اصطلاحی ہے اور مقصد یہ ہے کہ مسجد بنانا درست ہے

لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے جو روایات ذکر کی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد مسجد کے لفظ سے مسجد لغوی ہے نہ کہ مسجد اصطلاحی یعنی نماز پڑھنے کی جگہ، اس لئے کہ اسی ترجمۃ الباب کے اندر یہ تعلیق نقل کی ہے:

"و صلی ابن عون فی مسجد فی دار یغلق علیهم الباب".

ابن عون نے ایک ایسی مسجد میں نماز پڑھی جو گھر میں تھی اور اس پر دروازہ بند ہو جاتا تھا، عام طور پر جو گھر میں مسجد ہوتی وہ مسجد اصطلاحی نہیں ہوتی بلکہ مسجد لغوی ہوتی ہے، تو اس تعلیق کو نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسا مصلّی بنایا ہوا تھا جس کا دروازہ بھی بند ہوتا تھا اور اس میں نماز پڑھی، جب اس میں نماز پڑھنا درست ہے تو اگر کوئی بازار میں مصلّی بنالے اور اس میں نماز پڑھے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

۴۷۷ ۔ حدثنا مسدد قال: حدثنا أبو معاوية، عن الأعمش، عن أبی صالح، عن أبی هریرة عن النبی ﷺ قال: صلاة الجمیع تزید علی صلاته فی بیته و صلاته فی سوقه خمسا و عشرین درجة، فان أحدکم اذا توضا فأحسن و أتی المسجد لا یرید الا الصلاة لم یخط خطوة الا رفعه اللّٰه بها درجة وحط عنه خطیئة حتی یدخل المسجد . و اذا دخل المسجد کان فی صلاة ما کانت تحبسه و تصلی علیه الملائکة ما دام فی مجلسه الذی فیه: اللّٰهم اغفرله، اللّٰهم ارحمه ما لم یوذ یحدث". [راجع: ۱۷۶]

باجماعت نماز کی فضیلت

اس میں جو مرفوع حدیث نقل کی ہے وہ حضرت ابو ہریرہ ﷜ کی معروف حدیث ہے جس میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جماعت کی نماز گھر میں نماز پڑھنے اور بازار میں نماز پڑھنے کے مقابلے میں پچیس درجہ زیادہ فضیلت رکھتی ہے **"خمسا و عشرین درجة"**.

تو یہاں **"صلاته فی سوقه"** کہا گیا ہے، اس سے پتہ چلا کہ اگر بازار میں بھی نماز پڑھی جائے تو وہ ادا ہو جاتی ہے اور اس میں کوئی گناہ بھی نہیں ہے۔ صرف اتنا ہے کہ جماعت کی فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔

مقصود امام بخاری رحمہ اللہ

مجھے ایسا لگتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ یہاں پر جو حدیث لائے ہیں اس کا منشأ یہ ہے کہ جب آپ نے بغیر جماعت کے بازار میں نماز پڑھنے کو جائز قرار دیا اور یہ فرمایا کہ جماعت کی نماز اس پر پچیس درجہ زیادہ فضیلت رکھتی ہے، تو معلوم ہوا کہ اگر کوئی بازار میں باقاعدہ مسجد بنالے یا مصلّی بنالے اور اس میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھے تو دونوں مصلحتیں جمع ہو جائیں گی اور پچیس درجہ کی فضیلت بھی حاصل ہو جائے گی۔

یہی حال بیت کا بھی ہے کہ اگر گھر میں تنہا نماز پڑھے گا تو جماعت کے مقابلے میں پچیس گنا کم ثواب ملے گا، لیکن اگر گھر میں جماعت کرے گا تو پھر ان شاء اللہ اس کو پچیس درجہ ثواب حاصل ہو جائے گا۔

پچیس گنا ثواب مسجد کے ساتھ مقید نہیں

اسی واسطے فقہاء کرام نے فرمایا **"شرح المنیة"** میں مسئلہ لکھا ہے کہ اگر مسجد کے علاوہ کسی اور جگہ میں جماعت کر لی جائے تو ایک تو جماعت کی سنتِ مؤکدہ ادا ہو جاتی ہے، دوسرا جو پچیس درجہ فضیلت کی بات ہے وہ بھی حاصل ہو جاتی ہے، البتہ مسجد کی فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔[۱۶۹]

مسجد کی جو فضیلت ہے وہ مسجد سے باہر پڑھی ہوئی نماز کے مقابلے میں **"کیفا"** زیادہ ہے، **"کما"** اگرچہ برابر ہو، لہٰذا حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے کہ مسجد جماعت کے اندر نماز پڑھی جائے، لیکن اگر کبھی وہ فوت ہو جائے تو پھر انفراد کے مقابلے میں بہتر ہے کہ آدمی جماعت کر لے چاہے وہ جماعت سوق میں ہو یا گھر میں ہو اور یہاں تک کہ اگر کوئی اور نہ ملے تو کسی بچے کو ہی کھڑا کر لے اور وہ بھی نہ ملے تو اپنی کسی محرم عورت کو کھڑا کر لے یعنی مرد امامت کرے اور اس کے ساتھ ایک عورت کھڑی ہو جائے بشرطیکہ عورت اس کی محرم ہو، جیسے بیوی ہو یا محارم میں سے اور کوئی ہو تو اس کے ساتھ بھی جماعت ہو سکتی ہے۔

اختلافِ روایات اور تطبیق کی مختلف توجیہات

اس حدیث میں پچیس درجہ کا بیان ہے اور بعض روایتوں میں ستائیس درجہ کا بھی ذکر آیا ہے کہ ستائیس درجہ فضیلت رکھتی ہے۔

لطیف توجیہ:

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے استاذ علامہ بلقینی رحمہ اللہ نے اس میں ایک لطیفہ بیان فرمایا ہے کہ اقل جماعت وہ ہے جو تین افراد پر مشتمل ہو۔ تو اگر کم سے کم تین افراد کی جماعت سمجھی جائے تو **"کل حسنة بعشر امثالها"** کے قاعدہ سے ہر ایک کی نماز دس درجہ فضیلت رکھے گی اور تینوں کی مل کر تیس درجہ ہوئی۔ تو ان میں سے تین اصل ہے اس واسطے کہ تین آدمی تھے اور ستائیس فضیلت ہے تو اس واسطے ستائیس درجہ کہا گیا ہے۔ علامہ بلقینی رحمہ اللہ نے یہ لطیف توجیہ بیان فرمائی ہے۔

دوسری توجیہ:

بعض روایات میں خمساً وعشرین آیا ہے اور بعض میں ستائیس درجہ آیا ہے تو بعض حضرات نے تو اس کو

---

[۱۶۹] فیض الباری، ج:۲، ص: ۷۱۔

راویوں کے نسیان پر محمول کیا ہے کہ کسی کو ستائیس یاد رہا اور کسی کو پچیس یاد رہا، اور بعض نے کہا ہے کہ پچیس اور ستائیس، یہ اخلاص کے اعتبار سے ہے کہ اگر زیادہ اخلاص ہوگا تو ستائیس درجہ، ورنہ پچیس درجہ ثواب ہوگا۔ ۱۰۷

تیسری توجیہ:

بعض حضرات نے اس کی توجیہ یوں بیان فرمائی ہے کہ اقل جماعت دو سے ہوتی ہے۔ اگر ایک امام اور ایک مقتدی ہو تب بھی جماعت ہو جاتی ہے۔ تو جس میں ستائیس کا ذکر ہے اس میں اصل اور فضیلت دونوں کا ذکر ہے اور جس میں پچیس ہے اس میں صرف فضیلت کا بیان ہے، کیونکہ اگر ایک امام اور ایک مقتدی نماز پڑھتے ہیں تو دو آدمی ہیں، دونوں کا ایک ایک درجہ اصل ہے اور پچیس فضیلت ہے اگر فضیلت کے ساتھ اصل کو بھی شامل کرلیں تو ستائیس ہو جائیں گے اور اگر اصل کو نکال دیں تو پچیس رہ جاتے ہیں۔

سوال: اگر آدمی مسجد میں آئے اور جماعت ہو چکی ہو تو اب اس کو بغیر جماعت کے مسجد میں نماز پڑھنی چاہئے اور جماعت کرنے کے لئے مسجد سے باہر نہیں جانا چاہئے، اس لئے کہ جب مسجد میں داخل ہو گیا تو اس پر مسجد کا حق لازم ہو گیا، اس مسئلہ کی کیا حقیقت ہے؟

جواب: یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اگر مسجد میں آیا اور جماعت ہو چکی ہے تو اب بہتر یہی ہے کہ اگر کوئی دوسرا آدمی موجود ہے تو اس کے ساتھ مل کر باہر جماعت کرے، انفراد کے مقابلے میں یہ بہت بہتر ہے اور حضور ﷺ سے یہ بات ثابت ہے۔

معجم طبرانی میں روایت ہے کہ حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ قبا تشریف لے گئے وہاں کچھ لوگوں کا جھگڑا تھا، اس جھگڑے کو نمٹانے کے لئے تشریف لے گئے تھے، جب واپس مسجد نبوی میں تشریف لائے تو وہاں جماعت ہو چکی تھی، کیونکہ لوگ سمجھے کہ حضور ﷺ کہیں تشریف لے گئے ہیں، لہٰذا کسی اور نے نماز پڑھا دی، آپ ﷺ نے مسجد نبوی میں نماز نہیں پڑھی بلکہ اپنے گھر تشریف لے گئے **"و جمع اهله و صلی بهم"** تو اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایسی صورت میں یہی کرنا چاہئے۔

انتظارِ نماز کی فضیلت

"فان أحدكم اذا توضا فأحسن الخ"

یہ معروف حدیث ہے کہ کوئی شخص وضو کرے اچھا وضو اور پھر مسجد آئے اور اس کا مقصد صرف نماز پڑھنا ہو تو ہر ایک قدم اٹھانے پر ایک درجہ بلند ہوگا اور ایک گناہ معاف ہوگا، یہاں تک کہ مسجد میں داخل ہو جائے گا تو وہ نماز کے ہی حکم میں ہوگا **"ما كانت تحبسه"** جب تک کہ نماز اس کو وہاں روکے رکھے، نماز کے انتظار میں

---

۱۰۷ ان تمام روایتوں، مع حوالے کے لئے ملاحظہ فرمائیں، عمدۃ القاری، ج: ۳، ص: ۵۴۳۔۵۴۷۔

رہے اور جب تک وہ نماز والی جگہ پر بیٹھے رہے ملائکہ دعا کرتے رہتے ہیں اور یہ دُعا کرتے ہیں **" اللّٰھم اغفرلہ ، اللّٰھم ارحمہ ما لم یؤذ یحدث"** جب تک اس میں ملائکہ کو ایذا نہ پہنچائے اور اس کی تفسیر **"یُحدث"** سے کردی کہ **"یؤذی"** کے معنی **"یحدث"** کے ہیں کہ حدث لاحق نہ ہو۔

(۸۸) بابُ تشبیک الأ صابع فی المسجد وغیرہ

مسجد میں انگلیوں میں پنجہ ڈالنے کا بیان

۴۷۸، ۴۷۹۔ حدثنا حامد بن عمر، عن بشر قال: حدثنا عاصم قال: حدثنا واقد عن أبیہ، عن ابن عمر. و قال شبک النبی ﷺ أصابعہ، [أنظر: ۴۸۰]

۴۸۰۔ و قال عاصم بن علی: حدثنا عاصم بن محمد سمعت ھذا الحدیث من أبی فلم احفظہ، فقومہ لی واقد عن ابیہ قال: سمعت أبی وھو یقول: قال عبداللہ: قال رسول اللہ ﷺ "یاعبدا للہ بن عمرو. کیف بک اذا بقیت فی حثالۃ من الناس.... بھذا. [راجع: ۴۷۹]

تشبیک کا حکم

"باب تشبیک الأصابع فی المسجد وغیرہ".

مسجد میں یا غیر مسجد میں اصابع کے درمیان تشبیک کرنا

یہ باب اس لئے قائم کیا کہ بعض احادیث میں تشبیک کی ممانعت آئی ہے کہ حضور ﷺ نے **" تشبیک بین الأصابع"** کو منع فرمایا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ **"تشبیک بین الأصابع "** کی جو ممانعت ہے وہ اتنی عام نہیں ہے کہ ہر وقت ممانعت ہو بلکہ بعض حالات میں وہ جائز بھی ہے۔

خلاصۂ مسئلہ

اس مسئلہ کا خلاصہ یہ ہے کہ **" تشبیک بین الأصابع"** جب عبث کے طور پر ہو یا کھیل کے طور پر یا سستی اور کاہلی کی وجہ سے ہو تو اس کے اندر کراہت ہے اور وہ کراہت بھی تحریمی نہیں بلکہ تنزیہی ہے، لیکن جہاں کوئی بات واضح کردینے کے لئے یا کوئی اشارہ کرنے کے لئے تشبیک مقصود ہو یا بے اختیار تشبیک ہوگئی ہو تو اس صورت میں اس کے اندر کوئی کراہت نہیں ہے، چاہے وہ مسجد میں ہو یا غیر مسجد میں ہو۔

روایتِ باب کی تشریح

چنانچہ اس میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ یا عبداللہ بن عمروؓ کی حدیث نقل کی، یعنی راوی کو شک ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ ہیں یا عبداللہ بن عمروؓ ہیں۔

"**قال شبک النبی ﷺ أصابعه**" اس روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی انگلیوں میں تشبیک فرمائی، آگے اس کی وضاحت آرہی ہے کہ کیوں فرمائی ہے۔

"**قال عاصم بن علی: حدثنا عاصم بن محمد سمعت هذا الحدیث من أبی**" عاصم بن محمد کہتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث اپنے والد سے سنی تھی، پھر بعض نسخوں میں یہاں اضافہ ہے کہ "**فلم أحفظه**" مجھے وہ یاد نہ رہی اور بعض نسخوں میں یہ جملہ محذوف ہے "**فقوّمه لی واقد**" والد سے جو حدیث سنی تھی وہ تو یاد نہ رہی لیکن واقد نے وہ حدیث پوری سنائی "**عن أبیه**" اپنے والد سے، اور انہوں نے یہ کہا کہ میں نے اپنے والد سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے یہ فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا "**یا عبداللہ بن عمرو کیف بک اذا بقیت فی حثالة من الناس**"۔

تمہارا کیا حال ہوگا جب تم کوڑا کرکٹ قسم کے لوگوں کے ساتھ رہ جاؤ گے۔ "**حثالة**" کوڑا کرکٹ کو کہتے ہیں، ہر چیز کی جو خراب ترین صنف اور نوع ہوتی ہے اس کو "**حُثالة**" کہتے ہیں، اسی واسطے جب گندم کو چھانتے ہیں تو اس کے بھوسہ کو بھی "**حثالة**" کہہ دیتے ہیں۔

جب تم ایسے لوگوں کے ساتھ رہ جاؤ گے جو بالکل رڈی قسم کے ہوں گے تو اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا؟ اور اس وقت آپ ﷺ کا "**بهذا**" سے تشبیک کی طرف اشارہ تھا، آپ نے "**تشبیک بین الاصابع**" یعنی اپنی اصابع کے درمیان تشبیک فرمائی کہ جب تم ان لوگوں کے ساتھ اس طرح مل جاؤ گے جیسا کہ انگلیاں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی ہیں یعنی جب رڈی قسم کے لوگوں کے ساتھ مل جاؤ گے، اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا؟ یہاں تشبیک کے ذریعہ اتصال کو بیان کرنا مقصود تھا، لہٰذا یہ تشبیک جائز تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ نہی اس صورت پر محمول ہے جب عبث اور لعب مقصود ہو یا سستی اور کاہلی کی وجہ سے ہو، ورنہ عام حالات میں تشبیک منع نہیں ہے۔

۴۸۱ ۔ حدثنا خلاد بن یحیی قال: حدثنا سفیان، عن أبی بردة بن عبد اللہ بن أبی برده، عن جده، عن أبی موسیٰ عن النبی ﷺ قال: "ان المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضه بعضا" و شبک ﷺ أصابعه. [أنظر: ۲۴۴۶، ۶۰۲۶] ۱۷۱

یہاں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مؤمن مؤمن کے لئے ایک عمارت کی طرح ہے، جس کا ایک حصہ

دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے اور پھر تشبیک فرمائی۔ اگر تشبیک کر لی جائے تو ایک ہاتھ کا حصہ دوسرے ہاتھ کے حصہ کو مضبوط کرتا ہے، تو یہاں پر بھی تشبیک سے مضبوطی کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا۔

۴۸۲ ـ حدثنا اسحاق قال : حدثنا ابن شميل قال: أخبرنا ابن عون، عن ابن سيرين، عن أبي هريرة قال: صلّى بنا رسول الله ﷺ احدى صلاتي العشي . قال ابن سيرين : قد سماها أبو هريرة ، و لكن نسيت أنا. قال : فصلى بنا ركعتين ثم سلم ، فقام الى خشبة معروضة في المسجد ، فاتكأ عليها كأنه غضبان ، و وضع يده اليمنى على اليسرى ، و شبك بين اصابعه و وضع خده الأيمن على ظهر كفه اليسرى ، و خرجت السرعان من أبواب المسجد فقالوا : أقصرت الصلاة ؟ و في القوم أبو بكر و عمر فهابا أن يكلماه ، و في القوم رجل في يديه طول يقال له ذو اليدين ، قال : يا رسول الله ! أنسيت أم قصرت الصلاة ؟ قال : "لم أنس و لم تقصر" فقال : "أكما يقول ذو اليدين ؟" فقالوا : نعم ، فتقدم فصلى ما ترك ، ثم سلّم ثم كبر و سجد مثل سجوده أوأطول، ثم رفع رأسه و كبر، ثم كبر و سجد مثل سجوده أو أطول، ثم رفع رأسه و كبر، فربما سألوه: ثم سلم؟ فيقول: نبئت ان عمران بن حصين قال: ثم ، سلم.[أنظر: ۷۱۴، ۷۱۵، ۱۲۲۷، ۱۲۲۹، ۶۰۵۱، ۷۲۵۰] [۷۲]

روایتِ باب سے امام بخاریؒ کا مقصود

یہ حضرت ذوالیدین والا واقعہ ہے جو آگے "**کتاب الصلوٰۃ**" میں بھی ان شاء اللہ اس کا مستقل بیان

[۷۱] وفي صحيح مسلم ، كتاب البر والصلة والآداب ، باب تراحم المؤمنين وتعاطفهم وتعاضدهم ، رقم: ۴۶۸۴، وسنن الترمذي ، كتاب البر والصلة عن رسول الله ، باب ماجاء في شفقة المسلم على المسلم ، رقم: ۱۸۵۱، وسنن النسائي ، كتاب الزكاة ، باب أجر الخازن اذا تصدق باذن مولاه ، رقم:۲۵۱۳، ومسند أحمد ، اوّل مسند الكوفيين ، باب حديث ابي موسىٰ الاشعري ، رقم: ۱۸۷۹۸ .

[۷۲] وفي صحيح مسلم ، كتاب المساجد ومواضع الصلاة ، باب السهو في الصلاة والسجود له ، رقم: ۸۹۷، وسنن الترمذي كتاب الصلاة ، باب ماجاء في الرجل يسلم في الركعتين من الظهر ، رقم: ۳۶۵، وسنن النسائي ، كتاب السهو ، باب مايفعل من سلم من ركعتين ناسيا وتكلم ، رقم: ۱۲۰۹ ، وسنن أبي داؤد ، كتاب الصلاة ، باب السهو في السجدتين ، رقم: ۸۵۶، وسنن ابن ماجه ، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها ، باب فيمن سلم من لثنين أو ثلاث ساهياً، رقم: ۱۲۰۴ ، ومسند احمد ، باقي مسند المكثرين ، باب مسند أبي هريرة ، رقم: ۶۹۰۳، ۷۳۴۲، ۷۴۸۶، ۹۰۹۹، ۹۵۳۵، موطأ مالك ، كتاب النداء للصلاة ، باب مايفعل من سلم من ركعتين ساهياً ، رقم ۱۹۵ ، ۱۹۶ ، وسنن الدارمي ، كتاب الصلوة ، باب في سجدتي السهو من الزيادة رقم: ۱۴۵۸ .

آئے گا اور اس پر بحث بھی وہیں پر آئے گی۔

یہاں صرف اتنا بیان کرنا مقصود ہے کہ جب نبی کریم ﷺ سے یہ کہا گیا کہ آپ نے دو رکعتیں پڑھائی ہیں تو آپ نے سوچنے کی حالت میں **"تشبیک بین أصابعه"** اپنی انگلیوں کے درمیان تشبیک فرمائی۔ **"ووضع خده الایمن علی ظهر کفه الیسری"** ایسے تشبیک فرمائی کہ اپنا دایاں رخسار ہتھیلی کی پشت پر رکھا، تو یہاں حضور ﷺ سے مسجد کے اندر تشبیک کرنا ثابت ہوا۔ اس کو ثابت کرنے کے لئے یہ حدیث لائے ہیں، باقی تفصیلی بیان ان شاء اللہ اپنے موقع پر آئے گا۔

(۸۹) باب المساجد التی علی طرق المدینة، والمواضع التی صلی فیها النبی ﷺ

وہ مسجدیں جو مدینہ کے راستوں پر ہیں اور وہ جگہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی

۴۸۳ ـ حدثنا محمد بن أبی بکر المقدمی قال: حدثنا فضیل بن سلیمان قال: حدثنا موسی بن عقبة قال: رأیت سالم بن عبداللہ یتحری أماکن من الطریق، فیصلی فیها، و یحدث أن أباه کان یصلی فیها، وأنه رأی النبی ﷺ یصلی فی تلک الامکنة، وحدثنی نافع، عن ابن عمر رضی اللہ عنهما. أنه کان یصلی فی تلک الأمکنة، وسألت سالما فلاأعلمه الا وافق نافعا فی الامکنة کلها الا انهما اختلفا فی مسجد بشرف الروحاء. [أنظر: ۱۵۳۵، ۲۳۳۶، ۷۳۴۵] ۴۷۳

روایتِ باب سے مقصود بخاریؒ

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب ان مساجد کے بیان میں قائم کیا ہے جو مدینہ منورہ کے راستہ میں واقع

---

۴۷۳ وفی صحیح مسلم، کتاب الحج، باب استحباب استلام الرکنین الیمانیین فی الطواف دون، رقم: ۲۲۲۵، وسنن النسائی، کتاب مناسک الحج، باب التعریس بذی الحلیفة، رقم: ۲۶۱۲، ومسند احمد، مسند المکثرین من الصحابة، باب مسند عبد اللہ بن عمر بن الخطاب، رقم: ۴۲۳۰، ۴۳۸۹، ۴۹۵۴، ۵۳۳۷، ۵۹۵۲، ۶۱۶۴، وموطامالک، کتاب الحج، باب صلاۃ المعرس والمحصب، رقم: ۸۰۴، وسنن الدارمی، کتاب المناسک، باب فی أی طریق ید خل مکة، رقم: ۱۸۴۷.

ہیں اوران مواضع کا بیان جن میں نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھی تھی اور اس میں آگے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے طویل حدیث روایت کی ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جب مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان سفر کرتے تو ڈھونڈ ڈھونڈ کران مقامات پرنماز پڑھتے تھے جہاں نبی کریم ﷺ نے اپنے سفر کے دوران نماز پڑھی تھی اوران مواقع کو نہ صرف خود تلاش کر کے نماز پڑھتے تھے بلکہ لوگوں کو بتلاتے بھی تھے کہ دیکھو یہ جگہ ہے جہاں نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھی تھی، یہاں تک کہ بعض روایات میں آتا ہے کہ ایک جگہ کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے بتلایا کہ دیکھو یہاں حضور اکرم ﷺ نے پیشاب کیا تھا اور اسی تحری کے نتیجے میں انہوں نے لفظوں میں اپنے تمام شاگردوں کوان تمام مواضع کی تفصیل بتادی تھی کہ کونسی جگہ ہے جہاں حضور ﷺ نے نماز پڑھی تھی۔

اگرچہ تفصیل ایسی تھی کہ اس کی مدد سے آج کوئی آدمی وہاں نہیں پہنچ سکتا کیونکہ وہ تفصیل انہوں نے اپنے زمانہ کے اعتبار سے بتائی تھی کہ دیکھوفلاں جگہ پرفلاں درخت ہے، فلاں جگہ پرگھاٹی ہے، فلاں جگہ پر پہاڑ ہے، فلاں جگہ پربستی ہے، ظاہر ہے کہ مرورِ زمانہ کی وجہ سے اب وہ نشانیاں مٹ گئی ہیں۔ یہاں تک کہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اپنے زمانہ میں یعنی آٹھویں صدی میں کہہ رہے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے جومقامات بیان فرمائے ہیں ان میں سے صرف دو باقی رہ گئے ہیں۔ایک روحاء کا مقام اورایک ذوالحلیفہ۔ باقی سارے مقامات اب دستیاب نہیں ہیں۔ اگرچہ بہت سی جگہیں اب تک ایسی ہیں جن کے نام اب تک وہی ہیں جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمائے تھے، لیکن جو تفصیل حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمائی تھی کہ بائیں مڑو اور دائیں مڑو، وہ تفصیل اب نہیں رہی ہے۔صرف روحاء ایک ایسی جگہ ہے جہاں سعودی حکومت کے ہاتھ نہیں پہنچے، اس واسطے وہ جگہ ایسی ہے کہ جہاں کوئی عمارت نہیں بنی تھی۔

چندسال پہلے میں گیا تھا تو وہاں وہ کنواں (بئر روحاء) اب بھی موجود ہے اوراس کے قریب جوایک جگہ بتائی گئی ہے، واللہ اعلم وہ جگہ بھی محفوظ ہے۔ باقی جتنے مقامات بتائے ہیں یہاں تک کہ ذوالحلیفہ کی وہ جگہ جہاں حضور ﷺ نے نماز پڑھی تھی، اب وہاں بہت عالی شان، لمبی چوڑی مسجد بنادی گئی ہے اُس جگہ کو خاص طور پر محفوظ نہیں رکھا گیا ہے، وہ مسجد اس کے اندر آ گئی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ علماء نجد کا کہنا ہے کہ اس قسم کے مقامات کوخاص طور پرمحفوظ رکھنا ناجائز ہے اورشرک آثار میں ہونے کی وجہ سے منع ہے۔ چنانچہ انہوں نے مدینہ منورہ میں ایسی کوئی نشانی نہیں چھوڑی جسے نہ مٹایا ہو، حضور ﷺ کے جوآثار تھے ایک ایک کر کے سب مٹادیئے اور چن چن کرختم کردیئے۔

لمحۂ فکریہ

افسوسناک اور ستم ظریفی کا پہلو یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں کعب بن اشرف کا قلعہ برقرار ہے اوراس پر

بورڈ لگایا ہوا ہے کہ یہ آثار قدیمہ میں سے ہے، خبردار کوئی شخص اس کو نقصان نہ پہنچائے، تو کعب بن اشرف کا قلعہ تو محفوظ ہے، نہ صرف محفوظ بلکہ اس کی حفاظت کے لئے بورڈ لگایا ہوا ہے اور مدینہ منورہ کے جتنے مآثر تھے ایک ایک کر کے، چن چن کر سب ختم کر دیئے ہیں، جس پر بس چلا اسے اٹھا کر ختم کر دیا۔ وہاں کبھی ہم جایا کرتے تھے اور وہاں پر حاضری ہو جایا کرتی تھی۔ ایک آخری چیز باقی رہ گئی تھی اور وہ مسجد قباء کے برابر وہ مکان تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس میں حضور ﷺ نے چودہ دن قیام فرمایا تھا۔ اب تین چار سال پہلے جب میں حاضر ہوا تو اس کو بھی ڈھا دیا گیا اور وہ بھی ختم کر دیا گیا۔

اس کی وجہ یہ کہتے ہیں کہ مآثر کو برقرار رکھنا اور مآثر انبیاء اور مآثر صلحاء سے تبرک حاصل کرنا **"شعب من شعب الشرک"** یہ شرک ہے، لہٰذا اس کو ختم کرنا ضروری ہے۔

استدلال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور کے ایک واقعہ سے ہے جو سنن سعید بن منصور میں مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حج کے لئے تشریف لے گئے، دیکھا کہ لوگ حج کے بعد ایک درخت کی طرف کثرت سے جا رہے ہیں اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ وہ مسجد ہے جہاں حضور ﷺ نے نماز پڑھی تھی، اس واسطے لوگ چاہتے ہیں کہ وہاں جا کر نماز پڑھیں۔ اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا کہ تم سے پہلی امتیں اس لئے ہلاک ہوئیں تھیں کہ انہوں نے اپنے انبیاء کے مشاہد کو مساجد بنا دیا تھا اور ان کے اندر نماز پڑھنی شروع کر دی اور ثواب کی چیز بنا دیا اور پھر عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا کہ اگر کسی کو نماز کا وقت ہے تو پڑھ لے اور اگر نہیں ہے تو چلا جائے۔ **" من عرض لہ صلوٰۃ فلیصل و من لا فلیمض"** [۴۷]

تبرک بآثار الانبیاءؑ جائز ہے

کہتے ہیں کہ دیکھو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان جگہوں پر نماز پڑھنے سے منع کیا، اب یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ہے جس میں حضور ﷺ کی تمام جگہوں پر نماز پڑھنے کا ذکر ہے۔ اسی سے سارے علماء یہ کہتے ہیں کہ انبیاء کرام علیہم الصلاۃ السلام کے مآثر سے تبرک جائز ہے جو "فتح الباری" میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی

---

۴۷ ... فلما قضی حجۃ ورجع والناس یبتدرون فقال ماھذا فقالوا مسجد صلّی فیہ رسول اللہ ﷺ فقال ھکذا ھلک اھل الکتاب اتخذوا آثار انبیائھم بیعا من عرضت لہ منکم فیہ الصلاۃ فیصل ومن لم تعرض لہ منکم فیہ الصلاۃ فلا یصل. تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: مصنف ابن أبی شیبۃ رقم: ۷۵۵۰، ج:۲، ص: ۱۵۱، مکتبۃ الرشد، الریاض سنۃ النشر ۱۴۰۹ ھ، وعمدۃ القاری، ج:۳، ص: ۵۵۹ و ۵۶۸، وفتح الباری، ج: ۱، ص: ۵۶۹.

لکھا ہے۔ ۱۷۵

لیکن ابھی حال میں سعودی عرب میں وہاں کے علماء کی نگرانی میں یہ کام ہوا ہے کہ وہاں کے جدید نسخوں میں جہاں جہاں یہ بات لکھی ہوئی ہے وہاں پر ایک حاشیہ لکھ دیا جاتا ہے کہ **"هذا خطائو هذا فيه نظر"** ۱۷۶

اور **"وهو أعلم بهذا الشان من ابنه رضي الله عنهما"** کہ حضرت عمرؓ کے قول کی زیادہ اقتدا کرنی چاہئے بنسبت ان کے بیٹے کے اور کہیں ایسا ہو تو ایک حدیث صحیح بخاری کی ہو لیکن ایک حدیث سعید بن منصور کی ہو تو پھر کہا جائے گا کہ صاحب بخاری کا سعید بن منصور کی روایت سے کیا مقابلہ۔ سعید بن منصور کی روایت کہاں اور بخاریؒ کی روایت کہاں، لیکن یہاں پر بخاری کی روایت جو ہے اس کی کوئی قیمت نہ رہی اور سعید بن منصور کی روایت کی بنیاد پر یہ کہہ دیا کہ ایسا کرنا شرک ہے۔

تبرک بآثار الانبیاء کا انکار غلو اور مکابرہ ہے

درحقیقت یہ بالکل غلو ہے اور دلائل شریعہ سے ناواقفیت پر مبنی ہے احادیث میں آثار انبیاء سے تبرک حاصل کرنے کے اتنے دلائل اور اتنے واقعات ہیں کہ ان کا انکار سوائے مکابرہ کے اور کچھ نہیں، ایک حدیث تو آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ کس کس طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جزرسی سے یہ بتایا کہ یہاں پر حضور ﷺ نے نماز پڑھی تھی لہٰذا پڑھو، اور یہ واقعات آپ پیچھے پڑھ آئے ہو کہ نبی کریم ﷺ کے جسم اطہر سے کوئی تھوک یا ریزش نہیں گرتی تھی، یہاں تک کہ لوگ اسے اپنے جسموں پر مل لیتے تھے، اب کہہ دو کہ یہ بھی شرک تھا؟

دلائل جوازِ تبرک

حضور نبی کریم ﷺ کے جسم سے مس کی ہوئی چیز کو صحابۂ کرامؓ اپنے جسم پر مل رہے ہیں یہ تبرک نہیں تو اور کیا تھا؟ پھر خود نبی کریم ﷺ نے اپنی ریش مبارک کے بال صحابہ میں تقسیم کئے تو اس تقسیم کرنے کا مقصد کیا تھا؟ اگر تبرک بآثار الانبیاءؑ جائز نہیں ہوتا تو خود آپ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کیوں تقسیم فرماتے، نیز صحابۂ کرامؓ نے ان تبرکات کا ایسا تحفظ فرمایا کہ وہ پانی جس میں آپ نے کلی فرمائی تھی وہ تقسیم فرما رہے تھے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا

---

۱۷۵ لأن ذلك من عمر محمول على أنه كره زيارتهم لمثل ذلك بغير صلاة أو خشي أن يشكل ذلك على من لا يعرف حقيقة الأمر فيظنه واجباً، وكلا الأمرين مأمون من ابن عمر، وقد تقدم حديث عتبان وسؤاله النبي ﷺ أن يصلي في بيته ليتخذه مصلى وإجابة النبي ﷺ إلى ذلك، فهو حجة في التبرك بآثار الصالحين الخ كذا ذكره الحافظ في فتح الباري، ج: ۱، ص: ۵۲۲ و ۵۶۹ .

۱۷۶ من أراد فليراجع في فتح الباري، ج: ۱، ص: ۵۲۲ و ۵۶۹.

ذکر پیچھے گزرا ہے ان سے فرمایا کہ اپنی ماں کے واسطے کچھ بچا کے رکھنا۔ ۱۷۷

وہی ام سلمہ رضی اللہ عنہا ہیں کہ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کا ایک موئے مبارک ایک شیشی کے اندر محفوظ رکھا ہوا تھا اور اس میں پانی ڈالا ہوا تھا۔ بخاری شریف میں **"کتاب اللباس"** میں یہ روایت ہے، تو سارے شہر میں جب کوئی بیمار ہوتا تو وہ اپنے ایک پیالے میں پانی رکھ کر حضرت ام سلمہؓ کی خدمت میں بھیجتے اور ان سے درخواست کرتے کہ آپ اس موئے مبارک کو ہمارے پانی میں بھی ڈال دیجئے تو وہ پانی جو شیشی میں ہوتا جس میں موئے مبارک تھا وہ اس پیالے میں ڈال دیتیں اور وہ لے جا کر اس مریض کو استشفاءً پلاتے۔ صحابۂ کرام ؓ باقاعدہ ان کے پاس بھیج رہے ہیں اور ام سلمہؓ یہ تبرک استشفاء کے لئے کرتی تھیں۔ ۱۷۸

حضرت ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت انس ؓ کی والدہ ہیں ان کی روایت بخاری **"کتاب الاستئذان"** کے اندر آئے گی وہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ سوئے ہوئے تھے گرمی کا موسم تھا تو آپ کے جسم اطہر سے پسینہ بہنے لگا تو میں جلدی سے ایک شیشی لے کر آئی اور جو پسینہ آپ کے جسم اطہر سے بہہ رہا تھا اس کو میں نے شیشی کے اندر جمع کر کے محفوظ کر لیا تو جتنی بہتر سے بہتر خوشبو کسی عطر میں ہو سکتی ہے وہ اس پسینہ مبارک میں تھی اور لوگ مجھ سے کہتے تھے۔ کہ ہم اپنی حنوط کو اس کے ساتھ تھوڑا سا مس کر لیں اور لوگ لے جایا کرتے تھے۔ ۱۷۹

مسلم شریف کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ جب آپ ﷺ بیدار ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ یہ کیا کر رہی ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! **"اتبرک بها"** کہ یہ میں اپنے بچوں کے واسطے تبرک جمع کر رہی ہوں، **فقال رسول الله ﷺ : "اصبت"** ۱۸۰

"أو كما قال عليه الصلوٰة والسلام" آپ نے اس کی تصویب فرمائی تو حضور اکرم ﷺ کی تقریر

---

۱۷۷ صحيح البخارى ، ۶۴ . كتاب المغازى ، (۵۷) باب غزوة الطائف فى شوال سنة ثمان، رقم:۴۳۳۸.

وفى فتح البارى: وقوله "يأخذون من فضل وضوئه " كأنهم اقتسموا الماء الذى فضل عنه. وقوله (ومج فيه) اى صب ماتناوله من الماء فى الإناء والغرض بذلك ايجاد البركة بريقه المبارك . (ج: ۱، ص: ۲۹۵ وعمدة القارى، ج: ۲، ص: ۴۸۴ .

۱۷۸ صحيح البخارى ، كتاب اللباس، (۶۶) باب مايذكر فى الشيب، رقم : ۵۸۹۶، ۵۸۹۷، ص: ۱۲۶۱ دارالسلام .

۱۷۹ ....أن ام سليم كانت تبسط للنبى ﷺ نطعاً فيقيل عندها على ذلك النطع قال : فاذا نام النبى ﷺ أخذت من عرقه وشعره، فجمعته فى فاردرة ثم جمعته فى سك وهو نائم. قال: فلما حضر انس بن مالك الوفاة أوصى إلى أن يجعل فى حنوطه من ذلك السك ، قال: فجعل فى حنوطه . صحيح البخارى، كتاب الإستئذان، (۴۱) باب من زار قوماً فقال عند هم ،رقم: ۶۲۸۱ .

۱۸۰ صحيح مسلم ، كتاب الفضائل، باب طيب عرق النبى ﷺ والتبرك به ، رقم: ۴۳۰۱.

بھی ثابت ہوگئی، **"فما ذا بعد الحق الا الضلال"**۔

حضرت خالد بن ولید ﷛ کے بارے میں منقول ہے کہ جب حضرت ابوطلحہ ﷛ موئے مبارک تقسیم فرما رہے تھے اس وقت انہوں نے ان سے آنحضرت ﷺ کی پیشانی کے چند بال لے لئے تھے جو انہوں نے اپنی ٹوپی سے لگا لئے تھے اور اس ٹوپی کو پہن کر جنگوں میں شریک ہوتے اور فتحیاب ہوتے، جنگ یمامہ میں وہ ٹوپی گر گئی، تو حضرت خالد ﷛ نے اس کو حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر نہایت زوردار حملہ کیا، اپنی جان کو اس طرح خطرہ میں ڈالنے پر صحابۂ کرام ﷡ نے ان پر اعتراض کیا تو انہوں نے جواب دیا **"انی ..... علیه الصلاة والسلام"**۔[۱۸۱]

حضرت سہل بن سعد ﷛ سے آپ ﷺ نے فرمایا تھا جو **"کتاب الاشربة"** میں مذکور ہے کہ حضور ﷺ جب سقیفہ بنی ساعدہ میں تشریف فرما تھے تو آپ نے حضرت سہل بن سعد ﷛ سے فرمایا کہ بھائی ذرا پانی پلاؤ، وہ ایک پیالہ لے کر آئے اور رسول کریم ﷺ کو پانی پلایا تو آپ نے اس پیالے کو اٹھا کر محفوظ کر دیا، حضرت سہل بن سعد ﷛ نے اس کے بعد جب حدیث سنائی تو وہ کہتے ہیں کہ میں وہ پیالہ نکال کر لایا کہ دیکھو! یہ پیالہ ہے میں نے جس میں نبی کریم ﷺ کو پانی پلایا تھا تو سب نے کہا کہ ہم بھی اس میں پئیں گے تو ہر ایک نے اس میں پانی پیا اور اس پیالہ کو باقاعدہ اہتمام کے ساتھ صحابہ کرام ﷡ و تابعینؒ نے محفوظ رکھا۔ یہ سہل بن سعد ﷛ کا واقعہ ہے۔[۱۸۲]

حضرت انس ﷛ فرماتے ہیں (ان کی حدیث حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے **"الاصابة فی تمییز الصحابه"** میں حضرت انس ﷛ کے حالات میں صحیح ابن السکن کے حوالے سے نقل کی ہے) کہ حضرت انس ﷛ نے ایک پیالہ رکھا ہوا تھا جس میں حضور اکرم ﷺ نے پانی پیا تھا تو وہ ٹوٹنے لگا تو اس کو زنجیر سے باندھ کر یعنی اس میں تکے لگا کر اس کو محفوظ رکھا اور صحابہ کرام ﷡ باقاعدہ اس کے تکے لگا لگا کر محفوظ رکھ رہے ہیں۔[۱۸۳]

یہ ایک دو واقعے نہیں، بے شمار واقعات ہیں۔

حضرت ابو محذورہ ﷛ جن کو نبی کریم ﷺ نے اذان سکھائی تھی کہ ساری عمر اپنے بال نہیں منڈوائے اس

---

[۱۸۱] عمدة القاری، ج:۳، ص:۴۸۴. وتهذیب الاسماء ج:۱، ص:۱۷۵.

[۱۸۲] صحیح البخاری، کتاب الاشربة، (۳۰) باب شرب من قدح النبی ﷺ و آنیة، رقم: ۵۶۳۷، ۱۲۱۳، دارالسلام سنة النشر ۱۴۱۷ھ۔

[۱۸۳] قال: وقال ابن سیرین: انه کان فیه حلقة من حدید، فاراد انس أن یجعل مکانها حلقة من ذهب أو فضة، فقال له ابو طلحة: لا تغیرن شیئاً صنعه رسول الله ﷺ فترکه (هکذا لفظ البخاری، فی کتاب الاشربة (۳۰) باب الشرب من قدح النبی ﷺ و آنیة، رقم:۵۶۳۸۔

واسطے کہ نبی کریم ﷺ کے دست مبارک نے ان کو مس کیا تھا۔۱۸۴

یہ عشق کی باتیں ہیں، یہ خشک مزاج لوگوں کی عقل میں نہیں آتیں، لیکن یہ ساری تفصیل احادیث کے اندر موجود ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو آپ دیکھ رہے ہیں، عمر بن شبہ نے اخبار مدینہ میں روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سارے مدینہ منورہ میں اور اس کے ماحول میں جتنی مسجدیں تھیں جس میں نبی کریم ﷺ کا نماز پڑھنا ثابت ہے ایک ایک آدمی سے پوچھ کر تحقیق کر کے جہاں حضور ﷺ نے نماز پڑھی تھی اس کے اوپر پتھر لگوائے تھے کہ یہ مسجد ہے جس میں حضور اکرم ﷺ نے نماز پڑھی ہے۔۱۸۵

یہ سب کام بے کار اور مشرکانہ تھے؟ اور کیا سب شرک کا ارتکاب کرتے تھے؟

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے منع کرنے کی وجہ

اب یہ بات کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے منع کیا تھا تو بھائی منع کرنے کے اسباب ہوتے ہیں۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے منع اس لئے کیا تھا کہ اہل کتاب کے طریقے پر کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ ان اماکن ہی کو نافع اور ضار سمجھنے لگیں یا ان کے اندر نماز پڑھنے کو واجب سمجھیں اور فرائض کو ترک کر کے اس کی طرف زیادہ متوجہ ہو جائیں' یہ بے شک منع ہے۔ ۱۸۶

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نفس "تبرک بالمآثر" کے منکر نہیں تھے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جہاں یہ بات ہے وہاں ایک اور بات بھی ہے جو "کتاب المغازی" میں مذکور ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک نیزہ تھا جس سے ابوذات الکرش کو قتل کیا تھا تو حضور ﷺ کے پاس وہ نیزہ رہا اور جب آپ ﷺ کا وصال ہوا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اٹھا کر اپنے پاس رکھا، جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ وہ نیزہ اپنے پاس لے گئے تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تمہارے

---

۱۸۴ ....أن أبا محذورة كانت له قصة في مقدم رأسه اذاقعد أرسلها فتبلغ الأرض فقالوا له ألا تحلقها فقال أن رسول الله ﷺ مسح عليها بيده فلم أكن لأحلقها حتى أموت فلم يحلقها حتى مات ، (المستدرك على الصحيحين ، ج:۳، ص:۵۸۹، رقم : ۶۱۸۱ ، دارالنشر دارالمكتب العلمية ، بيروت، ۱۴۱۱ھ ، ۱۹۹۰ء۔

ويستفاد من هذه الروايات اطلاع النبي ﷺ على فعل ام سليم وتصويبه ، ولا معارضة بين قولها انها كانت تجمعه لأجل طيبه وبين قولها للبركة بل يحصل على انها كانت تفعل ذلك للامرين معاً،فتح الباری ، ج: ۱۱،ص: ۷۲ .

۱۸۵ انظر : فتح الباری ، ج: ۱،ص: ۵۷۱ و عمدة القاری ، ج:۳،ص:۵۶۸۔

۱۸۶ قالوا: أمامارویٰ عن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنه ،أنه كره ذلك فلأنه شئی ان یلتزم الناس الصلاة فی تلك المواضع، فيشكل ذلك على من يأتی بعدهم ويرى ذلك واجباً (عمدة القاری ،ج:۳،ص: ۵۶۰، ۵۶۸ .

پاس وہ نیزہ ہے جو حضور ﷺ نے رکھا ہوا تھا تو انہوں نے کہا کہ جی ہاں، تو حضرت عمر ؓ نے فرمایا کہ مجھے دے دو میں اپنے پاس رکھوں گا تو حضرت عمر ؓ نے وہ نیزہ ساری عمر اپنے پاس رکھا اور جب ان کا وصال ہوا تو حضرت عثمان ؓ نے وہ نیزہ مانگا۔

تو یہ نیزہ ہی تو تھا لیکن اس کی اتنی حفاظت اور اتنا تحفظ؟ حضرت فاروق اعظم ؓ جیسا آدمی اس کی حفاظت کر رہا ہے تو وہ کیوں؟ ''عنزہ'' کا لفظ آتا ہے اور حضرت فاروق اعظم ؓ نے وہ اٹھا کر رکھا تو معلوم ہوا کہ فاروق اعظم ؓ بھی نفس تبرک بالمآثر کے منکر نہیں تھے وہ وہی عنزہ اٹھا کر کیوں رکھتے، دنیا میں اس نام کے ہزاروں عنزے تھے۔

ہمارے ہاں بھی ایک میزائیل کا نام عنزہ رکھا ہوا ہے، یہ اسی کے نام پر رکھا ہوا ہے۔ تو درحقیقت وہ عنزہ چونکہ حضور اکرم ﷺ کے پاس رہا تھا، اس وجہ سے تمام صحابۂ کرام ؓ اس کو اپنے پاس رکھنے میں سعادت سمجھتے تھے۔ ۱۸۷

شجرۂ بیعت رضوان کو کٹوانے کی وجہ

دوسرا واقعہ جو ان کا مشہور ہے وہ یہ کہ انہوں نے شجرۂ حدیبیہ (بیعت رضوان جس کے نیچے ہوئی) کو کٹوا دیا تھا اس میں پہلی بات تو یہ ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ کی روایت سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ درحقیقت جس درخت کو لوگ شجرۂ رضوان سمجھ رہے تھے اس کے شجرۂ رضوان ہونے میں شک تھا، بخاری کی روایت مغازی میں ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ''ہمیں تو پتہ نہیں ہے تم جانتے ہو تو بتاؤ'' مطلب یہ ہے کہ ہمیں تعیین کے ساتھ وہ درخت یاد نہیں ہے تمہیں معلوم ہو تو بتاؤ کہ کونسا درخت ہے؟ ۱۸۸

اور لوگ تعیین کے ساتھ اس کو شجرۂ رضوان سمجھ رہے تھے اس لئے فاروق اعظم ؓ نے اس کو کٹوا دیا۔ ۱۸۹

اور دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اندیشہ ہوا کہ لوگ اس کو باقاعدہ عرس کی جگہ نہ بنالیں تو اس واسطے انہوں نے کٹوا دیا لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی بھی آثر کو باقی نہ رکھا جائے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو روایتیں میں نے پیش کی ہیں یہ اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ تبرک بآثار

---

۱۸۷ صحیح البخاری، کتاب المغازی، رقم: ۳۹۹۸۔

۱۸۸ صحیح البخاری، کتاب المغازی، (۳۶) باب غزوۃ الحدیبیۃ، رقم: ۴۱۶۲، ۴۱۶۳، ۴۱۶۴، ۴۱۶۵۔

۱۸۹ وفی روایۃ ابن سعد باسناد صحیح عن نافع: أن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، بلغہ أن قوماً یأتون الشجرۃ فیصلون عندھا، فتوعدھم ثم أمر بقطعھا فقطعت۔ مصنف ابن ابی شیبۃ، ج: ۲، ص: ۱۵۰ و الطبقات الکبری ج: ۲، ص: ۱۰۰ و فتح الباری، ج: ۷، ص: ۴۴۸ و عمدۃ القاری، ج: ۱۲، ص: ۱۹۱۔

الانبیاء والصالحین جائز ہے اور ثابت ہے۔ ۱۹۰

مآثر انبیاء کے تبرکات کا مقصد

ان مشاہد اور تبرکات کا حاصل صرف اتنا ہے کہ آدمی حضور اکرم ﷺ کے ساتھ نسبت ہونی والی چیز کے ساتھ ایک محبت کا اظہار کرے اور اس سے تبرک حاصل کرے لیکن اس کو معبود سمجھ لے العیاذ باللہ یا اس کی عبادت شروع کر دے، یا اس کے ساتھ مس کو واجب سمجھ لے، یہ حدود سے تجاوز کرنا ہے۔ ۱۹۱

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو بعد میں لوگ ایسا کرنے لگیں، لہٰذا انہوں نے منع کر دیا، لیکن منع کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تبرکات کی کوئی سرے سے حیثیت ہی نہیں۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے تو حجر اسود کو بھی کہہ دیا تھا کہ جانتا ہوں تو صرف پتھر ہی ہے نہ تیرے اندر نفع پہنچانے کی طاقت ہے اور نہ تیرے اندر نقصان پہنچانے کی طاقت ہے لیکن **"أما والله إني لأعلم انک حجر، لاتضر ولاتنفع لولاأني رأيت رسول الله ﷺ يقبلک لم اقبلک"** فرمایا۔ ۱۹۲

ان کی نگاہ اس پر گئی کہ کہیں لوگ دوسری طرف غلو میں مبتلا نہ ہو جائیں، اس واسطے انہوں نے اس کو روکا، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تبرکات کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔

تبرکات مٹاؤ والے مؤقف کی حقیقت

لہٰذا یہ جو مؤقف اختیار کیا ہے کہ تبرکات کو مٹاؤ یہ بالکل غلو ہے اور تشدد فی الدین ہے اور دلائل واضحہ کے خلاف اور مکابرہ ہے، ہاں یہ بات ضرور ہے کہ یہ تبرک تبرک ہی کی حد میں رہنا چاہئے اس سے آگے بڑھ کر عبادت نہ سمجھا جائے کہ تبرک کو عبادت بنالیں اور آدمی اسی کو نافع وضار سمجھنے لگیں اور تعظیم ایسی کرنے لگیں کہ عبادت کے ساتھ مشابہ ہو جائے تو یہ باتیں منع ہیں اور غلو ہے اور بعض جگہ شرک کی حد تک پہنچ جاتی ہیں تو اس وجہ سے جہاں اس بات کا خطرہ ہو اور وہاں ممکن ہو تو اس جگہ لوگوں کو ایسا کرنے سے روک لیں، بس حد میں رہنے کا پابند بنایا جائے اور جہاں ممکن نہ ہو تو وہاں سد ذریعہ کے طور پر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بالکل رک جاؤ، یہ وہاں ہے

---

۱۹۰ الثاني: فيه الدلالة على جواز التبرک بآثار الصالحين۔ عمدة القاري، ج:۲، ص:۵۳۶۔

۱۹۱ وكان سبب خفائها أن يفتتن الناس بها لما جرى تحتها من الخير ونزول الرضوان فلو بقيت ظاهرة معلومة لخيف تعظيم الجهال اياها وعبادتهم لها، فاخفاؤها رحمة من الله تعالىٰ. عمدة القاري، ج:۱۰، ص:۱۹۱۔

۱۹۲ سنن و الترمذي، باب ماجاء في تقبيل الحجر، ج:۳، ص:۲۱۴، رقم:۸۶۰ و صحيح البخاري، كتاب الحج،(۵۰) باب ماذكر في الحجر الاسود، رقم: ۱۵۹۷ و (۵۷) باب الرمل في الحج والعمرة، رقم:۱۶۰۵ و (۶۰) باب تقبيل الحجر، رقم: ۱۶۱۰۔

جہاں لوگ حدود کے پابند نہیں رہیں گے، لیکن اس کو مطلق شرک قرار دینا اور آثار کو جان بوجھ کر مٹانا یہ بڑی زیادتی کی بات ہے کہ سرکارِ دوعالم ﷺ کے آثار کو ایک ایک کر کے مٹایا جارہا ہے۔

بھئی! تم نے روضۂ اقدس پر قابو پایا ہے کہ نہیں پایا، کہ روضۂ اقدس پر بھی لوگ شرک کرتے تھے، وہاں جا کر بدعات کرتے تھے، لیکن آدمی کھڑے کر دیئے مجال ہے کہ کوئی آدمی ہاتھ باندھ کر بھی کھڑا ہو جائے، اس کی بھی اجازت نہیں دیتے کہ ہاتھ نیچے کردو، وہاں پر پابندی لگائی ہوئی ہے لیکن تم نے غلو اور شرک کے اندیشہ سے بند نہیں کیا ہے تو جو کام وہاں کر رہے ہو دوسرے مآثر پر بھی کر سکتے ہو، اس واسطے غلو اور بدعات کو روکو، لیکن مآثر کو ضائع کرنا اور با قاعدہ ختم کرنا اور اس کو مشن بنالینا یہ اتنی افسوسناک بات ہے کہ کوئی حد احساس نہیں۔

چودہ صدیوں سے امت نے نبی کریم ﷺ کے ایک ایک مآثر کو محفوظ رکھا، ایک ایک یادگار کو اپنے سینہ سے لگا کر رکھا کہ کوئی آدمی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، کوئی دوسری قوم اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی تھی "خوخۂ ابوبکر" کو محفوظ رکھا، یہ نہیں کہ شرک کی وجہ سے، ارے عشق بھی کوئی چیز ہوتی ہے محبت بھی ہوتی ہے، تعلق خاطر بھی ہوتی ہے۔ آدمی جب ان یادگاروں کو دیکھتا ہے تو ان واقعات کو یاد کرتا ہے اور نبی کریم ﷺ اور ان کی سیرت طیبہ کو یاد کرتا ہے اس سے استحضار ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں اللہ جل جلالہ رسول کریم ﷺ کی محبت میں اضافہ فرماتے ہیں۔

چودہ صدیوں تک جن چیزوں کو محفوظ رکھا گیا ان کو یک لخت اٹھا کر ختم کر دیا، جب سے یہ برسر اقتدار آئے ایک ایک کر کے سب مٹا دیئے یعنی رفتہ رفتہ کر کے ایک دم سے سارے نہیں مٹائے، سوچا کہ لوگ ہنگامہ نہ کر دیں اس لئے رفتہ رفتہ کر کے کبھی ایک مٹایا، کبھی دوسرا اس طرح کر کے سب ختم کر دیئے، کوئی باقی نہیں چھوڑا۔

مستند تبرکات

جہاں سرکارِ دوعالم ﷺ کے تبرکات محفوظ کئے گئے ہیں، یوں تو دنیا کے مختلف حصوں میں آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب تبرکات پائے جاتے ہیں، لیکن مشہور یہ ہے کہ استنبول میں محفوظ یہ تبرکات زیادہ مستند ہیں۔ ان میں سرکارِ دوعالم ﷺ کا جبہ مبارک، آپ ﷺ کی دو تلواریں، آپ ﷺ کا وہ جھنڈا جس کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ وہ غزوۂ بدر میں استعمال کیا گیا تھا، موئے مبارک، دندانِ مبارک، مقوقس شاہِ مصر کے نام آپ ﷺ کا مکتوبِ گرامی اور آپ ﷺ کی مہر مبارک شامل ہیں۔

تاریخی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تبرکات بنو عباس کے خلفاء کے پاس موجود تھے، چنانچہ یہ آخری عباسی خلیفہ المتوکل کے حصے میں بھی آئے تھے، وہ آخر میں مصر کے اندر مملوک سلاطین کے زیر سایہ زندگی بسر کر رہا تھا، اقتدار و اختیار میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا۔ دسویں صدی ہجری میں جب حجاز اور مصر کے علاقوں نے عثمانی سلطان سلیم اوّل کی سلطنت تسلیم کر لی اور اسے "خادم الحرمین شریفین" کا منصب عطا کیا گیا تو عباسی خلیفہ

المتوکل نے ''خلافت'' کا منصب بھی سلطان سلیم کو سونپ دیا، اور مقاماتِ مقدسہ وحرمین شریفین کی کنجیاں اور یہ تبرکات بھی بطورِ سند خلافت ان کے حوالے کر دیئے۔ اسی کے بعد سے سلاطین عثمان کو ''خلیفہ'' اور ''امیر المؤمنین'' کا لقب مل گیا، اور پوری دنیائے اسلام نے ان کی یہ حیثیت کسی اختلاف کے بغیر تسلیم کر لی۔

اس طرح سلطان سلیم دسویں صدی ہجری میں یہ تبرکات مصر سے استنبول لے کر آئے، اور یہ اہتمام کیا کہ ''توپ کاپے سرائے'' میں ان کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک مستقل کمرہ تعمیر کیا۔ سلطان کی طرف سے ان تبرکات کی قدردانی اور ان سے عشق ومحبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب تک سلطان سلیم زندہ رہے استنبول میں مقیم رہنے کے دوران اس کمرے میں خود اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتے اور اس کی صفائی کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کمرے میں انہوں نے حفاظِ قرآن کو مقرر کیا کہ چوبیس گھنٹے یہاں تلاوت کرتے رہیں، حفّاظ کی باریاں مقرر تھیں، ایک جماعت کا وقت ختم ہونے سے پہلے دوسری جماعت آکر تلاوت شروع کر دیتی تھی۔ اس طرح یہ سلسلہ بعد کے خلفاء نے بھی جاری رکھا۔ اس طرح دنیا میں شاید ہی یہ واحد جگہ ہو جہاں چار سو سال تک تلاوتِ قرآن ہوتی رہی، اس دوران ایک لمحہ کے لئے بھی بند نہیں ہوئی۔ خلافت کے خاتمے کے بعد یعنی کمال اتاترک نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔

ان تبرکات کو انتہائی نفیس لکڑی کے صندوقوں میں رکھا گیا ہے، اور سال بھر میں صرف ایک بار رمضان کی ستائیس ویں شب میں باہر نکال کر ان کی زیارت کرائی جاتی ہے، عام دن میں یہ تبرکات صندوقوں میں بند رہتے ہیں، بس صرف صندوق ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔ بہر حال اس ظرف کی زیارت بھی ایک نعمت عظمی ہے جسے ان کی صحبت ومساس کا شرف حاصل ہو سعادت سے خالی نہیں ہے۔

درجۂ استناد کے لحاظ سے ان تبرکات کی جو بھی حیثیت ہو، لیکن ایک امتی کے لئے اس نسبت کی سچائی کا احتمال، اور صرف احتمال بھی کیا کم ہے!

اسی کمرے میں کچھ اور تبرکات بھی رکھے ہوئے ہیں جو شوکیسوں میں محفوظ ہیں، اور شفاف شیشوں کے واسطے سے ان کی زیارت کی جا سکتی ہے۔ ان میں ایک تلوار حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف منسوب ہے، چار تلواریں چاروں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب ہیں، ان کے علاوہ حضرت خالد بن ولید، حضرت جعفر طیار، حضرت عمار بن یاسر اور حضرت ابوالحسین رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب تلواریں بھی رکھی ہوئی ہیں۔ ایک حصہ میں کعبہ شریف کے دروازے کا ایک ٹکڑا، کعبہ شریف کا قفل اور چابیاں، میزابِ رحمت کے دو ٹکڑے اور وہ تھیلا بھی محفوظ ہے جس میں کسی زمانے میں حجر اسود رکھا گیا تھا، سرکارِ دو عالم ﷺ کے روضۂ اقدس کی مٹی بھی موجود ہے، لیکن محققین کا کہنا ہے کہ تلواروں کی نسبت مشکوک ہے۔[۱۹۳]

---

۱۹۳ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ''جہانِ دیدہ''، صفحہ ۳۳۸۔

حضرت انس ﷺ نے وصیت فرمائی تھی کہ میرے پاس حضور اکرم ﷺ کا ایک بال رکھا ہوا ہے، جب میں مروں تو مرنے کے بعد وہ میرے منہ میں رکھ دینا اور اس کے ساتھ مجھے دفن کر دینا، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا کہ دفن کے وقت ان کے منہ میں موئے مبارک رکھا ہوا تھا، یہ اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ تبرک بآثار الانبیاء والصالحین جائز ہے اور ثابت ہے۔

"رأيت سالم بن عبدالله يتحرى أماكن من الطريق ، فيصلي فيها، و يحدث أن أباه كان يصلي فيها".

فرمایا کہ سالم بن عبداللہ کہتے ہیں کہ **"يتحرى"** تحری کے کیا معنی ہیں، سالم بن عبداللہ **"يتحرى"** تلاش کر کے ان جگہوں کو جو راستے میں تھے اسی میں نماز پڑھتے تھے اور کہتے تھے **"ان أباه كان يصلّي فيها"**.

۴۸۴ ـ حدثنا ابراهيم بن المنذر قال: حدثنا انس بن عياض قال: حدثنا موسى ابن عقبة، عن نافع، ان عبدالله بن عمر أخبره أن رسول الله ﷺ كان ينزل بذى الحليفة حينن يعمر و فى حجته حين حج تحت سمرة فى موضع المسجد الذى بذى الحليفة، و كان اذا رجع من عزو كان فى تلك الطريق، او فى حج او عمرة هبط من بطن واد، فاذا ظهر من بطن واد، اناخ بالبطحاء التى على شفير الوادى الشرقية فعرس ثم حتى يصبح، ليس عند المسجد الذى بحجارة ولا على الاكمة التى عليها المسجد، كان ثم خليج يصلى عبدالله عنده، فى بطنه كثب كان رسول الله ﷺ ثم يصلى، فدحا فيه السيل بالبطحاء حتى دفن ذلك المكان الذى كان عبدالله يصلى فيه.[أنظر: ۱۵۳۲، ۱۵۳۳، ۱۷۹۹] ۱۹۴

۴۸۵ ـ وأن عبدالله بن عمر حدثه أن النبى ﷺ صلى حيث المسجد الصغير الذى دون المسجد الذى بشرف الروحاء، و قد كان عبدالله يعلم المكان الذى كان صلى فيه النبى ﷺ يقول: ثم عن يمينك حين تقوم فى المسجد تصلى، و ذلك المسجد على حافة الطريق اليمنىٰ وانت ذاهب الى مكة، بينه و بين المسجد الاكبر رمية بحجر أو نحو ذلك .

---

۱۹۴ وفى صحيح مسلم، كتاب الحج، باب الاهلال من حيث تنبعث الراحلة، رقم: ۲۰۳۵، وسنن النسائى، كتاب مناسك الحج، باب دخول مكة، رقم: ۲۸۱۳، وسنن أبى داؤد، كتاب المناسك، باب فى وقت الاحرام، رقم: ۱۵۰۹، ومسند أحمد، مسند المكثرين من الصحابة، باب مسند عبد الله بن عمر بن الخطاب، رقم: ۴۲۳۰، ۴۳۸۹، ۴۹۵۴، ۴۹۸۷، ۵۳۳۷، ۶۱۷۴، وموطأ مالك، كتاب الحج باب العمل فى الاهلال، رقم: ۶۴۷.

یہ دو روایتیں اصل میں حضرت ابن عمرؓ کی ہیں۔ ایک سالم نے روایت کی ہے اور دوسری نافع نے کی ہے اور سب معاملات میں اور جو پتے بتائے ہیں، ان میں سالم اور نافع کی روایتیں متحد ہیں۔ دونوں روایتیں جا کر مل جاتی ہیں، لیکن شرف الروحاء کے مقام پر جو نماز پڑھنے کی جگہ بتلائی ہے اس میں سالم اور نافع کے درمیان اختلاف ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ **"ان رسول اللہ ﷺ کان ینزل بذی الحلیفة حین یعتمر....."** آپ ﷺ ذوالحلیفہ میں قیام فرمایا کرتے تھے جبکہ آپ عمرہ کرتے اور اپنے حج میں بھی جبکہ آپ حج کرتے، ایک ببول کے درخت کے نیچے اس جگہ جہاں آج ذوالحلیفہ مسجد ہے۔ یہ حضرت ابن عمرؓ اپنے زمانے کی بات کر رہے ہیں وہاں جہاں ابھی مسجد ہے ایک ببول کے درخت کے نیچے اور جب آپ کسی غزوہ سے تشریف لاتے اور اس راستہ میں ہوتے یا حج سے آتے یا عمرے سے تشریف لاتے تو آپ بطن وادی کے اندر اتر جاتے تھے اور جب بطن وادی سے نکلتے تو اونٹ کو اس بطحاء پر سنگریز وادی میں بٹھاتے جو شرقیہ کے کنارے پر واقع ہے اور رات کو وہاں قیام فرماتے تھے۔ **"فعرس"** تعریس سے ہے یعنی وہاں تعریس فرماتے یعنی آخری شب میں اترتے، یہاں تک کہ صبح ہوتی۔ صرف نماز ہی کی بات نہیں کر رہے ہیں بلکہ بتا رہے ہیں کہ کہاں قیام فرماتے تھے، کس جگہ نزول ہوتا تھا۔

اب کسی کے ذہن میں شبہ ہوسکتا ہے اس کا ازالہ کر رہے ہیں **"لیس عند المسجد الذی بحجارة"** کہ اس مسجد کے پاس نہیں جہاں پتھر ہیں، پتھروں کے پاس جو مسجد ہے اور نہ اس ٹیلہ پر کہ جس پر مسجد واقع ہے بلکہ **"کان ثَمّ خلیج"** وہاں ایک خلیج تھی۔ عبداللہ بن عمرؓ اس خلیج کے پاس نماز پڑھا کرتے تھے جس کے پیٹ میں کچھ ٹیلے تھے۔

خلیج کے پیٹ میں کثب جمع کثب کی ٹلے۔ وہ خلیج جو تھی اس میں سیلاب آگیا **"بالبطحاء"** بطحاء کے اندر۔ یہاں تک کہ وہ جگہ دفن ہوگئی اور زیر زمین آگئی ہے جہاں حضرت عبداللہ بن عمرؓ نماز پڑھا کرتے تھے۔

نبی کریم ﷺ اس جگہ نماز پڑھا کرتے تھے جہاں چھوٹی مسجد واقع ہے اس مسجد سے پہلے جو شرف الروحاء پر ہے۔ **"شرف الروحاء"** روحاء مدینہ منورہ سے تقریباً چھتیس میل کے فاصلہ پر واقع ایک جگہ کا نام ہے اور یہاں پر بیئر روحاء ایک کنواں بھی ہے جو آج تک جاری ہے اور میں نے کہا تھا کہ وہ ابھی دست برد سے محفوظ ہے اس لئے کہ مدینہ منورہ سے چھتیس میل کے فاصلے پر ہے۔ تو وہ جگہ ایسی ہے جہاں حضور ﷺ کا نماز پڑھنا ثابت ہے جیسا کہ یہ مذکور ہے اور وہاں آپ ﷺ سے یہ روایت بھی ہے کہ یہاں یعنی روحاء میں چالیس انبیاء نے نمازیں پڑھی ہیں اور اس میں بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کنویں میں اپنا لعاب مبارک بھی ڈالا تھا اور آج تک وہ چلتا ہے، بڑا ہی میٹھا پانی ہے۔ تو اس کے لئے میں ایک سے زیادہ مرتبہ حاضر

ہوا تھا، وہاں کنواں چل رہا ہے وہ جگہ ابھی تک ایسی ہے جو دست برد سے محفوظ ہے۔

لیکن وہاں سالم اور نافع میں اس بارے میں اختلاف ہوگیا کہ وہ کہتے ہیں اس جگہ نماز پڑھی جو چھوٹی مسجد ہے اس مسجد سے پہلے جو شرف الروحاء کے اوپر ہے۔ "**أو قد كان عبداللّٰه كان صلىٰ فيه النبي ﷺ**" جب تم مسجد میں کھڑے ہو تو دائیں طرف اور وہ مسجد جو ہے وہ دائیں راستے کے کنارے پر ہے۔ جب تم مکہ مکرمہ جارہے ہوگے اس کے اور مسجد اکبر کے درمیان ایک پتھر پھینکنے کا فاصلہ ہے "**أو نحو ذالک**"۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس چھوٹے سے پہاڑ کی طرف بھی رخ کر کے نماز پڑھتے تھے جو روحاء سے واپس لوٹنے کی جگہ پر واقع ہے وہ مسجد جو کہ اس کے اور منصرف کے درمیان ہے جبکہ تم مکہ مکرمہ جارہے ہو، اب اس کا صرف ترجمہ ہی کرسکتے ہیں۔ اس کا کوئی نقشہ بنا نہیں سکتا۔ اب کہتے ہیں کہ سالم کہہ رہے ہیں کہ وہاں پر ایک اور مسجد بنی ہوئی ہے اب بھی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ وہاں پر نماز نہیں پڑھتے تھے اس کو بائیں طرف چھوڑ دیتے تھے اس سے آگے بڑھ کر جو پہاڑ ہے عین پہاڑ کے اوپر جا کر نماز پڑھتے تھے تو مسجد چھوڑ دی اور پہاڑ کے پاس جا کر نماز پڑھی، اس واسطے کہ حضور ﷺ وہاں نماز پڑھا کرتے تھے۔

۴۸۶ ــ وأن ابن عمر كان يصلي إلى العرق الذي عند منصرف الروحاء، وذلك العرق انتهاء طرفه على حافة الطريق دون المسجد الذي بينه وبين المنصرف وأنت ذاهب إلى مكة، وقد ابتني ثم مسجد فلم يكن عبد الله يصلي في ذلك المسجد كان يتركه عن يساره ووراءه ويصلي أمامه إلى العرق نفسه، وكان عبد الله يروح من الروحاء فلا يصلي الظهر حتى يأتي ذلك المكان فيصلي فيه الظهر، وإذا أقبل من مكة فإن مر به قبل الصبح بساعة أو من آخر السحر عرس حتى يصلي بها الصبح.

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روحاء سے روانہ ہوتے۔ رواح یہاں شام کے وقت جانے کے معنی میں نہیں بلکہ مطلق جانے کے معنی میں ہے۔ ظہر نہیں پڑھتے تھے اس وقت تک جب تک کہ اس جگہ تک نہ پہنچ جاتے، وہاں ظہر پڑھتے تھے۔ اور اگر مکہ سے آرہے ہوتے تو اگر صبح سے ایک گھنٹہ پہلے گزرتے یا آخری سحری کے وقت میں گزرتے "عَرَّس" وہاں پر اتر جاتے تھے تاکہ وہاں پر صبح کی نماز پڑھیں۔

۴۸۷ ــ وأن عبد اللّٰه حدثه أن النبي ﷺ كان ينزل تحت سرحة ضخمة دون الرويثة عن يمين الطريق ووجاه الطريق في مكان بطح سهل حتى يفضي من أكمة دوين بريد الرويثة بميلين، وقد إنكسر أعلاها فانثنى في جوفها وهي قائمة على ساق وفي ساقها كثب كثيرة.

یہ بھی فرمایا کہ حضور ﷺ قیام فرماتے تھے۔ "**سرحة**" بڑے درخت کو کہتے ہیں۔ تو بڑے درخت کے

نیچے جو "رویثہ" کے مقام سے پہلے ہے۔ "رویثۃ" ایک بستی کا نام ہے۔ راستے کے دائیں طرف جو راستہ کے سامنے ایک ایسی جگہ جو کہ وادی ہے، سہل ہے یعنی نرم زمین ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس ٹیلہ سے نکل جاتے جو قریب ہے "بريد الرويثة" کے۔ بریدالرویثہ بھی جگہ کا نام ہے۔ اس کا اوپر کا حصہ ٹوٹ چکا ہے اور وہ اپنے پیٹ کی طرف دوہرا ہوکر آ گیا ہے اور وہ ایک ساق پر کھڑا ہوا ہے۔ اور اس کے تنے کے نیچے بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹیلے ہیں۔ عرض کے پیچھے ایک ٹیلہ ہے ٹیلے کے کنارے پر نماز پڑھتے تھے۔

۴۸۸ ۔ وأن عبد اللّٰه بن عمر حدثه أن النبی ﷺ صلی فی طرف تلعة من وراء العرج وأنت ذاهب إلى هضبة ، عند ذلک المسجد قبران أو ثلاثة ، على القبور رضم من حجارة عن يمين الطريق عند سلمات الطريق ، بين أولئک السلمات كان عبد اللّٰه يروح من العرج بعد أن تميل الشمس بالهاجرة فيصلی الظهر فی ذلک المسجد۔

جب کہ تم جا رہے ہو اس مسجد کے پاس ایک "هضبة" میں۔ "هضبة" گھاٹی کو کہتے ہیں وہاں پر دو یا تین قبریں بنی ہوئی ہیں اور ان قبروں کے اوپر موٹے موٹے پتھر رکھے ہوئے ہیں۔

"رضم" کے معنی ہیں پتھر۔ "سلمات" درختوں کو کہتے ہیں ان "سلمات" کے درمیان حضرت عبداللہ بن عمرؓ جایا کرتے تھے عرض کی طرف۔

۴۸۹ ۔ و أن عبد اللّٰه بن عمر حدثه أن رسول اللّٰه ﷺ نزل عند سرحات عن يسار الطريق فی مسيل دون هرشی ، ذلک المسيل لاصق بكراع هرشی بينه وبين الطريق قريب من غلوة ، وكان عبد اللّٰه يصلی إلى سرحة هی أقرب السرحات إلى الطريق وهی أطولهن.

وہاں اترتے تھے سراحا کے معنی درخت راستے کے بائیں طرف ایک مسیل (نالے میں) جو ھرشی مقام سے پہلے ہے اور وہ نالہ ملا ہوا ہے "قراع هرشی" سے۔ اس کے راستہ کے درمیان ایک "غلوة" کا فاصلہ ہے۔ اگر تیر پھینکا جائے تو جہاں جا کر گرے اتنے فاصلے کو "غلوة" کہا جاتا ہے۔

۴۹۰ ۔ و أن عبد اللّٰه بن عمر حدثه أن النبی ﷺ كان ينزل فی المسيل الذی فی أدنی مر الظهران قبل المدينة حين يهبط من الصفراوات ينزل فی بطن ذلک المسيل عن يسار الطريق و أنت ذاهب إلى مكة ، ليس بين منزل رسول اللّٰه ﷺ و بين الطريق إلا رمية بحجر.

۴۹۱ ۔ و أن عبد اللّٰه بن عمر حدثه أن النبی ﷺ كان ينزل بذی طوی و يبيت حتی يصبح يصلی الصبح حين يقدم مكة ، و مصلی رسول اللّٰه ﷺ ذلک على أكمة

غليظة ليس في المسجد الذى بنى ثم و لكن أسفل من ذلک على أكمة غليظة . [أنظر: ۱۷۶۷، ۱۷۶۹]

"**مر الظهران**" بھی جگہ کا نام ہے اور "**ذی طوی**" پر بھی اترا کرتے تھے۔ ذی طوی بھی کنواں ہے جواب شہر مکہ کے اندر آ گیا ہے۔ اب یہ محلّہ زاہر کے نام سے کہلاتا ہے، زاہر کے محلے میں یہ واقع ہے وہاں اترا کرتے تھے۔

(۹۴) باب السترة بمكة و غيرها

مکہ اور دوسرے مقامات میں سترہ کا بیان

۵۰۱ ـ حدثنا سليمان بن حرب قال: حدثنا شعبة ، عن الحكم، عن ابى جحيفة قال: خرج رسول الله ﷺ بالهاجرة فصلى بالبطحاء الظهر والعصر ركعتين و نصب بين يديه عنزة و توضأ، فجعل الناس يتمسحون بوضوئه. [راجع: ۱۸۷]

ترجمۃ الباب سے مقصود امام بخاریؒ

"باب السترة بمكة و غيرها".

اس باب میں امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ مصلی کے سامنے سے گزرنے کی جو ممانعت آئی ہے آیا یہ ممانعت مکہ مکرمہ میں بھی لاگو ہے یا نہیں؟

اس مسئلے میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے:

مرور امام المصلّی میں اختلاف فقہاء

امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ ممانعت عام ہے مکہ ہو یا مدینہ، حرم ہو یا مسجد نبوی ہو، ہر حالت میں مصلی کے سامنے سے گزرنا ناجائز ہے اور ایسا لگتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا مذہب بھی یہی ہے، اس لئے انہوں نے باب قائم کیا "**باب السترة بمكة وغيرها**" یعنی مکہ اور غیر مکہ میں سترہ کے اندر کوئی فرق نہیں ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ٹھیک ہے ویسے تو فرق نہیں اور مصلی کے سامنے سے کسی حالت میں بھی گزرنا جائز نہیں، نہ مکہ میں نہ مدینہ میں اور نہ کہیں اور لیکن مکہ مکرمہ میں اتنا ہے کہ جو لوگ طواف کر رہے ہے وہ اگر مصلی کے سامنے سے گزر جائیں تو معاف ہے، کیونکہ طواف ایک عبادت ہے اور مصلی جو نماز پڑھ رہا ہے وہ بھی عبادت ہے تو یہ ایسا ہوا کہ مصلی کے سامنے کوئی دوسرا مصلی نماز پڑھ رہا ہے، لہٰذا طواف کرنے والا اگر

مصلی کے سامنے سے گزر جائے تو وہ کہتے ہیں کہ جائز ہے اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور یہی مذہب بعض حنفیہ کا بھی ہے۔[۱۹۵]

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مکہ وغیر مکہ میں فرق ہے مکہ مکرمہ میں بلکہ پورے حدود حرم میں مصلی کے سامنے سے گزرنا جائز ہے کہیں بھی کوئی نماز پڑھ رہا ہو تو اس کے سامنے سے گزرنا جائز ہے چاہے وہ مکہ مکرمہ کا شہر ہو یا مسجد حرام ہو یا حدود حرم میں جگہ ہو۔[۱۹۶]

امام بخاری رحمہ اللہ اس کی تردید کرنا چاہ رہے ہیں۔

امام طحاوی رحمہ اللہ کا مسلک

احناف میں سے امام طحاوی رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ مسجد حرام میں یا مکہ مکرمہ کے شہر میں کسی ایسی جگہ جہاں سے کعبہ سامنے نظر آتا ہو وہاں مصلی کے سامنے سے گزرنا جائز ہے۔ یہ پورے مسجد حرام یا صرف طائفین کے ساتھ خاص نہیں بلکہ پورے مسجد حرام میں بلکہ اگر آدمی باہر بھی کسی جگہ کھڑا ہے جہاں سے کعبہ سامنے نظر آ رہا ہو تو اس صورت میں مصلی کے سامنے سے گزرنے والے کے لئے جائز ہے کہ وہ بغیر سترے کے گزر جائے، اس پر انہوں نے روایت نقل کی ہے۔[۱۹۷]

اور ایک روایت دوسری جگہ یعنی مصنف عبد الرزاق میں ہے اور اس کے مختلف طرق ہیں جو اس کو درجہ حسن تک ضرور پہنچا دیتے ہیں، نبی کریم ﷺ کو مسجد حرام میں نماز پڑھتے دیکھا گیا آپ کے سامنے کوئی سترہ نہیں تھا اور لوگ آپ کے سامنے سے گزر رہے تھے۔[۱۹۸]

---

[۱۹۵] قال الطحاوی فی مشکله أنه لا بأس بمرور الطائفين أمام المصلی عند البيت لأن الطواف بالبيت صلاة ولا توجد تلک المسألة فی المذاهب الاربعة إلا عند الطحاوی وهذا باب ناظر إليها إلا أن الصلاة فی الحديث كانت على نحو ميل من مكة ومسألة الطحاوی فی داخل المسجد۔ الخ ، فيض الباری ، ج:۲،ص: ۸۱.

[۱۹۶] فصل ــــ ولا بأس أن يصلی بمكة إلى غير سترة روى ذلک عن ابن الزبير وعطأ ومجاهد قال الأثرم قيل لأحمد الرجل يصلی بمكة ولا يستتر بشئی فقال قد روی عن النبی صلی الله عليه وسلم أنه صلی وثم ليس بينه وبين الطواف سترة قال احمد لأن مكة ليست كغيرها كان مكة مخصوصة الخ ، المغنی ، ج:۲،ص: ۴۰ ، دارالفکر ، بیروت ، ۱۴۰۵ھ۔

[۱۹۷] شرح معانی الآثار ، ج: ۱،ص: ۲۶۱ ، دارالكتب العلمية ، بیروت ، ۱۳۹۹ھ.

[۱۹۸] باب لا يقطع الصلاة شئی بمكة ، رقم: ۲۳۸۵ ، عبد الرزاق عن معمر ابن طاووس عن أبيه قال لا يقطع الصلاة بمكة الخ و رقم ۲۳۸۷، عبد الرزاق عن عمرو بن قيس قال أخبرنی كثير بن كثير بن المطلب بن أبی وداعة عن أبيه عن جده قال رأيت النبی صلی اللّٰه عليه وسلم يصل فی المسجد الحرام والناس يطوفون بالبيت بينه وبين القبلة بين يديه ليس بينه وبينهم سترة ، مصنف عبدالرزاق ، ج:۲،ص: ۳۵ ، المكتب الاسلامی ، بیروت ، ۱۴۰۳ھ.

اس حدیث سے امام طحاوی رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے اور حنفیہ میں سے انہوں نے ہی بہت جم کر یہ فرمایا کہ مسجد حرام میں سترے کے احکام نہیں ہیں بلکہ سامنے سے گزر سکتے ہیں۔ فقہائے احناف فقہ کی کتابوں میں جب یہ مسئلہ ذکر کرتے ہیں تو ڈرڈر کر کرتے ہیں کہ ان میں یہ لکھ دیا کہ طائفین یعنی طواف کرنے والوں کے لئے جائز ہے۔ ۱۹۹

علامہ شامی رحمہ اللہ نے امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے اور پھر کہا ہے کہ امام طحاوی نے بڑی نادر بات کہی ہے اور اس کو یاد رکھنا، مطلب یہ ہے۔ کہ ان کو یہ قول پسند آیا اور بات ٹھیک ہے اور حدیث سے چونکہ اس کی تائید ہوتی ہے، لہٰذا یہی قول راجح ہے۔ ۲۰۰

سوال: کیا مسجد حرام میں سترے کے احکام جاری نہیں ہوتے ہیں اور اس میں اگر آدمی سامنے سے گزر جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب: واللہ اعلم حکمت کے پیچھے ہم زیادہ پڑتے نہیں ہیں، لیکن علمائے کرام نے یہ حکمت بیان کی ہے کہ سترے کا حکم اس لئے ہے کہ جس وقت بندہ نماز پڑھ رہا ہوتا ہے اس وقت اس کا اللہ ﷻ کے ساتھ ایک خاص تعلق قائم ہوتا ہے تو اس کے سامنے سے بغیر سترے کے کسی شئی کا گزر جانا یہ اس تعلق کو منقطع کرنے کا سبب بنتا ہے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب کعبہ سامنے ہو تو نماز پڑھنے والے کی کیفیت ہی کچھ اور ہوتی ہے یہاں نماز پڑھ لو اور حرم میں کعبہ کے سامنے نماز پڑھ لو، دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہاں جو تعلق قائم ہو رہا ہے اور وہاں جو تعلق قائم ہو رہا ہے جہاں کعبہ سامنے نظر آتا ہو، زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہاں تعلق کمزور ہے سامنے سے گزرنے والے کے مرور سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اور وہاں جو تعلق قائم ہے کعبہ کے سامنے اور کعبہ کے ساتھ اتنی عظمت و جلال کا واسطہ ہے تو اس صورت میں کتنے ہی لوگ گزرتے رہیں، پرواہ بھی نہیں ہوتی کہ میرے سامنے تو کعبہ ہے تو اس واسطے وہ گزرنا قطع مصلی کا سبب نہیں بنتا، واللہ اعلم اور یہی قول درست اور راجح ہے لیکن یہ حکم صرف مسجد حرام میں ہے مسجد نبوی میں نہیں، لہٰذا مسجد نبوی میں سامنے سے گزرتے ہوئے بڑا اہتمام چاہئے اور لوگ اہتمام نہیں کرتے، **"والناس عنه غافلون"** کیونکہ بعض مرتبہ لوگوں کو یہ مسئلہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مسجد حرام میں گزر سکتے ہیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ دونوں حرم ایک ہی جیسے ہیں، لہٰذا وہاں پر بھی وہی احکام

---

۱۹۹ **وليس بينهما سترة وهو محمول على الطائفين فيما يظهر لأن الطواف صلاة فصار كمن بين يديه صفوف من المصلين انتهى.** حاشيه ابن عابدين، ج: ۱، ص: ۶۳۶، بيروت.

۲۰۰ **بين يديه صفوف من المصلين اھ.**

وقال ثم رأيت في البحر العميق حكى عز الدين بن جماعة عن مشكلات الآثار للطحاوي أن المرور بين يدى المصلي بحضرة الكعبة يجوز اھ قلت وهذا فرع غريب فليحفظ. حاشيه ابن عابدين، ج: ۲، ص: ۵۰۲.

جاری کرو، جو درست بات نہیں۔

یہ روایت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ کی ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہاجرہ میں نکلے، ہاجرہ کے معنی ہیں دوپہر کا وقت۔ **"فصلی" الخ** بطحاء میں ظہر اور عصر کی دو رکعتیں پڑھیں **"و نصب بین یدیہ عنزۃ"** آپ کے سامنے ایک عنزہ (نیزہ) لگایا ہوا تھا۔ یہ موضع ترجمہ ہے، بطحاء سے مکہ مکرمہ کی بطحاء مراد ہے وہاں نماز پڑھ رہے تھے اور عنزہ گاڑھا ہوا تھا، معلوم ہوا کہ سترہ کے احکام وہاں پر بھی ہیں۔

لہٰذا اس سے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی تردید مقصود ہے اور اس سے ان لوگوں کی تردید نہیں ہو رہی جو کہہ رہے ہیں کہ یہ احکام مسجد حرام سے باہر کے ہیں اور مسجد حرام کے اندر کے نہیں ہیں جیسا کہ امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، **"وتواضؤا" الخ.**

(۹۵) باب الصلاۃ الی الأسطوانۃ

ستون کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا بیان

"وقال عمر: المصلون احق بالسواری من المتحدثین إلیها، ورای عمر رجلا یصلی بین اسطوانتین فأدناہ الی ساریۃ. فقال: صل الیها".

امام بخاری رحمہ اللہ نے کسی ستون کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کے بارے میں یہ باب قائم کیا ہے۔

سترہ کی ضرورت

"اسطوانہ" ستون کو کہتے ہیں اور یہ بات مستحب ہے کہ جب کوئی شخص نماز پڑھے تو ایسی جگہ پڑھے جہاں سامنے کوئی سترہ ہو، تاکہ گزرنے والوں کو کوئی تکلیف نہ ہو، لہٰذا جب آدمی مسجد میں جماعت کے علاوہ نماز پڑھ رہا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اس بات کا اہتمام کرے کہ کسی ستون کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھ لے تاکہ گزرنے والوں کو تکلیف نہ ہو، اگر ستون کے علاوہ پڑھے گا اور سامنے کوئی سترہ نہ ہو تو گزرنے والے کو لمبا چکر کاٹنا پڑے گا جو اس کے لئے تکلیف کا باعث بنے گا۔

اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ **"المصلون أحق بالسواری من المتحدثین إلیها"** نمازی لوگ یعنی جو نماز پڑھنے والے ہیں وہ ستونوں کے زیادہ مستحق ہیں بنسبت ان لوگوں کے جو وہاں بیٹھ کر باتیں کریں یعنی جو لوگ ستونوں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں ان سے وہ لوگ زیادہ ستونوں کے مستحق ہیں جو ان کے سامنے کھڑے ہو کر نماز پڑھنا چاہتے ہیں۔

"ورأی عمر" اور حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو دیکھا جو دو ستونوں کے درمیان نماز پڑھ رہا تھا **"فأدناہ الیٰ ساریة"** انہوں نے اس کو ایک ستون کے قریب کر دیا اور کہا **"صل الیھا"** یہاں کھڑے ہو کر نماز پڑھو۔

ضروری تنبیہ

یہ مشہور و معروف مسئلہ ہے کہ مصلّی کو حتی الامکان یہ کوشش کرنی چاہئے کہ جب وہ نماز پڑھے تو اس کے سامنے کوئی سترہ ہو لیکن افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ہاں طلبہ وغیرہ اس بات کا دھیان نہیں رکھتے۔ ساری مسجد خالی پڑی ہوتی ہے اور وہ صحن کے درمیان کھڑے ہو کر نماز پڑھنا شروع کر دیتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص گزرنا چاہے تو اس کو لمبا چکر کاٹنا پڑتا ہے اور بعض اوقات تو لمبا چکر کاٹ کر بھی راستہ نہیں ملتا، یہ بڑی غلط بات ہے۔ فقہائے کرام نے فرمایا ہے کہ اس طرح کھڑا ہونا جس سے دوسرے گزرنے والوں کو تکلیف ہو، گناہ ہے۔

فرض کریں اگر کوئی شخص ایسے موقع پر نمازی کے سامنے سے گزرے اور اس کے پاس گزرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ ہو، مجبوری ہو تو اس صورت میں گزرنے والے پر گناہ نہیں ہے۔ بلکہ نماز پڑھنے والے پر ہے کیونکہ اس نے خود مجبور کیا کہ وہ اس کے سامنے سے گزرے۔ اس لئے خود بھی اس کا اہتمام کرنا چاہئے اور دوسرے جو ساتھی ایسی حرکت کرتے ہیں ان کو بھی سمجھانا چاہئے۔

۵۰۲ ـ حدثنا المکی قال: حدثنا یزید بن ابی عبید قال: کنت آتی مع سلمة بن الاکوع فیصلی عند الاسطوانة التی عند المصحف، فقلت: یا ابا مسلم! اراک تتحری الصلاۃ عند ھذہ الاسطوانة؟ قال: فانی رایت النبی ﷺ یتحری الصلاۃ عندھا. [۲۰۱]

امام بخاری رحمہ اللہ نے یزید بن ابی عبید کی روایت نقل کی ہے اور یہ امام بخاری رحمہ اللہ کی ثلاثیات میں سے ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں حضرت سلمۃ بن الاکوعؓ کے ساتھ آتا تھا یعنی مسجد نبوی میں حاضر ہوتا تھا **"فیصلی عند ان اسطوانة التی عند المصحف"** تو وہ خاص طور پر اس ستون کے پاس کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے جو مصحف کے پاس تھا۔

یہ اس مصحف کا ذکر ہے جو حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانے میں لکھوایا تھا وہ مسجد نبوی میں ایک جگہ رکھوا دیا تھا اور وہ مصحف کی جگہ معروف تھی، اب وہ مصحف نہیں رہا۔ [۲۰۲]

---

[۲۰۱] وفی صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب دنو المصلی من السترۃ، رقم: ۷۸۸، وسنن ابن ماجة، کتاب إقامة الصلاۃ، السنة فیھا، باب ما جاء توطین المکان فی المسجد یصلی فیه، رقم: ۱۴۲۰، ومسند أحمد، أوّل مسند المدنیین أجمعین، باب حدیث سلمة بن الاکوع، رقم: ۵۹۱۹.

[۲۰۲] فیض الباری، ج: ۲، ص: ۸۱

''اسطوانة'' کی تعیین میں اختلاف شرّاح

شراح حدیث نے اس میں کلام کیا ہے کہ اس سے کون سا اسطوانہ مراد ہے؟

بعض حضرات نے فرمایا کہ ''**اسطوانة عائشة**'' مراد ہے، مسجد میں جو اسطوانے ہیں ان میں ایک اسطوانہ عائشہ رضی اللہ عنہا بھی ہے جس کو ''**اسطوانة المهاجرين**'' بھی کہتے ہیں۔

علامہ عینیؒ اور حافظ ابن حجرؒ کی رائے

علامہ عینی اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ دونوں نے یہ کہا ہے کہ یہاں اسطوانۂ عائشہ رضی اللہ عنہا مراد ہے، حضرت سلمۃ بن الاکوع رضی اللہ عنہ اس کے پاس جا کر نماز پڑھتے تھے۔ ''**فقلت يا أبا مسلم**'' میں نے ان سے کہا اے ابو مسلم! میں آپ کو دیکھتا ہوں کہ آپ خاص طور سے اہتمام کرتے ہیں ''**تتحری**'' با قاعدہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر آپ اس اسطوانہ کے پاس نماز پڑھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ''**رأيت النبي ﷺ يتحرى الصلاة عندها**'' میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ بھی خاص طور پر اس جگہ نماز پڑھتے تھے اور اہتمام فرماتے تھے۔

علامہ عینی اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ کا خیال یہ ہے کہ اس سے اسطوانۂ مہاجرین یا اسطوانۂ عائشہ مراد ہے، آج بھی اس پر یہ نام لکھا ہوا ہے ''**هذه اسطوانة عائشة**''۔

اسطوانۂ عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت

اس اسطوانہ کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے تحویل قبلہ کے بعد کچھ عرصہ تک وہاں کھڑے ہو کر امامت فرمائی، گویا یہ آپ ﷺ کا مصلی تھا، آپ ﷺ کے کھڑے ہونے کی جگہ تھی، نیز اس سے پشت لگا کر آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے تشریف فرما بھی ہوتے تھے۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ میری مسجد میں ایک اسطوانہ ہے، یعنی ایک جگہ ایسی ہے کہ اگر لوگوں کو اس کی فضیلت معلوم ہو جائے تو لوگ وہاں پر نماز پڑھنے کے لئے قرعہ اندازی کرنے لگیں۔ پھر اس جگہ کی نشاندہی فرمائی اور وہ ''**رياض الجنة**'' کے اندر حضور اقدس ﷺ کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔

اول تو مسجد نبوی کی فضیلت پھر مسجد نبوی میں ''**رياض الجنة**''، پھر ''**رياض الجنة**'' میں بھی وہ حصہ جہاں نبی کریم ﷺ کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اگر لوگوں کو اس جگہ کی فضیلت معلوم ہو جائے تو قرعہ اندازی کرنے لگیں۔ تو علامہ عینی اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ کا

خیال ہے کہ یہاں اسطوانۂ عائشہؓ مراد ہے۔ ۲۰۳

علامہ سمہودیؒ کی رائے

علامہ سمہودی رحمہ اللہ نے وفاء الوفاء میں ان دونوں بزرگوں یعنی حافظ ابن حجر اور علامہ عینی رحمہما اللہ سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ ان حضرات سے اسطوانہ کے تعیین میں مسامحت ہوگئی ہے، اس سے اسطوانۂ عائشہ رضی اللہ عنہا مراد نہیں ہے بلکہ اس سے رسول اللہ ﷺ کا مصلّی مراد ہے جس کو "**اسطوانة علم المصلّى**" کہا جاتا ہے، یہ نام وہاں لکھا ہوا نہیں ہے، کتابوں میں آتا ہے اور یہ اس جگہ ہے جہاں آج "**رياض الجنة**" میں محراب بنی ہوئی ہے۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ یہی محراب حضور ﷺ کا مصلی ہے حالانکہ حضور ﷺ کے زمانہ میں محراب نہیں تھی، وہ مصلّی نہیں ہے بلکہ محراب کے دائیں طرف ایک ستون ہے جس پر "**مصلّى النبى**" لکھا ہوا ہے اور یہ وہ اسطوانہ ہے جسے "**اسطوانة علم المصلّى**" کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے مصلّی کی علامت ہے، حضور ﷺ وہاں کھڑے ہوکر امامت فرمایا کرتے تھے۔

اس کے ساتھ ایک لمبا ستون ہے جس پر لکھا ہوا ہے "**هذه الاسطوانة المخلقة مختلقة**" اس کو کہتے ہیں جس کو خلوق کی خوشبو لگائی جاتی تھی۔۲۰۴

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ "**اسطوانة حنّانه**" وہیں پر تھا یعنی "رونے والا" لیکن اس پر اسطوانۂ مخلقہ لکھا ہوا ہے، اس زمانہ میں ہر ایک ستون پر خلوق کی خوشبو لگاتے تھے، لیکن صرف اس اسطوانہ پر اسطوانۂ مخلقہ کیوں لکھا ہوا ہے؟ اس کی وجہ معلوم نہیں۔

بہر حال علامہ سمہودی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں اسطوانۂ علم المصلّی مراد ہے اور یہ "**رياض الجنة**" میں دوسری اہم جگہ ہے جہاں نماز پڑھنے کی اس لئے فضیلت ہے کہ ان دنوں میں جب آپ ﷺ نے اسطوانۂ عائشہؓ کے سامنے کھڑے ہوکر نماز پڑھائی، باقی دنوں میں آپ مستقل طور پر یہیں پر کھڑے ہوکر نماز پڑھتے تھے۔ تو حضرت سلمہ بن الاکوع ؓ نے اس جگہ کا انتخاب کیا اور وہاں پر نماز پڑھی۔

---

۲۰۳ قال ابن حجر و الاسطوانة المذكورة حقق بعض مشائخنا أنها المتوسطة فى الروضة الكريمة وأنها تعرف باسطوانة المهاجرين . قال وروى عن عائشة أنها قالت لو عرفها الناس لاضطربوا عليها بالسهام الخ ، فيض القدير ، ج: ۱، ص: ۳۹۰، المكتبة التجارية الكبرى، مصر ، ۱۳۵۶ھ ، و فتح البارى ، ج: ۱، ص: ۵۷۷ ، وعمدة القارى ، ج: ۳، ص: ۵۷۷

۲۰۴ فيض البارى ، ج: ۲، ص: ۸۱.

حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے

حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ نے اس بارے میں علامہ سمہودی رحمہ اللہ کی تحقیق کو راجح قرار دیا ہے۔

اسی **"ریاض الجنة"** میں چار ستون اور ہیں۔

۱۔ **اسطوانة التوبة:** اس کو اسطوانۂ ابولبابہ بھی کہتے ہیں اور یہ وہ اسطوانہ ہے، جس سے حضرت ابولبابہ ﷺ نے اپنے آپ کو باندھ لیا تھا، تفصیل مغازی میں ہے اور حضور اقدس ﷺ کا بھی اس جگہ پر بکثرت نماز پڑھنا ثابت ہے۔

۲۔ **اسطوانة السّرير:** یہ وہ اسطوانہ ہے جس کے پاس حالتِ اعتکاف میں حضور ﷺ کی چارپائی ہوتی تھی۔

۳۔ **اسطوانة الوفود:** جب باہر سے آپ ﷺ کی خدمت میں وفود آتے تھے تو آپ ﷺ اس اسطوانہ سے ٹیک لگا کر ان سے گفتگو فرمایا کرتے تھے۔

۴۔ **اسطوانة الحرس:** حضرت علی ﷺ یا بعض اوقات کوئی اور صحابی اس پر بیٹھ کر حضور ﷺ کے لئے پہرہ دیا کرتے تھے۔

۵۔ **اسطوانة التهجد:** ہے۔ یہ حضرت علی ﷺ کے مکان کی شمالی جانب اور صفہ سے جنوب کی جانب ہے۔ بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ وہاں تہجد کی نماز پڑھا کرتے تھے۔

مسجد نبوی میں یہ مختلف اسطوانے ہیں، ان میں نماز پڑھنے، دعاؤں اور عبادت کے لئے یہ تین اسطوانے یعنی **"اسطوانة علم المصلّٰی، اسطوانة عائشة رضی اللّٰه عنها "** (مہاجرین) اور اسطوانۂ توبہ، خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

حضرت سلمہ بن الاکوع ﷺ کے اس خاص عمل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ صحابہ ﷺ بھی ان مقامات پر نماز پڑھنے کا اہتمام فرماتے تھے، لہٰذا وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ سارا **"ریاض الجنة"** برابر ہے، اس لئے کسی خاص اسطوانے کی طرف جانے کا اہتمام کرنے کی کوئی حاجت نہیں، حضرت سلمہؓ کے اس عمل سے یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت سلمہؓ خاص طور پر تحرّی کرکے اس طرف نماز نہ پڑھتے۔

۵۰۳ ـ حدثنا قبيصة قال: حدثنا سفيان، عن عمرو بن عامر، عن أنس قال: لقد رأيت كبار اصحاب النبي ﷺ يبتدرون السواري عند المغرب. وزاد شعبة، عن عمرو، عن

أنس: حتى يخرج النبي ﷺ. [أنظر: ۶۲۵]. ۲۰۵

حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے بڑے بڑے صحابہ کو پایا کہ وہ مغرب کے وقت جلدی سے ستونوں کے پاس جایا کرتے تھے۔

شعبہ کی روایت میں ہے، یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ نکل آتے یعنی اذان ہو چکی ہوتی اور جب تک آپ ﷺ تشریف نہ لاتے تو صحابہ ؓ دو رکعت پڑھنے کے لئے جلدی سے ستونوں کے پاس جاتے۔

مقصود بخاری رحمہ اللہ

یہاں اس حدیث سے امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد صحابۂ کرام ؓ کا یہ عمل بیان کرنا ہے کہ وہ نماز پڑھنے کے لئے ستونوں کی طرف جایا کرتے تھے۔ اس سے پتہ چلا کہ اگر اکیلے نماز پڑھنی ہو تو کسی ستون کی طرف پڑھنی چاہئے تاکہ سترہ ہو جائے۔

"رکعتین قبل المغرب" میں اختلاف ائمہ

یہاں فقہ کا دوسرا مسئلہ "**رکعتین قبل المغرب**" کا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک "**رکعتین قبل المغرب**" مستحب ہیں۔ ۲۰۶

ان کا استدلال اس حدیث سے ہے کہ صحابہ کرام ؓ "**رکعتین قبل المغرب**" پڑھا کرتے تھے، دوسری طرف وہ حدیث بھی ان کی دلیل ہے جس میں فرمایا "**بین کل اذانین صلوۃ لمن شاء**".

حنفیہ کا مسلک

حنفیہ کا جو مشہور مسلک بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ مغرب سے پہلے کی دو رکعت مشروع نہیں ہیں بلکہ بعض فقہاء نے ان کو مکروہ قرار دیا ہے اور اس بات سے استدلال کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مغرب کی تعجیل کا حکم

---

۲۰۵ وفي صحيح مسلم، كتاب الصلاة المسافرين وقصرها، باب استجاب ركعتين، قبل صلاة المغرب، رقم: ۱۳۸۳، وسنن النسائي، كتاب الأذان، باب الصلاة بين الأذان والاقامة، رقم: ۶۷۵، وسنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب الصلاة قبل المغرب، رقم: ۱۰۹۰، ومسند أحمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند أنس بن مالك، رقم: ۱۱۸۶۱، ۱۳۴۷۲.

۲۰۶ وتلك الصلاة مستحبة عند الشافعية ومباحة عند ابي حنيفة ومالك كما قرر ابن الهمام، فيض الباري، ج:۲، ص: ۸۱.

دیا ہے اور ان رکعتوں کا پڑھنا تعجیل مغرب کے خلاف ہے، لہٰذا وہ اس کی مشروعیت سے انکار کرتے ہیں۔[۲۰۷]

حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے

لیکن علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کراہت کی کوئی دلیل نہیں، اس کے برخلاف حدیث باب سے صراحۃً معلوم ہو رہا ہے کہ صحابۂ کرام ؓ یہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ اس واسطے اگر دو رکعتوں کے برابر تاخیر ہو بھی جائے تو وہ کوئی معتد بہ تاخیر نہیں ہے، لہٰذا اس کو ناجائز یا مکروہ کہنا درست نہیں۔

قول فیصل

صحیح بات یہ ہے کہ یہ جائز ہیں، البتہ تعجیل مغرب کی فضیلت حاصل کرنا زیادہ بہتر ہے۔ اذان ہوتے ہی نماز پڑھ لینا زیادہ بہتر ہے لیکن اگر کسی وجہ سے تاخیر ہو رہی ہے تو پھر اس وقت دو رکعت پڑھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، عام طور پر جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ مکروہ ہیں، یہ بات درست نہیں، کیونکہ روایات کے ذریعہ رکعتین قبل المغرب کے استحباب کی نفی تو ثابت ہوتی ہے، لیکن ان کو مکروہ یا بدعت کہنے کا جواز نہیں، حضرت شاہ صاحبؒ یہی فرماتے ہیں۔

حنفیہ کا استدلال دارقطنی اور بیہقی کی ایک روایت سے ہے جس میں **"أن عند كل أذانين ركعتين ماخلا صلاة المغرب"** آیا ہے۔[۲۰۸]

لیکن **"إلا المغرب"** کا استثناء سنداً کمزور ہے۔[۲۰۹]

---

[۲۰۷] قوله وقبل المغرب أى ومنع عن التنفل بعد غروب الشمس قبل صلاة المغرب لما رواه أبو داؤد سئل ابن عمر رضى الله عنهما عن الركعتين قبل المغرب فقال ما رأيت احدا على عهد رسول الله ﷺ يصلهما وهو يقتضى نفى المندوبية أما ثبوت الكراهية فلا إلا أن يدل دليل آخر وما ذكر من استلزام تأخير المغرب فقد قدمنا عن القنية استثناء القليل والركعتان لاتزيد على القليل اذا تجوز فيهما وفى صحيح البخارى أنه فالصلاة قبل المغرب ركعتين وهو أمر ندب وهو الذى ينبغى اعتقاده فى هذه المسالة والله الموفق ، البحر الرائق ، ج: ۱، ص: ۲۶۶، وفيض البارى ، ج: ۲، ص: ۸۲.

[۲۰۸] سنن الدارقطنى ، باب الحث على الركوع بين الأذانين فى كل صلاة والركعتين قبل المغرب والاختلاف فيه ، رقم: ۱، ج: ۱، ص: ۲۶۴، وسنن البيهقى الكبرى، رقم: ۴۲۷۱، ج: ۲، ص: ۴۷۴.

[۲۰۹] مزید تفصیل حدیث نمبر ۶۲۵ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۹۶) باب الصلاۃ بین السواری فی غیر جماعۃ

اگر اکیلا ہو تو ستونوں کے درمیان نماز پڑھنے کا بیان

یہ باب ہے کہ سواری کے درمیان بغیر جماعت کے نماز پڑھنا، یعنی ابھی جماعت نہیں ہو رہی ہے آدمی تنہا دو ستونوں کے درمیان نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔

مقصود بخاری رحمہ اللہ

پچھلے باب میں گزرا ہے کہ مستحب ہے کہ آدمی کسی اسطوانہ کی طرف رُخ کرے۔ یہاں امام بخاری رحمہ اللہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ عام حالات میں تو یہی مستحب ہے کہ آدمی کسی اسطوانہ کی طرف رُخ کرے اور دونوں ستونوں کے درمیان کھڑا ہو، جبکہ سامنے سترہ نہ ہو یہ خلاف اولیٰ ہے لیکن جہاں کوئی ایسی جگہ ہو کہ سامنے سے کسی کے گزرنے کا امکان نہ ہو تو پھر اسطوانہ کی طرف رخ کرنا یا دونوں ستونوں کے درمیان کھڑے ہونا، دونوں برابر ہیں، اس لئے کہ کسی کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے۔

۵۰۴ ـ حدثنا موسى بن اسماعيل قال: حدثنا جويرية، عن نافع، عن ابن عمر قال: دخل النبي ﷺ البيت و اسامة بن زيد، و عثمان بن طلحة، و بلال فاطال ثم خرج، كنت اول الناس دخل على اثره، فسالت بلالا: اين صلّى؟ قال: بين العمودين المقدمين.
[ارجع: ۳۹۷]

چنانچہ اس میں وہ روایت ذکر کی کہ رسول اللہ ﷺ کعبہ شریف میں داخل ہوئے اور دو ستونوں کے درمیان نماز پڑھی۔ ظاہر ہے کہ جب حضور اقدس ﷺ کعبہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ تھے اور آپ کے ساتھ ایک دو صحابی تھے، سامنے سے کسی کے گزرنے کا کوئی امکان نہیں تھا، اس لئے آپ ﷺ نے وہاں بغیر سترہ کے نماز پڑھ لی۔ اس سے پتہ چلا کہ جہاں کسی کے گزرنے کا امکان نہ ہو وہاں دو ستونوں کے درمیان بھی نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

صف بین السواری کا حکم

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس میں "**فی غیر جماعۃ**" کا لفظ بڑھا کر مفہوم مخالف کے ذریعے اس طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ جب جماعت ہو رہی ہو تو اس وقت ستونوں کے درمیان صف بنانا کراہت سے خالی نہیں ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مسلک

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مسلک یہی ہے کہ مسجد کے اندر ستونوں کی جگہ صف نہیں بنانی چاہئے بلکہ ستونوں کی جگہ بالکل خالی چھوڑ دینی چاہئے، دو ستونوں کے درمیان صف بنانا امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک مکروہ ہے۔[۲۱۰]

امام بخاری رحمہ اللہ نے بظاہر اس ترجمۃ الباب سے **"غیر جماعۃ"** کا لفظ بڑھا کر امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی تائید کرنا چاہتے ہیں۔

اس کی دلیل حضرت انس رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جو ترمذی میں آئی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے کسی امیر کے پیچھے نماز پڑھی تو وہاں بہت ہجوم تھا اس کی وجہ سے ہم دو ستونوں کے درمیان صف بنانے پر مجبور ہو گئے۔ بعد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا **"کنا نتقی هذا علی عهده رسول اللہ ﷺ"** ہم رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں اس عمل سے بچا کرتے تھے یعنی صف بین السواری سے۔[۲۱۱]

جمہور کا مسلک

لیکن جمہور کے نزدیک صف بین السواری میں کوئی کراہت نہیں ہے بشرطیکہ اس سے صف کے سیدھے ہونے میں کوئی فرق نہ پڑے، صف سیدھی ہو، بیچ میں صرف ستون حائل ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ حنفیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔[۲۱۲]

جمہور کہتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے جو یہ فرمایا کہ ہم نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں اس عمل سے بچا کرتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ مسجد نبوی کے ستون باہم متوازی نہ تھے، ایک سیدھ میں نہ تھے، اس لئے اگر اس میں صف بنائیں گے تو وہ ٹیڑھی ہوگی، اب بھی جا کر دیکھیں مسجد نبوی کے ستون متوازی نہیں ہے۔ یہ ترکوں کی تعمیر کی ہوئی ہے، انہوں نے ستونوں کو اسی جگہ برقرار رکھا ہے جہاں نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں تھے، البتہ اسی جگہ

---

[۲۱۰] المبدع، ج:۲، ص:۹۳.

[۲۱۱] ......عن عبد الحميد بن محمود قال صلينا خلف أمير من الأمراء فاضطرنا الناس فصلينا بين الساريتين فلما صلينا قال أنس بن مالك كنا نتقي هذا على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وفي الباب عن قرة بن إياس المزني قال ابو عيسى حديث أنس حديث حسن صحيح وقد كره قوم من اهل العلم أن يصف بين السوارى وبه يقول احمد واسحاق وقد رخص قوم من اهل العلم في ذلك . سنن الترمذي ، باب ماجاء في كراهية الصف بين السوارى ، رقم : ۲۲۹ ، ج:۲، ص:۴۴۳، بيروت.

[۲۱۲] وقد رخص قوم من اهل العلم في ذلك انتهى.......قال ابن سيد الناس ولا يعرف لهم مخالف في الصحابة ورخص فيه ابو حنيفة ومالك والشافعي الخ ، نيل الأوطار ، ج:۳، ص:۲۳۶، واعلاء السنن ، ج:۴، ص:۳۸۳.

برقرار رکھتے ہوئے جتنا توازن پیدا کر سکتے تھے، اتنا توازن پیدا کیا ہے۔

تو جب ستون متوازی نہ تھے تو اگر ان میں صف بنائی جاتی تو وہ بھی ٹیڑھی ہوتی، اس واسطے صحابۂ کرام ﷺ اس سے پرہیز کرتے تھے، ورنہ اگر ستون متوازی ہو تو فی نفسہ درمیان میں صف بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے اور کوئی محذور نہیں ہے۔

۵۰۵ ـــ حدثنا عبد اللہ بن یوسف قال: أخبرنا مالک، عن نافع، عن عبداللہ بن عمر ﷺ: ان رسول اللہ ﷺ دخل الکعبۃ أو أسامۃ بن زید و بلال و عثمان بن طلحۃ الحجبی فاغلقھا علیہ، و مکث فیھا، فسالت بلالا حین خرج: ما صنع البنی ﷺ؟ قال: جعل عمودا عن یسارہ، و عمودا عن یمینہ، و ثلاثۃ اعمدۃ ورائہ، وکان البیت یومئذ علی ستۃ اعمدۃ ثم صلّی. و قال اسماعیل: حدثنی مالک و قال: عمودین عن یمینہ. [راجع: ۳۹۷]

حصولِ تبرک کا حکم

صحابۂ کرام ﷺ کو دیکھئے کہ کتنے اہتمام سے اس جگہ کا تعین کر رہے ہیں، جہاں نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھی، اس کی اور کیا وجہ ہے، سوائے اس کے کہ وہ جگہ سرکار دو عالم ﷺ کے جسد اطہر سے مس ہوئی ہے!

اس سے معلوم ہوا کہ سرکار دو عالم ﷺ سے جس جگہ کو بھی نسبت حاصل ہوئی ہو، اس سے تبرک حاصل کرنا نہ شرک ہے، نہ کفر ہے اور نہ بدعت ہے۔

(۹۸) باب الصلاۃ الی الراحلۃ و البعیر و الشجر و الرحل

اونٹنی اور اونٹ اور درخت اور کجاوہ کو آڑ بنا کر نماز پڑھنے کا بیان

"راحلۃ" کا اطلاق مذکر و مؤنث دونوں پر ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کے آخر میں "تاء" لگی ہوئی ہے جس سے بعض لوگوں کو شبہ ہو سکتا ہے کہ اس سے مؤنث مراد ہوگی، امام بخاری رحمہ اللہ نے باقاعدہ لفظ "بعیر" بڑھا دیا کہ صرف مؤنث مراد نہیں بلکہ "بعیر" بھی اس میں داخل ہے۔ آگے جو حدیث آرہی ہے اس میں صراحۃً لفظ "رحل" اور "راحلۃ" دونوں کا ذکر ہے، "بعیر" کو "راحلۃ" پر اور "شجر" کو "رحل" پر قیاس کیا۔ معلوم ہوا کہ ان سب کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا جائز ہے۔

۵۰۷ ـــ حدثنا محمد بن أبی بکر المقدمی البصری قال: حدثنا معتمر، عن عبید اللہ، عن نافع، عن ابن عمر عن النبی ﷺ أنہ کان یعرض راحلتہ فیصلی الیھا. قلت:

افرأيت اذا هبت الركاب؟ قال: كان يأخذ الرحل فيعد له فيصلي الى آخرته، أو قال مؤخره و كان ابن عمر رضي الله عنهما يفعله. [راجع: ۴۳۰]

اس حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت نقل کی ہے کہ "**أنه كان يعرّض راحلته**" نبی کریم ﷺ کی عادت یہ تھی کہ آپ اپنی راحلۃ کو عرضاً سامنے رکھتے تھے "**فيصلي اليها**"۔

تشریح حدیث میں شراح کے اقوال

قلت: افرأيت اذا هبت الركاب؟ اس جملہ کی شراح حدیث نے جس طرح تشریح کی ہے اس سے کوئی مفہوم واضح نہیں ہوتا۔

عام شراح حدیث کا قول

شراح نے یہ تشریح کی ہے کہ "**هبت**" کے معنی ہیں سواری یعنی "**ناقة**" کا حرکت کرنا اور سوال کا منشأ یہ ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھا کہ جب حضور اقدس ﷺ اونٹنی کو بٹھا کر نماز پڑھتے تھے تو اونٹ تو بے عقل ہے اگر وہ کوئی حرکت شروع کر دے، ہلنا جلنا شروع کر دے یا کھڑا ہو جائے تو اس سے تشویش واقع ہوگی۔

اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ ایسی صورت میں آپ ﷺ اس رحل کو سترہ بنا لیتے تھے، اکثر شرّاح نے جن میں حافظ ابن حجر، علامہ عینی اور علامہ قسطلانی رحمہم اللہ بھی شامل ہیں انہوں نے یہ مطلب بیان کیا ہے۔

لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب اونٹنی حرکت کرنے لگتی ہے تو کجاوہ کو اٹھا کو سترہ بنا لیتے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کجاوہ اٹھا کر سامنے رکھتے تھے یا اس کی کیا صورت تھی؟ بات واضح نہیں ہوتی۔

یا یوں کہیں کہ شروع سے ہی "**بعير**" کی طرف رخ نہیں کرتے تھے اور کجاوہ اتار کر رکھ کر اس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے تو یہ جملہ روایت کے خلاف ہے اور اگر کہیں کہ عین نماز کی حالت میں جب اس نے حرکت شروع کر دی پھر رحل سامنے رکھیں گے تو سوال یہ ہے کہ رحل کہاں سے اٹھائیں گے اور کیسے رکھیں گے؟ شرّاح میں سے کسی نے بھی یہ ذکر نہیں کیا کہ اس پر کیسے عمل ہو سکتا ہے۔

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کا قول

حضرت شیخ الحدیث صاحب قدس اللہ سرہ اپنے والد ماجد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا یہاں "**هبت**" کا ترجمہ کرنے میں شرّاح سے غلطی ہوئی ہے۔

شراح نے **"هبت"** کا ترجمہ کیا ہے "اونٹنی حرکت کرنے لگے" یہ معنی صحیح نہیں ہیں کیونکہ اس صورت میں کجاوہ کو سامنے رکھنے اور سترہ بنانے کے کوئی معنی نہیں بنتے' لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ یہاں **"هبت"** کا معنی ہے "چلے جانا" جب شاعر نے کہا ہے: **"ألا أيها الركب النيام ألا هُبّوا"** معنی ہیں روانہ ہو جاؤ۔ **"هبّ"** (ن) کے معنی ہیں روانہ ہو جانا۔

تو سوال کرنے والا یہ سوال کر رہا ہے کہ آپ نے جو کہا کہ آپ ﷺ اونٹ کو اپنے سامنے عرضاً بٹھا کر جنگل یا سفر وغیرہ میں سترہ بنا کر نماز پڑھتے تھے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اونٹ وغیرہ کو چرنے کے لئے چھوڑ دیتے تھے جیسا کہ چھوڑا جاتا ہے تو پھر کس چیز کو سترہ بناتے تھے؟

انہوں نے فرمایا کہ جب جانوروں کو چرنے کے لئے چھوڑ دیتے تو ان پر سے کجاوہ اتار کر اسے سترہ بنا کر نماز پڑھتے تھے۔ **"اذاهبت الركاب"** کا صحیح مطلب یہ ہے۔

"قلت" : میں نے پوچھا **"اذاهبت الركاب؟"** جب سواریاں چرنے کے لئے جائیں تو پھر کیا ہوتا؟ انہوں نے فرمایا **"كان يأخذ الرحل"** آپ ﷺ ان کے کجاوے لے لیتے تھے، **"فيعدّله"** اس کو برابر کرتے **"فيصلي الى آخرته"**۔

اس کا صحیح تلفظ **"اَخَرَتِه"** [**بفتحات ثلاثه**] بعض نے **"آخرَته"** کہا ہے جو لغت کے اعتبار سے بن تو جاتا ہے لیکن ایک تو "اَخَرَ" کی روایت زیادہ قوی ہے، دوسر الغۃً بھی وہ معنی زیادہ واضح ہیں۔

"اَخَرَتِه" اس کا پچھلا حصہ **"اؤ قال مؤخره، وكان ابن عمر يفعله"** اور ابن عمر ﷺ خود بھی ایسا کرتے تھے کہ کجاوہ کے پچھلے حصہ کو سامنے رکھ کر نماز پڑھتے تھے۔

(۹۹) باب الصلاة الى السرير

تخت کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا بیان

۵۰۸ ۔ حدثنا عثمان بن ابی شيبة قال: حدثنا جريرٌ، عن منصور، عن ابراهيم، عن الاسود، عن عائشة قالت: أعدلتمونا بالكلب والحمار؟ لقد رأيتني مضطجعة على السرير فيجئ النبي ﷺ فيتوسط السرير فيصلي فأكره أن أسنحه فانسل من قبل رجلي السرير حتى انسل من لحافي. [راجع: ۳۸۰]

عورت کے گزرنے سے نماز کا حکم

آگے کئی ابواب میں امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک بات کو بار بار دہرایا ہے، دراصل وہ اس مؤقف سے

بڑے ناراض ہیں کہ عورت کیسے نماز قطع کر دیتی ہے؟ اس کی تردید میں باب کے باب باندھتے چلے جار ہے ہیں۔

یہاں بھی ایسی ہی حدیث لائے ہیں کہ آپ ﷺ نے سریر کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی، معلوم ہوا کہ سریر کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا جائز ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سریر پر لیٹی ہوئی تھیں، تو عورت سامنے موجود ہے، پھر بھی نماز کو قطع نہیں کیا۔

"اعدلتمونا بالكلب و الحمار" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ تم نے ہمیں کتے اور گدھے کے برابر کر دیا کہ کہتے ہو کہ کتے، گدھے اور عورت کے گزرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے، حالانکہ **"لقد رأيتني مضطجعة على السرير فيجئ النبي ﷺ فيتوسط السرير فيصلي فاكره أن اسنحه فأنسلّ من قبل رجليي السرير حتى انسلّ من لحافي"** تو میں اس بات کو برا سمجھتی تھی کہ میں آپ ﷺ کے سامنے آجاؤں۔ **(اسنح) "سنح - يسنح"** کے معنی ہیں پیش آنا، سامنے آنا۔

میں اس بات کو برا سمجھتی تھی کہ میں آپ ﷺ کے سامنے لیٹی رہوں اور آپ ﷺ نماز پڑھ رہے ہوں، اس لئے میں اپنے لحاف سے چارپائی کے پائنتی کی جانب سے کھسک جاتی تھی۔

(۱۰۰) باب: يرد المصلي من مر بين يديه

نماز پڑھنے والے کو چاہیئے کہ جو شخص اسکے سامنے سے گذرے تو اسے روک دے

ورد ابن عمر في التشهد، وفي الكعبة و قال: إن أبى إلا أن تقاتله قاتله.

نمازی کے سامنے سے گزرنے کو روکنے کا حکم

یہ باب قائم کیا ہے کہ مصلی کو سامنے سے گزرنے والے کو پیچھے کر دینا چاہئے، لوٹا دینا چاہئے اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کعبہ کے اندر نماز کی حالت میں تشہد میں بیٹھے ہوئے سامنے سے گزرنے والے ایک شخص کو ہاتھ بڑھا کر پیچھے کر دیا۔ اس سے اشارہ کیا کہ ان کے خیال کے مطابق مسجد حرام میں بھی سترہ کا اہتمام کرنا چاہئے۔

"وقال: ان أبى الّا أن تقاتله قاتله" اور ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر کوئی آدمی پھر بھی نہ مانے، مگر لڑائی کے ذریعہ سے تو اس سے لڑائی کر۔

۵۰۹ - حدثنا ابو معمر قال: حدثنا عبد الوارث قال: حدثنا يونس، عن حميد ابن هلال، عن أبي صالح أن أبا سعيد قال: قال النبي ﷺ ح.

و حدثنا آدم قال: حدثنا سليمان بن المغيرة قال: حدثنا حميد بن هلال العدوى قال: حدثنا ابو صالح السمان قال: رأيت أبا سعيد الخدرى في يوم جمعة يصلي الى شئ

یستره من الناس، فأراد شاب من بني الى معيط أن يجتاز بين يديه، فدفع ابو سعيد في صدره فنظر الشاب فلم يجد مساغا الا بين يديه، فعاد ليجتاز فدفعه أبو سعيد أشد من الأولى فنال من أبي سعيد، ثم دخل على مروان فشكا إليه ما لقيي من أبي سعيد، و دخل ابو سعيد خلفه على مروان. فقال: ما لک ولإبن اخيک يا أبا سعيد؟ قال: سمعت النبي ﷺ يقول: "اذا صلى أحدكم إلى شيئ يستره من الناس فأراد أحد أن يجتاز بين يديه، فليدفعه فان وأبى فليقاتله فإنما هو شيطان". [أنظر: ۳۲۷۴] ۲۱۳

حضرت ابوسعید خدریؓ کی حدیث ہے، اس کے الفاظ میں "**فليقاتله فانما هو شيطان**" کہ سامنے سے گزرنے والا نہ مانے تو اس سے لڑائی کر، اس لئے کہ وہ شیطان ہے۔

فليقاتله کی صحیح تشریح

"**فليقاتله**" کے معنی ہیں اس کو دل میں برا سمجھے اور روکنے کی جتنی استطاعت ہے اس کو روکے اور مبالغہ کرنا مقصود ہے تاکہ گزرنے والے کو یہ احساس ہو کہ یہ ایسا عمل ہے جس پر لڑائی بھی جائز ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ ہم باوجود ان روایات کے یہ کہہ رہے ہیں کہ ایسا نہ کرو، اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیت ہے "**و قوموا لله قانتين**" اس میں "**قانتين**" کے معنی ہیں ساکت کھڑے رہو اور نماز میں جتنی کم حرکتیں ہوں، اتنا ہی اچھا ہے۔

تو قرآن کریم کی آیت قطعی ہے اور یہ اخبار آحاد ہیں، اس لئے ان کے ذریعے آیت پر زیادتی نہیں ہو سکتی، لہٰذا حدیث سے جو ظاہری مفہوم سمجھ میں آرہا ہے، وہ مراد نہیں ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ کوئی شخص اگر دوسرے کے گھر میں جھانکے تو اس کی آنکھ پھوڑ دو، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خنجر لے کر اس کی آنکھ میں گھونپ دو، بلکہ اس عمل کی شناعت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ عمل اس لائق ہے کہ اگر ایسا کر دیا جائے تو نا

---

۲۱۳ وفي صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب منع المار بين يدي المصلي، رقم: ۷۸۳، وسنن النسائي، كتاب القبلة، باب التشديد في المرور بين يدي مصلي وبين سترته، رقم: ۷۴۹، وكتاب القسامة، باب من اقتص وأخذ حقه دون السلطان، رقم: ۴۷۷۹، وسنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب مايؤمر المصلي أن يدرأ عن الممر بين يديه، رقم: ۵۹۸، وسنن ابن ماجة كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب ادرأ ما استطعت، رقم: ۹۴۴، ومسند احمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند أبي سعيد الخدري، رقم: ۱۰۸۷۲، ۱۰۹۶۷، ۱۱۰۳۳، ۱۱۱۱۵، ۱۱۱۷۹، ۱۱۳۵۴، وموطأ مالک، كتاب النداء للصلاة، باب التشديد في أن يمر احد بين يدي المصلي، رقم: ۳۲۸، وسنن الدارمي، كتاب الصلاة، باب في دنو المصلي إلى السترة رقم: ۱۳۷۵.

انصافی نہ ہوگی۔

اسی طرح یہاں یہ معنی ہیں کہ نمازی کے سامنے سے گزرنا ایسا عمل ہے کہ اگر گزرنے والے سے لڑائی یا قتال کیا جائے، تو یہ ناانصافی نہیں ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر آدمی دوسرے پر چڑھ دوڑے۔ اس تشریح سے ان روایات کی "**و قوموا للّٰہ قانتین**" کے ساتھ تطبیق ہوجاتی ہے۔[۲۱۴]

بعض فقہاء کی رائے

بعض فقہاء نے اس حدیث کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر کوئی آدمی نمازی کے سامنے سے گزر رہا ہے تو وہ اس کو روکے، اگر وہ نہ رکے تو اس کو پیچھے سے مارے اور اگر پھر بھی نہ رکے تو باقاعدہ اس پر حملہ کردے۔ اس پر کلام کیا ہے کہ اگر حملہ میں موت واقع ہوجائے تو قصاص بھی نہیں ہے کیونکہ اس نے ایک حدیث پر عمل کرتے ہوئے یہ عمل کیا ہے۔[۲۱۵]

حنفیہ کا مسلک

حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بے خبری میں سامنے سے گزر رہا ہے اور اس کو نمازی کا علم نہیں ہے تو نمازی کو چاہئے کہ وہ تھوڑا سا جہر کردے یعنی قرأت میں تھوڑا سا جہر کردے تاکہ گزرنے والے کو تنبیہ ہوجائے اور وہ رُک جائے، بعض نے کہا کہ سبحان اللہ کہدے، اس کی بھی اجازت ہے، لیکن عملی طور پر روکنے کو حنفیہ مشروع نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ یہ یا تو اس وقت کی روایت ہے جب نماز میں عمل کثیر ممنوع نہیں تھا اور یا یہ مبالغہ پر محمول ہے۔[۲۱۶]

حضرت ابوسعید ﷺ نے یہی عمل کیا کہ سامنے سے آدمی گزر رہا تھا، اس کے سینے پر مار "ا **فنال من ابی سعید ، نال منه**" کے معنی ہیں بُرا بھلا کہنا۔ یعنی ابوسعید ﷺ نے جس شخص کو مارا تھا اس نے ابوسعید کو بُرا بھلا کہنا شروع کردیا۔

یہ بات مروان کے پاس پہنچی، مروان نے پوچھا تو انہوں نے یہ حدیث پیش کی۔

اگر کوئی نماز میں ایسا عمل کرے تو نماز فاسد نہیں ہوگی اور اس کو ناجائز بھی نہیں کہیں گے، کیونکہ بہرحال

---

۲۱۴ فیض الباری، ج:۲، ص:۸۴۔

۲۱۵ من اراد التفصیل فلیراجع : عمدۃ القاری، ج:۳، ص:۵۹۲، وفتح الباری، ج:۱، ص:۵۸۲، واعلاء السنن، ج:۵، ص:۹۲ - ۸۷۔

۲۱۶ فیض الباری، ج:۲، ص:۸۴۔

حدیث میں آیا ہے۔ البتہ حنفیہ کہتے ہیں کہ **"قوموا اللہ قانتین"** کے مطابق کھڑے رہیں تو زیادہ اچھا ہے۔

(۱۰۱) باب اثم المار بین یدی المصلی

نماز پڑھنے والے کے سامنے گذرنے والے کا بیان

۵۱۰ ـ حدثنا عبد اللہ بن یوسف قال: أخبرنا مالک عن أبی النضر مولی عمر بن عبیداللہ، عن بسر بن سعید ان زید بن خالد أرسله الی أبی جهیم یسأله : ما ذا سمع من رسول اللہ ﷺ فی المار بین یدی المصلی، فقال ابو جهیم : قال رسول اللہ ﷺ : "لو یعلم المار بین یدی المصلی ماذا علیه لکان أن یقف أربعین خیرا له من أن یمر بین یدیه." قال ابو النضر: لا أدری قال: أربعین یوما أو شهرا أو سنة. [۲۱۷]

مرور بین المصلی سے بچنا چاہیے

"مرور بین المصلی" کے بارے میں آپ ﷺ نے کتنی تاکید فرمائی ہے اور عام لوگ اس کا بڑا اہتمام کرتے ہیں کہ کوئی نمازی کے سامنے سے نہ گزرے، اگر کوئی گزر جائے تو خوب ملامت کا نشانہ بنتا ہے۔ مگر افسوس کہ بہت سے طلبہ اس کا اہتمام نہیں کرتے اور اسے معمولی بات سمجھ کر اس کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔

عام لوگوں کی مساجد میں وہ غلطیاں نہیں ہوتیں جو یہاں ہوتی ہیں۔ امام صاحب آخر وقت تک کہتے کہتے تھک جاتے ہیں کہ صف سیدھی کرلو اور دونوں طرف فاصلہ برابر رکھو، لیکن ہوتا یہ ہے کہ لوگ پیچھے سے آئیں گے اور ایک کنارے میں کھڑے ہو جائیں گے، معلوم ہوا کہ صف بائیں طرف چل رہی ہے کسی اور مسجد میں یہ منظر نظر نہیں آتا، کتنے افسوس کی بات ہے۔

حنفیہ کے ہاں لکیر کھینچنا مسنون نہیں ہے لیکن حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں جبکہ بہت مجبوری ہو، کیونکہ حدیث میں ہے **"فلیخط خطًا"** کسی صحرا وغیرہ میں جہاں سترہ نہ ہو ایسا کرے لیکن مسجد کے اندر کسی خط وغیرہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ایک صورت یہ ہے کہ کوئی آدمی خود سترہ بن جائے جیسے یہاں طالب علم بعض اوقات ایسا کرتے ہیں، اللہ ﷻ ان کو جزائے خیر دے کہ وہ خود کھڑے ہو جاتے ہیں تا کہ لوگ سامنے سے گزر جائیں، یہ ٹھیک ہے اس میں کوئی حرج نہیں اور اگر ہاتھ میں رومال ہے، رومال لٹکا کر گزر جائے یہ بھی جائز ہے۔ [۲۱۸]

---

۲۱۷ لایوجد للحدیث مکررات.

۲۱۸ فیض الباری، ج:۲، ص:۸۳.

(۱۰۲) باب استقبال الرجل الرجل و هو یصلی

نماز پڑھنے کی حالت میں ایک شخص کا دوسرے شخص کی طرف منہ کرنے کا بیان

وکرہ عثمان أن یستقبل الرجل و ھو یصلی ، و إنما ھذا اذا اشتغل به ، فاما اذا لم یشتغل فقد قال زید بن ثابت، ما بالیتُ إن الرجل لا یقطع صلاۃ الرجل.

۵۱۱ - حدثنا اسماعیل بن خلیل: حدثنا علی بن مسھر، عن الأعمش، عن مسلم، عن مسروق، عن عائشة أنه ذکر عندھا ما یقطع الصلاۃ فقالوا: یقطعھا الکلب و الحمار والمرأۃ . قالت: لقد جعلتمونا کلابا ، لقد رأیت النبی ﷺ یصلی وإنی لبینه و بین القبلة وانا مضطجعة علی السریر فتکون لی الحاجة و أکرہ أن أستقبله فانسل إنسلالا .

و عن الأعمش، عن إبراھیم ، عنِ الأسود عن عائشة نحوہ.[راجع: ۳۸۲].

یہ باب قائم کیا ہے کہ مرد کا مرد کے سامنے آنا جبکہ دوسرا آدمی نماز پڑھ رہا ہے۔

نمازی کی طرف رخ کرنا جائز نہیں

اس میں اس بات کی طرف اشارہ کررہے ہیں کہ جس طرح مصلّی کے سامنے سے مرورنا جائز ہے، اسی طرح اس کی طرف رخ کرکے کھڑا ہونا بھی جائز نہیں ہے۔

بعض نا اداشناس یہ کرتے ہیں کہ دیکھا پیچھے کوئی نماز پڑھ رہا ہے تو چاہئے کہ بیٹھا رہے جب تک کہ وہ فارغ نہ ہو جائے لیکن یہ اس طرح انتظار کرتے ہے کہ مصلّی کی طرف رُخ کرکے کھڑے ہو جاتے ہیں، یہ بہت بُری بات ہے، اس سے بہتر ہے کہ آدمی بیٹھا رہے۔ **"وکرہ عثمان" الخ** حضرت عثمان ؓ نے یہ بات مکروہ سمجھی ہے کہ کوئی شخص دوسرے کا استقبال کرے اور وہ حالت نماز میں ہو۔

آگے امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اسی حدیث سے استدلال کیا ہے جو پہلے گزری ہے کہ وہ فرماتی ہیں کہ میں آپ ﷺ کے سامنے آنا پسند نہ کرتی تھی اور جب میں سریر سے نیچے جانا چاہتی تھی تو کھسک جاتی تھی تا کہ میں آپ ﷺ کا رخ کرکے سامنے سے نہ اتروں۔ معلوم ہوا کہ سامنے رُخ کرنا درست نہیں۔

مذکورہ مسئلہ میں امام بخاریؒ کی رائے

آگے امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک قید لگادی **"وانما ھذا اذا اشتغل به"** یعنی استقبال اس وقت ناجائز ہے جب مصلّی اس کھڑے ہونے والے کے ساتھ مشغول ہو جائے یعنی اس کا ذہن اس کی طرف سے

مشوش ہو جائے "**فاما اذا لم یشتغل**" لیکن اگر کھڑے ہوئے شخص سے اس کے دل میں کوئی تشویش نہ پیدا ہوتو "**فقد قال زید بن ثابت: مابا لیت ان الرجل لا یقطع صلاۃ الرجل**" مرد دوسرے مرد کی نماز قطع نہیں کرتا۔ اس سے پتہ چلا کہ اگر اس کا خشوع فوت نہیں ہوتا تو پھر کوئی حرج نہیں۔

دوسرے فقہاء کی رائے

یہ امام بخاری رحمہ اللہ کی اپنی رائے ہے، جن احادیث سے وہ استدلال کر رہے ہیں ان میں کہیں بھی اس قسم کی قید نہیں ہے، لہٰذا دوسرے فقہاء نے امام بخاری رحمہ اللہ سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ استقبال ہر صورت میں ناجائز ہے۔[۲۱۹]

بعض اوقات کسی عالم کے ساتھ محافظین ہوتے ہیں، آج کل علماء کے لئے یہ لازم بن گیا ہے کہ ایک مسلح آدمی ان کے ساتھ ہوتا ہے، بعض اوقات وہ محافظ حفاظت کی خاطر بالکل مصلیوں کی طرف رُخ کر کے کھڑا ہو جاتا ہے۔

عام حالات میں یہ جائز نہیں ہے، لیکن اگر ضرورت شدیدہ ہو تو پھر مستثنیٰ ہے، رہی یہ بات کہ کہاں ضرورت شدیدہ ہے؟ اور کہاں نہیں ہے یہ واقعہ کا مسئلہ ہے۔

(۱۰۶) باب اذا حمل جاریة صغیرة علی عنقه فی الصلاة

حالت نماز میں چھوٹی لڑکی کو اپنی گردن پر اٹھانے کا بیان

۵۱۶ ـ حدثنا عبداللہ بن یوسف قال: أخبرنا مالک، عن عامر بن عبداللہ بن الزبیر، عن عمرو بن سلیم الزرقی عن أبی قتادۃ الأنصاری أن رسول اللہ ﷺ کان یصلی و هو حامل أمامة بنت زینب بنت رسول اللہ ﷺ ولأبی العاص بن ربیعة بن عبد شمس، فاذا سجد وضعها و إذا قام حملها. [أنظر: ۵۹۹۶][۲۲۰]

---

۲۱۹ لم الاستقبال المذکور مکروہ عندنا مطلقاً بدون تفصیل الإشتغال وعدمه و فرق المصنف بالإشتغال وعدمه الخ، فیض الباری، ج: ۲، ص: ۸۵.

۲۲۰ وفی صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، باب جواز حمل الصبیان فی الصلاۃ، رقم: ۸۴۴، و سنن النسائی، کتاب السهو، باب حمل الصبایا فی الصلاۃ ووضعهن فی الصلاۃ، رقم: ۱۱۹۰، وسنن أبی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب العمل فی الصلاۃ، رقم: ۷۸۲، ومسند احمد، باقی مسند الأنصار، باب حدیث أبی قتادۃ الانصاری، رقم: ۲۱۴۸۱، ۲۱۵۳۴، ۲۱۵۹۳، وموطأ مالک، کتاب النداء للصلاۃ، باب جامع الصلاۃ، رقم: ۳۷۲، وسنن الدارمی، کتاب الصلاۃ، باب العمل فی الصلاۃ، رقم: ۱۳۲۶.

حضرت ابوقتادہ ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھا کرتے تھے، اس حالت میں کہ آپ ﷺ نے اپنی صاحبزادی زینب کی بیٹی امامہ بنت زینب کو اٹھایا ہوا ہوتا تھا۔

"ولأبی العاص" الخ اس کا عطف **"بنت زینب"** پر ہے کہ امامہ حضرت زینب اور ابوالعاص بن ربیعہ کی بیٹی تھیں۔ ابوالعاص بن ربیع حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے شوہر تھے۔

"فاذا سجد وضعھا" جب آپ سجدے میں جاتے تو ان کو اتار دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو اٹھا لیتے، اس طرح سے حضرت امامہ کو اٹھا کر حضور ﷺ کا نماز پڑھنا اس حدیث سے ثابت ہے۔

حدیث سے استدلال بخاریؒ

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی شخص جاریہ صغیرہ کو اپنی گردن پر رکھ کر نماز پڑھ لے تو نماز میں کوئی حرج نہیں۔

جس سیاق سے امام بخاری رحمہ اللہ یہ حدیث لائے ہیں، اس سے مقصود اسی بات کی تردید ہے کہ عورت کے سامنے ہونے سے نماز نہیں ٹوٹتی، کیونکہ کہہ رہے ہیں جب گردن پر سوار کر لیا تو یہ اس بات سے اشد ہے کہ عورت سامنے سے گزر جائے، اس واسطے یہ حدیث یہاں لائے، ورنہ یہ اس کا محل نہ تھا۔ اس کا محل وہ ہے جہاں نماز کے افعال کا بیان ہوتا ہے۔ یہاں لانے کا منشأ یہی ہے کہ جب بچی کو اٹھانے سے نماز فاسد نہیں ہوئی تو سامنے سے گزرنے سے بھی نہیں ہوتی۔

بچہ کو اٹھا کر نماز پڑھنے کا حکم

ساتھ ہی اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے یہ مسئلہ بھی بیان کر دیا کہ بچہ کو اٹھا کر نماز پڑھنا ثابت ہے، لہٰذا یہ عمل جائز ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے دو پہلو ہیں:

ایک پہلو یہ ہے کہ بچہ کے ناپاک ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ اس کے باوجود آپ نے اٹھایا۔ معلوم ہوا کہ اگر بچے کے اوپر ناپاکی لگنے کا یقین نہ ہو یا ظن غالب نہ ہو تو اس کو پاک تصور کر لینا درست ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ بچہ کو نماز کے اندر اٹھانا اور پھر اتار دینا، یہ ایسا عمل ہے کہ جو نماز کے لئے مفسد نہیں ہے۔[۲۲۱]

---

۲۲۱ فیض الباری، ج:۲، ص:۸۶.

دوسرے فقہاء تو یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے بھی یہ پتہ چل رہا ہے کہ مصلّی کا اتنا عمل جائز ہے۔

خود حنفیہ نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ اگر ماں نماز کے دوران بچہ کو اٹھا کر دودھ پلائے تو نماز فاسد ہو جائے گی، لیکن اگر دودھ نہ پلائے، ویسے ہی اٹھالے، تو نماز درست ہے۔ صاحب بدائع نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے اور اس واقعے کو بیانِ جواز پر محمول کیا ہے۔[۲۲۲]

اشکال

یہاں اشکال یہ ہوتا ہے کہ عام حالات میں یہ عمل عملِ کثیر کو مستلزم ہے، کیونکہ عملِ کثیر کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ ایسا عمل جس کو دیکھ کر دوسرا آدمی یہ سمجھے کہ یہ نماز میں نہیں ہے۔ اب یہاں بچے کو اٹھا رہے ہیں، بٹھا رہے ہیں، پھر اتار رہے ہیں، یہ عمل عملِ کثیر ہے، تو مفسد صلوٰۃ کیوں نہ ہو؟

جواب

اس کے بارے میں تین مؤقف اختیار کئے گئے ہیں:

ایک: یہ کہ عام حالات میں عملِ کثیر مفسدِ صلوٰۃ ہوتا ہے، لیکن چونکہ اس جگہ یہ حضور اکرم ﷺ سے ثابت ہوگیا، اس لئے یہ عمل مفسد نہیں، یہ مستثنیٰ ہے۔

دوسرا: مؤقف بعض حضرات نے یہ اختیار کیا ہے کہ یہ واقعہ عملِ کثیر کے مفسد ہونے سے پہلے کا ہے، بعد میں حضور ﷺ کے ارشاد **"ان الصلوٰۃ لشغلاً"** یا آیت **"وقوموا للّٰہ قانتین"** نے اسے منسوخ کر دیا۔

تیسرا: مؤقف علامہ خطابی رحمہ اللہ نے یہ اختیار کیا ہے کہ حقیقت میں حدیث کے ظاہری الفاظ سے جو منظر نظر آ رہا ہے اس میں یہ صورتحال نہ تھی کہ آپ ﷺ خود اٹھا کر کندھے پر بٹھا رہے ہیں، پھر اتار رہے ہیں، بلکہ ایسا ہوتا ہوگا کہ جب نبی اکرم ﷺ سجدہ میں گئے تو بچی خود ہی آکر کندھے پر بیٹھ گئی، اسی حالت میں آپ ﷺ کھڑے ہوگئے، پھر جب سجدہ میں گئے تو وہ اتر گئی اور بچے بکثرت ایسا کرتے ہیں۔

لیکن علامہ نووی اور علامہ عینی رحمہما اللہ نے اس کی تردید کی ہے، کیونکہ صحیح مسلم میں الفاظ ہیں کہ **"فإذا**

---

[۲۲۲] **واذا قام حملها ـــ وقد أجيب عنه بأجوبة منها ماذكر الشارح أنه منسوخ مما ذكره من الحديث وهو مردود بأن حديث إن في الصلاة لشغلاً كان قبل الهجرة وقصة امامة بعدها.**

ومنها مافى البدائع أنه لم يكره منه ذلك لأنه كان محتاجاً إليه لعدم من يحفظها أو للتشريع بالفعل أن هذا غير مفسدة ومثله ايضاً فى زماننا لا يكره لواحد منا فعله عند الحاجة أما بدونها مكروه . حاشيه ابن عابدين ، ج: ۱، ص: ۶۵۳، دار الفكر، بيروت، وعمدة القارى ، ج: ۳، ص: ۶۰۶.

قام حملها" اور "فإذا رفع من السجود اعادها". ۲۲۳

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمداً آپ ﷺ نے ان کو اٹھایا اور رکھا۔لہٰذا علامہ عینی رحمہ اللہ نے اسی کو راجح قرار دیا ہے کہ اس بچی کا دوسرا کوئی نگران اس وقت موجود نہ تھا، اسی لئے آپ ﷺ نے ایسا کیا تا کہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ اس حالت میں نماز درست ہو جاتی ہے اور بچی کو ایک ہاتھ سے اٹھانا اور اتارنا عمل کثیر کے بغیر بھی ایک ہاتھ سے ممکن ہے۔ ۲۲۴

بعض حضرات نے اسے نفلی نماز پر محمول کیا ہے، لیکن علامہ عینی رحمہ اللہ نے سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کی ایک روایت نقل کی ہے جس سے نماز با جماعت میں ایسا کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔ ۲۲۵

(۱۰۹) باب المرأة تطرح عن المصلي شيئامن الأذى

اس امر کا بیان کہ عورت نماز پڑھنے والے کے جسم سے ناپاکی کو دور کرے

۵۲۰ ۔ حدثنا أحمد بن إسحاق السورماري قال: حدثنا عبيد الله بن موسى قال: حدثنا إسرائيل عن أبي إسحاق عن عمرو بن ميمون، عن عبد الله قال: بينما رسول الله ﷺ قائم يصلي عند الكعبة وجمع من قريش في مجالسهم: إذ قال قائل منهم: ألا تنظرون إلى هذا المرائي؟ أيكم يقوم إلى جزور آل فلان فيعمد إلى فرثها و دمها و سلاها فيجيء به ثم يمهله حتى إذا سجد وضعه بين كتفيه؟ فأنبعث أشقاهم، فلما سجد رسول الله ﷺ وضعه بين كتفيه و ثبت النبي ﷺ ساجداً فضحكوا حتى مال بعضهم إلى بعض من الضحك. فأنطلق منطلق إلى فاطمة و هي جويرية فأقبلت تسعى و ثبت النبي ﷺ ساجداً حتى القته عنه، و أقبلت عليهم تسبهم، فلما قضى رسول الله ﷺ الصلوٰة قال: ((اللّٰهم عليك بقريش اللّٰهم عليك بقريش)) ثم سمى: ((اللّٰهم عليك بعمرو بن هشام، وعتبة بن ربيعة، و شيبة بن ربيعة، و الوليد بن عتبة، و أمية بن خلف، و عقبة بن أبي معيط، و عمارة بن الوليد)). قال عبد الله: فوالله لقد رأيتهم صرعى يوم بدر، ثم سحبوا إلى القليب قليب بدر، ثم قال

---

۲۲۳ فاذا ركع وضعها واذا رفع من السجود أعادها، صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب جواز حمل الصبيان في الصلاة، رقم: ۵۴۳، ج: ۱، ص: ۳۸۵.

۲۲۴ عمدة القاري، ج: ۳، ص: ۲۰۶.

۲۲۵ صحيح مسلم، كتاب المساجد و مواضع الصلاة، باب جواز حمل الصبيان في الصلاة، رقم: ۵۴۳، ج: ۱، ص: ۳۸۵.

رسول الله ﷺ : ((وأتبع أصحاب القليب لعنة)). [راجع : ۲۴۰]

اصحابِ قلیب کے پیچھے لعنت لگا دی گئی یعنی اللہ بچائے لعنت ان کا جز و بدن بن گئی۔

یہاں یہ حدیث لائے ہیں اور ترجمۃ الباب قائم فرمایا ہے" **باب المرأة تطرح عن المصلي شيئا من الأذى** " کہ عورت کے لئے جائز ہے کہ وہ مرد مصلی کے سامنے سے کوئی تکلیف دہ چیز گندگی وغیرہ ہٹائے، جیسا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ہٹائی۔ مقصد یہ ہے کہ اس طرح عورت کے سامنے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

كتاب مواقيت الصّلاة

٥٢١ - ٦٠٢

بسم الله الرحمن الرحيم

۹ ۔ کتاب مواقیت الصلاة

(۱) باب مواقيت الصلوٰة وفضلها،

نماز کے اوقات اور ان کی فضیلت کا بیان

وقوله : ﴿إِنَّ الصَّلاَةَ كَانَتْ عَلى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَاباً مَوْقُوْتاً﴾ [النساء : ۱۰۳] موقتا وقته عليهم.

۵۲۱ ۔ حدثنا عبد الله بن مسلمة قال : قرأت على مالک ، عن ابن شهاب أن عمر ابن عبد العزيز أخر الصلاة يوما ، فدخل عليه عروة بن الزبير فأخبره أن المغيرة بن شعبة أخر الصلاة يوما و هو بالعراق فد خل عليه أبو مسعود الأنصاری فقال : ماهذا يامغيرة؟ أليس قد علمت أن جبريل صلوات الله وسلامه عليه نزل فصلى ، فصلى رسول الله ﷺ ، ثم صلى فصلى رسول الله ﷺ ، ثم صلى فصلى رسول الله ﷺ ، ثم صلى فصلى

رسول الله ﷺ، ثم صلى فصلى رسول الله ﷺ . ثم قال : "بهذا أمرت". فقال عمر لعروة: أعلم ما تحدث به، أوإن جبريل هو أقام لرسول الله وقت الصلاة؟ قال عروة: كذالک كان بشير بن أبي مسعود يحدث عن أبيه.[أنظر: ۳۲۲۱، ۴۰۰۷]

۵۲۲ ـ قال عروة و لقد حدثني عائشة ان رسول الله ﷺ كان يصلي العصر والشمس في حجرتها قبل ان تظهر.[أنظر: ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۳۱۰۳][1]

"**بـا ب مـواقيت الـصلوٰة و فضلها**" اوربعض نسخوں میں عنوان اس کے برعکس ہے، یعنی "**كتاب مواقيت الصلوٰة و فضلها**"، "**با ب مواقيت الصلوٰة**" اوربعض نسخوں میں اس طرح ہے جیسے یہاں لکھا ہوا ہے "**كتاب مواقيت الصلوٰة، باب مواقيت الصلوٰة و فضلها**" دونوں نسخے اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔

ترجمۃ الباب کا مقصد

اس میں دو باتیں بیان کرنی مقصود ہیں:

(۱) نماز کے مواقیت

(۲) نماز کی فضیلت، خاص طور پر ان مواقیت کی فضیلت۔"**فضلها**" کی ضمیر کے بارے میں بیشتر شراح نے کہا ہے کہ "**مواقيت**" کی طرف راجع ہے اور مراد یہ ہے کہ نماز کے جو اوقات مقرر کئے گئے ہیں، ان کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے۔

لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے ان ابواب میں جو حدیثیں ذکر کی ہیں ان میں بہت سی ایسی ہیں جنہیں مواقیت کی فضیلت قرار دینا بغیر تکلف کے ممکن نہیں۔

مجھے یہ بات زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے کہ "**ها**" کی ضمیر کو "**صلوٰة**" کی طرف راجع مانا جائے کہ مواقیت صلوٰۃ کا بیان بھی مقصود ہے اور نماز کی فضیلت بیان کرنا بھی مقصود ہے اور آیت کریمہ کی طرف اشارہ کر دیا جو مواقیت کے باب میں اصل ہے۔اللہ جل جلالہ نے ارشاد فرمایا "**ان الصلوٰة كانت على المؤمنين كتابًا**

---

[1] وفي صحيح مسلم ، كتاب المساجد و مواضع الصلاة ، باب اوقات الصلوات الخمس ، رقم : ۹۶۰ ، وسنن أبي داؤد ، كتاب الصلاة ، باب في المواقيت ، رقم : ۳۳۳ ، ومسند أحمد ، مسند الشاميين ، باب بقية حديث أبي مسعود البدري الأنصاري ، رقم : ۱۶۴۶۹ ، باقي مسند الأنصار ، باب حديث أبي مسعود عقبة بن عمرو الأنصاري ، رقم ۲۱۳۲۱، ۲۲۹۶۲ ، وموطأ مالک ، كتاب وقوت الصلاة ، باب وقوت الصلاة ، رقم : ۱ ، وسنن الدارمي ، كتاب الصلاة ، باب في مواقيت الصلاة ، رقم : ۱۱۶۲ .

موقوتًا" کہ نماز مؤمنین پر ایسا فریضہ ہے جو وقت کا پابند ہے یعنی وقت کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ ہر نماز کا ایک وقت معین ہے اور وقت معین ہونے کی وجہ سے وہ نماز اسی وقت میں پڑھی جاسکتی ہے اور اس کی تفصیل اس باب کی احادیث میں آرہی ہے۔

حدیثِ باب کی تشریح

پہلی حدیث امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت فرمائی کہ عبداللہ بن مسلمہ کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک رحمہ اللہ پر یہ حدیث پڑھی اور وہ ابن شہاب زہری سے روایت کرتے ہیں اور یہ مؤطا امام مالک رحمہ اللہ کی پہلی حدیث ہے، امام مالک رحمہ اللہ نے اپنی مؤطا کو اسی حدیث سے شروع کیا ہے۔

امام ابن شہاب زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ایک دن نماز تاخیر سے پڑھی، یہ واقعہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے خلیفہ بننے سے پہلے کا ہے اور **"یوماً"** کے لفظ نے بتا دیا کہ ان کی عادت نماز کو مؤخر کرنے کی نہیں تھی لیکن ایک دن اتفاق سے نماز مؤخر کر دی، **"فدخل علیه عروة بن الزبیر"** تو عروہ بن زبیر ان کے پاس آئے، **"فأخبره أن المغیرة بن شعبة أخّرَ الصلوٰة یوماً و هو بالعزاق"**.

ایک مرتبہ مغیرہ بن شعبہ ﷺ نے بھی نماز تاخیر سے پڑھی تھی جب وہ عراق کے گورنر تھے۔ **"فدخل علیه ابو مسعود الانصاری"** ان کے پاس حضرت ابو مسعود الانصاری ﷺ آئے، **"فقال ما هٰذا یا مغیرة"** پوچھا اے مغیرہ! کیا بات ہے؟ نماز کیوں تاخیر سے پڑھی؟

"الیس قد علمت أن جبریل صلوات اللّٰه و سلامه علیه نزل فصلّٰی". کیا آپ کے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے اور انہوں نے نماز پڑھی اور ان کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے بھی نماز پڑھی۔

فصلی رسول اللّٰه ﷺ ثم صلّی فصلّی رسول اللّٰه ﷺ ثم صلّی فصلّی رسول اللّٰه ﷺ ثم صلّی فصلّی رسول اللّٰه ﷺ ، ثم صلّی فصلی رسول اللّٰه ﷺ.

پانچ مرتبہ ارشاد فرمایا، یعنی پانچوں نمازوں کا ذکر فرمایا **"صلی فصلّی"** یہ فاء تعقیب کی ہے۔

فاء تعقیب کے دو معنی

"فاء" تعقیب کے دو معنی آتے ہیں:

ایک معنی تو یہ ہے کہ تعقیب زمانی ہو، **"فاء"** سے ماقبل کا واقعہ پہلے واقع ہوا ہو، اور **"فاء"** کے مابعد جو

بیان کیا گیا ہے وہ بعد میں واقع ہوا ہو۔

دوسرا "فاء" تعقیب "سببیه" ہے، یعنی "فاء" کا ماقبل "فاء" کے مابعد کا سبب ہے، اس کے لئے ضروری نہیں کہ دونوں کے زمانوں میں فرق ہو، ایک ہی وقت میں دونوں ہوں اور ایک چیز دوسری چیز کا سبب ہو تو بھی "فاء" کا اطلاق ہو جاتا ہے۔

احتمال

"صلی فصلی رسول الله ﷺ" میں دونوں احتمال ہیں، اگر اس "فاء" کو "فاء" "سببیه" مانا جائے تو اس سے واقعۂ جبرئیل علیہ السلام کی طرف اشارہ ہوگا، جس کا مطلب یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے امامت کی جس کے نتیجے میں نبی کریم ﷺ نے بھی ان کے ساتھ نماز پڑھی اگرچہ دونوں کا زمانہ مقترن تھا، دونوں ایک ہی وقت میں پڑھ رہے تھے لیکن حضرت جبرئیل علیہ السلام کی نماز حضور ﷺ کی نماز کے لئے سبب تھی، اس واسطے یہاں پر "فاء" تعقیب سببی پر دلالت کر رہی ہے۔

اور اگر "فاء" کو تعقیب زمانی کے لئے لیا جائے تو بعض حضرات نے اس کے یہ معنی کئے ہیں کہ پہلے "صلی" سے مراد جبرئیل علیہ السلام کا امامت کرنا اور دوسرے "صلی" سے مراد ہے کہ اس کے بعد نبی کریم ﷺ کا انہی اوقات میں نماز ادا کرنا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے امامت کی تھی بعد میں رسول اللہ ﷺ انہی اوقات میں نماز ادا فرماتے رہے جن کی حضرت جبرئیل علیہ السلام نے تعلیم دی تھی۔ تو یہ دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔

تفصیلِ حدیث کے بارے میں روایاتِ سنن کا اختلاف

اب اس حدیث میں حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ نے مواقیت کی تفصیل نہیں بتائی، صرف اتنا بتایا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کے ساتھ پانچ نمازیں پڑھیں اور ذکر بھی صرف ایک دن کا کیا، جبکہ حدیثِ جبرئیل جس میں مواقیت کا ذکر ہے وہاں دو دن کی امامت کا بیان ہے اور حدیثِ جبرئیل تمام کتابوں یعنی سنن اربعہ میں موجود ہے۔ [۲] لیکن بخاری و مسلم نے اس تفصیل کے ساتھ کہیں بھی روایت نہیں کیا جو تفصیل سنن اربعہ میں آئی ہے، وہ اس لئے کہ یہ حدیث ان کی شرائط کے مطابق نہ ہوگی، اس واسطے صرف اتنا حصہ روایت کیا ہے جو ان کی شرائط کے مطابق ہے۔

---

[۲] اخرجه أبو داؤد فيه عن محمد بن مسلمة عن ابن وهب عن اسامة بن زيد عن الزهري به ، وأخرجه الترمذي في الصلاة عن قتيبة عن الليث عن ابن شهاب عن عروة عن عائشة به ، وأخرجه النسائي فيه عن قتيبة به ، وأخرجه ابن ماجة عن محمد بن رمح به ، انظر : عمدة القاري ، ج: ۴، ص: ۵ ، في ذيل "ذكر تعدد موضعه ومن أخرجه غيره".

تو یہاں تفصیل نہیں ہے وہاں سنن میں تفصیل ہے، چاہے وہ بخاری و مسلم کی اعلیٰ شرائط پر پوری نہ اترے، لیکن فی نفسہٖ سنداً وہ صحیح ہے، اس واسطے ان کے ساتھ استدلال بھی درست ہے تو اس میں جو مواقیت کی تعلیم دی ہے، اس میں یہ بات ملحوظ رہے کہ اس میں اوقاتِ مستحبہ، غیر مکروہہ کا بیان ہے۔

اسی وجہ سے اس میں پہلے دن عصر کی نماز مثلِ اول پر پڑھی اور دوسرے دن عصر کی نماز مثل ثانی کے بعد پڑھی، حالانکہ عصر کا وقت مثل ثانی کے بعد بھی برقرار رہتا ہے لیکن گویا مستحب وقت یہ ہے کہ اصفرار سے پہلے پہلے پڑھ لے، اس واسطے اس کی تعلیم دی۔ باقی مختلف اوقات کے بارے میں جو فقہاء کا اختلاف ہے وہ متعلقہ ابواب میں ان شاء اللہ آجائے گا۔

آگے ذکر فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ نماز پڑھی، **"ثم قال"** پھر جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا **"بھذا اُمرتُ یا بھذا امرتَ"** دونوں جائز ہیں کہ اسی کا آپ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ اسی طرح نماز پڑھیں۔

"فقال عمر لعروۃ" حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے جب عروۃ سے یہ بات سنی تو عروۃ سے کہا **"اعلم ما تحدث بہ"** کہ جو حدیث سنا رہے ہو، سوچ سمجھ کر کہو۔

"أو أن جبرئیل ھو اقام لرسول اللہ ﷺ وقت الصلوٰۃ؟".

کیا جبرئیل تھے جنہوں نے حضور ﷺ کے لئے نماز کا وقت مقرر کیا؟

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو اس سے قبل یہ واقعہ معلوم نہیں تھا اور ان کو اس بات سے اچھنبا ہوا کہ جبرئیل امین نے آکر حضور اقدس ﷺ کو اوقاتِ نماز کی تعلیم دی۔

"قال عروۃ! کذالک کان بشیر بن ابی مسعود یحدث عن أبی".

عروہ نے بعد میں کہا کہ میں اس حدیث کو تنہا روایت کرنے والا نہیں ہوں، بلکہ ابو مسعود کے صاحبزادے بشیر بن ابی مسعود رضی اللہ عنہ بھی اس حدیث کو اپنے والد کے واسطے سے سنایا کرتے تھے۔

"قال عروۃ و لقد حدثنی عائشۃ ان رسول اللہ ﷺ کان یصلی العصر و الشمس فی حجرتھا قبل ان تظھر".

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس حالت میں نماز پڑھا کرتے تھے کہ سورج ان کے حجرے میں ہوتا تھا۔ **"قبل ان تظھر"** قبل اس کے کہ دھوپ ان کی دیوار پر چڑھے۔ **"تظھر"** یہاں **"ظَھَرَ۔ یظھر۔ ظھوراً"** سے نہیں **"ظھر۔ یظھر۔ ظھراً"** سے ہے، جس کے معنی ہوتے ہیں کسی کی پشت پر سوار ہونا، یعنی وہ دھوپ ابھی دیوار پر سوار نہیں ہوئی ہوتی تھی۔ یہ حدیث آگے مسنداً آرہی ہے۔

(۲) باب قول اللہ تعالیٰ

﴿مُنِيبِينَ إِلَيْهِ و اتَّقُوهُ وَ أَقِيمُو الصَّلاةَ وَ لاتَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ [الروم: ۳۱]

اللہ ﷻ کا قول کہ خدا کی طرف رجوع کرو اور اس سے ڈرتے رہو اور نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔

۵۲۳ ـ حدثنا قتيبة بن سعيد قال: حدثنا عباد (هو ابن عباد) عن ابی جمرة، عن ابن عباس قال: قدم وفد عبد القيس على رسول الله ﷺ فقالو: انا هذا الحيي من ربيعة، و لسنا نصل اليک الا فی الشهر الحرام، فمرنا بشیء نأخذه عنک و ندعو إليه من وراءَ نا. فقال: "أمركم باربع، و أنها كم عن أربع: الايمان بالله. ثم فسرها لهم. شهادة ان لا الٰه الا اللّٰه و إنی رسول الله و أقام الصلاة و ايتاءُ الزكاة و أن تؤدوا الى خمس ما غنمتم، وانهى عن الدباءِ والحنتم والمقيّر والنقير". [راجع: ۵۳]

(۳) باب البيعة على اقام الصلاة

نماز کے قائم رکھنے پر بیعت کا بیان

۵۲۴ ـ حدثنا محمد بن المثنى قال: حدثنا يحيى قال: حدثنا اسماعيل قال: حدثنا قيس عن جرير بن عبدالله قال: بايعت رسول الله ﷺ على اقام الصلاة، و ايتاء الزكاة، والنصح لكل مسلم. [راجع: ۵۷]

دونوں احادیث کی تشریح پیچھے گزر چکی ہے۔

(۴) باب: الصلاة كفارة

نماز گناہوں کا کفارہ ہے

۵۲۵ ـ حدثنا مسدد قال: حدثنا يحيىٰ، عن الأعمش قال: حدثنی شقيق قال: سمعت حذيفة قال: كنا جلوسا عند عمر بن الخطاب ﷺ فقال: ايكم يحفظ قول رسول

الله ﷺ في الفتنة؟ قلت: انا، كما قاله. قال: انک علیه او علیها لجریء. قلت: فتنة الرجل في اهله و ماله وولده و جاره تكفرها الصلاة و الصوم والصدقة والأمر والنهي. قال: ليس هذا اريد، ولكن الفتنة التي تموج كما يموج البحر؟ قال: ليس عليک منها بأس يا أمير المؤمنين، إن بينک و بينها بابا مغلقا. قال: ایکسر ام یفتح؟ قال: یکسر. قال: اذا لا يغلق ابدا. قلنا: اكان عمر يعلم الباب؟ قال: نعم كما ان دون الغد الليلة، إني حدثته بحديث ليس بالأغاليط فهبنا أن نسأل حذيفة فأمرنا مسروقا فسأله فقال: الباب عمر. [أنظر: ۱۴۳۵، ۱۸۹۵، ۳۵۸۶، ۷۰۹۶] [۳]

ترجمۃ الباب سے مقصود بخاریؒ

"باب الصلوٰة كفارة" اس باب میں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ نماز گناہوں کے لئے کفارہ ہوتی ہے اور اس میں حدیث روایت کی ہے کہ شقیق بن مسلمہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت حذیفہ ؓ سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: "كنا جلوساً عند عمر ؓ" کہ ہم حضرت عمر ؓ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، تو حضرت عمر ؓ نے فرمایا:

"أيكم يحفظ قول رسول الله ﷺ في الفتنة".

کہ تم میں سے کون شخص ہے جس کو رسول اللہ ﷺ کے فتنہ کے بارے میں ارشادات یاد ہوں، کہ جو فتنہ آئے گا، اس کے متعلق حضور اقدس ﷺ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہو، اگر وہ کسی کو یاد ہو تو بتائے۔ "قلت : أنا" حضرت حذیفہ ؓ نے عرض کیا کہ مجھے یاد ہیں۔ اس واسطے کہ ان کو "فتن" کے بارے میں خاص طور پر حضور اقدس ﷺ نے وہ باتیں بتائی تھیں جو اور لوگوں کو معلوم نہیں تھیں، اس لئے ان کو صاحب سر رسول اللہ ﷺ کہا جاتا ہے۔ "قلت أنا، كما قاله" بیچ میں فعل محذوف ہے۔ "انا أحفظ كما قاله" کہ مجھے یاد ہیں اور اسی طرح یاد ہیں جس طرح رسول اللہ ﷺ نے وہ باتیں ارشاد فرمائی تھیں۔ "قال انک علیه لجریء" حضرت عمر ؓ نے فرمایا کہ: تمہارا یہ کہنا کہ مجھے اس طرح یاد ہے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، تمہاری بڑی جرأت کی بات ہے۔ تم تو بڑے جرأت مند ہو، تو میں نے عرض کیا:

---

[۳] وفي صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب بيان أن الاسلام بدأ غريبا وسيعود غريبا وأنه يا رز، رقم: ۲۰۷، و كتاب الفتن واشراط الساعة، باب في الفتنة التي تموج كموج البحر، رقم: ۵۱۵۰، وسنن الترمذي، كتاب الفتن عن رسول الله، باب ماجاء في النهي عن سب الرياح، رقم: ۲۱۸۴، وسنن ابن ماجة، كتاب الفتن، باب مايكون من الفتن، رقم: ۳۹۴۵، ومسند أحمد، باقي مسند الأنصار، باب حديث حذيفة بن اليمان عن النبي، رقم: ۲۲۱۹۳، ۲۲۳۲۲، ۲۲۳۴۳.

"فتنة الرجل فی اهله و ماله و ولده و جاره تکفر ها الصلوٰة و الصوم و الصدقة والامرو النهی"

کہ وہ فتنہ جو کسی انسان کو لاحق ہوتا ہے اپنے اہل میں یا اپنے مال میں یا اپنی اولاد میں یا اپنے پڑوس کے بارے میں تو نماز، روزہ، صدقہ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس کا کفارہ کر دیتے ہیں۔

اس کے نیچے بین السطور میں لکھا ہوا ہے کہ: **"فتنة الرجل فی اهله و ماله"** کہ **"بأن یاخذه من غیر مأ خذه ویصر فه فی غیر مصرفه"**۔

کہ مال کا فتنہ یہ ہے کہ اس کو غیر مأ خذ سے لے، جو اس کے لینے کی جگہ تھی وہاں سے نہیں لیا، حلال طریقہ پر حاصل نہیں کیا بلکہ ناجائز طریقہ پر حاصل کیا اور اس کو غیر مصرف پر خرچ کیا۔ جو اس کا صحیح مصرف تھا اس پر صرف کرنے کے بجائے غلط مصرف میں صرف کیا، یہ **"فتنة الرجل فی ماله"** کی تفسیر کی۔

لیکن یہ تفسیر دوسرے دلائل شرعیہ کے خلاف ہے، اس واسطے کہ اگر کوئی شخص مال ناجائز طریقہ سے حاصل کرے اور ناجائز طریقے سے صرف کرے تو نماز، روزہ اس کا کفارہ نہیں ہوتے، کیونکہ اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے اور یہ جو نماز، روزہ وغیرہ کے کفارہ ہونے کا ذکر آیا ہے یہ حقوق العباد سے متعلق نہیں، بلکہ کبائر سے بھی متعلق نہیں ہے جیسا کہ میں نے ترمذی میں عرض کیا تھا کہ اس سے ہمیشہ صغائر مراد ہوتے ہیں۔ کبائر کی معافی قانون کی رُو سے توبہ کے بغیر نہیں ہوتی، اللہ ﷻ اپنے فضل سے معاف فرما دیں تو یہ الگ بات ہے اور حقوق العباد کی معافی اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک صاحبِ حق معاف نہ کر دے یا اس کو اس کا حق نہ پہنچا دے، لہٰذا یہ تفسیر کرنا کہ ناجائز طریقہ سے مال حاصل کیا اور ناجائز طریقہ سے خرچ کیا اس کا کفارہ صوم یا صلوٰۃ ہو جائے گی یہ دلائل شرعیہ کے خلاف ہے۔

مزید توضیح

یہ ہے کہ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے (واللہ سبحانہ اعلم) کہ اس کی تفسیر یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے اہل کی وجہ سے، مال کی وجہ سے، اولاد کی وجہ سے، پڑوسی کی وجہ سے فتنہ میں مبتلا ہو جائے یعنی ان کی وجہ سے کسی گناہ صغیرہ کا ارتکاب کر لے، گھر والوں کو راضی کرنے کے لئے کسی گناہ کا ارتکاب کر لیا، لیکن جس گناہ کا ارتکاب کیا اس کا تعلق حقوق العباد سے نہیں ہے، گھر والوں کے ساتھ اتنا مصروف ہوا کہ فرض کرو کوئی جماعت چھوڑ دی، یا اپنے مال میں اتنا مصروف ہوا کہ اس کی وجہ سے کسی گناہ کا ارتکاب کر لیا، اولاد یا پڑوسی کے ساتھ اتنا مشغول ہوا کہ ان کی وجہ سے کسی گناہ کا ارتکاب کر لیا۔ تو اس صورت میں نماز، روزہ وغیرہ اس کا کفارہ ہو جائیں گے۔

"الفتنة الرجل فی" کا معنی یہ نہیں ہے کہ اپنے اہل، مال یا جار کا حق ضائع کر دے، کیونکہ اگر ان کے

حقوق ضائع کریگا تو محض نماز، روزہ سے اس کا کفارہ ادا نہیں ہوگا۔ تو مراد یہ ہے کہ ان کی وجہ سے یا اس کے ساتھ مشغول و منہمک ہونے کی بنا پر کسی ایسے گناہ کا ارتکاب کرلے جس کا تعلق حقوق اللہ سے ہو تو "**تکفرها الصلوٰة و الصوم**" اس کا کفارہ نماز، روزہ، صدقہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے ہو جاتے ہیں۔

"**قال لیس هذا ارید**" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرے پوچھنے کا مطلب وہ فتنہ نہیں تھا جو انسان کو اہل اور مال وغیرہ کی وجہ سے ہو بلکہ "**ولكن الفتنة التي تموج كما يموج البحر**" میرا مقصد تو اس فتنہ کے بارے میں پوچھنا تھا جو اس طرح موج مارے گا جس طرح سمندر موج مارتا ہے یعنی میرا مقصد انفرادی فتنہ نہیں ہے۔ آپ جو جواب دے رہے ہیں وہ اس فتنہ کے بارے میں دے رہے ہیں جس میں کوئی شخص انفرادی طور پر مبتلا ہو جائے "**قال**" تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا:

"**لیس علیک منها بأس یا أمیر المؤ منین**".

اے امیر المؤمنین! وہ جو اجتماعی فتنہ ہے، اس سے آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ کیوں؟

"**ان بینک و بینها بابا مغلقا**". اس لئے کہ آپ اور اس فتنہ کے درمیان بند دروازہ ہے، کیا معنی؟ کہ جب تک وہ دروازہ بند رہے گا اس وقت تک فتنے نہیں آئیں گے، لہٰذا آپ اس سے محفوظ ہیں۔

"**قال: أیُکسر أم یفتح؟**"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فراست

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ دروازہ کھولا جائے گا یا توڑا جائے گا، سمجھ گئے کہ یہ دروازہ میں ہوں، یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فراست ہے کہ دروازہ قوت سے توڑا جائے گا یا معمول کے مطابق کھولا جائے گا۔ گویا میری وفات طبعی طور پر واقع ہوگی یا تشدد و شہادت کے ذریعے واقع ہوگی۔

"**قال أیُکسر**" حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا توڑا جائے گا۔ تو اس سے دو نتیجے نکالے:

ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ آپ کی شہادت واقع ہوگی۔

دوسرا نتیجہ یہ کہ "**إذاً لا یغلق أبداً**" کہ اگر توڑا جائے گا تو پھر دوبارہ بند نہیں ہوگا۔ کیونکہ اگر معمول کے مطابق کھولا جاتا تو پھر معمول کے مطابق بند بھی کیا جاتا ہے، لیکن جب دروازہ ٹوٹ ہی گیا تو اب اس کے بند ہونے کا راستہ ہی نہیں۔ "**اذاً لا یغلق أبداً**" پھر تو وہ کبھی بھی بند نہیں ہوگا۔ "**اللہ اکبر**" یعنی فراست بھی کس مقام کی ہے کہ سوال بھی کیا گیا اور جواب ملا تو اس کا نتیجہ بھی کیا نکالا۔

"**قلنا**" حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے ایک شاگرد یعنی شقیق کہتے ہیں کہ ہم نے حذیفہ رضی اللہ عنہ سے کہا:

"**أکان عمر یعلم الباب**".

کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ دروازہ کیا ہے؟ **"قال: نعم کما أن دون الغد الليلة"** ہاں وہ اس طرح جانتے تھے جس طرح کل سے پہلے آج کی رات ہے انسان کو جتنا یقین اس بات پر ہوسکتا ہے اتنے ہی یقین سے وہ جانتے تھے کہ دروازہ کون ہے؟

"انی حدثته بحدیث لیس بالا غالیط".

میں نے انہیں جو حدیث سنائی تھی وہ کوئی مغالطے والی باتیں نہیں تھیں، حضور اقدس ﷺ کا ارشاد تھا۔ اس واسطے وہ جانتے تھے کہ دروازہ کیا ہے؟

اب شقیق ابن مسلمہ کہتے ہیں کہ **"فهبنا أن نسأل حذيفة"** ہمیں ڈر لگا کہ ہم حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھیں کہ وہ دروازہ کون تھا؟

"فأمرنا مسروقا فسأله، فقال: الباب عمر".

تو ہم نے اپنے ساتھی مروان بن الاجدع سے کہا، انہوں نے جا کر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ دروازہ خود حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ہیں۔

چنانچہ واقعہ بھی یونہی پیش آیا کہ جب تک فاروق اعظم رضی اللہ عنہ زندہ رہے مسلمانوں میں کوئی فتنہ نہیں پیش آیا اور جب وہ دروازہ توڑا گیا یعنی شہید ہوئے تو ان کی شہادت کے بعد فتنوں کا دروازہ کھلا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ابتداء خلافت سے ہی اس کے آثار شروع ہو گئے تھے۔

شروع میں ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جن جن لوگوں کو مختلف مقامات پر گورنر مقرر کیا، ان کے گورنروں کے خلاف یورش اور شورشیں ہر جگہ شروع ہو گئیں، جو فتنہ کا آغاز تھا۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر اس کا شباب اور انتہا ہوئی کہ اہل فتنہ نے آپ کو شہید کر دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں میں جو تلوار چلی وہ نہ رک سکی۔

۵۲۶ - حدثنا قتيبة قال: حدثنا يزيد بن زريع، عن سليمان التيمي، عن أبي عثمان النهدي، عن ابن مسعود ان رجلا أصاب من امرأة قبلة، فأتى النبي ﷺ فأخبره، فانزل الله: ﴿أَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفاً مِنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ [هود: ۱۱۴] فقال الرجل: يا رسول الله، ألي هذا؟ قال: "لجميع امتي كلهم"[أنظر: ۴۶۸۷] [۴]

[۴] وفي صحيح مسلم، كتاب التوبة، باب إن الحسنات يذهبن السيئات، رقم: ۴۹۶۳، وسنن الترمذي، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله، باب ومن سورة هود، رقم: ۳۰۳۷، وسنن أبي داؤد، كتاب الحدود، باب في الرجل يصيب من المرأة دون الجماع فيتوب قبل، رقم: ۳۸۷۵، وسنن ابن ماجة كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها، باب كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، رقم: ۱۳۸۸، وكتاب الزهد، باب ذكر التوبة، رقم: ۴۲۴۴، ومسند احمد، مسند المكثرين من الصحابة، باب مسند عبد الله بن مسعود، رقم: ۳۴۷۱، ۳۶۶۱، ۳۸۸۵، ۴۰۲۹، ۴۰۶۴، ۴۰۹۷.

باب **"الصلوٰۃ کفارۃ"** کی یہ دوسری حدیث ہے،

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرد نے ناجائز طریقے پر ایک عورت کا بوسہ لے لیا اور پھر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا اور آکر بتایا تو اس پر اللہ جل جلالہ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿أَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفاً مِنَ اللَّيلِ إِنَّ الحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾.

یعنی نماز قائم کرو دن کے دونوں کناروں پر اور رات کے مختلف حصوں میں، بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو زائل کر دیتی ہے۔

بوسہ لینا گناہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟

تو جب نماز کی نیکی کرو گے تو یہ گناہ کا کفارہ ہو جائے گا۔ اس سے علماء نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ قبلہ (بوسہ لینا) صغائر میں سے ہے، ورنہ کبائر حسنات سے معاف نہیں ہوتے، جب تک کہ توبہ نہ کرے۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی رائے

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس میں تردد ہے کہ قبلہ صغائر میں سے ہے، حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اتنی بات کہہ کر کہ ''مجھے تردد ہے'' بات چھوڑ دی اس کی مزید تشریح نہیں کی۔[۵]

دیگر علماء کی آراء

بعض علماء کرام نے یہ فرمایا کہ قبلہ یا دوسرے دواعیِ زنا اور وطی، ان کی دو حیثیتیں ہیں:

ایک یہ کہ کوئی شخص زنا کرنا چاہ رہا ہے **"اللّٰھم احفظنا منہ"** (آمین) اور یہ اعمال تقبیل لمس وغیرہ مقدمہ کے طور پر کر رہا ہے تو اس وقت تو یہ صغیرہ ہیں، کیونکہ اصل مقصود تو ارتکابِ زنا ہے، ابھی ابتدائی چھیڑ چھاڑ اور ابتدائی مقدمات شروع کئے ہیں، پھر ایک دم سے اللہ جل جلالہ کے خوف سے رک گیا اور آگے تجاوز نہیں کیا، تو یہ قبلہ لمس وغیر صغیرہ ہو گئے اور یہ آئندہ کوئی نماز، وضو کرے گا تو معاف ہو جائے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مقصود ہی قبلہ وغیرہ تھے زنا مقصود نہ تھا آگے بڑھنا منظور ہی نہیں تھا، صرف اسی

---

[۵] ثم إن فی الزیلعی شرح الکنز أن القبلة صغیرة قلت ولی فیه تردد، فیض الباری علی صحیح البخاری، ج:۲، ص:۱۰۳۔

عمل سے لذت اندوزی پیش نظر تھی تو پھر یہ کبیرہ ہے، کیونکہ مقصود یہی ہے۔[۶]

اور یہ بات تو سب ہی کہتے ہیں کہ صغیرہ اس وقت تک صغیرہ ہے جب تک آدمی اتفاقاً کبھی ایسا کام کرلے اور اگر اس کو عادت بنالے اور اس پر اصرار کرے تو پھر وہ صغیرہ بھی کبیرہ ہوگا، نیز اگر صغیرہ کو معمولی سمجھ کر کرے تو اس کو بھی کبیرہ کہا ہے، اس لئے کہ اللہ ﷻ کی نافرمانی چاہے چھوٹی چیز میں ہو یا بڑی چیز میں ہو، ہے تو نافرمانی۔ اب کوئی اس نافرمانی کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کرے تو یہ استھانت ہے اور استخفاف ہے اس لئے وہ گناہِ کبیرہ ہے، لہٰذا کبھی اس چکر میں مت پڑنا کہ بھائی یہ صغیرہ ہے چلو کر گزرو۔

صغیرہ اور کبیرہ کی مثال

حضرت حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ صغیرہ وکبیرہ کی مثال دیتے ہیں کہ جیسے چنگاری اور بڑا شعلہ، دونوں آگ ہیں، کیا کوئی شخص یہ سمجھ کر کہ یہ چھوٹی سی چنگاری ہے اپنی الماری میں رکھ لے گا، ایسا کوئی نہیں کرے گا، اس لئے کہ اگر رکھے گا تو جلا دے گی اس لئے جو کہا گیا ہے کہ روزہ، نماز صغیرہ کے لئے کفارہ بن جاتے ہیں، اس سے کبھی یہ مت سمجھنا کہ یہ معمولی چیز ہے، لہٰذا کر گزرو۔

یہ کفارہ اس وقت بنتے ہیں جبکہ اتفاقاً بھول چوک سے سرزد ہو جائے، لیکن باقاعدہ مقصد بنا کر، ارادہ کر کے اسے معمولی سمجھ کر کرتا ہے تو یہ کبیرہ ہی کے حکم میں ہے۔ اللہ ﷻ اپنی مدد اور نصرت سے محفوظ فرمائے۔ آمین۔

صحابی تھے ایک مرتبہ تقاضائے بشریت سے مغلوب ہو کر یہ معاملہ ہو گیا اور ہونے کے بعد حضور ﷺ کی خدمت میں آکر صاف صاف اعتراف کرلیا۔ اگر کسی سے ایسا کام ہو جائے تو کوئی اپنے باپ، استاذ یا شیخ سے جا کر یہ کہے گا کہ مجھ سے یہ کام ہو گیا؟

تو ندامت کس اعلیٰ مقام کی ہوگی کہ جس کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کے ہاں گئے، تو معلوم ہوا کہ عادت نہیں تھی اس لئے کہ جس کی عادت ہوتی ہے وہ اس قدر پشیمان نہیں ہوتا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آیت نازل ہو چکی تھی مگر حضور اکرم ﷺ نے اس جگہ اس سے تمسک فرمایا۔ تو بعض مرتبہ یہ بھی تعبیرات ہوتی ہیں اس لئے تسلّی دی کہ نماز پڑھو، معاف ہو جائے گا۔ باقی عادت نہ بنائے، نہ

---

[۶] ثم أن آيات الكفارة ثلاث...... أما الامكان فقد علم من النص الاول فعلم أن مغفرة الذنوب كلها ممكنة ولكنها تحت مشيئته تعالى ؛ وأما الوعد ففي صورة الا جتناب عن الكبائر لا انها مستحيلة عند عدمه ؛ وأما في الثالثة فتنبيه على سبب خاص لها وهو أن الحسنات أحد أسباب المغفرة للسيئات وفي قوله إلا اللمم أيضا إشارة إلى الوعد بمغفرة الصغائر فهذا نوع آخر ووعد آخر وراجع لكفارة الصغائر والكبائر عقيدة السفاريني الخ ، فيض الباري على صحيح البخاري ، ج: ۲، ص: ۱۰۳.

قصدوارادہ کر کے کرے اور نہ اس کو معمولی سمجھے۔

(۵) باب فضل الصلاة لوقتها

نماز اس کے وقت پر پڑھنے کی فضیلت کا بیان

۵۲۷ ـ حدثنا أبو الوليد هشام بن عبد الملک قال : حدثنا شعبة قال: الوليد بن العيزار أخبرني قال: سمعت أبا عمرو الشيباني يقول: حدثنا صاحب هذه الدار، وأشار بيده إلى دار عبدالله ، قال : سألت النبي ﷺ : أى العمل أحب إلى الله؟ قال: "الصلاة على وقتها" قال : ثم أىّ؟ قال : "بر الوالدين". قال ثم أىّ؟ قال : "الجهاد في سبيل الله" . قال : حدثني بهن رسول الله ﷺ ولو استزدته لزادني .[انظر: ۲۷۸۲، ۵۹۷۰، ۷۵۳۴]

یعنی اگر میں اور پوچھتا کہ کون سا عمل افضل ہے تو اور بتاتے کہ کونسا افضل ہے۔

(۶) باب : الصلوات الخمس كفارة

پنج وقت نماز کفارہ ہیں

۵۲۸ ـ حدثنا ابراهيم بن حمزة قال: حدثني ابن أبي حازم والدراوردي، عن يزيد بن عبدالله ، عن محمد بن ابراهيم، عن أبي سلمة بن عبدالرحمٰن، عن أبي هريرة أنه سمع رسول الله ﷺ يقول: "أرائيتم لو أن نهرا بباب أحدكم يغتسل فيه كل يوم خمسا، ما تقول ذالک يبقى من درنه؟ "قالو: لا يبقى من درنه شيئا. قال: "فذالک مثل الصلواتِ الخمس يمحو الله به الخطايا".

(۷) باب : في تضييع الصلاة عن وقتها

نماز کے بے وقت پڑھنے کا بیان

۵۲۹ – حدثنا موسى بن إسماعيل قال: حدثنا مهدي عن غيلان عن أنس قال: ما اعرف شيًا مما كان على عهد النبي ﷺ ، قيل: الصلاة؟: اليس صنعتم ما صنعتم فيها. [۷]

[۷] وفي سنن الترمذي كتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله ، باب ماجاء في صفة أواني الحوض ، رقم: ۲۳۷۱ ، ومسند أحمد ، باقي مسند المكثرين ، باب مسند أنس بن مالک ، رقم : ۱۱۵۳۹ ، ۱۲۶۹۱ .

۵۳۰ - حدثنا عمرو بن زراة قال: أخبرنا عبد الواحد بن واصل أبو عبيدة الحداد ، عن عثمان بن أبى رواد أخو عبدالعزيز قال: سمعت الزهرى يقول: دخلت على أنس بن مالک بدمشق و هو يبكى فقلت له: ما يبكيک ؟ فقال: لا أعرف شيًا مما ادركت الا هذه الصلاة وهذه الصلاة قد ضيعت. وقال بكر بن خلف: حدثنا محمد ابن بكر البرسانى قال: أخبرنا عثمان بن أبى رواد نحوه.

حدیثِ باب کی تشریح

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ آج میں ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں پاتا جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں تھی۔ ان کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ ہم حضور ﷺ کے زمانہ میں جو اعمال دیکھتے تھے، جو جذبات دیکھتے تھے ان میں سے کوئی بھی نظر نہیں آتا **"ما اعرف شیئا مما کان علی عهد النبی ﷺ"**.

حضرت انس رضی اللہ عنہ اپنے زمانہ میں فرما رہے ہیں، یہ سب سے آخری صحابی ہے، تقریباً سو سال عمر پائی، زیادہ سے زیادہ یہ سمجھ لیں کہ جب وہ بات فرما رہے ہوں گے اس وقت صدی کا آخر ہوگا۔

تو ایک صدی سے زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ اس وقت فرما رہے ہیں کہ میں جو چیزیں حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں دیکھتا تھا، ان میں سے اب کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ سو سال میں یہ حال ہوا۔

لمحۂ فکریہ

اگر آج صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تشریف لے آئیں اور ہماری حالت دیکھیں، کسی بزرگ کا مقولہ میں نے سنا ہے کہ اگر آج کوئی صحابی تشریف لے آئیں تو وہ ہمیں کافر کہیں گے اور لوگ انہیں کہیں گے کہ یہ مجنون ہیں۔ [۸]

"قيل الصلوٰة".

ایک آدمی نے کہا آپ کی یہ بات مبالغہ معلوم ہوتی ہے کہ کچھ تو اس دور کی باتوں کا باقی ہے، مثلاً نماز۔

"قال أليس صنعتم ما صنعتم فيها ؟".

---

۸ كذا ذكره الزرقانى فى شرحه " كما قال الحسن أدركت اقواما لو رأوكم لقالوا لايؤمنون بيوم الحساب"، ج:۴،ص: ۵۱۴، ولذالک قال الحسن ادركنا أقواما مارأيتموهم لقلتم مجانين ولو رأوكم لقالوا شياطين الخ، فيض القدير ، ج: ۲،ص: ۷۹ ، وقال الربيع بن خيثم لو رآنا أصحاب محمد صلى الله عليه وسلم لقالوا هؤلاء لايؤمنون بيوم الحساب الخ ، فيض القدير ، ج:۳،ص: ۴۷۹.

کیا اس جماعت کے اندر تم نے وہ کچھ نہیں کرلیا یعنی نمازوں کی ادائیگی کے طریقے میں تم نے ایسی تبدیلیاں پیدا کرلی ہیں جن کا رسول کریم ﷺ کے زمانے میں تصور بھی نہیں تھا، اس سے نماز کو وقت سے مؤخر کرنے کی طرف اشارہ ہے کہ وقتِ مستحب سے مؤخر کر کے پڑھتے ہو اور ظاہر ہے اشارہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو خشوع کی کیفیات، جو انابت إلی اللہ اور اخلاص حضور اقدس ﷺ کے زمانہ میں تھا وہ اب نظر نہیں آتا۔ یہاں یہ حدیث لانے کا منشأ یہ ہے کہ:

یہ باب ”تضييع الصلوٰة عن وقتها“ کا ہے۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بھی یہ کہا کہ تم نے نماز کو اپنے وقت سے مؤخر کر دیا۔

(۸) باب المصلي يناجي ربه عز و جل

نماز پڑھنے والا اپنے پروردگار سے سرگوشی کرتا ہے

۵۳۱ ـ حدثنا مسلم بن ابراهيم قال: حدثنا هشام، عن قتادة عن أنس قال: قال النبي ﷺ " إن أحدكم اذا صلى يناجي ربه فلا يتفلن عن يمينه ولكن تحت قدمه اليسرى". وقال سعيد عن قتادة: " لا يتفل قدامه أو بين يديه ولكن عن يساره أو تحت قدميه". و قال شعبة: "لا يبزق بين يديه ولا عن يمينه ولكن عن يساره أو تحت قدمه". وقال حميد عن أنس عن النبي ﷺ :" لا يبزق في القبلة ولا عن يمينه، ولكن عن يساره أو تحت قدمه". [ارجع: ۲۴۱]

۵۳۲ ـ حدثنا حفص بن عمر قال: حدثنا يزيد بن ابراهيم قال: حدثنا قتادة، عن أنس عن النبي ﷺ قال " اعتدلوا في السجود، ولا يبسط ذراعيه كالكلب، واذا بزق فلا يبزقن بين يديه ولا عن يمينه، فانما يناجي ربه".[راجع: ۲۴۱]

(۹) باب الابراد بالظهر في شدة الحر

گرمی کی شدت میں ظہر کو ٹھنڈا وقت کر کے پڑھنے کا بیان

۵۳۳، ۵۳۴ ـ حدثنا ايوب بن سليمان قال: حدثنا ابو بكر عن سليمان بن بلال: قال صالح بن كيسان: حدثنا الأعرج عبدالرحمٰن و غيره ، عن أبي هريرة ، و نافع مولى عبدالله بن عمر، عن عبدالله بن عمر أنهما حدثاه عن رسول الله ﷺ أنه قال: " اذا اشتد

الحر فابردوا بالصلاة، فان شدة الحر من فيح جهنم". [أنظر: ۵۳۶][9]

یہ دو حدیثوں کو ایک ساتھ جمع کیا ہے کہ عبدالرحمٰن ابن اعرج اس کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں اور نافع عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ حدیثیں دونوں الگ الگ ہیں لیکن متن دونوں کا ایک ہے، وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب گرمی سخت ہو تو **"فابردوا بالصلوٰۃ"** نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھو یعنی ٹھنڈے وقت میں پڑھو۔ **"فان شدة الحر من فيح جهنم"** اس لئے کہ سخت گرمی جہنم کی بھاپ کا ایک حصہ ہے۔ **"فیح"** کے معنی لپک کہہ لو، اصل میں **"فیح"** بھاپ کو کہتے ہیں اور آگ کی بھاپ لپک ہے تو جہنم کی لپک کا حصہ ہے۔

قابل ذکر تین مسائل: پہلا مسئلہ ترجمۃ الباب سے متعلق

یہاں تین مسئلے قابل ذکر ہیں۔ پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ابھی اوقاتِ نماز کی تعیین کرنے والے ابواب شروع نہیں کئے، یعنی ظہر کا وقت کب شروع ہوگا، آگے جا کر باب قائم کیا ہے: **"باب وقت الظهر عند الزوال"**.

ترتیب طبعی کے خلاف کرنے کی وجہ

طبعی ترتیب کا تقاضا یہ تھا کہ پہلے وقت کی ابتدا و انتہا بتادیں، پھر وقتِ مستحب ذکر فرمائیں جیسے اور محدثین کرتے ہیں کہ پہلے وقت بتاتے ہیں اور پھر اس کے بعد وقت مستحب بتاتے ہیں، اور یہاں امام بخاری رحمہ اللہ **"ابراد بالظهر"** کو پہلے لائے اور وقت ظہر کو بعد میں ذکر کیا۔ تو کسی نے کہا اتفاقاً ابراد کی اہمیت بیان کرنے کے لئے اس کو پہلے ذکر کیا ہے۔

لیکن دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ اصل میں اس سے پہلے جو باب قائم کیا تھا وہ یہ تھا کہ **"المصلی يناجي ربه"** مصلّی نماز میں اپنے پروردگار سے مناجات کرتا ہے اور مناجات کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے لئے ایسے وقت کا انتخاب کیا جائے جو رضا کا وقت ہو، غضب کا وقت نہ ہو تو اس کے مناسب یہ باب لے کر آئے۔

---

9 وفي صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب استحباب الابراد بالظهر في شدة الحرلمن يمضى، رقم: ۹۷۳، وسنن الترمذى، كتاب الصلاة، باب ماجاء في تأخير الظهر في شدة الحر، رقم: ۱۴۵، وسنن النسائى، كتاب المواقيت، باب الابراد بالظهر اذا اشتد الحر، رقم: ۴۹۶، وسنن أبى داؤد، كتاب الصلاة، باب في وقت صلاة الظهر، رقم: ۳۴۱، وسنن ابن ماجة، كتاب الصلاة، باب الابراد بالظهر في شدة الحر، رقم: ۶۶۹، ومسند أحمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند أبي هريرة، رقم: ۶۸۳۳، ۶۹۴۸، ۷۱۶۱، ۷۴۹۵، ۷۳۹۷، ۷۴۹۵، ۷۸۷۴، ۸۵۴۵، ۸۷۴۲، ۸۸۴۵، ۸۹۶۷، ۱۰۱۰۲، ۱۰۱۸۷، ۱۰۱۱، ۱۱۰۷۲، وموطأ مالك، كتاب وقوت الصلاة، باب النهى عن الصلاة بالهاجرة، رقم: ۲۶، وسنن الدارمى، كتاب الصلاة، باب الابراد بالظهر، رقم: ۱۱۸۱.

جب یہ فرمایا گیا کہ **"شدة الحر من فیح جهنم"** اور جہنم باری تعالیٰ کے غضب کی نشانی ہے، اس واسطے کہا گیا ہے کہ ابراد کے وقت پڑھو جو رضا کا عنوان ہے، اس واسطے مناجات کے مناسب یہ سمجھا کہ پہلے ابراد والی حدیثیں ذکر کر دیں اور پھر آگے جا کر حسب معمول اوقات بیان کریں گے۔

دوسرا مسئلہ: حدیث باب سے استدلال حنفیہؒ اور امام بخاریؒ کی تاویل

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ یہ حدیث اس باب میں حنفیہ کی دلیل ہے کہ گرمیوں کے موسم میں ظہر میں ابراد افضل ہے اور سردیوں میں حنفیہ کے نزدیک تعجیل افضل ہے۔[۱۰]

امام بخاری رحمہ اللہ ہر حالت میں تعجیل کو افضل کہتے ہیں اور حدیث باب کی یہ تأویل کرتے ہیں کہ یہ اس وقت ہے جب لوگوں کو نماز میں آنے کے لئے دور دراز کا سفر طے کرنا پڑتا ہو، تو اس وقت ابراد کیا جائے۔

امام کی تأویل کی پہلی تردید

اول تو خود الفاظ حدیث اس تأویل کی تردید کرتے ہیں کیونکہ جو علت بیان کی گئی ہے وہ **"شدة الحر من فیح جهنم"** ہے، تو لوگ قریب سے آئیں یا دور سے یہ علت موجود ہے۔

دوسری تردید

دوسرے یہ کہ اگلی حدیث آرہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سفر کی حالت میں بھی نماز کو مؤخر فرمایا اور **"أبرد أبرد"** فرماتے رہے۔ تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جب سارے لوگ یکجا تھے، دور سے کسی کو نہیں آنا تھا، آپ ﷺ نے پھر بھی تاخیر فرمائی۔

اس واسطے امام ترمذی رحمہ اللہ نے یہ حدیث نقل کر کے فرمایا ہے کہ اس سے امام شافعی رحمہ اللہ کی تاویل کی تردید ہوتی ہے۔[۱۱]

مسئلے کی مزید تشریح ان شاء اللہ ترمذی میں آئے گی۔

تیسرا مسئلہ: "فیح جهنم" کا سبب

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ حدیث باب میں "حر" کا سبب "فیح جهنم" ہے کیونکہ "من" سببیہ ہے۔

[۱۰، ۱۱] ولم يرض الترمذي بهذا التأويل مع كونه شافعيا، ولم يصرح بخلافه مع أمامه في موضع من كتابه إلا هذا فقال قال أبو عيسىٰ ومعنى من ذهب إلى تأخير الظهر (وهم الحنفية) رضي الله عنهم في شدة الحر أولىٰ وأشبه بالاتباع الخ ، فيض الباري ، ج:۲، ص:۱۰۸ .

معلوم ہوا کہ **"شدّۃ حر"** سبب ہے **"فیح جھنم"** کا، اور اگر **"مِنْ"** کو تبعیضیہ لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ شدۃ حر فیح جہنم کا ایک حصہ ہے تو اس میں **"شدۃ حر"** کو **"فیح جھنم"** کا حصہ قرار دیا گیا ہے یا **فیحِ جھنم** کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

پہلی بات (سببیت) کی تائید اگلی روایت سے ہوتی ہے کہ:

"عن أبی ھریرۃ ﷺ عن النبی ﷺ انہ قال إذا اشتدّ الحر فابردوا بالصلوٰۃ فان شدۃ الحرّ من فیح جھنم و اشتکت النار الیٰ ربھا قالت یا رب أکل بعضی بعضھا فاذن لھا بنفسین"۔

کہ جہنم نے اپنے رب سے شکایت کی کہ اے رب! میرے کچھ حصہ نے کچھ کو کھانا شروع کر دیا۔

یہ آگ ایسی چیز ہے جب تک دوسری چیز ملتی رہے یہ اس کو کھاتی رہتی ہے اور جب کھانے کو اور کوئی چیز نہ ملے تو خود اپنے آپ کو کھانا شروع کر دیتی ہے۔

"کالنار تأکل بعضھا ان لم تجد ما تأکلہ"۔

"فاذن لھا بنفسین" تو اللہ جل جلالہ نے اس کو دو سانس لینے کی اجازت دے دی، **"نفس فی الشتاء ونفس فی الصیف"** ایک سانس سردی میں لے اور ایک سانس گرمی میں لے۔

"وھو اشد ماتجدون من الحرّ" یعنی جب شدید گرمی کا وقت پاتے ہو وہ اس کا گرمی والا سانس ہے **"وأشد ما تجدون من الزمھریر"** اور اس دنیا کے اندر جب تم زیادہ سردی پاتے ہو تو یہ اس کا سردی والا سانس ہوتا ہے۔

"زمھریر" کے معنی سخت سردی کے ہیں۔ **"ولا یرون فیھا شمساً و لا زمھریراً"** نہ جنت میں دھوپ ہوگی نہ سخت سردی ہوگی۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ گرمی کی شدّت کا سبب **"فیح جھنم"** ہے۔

حدیث باب پر دو مشہور سائنسی اشکال

اس پر مشہور اشکال ہوا کہ سائنس کی رو سے اور تمام اہل دنیا کے مسلمات کی رو سے گرمی کا سبب سورج کا قرب اور بعد ہوتا ہے، جب سورج ہم سے قریب ہوتا ہے تو گرمی ہوتی ہے، جب دور ہوتا ہے تو سردی ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارا خطِ استوا کی شمالی جانب ہے اور آج کل خطِ استوا کے شمال میں گرمی کا موسم ہے، لیکن ٹھیک اس وقت خط استوا کے جنوب میں جو ممالک ہیں وہاں سردی ہے، چنانچہ جنوبی افریقہ میں اس وقت شدید سردی ہے۔ مئی، جون ہمارے ہاں گرمی کے موسم شمار ہوتے ہیں جبکہ وہاں مئی، جون سردی کے موسم ہیں۔ آسٹریلیا تک یہی صورت حال ہے۔ ہمارے ہاں جو سردی کے مہینے ہیں، دسمبر اور جنوری، وہ ان علاقوں میں

شدید گرمی کے مہینے سمجھے جاتے ہیں، اور واقعی شدید گرمی ہوتی ہے، کیونکہ سورج جنوب میں چلا جاتا ہے اور ان کے قریب ہو جاتا ہے۔

تو یہ بات مسلمات میں ہے کہ گرمی اور سردی کا سبب سورج کا قرب و بعد ہے جبکہ حدیث میں اس کا سبب **"فیح جھنم"** کو قرار دیا ہے۔ تو اس پر دو اشکال وارد ہوتے ہیں:

پہلا اشکال یہ ہے کہ یہ بات مسلمات کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔

پہلا جواب

اس میں حضرات شراح اور علماء نے بڑی لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں:

ان میں سے ایک بحث یہ ہے کہ اسباب کا تزاحم نہیں ہوتا، ایک ہی چیز کے ایک سے زائد سبب ہو سکتے ہیں۔ مسبب تو ایک ہے لیکن اسباب کئی ہیں، یہ ہو سکتا ہے اور فلسفہ ومنطق کا مشہور قاعدہ ہے کہ **"لا تزاحم فی الاسباب"** لہٰذا اگر ایک سبب سورج کا قرب اور بعد ہے تو دوسرا **"فیح جھنم"** ہے، دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔

دوسرا جواب

بعض حضرات نے اس بات کو دوسرے طریقہ سے کہا ہے کہ درحقیقت بات یہ ہے کہ سورج کا قرب اور بعد بے شک گرمی اور سردی کا باعث ہے، لیکن سورج کی گرمی **"فیح جھنم"** سے ہے، سورج میں گرمی جہنم سے آ رہی ہے تو یہ سبب ہے، اور وہ سبب السبب ہے۔

تو یہ حدیث میں انتہائی سبب کو بیان کیا گیا ہے اور وہ **"فیح جھنم"** ہے اور جو ہم دیکھتے ہیں وہ سبب قریب ہے۔

دوسرا اشکال

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر یہ بات ہے کہ سورج میں گرمی **"فیح جھنم"** سے آ رہی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ایک علاقہ میں سردی اور دوسرے علاقے میں گرمی ہوتی ہے؟

حضرت شاہ صاحبؒ کی توجیہ

حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ نے اس کی یہ توجیہ فرمائی کہ جہنم کو اللہ ﷻ نے دو سانس لینے کی اجازت دی، ایک سردی میں اور ایک گرمی میں۔ تو حضرت رحمہ اللہ نے اس کی یہ توجیہ فرمائی کہ یہ دونوں

سانس صرف باہر کی طرف نہیں ہیں بلکہ ایک اندر کی طرف ہے اور دوسرا باہر کی طرف، تو جب اندر کی طرف سانس لیا تو اس نے ایک علاقہ سے گرمی کھینچی اس لئے وہاں سردی ہوگئی اور جب باہر کی طرف سانس لیا تو جہاں پھینکا وہاں گرمی ہوگئی۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ **"من فیح جھنم"** میں "من" نہ تبعیض کے لئے ہے نہ سببیت کے لئے، بلکہ یہ تشبیہ کے لئے ہے اور مطلب یہ ہے کہ گرمی فیح جہنم کا مشابہ ہے، لہٰذا مذکورہ اشکال وارد ہی نہیں ہوتا۔[۱۲]

لیکن مجھے یوں معلوم ہوتا ہے واللہ جل جلالہ اعلم کہ ان سب تکلفات کی چنداں حاجت نہیں۔ یہ ساری کوششیں اس بات کی ہو رہی ہیں کہ حدیث میں جو بات کہی گئی ہے اس کو سائنٹیفک حقائق پر منطبق کر دیا جائے اور اس انطباق میں تکلف سے کام لیا جا رہا ہے۔

مجھے یوں معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم کہ نبی کریم ﷺ کا جو یہ ارشاد ہے **"فان شدۃ الحر من فیح جھنم"** اس کا تعلق عالم غیب سے ہے اور ہمیں یہاں جو اسباب نظر آتے ہیں وہ عالم مشاہدہ کے ہیں، ہم اپنی ظاہری نظروں سے جن اسباب کا ادراک کر پاتے ہیں وہی ہمارے مشاہدہ میں آتے ہیں اور ہمارا علم، ہماری تحقیقات، ہماری سائنس اسی کے اندر محدود ہے۔

اور قرآن کریم یا حضور اقدس ﷺ کے ارشادات وہ عالم غیب سے متعلق ہیں اور عالم غیب کی کُنہ اور حقیقت ہم اپنی اس محدود عقل سے نہیں پا سکتے، اس کی حقیقت ہماری سمجھ سے باہر ہے، جیسے جنت اور نار کی حقیقت ہماری سمجھ سے باہر ہے، جبکہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا **"ما خطر علی قلب بشر"** کسی بشر کے دل پر اس کا واہمہ بھی نہیں گزرا، تو جس چیز کا واہمہ ہی نہیں گزرا اس کا تصور کیسے کر سکتے ہیں اور اس کی حقیقت کیسے پا سکتے ہیں، یہ سب عالم غیب ہے اور اس عالم غیب کے حقائق کو ہم اپنے دنیاوی مشاہدات پر منطبق کریں گے تو وہ نہیں منطبق ہوں گے۔ اس کو منطبق کرنے کے لئے جتنی توجیہات کریں بعض اوقات وہ توجیہات اتنی آگے بڑھ جاتی ہیں کہ اس پر دل مطمئن نہیں ہوتا اور بعض اوقات مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں۔

وہ اس وجہ سے نہیں کہ معاذ اللہ حضور اقدس ﷺ کے کلام میں کوئی بات قابلِ اعتراض ہوتی ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ ہم عالم غیب کے ناقابلِ ادراک حقائق کو اس عالم مشاہدہ کے محدود علم پر منطبق کرنا چاہ رہے ہیں۔ اس سے ساری گڑبڑ اور سارے اشکالات پیدا ہوتے ہیں۔

خلاصۂ کلام

سیدھی سی بات یہ ہے کہ جو حقیقت نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائی ہے وہ ہماری اس عقل محدود سے بالاتر

---

[۱۲] انظر : فیض الباری، ج:۳، ص:۱۰۶.

ہے اس کی کُنہ اور حقیقت ہم پہچان ہی نہیں سکتے ۔ حدیث میں جتنی عالم غیب کی باتیں آئی ہیں ان عالم غیب کی باتوں کو تم اپنے سائنسی تجربات پر منطبق کرنا چاہو گے تو یہی اشکال پیدا ہوگا۔

یہ حقیقت عالم الغیب کی ہے اور اس کی حقیقت اللہ ﷻ یا اللہ کے رسول ﷺ جانتے ہیں اور یہ بات کہ کوئی کہے ہم اس کی تشریح اس لئے کرنا چاہتے ہیں تاکہ حضور اقدس ﷺ پر سے یہ اشکال رفع ہو کہ آپ ﷺ نے ایک غیر سائنٹیفک بات کہہ دی، یا ایسی بات کہہ دی جو سائنس کے نظریوں کے خلاف ہے، تو یہ حماقت کی بات ہے۔

اس واسطے یہ بات کہ ظاہری اعتبار سے گرمی سورج کے ذریعے آتی ہے یہ وہ بات ہے جو بچہ بھی جانتا ہے یہ بدیہیات میں سے ہے، کیا حضور اقدس ﷺ پر یہ حقیقت واضح نہیں تھی کہ گرمی سورج سے ہوتی ہے اور شام کو جب سورج غروب ہوتا ہے تو ٹھنڈک ہو جاتی ہے اور سورج قریب آتا ہے تو گرمی ہو جاتی ہے، اس کے باوجود حضور اکرم ﷺ اس کو برقرار رکھ کر بتلا رہے ہیں کہ تمہاری نظریں اس چھوٹے سے دائرہ کے اندر دیکھ رہی ہیں اور شروع سے آخر تک سب کچھ نظر آ رہا ہے، لیکن عالم غیب کی حقیقت حال یہ ہے کہ اللہ ﷻ نے اس کو دو سانسوں کی اجازت دی ہے۔ ایک گرمی میں لیتی ہے اور ایک سردی میں لیتی ہے۔

اب یہ کہ اس سانس کی کیفیت اور کُنہ کیا ہے؟ میں اور آپ کیسے پہچان سکتے ہیں جبکہ ہمیں جنت کی حقیقت اور نار کی حقیقت معلوم نہیں، اگر ہم میں سے کوئی کہے کہ جہنم کا نقشہ کھینچو، تو نہیں کھینچ سکتے، اس لئے کہ ہمیں اس کی حقیقت اور کنہ معلوم نہیں، جب اس کی حقیقت معلوم نہیں تو اس کے سانس لینے کی کنہ کیسے معلوم ہو سکتی ہے اور اللہ ﷻ نے اس کو جو دو سانس لینے کی اجازت دی ہے اس کا مطلب کیا ہے؟ چھ ماہ میں ایک سانس اور چھ ماہ میں دوسرا سانس، اس کی حقیقت کیا ہے؟

جتنے بھی قیاسات کے گھوڑے دوڑائے جائیں گے اس سے حقیقت تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ نبی کریم سرور عالم ﷺ نے جو بات ارشاد فرمائی ہے وہ عالم غیب کی بات ہے جو ہماری اس محدود عقل کے ادراک میں آ ہی نہیں سکتی، لہٰذا اس کی تفصیل، اس کی کنہ، اس کی حقیقت اور اس کی جزئیات میں غور و خوض کرنا، یہ اپنے مقام سے تجاوز کرنے کے مترادف ہے۔

مزید توضیح

اب اللہ ﷻ نے فرما دیا کہ **" ان یوماً عند ربک کالف سنة مما تعدّون "** کہ تمہاری گنتی کے حساب سے ایک دن ہزار سال کے برابر ہے۔ اب اس کو سائنٹیفک طریقہ پر منطبق کریں کہ ہزار سال کا دن جبکہ شمس و قمر کا دورہ چل رہا ہے اور اس میں چوبیس گھنٹے میں رات دن بن رہے ہیں، اس میں کہا جا رہا ہے کہ ایک دن ہزار سال کے برابر ہے۔

"یـــوم" سورج کے طلوع وغروب ہونے کا نام ہےتو اس ایک ہزار سال کو سورج کے طلوع وغروب ہونے پر منطبق کریں جو ہمیں نظر آ رہا ہے، تو نہیں کر سکتے، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یہ عالم الغیب کی بات ہے اوراس کی حقیقت اللہ جل جلالہ ہی جانتے ہیں۔

اس میں کوئی شک وشبہ کی بات نہیں کہ یہ حق ہے کیونکہ مخبر صادق نے خبر دی ہے لیکن اس حق کی کُنہ اور حقیقت و ماہیت کیا ہے؟ یہ ہمارے ادراک میں نہیں آ سکتی، اگر یہ نکتہ ذہن نشین ہو جائے تو قرآن وحدیث کی بے شمار آیات جن کے بارے میں لوگ طرح طرح کی تأویلات کرتے رہتے ہیں تاکہ اس کو سائنٹیفک طریقہ پر منطبق کریں، اس کی چنداں حاجت نہ رہے۔

دعوت فکر

میں اس پر ایمان رکھتا ہوں کہ جو بات قرآن کریم نے یا نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمائی وہ حق ہے، البتہ اس کی کُنہ کا ہماری سمجھ میں آنا ضروری نہیں اور نہ ہم اس کے مکلف ہیں، ہم سے قبر میں یہ سوال نہیں ہوگا کہ "**شدة الحرمن فيح جهنم**" کا کیا مطلب ہے؟ یہ بتاؤ، نہ حشر میں پوچھا جائے گا نہ حساب وکتاب اس بنیاد پر ہوگا، اس پر ایمان یا عمل کا کوئی مسئلہ موقوف نہیں، لہٰذا اس کی کُنہ میں پڑنا اور اس کی تحقیق میں غور وخوض کرنا، اس کی چنداں حاجت نہیں "**ولا تقف ما ليس لک به علم**" جو بھی آیا ہے جیسا بھی آیا ہے اور اس کی جو بھی کنہ ہے وہ حق ہے، اس پر ایمان واجب ہے، لہٰذا یہ توجیہات ہیں کہ یوں ہوتا ہوگا اور اس طرح سانس لیتی ہوگی اور اس طرح اس کی گرمی اور ٹھنڈک پیدا ہوتی ہوگی، کچھ بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

۵۳۵ ۔ حدثنا ابن بشار قال: حدثنا غندر قال: حدثنا شعبة عن المهاجر ابی الحسن: سمع زيد بن وهب عن أبی ذر قال: اذن موذن النبی ﷺ الظهر فقال: "ابرد ابرد"، او قال: "انتظر انتظر". و قال: "شدة الحر من فيح جهنم، حتى راينا فیُ التلول، فاذا اشتد الحر فابردوا عن الصلاة" [أنظر: ۵۳۹، ۶۲۹، ۳۲۵۸]

۵۳۶ ۔ حدثنا علی بن عبدالله قال: حدثنا سفيان قال: حفظناه من الزهری عن سعيد بن المسيب، عن ابی هريرة عن النبی ﷺ قال: "اذا اشتد الحر فابردوا بالصلاة فان شدة الحر من فيح جهنم. [راجع: ۵۳۳]

حدیث باب کی تشریح

"**حتى رأينا فئ التلول**" اسے کہہ دیا کہ آپ نے ظہر میں اتنی تاخیر کی کہ ہم نے ٹیلوں کا سایہ دیکھا۔

"تلول" **تل** کی جمع ہے اور **"تل"** ٹیلے کو کہتے ہیں، حجاز کے اکثر ٹیلے پھیلے ہوئے ہیں، منبسط، منبطح، سیدھے نہیں ہیں۔ اگر ٹیلہ سیدھا ہو تو اس کا سایہ عام چیزوں کے سائے جیسا ہوتا ہے لیکن اگر ٹیلہ پھیلا ہوا ہے تو اس کا سایہ عام اشیاء کے سائے آنے کے کافی دیر بعد آتا ہے۔ نصف النہار کے وقت ایک لکڑی کھڑی کر دی جائے تو جونہی کھڑی کی جائے تو فوراً سایہ پڑنا شروع ہو جائے گا اور جونہی زوال ہوگا وہ سایہ بڑھتا چلا جائے گا، لیکن اگر کوئی چیز پھیلی ہوئی ہو تو اس کا سایہ دیر سے آتا ہے۔

حدیثِ باب کا مقصد

تو یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے نماز اتنی دیر سے پڑھی کہ ہم نے ٹیلوں کا سایہ دیکھ لیا۔

آگے ایک روایت امام بخاری رحمہ اللہ نے اذان کے ابواب میں نقل کی ہے وہاں لفظ ہے **"حتی ساوی الظل التلول"** یہاں تک کہ ٹیلوں کا سایہ برابر ہو گیا، گویا ٹیلوں کا سایہ ایک مثل ہو گیا، اس وقت آپ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھی۔

حدیث باب سے استدلال حنفیہ

اس سے حنفیہ نے استدلال کیا کہ ایک مثل کے بعد بھی وقتِ ظہر باقی رہتا ہے اور وقتِ ظہر دو مثل تک باقی رہتا ہے اور وجہِ استدلال یہ ہے کہ جب ٹیلوں کا سایہ ایک مثل ہو گیا تو دوسری چیزوں کا سایہ ایک مثل سے یقیناً زیادہ ہو گیا ہوگا۔ اس وقت آپ ﷺ نے ظہر پڑھی۔ تو معلوم ہوا کہ **"ما بعد المثل الاول"** وقت ظہر ہے۔

یہ استدلال موجہ ہے البتہ اسے حتمی اور قطعی استدلال نہیں کہہ سکتے، اس لئے کہ راوی اس موقع پر جو الفاظ استعمال کرتے ہیں وہ تخمینی ہوتے ہیں، یہ کہنا کہ ٹیلوں کا سایہ ان کے برابر ہو گیا، ایک مثل ہو گیا، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو صحابی ؓ یہ کہہ رہے ہیں انہوں نے ایک ٹیپ لے کر پہلے ٹیلے کو ناپا، پھر اس کے سائے کو ناپا اور دونوں کو برابر قرار دیا بلکہ یہ بات تقریبی اور تخمینی ہوتی ہے، اب وہ ٹیلے جن کا ذکر کر رہے ہیں، وہ کیسے تھے؟ کتنے سیدھے تھے؟ کتنے بچھے ہوئے تھے؟ اور سایہ واقعۃً پورا برابر تھا یا کم تھا؟ ان باتوں کی توقع کرنا کہ صحابی ؓ نے دو اور دو چار کر کے، ناپ تول کر کے یہ بات کہی ہوگی، یہ خلاف عادت بات ہے، لہٰذا یہ بات قطعی اور یقینی نہیں ہے، پس اس سے استدلال تو نہیں کیا جا سکتا، البتہ استیناس کر سکتے ہیں۔

۵۳۷ ۔ واشتکت النار إلی ربها فقالت: یا رب اکل بعضی بعضا، فاذن لها بنفسین، نفس فی الشتاء و نفس فی الصیف، اشد ما تجدون من الحر واشد ما تجدون من الزمهریر". [أنظر: ۳۲۶۰]

۵۳۸ ۔ حدثنا عمر بن حفص قال: حدثنا ابی قال: حدثنا الأعمش قال: حدثنا أبو صالح، عن أبی سعید قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ: "ابردو أبالظهر فإن شدة الحر من فیح جهنم" تابعه سفیان، و یحییٰ، و أبو عوانة عن الأعمش. [انظر: ۳۲۵۹]

(۱۰) باب الابراد بالظهر فی السفر

سفر میں ظہر کی نماز ٹھنڈے وقت میں پڑھنے کا بیان

۵۳۹ ۔ حدثنا آدم قال: حدثنا شعبة قال: حدثنا مهاجر أبو الحسن مولی لبنی تیم اللّٰہ قال: سمعت زید بن وهب عن أبی ذر الغفاری قال: کنا مع النبی ﷺ فی سفر فاراد المؤذن أن یؤذن للظهر فقال النبی ﷺ: "ابرد" ثم اراد أن یوذن فقال له: "ابرد" حتی رأینا فیئ التلول. فقال النبی ﷺ: "أن شدة الحر من فیح جهنم، فاذا اشتد الحر فابردوا بالصلاة" و قال ابن عباس رضی اللّٰہ عنهما: ﴿تَتَفَيَّأُ﴾ [النحل:۴۷] تَتَمَيَّلُ. [راجع: ۵۳۵]

عادتِ بخاری

امام بخاری رحمہ اللہ کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ حدیث ذکر کرتے ہیں اور اس سے ملتی جلتی کوئی آیت ہوتی ہے اور اس آیت میں اگر کوئی لفظ آجائے تو ساتھ ساتھ اس کی تشریح بھی کرتے ہیں تو یہاں "فیئ" کا لفظ آیا تھا اور قرآن کریم میں ہے "یتفیوا ظلله" تو تتفیا" کی تفسیر "تتمیّل" سے کی یعنی مائل ہونا۔

(۱۱) باب: وقت الظهر عند الزوال

ظہر کے وقت زوال کے وقت ہے

وقال جابر: کان النبی ﷺ یصلی بالهاجرة.

زوال کے متصل بعد ظہر کا وقت شروع ہوتا ہے، اس لئے یہاں یہ باب قائم فرمایا اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"کان النبی ﷺ یصلی بالهاجرة".

"**هاجرة**" عین دوپہر کے وقت کو کہتے ہیں، جس میں سورج کی گرمی اپنے شباب پر ہوتی ہے۔

حدیثِ باب سے استدلال بخاریؒ

اس سے امام شافعی رحمہ اللہ نے تعجیل ظہر پر استدلال کیا ہے، لیکن حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ پیچھے جو حدیث گزری ہے اس کی روشنی میں یہ موسمِ شتاء پر محمول ہوگی کہ سردی کے وقت میں آپ اوّل وقت میں پڑھا کرتے تھے، چنانچہ ترمذی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"ما رأیت أحدا کان اشد اشد تعجیلا للظهر من رسول الله ﷺ" [۱۳]

کہ تم ظہر حضورِ اکرم ﷺ کے مقابلے میں جلدی پڑھتے ہو اور ایک روایت جس میں **"اذا اشتد الحر"** بھی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جب **"شدّت حرّ"** ہو تو پھر ابراد افضل ہے لیکن موسمِ سرما میں ابراد کی ضرورت نہیں۔

تو یہاں جو لفظ ہے کہ آپ ﷺ نے **"هاجرة"** میں نماز پڑھی، اس کو موسمِ سرما پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

۵۴۰ ۔ حدثنا أبو الیمان قال: أخبرنا شعیب عن الزهری قال: أخبرنی أنس بن مالک أن رسول الله ﷺ خرج حین زاغت الشمس فصلی الظهر، فقام علی المنبر فذکر الساعة فذکر أن فیها أمورا عظاما، ثم قال: "من أحب أن یسأل عن شیء فلیسأل فلا تسالونی عن شیء الا أخبرتکم ما دمت فی مقامی هذا" فاکثر الناس فی البکاء و اکثر أن یقول: "سلونی". فقام عبدالله بن حذافة السهمی فقال: من أبی؟ قال: "ابوک حذافة" ثم اکثر أن یقول: "سلونی" فبرک عمر علی رکبتیه فقال: رضینا بالله ربا، وبالاسلام دینا، و بمحمد نبیا، فسکت ثم قال: "عرضت علیّ الجنة والنار أنفا فی عرض هذا الحائط، فلم أر کالخیر و الشر". [راجع: ۹۳]

اس میں حضرت انس ﷺ کی حدیث نقل کی کہ حضور اقدس ﷺ نکلے یہاں تک کہ سورج مائل ہو گیا یعنی زوال ہو گیا تو آپ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھی، پس یہی ترجمۃ الباب موضع استدلال ہے کہ **"زاغت الشمس"** کے فوراً بعد آپ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھی۔

حدیثِ باب کی تشریح

"فقام علی المنبر فذکر الساعة" آپ ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے اور قیامت کا ذکر فرمایا اور فرمایا:

"ان فیها امورا عظاما ثم قال من أحب أن یسئل عن شئ فلیسأل" جس کو سوال کرنا ہے

---

[۱۳] سنن الترمذی، باب ماجاء فی التعجیل بالظهر، رقم: ۱۵۵، ج: ۱، ص: ۲۹۲، داراحیاء التراث، العربی، بیروت.

وہ سوال کرے، کیونکہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے بارے میں تم مجھ سے سوال کرو گے مگر میں تم کو بتا دوں گا جب تک کہ میں یہاں کھڑا ہوں، یہ حدیث یہاں مختصر ہے، دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے حضور ﷺ سے کثرت سے سوال کرنے شروع کر دیئے تھے اور حضور ﷺ نے کثرت سوال سے منع فرمایا، بلا ضرورت سوال کرنا معیوب ہے۔ **"نهى عن كثرت السئوال و قيل و قال"** اور **"كما قال"** تو آپ کو ان کی کثرت سوال ناگوار گزری اور اس ناگواری کا اظہار حدیث میں ذکر کردہ تفصیل کے طور پر کیا۔

"فاكثر الناس في البكاء" لوگ رونے لگے، اس لئے کہ یہ ناگواری اور ناراضی کا انداز تھا، حقیقت میں طلب سوال اس معنی میں نہیں تھا کہ آپ باقاعدہ کہہ رہے ہیں کہ سوال کرو! بلکہ ناگواری کا انداز تھا **"فمن شاء فليؤمن ومن شأ فليكفر"** کا جو انداز ہے وہی تھا۔ **وأكثر أن يقول "سلوني"** مسلمان رونے لگے اور آپ ﷺ بار بار یہ فرما رہے ہیں کہ مجھ سے سوال کرو۔

فقام عبدالله بن حذافة السهمي، فقال :

عبداللہ بن حذافہ **السهمي** کھڑے ہوگئے اور انہوں نے کہا: **"من أبي"** میرا باپ کون ہے؟

یہ اس لئے پوچھا کہ کچھ لوگ ان کی والدہ پر تہمت لگاتے ہوں گے اس کا ازالہ کر دیا، یا بعض لوگوں کی طبیعت میں وہم ہوتا ہے، ہوسکتا ہے ان کی طبیعت میں بھی ہو، اور اس کا ازالہ کرنا چاہتے ہوں، بہر حال اُنہوں نے پوچھ لیا **"من أبی؟"**.

آپ ﷺ نے فرمایا **"أبوک حذافة"** کہ تمہارے باپ حذافہ ہیں۔

"ثم اكثر أن يقول سلوني" پھر آپ ﷺ بار بار فرماتے رہے **"سلونی"**.

"فبرک عمر علی رُكبتيه" حضرت عمر ؓ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور یہ عرض کیا۔

"رضينا بالله ربا و بالاسلام دينا وبمحمد ﷺ نبيا".

مطلب یہ ہے کہ حضرت! ہمیں کوئی سوال نہیں کرنا، بس ہم تو آپ کی ہر بات پر مطمئن ہیں، اللہ جل جلالہ پر راضی ہیں پروردگار ہونے کی حیثیت سے، آپ ﷺ پر راضی ہیں نبی ہونے کی حیثیت سے، لہٰذا آپ ﷺ اب زیادہ سوالات کا سلسلہ جاری نہ رکھیں۔

"ثم قال عرضت على الجنة والنار آنفافي عرضها"

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: کہ میرے اوپر ابھی جنت اور نار اس دیوار کے کنارے میں پیش کی گئی **"فلم أرَ الخير و الشر"** تو جنت جیسی خیر اور نار جیسا شر میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ یعنی جنت اتنی بہترین چیز تھی کہ اس سے پہلے اتنی بہترین چیز نہیں دیکھی اور جہنم ایسی شر تھی کہ اس سے پہلے العیاذ باللہ اس جیسا شر نہیں دیکھا۔

اب اگر اس کو سائنٹیفک طریقے سے منطبق کریں کہ جنت اور نار دیوار کے کونے میں آ گئی، تو نہیں

کر سکتے۔ جبکہ جنت کا ادنیٰ ترین حصہ جو دیا جائے گا وہ دنیا سے ستر گنا زیادہ ہوگا، اب وہ دیوار کے کونے میں جنت اور نار کیسے آ گئی، تو اس کا تعلق عالم غیب سے ہے، اس کو اپنے ظاہری احوال اور مشاہدے کے قواعد پر منطبق کرنے کی کوشش ہی فضول ہے۔

۵۴۱ ۔ حدثنا حفص بن عمر قال: حدثنا شعبة عن أبی المنهال، عن أبی برزة كان النبی ﷺ يصلی الصبح و أحدنا يعرف جليسه، و يقرأ فيها ما بين الستين إلى المائة، و كان يصلی الظهر اذا زالت الشمس، والعصر و أحدنا يذهب إلى أقصى المدينة رجع والشمس حية، و نسيت ما قال فی المغرب، ولا يبالی بتاخير العشاء إلى ثلث اليل: ثم قال: إلى شطر الليل . وقال معاذ: قال شعبة: ثم لقيت مرة فقال: أو ثلث الليل. [أنظر: ۵۴۷، ۵۶۸، ۵۹۹] [۱۴]

نبی اکرم ﷺ صبح کی نماز پڑھتے تھے **"و أحدنا يعرف جليسه"** جبکہ ہم میں سے ہر کوئی اپنے جلیس کو پہچان لیتا تھا۔

حدیثِ باب سے حنفیہ اور شافعیہ کا استدلال

اب اس سے فریقین نے استدلال کیا ہے: یعنی غلس والوں نے بھی اور اسفار والوں نے بھی۔

غلس والوں نے کہا کہ دیکھو جب نماز سے فارغ ہوتے تھے تب آدمی نظر آتا تھا، وہ بھی بالکل برابر والا، دور سے پھر بھی نظر نہیں آتا تھا، تو معلوم ہوا کہ نماز غلس میں ہو رہی تھی۔

اسفار والوں نے کہا کہ مدینہ منورہ کی مسجد نبوی کا تصور کرو، کہ مسجد نبوی کی دیواریں چھوٹی تھیں، چھت نیچی تھی اور مسجد کی جانب دروازہ نہیں تھا، لہٰذا آدمی اپنے برابر والے کو اس وقت پہچان سکے گا جب باہر خوب اجالا ہو چکا ہو۔

قول فیصل

تو دونوں نے اس کو اپنے مسلک کی طرف کھینچنے کی کوشش کی، باقی زبردستی کھینچ تان کی ضرورت نہیں،

[۱۴] وفی صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب استحباب التكبير بالصبح فی اول وقتها، رقم: ۱۰۲۴، وسنن النسائی، كتاب المواقيت، باب مايستحب من تأخير العشاء، رقم: ۵۲۷، وسنن أبی داؤد، كتاب الصلاة، باب فی وقت الصلاة النبی وكيف كان يصليها، رقم: ۳۳۷، وسنن ابن ماجة كتاب الصلاة، باب وقت صلاة الظهر، رقم: ۶۶۶، وسنن الدارمی، كتاب الصلاة، باب قدر القراءة فی الفجر، رقم: ۱۲۶۷.

اس سے کسی بھی مذہب پر یقینی استدلال ممکن نہیں، ایک حقیقت ہے جو بیان فرمارہے ہیں کہ جب نماز پڑھتے تھے تو ہم اپنے برابر والے آدمی کو پہچان لیتے تھے، لہٰذا اس کو کسی بھی فریق کی حتمی دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔

البتہ حنفیہ کی واضح دلیل سنن اربعہ میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے:

"أسفروا بالفجر فإنه أعظم للأجر" یہ حدیث قولی بھی ہے، اور قاعدہ کلیہ بیان کررہی ہے، لہٰذا جزوی فعلی اور محتمل روایتوں پر راجح ہے۔[۱۵]

حدیثِ باب کی تشریح

"و یقرأ فیها ما بین الستین الی المائة".

ساٹھ سے سو آیتوں تک تلاوت فرماتے۔ **"و کان یصلی الظهر اذا زالت الشمس"** اور جب سورج زائل ہو جاتا تھا تو ظہر کی نماز پڑھتے تھے اور عصر پڑھتے تھے جبکہ ایک آدمی مدینہ منورہ کے انتہائی حصہ میں پہنچ جاتا، چلا جاتا تھا۔

"رجع" کا معنی دو طرف سے آنا جانا نہیں۔ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ **"رجع الی اهله"** یعنی جب حضور اقدس ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ کر واپس مدینہ کے اقصیٰ علاقے میں جاتا تھا، جہاں اس کا گھر تھا، تو جب وہ گھر کے اندر پہنچ جاتا تھا اس وقت سورج زندہ ہوتا۔

اس کو کسی مذہب کی حتمی دلیل قرار دینا مشکل ہے، اس لئے کہ معلوم نہیں اقصی المدینہ کتنے فاصلے پر تھا، اقصی المدینہ کدھر کا؟ دائیں کا، بائیں کا، شمال کا، جنوب کا، مشرق کا یا مغرب کا۔ کس چیز کا؟ کوئی یقینی حال معلوم نہیں۔ اس کو کسی بات کی یقینی دلیل نہیں کہہ سکتے۔

اور پھر **"رجع والشمس حیّة"** کے کیا معنی ہیں؟ آیا اس سے مراد **"ما قبل الاصفرار"** کی زندگی ہے یا **"ما بعد الاصفرار"** کی زندگی ہے، یہ بھی پتہ نہیں۔ لہٰذا ان روایات سے کھینچ تان کر اپنے مذاہب پر استدلال کرنا، یہ انصاف کے خلاف ہے۔

"و نسیت ما قال فی المغرب" کہتے ہیں کہ مغرب کے بارے میں جو کہا تھا وہ میں بھول گیا۔

---

[۱۵] اختلف أهل العلم فی الاسفار والتغلیس فرأی بعضهم أن الأسفار افضل وبه قال أبو حنیفة واصحابه وسفیان الثوری وأهل الکوفة أخذ بحدیث رافع بن خدیج اسفروا بالفجر فإنه اعظم للأجر ورای بعضهم أن التغلیس افضل وبه أخذ الشافعی و مالک و أحمد أخذ بحدیث عائشة الخ (نصب الرایة، ج: ۱، ص: ۲۳۹، وذکره الزیلعی من عدة من الصحابة بطریق مختلفة أخرجها أصحاب السنن الاربعة وغیرهم، راجع: نصب الرایة، ج: ۱، ص: ۲۳۵، وإعلاء السنن، ج: ۲، ص: ۲۲.

"ولا یبالی بتأخیر العشاء الیٰ ثلث اللیل".

اور عشاء میں ایک تہائی رات تک تاخیر کرنے میں آپ ﷺ کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ ایک روایت میں ہے "شطر اللیل" تک اور ایک روایت میں ہے "ثلث اللیل" تک۔

۵۴۲ ـ حدثنا محمد، قال: أخبرنا عبداللّٰہ قال: أخبرنا خالد ابن عبدالرحمٰن . قال : حدثنی غالب القطان عن بکر بن عبداللّٰہ المزنی، عن أنس بن مالک قال: کنا اذا صلینا خلف رسول اللّٰہ ﷺ با لظھائر سجدنا علی ثیابنا اتقاء الحر. [راجع: ۳۸۵]

تعجیل ظہر والوں کا استدلال

جب ہم ظہر کے وقت حضور ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے تو اپنے کپڑوں پر سجدہ کرتے تھے، گرمی اتنی ہوتی تھی کہ کچھ بچھانا پڑتا تھا۔ عمامہ کا پلّو وغیرہ بچھایا اور سجدہ کیا۔ جو حضرات تعجیل میں نماز پڑھنے کے قائل ہیں وہ اس سے استدلال کرتے ہیں یعنی ان کے نزدیک تعجیل مستحب ہے۔

استدلال کا وجہ ضعف

یہ استدلال بھی تام نہیں ہے، اس لئے کہ مدینہ منورہ اور حجاز کے علاقے میں سخت گرمی کے موسم میں عصر تو درکنار، فجر میں بھی زمین گرم ہوتی ہے۔

میں آپ سے صحیح کہتا ہوں، آپ لوگوں نے شاید یہ منظر نہ دیکھا ہو، لیکن میں نے حرم شریف میں فجر کی نماز کا ایسا وقت دیکھا ہے کہ میں ایک پتھر پر چند منٹ کھڑا نہیں ہوسکا، تو جب فجر میں یہ حال ہوتا تھا تو عصر میں کیا ہوتا ہوگا، لیکن یہ گفتگو اس بات میں ہو رہی ہے کہ عین زوال کے وقت جو گرمی ہے اس سے بچانا منظور ہے، عصر کے وقت میں بھی بہت گرمی ہوتی ہے مغرب کے وقت میں بھی گرمی ہوتی ہے، عشاء میں بھی ہوتی ہے۔

لہٰذا اگر پتھر تپ رہا ہے اس حالت میں تو وہ عصر میں بھی تپ سکتا ہے، اس لئے اس سے کسی معین بات پر استدلال نہیں ہوسکتا۔

(۱۲) باب تاخیر الظھر إلی العصر

ظہر کی نماز کو عصر کے وقت تک مؤخر کرنے کا بیان

۵۴۳ ـ حدثنا أبو النعمان قال: حدثنا حماد بن زید، عن عمرو بن دینار، عن جابر بن زید، عن إبن عباس أن النبی ﷺ صلی بالمدینة سبعا و ثمانیا الظھر والعصر

والمغرب والعشاء فقال أيوب: لعله في ليلة مطيرة؟ قال عسى.[انظر: ۵۶۲، ۱۱۷۴] [۱۶]

امام بخاری رحمہ اللہ نے باب قائم کیا ہے کہ **"باب تأخير الظهر الى العصر"** یعنی "ظہر کی نماز کو عصر تک مؤخر کرنا" اور اس میں حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ کی روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے مدینہ منورہ میں سات اور آٹھ رکعتیں نماز پڑھیں یعنی **"سبعـــا"** کا مطلب ہے کہ مغرب اور عشاء کو ایک ساتھ پڑھا اور **"ثمانياً"** کا مطلب ہے کہ ظہر اور عصر کو ایک ساتھ پڑھا۔

یہاں روایت میں **"سبعاً"** اور **"ثمانياً"** لف نشر غیر مرتب ہے، سبعاً کا تعلق مغرب وعشاء اور **"ثمانياً"** کا تعلق ظہر اور عصر سے ہے اور ارشاد نبوی کا مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے آٹھ رکعتیں ظہر اور عصر کی ملا کر پڑھیں اور سات رکعتیں مغرب وعشاء کی ملا کر پڑھیں۔

ترجمۃ الباب سے مقصود بخاریؒ

بعض حضرات نے فرمایا کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد اس باب کو قائم کرنے سے یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ ان لوگوں کا رد کرنا چاہتے ہیں جو ظہر وعصر کی نمازوں کے اوقات کو مشترک قرار دیتے ہیں۔

اس لئے کہ بعض فقہاء کا یہ مسلک ہے کہ ظہر اور عصر کی نماز کا وقت مشترک ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ سے بھی یہی منقول ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی بھی ایک روایت یہ ہے کہ مثل اوّل سے لے کر مثل ثانی تک کا جو وقت ہے وہ مشترک بين الظهر والعصر ہے۔ [۱۷]

لہٰذا اس باب سے امام بخاری رحمہ اللہ ان حضرات پر ردّ کر رہے ہیں اور کہنا یہ چاہتے ہیں کہ وقت مشترک نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ظہر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "ظہر کو مؤخر کیا عصر تک" تو معنی ہوئے کہ ظہر کا وقت الگ ہے اور عصر کا وقت الگ ہے جب ہی تو کہا جائے گا کہ ظہر کو عصر تک مؤخر کیا اور اگر دونوں کا وقت مشترک ہوتا تو پھر **"تأخير الظهر"** کہنے کے کوئی معنی نہیں بنتے۔

جبکہ بعض حضرات نے فرمایا کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد ان حضرات پر رد کرنا ہے جو ظہر وعصر کے درمیان وقت مہمل کے قائل ہیں۔

یعنی ایک مذہب یہ ہے کہ مثل اول تک ظہر کا خالص وقت ہے اور مثل اول سے مثل ثانی تک کا وقت

---

[۱۶] **وفي صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب الجمع بين الصلاتين في الحضر، رقم: ۱۱۴۷، وسنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ماجاء في الجمع بين الصلاتين في الحضر، رقم: ۱۷۲، ومسند أحمد، ومن مسند بني هاشم، باب بداية مسند عبد الله بن العباس، رقم: ۲۴۲۶، ۳۰۶۵، ۳۱۵۲.**

[۱۷] **فيض الباري، ج:۲، ص:۹۴، ۹۵.**

مہمل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت میں کوئی فرض نماز نہیں جیسے طلوع آفتاب سے لے کر زوال تک لیکن اگر کوئی نفلیں پڑھنا چاہے تو جتنی چاہے پڑھ لے، اسی طرح بعض فقہاء نے فرمایا کہ ظہر اور عصر کے درمیان بھی ایک وقت مہمل ہے۔ تو امام بخاری رحمہ اللہ نے ان پر رد فرمایا اور حضور اقدس ﷺ کا **"جمع بین الصلوتین"** کا واقعہ ذکر فرمایا۔

جمع بین الصلوتین سے رد اس طرح ہے کہ جمع بین الصلوتین بالا جماع انہی دو اوقات میں ہوتی ہے جن کے درمیان کوئی وقت مہمل نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ جمع بین الصلوتین ہمیشہ ظہر اور عصر کے درمیان یا مغرب وعشاء کے درمیان ہوتی ہے اور جہاں کوئی وقت مہمل حائل ہو جائے یا وقت مکروہ حائل ہو جائے وہاں جمع بین الصلوتین نہیں ہوتی اسی وجہ سے فجر اور ظہر کے اندر جمع نہیں ہو سکتا کیونکہ فجر اور ظہر کے درمیان ایک طویل وقت مہمل حائل ہے اسی طرح عصر اور مغرب میں جمع نہیں ہو سکتا کیونکہ بیچ میں ایک وقت مکروہ حائل ہے، اسی طرح عشاء اور فجر میں جمع نہیں ہو سکتا کیونکہ درمیان میں ایک وقت مکروہ حائل ہے۔ لہٰذا اگر ظہر وعصر کے درمیان وقت مہمل ہوتا تو پھر جمع بین الصلوتین نہیں ہو سکتی تو اس سے امام بخاری رحمہ اللہ نے ان لوگوں پر رد کیا جو وقت مہمل کے قائل تھے۔

بعض مشائخ کی رائے

ہمارے مشائخ میں سے بعض حضرات اس طرف گئے ہیں اور مجھے بھی وہی بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ یہاں جمع بین الصلوتین حقیقی نہیں ہے، بلکہ صوری ہے۔

جمع صوری کا مطلب

جمع صوری کے معنی یہ ہیں کہ دونوں نمازیں اپنے اپنے وقت پر پڑھی جائیں لیکن صورۃً وہ اکٹھی ہوں یعنی ظہر کے اخیر وقت میں ظہر کی نماز پڑھ لی جائے اور پھر جب عصر کا وقت داخل ہو تو عصر کی نماز پڑھ لی جائے تو صورۃً اگرچہ ایک ساتھ اکٹھی ادا ہوئی ہیں لیکن ان کو اپنے اپنے وقت میں ادا کیا گیا ہے۔

جمع صوری کی دلیل

اور اس بات کی دلیل کہ یہاں جمع صوری مراد ہے یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے جمع بین الصلوٰتین کا باب قائم نہیں فرمایا بلکہ **"تاخیر الظھر الی العصر"** کا باب قائم کیا کہ ظہر کو اتنا مؤخر کیا کہ عصر کے قریب پہنچ گیا تو وہاں ظہر کی نماز پڑھ لی اور پھر عصر کا وقت داخل ہونے کے بعد عصر کی نماز پڑھ لی، لہٰذا یہ جمع صوری ہوگئی اور حضرت عبد اللہ بن عباس ﷺ کی یہ مذکورہ حدیث جمع صوری پر ہی محمول ہے اور فقہاء و محدثین کی ایک بڑی

جماعت نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے کیونکہ اس کے بغیر یہ حدیث کسی بھی مذہب پر فِٹ نہیں ہوتی، اس لئے کہ اس روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے مدینہ منورہ میں جمع بین الصلوتین کیا یعنی سفر کی حالت نہیں تھی اس کے باوجود آپ ﷺ نے جمع بین الصلوتین کیا ہے۔

حدیث باب کی پہلی تاویل

اب جو حضرات جمع بین الصلوتین کے قائل ہیں وہ حالت سفر میں قائل ہیں نہ کہ حالت حضر میں، تو انہوں نے اس کی مختلف تاویلات کی ہیں۔ ایک تاویل تو خود روایت کے آخر میں ہے کہ **"فقال أیوب: لعلّه فی لیلة مطیرة؟"** یعنی آپ ﷺ نے یہ جمع بارش کی رات میں کیا ہوگا، انہوں نے ایک احتمال کے طور پر یہ کہہ دیا۔

چنانچہ بعض فقہاء کہتے ہیں کہ حالت مطر میں جمع بین الصلوتین جائز ہے اور یہ مذہب امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا ہے۔ تو یہ حضرات اس جمع کو حالت مطر پر محمول کرتے ہیں۔ [۱۸]

تردید تاویل اول

یہ دو وجہ سے درست نہیں ہے:

پہلی وجہ یہ ہے کہ بعض روایات میں آیا ہے:

"من غیر خوف و لا مطر جمع رسول اللّٰہ ﷺ بین الصلٰوتین بالمدینة".

اور ترمذی میں بھی یہی ہے، لہٰذا جب یہاں پر صراحت موجود ہے کہ خوف اور مطر کی حالت نہیں تھی تو پھر اس کو کیسے حالت مطر پر محمول کر سکتے ہیں؟

دوسری وجہ درست نہ ہونے کی یہ ہے کہ جو حضرات مطر کی حالت میں جمع کے قائل ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ حالت مطر میں جمع تقدیم ہو سکتی ہے جمع تاخیر نہیں ہو سکتی۔ مثلاً مغرب کے وقت بارش شروع ہوئی تو پتہ نہیں کہ کب تک رہے گی، لہٰذا مغرب کے وقت میں عشاء کی نماز پڑھ لی کہ کیا پتہ عشاء کے وقت تک بارش رہے اور ہم جانہ سکیں۔ اور جمع تاخیر کسی کے نزدیک بھی حالت مطر میں جائز نہیں ہے، جبکہ یہاں روایت میں جمع تقدیم بھی ہے اور جمع تأخیر بھی ہے یعنی ظہر وعصر میں جمع تاخیر ہے اور مغرب اور عشاء میں تقدیم بھی ہو سکتی ہے اور تاخیر بھی ہو سکتی ہے لیکن ظہر وعصر میں واضح طور پر تاخیر ہے اور مطر باعثِ تاخیر بنی ہے، لہٰذا اس کو حالت مطر پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

حدیث باب کی دوسری تاویل

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ حالت مرض میں پیش آیا ہو کیونکہ بعض شافعیہ

---

۱۸ عمدۃ القاری، ج:۴، ص:۴۳.

وغیرہ کے ہاں جمع بین الصلوتین حالت مرض میں بھی جائز ہو جاتی ہے۔

تردید تأویل ثانی

لیکن یہ تأویل اس لئے درست نہیں ہے کہ یہ کہنا کی حضور اقدس ﷺ اور تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بیمار تھے یہ انتہائی بعید بات ہے کیونکہ بیماری اگر ہوگی تو کچھ لوگوں کو ہوگی اور جمع بین الصلوتین صرف وہ ہی کر سکتے ہیں کہ جن کے لئے بیماری کا عذر ہے، لیکن جن کو بیماری نہیں وہ کیسے جمع کریں گے۔

حدیثِ باب کا صحیح محمل

لہٰذا یہاں پر جمع صوری کے علاوہ کوئی اور تاویل درست نہیں بنتی، اسی وجہ سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی ''فتح الباری'' میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہاں پر اس کو جمع صوری پر محمول کرنا زیادہ اولیٰ ہے۔[۱۹]

جمع صوری پر محمول کرنے کی تائید

اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث ابو الشعثاء جابر بن زید کو سنائی تو صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ابو الشعثاء نے کہا کہ:

'' اظنّه اخرّ الظهر و عجّل العصر و اخر المغرب و عجّل العشاء ''[۲۰]

یعنی میرا خیال ہے کہ آپ ﷺ نے شاید ایسا کیا ہوگا کہ ''ظہر کی نماز کو مؤخر کر دیا اور عصر کی نماز جلدی پڑھ لی اور مغرب کو مؤخر کر دیا اور عشاء کی نماز جلدی پڑھ لی''

تو راوی کا گمان بھی یہی ہے، لہٰذا اس سے تائید ہوتی ہے کہ یہاں پر مراد جمع صوری ہے اور اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جمع صوری کوئی انہونی بات نہیں ہے، لہٰذا جن روایتوں میں جمع بین الصلوٰتین کا ذکر آیا ہے، چاہے وہ سفر کی حالت ہی کیوں نہ ہو، احناف اس کو جمع صوری پر محمول کرتے ہیں اور یہ واقعات زیادہ تر غزوۂ تبوک میں پیش آئے ہیں کہ آپ ﷺ صبح کے وقت میں زوال کے بعد روانہ ہوتے تو ظہر کو مؤخر کرتے تھے اور ظہر اور عصر کو ملا کر پھر ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ احناف کے نزدیک یہ جمع صوری پر محمول ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے آگے ایک باب ذکر کیا ہے کہ **''هل يؤذن او يقيم اذا جمع بين المغرب و العشاء''** اور اس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ ﷺ کو سفر کی حالت میں جلدی ہوتی تو آپ ﷺ مغرب کی نماز کو مؤخر فرماتے، یہاں تک کہ پھر مغرب اور عشاء کو جمع فرماتے۔

۱۹، ۲۰ والجمع الصوری اولیٰ واللہ اعلم ، فتح الباری ، ج: ۲، ص: ۲۴.

جمع صوری پر محمول کرنے کی پہلی وجہ

اور پھر اسی روایت میں آگے "**سالم**" کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرؓ خود بھی ایسے ہی کرتے تھے یعنی جب تیزی سے جانا ہوتا تو مغرب کی نماز تین رکعت پڑھ کر سلام پھیر لیتے پھر تھوڑی دیر ٹھہر جاتے، پھر عشاء کی نماز پڑھتے۔

لہٰذا اگر یہ جمع حقیقی ہوتی تو درمیان میں ٹھہرنے کے کوئی معنی نہیں بنتے اور اس روایت کی تفصیل ابوداؤد میں آئی ہے اور وہاں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ "**انتظر غياب الشفق**" یعنی شفق کے غائب ہونے کا انتظار کرتے اور جب شفق غائب ہو جاتی تو پھر عشاء کی نماز پڑھتے تھے اور ابوداؤد اور دارقطنی میں تو اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضور اقدس ﷺ کی طرف جو بین الصلوٰتین کی نسبت کر رہے ہیں، اس کی تفسیر عملاً خود کر کے بھی دکھلادی کہ آخر وقت میں نماز پڑھی۔ ابوداؤد کے الفاظ میں "**حتى اذا كان قبل غيوب الشفق نزل فصلّى المغرب ثم انتظر حتى غاب الشفق فصلى العشاء**". [۱۲]

لہٰذا اس میں صراحت ہے کہ یہ جمع صوری تھی اس وجہ سے ان تمام روایات کو کہ جن میں جمع بین الصلوٰتین کا ذکر ہے، احناف کہتے ہیں کہ یہ سب جمع صوری پر محمول ہیں۔

دوسری وجہ

اور اس جمع صوری پر محمول کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن مجید میں صاف صاف آیا ہے کہ "**ان الصلٰوة كانت على المؤمنين كتاباً موقوتا**" یعنی نماز کا فریضہ موقت ہے۔ اور ایسی حدیثیں حد استفاضہ تک پہنچی ہوئی ہیں کہ جن میں آپ ﷺ نے نماز کو اپنے وقت سے مؤخر کرنے پر شدید وعید بیان فرمائی ہیں۔

اسی واسطے صحیح بخاری و صحیح مسلم دونوں میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ ارشاد مروی ہے کہ "**والذى لا اله الا هو ما صلى رسول الله ﷺ صلٰوة لغير ميقاتها**" **الخ** یعنی قسم کھا کر کہہ رہے ہیں کہ آپ ﷺ نے سوائے مزدلفہ کے کوئی نماز اپنے وقت علاوہ کسی اور وقت میں نہیں پڑھی۔

ان تمام دلائل سے یہ بات بخوبی معلوم ہو رہی ہے کہ آپ ﷺ نمازوں کو دوسرے وقت کی طرف مؤخر نہیں فرماتے تھے، لہٰذا جن احادیث میں جمع بین الصلوٰتین وارد ہوا ہے اُن کو ان آیات قرآنیہ اور روایات کے ساتھ تطبیق دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کو جمع صوری پر محمول کیا جائے۔

---

[۱۲] سنن أبي داؤد، ج:۲، ص:۶، رقم: ۱۲۱۲ دار الفكر، ويشهد له رواية الدار قطني من أدرك ركعة من الصلاة فقد أدركها قبل أن يقيم الإمام صلبه انتهى وهذه الأحاديث أيضاً مشكلة عن مذهبنا في القول ببطلان صلاة الصبح الخ، نصب الراية، ج:۱، ص:۲۲۸.

قائلین جمع حقیقی کی دلیل

جمع بین الصلوتین کے سلسلے میں جو لوگ حقیقت جمع کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ جہاں درمیان میں کوئی وقت مہمل یا وقت مکروہ حائل ہو تو جمع صلوٰۃ نہیں ہوسکتی ہے۔

دلیل کا جواب

ہم یہ کہتے ہیں کہ جب مقصود رخصت دینا ہے تو پھر چاہے درمیان میں وقتِ مہمل حائل ہو یا وقت مکروہ حائل ہو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ جمع حقیقی ہوسکتی ہے لیکن جب جمع صوری مراد ہوگی تو پھر وقت مہمل اور وقت مکروہ کے درمیان میں حائل ہونے سے فرق پڑے گا کیونکہ جمع صوری اسی صورت میں ممکن نہیں کیونکہ جمع صوری کے معنی ہیں کہ ایک نماز آخری وقت میں پڑھ لی جائے اور دوسری نماز اوّل وقت میں پڑھ لی جائے، لہٰذا اب اگر درمیان میں وقت مہمل یا وقت مکروہ حائل ہونے کی وجہ سے آدمی آخر وقت میں نماز نہیں پڑھ سکتا لہٰذا جمع صوری کی صورت میں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے، لیکن جب جمع حقیقی مراد لی جائے تو پھر درمیان میں وقتِ مکروہ یا وقتِ مہمل کے حائل ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اس سے مراد جمع صوری ہے اور حدیث باب سے بھی یہ تائید ہوتی ہے کہ حدیثِ باب میں اور کوئی توجیہ کسی کے نزدیک بھی ممکن نہیں ہے سوائے اس کے کہ اس سے جمع صوری مراد لی جائے۔[۲۲]

(۱۳) باب وقت العصر

وقتِ عصر کا بیان

"و قال أبو أسامة عن هشام: من قعر حجرتها"۔

۵۴۴ ـ حدثنا ابراهيم بن المنذر قال: حدثنا أنس بن عياض، عن هشام، عن أبيه أن عائشة قالت: كان رسول الله ﷺ يصلي العصر و الشمس لم تخرج من حجرتها. [راجع: ۵۲۲]

۵۴۵ ـ حدثنا قتيبة قال: حدثنا الليث عن ابن شهاب، عن عروة، عن عائشةُ أن رسول الله ﷺ صلى العصر و الشمس في حجرتها، لم يظهر الفيءُ من حجرتها. [راجع: ۵۲۲]

---

۲۲ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: إعلاء السنن، ج: ۲، ص: ۹۳ ـ ۱۰۰.

۵۴۶ ـ حدثنا أبو نعيم قال: أخبرنا ابن عيينة عن الزهري، عن عروة، عن عائشة قال: كان النبي ﷺ يصلي صلاة العصر والشمس طالعة في حجرتي، لم يظهر الفيُ بعد. وقال مالك و يحيى بن سعيد و شعيب وابن أبي حفصة: والشمس قبل أن تظهر. [۲۳]

احناف کے نزدیک سوائے مغرب کے ہر نماز میں تاخیر افضل ہے اور شافعیہ کے نزدیک سوائے عشاء کے ہر نماز میں تعجیل افضل ہے لہٰذا مغرب اور عشاء میں دونوں متفق ہیں کہ مغرب میں تعجیل ہے اور عشاء میں تاخیر افضل ہے، اس پر تو اتفاق ہے لیکن بقیہ تین نمازوں یعنی فجر، ظہر اور عصر میں اختلاف ہے، شافعیہ تعجیل کی افضلیت کے قائل ہیں اور احناف تاخیر کی افضلیت کے قائل ہیں۔ [۲۴]

مذکورہ روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا **"لم يظهر الفئی"** سایہ دیوار پر نہیں چڑھا تھا یعنی دھوپ ابھی گھر میں فرش پر ہی تھی ایسی وقت میں آپ ﷺ نے عصر کی نماز پڑھی۔

تعجیل عصر پر شوافع کا استدلال

شوافع مذکورہ روایت سے استدلال اس طرح کرتے ہیں کہ دھوپ گھر کے اندر آ رہی تھی تو معنی یہ ہیں کہ آپ ﷺ نے بالکل اوّل وقت میں عصر کی نماز پڑھی، لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ تعجیل فرماتے تھے۔

جواب

احناف کہتے ہیں کہ اس بات پر غور کریں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ مبارکہ کی دیواریں نیچی تھیں اور دھوپ اندر آنے کے دو ہی راستے تھے یا تو دھوپ چھت کے راستے سے آئے یعنی چھت اوپر سے کھلی ہو اور دھوپ اوپر سے آئے اور دیواریں چھوٹی تھیں، لہٰذا سورج مغرب کی طرف جتنا بھی ڈھل جائے اس کی دھوپ اندر آتی رہتی تھی۔

اور اگر بالفرض یہ تصور کیا جائے کہ وہ حجرہ مسقّف تھا تو پھر دھوپ کے اندر آنے کا راستہ صرف دروازہ

---

[۲۳] وفي صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، رقم: ۹۶۱، وسنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب أوقات الصلوات الخمس، رقم: ۱۴۷، وسنن النسائي، كتاب المواقيت، باب تعجيل العصر، رقم: ۵۰۱، وسنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب في المواقيت، رقم: ۳۴۳، مسند أحمد، باقي مسند الأنصار، باب حديث السيدة عائشة، رقم: ۲۲۹۶۶، ۲۳۴۱۵، ۲۴۴۵۵، ۲۴۵۰۴، ۲۵۱۷۴، وموطأ مالك، كتاب وقوت الصلاة، باب وقوت الصلاة، رقم: ۱، وسنن الدارمي، كتاب الصلاة، باب في مواقيت الصلاة، رقم: ۱۱۶۲.

[۲۴] قال بتعجيل العصر في اول وقتها مالك والشافعي و احمد، وبتأخيرها ابو حنيفة و أصحابه والثوري مالم تتغير الشمس كما في شرح المهذب، معارف السنن، ج:۲، ص:۵۸، راجع: إعلاء السنن، ج:۲، ص:۴۲.

ہے اور یہ بات طے ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کا دروازہ مغرب کی سمت میں تھا اب دیواریں چھوٹی ہیں اور دروازہ بھی چھوٹا سا ہے تو اب دھوپ اندر اس وقت آئے گی جب سورج ڈھل کر مغرب کی سمت بہت نیچے چلا جائے گا لہٰذا جب سورج ڈھل کر نیچے چلا جائے گا پھر وہاں سے دھوپ دروازے میں داخل ہوگئی تو یہ تاخیر کی دلیل بنتی ہے نہ کہ تعجیل کی۔

حنفیہ کی تائید

اس کی تائید قرآن مجید کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں عصر کی نماز کا ذکر ہے کہ فرمایا **"فسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس و قبل غروبھا"** یہاں قبل الغروب سے بالاتفاق عصر کی نماز مراد ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ نماز عصر کا مستحب اور متناسب وقت غروب سے پہلے کا ہے اور قبل الغروب گھنٹہ سوا گھنٹہ غروب سے پہلے کہلائے گا نہ یہ کہ تین گھنٹے قبل جیسے کسی آدمی سے کہا جائے کہ مغرب سے پہلے آجانا اب شخص صبح پہنچ جائے اور نے کہا تھا کہ مغرب سے پہلے آجانا تو یہ صبح وقت مغرب سے پہلے ہی تو ہے، تو سب اس کو احمق ہی کہیں گے کیونکہ قبل الغروب کا اطلاق اس وقت ہوگا جبکہ آدمی غروب سے کچھ پہلے پہنچے، لہٰذا آپ کا بھی تین گھنٹے قبل عصر کی نماز پڑھ لینا قبل الغروب نہ ہوگا۔

احناف کہتے ہیں کہ اصفرار شمس سے اتنا پہلے پڑھ لے کہ اگر آدمی کو نماز لوٹانی پڑ جائے تو آسانی سے مسنون طریقے سے لوٹا سکے، لہٰذا اگر قبل الغروب کا اطلاق پہلے کرو گے تو یہ بلاغت کی شان کے مطابق نہیں۔ لہٰذا اس وجہ سے تاخیر افضل ہے اور وہ بھی اتنی کی اصفرار شمس کے قریب تک بھی نہ پہنچے۔

مثل اول مثل ثانی درمیانی وقت کی بابت اقوال

ایک روایت یہ ہے کہ مثل اوّل سے مثلِ ثانی تک کا وقت مشترک ہے، ایک روایت یہ ہے کہ درمیان میں کچھ وقت مہمل ہے۔ عام طور سے مختلف روایتیں ہیں لیکن جو مشہور روایت ہے اور جس پر فتویٰ دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ مثلین تک ظہر کا وقت ہوتا ہے اور مثل ثانی سے عصر کا وقت شروع ہوتا ہے اس کو لوگوں نے ظاہر الروایۃ کہہ دیا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ظاہر الروایۃ یہی ہے۔ اور ظاہر الروایۃ اس کو کہتے ہیں کہ امام محمدؒ کی چھ کتابوں میں سے کسی کتاب میں یہ روایت مذکور ہو۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا قول

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "میں نے امام محمد رحمہ اللہ کی ساری کتابوں میں یہ بات تلاش کی لیکن کہیں یہ بات موجود نہیں" لہٰذا اس کو ظاہر الروایۃ کہنا غلط ہے، وہاں ہم یہ کہہ سکتے

ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے مشہور یہ ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی صحیح روایت وہ ہے کہ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ مثلِ اول سے مثلِ ثانی تک کا وقت مشترک بین الظہر والعصر ہے۔ اور اس مذہب کی تائید حدیثِ جبرائیل سے بھی ہوتی ہے کیونکہ آپ ﷺ نے پہلے دن مثل اول کے وقت عصر کی نماز پڑھی تھی اور پھر اگلے دن اسی وقت ظہر کی نماز پڑھی اور حدیث میں الفاظ یہ ہیں کہ **"لوقت العصر بالأمس"** یعنی کل جس وقت عصر کی نماز پڑھی تھی آج اسی وقت ظہر پڑھی، لہٰذا معلوم ہوا کہ وہ ظہر کا وقت بھی تھا اور عصر کا وقت بھی تھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ وقت مشترک بین الظہر والعصر ہے لیکن دونوں وقتوں کے درمیان فاصلہ ہونا ضروری ہے، یعنی اگر ظہر مثل اول میں پڑھ لی ہے تو عصر مثل ثانی پر پڑھ لے اور اگر ظہر زوال کے متصل بعد پڑھ لی ہے تو عصر مثل اول پر پڑھ لے یعنی فاصلہ ضروری ہے۔ اس وجہ سے احناف تاخیر عصر کے قائل ہیں۔

احناف وشوافع میں اس مسئلہ میں اگر دیکھا جائے تو عملاً زیادہ فرق نہیں ہے، کیونکہ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں نے شافعیہ کی کتابوں میں دیکھا وہ یہ کہتے ہیں کہ عصر کی نماز کو اتنا مؤخر کرنا چاہئے کہ دن کا چوتھائی حصہ یا پانچواں حصہ باقی ہو۔ علامہ شامی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے نماز عصر کو اتنا مؤخر کر کے پڑھنا چاہئے کہ پانچواں حصہ یا چھٹا حصہ باقی ہو لہٰذا ایک چوتھا اور پانچواں حصہ کہہ رہے ہیں اور دوسرے پانچواں اور چھٹا حصہ کہہ رہے ہیں، تو یہ کوئی زیادہ فرق کی بات نہیں ہے۔[۲۵]

۵۴۷ - حدثنا محمد بن مقاتل قال: أخبرنا عبداللہ قال: أخبرنا عوف عن سيار ابن سلامة قال: دخلت انا و أبي على أبي برزة الاسلمي: فقال له أبي: كيف كان رسول اللہ ﷺ يصلي المكتوبة؟ فقال كان يصلي الهجير التي تدعونها الأولى حين تدحض الشمس، و يصلي العصر، ثم يرجع أحدنا إلى رحله في اقصى المدينة والشمس حية، ونسيت ما قال في المغرب، وكان يستحب أن يؤخر من العشاء التي تدعونها العتمة، وكان يكره النوم قبلها والحديث بعدها، وكان ينفتل من صلاة الغداة حين يعرف الرجل جليسه، و يقرأ بالستين إلى المائة. [راجع: ۵۴۱]

---

۲۵ ملاحظہ فرمائیں: فیض الباری، ج:۲، ص: ۱۲۰ و ۱۲۷۔

روایتِ باب کی تشریح

یہاں مذکورہ روایت میں یہ کہا گیا ہے کہ ”عصر کی نماز ایسے وقت پڑھتے تھے کہ ہم میں سے ایک شخص مدینہ کے انتہائی حصہ میں اپنے گھر چلا جاتا تھا جبکہ سورج زندہ ہوتا تھا۔“

اب اس روایت میں جو علامتیں بیان ہو رہی ہیں وہ کسی مذہب پر بھی صراحۃً دلالت نہیں کر رہی ہیں، کیونکہ آخر مدینہ کتنا دور تھا، آدمی کس رفتار سے گیا اور سورج کے زندہ ہونے کے کیا معنی ہیں؟ یہ مبہم و مجمل باتیں ہیں، لہٰذا ان کو معین طور سے کسی ایک مذہب پر منطبق کرنا مشکل ہے۔

البتہ ظہر اور عصر کے سلسلے میں ایک بات سمجھنے کی ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے ظہر اور عصر کے وقت کے بارے میں متعدد روایات ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ ظہر مثلِ اوّل پر ختم ہو جاتی ہے اور مثلِ اوّل ہی سے عصر شروع ہو جاتی ہے۔

اور ایک روایت جس کو صاحبین رحمہما اللہ نے اختیار بھی کیا ہے کہ اگرچہ وقت مشترک بین الظہر والعصر ہے لیکن خمس صلوٰت کا تقاضا ہے کہ درمیان میں فاصلہ ہو، لیکن اس فاصلہ کا تقاضا عذر کی وجہ سے بعض اوقات ساقط ہو جاتا ہے، لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ حالتِ سفر میں فاصلہ کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ جو مشترک وقت ہے اس میں دونوں اکٹھی پڑھ لو، یعنی جمع حقیقی کر لو، اور یہی بات معذور کے حق میں بھی ہے یعنی جس کو مسلسل کوئی ناقضِ وضو ہو رہا ہو یا خون بہہ رہا ہو جیسے مستحاضہ وغیرہ تو ان کے حق میں بھی فاصلے کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے، لہٰذا جو وقتِ مشترک بین الظہر والعصر ہے اس میں دونوں اکٹھی پڑھ لیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اصل میں وقت مشترک بین الظہر والعصر ہے لیکن عام حالات میں نمازوں کے درمیان فاصلہ ضروری ہے لیکن عذر کی بنا پر یعنی سفر اور مرض میں یہ فاصلہ ساقط ہو جاتا ہے اور دونوں نمازیں اکٹھی پڑھ سکتے ہیں اور یہی معاملہ مغرب وعشاء کا بھی ہے کہ شفق احمر کے غروب سے لے کر شفق ابیض کے غروب تک کا وقت یہ مشترک بین المغرب والعشاء ہے، لیکن مغرب اور عشاء میں فاصلہ کرنا ضروری ہے۔ مطلب یہ کہ اگر غروب کے وقت میں نماز فوراً پڑھ لی ہے اور پھر شفق احمر کے غروب ہونے کے فوراً بعد عشاء پڑھ سکتا ہے اور اگر نماز مغرب کو شفق احمر تک مؤخر کیا ہے تو پھر شفق ابیض کے غروب کے بعد عشاء پڑھنی چاہئے تاکہ فاصلہ ہو جائے لیکن جو آدمی حالتِ سفر میں ہے یا کسی اور حالتِ عذر میں ہے تو اس کے لئے یہ فاصلہ کرنے کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے، لہٰذا وہ بین الاحمر والابیض جمع بین الصلوٰتین کر سکتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کو اپنے اس قول پر بڑا جزم ہے اور یہی تحقیق حنفیہ کے مذہب کے عین

مطابق ہے اور صحیح ہے، اگر یہ تحقیق مان لی جائے تو پھر جمع بین الصلوتین کی جو تاویل جمع صوری کی گئی تھی اس کی حاجت باقی نہیں رہتی، تو پھر یہ جمع حقیقی ہوگئی اور یہی حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا مذہب ہے اور اس کے اوپر عمل کرنا بالکل درست ہے اور حضرت شاہ صاحبؒ کے دلائل میں وزن بھی بہت ہے، چنانچہ سفر کی حالت میں اس بات کی پوری گنجائش موجود ہے کہ آپ مثل اوّل گزرنے کے بعد دونوں نمازیں اکٹھی پڑھ لیں اور شفق احمر کے غروب ہونے کے بعد دونوں نمازیں اکٹھی پڑھ لیں، لیکن مثل اول یا غروب شفق احمر سے پہلے جمع تقدیم کا جواز پیدا نہیں ہوتا۔

۵۴۸ ـ حدثنا عبداللہ بن مسلمه عن مالک، عن اسحاق بن عبداللہ بن أبی طلحة، عن أنس بن مالک قال: کنا نصلی العصر ثم یخرج الإنسان إلی بنی عمرو ابن عوف فیجدهم یصلون العصر. [أنظر: ۵۵۰، ۵۵۱، ۷۳۲۹][۲۶]

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں کہ ہم عصر کی نماز پڑھتے پھر ہم میں سے لوگ بنی عمرو ابن عوف کی طرف جاتے تو ان کو بھی عصر کی نماز پڑھتے ہوئے پاتے تھے۔

اب اس سے کوئی نتیجہ نکالنا مشکل ہے، بنی عمرو ابن عوف قباء کے پاس آباد تھے، قباء کا راستہ اگر ایک طرف سے جاؤ تو دو میل پڑتا ہے اور اگر دوسری طرف سے جاؤ تو تین میل پڑتا ہے، اور آدمی کس رفتار سے جا رہا ہے وغیرہ وغیرہ یہ سب مبہم ہے، لہٰذا کوئی نتیجہ نکالنا مشکل ہے۔

۵۴۹ ـ حدثنا ابن مقاتل قال: أخبرنا عبداللہ قال: أخبرنا ابو بکر بن عثمان بن سهل بن حنیف، قال: سمعت أبا أمامة یقول: صلینا مع عمر بن عبدالعزیز الظهر، ثم خرجنا حتی دخلنا علی انس بن مالک فوجدناه یصلی العصر، فقلت: یا عم ما هذه الصلوة التی صلیت؟ قال: العصر، وهذه صلوة رسول اللہ ﷺ التی کنا نصلی معه. [۲۷، ۲۸]

[۲۶] وفی صحیح مسلم کتاب المساجد، ومواضع الصلاة، باب استحباب التبکیر بالعصر، رقم: ۹۸۶، وسنن النسائی، کتاب المواقیت، باب تعجیل العصر، رقم: ۵۰۲، و سنن أبی داؤد کتاب الصلاة، باب فی وقت صلاة العصر، رقم: ۳۴۳، وسنن ابن ماجة، کتاب الصلاة، باب وقت صلاة العصر، رقم: ۶۷۴، ومسند احمد، باقی مسند المکثرین، باب مسند أنس بن مالک، رقم: ۱۲۱۸۳، ۱۲۷۵۸، ۱۲۷۹۵، ۱۲۸۵۲، وموطأمالک، کتاب وقوت الصلاة، باب وقوت الصلاة، رقم: ۹، وسنن الدارمی، کتاب الصلاة، باب وقت العصر، رقم: ۱۱۸۲.

[۲۷] لایوجد للحدیث مکررات.

[۲۸] وفی صحیح مسلم کتاب المساجد، ومواضع الصلاة، باب استحباب التبکیر بالعصر، رقم: ۹۸۸، وسنن النسائی، کتاب المواقیت، باب تعجیل العصر، رقم: ۵۰۵، و سنن أبی داؤد کتاب الصلاة، باب فی وقت صلاة العصر، رقم: ۳۵۰، ومسند احمد، باقی مسند المکثرین، باب مسند السابق، رقم: ۱۲۷۶۲.

ابوامامہ کہتے ہیں کہ ہم نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی، پھر ہم نکلے یہاں تک کے ہم نے حضرت انس بن مالک ﷺ کو دیکھا کہ وہ عصر کی نماز پڑھ رہے ہیں۔ تو ہم نے پوچھا کہ یہ کونسی نماز ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ عصر، اور یہ اس طرح کی نماز ہے جو ہم حضور ﷺ کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔

تعجیل عصر میں شافعیہ کی دلیل

مذکوہ حدیث بلاشبہ تعجیل عصر کی دلیل ہے اور شافعیہ کی دلیل و حجت ہے۔ جس کا حاصل صرف یہ ہے کہ حضرت انس بن مالک ﷺ کا مذہب شافعیہ کے عین مطابق تھا اور ہمیں بھی اس سے انکار نہیں، باقی دوسرے صحابہ کرام ﷺ سے دیگر باتیں بھی منقول ہیں جیسا کہ ترمذی میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ''تم عصر کی نماز حضور ﷺ کے مقابلے میں جلدی پڑھتے ہو، مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ دیر سے پڑھا کرتے تھے، تو یہ مختلف اوقات میں مختلف طریقے رہے ہیں تو کسی صحابی نے کسی طریقے کو اور کسی نے کسی اور طریقے کو اختیار کرلیا، لہٰذا وہ ایک دوسرے کے خلاف حجت نہیں۔

۵۵۰ ـ حدثنا أبو اليمان قال: أخبرنا شعيب عن الزهري قال: حدثني أنس بن مالک قال : كان رسول الله ﷺ يصلي العصر والشمس مرتفعة حيّة فيذهب الذاهب إلى العوالي فياتيهم والشمس مرتفعة، وبعض العوالي من المدينة على أربعة اميال أو نحوه .
[راجع: ۵۴۸]

حضرت انس بن مالک ﷺ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ عصر کی نماز پڑھتے تھے جبکہ سورج بلند ہوتا تھا تو جانے والا عوالی جاتا تھا اور ان کے پاس پہنچ جاتا تھا لانکہ سورج ابھی تک بلند ہی ہوتا تھا۔

یہ حتمی دلیل نہیں

اس حدیث کو تعجیل عصر یا مثل اول پر محمول کیا جارہا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ یہ کسی بات کے اوپر حتمی طور پر دلیل نہیں، کیونکہ یہ کہنا کہ سورج کے بلند ہونے کی ہی حالت میں عوالی پہنچ جاتا تھا تو عوالی مدینہ کے پاس کچھ بستیاں تھیں اور ان کا حال یہ تھا کہ ایک میل سے بارہ میل تک پھیلی ہوئی تھیں اب یہ عوالی کے کون سے حصے میں جاتے تھے ایک میل والے یا چار میل والے یا بارہ میل والے؟ یہ کچھ پتا نہیں، لہٰذا اس سے کوئی حتمی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔

۵۵۱ ـ حدثنا عبدالله بن يوسف قال: أخبرنا مالک، عن ابن شهاب، عن أنس ابن مالک قال: كنّا نصلّي العصر ثم يذهب الذاهب منا إلى قباء فياتيهم والشمس مرتفعة [راجع: ۵۳۸].

(۱۴) باب اثم من فاتته العصر

اس شخص کو کتنا گناہ ہے جس کی نماز عصر جاتی رہے

۵۵۲ - حدثنا عبداللہ بن یوسف قال: أخبرنا مالک عن نافع، عن بن عبداللہ عمر أن رسول اللہ ﷺ قال: الذی تفوته صلوٰۃ العصر فکانما وتر أهله وماله. [۲۹]

"فکانما وتر أهله وماله": اس کو دو طرح سے پڑھ سکتے ہیں، پہلی صورت یہ ہے کہ **"اهلُه ومالُه"** (مرفوع) پڑھا جائے اس صورت میں "وُتر" "لٹ جانے" کے معنی میں ہوگا۔ یعنی اس کے مال اور اس کے اہل کو لوٹ لیا گیا۔ اور اگر **"اهلَه ومالَه"** (منصوب) پڑھا جائے تو پھر **"وتر یتر"** "کمی پیدا کرنے" کے معنی میں ہوگا۔ جیسے **"لن یترکم اعمالکم"** یعنی اللہ تمہارے اعمال میں کمی نہیں کریں گے، یہ متعدی بدو مفعول ہوتا ہے لہذا یہاں **"وتر"** کی ضمیر نائب فاعل مفعول اوّل ہے اور **"اهلَه و مالَه"** اس کا مفعول ثانی ہے، یعنی اس کے اہل و مال میں کمی واقع کر دی گئی۔

(۱۵) باب من ترک العصر

اس شخص کا گناہ جو نماز عصر کو چھوڑ دے

۵۵۳ - حدثنا مسلم بن ابراهیم قال: حدثنا هشام قال: أخبرنا یحیی بن أبی کثیر عن أبی قلابة عن أبی الملیح قال: کنا مع بریدة فی غزوة فی یوم ذی غیم فقال: بکروا

[۲۹] وفی صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاة، باب التغلیظ فی تفویت صلاة العصر، رقم: ۹۹۱، ۹۹۲، وسنن الترمذی، کتاب الصلاة، باب ما جاء فی السهو عن وقت صلاة العصر، رقم: ۱۶۰، وسنن النسائی، کتاب الصلاة، باب صلاة العصر فی السفر، رقم: ۴۷۴، و کتاب المواقیت، باب التشدید فی تأخیر العصر، رقم: ۵۰۸، وسنن أبی داؤد، کتاب الصلاة، باب فی وقت صلاة العصر، رقم: ۳۵۱، وسنن ابن ماجة، کتاب الصلاة، باب المحافظة علی صلاة العصر، رقم: ۶۷۷، ومسند احمد، مسند المکثرین من الصحابة، باب مسند عبد اللہ بن عمر بن الخطاب، رقم: ۴۳۱۷، ۴۳۹۳، ۴۵۷۴، ۴۸۴۰، ۴۹۱۴، ۵۰۶۱، ۵۱۹۸، ۵۵۱۹، ۵۷۹۲، ۵۹۰۱، ۶۰۳۸، ۶۰۷۳، وموطأ مالک، کتاب وقوت الصلاة، باب جامع الوقوت، رقم: ۱۸، وسنن الدارمی، کتاب الصلاة، باب فی الذی تفوته، صلاة العصر، رقم: ۱۲۰۲، ۱۲۰۳.

بصلاة العصر فإن النبی ﷺ قال: "من ترک صلاة العصر فقد حبط عمله". [۳۰]

ترک نماز عصر پر وعید

مذکورہ حدیث میں **"من ترک صلوٰۃ العصر فقد حبط عمله"** یعنی جو نماز عصر ترک کردے تو اس کا عمل حبط ہوگیا، یہ جملہ کس قدر سنگین ہے کہ ظاہر تو یہ ہے کہ جو کچھ کیا دھرا تھا سب پر پانی پھر گیا اور ایک دن کی عصر کی نماز چھوڑنے پر سارے اعمال بیکار ہو گئے۔

یہ ظاہری معنی جمہور اہلسنت کے نزدیک مراد نہیں ہو سکتے، کیونکہ جمہور اہلسنت کے نزدیک کبیرہ سے ایمان نہیں جاتا جیسا کہ **"کتاب الایمان"** میں گذر چکا ہے، لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ حبط کی کچھ تاویل کرنی پڑے گی۔

حبط عملی کی تاویل

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ حبط کی تاویل نہیں ہوسکتی، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تغلیظ پر محمول ہے اور اس کا ظاہر مراد نہیں اور یہ تاویل بکثرت کی جاتی ہے کہ **" قال النبی ﷺ تغلیظا"**۔

قاضی ابوبکر ابن العربی رحمہ اللہ کی توجیہ

لیکن اس تاویل پر اطمینان نہیں ہوتا، اس لئے کہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ ﷺ نے تغلیظاً ایک ایسی بات کہہ دی جو کہ واقعے کے مطابق نہیں تھی، العیاذ باللہ۔ یعنی جیسے بچوں کو جھوٹ بول کر اور غلط بات کہہ کر محض بچوں کو ڈرایا جاتا ہے، اسی طریقہ سے آپ ﷺ نے معاذ اللہ ڈرانے کے لئے ایک ایسی بات کہہ دی جو واقعہ کے مطابق نہیں، لہٰذا یہ تاویل درست ہی نہیں ہے۔ میرے نزدیک اس کی سب سے بہتر توجیہ قاضی ابوبکر ابن العربی رحمہ اللہ نے کی ہے۔

حبط عمل کی قسمیں

ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حبط عمل کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم حبط عمل کی یہ ہے کہ جتنی حسنات تھیں سب پر پانی پھر گیا، کوئی بھی نیکی نامۂ اعمال میں باقی نہ رہی اور یہ حبط عمل صرف کفر سے ہوتا ہے، العیاذ باللہ۔ اگر کوئی شخص مرتد ہو جائے تو اس کا عمل اسی طرح حبط ہوگا جیسا کہ سورۂ "محمد" میں ہے:

---

۳۰ وفی سنن النسائی، کتاب الصلاة، باب من ترک صلاة العصر، رقم: ۴۷۰، وسنن ابن ماجة، باب میقات الصلاة فی الغیم، رقم: ۶۸۶، ومسند احمد، باقی مسند الأنصار، باب حدیث بریدة الاسلمی، رقم: ۲۱۸۲۹.

"اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝" [محمد، الآية: ١]

ترجمہ: جو لوگ کہ منکر ہوئے اور روکا اوروں کو اللہ کی راہ سے کھو دیئے اللہ نے اُن کے کام۔

دوسری قسم حبط عمل کی یہ ہے کہ تمام اعمال تو باطل نہیں ہوئے لیکن درمیان میں کوئی عمل ایسا آ گیا کہ جس نے اس کو موقتاً عمل کرنے سے روک دیا مثلاً آدمی نے نماز پڑھی تھی، روزے رکھے تھے، صدقات بھی دیتا تھا لیکن ایک عمل درمیان میں ایسا آ گیا کہ جو ان کے اعمال کے نتائج کے بیچ میں حائل ہو گیا اور ان اعمال کے بدلے میں جو ثواب ملنا تھا اس کو روک دیا لیکن یہ روکنا موقت ہے یعنی پہلے اس عمل کی سزا بھگتو، پھر اُن اعمال کا نتیجہ ظاہر ہوگا۔

لہٰذا احادیث میں جہاں مختلف گناہوں پر حبط عمل وارد ہوا ہے اس سے مراد حبطِ موقت ہے نہ کہ مؤبد، جو کفر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ بات دل کو بڑی لگتی بھی ہے، لہٰذا جہاں جہاں آپ دیکھیں کہ سوائے کفر کے کسی گناہ کے اوپر حبط عمل کو ذکر ہے تو وہاں حبط عمل موقت مراد ہوگا۔[۳۱]

(۱۶) باب فضل صلاۃ العصر

نماز عصر کی فضیلت کا بیان

۵۵۴ ۔ حدثنا الحمیدی قال: حدثنا مروان بن معاویة قال: حدثنا اسماعیل، عن قیس عن جریر قال: کنا مع النبی ﷺ فنظر إلی القمر لیلة. یعنی البدر. فقال: "إنکم سترون ربکم کما ترون هذا القمر، لا تضامون فی رویته فإن استطعتم أن لا تغلبوا علی صلاة قبل طلوع الشمس و قبل غروبها فافعلوا". ثم قرأ: ﴿وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ الْغُرُوْبِ﴾ [ق: ۳۹] قال اسماعیل: افعلوا لا تفوتنکم. [أنظر: ۵۷۳، ۴۸۵۱، ۷۴۳۴، ۷۴۳۵، ۷۴۳۶].[۳۲]

---

۳۱ انظر: عمدة القاری، ج:۴، ص:۵۷۔

۳۲ وفی صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاة، باب فضل صلاتی الصبح والعصر والمحافظة علیهما، رقم: ۱۰۰۲، وسنن الترمذی، کتاب صفة الجنة عن رسول الله، باب ماجاء فی رؤیة الرب تبارک وتعالی، رقم: ۲۴۷۴، وسنن أبی داؤد، کتاب السنة، باب فی الرؤیة، رقم: ۴۱۰۴، وسنن ابن ماجة، کتاب المقدمة، باب فیما أنکرت الجهمیة، رقم: ۱۷۴، ومسند احمد، اول مسند الکوفیین، باب ومن حدیث جریر بن عبد الله عن النبی، رقم: ۱۸۳۹۴، ۱۸۴۰۹، ۱۸۴۵۴.

۵۵۵ ـ حدثنا عبداللہ بن یوسف قال: حدثنا مالک عن أبی الزناد، عن الأعرج، عن أبی ہریرۃ ﷺ أن رسول اللہ ﷺ قال: " یتعاقبون فیکم ملائکۃ باللیل و ملائکۃ بالنہار ویجتمعون فی صلاۃ الفجر و صلاۃ العصر، ثم یعرج الذین باتو فیکم فیسالہم. وھو أعلم بہم - کیف ترکتم عبادی؟ فیقولون: ترکناھم وھم یصلون، و أتینا ھم و ھم یصلون".
[أنظر: ۳۲۲۳، ۷۴۲۹، ۷۴۸۶][۳۳]

نمازعصر کی فضیلت

حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ" کچھ ملائکہ تمہارے اوپر ایک دوسرے کے پیچھے آتے رہتے ہیں، کچھ رات کے وقت میں اور کچھ دن کے وقت میں۔

یہاں **"یتعاقبون"**، **"اکلونی البراغیث"** کی قبیل سے ہے، قاعدہ کی رُو سے **"یتعاقب"** واحد ہونا چاہئے تھا کیونکہ آگے فاعل اسم ظاہر آ رہا ہے اور جب فاعل اسم ظاہر ہو تو فعل ہمیشہ مفرد ہوتا ہے، لیکن یہاں **"یتعاقبون"** کہا گیا تو یہ بعض اہلِ عرب کی لغت ہے جس کی مثال نحویوں نے **"اکلونی البراغیث"** سے دی ہے۔

"و یجتمعون فی صلوٰۃ الفجر و صلوٰۃ العصر" یعنی ان آنے جانے والے فرشتوں کا عصر اور فجر میں اجتماع ہوتا ہے پھر یہ فرشتے رات گزار کر اوپر اللہ ﷻ کے پاس چڑھ کر جاتے ہیں، پروردگار ان سے پوچھتے ہیں حالانکہ خود بھی جانتے ہیں۔ یہ پوچھنا کسی عدم علم کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ محض ایک اظہار فضل کی وجہ سے ہے کہ تم میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑ کر آئے ہو، تو وہ کہتے ہیں کہ فجر کی نماز پڑھتے ہوئے چھوڑ کر آئے ہیں اور جب گئے تھے تو وہ اس وقت بھی نماز پڑھ رہے تھے یعنی عصر کی نماز۔

(۱۷) باب من أدرک رکعۃ من العصر قبل الغروب

اس شخص کا بیان جو غروب آفتاب سے پہلے عصر کی ایک رکعت پائے

" حدثنا أبو نعیم قال: حدثنا شیبان، عن یحیی، عن أبی سلمۃ، عن أبی ہریرۃ

[۳۳] وفی صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، باب فضل صلاتی الصبح والعصر والمحافظۃ علیہما، رقم: ۱۰۰۱، وسنن النسائی، کتاب الصلاۃ، باب فضل صلاۃ الجماعۃ، رقم: ۴۸۱، ومسند احمد، باقی مسند المکثرین، باب مسند أبی ہریرۃ، رقم: ۷۱۷۸، ۷۷۷۲، ۸۱۸۲، ۸۷۸۷، ۹۹۱۸؛ وموطامالک، کتاب النداء للصلاۃ، باب جامع الصلاۃ، رقم: ۳۷۳.

قال: قال رسول اللہ ﷺ :" إذا أدرک أحدکم سجدۃ من صلاۃ العصر قبل أن تغرب الشمس فلیتم صلاتہ ، و إذا أدرک سجدۃ من صلاۃ الصبح قبل أن تطلع الشمس فلیتم صلاتہ" .[أنظر: ۵۷۹، ۵۸۰] [۳۴]

حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کو غروب سے پہلے ایک سجدہ بھی عصر کی نماز کا مل جائے تو وہ اپنی نماز پوری کرلے اور جب طلوع شمس سے پہلے ایک سجدہ نماز فجر کا مل جائے تو وہ اپنی نماز پوری کرلے۔

اور آگے زیادہ تر روایت میں اس طرح کے الفاظ ہیں کہ **"من أدرک رکعۃ من الفجر قبل ان تطلع الشمس فقد ادرک الفجر و من ادرک رکعۃ من العصر قبل ان تغرب الشمس فقد ادرک العصر"**:

یہ وہ حدیث ہے جس کے ظاہر پر ائمۂ ثلاثہ عمل کرتے ہیں اور حنفیہ کا مذہب چونکہ اس کے خلاف ہے لہٰذا حنفیہ کی طرف سے اس میں بڑی زبردست تأویلات کی گئی ہیں، جس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

حدیث باب پر ائمۂ ثلاثہ کا عمل

آئمہ ثلاثہ اور جمہور اس کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اگر طلوع سے پہلے فجر کی ایک رکعت بھی مل گئی، چاہے دوسری رکعت طلوع کے بعد ادا ہو تو نماز پھر بھی ہو جائے گی اور یہی حال عصر کی نماز کا بھی ہے۔ [۳۵]

حنفیہ کا مسلک

حنفیہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ فجر کی نماز فاسد ہوگئی اور عصر کی نماز صحیح ہوگئی۔ [۳۶]

---

[۳۴] وفی صحیح مسلم ، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ ، باب من أدرک رکعۃ من الصلاۃ فقد أدرک تلک الصلاۃ ، رقم : ۹۵۴، وسنن الترمذی ، کتاب الصلاۃ ، باب ماجاء فی من أدرک رکعۃ من العصر قبل أن تغرب ، رقم : ۱۷۱ ، وکتاب الجمعۃ عن رسول اللہ ، باب ماجاء فیمن أدرک من الجمعۃ ، رقم: ۴۸۲ ، وسنن النسائی ، کتاب المواقیت ، باب من أدرک رکعتین من العصر ، رقم : ۵۱۲، وسنن أبی داؤد ، کتاب الصلاۃ ، باب فی وقت صلاۃ العصر ، رقم : ۳۴۹،و سنن ابن ماجۃ ، کتاب الصلاۃ ، باب وقت الصلاۃ فی العذر والضرورۃ ، رقم : ۶۹۱ ، وکتاب إقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا ، باب ماجاء فیمن أدرک من الجمعۃ رکعۃ ، رقم: ۱۱۱۲ ، ومسند احمد ، باقی مسند المکثرین ، باب مسند أبی ھریرۃ ، رقم : ۶۹۸۳، ۷۲۲۴، ۷۲۷۷، ۷۷۱۱، ۸۵۲۸، ۸۸۷۱، ۹۵۳۸، ۹۵۷۵، ۹۷۴۵ ، وموطأ مالک ، کتاب وقوت الصلاۃ ، باب وقت الصلاۃ ، رقم : ۴ ، و باب من أدرک رکعۃ من الصلاۃ ، رقم: ۱۴ ، وسنن الدارمی ، کتاب الصلاۃ ، باب من أدرک رکعۃ من صلاۃ فقد أدرک رقم : ۱۱۹۳، ۱۱۹۴.

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول

امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دونوں نمازیں فاسد ہوگئیں اس لئے کہ درمیان میں ایک مکروہ وقت حائل ہے یعنی طلوع اور غروب کا کہ جس نے دونوں نمازوں کو فاسد کر دیا۔[۳۷]

حدیث باب کی توجیہ

امام طحاوی رحمہ اللہ حدیث باب کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ **"ادرک"** سے مراد **"ادرک الفرضیة"** ہے یعنی اگر کوئی شخص جو پہلے نابالغ تھا وہ بالغ ہوگیا یا غیر مسلم تھا وہ اسلام لے آیا، ایسے وقت میں جبکہ ایک رکعت پڑھنے کا وقت باقی ہے تو اس نے فرضیت پالی، لہٰذا اس کے ذمہ فجر کی نماز فرض ہوگی، اب یہ بعد میں اس کو ادا کرے گا اور یہی حکم عصر کا بھی ہے۔[۳۸]

اشکال: احناف کے اس مشہور مذہب میں یہ مشکل پیش آتی ہے کہ دونوں نمازوں میں یہ فرق کیسے کیا گیا اور پھر حدیث باب کا مطلب کیا ہے؟

جواب: اس کے جواب میں حنفیہ کی طرف سے جو تاویل پیش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ حدیث باب کا مطلب بیشک یہ نکل رہا ہے کہ دونوں نمازیں ہوگئیں لیکن یہ حدیث ان احادیث متواتر المعنی کے متعارض ہے، جن میں طلوع اور غروب کے وقت میں نماز پڑھنے کی ممانعت کی گئی ہے۔

اور یہ حدیثیں متواتر المعنی ہیں تو ان کا تقاضا یہ ہے کہ ان اوقات میں نماز نہ پڑھی جائے جبکہ حدیث باب کا تقاضا ہے کہ پڑھی جائے اور نماز ہو جائے گی اور تعارض کا حکم یہ ہے کہ **"اذا تعارضا تساقطا"** لہٰذا اب نہ تو ان احایث پر عمل ہو اور نہ اس حدیث باب پر عمل ہو بلکہ قیاس پر عمل ہونا چاہئے اور قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ فجر کی نماز صحیح فاسد ہو جائے، اور عصر کی نماز ہو جائے اس لئے کہ طلوع شمس سے ایک لمحے پہلے تک بھی فجر کا وقتِ کامل ہے کوئی وقت مکروہ نہیں ہے۔ کیونکہ جب وقت داخل ہوتا ہے تو فریضۂ صلوٰۃ متوجہ ہوتا ہے اور وجوب

[۳۵، ۳۶، ۳۷] قال النووی هذا دلیل صریح فی أن من صلی رکعة من الصبح أو العصر ثم خرج الوقت قبل سلامه لا تبطل صلاته بل يتمها وهی صحيحة، وهذا مجمع عليه فی العصر وأما فی الصبح فقال به مالک والشافعی واحمد رحمهم الله تعالی والعلماء کافة إلا أبا حنيفة رحمه الله تعالی فانه قال تبطل صلاة الصبح بطلوع الشمس فيها لانه دخل وقت النهی عن الصلاة بخلاف غروب الشمس. والحديث حجة عليه الخ، فيض الباری ج:۲، ص:۱۱۸، وعمدة القاری، ج:۴، ص:۶۸۔

[۳۸] اعلاء السنن، ج:۵، ص:۱۲۔

اداء مختلف اجزاءِ وقت میں ایک جز سے دوسرے جز کی طرف منتقل ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ جو جز "**مقارن للأداء**" ہوتا ہے وہ سبب وجوب بنتا ہے، لہٰذا جب فجر کا وقت داخل ہوا تو وجوب ادا کے اجزاء منتقل ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ آخری جز جو "**مقارن للأداء**" تھا اس میں فرضیت ادا ہوئی۔ اب وہ وقت جس میں وجوب ہوا، وہ کامل ہے اور اس نے ادائیگی وقت مکروہ میں کی جو اداء ناقص ہے، لہٰذا "**وجب کاملاً و ادیٰ ناقصاً فلم یؤدّ کما وجب**"۔

بخلاف نماز عصر کے کہ غروب شمس جو کہ متصل اصفرار کا وقت ہے اور اصفرار کا وقت وقتِ ناقص ہے تو جب آدمی نے نماز شروع کی تو وجوب اداء ناقص ہوا، لہٰذا جیسا ناقص واجب ہوا تھا ویسا ہی ادا بھی کر دیا، لہٰذا اس قیاس کی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ فجر میں فاسد اور عصر میں جائز ہے۔ احناف کی طرف سے یہ تاویل اس باب میں پیش کی گئی ہے۔

احناف کی تاویل

احناف کی اس تاویل پر دل مطمئن نہیں ہوتا کیونکہ یہاں پہلی بات یہ ہے کہ اس ساری بحث کا دارومدار اس پر ہے کہ احادیث میں تعارض ہے یعنی یہ حدیث معارض ہے حدیث نہی سے، لہٰذا قیاس کی گنجائش نکلی اور اگر تطبیق پیدا ہو جائے تو پھر قیاس کی ضرورت ہی نہیں، لیکن اگر غور کیا جائے تو تعارض ہے ہی نہیں، اس لئے کہ نہی کے معنی ہیں کہ ایسا کام نہ کرو۔ کسی کام کا مکروہ ہونا اور بات ہے اور شریعت میں صحیح ہو جانا اور بات ہے، ہوسکتا ہے کہ ایک کام شرعاً ممنوع ہو لیکن ادا ہو جائے، مثلاً تین طلاقیں دینا منع ہیں لیکن اگر کوئی دے گا تو واقع ہو جائیں گی، اس طرح اذان جمعہ کے بعد بیع جائز نہیں لیکن اگر کوئی بیع کرلے گا تو صحیح ہو جائے گی، تو کسی فعل کا جواز اور بات ہے، صحت اور بات ہے۔

لہٰذا حدیث میں طلوع کے وقت نماز پڑھنے کی نہی آئی ہے، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اگر کوئی پڑھ لے گا تو اس کی نماز ادا نہیں ہوگی، تو نہی اور صحت میں کوئی تعارض نہیں، البتہ تعارض نفی اور صحت میں ہے۔ خاص طور پر حنفیہ کے اصول پر، اور اصول فقہ میں ہے کہ نہی من افعال شرعیہ اصل فعل کی مشروعیت کا تقاضا کرتی ہے، افعال شرعیہ سے جب نہی وارد ہو تو حنفیہ بڑی پکی بات کہتے ہیں کہ نہی اصل فعل کی مشروعیت کا تقاضا کرتی ہے کیونکہ اگر اصل فعل کی مشروعیت آپ نہیں مانیں گے تو وہ نہی، نہی نہیں رہے گی بلکہ نفی بن جائے گی، تو یہ نہی بھی افعال شرعیہ میں سے ہے کیونکہ صلوٰۃ افعال شرعیہ میں سے ہے، لہٰذا جب اس سے نہی وارد ہوئی ہے تو اس کے معنی یہ ہے کہ یہ فعل کی مشروعیت کا تقاضا کرے گی، لہٰذا اگر حدیث یہ کہہ رہی ہے کہ جس شخص نے اس طرح نماز پڑھ لی تو اس کی نماز ہوگئی تو اس کا تعارض نہی کی حدیث سے نہیں ہوا جب نہیں ہوا تو رجوع الی القیاس بھی نہیں ہوگا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے جواب میں کوشش اس بات کی کی گئی ہے کہ تعارض ثابت کیا جائے حالانکہ عام حالات میں کوشش یہ ہوتی ہے کہ تعارض کو رفع کر کے کسی نہ کسی طرح تطبیق پیدا کی جائے۔ چنانچہ ایک روایت ایسی لائی گئی کہ جس میں ہے کہ **"لا صلوٰۃ بعد الفجر حتی تطلع الشمس ولا صلوٰۃ بعد العصر حتی تغرب الشمس"**. تو کہتے ہیں کہ **"لا صلوٰۃ"** نہی نہیں ہے بلکہ نفی ہے تو چونکہ نفی ہے تو اس کا صحت والی حدیث سے تعارض ہو گیا لہٰذا جب تعارض ہو گیا ہے تو ہمارا قیاس درست ہو گیا تو یہ با قاعدہ تعارض کر کے قیاس کے درست ہونے کی کوشش کی جارہی ہے تا کہ تساقط ہو جائے اور قیاس کا کوئی مخرج نکل آئے۔

تو اوّل تو یہ بات ہے کہ ساری حدیثیں نہی سے آرہی ہیں ایک روایت اگر نفی کے الفاظ سے آرہی ہے تو احناف کہتے ہیں کہ یہ نفی بھی نہی کے معنی پر محمول ہے یا "لا" نفی کمال کے لئے ہے، اور نفی کمال کا نسخہ تعارض کو رفع کرنے کے لئے ہر جگہ استعمال کیا جاتا ہے، لیکن یہ کیا ہے کہ زبردستی تعارض ثابت کیا جائے اور پھر اس کے نتیجے میں دونوں روایتیں ساقط ہوں، لہٰذا اس واسطے یہ بات کسی طرح بھی دل کو نہیں لگتی۔

پھر یہ قیاس جو پیش کیا گیا وہ بھی بڑا عجیب وغریب قسم کا قیاس ہے کہ وہاں وجوب کامل ہوا تھا، لہٰذا ادا بھی کامل اور یہاں وجوب ناقص، لہٰذا ادا بھی ناقص ہوگئی، یہ منقوض ہے۔ بہرحال اس تفصیل کی اب ضرورت نہیں، اس واسطے کہ خود حنفیہ میں بڑے بڑے محققین نے یہ کہا ہے کہ اس باب میں حنفیہ مؤقف کمزور ہے، حدیث باب صریح ہے اور صحیح ہے اس میں کسی تفصیل کی کوئی گنجائش نہیں، لہٰذا سیدھی سی بات ہے کہ حدیث اور امام کے قول میں تعارض ہو جائے تو حدیث بالا رہے گی۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے **"البحر الرائق"** میں، حضرت گنگوہی اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہما اللہ نے **"فتح الملھم"** میں یہ کہا ہے کہ یہ تاویلات بڑی دور از کار ہیں، لہٰذا اس کی بنا پر حدیث صحیح کو ترک نہیں کرنا چاہئے اور یہی اس بارے میں سلیم مؤقف ہے۔[۳۹]

حضرت مفتی شفیع صاحب نوراللہ مرقدہ کا قول زریں

میرے والد ماجد رحمہ اللہ ایک بڑی پیاری بات فرماتے تھے جو کہ یاد رکھنے کی ہے کہ "خود حنفی بنتے ہو تو بنو، لیکن حدیث کو حنفی بنانے کی کوشش نہ کرو کہ گھڑ مڑ کر کسی طرح کھینچ تان کر اس کو حنفی بناؤ"

الغرض سیدھی بات یہ ہے کہ حدیث باب صحیح اور صریح ہے اس کے خلاف کوئی بھی دلیل نہیں جو کہ وزنی ہو۔

۵۵۷ - حدثنا عبدالعزیز بن عبداللہ قال: حدثنی ابراھیم بن سعد عن ابن شھاب، عن سالم بن عبداللہ، عن أبیه أنه أخبره أنه سمع رسول اللہ ﷺ یقول: "إنما

۳۹ فمن شاء التفصیل فلیراجع: عمدۃ القاری، ج:۴، ص:۶۸، وفیض الباری، ج:۲، ص:۱۱۸-۱۲۴۔

بقائعكم فيما سلف قبلكم من الأمم كما بين صلاة العصرِ إلى غروب الشمس؛ أوتى أهل التوراة التوراة، فعملوا بها حتى إذا انتصف النهار عجزوافاعطوا قيراطا قيراطا. ثم أوتى أهل الإنجيل الإنجيل، فعملوا إلى صلاة العصر ثم عجزوا فاعطوا قيراطا قيراطا. ثم أوتينا القران فعملنا إلى غروب الشمس فاعطينا قيراطين قيراطين. فقال أهل الكتابين: أى ربنا، أعطيت هؤلاءِ قيراطين قيراطين وأعطيتنا قيراطا قيراطا، و نحن كنا أكثر عملا. قال الله: هل ظلمتكم من أجركم من شيء؟ قالو: لا، قال: فهو فضلي أوتيه من أشاء". [أنظر: ۲۲۶۸، ۲۲۶۹، ۳۴۵۹، ۵۰۲۱، ۷۴۶۷،۷۵۳۳][۴۰]

تشریح

یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا "انما بقاء کم و فیما سلف قبلکم من الامم کما بین صلوٰۃ العصرالیٰ غروب الشمس".

یہاں لفظ "فی" مقابلہ کے معنی میں ہے۔ آنحضرت ﷺ نے امت مسلمہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ دنیا میں تمہاری بقاء تمہارا ٹھہرنا پچھلی جو امتیں گزر چکی ہیں ان کے مقابلہ میں ایسا ہے "کما بین صلوٰۃ العصرالی غروب الشمس" جیسا کہ نماز عصر سے غروب آفتاب تک کا وقت ہوتا ہے، یعنی پچھلی امتوں کا وقت ایسا ہے جیسا کہ طلوع آفتاب سے عصر تک کا وقت اور تمہارا دنیا کے اندر وقت ایسا ہے جیسا کہ عصر سے لے کر غروب آفتاب تک کا وقت۔

آگے اس کی تفصیل بیان فرمائی کہ " أوتى أهل التوراة التوراة" اہل تو راۃ کو توراۃ دی گئی "فعملوا بھا" انہوں نے عمل کیا، یہاں تک کہ جب صبح سے نصف النہار تک کام کر چکے تو عاجز ہو گئے یعنی کام چھوڑ دیا۔ "فاعطوها قيراطاً قيراطاً" تو ان کو صبح سے دو پہر تک کام کرنے کی اجرت ایک ایک قیراط دیا گیا۔

"ثم أوتى اهل الانجيل الانجيل" پھر اہل انجیل کو انجیل دی گئی "فعملوا" انہوں نے عمل کیا، پھر وہ عاجز ہو گئے ان کو بھی ایک ایک قیراط دیا گیا۔

"ثم أوتينا القرآن" ہم کو قرآن عطا کیا گیا "فعملنا الیٰ غروب الشمس فاعطينا قيراطين قيراطين".

---

[۴۰] وفی سنن الترمذی، كتاب الأمثال عن رسول الله، باب ماجاء في مثل ابن آدم و أجله و أمله، رقم: ۲۷۹۷، ومسند احمد، مسند المكثرين من الصحابة، باب مسند عبد الله بن عمربن الخطاب، رقم: ۴۲۷۹، ۵۶۳۶، ۵۷۵۶، ۵۸۵۹.

"فقال اهل الكتابين" توراۃ اور انجیل والوں نے اللہ جل جلالہ سے کہا **"ای ربنا اعطیت هؤلاء قیراطین قیراطین"** یعنی آپ نے مسلمانوں کو دو دو قیراط عطا فرمائے **"واعطینا قیراطا قیراطا و نحن كنا اكثر اعمالا"** جبکہ ہمارا عمل زیادہ تھا۔

اللہ جل جلالہ نے فرمایا **"هل ظلمتكم من أجركم من شيء ؟"** کیا میں نے تمہارے اجر میں کوئی کمی کی، تمہارا جو اجر تھا وہ تمہیں دے دیا **"قالوا لا"** انہوں نے کہا: نہیں کوئی کمی نہیں کی۔ **"قال: وهو فضلي أوتيه من يشاء"** فرمایا جو زیادہ ہے وہ میرا فضل ہے میں جس کو چاہوں دوں، جو تمہارا حق تھا وہ تمہیں مل گیا، اگر میں کسی کو اپنے فضل سے زیادہ دیدوں تو مجھے اس کا اختیار ہے۔

امت محمدیہ کی فضیلت

اس حدیث میں اصل یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اس امت کو اللہ جل جلالہ نے یہ فضیلت بخشی ہے کہ اگر چہ اس کے عمل کا وقت کم ہے لیکن اس کا اجر پچھلی امتوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔

اب یہاں دو مسائل زیر بحث ہیں۔

پہلا مسئلہ

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ حدیث **"باب من ادرک رکعة من العصر قبل الغروب"** میں نکالی ہے، بظاہر اس حدیث شریف کی باب سے کوئی مناسبت نظر نہیں آ رہی ہے۔

پہلا جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ یہاں یہ بیان فرما رہے ہیں کہ جس طرح اللہ جل جلالہ نے امت محمدیہ کو یہ فضیلت عطا فرمائی ہے کہ ان کا وقت کم ہونے کے باوجود ان کو زیادہ اجر عطا فرمایا، اسی طرح اگر کوئی شخص عصر کی ایک رکعت بھی وقت کے اندر پالے اس کو اپنے فضل سے مدرک صلوٰۃ قرار دے دیا۔

تو دونوں جگہ فضل و کرم ہے یعنی کم وقت کے باوجود اجرت کا زیادہ دینا، یہ بھی فضل و کرم ہے اور ایک رکعت پانے والے کو پوری نماز کا مدرک قرار دینا، یہ بھی فضل و کرم ہے۔ لہٰذا اسی مناسبت سے امام بخاریؒ یہاں یہ حدیث لے کر آئے ہیں۔

لطیف نکتہ

اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ یہ جو فرمایا کہ امت محمدیہ عصر سے لے کر مغرب تک عمل

کررہی ہے اور اس کو دو دو قیراط دیے گئے، اس میں امت کے تمام افراد شامل ہیں۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی شامل ہیں جو قیامت کے قریب آنے والے ہیں کیونکہ وہ بھی امت محمدیہ کے افراد ہیں، حالانکہ ان کا عمل اس تمثیل کے مطابق قبیل غروب الشمس ہوگا، تو گویا **"من ادرک رکعة الخ"** یہ اس صورت حال پر قیاس ہے کہ ایک شخص قرب قیامت کے قریب آتا ہے گویا وہ قبیل غروب الشمس آیا ہے لیکن اس کے باوجود اس کو دو قیراط ملیں گے، اللہ ﷻ کا یہ فضل اس فضل کے مماثل ہے جو آپ ﷺ نے ایک ایک رکعت پانے والے کو چار رکعت پانے والے کے مماثل قرار دیا۔

دوسری بحث

اس حدیث میں دوسری بحث یہ ہے کہ حنفیہ کہتے ہیں یہ ہماری تائید کرتی ہے اور شافعیہ کہتے ہیں ہماری تائید کرتی ہے۔

اختلاف اس میں ہے کہ عصر کا وقت مثلین کے بعد سے شروع ہوتا ہے یا مثل اوّل سے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ مثلین کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور یہ حدیث ہماری تائید کرتی ہے اس لئے کہ اگر مثل اوّل سے عصر کا وقت شروع مانا جائے تو ما بین المثل الاوّل وغروب الشمس کا وقت ما بین الظہر والعصر سے زیادہ ہے، کم نہیں ہے، حالانکہ تمثیل میں مفروضہ یہ ہے کہ ظہر اور عصر کا درمیانی وقت زیادہ ہے اور عصر اور غروب کا درمیانی وقت اس کے مقابلہ میں کم ہے اور یہ اس وقت ہوسکتا ہے جب عصر کو مثلین پر مانا جائے، اگر مثل اوّل پر مانا جائے گا تو ما بین العصر والمغرب کا وقت بڑھ جائے گا۔

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ کا قول

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث شافعیہ کے مسلک کی تائید کرتی ہے اور کہتے ہیں کہ اگر عصر مثل اول پر مانی جائے تب بھی **"ما بین العصر و المغرب"** کا وقت **"ما بین الظهر و العصر"** سے کم ہوتا ہے۔

علامہ عینی رحمہ اللہ کا قول

علامہ عینی رحمہ اللہ کہتے ہیں اس طرح **"ما بين العصر و المغرب"** کا وقت زیادہ ہوتا ہے، لہٰذا دونوں میں بحث چلی۔ [۱۳]

[۱۳] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: عمدة القاری، ج:۴، ص:۷۱-۷۶۔

توضیح

واقعہ یہ ہے کہ یہ بات کہ کون سا وقت لمبا ہوتا ہے اور کون سا مختصر ہوتا ہے یہ ازمنہ اور امکنہ پر موقوف ہے۔

بعض زمانوں میں بعض مقامات پر "**ما بین العصر و المغرب**" کا وقت مثل اول کی صورت میں زیادہ ہوتا ہے اور بعض مرتبہ اس کے برابر اور بعض مرتبہ کم ہوتا ہے، اس لئے اس کو شافعیہ یا حنفیہ کے حق میں ابدی دلیل کہنا تو مشکل ہے، البتہ رجحان اس طرف ہوتا ہے کہ یہ بات جزیرہ عرب کی ہو رہی ہے اور جزیرہ عرب میں خاص طور پر گرمی کے موسم میں عصر کا وقت اگر مثلِ اول سے مانا جائے تو ما بین الظہر والعصر کا وقت زیادہ ہو جاتا ہے اس واسطے اس حدیث سے حنفیہ کی تائید ہوتی ہے، لیکن یہ جزیرہ عرب اور گرمی کے موسم کے لحاظ سے ہے اس لئے ابدی طور پر کسی کے حق میں واضح دلیل نہیں بنتی۔

سوال: یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حدیث باب سے بظاہر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ اہل انجیل کی مدت عمل اہل قرآن کی مدت عمل سے زیادہ ہے، کیونکہ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ظہر سے لیکر عصر تک کام کریں گے اور اہل قرآن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ عصر سے مغرب تک کام کریں گے اور پھر آخر میں "**نحن کنا اکثر عملا**" بھی کہا گیا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کی مدتِ عمل امت محمدیہ علی صاحبہا السلام کی مدت عمل سے زیادہ ہو، حالانکہ واقعہ یوں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمان کے تقریباً ساڑھے چھ سو سال گزرے تھے کہ حضور اقدس ﷺ تشریف لے آئے لہٰذا اہل انجیل کی مدت عمل کل ساڑھے چھ سو سال ہوئی جبکہ امت محمدیہ کو اب تک چودہ سو سال ہو چکے ہیں جو اُن کی مدت سے کم از کم دوگنی تو ہے ہی اور اللہ جل جلالہ جانے اس سے آگے کتنی مدت ہوگی۔ اس لئے بظاہر اہل انجیل کی مدت عمل کو زیادہ اور اہل قرآن کی مدت عمل کو کم قرار دینا خلافِ واقعہ لگ رہا ہے۔

جواب: اس سوال کا جواب کافی تلاش وجستجو کے باوجود مجھے کہیں نہیں ملا، کیونکہ اس سوال سے کسی نے تعرض نہیں کیا، سب اسی مفروضے پر بحث کرتے آئے ہیں کہ اہل انجیل کی مدت عمل زیادہ ہے، اس لئے اس کا کوئی واضح جواب تو نہیں ملا لیکن شاید اس کا یہ جواب ممکن ہو کہ یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت نبی کریم ﷺ تک کا زمانہ مراد ہے۔ اہل انجیل اگرچہ بعد میں آئے ہیں لیکن اہل انجیل انہی کو کہا جائے گا جو تورات پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر بھی ایمان رکھتے ہیں، ورنہ جو لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ رکھیں تو وہ اہلِ انجیل کہلانے کے مستحق نہیں ہے جیسا کہ اہل قرآن اس وقت تک مسلمان کہلانے کے مستحق نہیں ہیں جب تک حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لائیں، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی ایمان لانے والے تھے، لہٰذا ان کی مدت عمل اور اہل تورات کی مدتِ عمل

باہم مدغم ہوگئی ہے اور مدغم ہونے کی وجہ سے انہوں نے یہ کہا کہ **"اکنا اکثر عملاً"** یہ توجیہہ میری سمجھ میں آتی ہے لیکن اس کی تصریح نہیں دیکھی، اور یہ توجیہہ خالی از اشکال بھی نہیں ہے۔

(حاشیہ نمبر۲ صفحہ ۷۹) میں لکھا ہے **"هذا علی وجه التمثيل والتشبيه فلا يلزم منه السوية من كل جهة"۔**

لیکن اصل میں بات یہ ہے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ تمثیل اور تشبیہ میں **"تسوية"۔ "من كل الجهة"** نہیں ہوتا لیکن ممثّل فیہ میں تو تسویۃ ہونا چاہئے اور ممثّل فیہ یہاں **"ما بين العصر الی غروب الشمس"** ہے۔ اس لئے یہ عبارت صحیح معنی میں اشکال کا جواب نہیں بنتی ہے۔

دوسرا جواب

دوسرا جواب یہ بھی ممکن ہے کہ یہ فضیلت صرف صحابہ کرام ﷺ کو حاصل ہو کہ انہیں دو دو قیراط ملے، اور ظاہر ہے صحابہ کرام ﷺ کا زمانہ اہل انجیل کے کل زمانہ سے کم تھا، واللہ اعلم۔[۴۲]

۵۵۸ ۔ حدثنا أبو كريب قال: حدثنا أبو أسامة، عن بريد، عن أبی بردة، عن أبی موسیٰ عن النبی ﷺ: "مثل المسلمين واليهود و النصاری كمثل رجل أستاجر قوما يعملون له عملا إلی الليل فعملو إلی نصف النهار فقالو: لا حاجة لنا إلی اجرک، فاستاجر اخرين فقال: اكملوا بقية يومكم و لكم الذی شرطت، فعملوا حتی اذا كان حين صلاة العصر قالو: لک ما عملنا، فاستاجر قوما فعملو بقية يومهم حتی غابت الشمس، واستكملوا اجر الفريقين".[أنظر: ۲۲۷۱][۴۳]

یہ اسی جیسی تمثیل ہے جو پہلے بیان کی گئی ہے البتہ تھوڑا سا فرق ہے۔ وہاں یہ تھا کہ وہ زوال کے وقت عاجز ہو گئے اور یہاں یہ ہے کہ انہوں نے خود کام چھوڑ دیا اور کہا کہ ہمیں تمہاری اجرت کی ضرورت نہیں ہے، پھر کچھ لوگوں کو کام کے لئے لیا اور ان سے طے کیا کہ تم اس وقت تک کام کرنا لیکن جب عصر کی نماز کا وقت آیا تو انہوں نے کہا بس ہمیں جتنا کرنا تھا کر لیا اب اور نہیں کرتے، پھر ایک اور قوم کو لیا **"فعملوا بقيّة يومهم حتی غابت الشمس، واستكملوا اجر الفريقين"** ہوسکتا ہے کہ وہی پہلی والی تشبیہ مراد ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوسری ہو، دونوں قول ہیں، لیکن بہر حال حاصل اس کا بھی وہی ہے۔

یعنی عشاء کی نماز احیاناً واحیاناً مختلف اوقات میں پڑھتے۔ آگے اس کی تفصیل بیان فرمائی کہ دیکھتے کہ جب لوگ جمع ہو گئے ہیں تو جلدی پڑھ لیتے اور دیکھتے کہ لوگ دیر سے آئے ہیں تو **"اخر"** تاخیر کر دیتے۔

---

[۴۲] **راجع للتفصيل: فيض الباری، ج:۲، ص:۱۱۸-۱۲۸۔**

[۴۳] **انفرد به البخاری.**

(۱۸) بابُ وقت المغرب

مغرب کے وقت کا بیان

"وقال عطاء : يجمع المريض بين المغرب والعشاء".

۵۵۹ ـ حدثنا محمد بن مهران قال : حدثنا الوليد قال : حدثنا الأوزاعي قال : حدثنا أبو النجاشي مولى رافع بن خديج ـ هو عطاء بن صهيب ـ قال : سمعت رافع ابن خديج يقول : كنا نصلي المغرب مع النبي ﷺ ، فينصرف أحدنا وإنه ليبصر مواقع نبله.

۵۶۰ ـ حدثنا محمد بن بشار قال: حدثنا محمد بن جعفر قال : حدثنا شعبة ، عن سعد، عن محمد بن عمرو بن الحسن بن علي قال : قدم الحجاج فسألنا جابر بن عبدالله فقال : كان النبي ﷺ يصلي الظهر بالهاجرة ، والعصر والشمس نقية ، والمغرب اذا وجبت ، والعشاء أحيانا وأحيانا ، إذا رآهم إجتمعوا عجل ، وإذا رآهم أبطؤا أخر . والصبح كانوا أو كان النبي ﷺ يصليها بغلس . [أنظر: ۵۶۵]

حدیثِ باب سے شافعیہ کا استدلال

یہ وہ حدیث ہے جس سے شافعیہ استدلال کرتے ہیں کہ نماز فجر کا غلس میں پڑھنا افضل ہے۔ حنفیہ کا کہنا ہے کہ اسفار میں پڑھنا افضل ہے۔

حنفیہ کا استدلال

حنفیہ کی دلیل سنن اربعہ میں حدیث ہے **"اسفروا بالفجر فانه اعظم للأجر".**[۴۴]

حنفیہ کہتے ہیں یہ قولی حدیث ہے اور غلس والی فعلی حدیث ہے اور جب تعارض ہو تو قولی کو ترجیح ہوتی ہے۔

توجیح

اور صحابہ کرام ﷺ جو یہ فرما رہے ہیں کہ آنحضرت ﷺ غلس میں پڑھتے تھے، اصل میں غلس کہتے ہیں جھٹ پٹے کو اور جھٹ پٹہ ایسا لفظ ہے جس سے مختلف لوگ مختلف اوقات مراد لیتے ہیں۔ اب جس وقت ہم نماز فجر پڑھنے آتے ہیں تو اس وقت ہلکا ہلکا اندھیرا ہوتا ہے، اگر کوئی شخص اس کو غلس کہہ دے، جھٹ پٹہ سے تعبیر کر دے تو یہ کوئی بعید نہیں ہے اور دوسرا آدمی اسی کو اسفار سے تعبیر کر دے اس لئے کہ تھوڑی روشنی بھی ہوتی ہے تو یہ بھی

---

۴۴ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: اعلاء السنن، ج: ۲، ص: ۲۰ - ۴۰.

کوئی بعید نہیں ہے۔ جب حدیث میں یہ ہے کہ آپ ﷺ غلس میں پڑھتے تھے جیسا کہ یہاں آیا ہے اور ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ **"اسفرو بالفجر"** تو دونوں میں تطبیق اس طرح دی جاسکتی ہے کہ وہ ایسا وقت ہوتا تھا کہ اگر کوئی کہنے والا غلس کہے تو یہ بھی ممکن تھا اور اگر کوئی اسفار کہے تو یہ بھی ممکن تھا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ حضور اقدس ﷺ غلس میں نماز پڑھتے تھے اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ بالکل چوپٹ اندھیرا ہوتا تھا یہ نتیجہ نکالنا مشکل ہے، لہٰذا تطبیق دینی چاہئے کہ ایسے وقت میں پڑھے جس میں ہلکا سا اندھیرا بھی ہو اور کچھ روشنی بھی ہوگئی ہو، کم از کم شروع ایسے وقت میں کرے، اس طرح دونوں حدیثوں پر عمل ہو جاتا ہے اور یہی حنفیہ کا مؤقف ہے۔

"جمع بين الصلوتين" سے متعلق بحث پیچھے گزر چکی ہے یہاں امام بخاری رحمہ اللہ نے جو ترجمۃ قائم کیا ہے **"يجمع المريض بين المغرب و العشاء"** اس سے بظاہر اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ کی حدیث کو حالتِ مرض پر محمول کیا ہے کہ آپ نے مدینہ میں جمع بین الصلوٰتین مرض کی وجہ سے فرمائی لیکن اس تاویل کا ضعف پہلے گزر چکا ہے کہ یہ تصور کرنا بڑا مشکل ہے کہ پورے مدینہ کے سارے مسلمان بیک وقت ایسے بیمار ہوگئے تھے جس کی وجہ سے سب کو جمع بین الصلوتین کی حاجت پیش آ گئی۔

(۱۹) باب من كره أن يقال للمغرب: العشاء

اس شخص کا بیان جس نے اس کو مکروہ سمجھا ہے کہ مغرب کو عشاء کہا جائے

۵۶۳ ــ حدثنا أبو معمر. هو عبدالله بن عمرو. قال: حدثنا عبد الوارث، عن الحسين قال: عبدالله بن بريدة قال: حدثني عبدالله المزني أن النبي ﷺ قال: "لا تغلبنكم الأعراب على إسم صلاتكم المغرب" قال: و تقول الأعراب: هي العشاء. [۴۵، ۴۶]

حضرت عبداللہ المزنی ﷺ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا **"لا تغلبنكم الأعراب على إسم صلوتكم المغرب"** اعرابی لوگ مغرب کی نماز کے نام کے بارے میں تم پر غلبہ نہ پائیں۔ آگے راوی نے خود تفسیر کردی کہ **قال: و تقول الاعراب: "هي العشاء"** اعرابی لوگ مغرب کی نماز کو عشاء کہتے تھے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان اعرابی لوگوں سے مغلوب ہو کر تم بھی مغرب کی نماز کو عشاء سے تعبیر کرنے لگو، اس کو عشاء سے تعبیر نہ کرو بلکہ مغرب ہی کہو، بعض حضرات مغرب کو **"العشاء الأولى"** اور عشاء کو **"العشاء الآخرة"** کہنے لگے تھے، آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا کہ اس نام سے مغلوب نہ ہو

---

۴۵ لا يوجد للحديث مكررات.

۴۶ وفي مسند احمد ، اول مسند البصريين ، باب حديث عبد الله بن مغفل المزني ، رقم : ۱۹۶۴۴ .

بلکہ مغرب کو مغرب ہی کہو۔

صورت حال یہ تھی کہ اعرابی لوگ مغرب کو عشاء کہتے تھے اور عشاء کو عتمہ کہتے تھے۔ عتمہ اس لئے کہتے تھے کہ "اعتم ۔ یعتم" کے لفظی معنی دودھ دوہنا، یہ عرب لوگ رات کے وقت اپنی بکریوں اور اونٹنیوں کا دودھ نکالا کرتے تھے، اس لئے انہوں نے اس کا نام عتمہ رکھا ہوا تھا۔ چونکہ عشاء کی نماز بھی اسی وقت پڑھی جاتی تھی اس لئے انہوں نے عشاء کی نماز کو بھی "**صلوٰۃ العتمہ**" کہنا شروع کر دیا اور مغرب کو عشاء کہنا شروع کر دیا۔

آنحضرت ﷺ نے اعراب کے اس نام پر اعتراض فرمایا اور صحابۂ کرام ؓ کو تاکید فرمائی کہ مغرب کو مغرب کہو اور عشاء کو عشاء کہو۔ مغرب کو عشاء اور عشاء کو "**صلوٰۃ العتمہ**" کہنے سے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے۔

عشاء اور عتمہ میں فرق

دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ اسی فرق کو یہاں بیان فرما رہے ہیں۔

فرق یہ ہے کہ اعرابی لوگ مغرب کو عشاء کہتے تھے آنحضرت ﷺ نے اس پر شدت سے نہی فرمائی "**لا یغلبنکم الاعراب**" اس لئے کہ بعض جگہ ایسا ہوتا ہے کہ جہاں نام بدلنے سے حقیقت میں کوئی تبدیلی یا التباس پیش نہیں آتا، ایسی جگہ نام کی تبدیلی زیادہ سے زیادہ مکروہ تنزیہی کہلائے گی، خلاف اولیٰ کہیں گے لیکن جہاں نام کی تبدیلی سے التباس پیدا ہونے کا اندیشہ ہو ایسی جگہ نام کی تبدیلی بالکل جائز نہیں ہوگی۔

اعراب جو مغرب کو عشاء کہتے تھے اس میں التباس کا اندیشہ تھا اس لئے کہ عشاء دوسری نماز کا نام ہے لہٰذا اس سے سختی سے منع فرمایا۔ اور عشاء کو عتمہ کہنے سے التباس کا اندیشہ نہیں تھا لہٰذا اس کو ناپسند تو فرمایا لیکن اس پر اتنی سخت نہی نہیں فرمائی۔

عشاء کو عتمہ کہنا ناپسندیدہ ہے

آگے امام بخاری رحمہ اللہ اس کی وضاحت فرما رہے ہیں کہ اگر کوئی عتمہ کہے تو یہ ناجائز نہیں ہے لیکن ناپسندیدہ ہے اور ناپسند ہونے کی دو وجہ ہیں:

ایک وجہ تو یہ ہے کہ شریعت نے جس چیز کا جو نام مقرر فرمایا ہے مسلمان کو چاہئے کہ وہ اس نام کا احترام بھی کرے اور تحفظ بھی کرے۔ قرآن کریم میں ہے "**و من بعد صلوٰۃ العشاء**" تو قرآن کریم نے صلوٰۃ العشاء نام لے کر فرمایا، اب بلا وجہ اس نام سے عدول کرنا اور اس کو تبدیل کرنا پسندیدہ نہیں ہے، پتہ چلا کہ نام کے اندر بھی حسن و قبح ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اعرابیوں نے عتمہ نام ایک دنیوی مشغلہ کی وجہ سے رکھا تھا جو دودھ دوہنے سے

متعلق ہے اور جس کا پس منظر بھی اچھا نہیں ہے۔ بعض شراح نے فرمایا کہ اعراب لوگ رات کو اس لئے دودھ دوہتے تھے کہ دن کو لوگ جمع ہو جاتے اور کوئی مانگتا تو دینا پڑتا تھا لہٰذا رات کو دوہتے تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے اور کوئی مانگنے نہ آئے۔

گویا اس وقت کو دودھ دوہنے کے لئے منتخب کرنا بخل پر مبنی تھا، لہٰذا ایک ایسا دنیوی عمل جو بخل پر مبنی ہے ایک افضل العبادات کو اس کے نام سے موسوم کرنا یہ پسندیدہ بات نہیں ہے، لیکن چونکہ کوئی تلبیس بھی نہیں ہے اس لئے بالکل ناجائز اور حرام بھی نہیں کہا۔

بخلاف مغرب کا نام عشاء رکھنے مین چونکہ اس میں تلبیس ہے، اس لئے بالکل سختی سے منع فرمایا۔

(۲۰) باب ذکر العشاء والعتمة و من راٰه واسعا،

عشاء اور عتمہ کا ذکر اور جس نے عشاء اور عتمہ دونوں کہنا جائز خیال کیا ہے

وقال أبو هريرة عن النبی ﷺ :" اثقل الصلاة على المنافقين العشاء و الفجر". وقال : " لو يعلمون ما فى العتمة والفجر"، قال أبو عبدالله : والإ ختيار أن يقول: العشاء، لقوله تعالىٰ: ﴿ و مِنۢ بَعۡدِ صَلَاةِ الۡعِشَاءِ﴾[النور: ۵۸] و يذكر عن أبى موسىٰ قال: كنا نتناوب النبى ﷺ عند صلاة العشاء فأعتم بها. وقال ابن عباس و عائشة: أعتم النبى ﷺ بالعشاء. و قال بعضهم عن عائشة : أعتم النبى بالعتمة. و قال جابر : كان النبى ﷺ يصلى العشاء . وقال أبو برزة: كان النبى ﷺ يؤخر العشاء. و قال أنس: "أخر النبى ﷺ العشاء الأخرة. وقال ابن عمر وأبو أيوب وابن عباس: صلى النبى ﷺ المغرب و العشاء.

ترجمۃ الباب سے مقصود بخاریؒ

"باب ذکر العشاء والعتمة" الخ عشاء کے ساتھ عتمہ کا لفظ بھی ذکر فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ بعض سلف نے عتمہ کے لفظ سے بھی عشاء کو تعبیر کیا ہے۔

"و من رآه واسعا" اور یہ باب اس شخص کی دلیل میں ہے جو اس معاملے میں وسعت سمجھتا ہے یعنی اس کے نزدیک عشاء کو عتمہ سے تعبیر کرنے کی گنجائش موجود ہے۔

" و قال أبو هريرة عن النبی ﷺ : أثقل الصلوٰة على المنافقين العشاء و الفجر".

حضرت ابو ہریرہؓ نے نبی کریم ﷺ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ منافقوں پر سب سے زیادہ دو نمازیں گراں ہوتی ہیں ایک عشاء اور دوسری فجر۔

اب یہ اس بات کی دلیل پیش کر رہے ہیں کہ صحابۂ کرام ﷺ بکثرت عشاء کا لفظ استعمال کرتے تھے بعض نے کبھی کبھی عتمہ کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔

ایک جگہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ **"یعلمون مافی العتمة و الفجر"** اگر لوگ عشاء اور فجر کی فضیلتوں کو جان لیں تو (بعض احادیث میں یہ الفاظ ہیں) وہ آئیں چاہے ان کو گھٹنوں کے بل چل کر آنا پڑے۔

یہاں خود حضور اقدس ﷺ نے عتمہ کا لفظ عشاء کے لئے استعمال فرمایا، معلوم ہوا کہ عتمہ کا لفظ استعمال کرنا جائز ہے۔

"قال أبو عبداللہ: و الإختیار أن یقول العشاء"۔

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اولیٰ اور پسندیدہ یہ ہے کہ عشاء کا لفظ استعمال کریں۔

"لقوله تعالى: و من بعد صلوٰة العشاء"۔

اللہ ﷻ نے قرآن کریم میں یہی لفظ استعمال فرمایا ہے اور جو لفظ قرآن میں استعمال کیا گیا ہے وہی اولیٰ اور پسندیدہ ہوگا۔

"یذکر عن أبی موسیٰ قال : کنا نتناوب النبی ﷺ صلوٰة العشاء فاعتم بها" حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ سے یہ حدیث منقول ہے، خود امام بخاری رحمہ اللہ اس کو موصولاً ذکر کریں گے کہ جب یہ اپنے قبیلے کے ساتھ حضور اقدس ﷺ کے پاس آئے تھے تو کہیں باہر پڑاؤ ڈال لیا تھا اور باری باری حضور اقدس ﷺ کے پاس عشاء کی نماز پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے، یہاں لفظ عشاء کا استعمال کیا لیکن فرمایا **"اعتم بها"** حضور اقدس ﷺ نے یہ نماز اندھیرے میں پڑھی۔ **"اعتم"** کے معنی ہے وقت العتمۃ میں داخل ہو جانا۔

"وقال ابن عباس و عائشة: اعتم النبی ﷺ بالعشاء" انہوں نے نماز کے لئے عشاء کا لفظ استعمال کیا۔

"و قال بعضهم عن عائشة: أعتم النبی ﷺ بالعتمة" یہاں نام بھی عتمہ ذکر کیا، معلوم ہوا سب جائز ہے۔

و قال جابر: کان النبی ﷺ یصلی العشاء.

و قال أبو برزة: کان النبی ﷺ یؤخر العشاء . و قال انس: أخر النبی ﷺ العشاء الآخرة. وقال ابن عمر و أبو أیوب و ابن عباس: صلی النبی ﷺ المغرب و العشاء.

یہ سب حضرات زیادہ تر عشاء کا لفظ استعمال کر رہے ہیں۔

۵۶۴ ـ حدثنا عبدان قال: أخبرنا عبد اللہ ، قال: أخبرنا یونس عن الزهری قال سالم: أخبرنی عبد اللہ قال صلی لنا رسول اللہ ﷺ لیلة صلاة العشاء. و هی التی یدعو

الناس العتمة. ثم انصرف علیه الصلاة و السلام فاقبل علینا فقال: "أرائیتم لیلتکم هذه، فان راس مائة سنة منها لا یبقی ممن هو علی ظهر الارض أحد"[راجع: ۱۱۶]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں "**صلی لنا رسول اللہ ﷺ لیلة صلوٰة العشاء و هی التی یدعو الناس العتمة**" حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے خود عشاء کا لفظ استعمال فرمایا لیکن ساتھ کہہ دیا کہ یہ وہ نماز ہے جس کو لوگ عتمہ کے نام سے پکارتے ہیں۔

"**ثم انصرف** علیہ السلام **فاقبل علینا فقال**" عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد آپ ﷺ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تمہیں آج کی رات کے بارے میں بتاؤں "**فان رأس مائة سنة منها لا یبقی ممن هو علی ظهر الأرض أحد**" اس رات کے بعد جو سو سال ہوں گے اس رات میں ان لوگوں میں سے جو اس وقت زمین کی پشت پر ہیں کوئی شخص باقی نہیں رہے گا، یعنی سو سال بعد جب یہی رات آئے گی تو آج جتنے لوگ زمین پر موجود ہیں ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اب صحیح تاریخ تو معلوم نہیں کہ آپ ﷺ نے کون سی رات میں یہ بات ارشاد فرمائی تھی لیکن وصال سے پہلے ہی کسی وقت فرمائی ہوگی، چنانچہ سب سے آخر میں جن صحابی کی وفات ہوئی وہ حضرت ابو الطفیلؓ ہیں اور اس وقت ان کی عمر سو سال کے قریب تھی اور یہ پہلی صدی ہجری کا بالکل آخری وقت تھا۔ سو سال کے بعد کسی کا زندہ رہنا ثابت نہیں۔

حدیثِ باب سے حضرت خضر علیہ السلام کی موت پر استدلال

اس حدیث سے بعض لوگوں نے حضرت خضر علیہ السلام کی موت پر بھی استدلال کیا ہے۔

یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا نہیں؟

بعض حضرات نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے سو سال بعد جو لوگ اس وقت زمین کی پشت پر موجود ہیں ان میں سے کوئی زندہ نہیں رہے گا، اگر حضرت خضر علیہ السلام اس وقت زندہ تھے تو یقیناً سو سال کے بعد مر گئے ہوں گے۔

جو لوگ حضرت خضر علیہ السلام کی حیات کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہاں ذکر "**علیٰ ظهر الارض**" کا ہے اور وہ "**علی الارض**" ہیں ہی نہیں، کہاں ہیں؟ یہ اللہ جل جلالہ ہی جانیں۔ اس واسطے وہ حضرات کہتے ہیں کہ اس سے ان کی وفات کا کوئی استدلال نہیں بنتا اور حیات کا بھی نہیں بنتا، حیات اور وفات دونوں کی کوئی واضح دلیل نہیں ہے۔[۴۷]

۴۷ وفی المقام أبحاث ذكرها العینی فی العمدة، ج: ۴، ص: ۸۷، فمن شاء فلیرجع إلیه.

صوفیائے کرام رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہماری حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوتی رہتی ہے، جب وہ یہ کہتے ہیں تو "**اذا لم تری الهلال فسلّم........**" **الخ**.

لہٰذا خواہ مخواہ اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، نہ عقیدۃً ان کی حیات ماننا ضروری ہے اور نہ وفات ماننا ضروری ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی ملاقات ایک ایسے جن سے ہوئی جو صحابیؓ تھے، واقعہ کچھ اس طرح سے بیان کیا گیا ہے کہ ان کے بادشاہ کے ساتھ بڑے تعلقات تھے، ایک دن یہ اپنے کمرے میں بیٹھے تھے کہ بادشاہ کا قاصد آیا اور کہا کہ بادشاہ صاحب نے آپ کو بلایا ہے، یہ چل دیئے، ان کو ایک پالکی یعنی ڈولی میں بٹھا دیا۔ ڈولی کے اوپر پردے پڑے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے آدمی کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔

چنانچہ وہ پالکی لے کر چلے، تھوڑی دیر کے بعد انہیں محسوس ہوا کہ پالکی ہوا میں اڑ رہی ہے، چنانچہ انہوں نے باہر دیکھا تو واقعی وہ ہوا میں اڑ رہی ہے، سمجھ گئے کہ کچھ چکر ہے۔ وہ پالکی ایک پہاڑی پر لے جا کر اتاری گئی، انہوں نے وہاں دیکھا کہ سب لوگ سیاہ لباس پہنے کھڑے ہیں، پوچھا بھائی یہ کیا قصہ ہے۔ بتایا گیا کہ ہمارا شہزادہ مر گیا ہے اس کا ماتم ہو رہا ہے۔

اتنا تو سمجھ گئے کہ یہ جنات ہیں، پوچھا کہ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ کہا کہ ابھی آپ کو پتہ چل جائے گا، جب لے گئے تو دیکھا کہ بادشاہ کا دربار لگا ہوا ہے، اس میں ان کو پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے کہا ہم نے آپ کو اس لئے بلایا ہے کہ آپ نے ہمارے بیٹے کو قتل کیا ہے، انہوں نے کہا میں نے آپ کے بیٹے کو قتل نہیں کیا۔ بادشاہ نے کہا کل رات آپ اپنے کمرے میں تھے وہاں ایک سانپ آیا تھا آپ نے اس سانپ کو مار دیا تھا، وہ اصل میں سانپ نہیں تھا بلکہ ہمارا بیٹا تھا جو اس شکل میں متشکل تھا۔

اب یہ بہت پشیمان ہوئے کہ میں نے تو سانپ سمجھ کر مارا تھا مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ سانپ ہے یا جن۔

بادشاہ نے کہا اچھا ہم پہلے اپنے ایک مفتی صاحب سے مسئلہ پوچھیں گے چنانچہ تھوڑی دیر بعد ایک نورانی صورت والے بزرگ آئے، ان کے سامنے مسئلہ پیش کیا گیا تو انہوں نے کہا "**سمعت رسول اللہ ﷺ باذنی هاتین بقول من تزیا بغیر زیّه فدمه هدر**".

جو شخص کسی دوسرے بھیس میں آجائے تو اس کا خون ہدر ہے، لہٰذا ان پر قصاص نہیں آتا، چنانچہ ان کو رہا کر دیا گیا اور واپس بھیج دیا گیا، چونکہ وہ صحابیؓ تھے اس لئے اس کے بعد یہ حدیث سناتے تو یوں کہتے "**حدثنی مفتی الجن قال سمعت رسول اللہ ﷺ من .... واللہ أعلم**".

یہ واقعہ اپنے بزرگوں سے بھی بکثرت سنا ہے اور بہت سی کتابوں میں بھی لکھا ہے لیکن جسے سند متصل کہتے ہیں ایسی سند متصل نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مجھے اس واقعہ کی صحت میں ایک شبہ ہے اور وہ شبہ یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ صحیح ہوتا تو ساری قوم حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ پر ٹوٹ پڑتی اور روایت حدیث حاصل کرتی کیونکہ اس سے سند عالی ہو جاتی لیکن ایسا کہیں منقول نہیں دیکھا کہ لوگ اہتمام کے ساتھ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے پاس جاتے ہوں اور روایت حاصل کرتے ہوں۔

اور ایک بات حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کے وعظ میں دیکھی کہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جن کو دیکھنے سے تابعیت حاصل نہیں ہوتی، کیونکہ اول تو تابعی ہونے کے لئے قرب زمانی شرط ہے، **لقوله عليه السلام : "ثم الذين يلونهم"** دوسرے یہ رویت جسمانی آنکھ سے نہیں ہوئی، باطنی آنکھ سے ہوئی، اس لئے یہ خواب کی رویت کے مشابہ تھی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

سوال: بہت ساری جگہوں پر نمازوں کے دوسرے نام رکھے ہوئے ہیں مثلاً ظہر کو پیشین اور عصر کو دیگر وغیرہ اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: ان ناموں کو ناجائز اور حرام تو نہیں کہیں گے لیکن پسندیدہ نہیں ہیں، اس لئے کہ شریعت نے جو نام رکھے ہیں انہی ناموں سے موسوم کرنا چاہیے اور ان کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

سوال: ایک شخص قرب قیامت میں **"حدثنا رسول الله ﷺ"** کہتا ہوا ظاہر ہوگا، کیا اس کو صحابی کہیں گے؟

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے اگر موت خضر علیہ السلام تسلیم کر لی جائے تو پھر یہ شخص کون ہوگا؟

جواب: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی ایک کتاب ہے **" الاصابة فی معرفة الصحابة "** یہ وہ کتاب ہے جس میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات لکھے ہیں۔ اس میں انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام کے حالات بھی لکھے ہیں اور ان کی حیات کے مسئلہ پر بھی بہت لمبی بحث کی ہے اور بہت سی روایات نقل کی ہیں لیکن آخر میں جو خلاصہ بنتا ہے وہ یہ ہے کہ کوئی ایک روایت بھی اتنی پکی نہیں ہے جس سے استدلال کیا جا سکے۔ سوال میں جو روایت پیش کی ہے یہ مجھے یاد نہیں ہے، لیکن حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں بہت سی روایات حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ذکر کی ہیں۔ [۴۸]

نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ کوئی پکی روایت نہیں ہے جس سے حیات پر استدلال ہو سکے۔

---

[۴۸] ملاحظہ فرمائیں: الإصابة، ج: ۲، ص: ۲۸۶ - ۳۳۴، دار الجيل، بيروت، ۱۴۱۲ھ.

(۲۲) باب فضل العشاء

نمازِ عشاء کی فضیلت کا بیان

۵۶۶ ۔ حدثنا يحيى بن بكير قال: حدثنا الليث، عن عقيل، عن ابن شهاب، عن عروة أن عائشة أخبرته قالت: أعتم رسول الله ﷺ ليلة بالعشاء. و ذلک قبل أن يفشو الاسلام فلم يخرج حتى قال عمر: نام النساء و الصبيان، فخرج فقال لأهل المسجد: ماينتظرها أحد من أهل الأرض غيركم. [أنظر: ۵۶۹، ۸۶۲، ۸۶۴][۴۹]

نمازِ عشاء کی فضیلت

آپ ﷺ دیر سے نماز کے لئے تشریف لائے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا "**نام النساء و الصبیان**" عورتیں اور بچے سو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب لوگ سارا دن محنت کرتے اور آخر شب سے بھی پہلے اٹھتے، تہجد پڑھتے، اس وقت بجلی نہیں تھی، مغرب سے پہلے کھانا کھالیتے، عام طور پر عرب مغرب کے بعد جلد سو جانے کے عادی تھے، اب یہ انتظار میں بیٹھے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "**نام النساء و الصبیان**" آپ تھوڑی دیر بعد تشریف لائے اور مسجد والوں سے فرمایا۔ "**ماینتظرها أحد من أهل الأرض غیرکم**" اس نماز کا تمہارے سوا اور کوئی روئے زمین پر انتظار نہیں کر رہا ہے۔ فضیلت بیان فرمائی کہ یہ وہ نماز ہے جس کے انتظار میں دنیا میں تمہارے سوا اور کوئی نہیں جاگتا، اللہ جل جلالہ نے تمہیں یہ فضیلت بخشی ہے کہ تم اس کے انتظار میں جاگتے ہو، یہ فضیلت متعدد احادیث میں آرہی ہے۔

۵۶۷ ۔ حدثنا محمد بن العلاء قال: أخبرنا أبو أسامة، عن بريد، عن أبي بردة، عن أبي موسىٰ قال: كنت أنا و أصحابي الذين قدموا معي في السفينة نزولا في بقيع بطحان. والنبي ﷺ بالمدينة. فكان يتناوب النبي ﷺ عند صلاة العشاء كل ليلة نفر منهم فوافقنا النبي ﷺ أنا و أصحابي وله بعض الشغل في بعض أمره، فاعتم بالصلاة حتى أبهارا

---

[۴۹] وفي صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب وقت العشاء وتأخيرها، رقم: ۱۰۰۸، وسنن النسائي، كتاب المواقيت، باب آخر وقت العشاء، رقم: ۵۳۲، ومسند احمد، باقي مسند الأنصار، باب حديث السيدة عائشة، رقم: ۲۲۹۳۰، ۲۳۳۴۹، ۲۳۶۲۴، ۲۵۱۳۲، وسنن الدارمي، كتاب الصلاة، باب مايستحب من تأخير العشاء، رقم: ۱۱۸۷.

لليل، ثم خرج النبي ﷺ فصلى بهم ، فلما قضى صلاته قال لمن حضره: "على رسلكم، أبشروا، أن من نعمة الله عليكم أنه ليس أحد من الناس يصلي هذه الساعة غير كم. أو قال: . ما صلى هذه الساعة أحد غيركم". لا يدري أي الكلمتين قال. قال أبوموسى : فرجعنا فرحىٰ بما سمعنا من رسول الله ﷺ. [50، 51]

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اور میرے وہ ساتھی جو میرے ساتھ کشتی میں آئے تھے، یہ حبشہ چلے گئے تھے اور پھر تقریباً غزوۂ خیبر کا زمانہ تھا جب یہ حبشہ سے آئے تھے تو فرماتے ہیں میں اور میرے ساتھی جو کشتی میں آئے تھے بقیع بطحان میں اتر گئے تھے، یہ مدینہ منورہ کے قریب ایک وادی ہے، جس کو بطحان کہتے ہیں اور بقیع اصل میں ہر اس زمین کو کہا جاتا ہے جہاں جھاڑیاں وغیرہ اگی ہوئی ہوں جیسے بقیع الغرقد مشہور ہے تو یہ بقیع بطحان میں اتر گئے تھے، "**والنبی ﷺ بالمدينة**" نبی کریم ﷺ مدینہ میں تھے۔ "**فكان يتناوب النبي ﷺ عند صلوٰة العشاء كل ليلة نفر منهم**" ہر رات ہمارے ساتھیوں میں سے کچھ لوگ باری باری عشاء کی نماز کے وقت حضور اقدس ﷺ کے پاس آیا کرتے تھے۔

"**فوافقنا النبي ﷺ أنا و أصحابي وله بعض الشغل في بعض أمره**".

اتفاق سے ایسا ہوا کہ میں اور میرا ساتھی اس حالت میں نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچے کہ آپ ﷺ اپنے بعض معاملات میں مشغول تھے اور مشغول ہونے کی وجہ سے عشاء کی نماز کے لئے باہر تشریف نہیں لائے۔

"**فاعتم بالصلاة حتى ابهارّ الليل**" آپ ﷺ دیر سے تشریف لائے اور نماز پڑھی یہاں تک کہ آدھی رات ہوگئی۔

"**فلما قضى صلوته قال لمن حضره**".

جب نماز پڑھ چکے تو حاضرین سے فرمایا: "**على رِسلِكم**".

لوگ جلدی جانے لگے تو فرمایا ٹھہرو، "**ابشروا ، أن من نعمة الله عليكم أنه ليس أحد من الناس يصلّي هذه الساعة غير كم أو قال: ما صلى هذه الساعة أحد غيركم**".

یعنی یا تو یہ فرمایا کہ اس وقت تمہارے سوا کوئی نماز نہیں پڑھ رہا ہے یا یہ فرمایا کہ یہ نماز تمہارے سوا کسی نے ماضی میں نہیں پڑھی۔

"**لا يدري أىّ الكلمتين قال**" راوی کو یہ یاد نہیں رہا کہ ان میں سے کون سی بات کہی۔

"**قال ابو موسىٰ: فرجعنا فرحا حتى بما سمعنا من رسول الله ﷺ**".

---

[50] لايوجد للحديث مكررات.

[51] وفي صحيح مسلم ، كتاب المساجد ومواضع الصلاة ، باب وقت العشاء وتأخيرها ، رقم : ١٠١٤ .

اس بات کی وجہ سے ہم خوش خوش لوٹ کر گئے۔

(۲۳) باب ما يكره من النوم قبل العشاء

عشاء کی نماز سے پہلے سونا مکروہ ہے

۵۶۸ ـ حدثنا محمد بن سلام قال: أخبرنا عبدالوهاب الثقفي قال: حدثنا خالد الحذاء، عن أبي المنهال، عن أبي برزة أن رسول الله ﷺ كان يكره النوم قبل العشاء والحديث بعدها. [راجع: ۵۴۱]

مقصود بخاری رحمہ اللہ

آنحضرت ﷺ عشاء سے پہلے سو جانے کو اور عشاء کے بعد باتیں کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔

عشاء کے بعد باتیں کرنے کا ذکر آگے آئے گا ان شا اللہ۔ یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ آپ ﷺ عشاء سے پہلے سونے کو ناپسند کرتے تھے۔

یہ اس شخص کے لئے ہے جس کو یہ اندیشہ ہو کہ اگر وہ سو گیا تو عشاء کے لئے بیدار نہیں ہوگا اور نماز فوت ہو جائے گی، لیکن اگر کسی کو یقین ہو کہ میں نے اٹھانے کا انتظام کر رکھا ہے اور ضرور اٹھ جاؤں گا، تو پھر سونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جیسا کہ اگلے باب میں اس کا بیان آرہا ہے۔

(۲۴) باب النوم قبل العشاء لمن غلب

جس شخص پر نیند کا غلبہ ہو اس کے لئے عشاء سے پہلے سونے کا بیان

۵۶۹ ـ حدثنا أيوب بن سليمان قال: حدثني أبو بكر، عن سليمان: قال صالح ابن كيسان: أخبرني ابن شهاب، عن عروة أن عائشة قالت: أعتم رسول الله ﷺ بالعشاء حتى ناداه عمر: الصلاة، نام النساء والصبيان، فخرج فقال: "ما ينتظرها أحد من أهل الأرض غيركم". قال ولا تصلي يومئذ الا بالمدينة؛ قال: و كانوا يصلون العشاء فيما بين أن يغيب الشفق إلى ثلث الليل الأول. [راجع: ۵۶۶]

یہ باب اس شخص کے لئے قائم کیا ہے جس کو عشاء سے پہلے غیر اختیاری طور پر نیند آگئی ہو۔

"غلب"، یعنی جس کے اوپر نیند کا غلبہ ہو گیا ہو، اس کا جواز حدیث کا یہ جملہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

فرمایا عورتیں اور بچے سو گئے ہیں تو آپ ﷺ نے ان کے سونے پر کوئی نکیر نہیں فرمائی۔

وہ بے چارے وہیں مسجد میں انتظار کرتے کرتے سو گئے، تو اس پر نکیر نہیں فرمائی، معلوم ہوا کہ عشاء سے پہلے ایسا سونا جس میں اٹھ جانے کا یقین ہو جائز ہے۔

"و لا تصلي يومئذ الا بالمدينة" یعنی عشاء کی نماز باجماعت اس وقت سوائے مدینہ کے اور کہیں نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے کہ جو لوگ مکہ میں رہ گئے تھے، وہ تو رات کو گھروں میں چھپ کر نمازیں پڑھتے تھے، جماعت سے نہیں پڑھ سکتے تھے اور دوسرے علاقوں میں ابھی اسلام نہیں پھیلا تھا، لہٰذا صرف مدینہ میں عشاء کی نماز باجماعت ہوتی تھی۔

۵۷۰ ـ حدثنا محمود قال: أخبرنا عبدالرزاق قال: أخبرني ابن جريج قال: أخبرني نافع قال: حدثنا عبدالله بن عمر أن رسول الله شغل عنها ليلة فاخرها حتى رقدنا في المسجد، ثم أستيقظنا، ثم رقدنا، ثم أستيقظنا، ثم خرج علينا النبي ﷺ ثم قال: "ليس أحد من أهل الأرض ينتظر الصلاة غير كم". وكان ابن عمر لا يبالي أقدمها أم أخرها إذا كان لا يخشى أن يغلبه النوم عن وقتها، و كان يرقد قبلها. [۵۲]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک رات حضور اقدس ﷺ کسی کام میں مشغول ہو گئے اور عشاء کی نماز کو مؤخر فرمایا **"حتى رقدنا في المسجد"** یہاں تک کہ ہم مسجد میں سو گئے، **"ثم أستيقظنا، ثم رقدنا ثم أستيقظنا"** یہی موضع ترجمہ ہے کہ عشاء سے پہلے سو گئے۔ **"ثم خرج علينا النبي ﷺ ...."**۔

"و كان ابن عمر لا يبالي أقدمها أم أخرها" حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نماز عشاء کو مقدم کرنے یا مؤخر کرنے میں کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے یعنی دونوں طریقوں کو جائز سمجھتے تھے۔

"إذا كان لا يخشى أن يغلبه النوم عن وقتها، و كان يرقد قبلها" بعض اوقات اس سے پہلے سو بھی جاتے تھے، یہی موضع ترجمہ ہے کہ سونا جائز ہے۔

۵۷۱ ـ قال ابن جريج: قلت لعطاء فقال: سمت ابن عباس يقول: اعتم رسول الله ﷺ ليلة بالعشاء حتى رقد الناس واستيقظوا، ورقدوا واستيقظوا؛ فقام عمر ابن الخطاب فقال: الصلاة. قال عطاء: قال ابن عباس: فخرج نبي الله ﷺ كأني أنظر إليه

---

[۵۲] وفي صحيح مسلم، كتاب المساجد و مواضع الصلاة، باب وقت العشاء وتأخيرها، رقم: ۱۰۱۱، وسنن النسائي، كتاب المواقيت، باب ما يستحب من تأخير العشاء، رقم: ۵۲۸، وسنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب في وقت العشاء الآخرة، رقم: ۳۵۶، ومسند احمد، مسند المكثرين من الصحابة، باب باقي المسند السابق، رقم: ۵۳۵۴، ۵۸۲۴.

الآن يقطر رأسه ماء واضعا يده على رأسه ، فقال : ((لو لا أن أشق على أمتي لأمرتهم أن يصلوها هكذا)). فاستثبتّ عطاء : كيف وضع النبيّ ﷺ يده على رأسه كما انبأه ابن عباس؟ فبدّد لي عطاء بين أصابعه شيئا من تبديد ، ثم وضع أطراف أصابعه على قرن الرأس ، ثم ضمها يمرّها كذلك على الرأس حتّى مسّت ابهامه طرف الأذن ممّا يلي الوجه على الصدغ وناحية اللحية ، لا يقصر ولا يبطش إلا كذلك. وقال : ((لو لا أن أشق على أمتي لأمرتهم أن يصلوها هكذا)). [أنظر: ۷۲۳۹]

"قال ابن جريج: قلت لعطاء: فقال: سمعت ابن عباس يقول أعتم رسول الله ﷺ ليلة بالعشاء" حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت "طرداً للباب" ذکر فرمادی کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک رات عشاء کی نماز میں بہت تاخیر کی۔ "حتى رقد الناس واستيقظوا، فقام عمر ابن الخطاب فقال: الصلاة" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہوکر آواز لگائی الصلوٰۃ،

"قال عطاء: قال ابن عباس: فخرج نبي الله ﷺ كانّي أنظر إليه الآن يقطر رأسه ماً أو اضعا يده على رأسه".

آپ ﷺ باہر تشریف لائے، گویا میں آپ ﷺ کو دیکھ رہا ہوں کہ آپ ﷺ کے سر اقدس سے پانی ٹپک رہا تھا اور آپ نے اپنا ہاتھ اپنے سر مبارک پر رکھا ہوا تھا، اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا "أن لو لا أشق على أمتي لأمرتهم أن يصلّوها هكذا.

فاستثبتّ عطاء : كيف وضع النبي ﷺ يده على رأسه كما انبأه ابن عباس؟ فبدّد لي عطاء بين أصابعه شيئا من تبديد ، ثم وضع أطراف أصابعه على قرن الرأس، ثم ضمها يمرّها كذلك على الرأس حتّى مسّت أبهامه طرف الأذن ممّا يلي الوجه على الصدغ وناحية اللحية، لا يقصر ولا يبطش إلا كذلك. وقال : ((لو لا أن أشق على أمتي لأمرتهم أن يصلوها هكذا)). پوری کیفیت بیان فرمائی۔

حضرت عطاء رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں جو سمجھا ہوں، وہ یہ ہے کہ انہوں نے بتلایا آپ ﷺ نے اپنا دست مبارک اپنے سر مبارک کے کنارے پر رکھا "فبدّدلی عطاء" الخ یعنی انگلیوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ کیا ہوا تھا، دست مبارک سر پر رکھا پھر اس کو نیچے لائے جیسے بالوں کو نچوڑنے کے لئے کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ آپ کا ابہام مبارک طرف اذن جو مما یلی الوجہ ہے اس کے صدغین سے آملا۔ پھر آپ ﷺ نے انگلیوں کے کنارے "على قرن الرّأس" رکھے "ثم ضمها" پھر ان کو ملالیا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کا عشق دیکھیں کہ اس کیفیت سے بظاہر کوئی حکم شرعی متعلق نہیں ہے لیکن پھر بھی

سرکار دو عالم ﷺ کی اس کیفیت کو بھی محفوظ رکھا اور آگے اپنے شاگردوں تک پہنچایا۔

عام شراح کی تشریح

آگے جملہ ہے **"لا یقصّر ولا یبطش إلا کذلک"**.

عام طور سے شراح نے اس کا یہ مطلب بیان فرمایا ہے کہ **"لا یقصّر"** کا معنی ہے جلدی کرنا اور **"لا یبطش"** کے معنی ہیں تاخیر کرنا، یعنی آپ ﷺ عشاء کی نماز میں جلدی یا تاخیر نہیں فرماتے تھے مگر اس طرح یعنی کبھی جلدی پڑھ لی اور کبھی نصف اللیل تک تاخیر کردی۔

ایک لطیف تشریح

مگر میری سمجھ میں یہ معنی نہیں آتے اس لئے کہ قصر کے معنی جلدی کرنا اور بطش کے معنی تاخیر کرنا لغۃً بھی غریب ہے، اگرچہ لغت میں موجود ہے مگر غریب ہے، لہٰذا میرے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ شاید یہاں مراد ہے کہ قصر کے معنی نچوڑنا اور بطش کے معنی پکڑنا یعنی آپ اس طرح بالوں کو نہ نچوڑتے تھے جن کا ابھی ذکر ہوا اور نہ پکڑتے تھے مگر اس طرح۔ اس کا ماقبل سے تعلق بھی ہے، لیکن چونکہ یہ معنی کہیں منقول نہیں دیکھے، اس واسطے جب تک حدیث یا قرآن کی تفسیر میں نقل نہ ہو کسی کے لئے اپنی عقل چلانا اچھا نہیں ہے۔

بعد میں نظر سے گزرا کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ بھی **"لامع الدراری"** میں یہی بات کہی ہے کہ یہ معنی ہیں، بہرحال ایک بزرگ کی تائید اس معنی کو حاصل ہے۔

(۲۵) باب وقتِ العشاء إلى نصف الليل،

عشاء کا وقت آدھی رات تک ہے

"وقال أبو برزة: كان النبي ﷺ يستحب تأخيرها".

اختلاف ائمہ

اس ترجمۃ الباب سے عشاء کا وقت بیان کرنا مقصود ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک عشاء کا وقت فجر تک رہتا ہے، البتہ نصف اللیل کے بعد مزید تاخیر کرنا مکروہ ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وقت العشاء نصف اللیل تک باقی رہتا ہے، اس سے آگے عشاء کا وقت نہیں ہے۔ [۵۳]

مقصود بخاری رحمہ اللہ

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس ترجمۃ الباب سے امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد امام شافعی رحمہ اللہ کی تائید کرنا ہے، اس لئے فرمایا **"باب وقت العشاء إلی نصف اللیل"**.

بعض دوسرے حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے حنفیہ کی تائید مقصود ہے، اس لئے کہ فرمایا **"وقت العشاء إلی نصف اللیل"** یہاں غایہ مغیہ میں داخل ہے، مطلب یہ ہے کہ نصف لیل تک نماز نہ پڑھنا، نصف لیل کے بعد پڑھنا۔

۵۷۲ ۔ حدثنا عبدالرحیم المحاربی قال: حدثنا زائدة، عن حمید الطویل، عن انس قال: آخر النبی ﷺ صلاة العشاء إلی نصف اللیل، ثم صلّی، ثم قال: "قد صلی الناس و ناموا. أما أنکم فی صلاة ما انتظرتموها".

وزاد ابن أبی مریم: أخبرنا یحیی بن أیوب قال: حدثنی حمید، أنه سمع انسا قال: کأنی أنظر إلی وبیص خاتمه لیلتئذ. [أنظر: ۶۰۰، ۶۶۱، ۸۴۷، ۵۸۶۹] [۵۴]

چنانچہ اس کی تائید میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث روایت کی ہے کہ **" اخر النبی ﷺ صلوٰة العشاء إلی نصف اللیل ثم صلّی"** نصف رات تک مؤخر کی پھر پڑھی۔ یعنی نصف لیل گزر چکی تھی، نصف ثانی میں پڑھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ نصف لیل گزرنے سے عشاء کا وقت ختم نہیں ہوتا، اس کے بعد بھی باقی رہتا ہے، اگر باقی نہ رہتا تو نصف لیل گزرنے کے بعد آپ عشاء کی نماز نہ پڑھتے۔ جب مابعد النصف، صلوٰۃ العشاء کا وقت ثابت ہوگیا تو پھر فجر تک ثابت ہوگیا **"لعدم القائل بالفصل"** اس لئے کہ اس کا کوئی قائل نہیں ہے کہ نصف رات کے بعد باقی رہتا ہے مگر فجر تک باقی نہیں رہتا۔ بلکہ دو ہی مذہب ہیں، ایک یہ کہ نصف لیل پر وقت ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا یہ کہ فجر پر ختم ہوتا ہے، درمیان میں ختم ہونے کا کوئی قائل نہیں ہے۔ لہٰذا جب مابعد النصف نماز

---

[۵۳] المجموع، ج:۳، ص:۳۹۔

[۵۴] وفی صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاة، باب وقت العشاء وتأخیرها، رقم: ۱۰۱۲، وسنن النسائی، کتاب المواقیت، باب آخر وقت العشاء، رقم: ۵۳۶، وسنن ابن ماجة، کتاب الصلاة، باب وقت صلاة العشاء، رقم: ۶۸۴، ومسند احمد، باقی مسند المکثرین، باب مسند أنس بن مالک، رقم: ۱۲۲۱۴، ۱۲۲۹۴، ۱۲۵۹۶، ۱۳۳۱۷.

پڑھنا ثابت ہے تو فجر تک نماز پڑھنے کا جواز بھی ثابت ہو گیا۔

مسلک حنفیہ پر امام طحاوی رحمہ اللہ کا استدلال

امام طحاوی رحمہ اللہ نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک پر متعدد روایتوں سے استدلال کیا ہے، جن میں سے بعض میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھائی **"حتی مضی عامة اللیل"** یہاں تک کہ رات کا اکثر حصہ چلا گیا تھا، یہ مابعد النصف پر دلالت کرتا ہے اس لئے اس سے حنفیہ کی تائید ہوتی ہے۔[۵۵]

بعض حضرات کا خیال ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تائید کر رہے ہیں، اس لئے کہ جو اثر اور روایت ذکر کی ہے وہ بھی بظاہر اسی کی تائید میں ہے۔

چنانچہ فرمایا **"وقال أبو برزة: کان النبی ﷺ یستحب تاخیرها"** آپ ﷺ عشاء کی تاخیر کو پسند فرماتے تھے اور شاید اس کو لانے کا مقصد یہ ہے واللہ اعلم کہ وہ تاخیر کو مستحب سمجھتے تھے، تاخیر کی کوئی غایت بیان نہیں کی کہ کب تک تاخیر پسند تھی، تو جب تک رات باقی رہتی ہے اس وقت تک تاخیر کا جواز ثابت ہوا۔

اس باب میں امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت انسؓ کی حدیث روایت کی ہے **"عن أنس قال..... ثم قال: قد صلی الناس و ناموا، أما إنکم فی صلوٰة ما انتظرتموها"۔**

یہاں ساتھ یہ تنبیہ بھی فرمادی کہ جب تک تم کسی نماز کا انتظار کر رہے ہو، اس وقت تک حکماً تم نماز میں ہو، لہٰذا جو تاخیر کی تکلیف ہوئی اس کی وجہ سے رنجیدہ نہیں ہونا چاہئے، بلکہ یہ تمہارے لئے اجر و فضیلت کا سبب و باعث ہے۔

وزاد ابن مریم : أخبرنا یحییٰ بن أیوب قال: حدثنی حمید، أنه سمع انسا قال: کأنی أنظر إلی و بیص خاتمه لیلتئذ.

حضرت انس ؓ فرماتے ہیں ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نبی کریم ﷺ کی اس خاتم کی چمک دیکھ رہا ہوں جو آپ ﷺ نے اس رات کو پہنی ہوئی تھی۔

حنفیہ فرماتے ہیں حضور اقدس ﷺ بعض مرتبہ بیان جواز کے لئے ایسا عمل بھی کرتے تھے جو امت کے لئے مکروہ ہے۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ حضرت ابوبرزۃ کے اثر سے استدلال ٹھیک نہیں بنتا، اس لئے کہ وہ اثر اتنی تاخیر پر دلالت کرتا ہے جتنی مستحب ہے۔

---

۵۵ عن عائشة أم المؤمنین رضی اللہ عنها أنها قالت اعتم النبی صلی اللہ علیه وسلم ذات لیلة حتی ذهب عامة اللیل وحتی نام اهل المسجد ثم خرج فصلی وقال إنه لوقتها لو لا أن أشق علی أمة وفی هذا أنه صلاها بعد مضی أکثر اللیل الخ، شرح معانی الآثار، ج: ۱، ص: ۱۵۸ و نصب الرایة، ج: ۱، ص: ۲۳۴.

(۲۶) باب فضل صلوٰۃ الفجر والحدیث

نماز فجر کی فضیلت کا بیان

یہ ان تراجم میں سے ایک ترجمہ ہے جن کی تشریح میں شراح حیران و پریشان و سرگرداں ہیں۔

"باب فضل صلوٰۃ الفجر" یہاں تک تو بات ٹھیک ہے، آگے جو **"والحدیث"** فرمایا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟

پہلی توجیہ

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہاں **"والحدیث"** کا کوئی موقع نہیں تھا، امام بخاری رحمہ اللہ سے کچھ وہم ہوگیا ہے یا بعد میں کچھ لکھنا چاہتے تھے لیکن اس کی تکمیل کا موقع نہیں ملا، یا کاتب سے وہم ہوگیا۔[۵۶]

دوسری توجیہ

علامہ عینی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ خواہ مخواہ وہم کی نسبت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے **"باب فضل صلوٰۃ الفجر والحدیث الوارد فیہ"** یعنی یہ باب صلوٰۃ فجر کی فضیلت کے بیان کا ہے اور اس حدیث کے بیان کا ہے جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہے۔[۵۷]

توجیہ کا جواب

اس توجیہ پر یہ اعتراض ہوا کہ پھر یہ صرف اسی باب میں کیوں ہے، دوسرے ابواب میں بھی کوئی نہ کوئی حدیث نقل کرتے ہیں وہاں یہ کیوں نہیں کہا؟ اس واسطے یہ توجیہ سمجھ میں نہیں آتی۔[۵۸]

تیسری توجیہ

بعض حضرات نے فرمایا یہاں مراد ہے **"والحدیث بعد صلوٰۃ الفجر"** یعنی فجر کی نماز کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے اور ساتھ یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ نماز فجر کے بعد باتیں کرنا پسندیدہ نہیں ہے، کیونکہ قرآن کریم کی آیت میں باری تعالیٰ نے فرمایا ہے **"وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس"** تو طلوع شمس سے

---

۵۶ فتح الباری، ج: ۲، ص: ۵۳۔

۵۷، ۵۸ عمدۃ القاری، ج: ۴، ص: ۹۹۔

پہلے یعنی نماز فجر کے بعد کے وقت کو تسبیح و تحمید میں گزارنا چاہئے، باتیں کرنا پسندیدہ نہیں ہے، اس صورت میں عبارت اس طرح ہوگی "**باب فضل صلوٰۃ الفجر والحدیث**". "**حدیث**" کا عطف "**فضل**" پر ہے نہ کہ "**صلوٰۃ الفجر**" پر، نماز کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے اور "**حدیث**" یعنی باتوں کا حکم بیان کرنا مقصود ہے۔

چوتھی توجیہ

ایک توجیہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بیان فرمائی کہ میرا خیال ہے امام بخاری رحمہ اللہ یہاں سے حدیث بعد صلوٰۃ العشاء کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں یعنی سمر بعد العشاء جس کے بارے میں آگے مستقل باب قائم کیا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جب وہ کسی ترجمۃ الباب کے تحت کوئی حدیث لاتے ہیں تو مقصود بالترجمہ حصہ کے علاوہ اگر اس حدیث سے ضمناً اور تبعاً کوئی اور بات بھی نکل رہی ہو تو بعض اوقات ترجمۃ الباب میں اس کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔[59]

یہاں جو حدیث بیان کی ہے اس کا اصل منشأ تو فجر کی نماز کی فضیلت بیان کرنا ہے لیکن حضور اقدس ﷺ کا جو ارشاد اس فضیلت کے سلسلے میں نقل کیا ہے وہ ایسا ارشاد ہے جو آپ ﷺ نے رات کے وقت میں فرمایا تھا اور ظاہر ہے عشاء کے بعد فرمایا تھا اس لئے کہ چودھویں کا چاند تھا اور چودھویں کا چاند پختہ اور زیادہ لامع عشاء کے بعد ہوتا ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ عشاء کے بعد باتیں کرنا مطلقاً ممنوع نہیں بلکہ جائز ہے۔ چونکہ اس حدیث سے یہ مسئلہ نکل رہا تھا اس لئے ترجمۃ الباب میں اس کی طرف اشارہ کر دیا اور فرمایا "**باب فضل صلوٰۃ الفجر والحدیث**" یعنی "**والحدیث بعد العشاء**" اس ترجمۃ الباب کی یہ چار بنیادی توجیہات کی گئی ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

۵۷۳ ـ حدثنا مسدد قال: حدثنا یحییٰ عن اسماعیل قال: حدثنا قیس: عن جریر ابنِ عبداللّٰه ؛ کنا عند النبی ﷺ إذ نظر إلی القمر لیلة البدر فقال: "أما إنکم سترون ربکم کما ترون هذا لا تضامون. أو لا تضاهون. فی رؤیته، فان استطعتم أن لا تغلبوا علی صلاة قبل طلوع الشمس و قبل غروبها فافعلوا". ثم قال: ﴿ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا﴾ [طه: ۱۳۰]. [راجع: ۵۵۴]

حضرت قیس بن حازم کہتے ہیں مجھ سے حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہم چودھویں رات کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، آپ ﷺ نے چاند کی طرف دیکھ کر فرمایا "**أما انکم سترون ربکم کما ترون هذا**

[59] فیض الباری، ج:۲، ص: ۱۳۳.

لا تضامون فی رؤیته" تم اپنے پروردگار کوایسے دیکھو گے جیسے اس چاند کو دیکھتے ہو، دھکا پیل کے بغیر یعنی ایسے دیکھو گے کہ آپس میں دھکا پیل نہیں کرو گے، یا یہ فرمایا "**لا تضاهون**" کہ تمہارے اوپر کوئی اشتباہ نہ ہوگا۔

"**فان استطعتم ان لا تغلبوا علی صلوٰة قبل طلوع الشمس و قبل غروبها فافعلوا**" لہٰذا اگر تم یہ کرسکو کہ طلوع شمس اور غروب شمس سے پہلے نماز کے بارے میں اپنے نفس سے مغلوب نہ ہو تو ضرور کر لینا کہ اللہ جل جلالہ کی زیارت ممکن ہو۔

۵۷۴ ـ حدثنا هدبة بن خالد قال: حدثنا همام قال: حدثني أبو جمرة عن أبي بكر بن أبي موسىٰ عن أبيه أن رسول الله ﷺ قال: "من صلى البردين دخل الجنة" و قال ابن رجاء: حدثنا همام عن أبي جمرة أن أبا بكر بن عبدالله بن قيس أخبره بهذا. حدثنا اسحاق عن حبان قال: حدثنا همام قال: حدثنا أبو جمرة عن أبي بكر ابن عبدالله عن أبيه عن النبي ﷺ مثله.

"**بردین**" سے فجر اور عصر کی نماز مراد ہے، برد کے اصل معنی ٹھنڈے کے ہوتے ہیں، چونکہ یہ دو نمازیں بھی ٹھنڈے وقت میں پڑھی جاتی ہیں اس لئے ان کو بردین کہا جاتا ہے، تو اس حدیث میں ان دونوں نمازوں کی خصوصی فضیلت بیان فرمائی۔

(۲۷) باب وقت الفجر

نماز فجر کے وقت کا بیان

۵۷۷ ـ حدثنا اسماعيل بن أبي اوس عن أخيه، عن سليمان، عن أبي حازم أنه سمع سهل بن سعد يقول: كنت استحر في أهلي ثم يكون سرعة بي أن أدرك صلاة الفجر مع رسول الله ﷺ. [أنظر: ۱۹۲۰]

یعنی میں اپنے گھر والوں کے ساتھ سحری کرتا تھا "**ثم تكون سرعة بي**" پھر مجھے جلدی ہوتی تھی کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پالوں یعنی آپ ﷺ جلدی پڑھاتے تھے اس لئے جلدی جانے کی کوشش کرتا تھا۔

۵۷۸ ـ حدثنا يحيىٰ بن بكير قال: أخبرنا الليث، عن عقيل، عن ابن شهاب قال: أخبرني عروة بن الزبير أن عائشة أخبرته قالت: كن نساء المؤمنات يشهدن مع رسول الله ﷺ صلاة الفجر متلفعات بمروطهن ثم ينقلبن إلى بيوتهن حين يقضين الصلاة لايعرفهن أحد من الغلس. [راجع: ۳۷۲]

پیچھے یہی حدیث گزری ہے وہاں **"من الغلس"** کا لفظ نہیں تھا بظاہر یہ راوی کا ادراج ہے اور ابن ماجہ کی روایت میں اس کی صراحت بھی ہے وہاں ہے **"تعنی من الغلس"** یعنی راوی کہتا ہے کہ ان کی مراد یہ تھی کہ اندھیرے کی وجہ سے عورتیں نہیں پہچانی جاتی تھیں۔[۶۰]

اس سے معلوم ہوا کہ یہ جملہ روایت میں نہیں ہے، اصل روایت اس طرح ہے کہ وہ کہہ رہی ہیں کہ خواتین چادروں میں لپٹی ہوئی ہوتی تھیں، اس لئے، ان کو کوئی پہچانتا نہیں تھا۔

غالباً انہوں نے یہ اس سیاق میں فرمایا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عورتوں کو مسجد میں آنے سے منع کر دیا تھا، بعض لوگوں نے کہا کہ حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں تو آتی تھیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرما رہی ہیں کہ وہ زمانہ اور تھا صبح کے وقت چادروں میں لپٹی ہوئی آتی تھیں، کوئی ان کو نہیں پہچانتا تھا، اب فتنے کا زمانہ آ گیا ہے، اُس پر قیاس نہیں کر سکتے۔

راوی یہ سمجھے کہ اندھیرے کی وجہ سے نہیں پہچانی جاتی تھیں، اس لئے غلس کو ذکر کیا، لہٰذا اس سے غلس کی فضیلت پر استدلال درست نہیں۔ یہ مسئلہ تفصیل سے گزر چکا ہے۔

(۲۸) باب من أدرک من الفجر رکعة

اس شخص کا بیان جو فجر کی ایک رکعت پائے

۵۷۹ ۔ حدثنا عبداللّٰه بن مسلمة عن مالک، عن زید بن أسلم ، عن عطاء بن یسار، و عن بسر بن سعید، و عن الأعرج یحدثونه عن أبی هریرة أن رسول اللّٰه ﷺ قال: " من أدرک من الصبح رکعة قبل أن تطلع الشمس فقد أدرک الصبح ، ومن أدرک رکعة من العصر قبل أن تغرب الشمس فقد أدرک العصر" [راجع: ۵۵۶]

(۲۹) باب من أدرک من الصلاة رکعة

اس شخص کا بیان جس نے نماز کی ایک رکعت پالی

۵۸۰ ۔ حدثنا عبداللّٰه بن یوسف قال: أخبرنا مالک عن ابن شهاب، عن أبی سلمة بن عبدالرحمٰن، عن أبی هریرة أن رسول اللّٰه ﷺ قال: "من أدرک رکعة من الصلاة

---

[۶۰] عن عائشة قالت کن نساء المؤمنات......فلا یعرفهن أحد تعنی من الغلس ، سنن ابن ماجة ، کتاب الصلاة ، باب وقت صلاة الفجر ، رقم : ۶۶۱.

فقد أدرک الصلاة" [راجع: ۵۵۶]

(۳۰) باب الصلاة بعد الفجر حتی ترتفع الشمس

فجر کے بعد آفتاب بلند ہونے تک نماز پڑھنے کا بیان

۵۸۱ ـ حدثنا حفص بن عمر قال: حدثنا عشام، عن قتادة، عن أبی العالیة، عن ابن عباس قال: شهد عندی رجا ل مرضیون وأرضاهم عندی عمر أن النبی ﷺ نهی عند الصلاة و بعد الصبح حتی تشرق الشمس، و بعد العصر حتی تغرب.

حدثنا مسدد قال: حدثنا یحیی، عن شعبة، عن قتاده قال: سمعت أبا العالیة عن ابن عباس قال: حدثنی ناس بهذا.

۵۸۲ ـ حدثنا مسدد قال: حدثنا یحییٰ بن سعید عن هشام قال: أخبرنی أبی قال: أخبرنی ابن عمر قال: قال رسول الله ﷺ : " لا تحروابصلاتکم طلوع الشمس و لا غروبها". [أنظر: ۵۸۵، ۵۸۹، ۱۱۹۲، ۱۶۲۹، ۳۲۷۳][۱۷]

۵۸۳ ـ وقال: حدثنی ابن عمر قال: قال رسول الله ﷺ ((إذا طلع حاجب الشمس فاخروا الصلاة حتی ترتفع . و اذا غاب حاجب الشمس فاخروالصلاة حتی تغیب)) تابعه عبدة . [أنظر : ۳۲۷۲]

۵۸۴ ـ حدثنا عبید بن اسماعیل ، عن أبی أسامة عن عبید الله، عن خبیب بن عبدالرحمٰن، عن حفص بن عاصم ، عن أبی هریرة: ان رسول الله ﷺ نهی عن بیعتین و عن لبستین و عن صلاتین؟ نهی عن الصلاة بعد الفجر حتی تطلع الشمس، و بعد العصر حتی تغرب الشمس، و عن اشتمال الصماء، و عن الاحتباء فی ثوب واحد یفضی بفرجه الی السماء، و عن المنابذة و الملامسة.[راجع: ۳۶۸]

یہ کئی احادیث ہیں جن میں فجر کے بعد سے سورج نکلنے تک اور عصر کے بعد سے سورج غروب ہونے تک نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔

---

۱۷ وفی صحیح مسلم ، کتاب صلاة المسافرین وقصرها ، باب الأوقات التی نهی عن الصلاة فیها، رقم: ۱۳۶۹، وسنن النسائی ، کتاب المواقیت ، باب النهی عن الصلاة عند طلوع الشمس ، رقم : ۵۶۰ ، ومسند أحمد ، مسند المکثرین من الصحابة ، باب مسند عبد الله بن عمر بن الخطاب ، رقم : ۴۳۸۳، ۴۴۶۵، ۴۶۰۸، ۴۶۵۳، ۴۶۹۴، ۵۵۷۰ ، وموطأ مالک ، کتاب النداء للصلاة ، باب النهی عن الصلاة بعد الصبح وبعد العصر ، رقم : ۴۶۰.

حنفیہ کا مسلک

حنفیہ کہتے ہیں کہ ان اوقات میں نوافل پڑھنے کی ممانعت ہے، فرائض اور قضا نماز پڑھ سکتے ہیں، اس لئے کہ ان اوقات میں نماز کے ممانعت وقت کے مکروہ ہونے کی نہیں ہے، وقت تو کامل ہے، یہی وجہ ہے کہ اس دن کی فجر اور عصر جائز ہے لہٰذا حدیث میں نوافل کی ممانعت ہے فرض پڑھ سکتے ہیں اور اگر کوئی قضا نماز پڑھنا چاہے تو قضا بھی پڑھ سکتا ہے لیکن کسی قسم کے نوافل پڑھنا جائز نہیں ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔[۶۲]

امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کا بھی آپس میں اختلاف ہے۔

شوافع کا مسلک

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس وقت میں فرائض کے ساتھ ساتھ نوافل **ذوات الاسباب** بھی جائز ہیں۔ نوافل **ذوات الاسباب** کے معنی یہ ہیں کہ جن کے پڑھنے کا سبب اختیار عبد کے سوا بھی موجود ہو یعنی وہ خاص خاص مواقع جن میں نبی کریم ﷺ نے نفل پڑھنے کی ترغیب دی ہے جیسے تحیۃ المسجد، تحیۃ الوضو۔[۶۳]

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس قسم کے نوافل پڑھنا بھی جائز نہیں یہاں تک کہ طواف کی رکعتیں بھی جائز نہیں۔

حنفیہ کا استدلال

حنفیہ کا استدلال ان احادیث سے ہے جن میں آپ ﷺ نے ان اوقات میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔[۶۴]

شوافع کا استدلال

شوافع کا استدلال اس حدیث سے ہے جس میں کہا گیا ہے: **"اذا دخل أحدكم المسجد**

۶۲، ۶۳ أنظر: فيض البارى، ج:۲، ص:۱۳۶ - ۱۳۹، ﴿قلت﴾ (شاه محمد انور الكشميرى:) وقد بسطة ابن رشد فى "بداية المجتهد" أحسن بسط فراجعه من، ج:۱، ص:۷۴ - ۷۶، دار الفكر، بيروت.

۶۴ والحاصل أن الحنفية قالوا بكراهة تلك الأوقات كلها لأجل قيام الدليل واعترض عليه الشيخ ابن الهمام أن النهى فى هذين الوقتين أيضاً مطلقا كما الثلاثة المذكورة و تخصيص النص بالرأى لا يجوز ابتداً، فيض البارى، ج:۲، ص:۱۳۷.

فلیرکع رکعتین قبل أن یجلس". [۶۵]

جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں آئے تو دو رکعتیں پڑھ لے۔ شوافع کہتے ہیں کہ "اذا" عام ہے، جس وقت بھی آئے، لہٰذا عصر کے بعد کا وقت ہو یا مغرب کے بعد کا "اذا" سب کے عموم پر دلالت کرتا ہے۔

دوسرا استدلال حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہے، جو ابوداؤد اور ترمذی میں آئی ہے جس میں فرمایا کہ "**یا بنی عبد مناف لا تمنعوا أحداً طاف بهٰذا البیت و صلّی ایّة ساعة شاء من لیل أو نهار**۔ [۶۶]

جو اس بیت اللہ کا طواف کرے یا یہاں آکر نماز پڑھے اس کو منع نہ کرو، چاہے دن ہو یا رات ہو، معلوم ہوا طواف کی رکعتیں ہر وقت پڑھی جاسکتی ہیں۔

حنفیہ کی طرف سے استدلال کا جواب

جہاں تک "**اذا دخل أحدکم المسجد الخ**" کا تعلق ہے اگر وہاں "اذا" کو عام مان لیا جائے یعنی جس وقت بھی کوئی مسجد میں آئے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ عین طلوع اور غروب کے وقت بھی تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں جائز ہوں، حالانکہ اس کے جواز کے آپ بھی قائل نہیں ہیں۔

معلوم ہوا کہ "**اذا دخل أحدکم**" الخ کے معنی یہ ہیں کہ جب ایسے وقت میں آئے جب نماز پڑھنا جائز ہو اور حدیث باب سے معلوم ہو رہا ہے کہ بعد الفجر و بعد العصر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے، لہٰذا یہ "اذا" کے عموم میں بھی داخل نہیں ہے۔

دوسرے انداز میں اس کا جواب یوں ہوسکتا ہے کہ "**اذا دخل أحدکم**" الخ میں مقصود اصلی تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم دینا ہے جو عبارۃ النص ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ نے "اذا" سے استدلال کیا ہے جو "**سیق الکلام لأجله**" نہیں ہے، لہٰذا ان کا استدلال باشارۃ النص ہے، اور "**نهیٰ رسول اللّٰه ﷺ**" الخ میں سوق کلام اسی لئے ہے کہ عصر کے بعد نماز پڑھنا مکروہ ہے، اس لئے حنفیہ کا استدلال بعبارۃ النص ہے اور اصول یہ ہے کہ جہاں عبارۃ النص اور اشارۃ النص میں تعارض ہو، وہاں ترجیح عبارۃ النص کو ہوتی ہے۔ [۶۷]

---

[۶۵] أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال : إذا دخل أحدکم المسجد فلیرکع رکعتین قبل أن یجلس ، موطأ مالک ، باب انتظار الصلاۃ والمشی إلیها ، ج: ۱ ،ص: ۱۶۲ ، رقم : ۳۸۶.

[۶۶] سنن الترمذی ، باب ماجاء فی الصلاۃ بعد العصر و بعد الصبح لمن یطوف ، ج:۳،ص: ۲۲۰ ، رقم : ۸۶۸ ، بیروت ، وسنن أبی داؤد ، باب الطواف بعد العصر ، ج: ۲،ص: ۱۸۰، رقم : ۱۸۹۴ ، دارالفکر .

[۶۷] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں : بدایة المجتهد ، ج: ۱،ص: ۱۵۱، ۱۵۲ ، دارالفکر ، بیروت.

دوسری دلیل کا جواب

جہاں تک حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی طواف والی حدیث کا تعلق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دراصل عبد مناف کعبہ کے پاسبان تھے، اُنہیں یہ کہا جا رہا ہے کہ تم اسے تالہ لگا کر بند کر کے مت رکھو، بلکہ حرم میں ہر وقت لوگوں کا داخلہ کھلا رہنا چاہئے، اگر کوئی طواف کرنا چاہے تو تم بحیثیت دربان اسے مت روکو۔ اب یہ پڑھنے والے شخص کا فریضہ ہے کہ وہ ایسے وقت کا انتخاب کرے جو نا جائز نہ ہو۔ [۶۸]

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے فجر کے بعد طواف کیا، پھر مدینہ منورہ جانا تھا تو طواف کی دو رکعتیں وہاں نہیں پڑھیں بلکہ روانہ ہو گئے، یہاں تک کہ ذوطواء کے مقام پر پہنچے اور وہاں دو رکعتیں پڑھیں۔ اگر فجر کے بعد طواف کی دو رکعتیں پڑھنا جائز ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ مقام ابراہیم پر نماز پڑھ کر روانہ ہوتے، معلوم ہوا کہ ایسا کرنا جائز نہیں۔ [۶۹]

(۳۱) باب لا تتحرى الصلاة قبل غروب الشمس

غروب آفتاب سے پہلے نماز کا قصد نہ کرے

۵۸۷ ـ حدثنا محمد بن أبان قال: حدثنا غندر قال: حدثنا شعبة عن أبي التياح قال: سمعت حمران بن أبان يحدث عن معاوية قال: إنكم لتصلون صلاة لقد صحبنا رسول الله ﷺ فما رايناه يصليها و لقد نهى عنها، يعني الركعتين بعد العصر. [أنظر: ۳۷۶۶]

---

[۶۸] ويؤيد هذا المعنى ماورد في هذ الحديث عند ابن حبان من قوله ﷺ: يا بني عبد المطلب إن كان لكم من الأمر شئ فلا اعرفن أحد منكم أن يمنع من يصلي عند البيت أى ساعة شاء من ليل أو نهار، صريح فيما قلنا إنما نهاهم عن أن يمنعوا أحدا لأجل توليتهم بالبيت. أخرجه ابن حبان في صحيحه، ج:۴، ص:۴۲۰، دارالنشر مؤسسة الرسالة، بيروت، ۱۴۱۴ھ، كذا في "سبل السلام" ج:۱، ص:۱۱۴، واعلاء السنن، ج:۲، ص:۶۶.

[۶۹] وعند الطحاوى باسانيد عديدة أن عمر كان يعزر من كان يصلي بعد العصر وذلك بمحضر من الصحابة رضي الله عنهم ولم ينكر عليه أحد ايضاً وعند الطحاوى عنه أنه طاف قبل طلوع الشمس ولم يصل ركعتي الطواف حتى بلغ ذوطوى أخرجه موصولا والبخارى معلقاً وما ذلك إلا لخروج وقت الكراهة وقد صرح الترمذى بعبارة كاد أن تومى إلى إجماعهم على ذلك وهذا نصه: والذى إجتمع عليه أكثر أهل العلم على كراهية الصلاة بعد العصر الخ، فيض البارى، ج:۲، ص:۱۴۲.

حضرت معاویہ ؓ نے لوگوں سے فرمایا کہ تم ایسی نمازیں پڑھتے ہو کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہے لیکن کبھی آپ ﷺ کو پڑھتے نہیں دیکھا، بلکہ ان سے منع فرمایا، ان کی مراد عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھنا تھی جو کہ بعض صحابہ ؓ پڑھنے لگے تھے اور شاید پڑھنے کی وجہ یہ ہوگی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اقدس ﷺ جب بھی میرے گھر تشریف لاتے تو دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے کہ یہ حضور اقدس ﷺ کی خصوصیت تھی۔

اوقات ممنوعہ میں ائمہ کا اختلاف

اب تک بعد الفجر اور بعد العصر کی نماز کی ممانعت کا بیان تھا اور یہ ممانعت وقت کی کراہت کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ وقت کے مشغول بالفرائض ہونے کی وجہ سے تھی، لیکن تین اوقات ایسے ہیں جن میں نماز کی ممانعت وقت کی کراہت کی وجہ سے ہے، اور وہ تین اوقات یہ ہیں:

(۱) طلوع آفتاب کا وقت

(۲) غروب آفتاب کا وقت

اور

(۳) استواء کا وقت۔ [۷۰]

[۷۰، ۷۱، ۷۲] المسألة الأولى اتفق العلماء على أن ثلاثة من الأوقات منهي عن الصلاة فيها وهي وقت طلوع الشمس ووقت غروبها ومن لدن تصلي صلاة الصبح حتى تطلع الشمس.

واختلفوا في وقتين في وقت الزوال وفي الصلاة بعد العصر.

فذهب مالك وأصحابه إلى أن الأوقات المنهي عنها هي أربعة الطلوع والغروب وبعد الصبح وبعد العصر وأجاز الصلاة عند الزوال مطلقاً وذهب الجمهور إلى أنه مكروه مطلقاً.

المسألة الثانية اختلف العلماء في الصلاة التي لاتجوز في هذه الأوقات وذهب أبو حنيفة وأصحابه إلى أنها لا تجوز في هذه الأوقات صلاة بإطلاق لا فريضة مقضية ولا سنة ولا نافلة إلا عصر يومه قالوا فإنه يجوز أن يقضيه عند غروب الشمس اذا نسيه، واتفق مالك والشافعي أنه يقضي الصلوات المفروضة في هذه الأوقات.

وذهب الشافعي إلى أن الصلوات التي لا تجوز في هذه الأوقات هي النوافل فقط التي تفعل لغير سبب وأن السنن مثل صلاة الجنازة تجوز في هذه الأوقات الخ، راجع: بداية المجتهد، ج: ۱، ص: ۷۴، دار الفكر، بيروت، واعلاء السنن، ج: ۲، ص: ۵۹، وعمدة القاري، ج: ۴، ص: ۱۱۷.

جمہور کا مسلک

امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ یہ تینوں حضرات فرماتے ہیں کہ ان تینوں اوقات میں نماز پڑھنا منع ہے یہاں تک کہ سجدۂ تلاوت بھی منع ہے۔[۱]

امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ طلوع وغروب کے وقت تو نماز پڑھنا منع ہے لیکن استواء شمس کے وقت نماز کی ممانعت نہیں ہے، یعنی ان کے نزدیک دو وقت مکروہ ہیں طلوع وغروب، تیسرا وقت مکروہ نہیں ہے۔[۲]

امام مالک رحمہ اللہ کا استدلال

اس سلسلے میں ان کا استدلال ان کے اصولوں کے مطابق تعامل اہل مدینہ سے ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اہل مدینہ کو پایا وہ دوپہر کو نماز پڑھتے تھے، اس واسطے میں اسے مکروہ نہیں قرار دیتا۔[۳]

جمہور کا استدلال

جمہور کا استدلال احادیث مرفوعہ سے ہے، صحیح مسلم میں حضرت عقبہ بن عامر ﷺ کی حدیث ہے۔

"ثلاث ساعات كان رسول الله ﷺ ينهانا أن نصلي فيهن أو نقبر فيهن موتانا ..الخ.[۴]

ان میں ایک **"عند الطلوع"** دوسرا **"عند الغروب"** اور تیسرا **"عندما يقوم قائم الظهيرة"**.

ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ ﷺ کی روایت ہے وہ بھی استواء شمس کے وقت نماز کی ممانعت پر دلالت کرتی ہے۔[۵]

---

[۳] أما مالک فلأن العمل عنده المدينة لما وجده على الوقتين فقط ولم يجده على الوقت الثالث أعني الزوال أباح الصلاة فيه واعتقد أن ذلک النهي منسوخ بالعمل ، بداية المجتهد ، ج: ۱ ، ص: ۷۴ ، واعلاء السنن ، ج: ۲ ، ص: ۵۹ .

[۴] .....سمعت عقبة بن عامر الجهني يقول ثلاث ساعات كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ينهانا أن نصلي فيهن أو أن نقبر فيهن موتانا حين تطلع الشمس بازغة حتى ترتفع وحين يقوم قائم الظهيرة حتى تميل الشمس وحين تضيف الشمس للغروب حتى تغرب ، صحيح مسلم ، ج: ۱ ، ص: ۵۶۸ ، رقم : ۸۳۱ ، بيروت.

[۵] سنن ابن ماجة ، كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها ، باب ماجاء في الساعات التي تكره فيها الصلاة ، رقم: ۱۲۴۲ .

حضرت صنابحی سے ایک روایت مروی ہے۔[۷۶]

اور خود امام مالک رحمہ اللہ نے اپنی مؤطا میں روایت کی ہے اس میں بھی استواء شمس کے وقت نماز کی ممانعت کا ذکر ہے۔[۷۷]

لہٰذا جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ حضرت امام مالک رحمہ اللہ کو استواء والی حدیث نہیں پہنچی تھی، یہ بات درست نہیں ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کا ایک اہم اصول

امام مالک رحمہ اللہ کو استواء والی حدیث تو پہنچی تھی لیکن امام مالک رحمہ اللہ کا اصول یہ ہے کہ وہ مدینہ کے علماء کو دیکھتے ہیں جو فقہاء سبعہ ہیں اگر ان کا کسی عمل پر اجماع ہے اور بظاہر وہ حدیث کے خلاف ہے تو یہ کہتے ہیں کہ ضرور یہ حدیث منسوخ ہوگی ورنہ یہ سب حضرات اس کے خلاف کے قائل نہ ہوتے، گویا ان کے نزدیک اہل مدینہ کا تعامل حدیث کے خلاف ایک علت ہے، جب سارے اہل مدینہ اس کی مخالفت کررہے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ حدیث میں کوئی علت ہے، اگر علت نہ ہوتی تو سب لوگ اس کی مخالفت نہ کرتے۔[۷۸]

جمہور فقہاء کے نزدیک تعامل اہل مدینہ اس طرح حجت نہیں ہے جس کی وجہ سے حدیث مرفوع کو بھی رد کیا جاسکے۔

امام بخاری نے امام مالک رحمہما اللہ کے مذہب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ باب قائم کیا ہے **"باب من لم یکرہ الصلوٰۃ الا بعد الفجر و العصر"** یہ باب اس شخص کی حجت کے بیان میں ہے جو نماز کو مکروہ نہیں سمجھتا مگر دو اوقات میں یعنی فجر اور عصر کے بعد۔

استواء کے بارے میں کوئی حدیث امام بخاری رحمہ اللہ کی شرط پر نہ تھی اس لئے اس سلسلے میں انہوں نے کوئی حدیث روایت نہیں کی۔

(۳۳) باب ما یصلی بعد العصر من الفوائت و نحوها،

عصر کی نماز کے بعد قضا نمازیں اور اس کی مثل دوسری نمازوں کے پڑھنے کا بیان

وقال کریب عن أم سلمة: صلی النبی ﷺ بعد العصر رکعتین. و قال: شغلنی ناس

---

[۷۶] مختصر اختلاف العلماء، فی الصلاة نصف النهار، ج: ۱، ص: ۲۳۶.

[۷۷] موطأ مالک، کتاب النداء للصلاة، باب النهی عن الصلاة بعد الصبح وبعد العصر، ج: ۱، ص: ۲۱۹، رقم: ۵۱۲.

[۷۸] وقال مالک: وما أدرکت أهل الفضل والعباد الاوهم یهجرون ویصلون نصف النهار فی تلک الساعة، المدونة الکبری ج: ۱، ص: ۱۰۷، و فتح الباری، ج: ۲، ص: ۶۳، وعمدة القاری، ج: ۴، ص: ۱۱۷، والتمهید لإبن عبد البر، ج: ۴، ص: ۱۸.

من عبد القيس عن الركعتين بعد الظهر.

بعد العصر فوائت کا حکم

یہ دوسرا باب قائم کیا کہ عصر کے بعد قضا نمازیں پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ پڑھ سکتا ہے۔ یہاں اس واقعہ سے استدلال کیا جس میں نبی کریم ﷺ کا عصر کے بعد ظہر کی دو رکعتوں کی قضا کرنا منقول ہے۔

وفد عبدالقیس کی آمد کی وجہ سے ظہر کی دو رکعتیں چھوٹ گئیں تھیں، آپ ﷺ نے وہ عصر کے بعد قضا فرمائیں جس کا واقعہ تفصیل سے پیچھے گزر چکا ہے۔

استدلال اس طرح ہے کہ اگر چہ آپ ﷺ نے سنتوں کی قضا فرمائی لیکن یہ آپ کی خصوصیت تھی، امت کے لئے سنتوں کی قضا نہیں ہے، جب آپ نے سنتوں کی قضا کو عصر کے بعد گوارا فرمالیا تو فرض کی قضا اس وقت میں بطریق اولیٰ جائز ہوگی، یہ ہے وجہ **"مطابقة الحديث بالترجمة"**.

امت کے لئے ان دو رکعتوں کی قضا نہیں ہے کیونکہ جب حضرت امّ سلمہؓ نے پوچھا کہ **"أفنصليها اذ فاتتا"** اگر ہم سے کبھی فوت ہو جائیں تو ہم بھی ان کی قضا کریں تو آپ ﷺ نے صاف صاف فرمادیا **"لا"** تم نہیں، معلوم ہوا کہ یہ حضور اقدس ﷺ کی خصوصیت تھی۔

۵۹۲ ـ حدثنا موسىٰ بن اسماعيل قال: حدثنا عبدالواحد قال: حدثنا الشيباني قال: حدثنا عبدالرحمٰن بن الأسود، عن أبيه عن عائشة قالت: ركعتان لم يكن رسول الله ﷺ يدعهما سرا ولا علانية: ركعتان، قبل الصبح و ركعتان بعد العصر. [راجع: ۵۹۰]

"ركعتان لم يكن رسول الله ﷺ يدعها سرّا و علانية" یہ لفظ بعض اوقات اشکال پیدا کرتا ہے کہ آپ ﷺ یہ دو رکعتیں نہ سراً چھوڑتے تھے نہ اعلانیۃً، یعنی عصر کے بعد کی دو رکعتیں، حالانکہ ہم نے جو تحقیق عرض کی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی ابتدا حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں ہوئی تھی لیکن بعد میں آپ ہمیشہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں پڑھتے رہے جس کا حضرت عائشہؓ اور اُم سلمہؓ کے سوا کسی اور کو علم نہیں ہوا، پھر یہ کیسے فرمایا کہ **"سرّاً و علانيةً"** اگر اعلانیہ ہوتیں تو پھر صحابہ کرام ﷺ کو بھی پتہ ہوتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ سراً و اعلانیۃ کا تعلق خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہے کہ کبھی مجھ سے چھپ کر اور کبھی میرے سامنے پڑھتے تھے۔

(۳۴) باب التبكير بالصلاة في يوم غيم

بادل کے دنوں میں نماز سویرے پڑھنے کا بیان

یہ باب قائم کیا ہے کہ بادل والے دن نماز جلدی پڑھنا۔

۵۹۴ ــ حدثنا معاذ بن فضالة قال: حدثنا هشام عن يحيىٰ هو ابن أبي كثير، عن ابي قلابة أن أبا المليح حدثه قال: كنا مع بريدة في يوم ذي غيم فقال: بكروا بالصلاة فإن النبي ﷺ قال: "من ترك صلاة العصر حبط عمله". [راجع: ۵۵۳]

اس میں حدیث نقل کی ہے کہ ہم بادل والے دن حضرت بریدہ ؓ کے ساتھ تھے، انہوں نے فرمایا: "**بكروا بالصلوٰة فان النبي ﷺ قال: من ترك صلوٰة العصر حبط عمله**" عصر کی نماز جلدی پڑھو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص عصر کی نماز کو چھوڑ دے اس کا عمل حبط ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اصفرار شمس ہو جائے، وقتِ مکروہ شروع ہو جائے اور ہمیں بادلوں کی وجہ سے پتہ نہ چلے، اس لئے جلدی پڑھو۔

اس کا منشأ یہ ہے کہ جب بادل ہوں اس وقت احتیاط پر عمل کرنا چاہئے جہاں تعجیل میں احتیاط ہو وہاں تعجیل کرنی چاہئے اور جہاں تاخیر میں احتیاط ہو وہاں تاخیر کرنی چاہئے، جیسے مغرب میں احتیاط یہ ہے کہ تاخیر کی جائے کیونکہ اس میں اندیشہ ہے کہ شاید سورج غروب نہ ہوا ہو، اور بادلوں کی وجہ سے غروب معلوم ہو رہا ہو، لہٰذا تاخیر کی جائے۔

(۳۵) باب الأذان بعد ذهاب الوقت

وقت گذر جانے کے بعد نماز کے لئے اذان کہنے کا بیان

۵۹۵ ـ حدثنا عمران بن ميسرة قال: حدثنا محمد بن فضيل قال: حدثنا حصين، عن عبدالله بن أبي قتادة، عن أبيه قال: سرنا مع النبي ﷺ ليلة، فقال بعض القوم: لو عرست بنا يا رسول الله، قال: "أخاف أن تناموا عن الصلاة". قال بلال: أنا أوقظكم. فاضطجعو أواسند بلال ظهره إلى راحلته فغلبته عيناه فنام، فاستيقظ النبي ﷺ وقد طلع حاجب الشمس فقال: "يا بلال، أين ما قلت لا" قال: ما القيت على نومة مثلها قط. قال: "أن الله قبض أرواحكم حين شاء، وردها عليكم حين شاء، يا بلال قم فإذن بالناس

بالصلاة" فتوضأ، فلما ارتفعت الشمس وابياضت قام فصلى. [أنظر: ۷۴۷۱][۷۹]

قضا شدہ نمازوں کے لئے اذان کا حکم

یہاں حضور ﷺ نے قضا فرمائی اور حضرت بلال ؓ کو اذان کا حکم دیا، معلوم ہوا کہ اگر قضا نماز جماعت سے ادا کی جارہی ہو تو اس وقت اذان دینا مسنون ہے۔

البتہ فقہاء کرامؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حکم جماعت سے قضا کرنے کی صورت میں ہے اگر کسی تنہا آدمی کی نماز قضا ہو جائے تو اُسے اذان نہیں کہنا چاہئے بلکہ چپکے سے کسی جگہ پڑھ لینی چاہئے اپنی نماز کے قضا ہونے کا عام اعلان نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ جب کسی سے کوئی گناہ ہو جائے تو حتی الامکان اس کو چھپانا چاہئے نہ یہ کہ اس کا اعلان کرتا پھرے۔

حدیث کا آخری جملہ ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت بلال ؓ سے فرمایا اذان کہو۔ **"فتوضأ"** پس وضو کیا۔

"فلما ارتفعت الشمس وابياضّت قام فصلّٰى".

جب سورج بلند ہو گیا اور سفید ہو گیا یعنی اس کی زردی زائل ہو گئی تو اس وقت نماز پڑھی۔

یہ اس بارے میں حنفیہ کی دلیل ہے کہ اگر کوئی شخص نیند سے بیدار ہو تو اس کو نماز کے لئے سورج کے قدرے بلند ہونے کا انتظار کرنا چاہئے، اس سے پہلے نماز پڑھنا مکروہ ہے، کیونکہ حضور اقدس ﷺ نے طلوع شمس کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمایا جب تک ارتفاع شمس نہ ہو جائے۔

اور یہاں آپ ﷺ نے اس پر عمل بھی فرمایا کہ فوراً نماز نہیں پڑھی بلکہ انتظار فرمایا یہاں تک کہ سورج بلند ہو گیا پھر نماز پڑھی۔[۸۰]

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب نیند سے بیدار ہو اسی وقت نماز پڑھے، چاہے ابھی ارتفاع شمس نہ ہوا ہو۔ اور وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو آگے آنے والی ہے، **"من نسی صلوٰة فليصلها اذا ذکرها"** اس میں **"اذا"** عام ہے، لہٰذا جس وقت بھی یاد آجائے نماز پڑھو، چاہے وہ وقت مکروہ ہی کیوں نہ ہو۔

---

۷۹ وفي صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب قضا الصلاة الفائتة واستحباب تعجيل قضائها، رقم: ۱۰۹۹، وسنن النسائي، كتاب الإمامة، باب الجماعة للفائت من الصلاة، رقم: ۸۳۷، وسنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب في من نام عن الصلاة أو نسيها، رقم: ۳۷۲، ومسند احمد، باقي مسند الأنصار، باب حديث أبي قتادة الأنصاري، رقم: ۲۱۵۰۶، ۲۱۵۳۰.

۸۰ فيه أن الفوائت لا تقضى في الأوقات المنهي عن الصلاة فيها، واختلف أصحابنا في قدر الوقت الذي تباح فيه الصلاة بعد الطلوع. قال في الاصل: حتى ترتفع الشمس قدر رمح أو رمحين الخ، عمدة القاري، ج:۴، ص:۱۲۵، والبحر الرائق، ج:۱، ص:۲۶۳.

یہاں بھی حنفیہ کا استدلال عبارۃ النص سے ہے اور شافعیہ کا استدلال اشارۃ النص ہے اور عبارۃ النص کو اشارۃ النص پر ترجیح ہوتی ہے۔[۸۱]

(۳۶) باب من صلی بالناس جماعة بعد ذهاب الوقت

اس شخص کا بیان جو وقت گذرنے کے بعد لوگوں کو جماعت سے نماز پڑھائے

۵۹۶ ـ حدثنا معاذ بن فضالة قال: حدثنا هشام، عن يحيىٰ، عن أبي سلمة، عن جابر بن عبدالله: ان عمر بن الخطاب جاء يوم الخندق بعد ما غربت الشمس فجعل يسب كفار قريش، قال: يا رسول الله ما كدت أصلي العصر حتى كادت الشمس تغرب. قال النبي ﷺ: "والله ما صليتها"، فقمنا إلى بطحان فتوضأ للصلاة و توضأ نا لها، فصلى العصر بعد ما غربت الشمس، ثم صلى بعدها المغرب: [أنظر: ۵۹۸][۸۲]

قضا نماز با جماعت پڑھنے کی مشروعیت

یہ باب وقت گزرنے کے بعد با جماعت نماز پڑھنے کے بیان میں ہے یعنی قضا نماز کی جماعت کے بیان میں۔

اس میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خندق کے دن غروب شمس کے بعد آئے اور کفار قریش کو برا بھلا کہنے لگے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں نماز نہ پڑھ سکا یہاں تک کہ سورج غروب ہونے کے قریب ہوگیا، یعنی اس بنا پر برا بھلا کہنے لگے کہ ان کم بختوں نے ہماری نماز قضا کردی۔

"قال النبي ﷺ: والله ما صليتها" حضور ﷺ نے فرمایا کہ نماز تو میں نے بھی نہیں پڑھی ہے، خندق کھودنے میں اتنا مشغول رہا کہ نماز پڑھنے کا موقع نہ ملا یہاں تک کہ سورج غروب ہوگیا۔

"فقمنا إلى بطحان" ہم اٹھ کر گئے **"فتوضأ للصلوٰة و توضأنا لها، فصلى العصر بعد ماغربت الشمس ثم صلّى بعد ها المغرب"۔**

---

۸۱ فأما عبارة النص فهو ما سيق الكلام لأجله وأريد به قصدا واما اشارة النص فهي ما ثبت بنظم النص، أصول الشاشي، ص: ۹۹.

۸۲ وفي صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب الدليل لمن قال الصلاة الوسطى هي صلاة العصر، رقم: ۱۰۰۰. وسنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ماجاء في الرجل تفوته الصلوات بأيتهن يبدا، رقم: ۱۶۵، وسنن النسائي، كتاب السهو، باب إذا قيل للرجل صليت هل يقول لا، رقم: ۱۳۴۹.

یعنی غروب کے بعد پہلے ہم نے جماعت کے ساتھ عصر پڑھی، پھر مغرب کی نماز پڑھی، مراد یہ ہے کہ قضا نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا ثابت ہے۔

(۳۷) باب من نسی صلاۃ فلیصل إذا ذکر، ولا یعید إلا تلک الصلاۃ

اس شخص کا بیان جو کسی نماز کو بھول جائے تو جس وقت یاد آئے پڑھ لے اور صرف اسی نماز کا اعادہ کرے

" وقال ابراهیم : من ترک صلوٰۃ واحدۃ عشرین سنة لم یعد إلا تلک الصلوٰۃ الواحدۃ "۔

یہ باب اس شخص کے بارے میں ہے جو نماز پڑھنا بھول گیا ہو تو جب یاد آجائے اسی وقت پڑھ لے۔ پھر آگے فرمایا **" ولا یعید إلا تلک الصلوٰۃ "** اور نہیں لوٹائے گا مگر صرف وہی نماز۔

حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جو شخص بیس سال تک ایک نماز چھوڑے رہے وہ صرف اسی ایک نماز کا اعادہ کرے گا۔

"لا یعید إلا تلک الصلوٰۃ" کا مطلب اور اقوال شرّاح

"لا یعید إلا تلک الصلوٰۃ" کا کیا مطلب ہے؟ اس میں شراح کے مختلف اقوال ہیں:

پہلا قول

ایک مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اس سے ان لوگوں کا رد کرنا مقصود ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کی کوئی نماز قضا ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ اگلے وقت میں اس کی قضا کرے اور صرف اگلے وقت میں قضا کر لینا کافی نہیں ہے بلکہ اگلے دن جب دوبارہ اس قضا شدہ نماز کا وقت آئے گا تو اس وقت دوبارہ قضا کرے گا، مثلاً ایک شخص کی ظہر کی نماز قضا ہو گئی، اس نے عصر کے وقت اس کی قضا کر لی اور پھر عصر کی نماز پڑھ لی، ایک کام تو یہ ہو گیا، اب اگلے دن جب ظہر کا وقت آئے گا تو پچھلے دن جو ظہر کی نماز قضا ہوئی تھی اس کو دوبارہ پڑھے گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ اس نے عصر کے وقت قضا کر لی تھی لیکن چونکہ وہ اس کے فطری وقت میں نہ تھی

اس لئے اگلے دن اس کے وقت میں دوبارہ قضا کرے۔

اس سلسلے میں بعض روایات بھی ہیں، مثلاً ابوداؤد میں حضرت عمران بن حصین ﷺ کی روایت ہے۔ **"من أدرک منکم صلوٰۃ الغداۃ من غد صالحا فلیقض معھا مثلھا"**.[۸۳]

یہ روایت اس معاملے میں صریح ہے، مگر سلف میں سے اور فقہاء مشہورین میں سے کوئی بھی اس طرف نہیں گیا۔ **"کما ذکرہ الخطابی"**.

نیز صحیح مسلم میں حضرت ابوقتادہ ﷺ کی حدیث ہے **"فإذا کان الغد فلیصلھا عند وقتھا"** مگر یہ حدیث اس مفہوم پر صریح نہیں ہے کیونکہ اس کا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ اگلے دن وہی نماز اپنے وقت پر پڑھے۔[۸۴]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابوداؤد کے حوالے سے حضرت عمران بن حصین ﷺ کی جس حدیث کا ذکر کیا ہے اس میں ان سے وہم ہوا ہے، درحقیقت وہ ابوقتادہ ﷺ کی حدیث ہے، مگر خالد بن سمیر نے ان سے بالمعنی روایت کیا ہے اس میں ان سے غلطی ہوگئی ہے۔[۸۵]

لیکن اول تو یہ روایات سنداً ضعیف ہیں اور اگر ان میں سے کوئی قابلِ استدلال ہو تب بھی زیادہ سے زیادہ استحباب ثابت ہوتا ہے، تو بعض لوگوں نے کہا کہ اگلے دن بھی پڑھ لینا مستحب ہے۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ مستحب بھی نہیں ہے، شروع میں کسی وقت یہ حکم دیا گیا ہوگا بعد میں جو مشہور قاعدہ ہے اس پر عمل کیا گیا۔ چنانچہ خندق اور **"لیلۃ التعریس"** کے واقعہ میں جب حضور اقدس ﷺ کی نمازیں قضا ہوئیں تو صرف ان نمازوں کو قضا فرمایا اور اگلے دن ان کا اعادہ نہیں فرمایا۔[۸۶]

امام بخاری رحمہ اللہ **"لا یعید إلا تلک الصلوٰۃ"** سے ان روایات کی تردید کررہے ہیں کہ صرف اُسی نماز کا اعادہ کرے گا جو قضا ہوئی۔

وقال ابراھیم: "من ترک صلوٰۃ واحدۃ" الخ اگر بیس سال تک بھی ایک نماز چھوٹی رہی تو اسی ایک نماز کی قضا کرے گا، یہ نہیں کہ اگلے دن پھر دوبارہ اس کی قضا کرے۔

دوسرا قول

بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا منشأ دراصل ان حضرات پر رد کرنا ہے جو یہ کہتے تھے

---

۸۳ سنن أبی داؤد، باب فی من نام عن الصلاۃ أو نسیھا، ج: ۱، ص: ۱۲۰، رقم: ۴۳۸۔

۸۴ فتح الباری، ج۲ : ص ۷۱۔

۸۵ لامع الدراری، جلد ۱ : ص ۲۳۲، طبع قدیم۔

۸۶ عمدۃ القاری، ج: ۴، ص: ۱۳۰۔

کہ اگر کسی کی بہت ساری نمازیں قضا ہوگئیں تو ان میں ترتیب واجب ہے، کثرتِ فوائت سے بھی ترتیب ساقط نہیں ہوگی۔

فرض کریں ایک آدمی کی ظہر کی نماز قضا ہوگئی، اب اس کے ذمہ فرض تھا کہ پہلے ظہر پڑھے پھر عصر پڑھے لیکن اس نے ظہر نہیں پڑھی صرف عصر پڑھ لی، پھر مغرب کا وقت آیا تو اس کے ذمہ فرض تھا کہ پہلے ظہر پڑھے پھر عصر اور پھر مغرب پڑھے لیکن اس نے صرف مغرب پڑھی، پھر جب عشاء کا وقت آیا تو اس کے ذمہ فرض تھا کہ پہلے ظہر پڑھے پھر عصر، پھر مغرب اور پھر عشاء پڑھے، لیکن اس نے صرف عشاء پڑھ لی اور کئی روز تک کرتا چلا گیا اور ظہر نہیں پڑھی۔

اب جو لوگ کثرتِ فوائت سے بھی ترتیب کو ساقط نہیں مانتے، وہ کہتے ہیں کہ یہ آدمی اگر ایک ہفتہ بعد بھی ظہر کی قضا کرے گا تو صرف ایک نماز کی قضا نہیں کرے گا بلکہ پہلے قضا شدہ نماز اور پھر ہفتہ بھر کی نمازیں لوٹائے گا، اس کے بعد وقتی نماز پڑھے گا۔

امام بخاری رحمہ اللہ فرما رہے ہیں **"لا یعید إلا تلک الصلوٰۃ"** کہ کثرت فوائت کی صورت میں صرف فوت شدہ نماز کا اعادہ کرے گا، اسی کو ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کہتے ہیں جس نے بیس سال تک ایک قضا نماز نہیں پڑھی وہ اعادہ نہیں کرے گا مگر اس ایک نماز کا۔

تیسرا قول

بعض حضرات کہتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ رحمہم اللہ پر رد کرنا ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کا قول اختیار کرنا ہے۔

حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ رحمہم اللہ قضا فوائت میں ترتیب کے وجوب کے قائل ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ وجوب کے قائل نہیں۔

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک بھی کثرتِ فوائت کی صورت میں ترتیب ساقط ہو جاتی ہے لیکن جہاں کثرت نہ ہوئی ہو مثلاً پانچ نمازیں ہی ہیں تو وہاں ترتیب واجب ہے، لہٰذا اگر کسی کی فجر کی نماز قضا ہوگئی اس نے ظہر میں قضا نہیں کی، عصر میں نہیں کی، مغرب میں نہیں کی، عشاء میں نہیں کی تو ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں اگلے دن فجر میں پہلے گزشتہ روز کی فجر کی قضا کرے گا، پھر ظہر کی، پھر عصر کی، پھر مغرب کی، پھر عشاء کی اور اس کے بعد آج کی فجر کی نماز پڑھے گا، کیونکہ ترتیب واجب تھی اس لئے اس نے جو نمازیں بغیر ترتیب کے پڑھیں وہ نہیں ہوئیں، لہٰذا اب چھ کی چھ نمازوں کا اعادہ کرے گا۔

امام بخاری رحمہ اللہ اس کی تردید کر رہے ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ کا قول اختیار کرتے ہوئے فرما

رہے ہیں **"لا يعيد إلا تلك الصلوٰة"**.

یہ تین تشریحیں امام بخاری رحمہ اللہ کے اس قول کی کی گئی ہیں لیکن یہ تیسری تشریح بظاہر اس لئے صحیح نہیں ہے کہ آگے خود امام بخاری رحمہ اللہ نے وجوب ترتیب پر باب قائم کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جمہور کی طرح وہ بھی وجوبِ ترتیب کے قائل ہیں، لہٰذا وجوب ترتیب کے خلاف وہ کیوں باب قائم کریں گے؟

اس لئے پہلی دو تشریحیں راجح ہیں۔

۵۹۷ ـ حدثنا أبو نعيم و موسىٰ بن اسماعيل قالا: حدثنا همام، عن قتادة، عن أنس بن مالك عن النبي ﷺ قال: " من نسيي صلاة فليصل إذا ذكر، لا كفارة لها إلا ذلك ﴿ وَ أَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي ﴾ [طه: ۱۴] قال موسىٰ: قال همام: سمعته يقول بعد: ﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِلذِّكْرىٰ﴾ و قال حبان: حدثنا همام قال: حدثنا قتادة قال: حدثنا أنس عن النبي ﷺ نحوه.

یہاں حضرت انس ﷺ کی حدیث سے استدلال فرمایا کہ **"من نسيي صلوٰة فليصلّ إذا ذكر لا كفارة لها إلا ذلك"** جب یاد آجائے پڑھ لے اس کے سوا کوئی کفارہ نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ قضا کرنے سے اس کا کفارہ ہو جائے گا، اس کو اگلے دن دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۳۸) باب قضاء الصلاة الأولى فالأولى

قضا نمازوں کو ترتیب کے ساتھ پڑھنے کا بیان

۵۹۸ ـ حدثنا مسدد قال: حدثنا يحيىٰ عن هشام قال: حدثنا يحيى . هو ابن أبي كثير. عن أبي سلمة ، عن جابر قال: جعل عمر يوم الخندق يسب كفارهم و قال: يارسول الله! ما كدت أصلي العصر حتى غربت الشمس، قال: فنزلنا بطحان فصلىٰ بعد ما غربت الشمس ثم صلى المغرب. [راجع: ۵۹۶]

اختلاف ائمہ

یہ باب ترتیب کے بیان میں ہے یعنی نمازوں کو ترتیب کے ساتھ قضا کیا جائے، یہی جمہور کا مسلک ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ اس میں اختلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ترتیب واجب نہیں ہے۔

جمہور کا استدلال

جمہور کا استدلال اول تو خندق کے واقعہ سے ہے، جہاں آپ ﷺ نے ترتیب کے ساتھ نمازیں

پڑھائیں۔روایات اس بات پر متفق ہیں کہ آپ ﷺ نے ان چاروں نمازوں کی ادائیگی میں ترتیب کوملحوظ رکھا۔

دوسرا استدلال

جمہور کا دوسرا استدلال اس حدیث سے ہے جو امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں حضرت ابو جمعہ حبیب بن سباع سے روایت کی ہے کہ غزوۂ خندق میں ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مغرب کی نماز میں کچھ دیر ہوگئی آپ ﷺ نے مغرب کی نماز جماعت سے پڑھی بعد میں صحابہ ﷺ سے پوچھا کہ میں نے عصر کی نماز پڑھ لی تھی یا نہیں؟ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ نے عصر کی نماز بھی نہیں پڑھی تھی۔آپ ﷺ نے اقامت کہہ کر پہلے عصر کی نماز پڑھی اور پھر مغرب کی نماز دوبارہ پڑھی۔[۸۷]

یہ وجوب ترتیب پر بالکل صریح دلیل ہے، اگر ترتیب واجب نہیں تھی تو آپ ﷺ نے مغرب کی نماز کیوں دہرائی۔

تیسری دلیل

جمہور کی تیسری دلیل حضرت عبداللہ بن عمر ﷺ کا اثر ہے جو مؤطا امام محمد رحمہ اللہ میں نقل ہے، اس میں وجوب ترتیب کا خاص طور پر ذکر ہے۔ف:ا

نیز علامہ عینی رحمہ اللہ نے ابو حفص سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضرت ابن عمر ﷺ سے مرفوعاً یہ روایت نقل کی ہے کہ **"من نسی صلٰوۃ فلم یذکرھا إلا وھو مع الإمام فلیتم صلاتہ، فاذا فرغ من الصلاتہ فلیعد التی نسی ثم لیعد التی صلاھا مع الإمام".**[۸۸]

---

۸۷ أن أبا جمعة حبيب بن سباع وكان قد أدرك النبي صلى الله عليه وسلم أن النبي صلى الله عليه وسلم عام الأحزاب صلى المغرب فلما فرغ قال هل علم أحد منكم إني صليت العصر قالوا يا رسول الله ما صليتها فأمر المؤذن فأقام الصلاة فصلى العصر ثم أعاد المغرب ، مسند احمد ، مسند الشاميين ، حديث أبي جمعة حبيب بن سباع رضي الله عنه ، ج:۴، ص:۱۰۶ ، رقم : ۱۷۰۶۱ ، وعمدة القاري ، ج:۴، ص:۱۲۸ .

(ف ا) :من قوله فإذا سلم الإمام فليصل الصلاة التي نسي باتفاق ثم ليصل بعدها الأخرى التي صلاها مع الإمام وبهذا قال الأئمة الثلاثة ، شرح الزرقاني ، ج:۱، ص:۴۸۴.

۸۸ رواه البيهقي في سننه ، ج:۲، ص:۲۲۱ ، رقم : ۳۰۱۰ ، وقال العيني " وأخرجه أبو حفص بن شاهين مرفوعاً كذا في العمدة ، ج:۴، ص:۱۲۹ ، نصب الراية ، ج:۲، ص:۱۶۳ و لامع الدراري ، ج:۱ ، ص: ۲۳۳ .

(۳۹) باب ما یکره من السمر بعد العشاء

عشاء کی نماز کے بعد باتیں کرنا مکروہ ہے

السأمر من السمر والجمع السمار والسامر ها هنا فی موضع الجمع واصل السمر ضوء لونِ القمر و کانو یتحدثون فیه.

یہاں ''سمر'' بعد العشاء کا بیان ہے ''سمر'' لغۃً چاندنی کو کہتے ہیں اور اہل عرب کا طریقہ تھا کہ جب چاندنی رات ہوتی تو سب لوگ گھروں سے نکل آتے اور میدان میں جمع ہو کر گپ شپ کیا کرتے، اس گپ شپ کا نام بھی انہوں نے ''سمر'' رکھ دیا۔

۵۹۹ ـ حدثنا مسدد قال: حدثنا یحییٰ قال: حدثنا عوف قال: حدثنا أبو المنهال قال: أنطلقت مع أبی إلی أبی برزة الأسلمی، فقال له أبی: حدثنا کیف کان رسول اللّٰه ﷺ یصلی المکتوبة؟. قال: کان یصلی الهجیر. وهیی التی تدعونها الأولیٰ. حین تدحض الشمس، و یصلی العصر ثم یرجع أحدنا إلی أهله فی اقصی المدینة والشمس حیة، ونسیت ما قال فی المغرب. قال: و کان یستحب أن یوخر العشاء. قال: و کان یکره النوم قبلها والحدیث بعدها، و کان ینفتل من صلاة الغداة حین یعرف أحدنا جلیسه و یقرا من الستین إلی المائة. [راجع: ۵۴۱]

تو اصل میں ''سمر'' چاندنی کو کہتے تھے پھر چاندنی رات میں قصہ گوئی پر اس کا اطلاق کیا گیا، پھر مطلق قصہ گوئی (چاہے چاندنی رات ہو یا نہ ہو) پر بھی ''سمر'' کا اطلاق ہونے لگا، پھر رات کے وقت مطلق باتیں کرنے (چاہے قصے ہوں یا نہ ہوں) کو بھی ''سمر'' کہا جانے لگا، اسی سے ''سامر'' اور ''سمیر'' نکلا ہے۔ یہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کے ساتھ بیٹھ کر قصہ گوئی کی جائے۔

کان لم یکن بین الجحون الی الصفا
انیس و لم یسمر بمکة سامر

یہ مضاض بن اسماعیل کا شعر ہے۔

بعد العشاء قصہ گوئی کی ممانعت کی وجہ

بعض روایات میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ''سمر بعد العشاء'' سے منع فرمایا ہے۔ امام بخاری

رحمہ اللہ نے نہی کی روایت ذکر نہیں کی، شاید ان کی شرط پر نہیں ہیں، لیکن ذہن میں تو ہے کہ ایک ایسی حدیث ہے جس میں آپ ﷺ نے **"سمر بعد العشاء"** سے منع فرمایا ہے، تو اس کی توجیہ کر رہے ہیں کہ یہ اس وقت منع ہے جب اس کے نتیجے میں نماز فجر فوت ہونے کا اندیشہ ہو۔

اگر یہ اندیشہ نہ ہو اور دنیوی یا اخروی کوئی حاجت ہو جو اس سمر کی داعی ہو تو پھر عشاء کے بعد گفتگو کرنے میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ البتہ اگر بے فائدہ گفتگو ہو جس کا کوئی منشأ نہ ہو یا صبح کی نماز فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں کراہت ہے۔ چنانچہ شروع میں حدیث ذکر کی ہے۔ **"کان یکرہ النوم قبل العشاء والحدیث بعدھا"** لیکن اس کے بعد ساری وہ روایات نقل کی ہیں جن میں حضور اقدس ﷺ یا صحابہ کرام ؓ کا عشاء کے بعد باتیں کرنا منقول ہے، جس سے جواز معلوم ہوتا ہے۔

(۴۰) باب السمر فی الفقه والخیر بعد العشاء

دین کے مسائل اور نیک بات کے متعلق عشاء کے بعد گفتگو کرنے کا بیان

۶۰۰ ـ حدثنا عبداللّٰه بن الصباح قال: حدثنا أبو علی الحنفی قال: حدثنا قرة ابن خالد قال: أنتظرنا الحسن، وراث علینا حتی قربنا من وقت قیامة فجاء وقال: دعانا جیرا ننا ھؤلاء. ثم قال: قال أنس: نظرنا النبی ﷺ ذات لیلة حتی کان شطر اللیل یبلغه، فجاء فصلی لنا ثم خطبنا فقال: "إلا أن الناس قد صلوا ثم رقدوا وإنکم لم تزالوا فی الصلاة ما أنتظر تم الصلاة". "وإن القوم لا یزالون بخیر ما انتظرو الخیر من حدیث أنس عن النبی ﷺ. [راجع: ۵۷۲]

قرۃ ابن خالد کہتے ہیں **"انتظرنا الحسن"** ہم نے حضرت حسنؒ کا انتظار کیا **"وراث علینا"** اور ان کو ہم سے دیر ہوگئی، راث کے معنی ہیں **"تاخر"** یعنی ہم رات کے وقت ان کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ آئیں اور عشاء کی نماز پڑھائیں لیکن ان کو دیر ہوگئی **"حتی قربنا من وقت قیامة"** یہاں تک کہ وقت قریب آگیا جس وقت میں عام طور پر وہ مسجد سے اٹھ کر چلے جایا کرتے تھے مگر وہ عشاء کی نماز کے لئے مسجد میں نہیں آئے۔ **"فجاء وقال: دعانا جیراننا ھؤلاء"** جب آئے تو کہنے لگے ہمارے برابر کے پڑوسیوں نے بلا لیا تھا جس کی وجہ سے دیر لگ گئی، پھر آگے کا واقعہ سنایا جو کئی دفعہ گزر چکا ہے۔

موضع استدلال یہ ہے **"فصلی لنا ثم خطبنا"** عشاء کی نماز پڑھی پھر خطبہ دیا، معلوم ہوا عشاء کے بعد خطبہ دینا جائز ہے اور حدیث میں جو **"سمر بعد العشاء"** سے منع کیا تھا وہ کراہت تنزیہی ہے یا خاص حالات کے ساتھ مشروط ہے، اگر علم یا دین کی بات رات کے وقت کی جائے تو وہ جائز ہے۔

۶۰۱ ـ حدثنا أبو الیمان قال: أخبرنا شعیب، عن الزھری قال: حدثنی سالم بن

عبدالله بن عمر، و أبو بكر بن أبي حثمة أن عبدالله بن عمر قال: صلى النبي ﷺ صلاة العشاء في آخر، حياته، فلما سلم قام النبي ﷺ فقال: " أرايتكم ليلتكم هذه، فإن رأس مأة سنة لا يبقى ممن هو اليوم على ظهر الأرض أحد" فوهل الناس في مقالة النبي ﷺ إلى ما يتحدثون في هذه الأحاديث عن مائة سنة، وإنما قال النبي ﷺ : لا يبقى ممن هو اليوم على ظهر الأرض" يريد بذلك إنها تخرم ذلك القرن. [راجع: ١١٦]

یہاں حضور اقدس ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھی اور جب سلام پھیرا تو فرمایا۔ **"أرايتكم ليلتكم هذه"** یہ گفتگو عشاء کے بعد فرمائی، معلوم ہوا کہ عشاء کے بعد بات کرنا جائز ہے۔

یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے آگے فرمایا **"فوهل الناس في مقالة النبي ﷺ"** حضرت عبداللہ بن عمر ﷺ فرماتے ہیں لوگ حضور اقدس ﷺ کے ارشاد کے بارے میں غلطی میں پڑ گئے ہیں اور ان باتوں کی طرف چلے گئے ہیں جو وہ اکثر نبی کے بارے میں بناتے ہیں۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بعض لوگوں نے اس حدیث کا مطلب یہ لیا کہ گویا حضو اقدس ﷺ نے اس بات کی پیشین گوئی فرمادی کہ سو سال بعد قیامت آجائے گی، ساری دنیا ختم ہو جائے گی۔

حالانکہ **"وإنما قال النبي ﷺ : لا يبقى ممن هو اليوم علىٰ ظهر الأرض يريد بذلك إنها تخرم ذلك القرن"** مقصد اس کا یہ تھا کہ اس وقت جو لوگ زندہ ہیں سو سال کے بعد سب ختم ہو جائیں گے اور یہ قرن ختم ہو جائے گا۔

(۴۱) باب السمر مع الأهل والضيف

گھر والوں اور مہمانوں کے ساتھ عشاء کے بعد گفتگو کرنے کا بیان

گھر والوں اور مہمانوں کے ساتھ سمر کرنا، جواز بیان کرنا مقصود ہے۔ اس جواز کے سلسلے میں حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر ﷺ کی ایک حدیث نقل کی ہے اور یہ حدیث بخاری شریف میں کئی جگہ آئی ہے۔

۶۰۲ ـ حدثنا أبو النعمان قال: حدثنا معتمر بن سليمان قال: حدثنا أبي قال: حدثنا أبو عثمان عن عبدالرحمٰن بن أبي بكر: أن أصحاب الصفة كانوا أناسا فقراء. وأن النبي ﷺ قال: "من كان عنده طعام إثنين فليذهب ثالث. وان أربع فخامس أو سادس". وأن أبا بكر جاء بثلاثة و انطلق النبي ﷺ بعشرة. قال: فهو أنا وأبي، فلا أدري قال. وامرأتي و خادم ، بين بيتنا و بين بيت أبي بكر. وأن أبا بكر تعشى عند النبي ﷺ ثم لبث

حيث صليت العشاء ثم رجع فلبث حتى تعشى النبي ﷺ ، فجاء بعد ما مضى من الليل ماشاء الله. قالت له امرأته : وما حبسك عن أضيافك، أو قالت: ضيفك؟ قال: أوما عشيتهم ؟ قالت : أبوا حتى تجيء ، قد عرضوا فابوا. قال: فذهبت أنا فاختبأت، فقال: يا غنثر، فجدع وسب. وقال: كلو لا هنيئا، فقال: والله لا أطعمه أبدا، وأيم الله ماكنا نأخذ من لقمة الا ربا من أسفلها اكثر منها. قال: . وشبعوا. وصارت اكثر مما كانت قبل ذلك ، فنظر إليها أبو بكر فاذا هيى كما هيى أو أكثرمنها. فقال لإ مراته: يا أخت بني فراس، ما هذا ؟ قالت: لا و قرة عيني، لهي الآ ن أكثر منها قبل ذلك ثلاث مرات. فأكل منها أبو بكر وقال: إنما كان ذلك من الشيطان. يعني يمينه. ثم أكل منها لقمة ثم حملها إلى النبي ﷺ فاصبحت عنده، وكان بيننا و بين قوم عقد فمضى الأجل ففرقنا اثنى عشر رجلا مع كل رجل منهم أناس، الله اعلم كم مع كل رجل، فأكلو منها أجمعون، أو كما قال.[أنظر: ۳۵۸۱، ۶۱۴۰، ۶۱۴۱][۸۹]

"عن عبدالرحمٰن بن أبي بكر أن أصحاب الصفة كانوا أناسا فقراء، وأن النبيّ ﷺ قال: من كان عنده طعام اثنين فليذهب بثالث" جس آدمی کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ اصحاب صفہ میں سے تیسرا آدمی اپنے ساتھ کھانا کھلانے کے لئے لے جائے، "وإن اربع فخامس أو سادس" جس آدمی کے پاس چار آدمیوں کا کھانا ہے وہ اپنے ساتھ پانچویں یا چھٹے آدمی کو لے جائے۔

یعنی حضور اقدس ﷺ نے صحابۂ کرام ؓ سے یہ کہہ رکھا تھا کہ جب تم کھانا کھانے لگو تو اصحاب صفہ میں سے کسی کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور ان کی مہمانی کرو۔ "وأن أبا بكر جاء بثلاثة" اور صدیق اکبر ؓ اصحاب صفہ میں سے تین کو کھانا کھلانے کے لئے لائے "وانطلق النبي ﷺ بعشرة" آنحضرت ﷺ دس کو لے کر آئے قال: "فهو انا و أبي" . "فَهُوَ" میں "هُو" ضمیر شان ہے، مطلب یہ ہے کہ اب آگے قصہ یہ ہے کہ میں اور میرے والد اور والدہ گھر پر تھے "فلا أدري قال: وامرأتي و خادم ، بين بيتنا و بين بيت أبي بكر" راوی کو شک ہے کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے "فهو أنا و أبي" کہا تھا یا "امرأتي و خادم" کہا تھا۔

"بين بيتنا و بيت أبي بكر" کا تعلق خادم سے ہے یعنی ایسی خادمہ جو میرے اور صدیق اکبر ؓ کے گھر میں مشترک تھی ایک ہی خادمہ تھی، جو ہمارے گھر بھی کام کرتی تھی اور میرے والد صدیق اکبر ؓ کے گھر

۸۹ وفي صحيح مسلم ، كتاب الأشربة ، باب إكرام الضيف وفضل إيثاره ، رقم : ۳۸۳۳ ، وسنن أبي داؤد ، كتاب الأيمان والنذور ، باب فيمن حلف على طعام لاياكله ، رقم :۲۸۴۶ ، ومسند احمد ، مسند الصحابة بعد العشرة ، باب حديث عبد الرحمٰن بن ابي بكر ، رقم : ۱۶۰۹ .

بھی کام کرتی تھی۔ "**وأن أبا بكر تعشى عند النبی ﷺ**" صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مہمانوں کو گھر لائے اور خود رات کا کھانا حضور اقدس ﷺ کے گھر جا کر کھالیا، اس زمانہ میں رات کا کھانا مغرب سے پہلے یا متصلاً بعد از مغرب کھایا جاتا تھا۔

"**ثم لبث**" پھر وہیں ٹھہرے رہے، "**حيث صليت العشاء**" یہاں تک کہ عشاء کی نماز ہوگئی "**ثم رجع**" پھر دوبارہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضور اقدس ﷺ کے پاس آئے "**فلبث**" پھر کچھ دیر وہاں ٹھہرے "**حتى تعشى النبی ﷺ**" یہاں تک کہ حضور اقدس ﷺ نے بھی شام کا کھانا کھالیا، یعنی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ عشاء کی نماز کے بعد حضور اقدس ﷺ کے گھر گئے یہاں تک کہ جب حضور اقدس ﷺ نے کھانا کھالیا تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ واپس اپنے گھر آگئے۔

"**فجاء بعد ما مضى من الليل ماشاء الله**" وہ اپنے گھر آئے جبکہ رات کا اتنا حصہ گزر چکا تھا جتنا اللہ جل جلالہ نے چاہا یعنی کافی حصہ گزر چکا تھا۔

"**قالت له امرأته**" صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ نے ان سے کہا، "**وما حسبک عن أضيافک أو قالت ضيفک؟**" آپ کو اپنے مہمانوں سے کس چیز نے روک لیا تھا، چاہئے تو یہ تھا کہ جلدی گھر واپس آتے اور مہمانوں کے ساتھ کھانا کھاتے۔ "**قال: أو ما عشيتيهم؟**" صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا تم نے ابھی تک مہمانوں کو کھانا نہیں کھلایا، گھر میں مہمان تھے تو کھانا کیوں نہیں کھلایا؟ اتنی دیر کیوں لگا دی؟

"**قالت: أبوا حتى تجيء**" انہوں نے کہا کہ مہمانوں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا کہ ہم آپ کے آنے تک نہیں کھائیں گے، "**قد عرضوا فابوا**" اصل میں تھا "**قد عرضت الطعام عليهم**" بعض اوقات قلب ہو جاتا ہے یہاں بھی ہوا کہ ان کو کھانا پیش کیا گیا تھا کہ آپ کھالیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔

قال: "فذهبت أنا فاختبأت" عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے دیکھا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اس بات پر غصہ آرہا ہے کہ مہمانوں کو کھانا کیوں نہیں کھلایا گیا تو میں جا کر چھپ گیا کہ اگر اس وقت سامنے آیا تو پٹائی ہو جائے گی کہ تم نے کیوں نہیں کھلایا۔ **فقال: "يا غنثر"** انہوں نے آواز دی کہ اے کمینے بعض حضرات نے "**غنثر**" کا ترجمہ کمینہ کیا ہے "**لئيم**" اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں نا اہل، احمق۔

"**فجدّع و سبّ**" اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مجھے ناک کان کٹا قرار دیا اور برا بھلا کہا۔ "**جَدَع**" (بغیر تشدید) کے معنی ہیں کاٹنا اور "**جدّع**" کے معنی ہیں "**جدع الله انفک**" کہنا کہ اللہ تیری ناک کاٹے۔ یہ الفاظ بظاہر بددعا کے ہوتے ہیں لیکن بددعا مقصود نہیں ہوتی بلکہ محض اپنی ناراضگی کا اظہار کرنا ہوتا ہے "**فسب**" اور برا بھلا کہا، یعنی تمہیں چاہئے تھا کہ کسی طرح مہمانوں کو راضی کر کے کھانا کھلاتے اور اتنی دیر تک بھوکا نہ رکھتے، اس لئے ڈانٹ پلائی۔ **وقال: "كلوا، لا هنيئاً"** گھر والوں سے کہا اچھا تم کھاؤ۔ تمہارے لئے

یہ کوئی خوش گوار کھانا نہیں ہے کہ مہمانوں کو اتنی دیر بھوکا رکھا۔

فقال: "واللہ لا اطعمه ابدا" اللہ کی قسم! اب میں کبھی یہ کھانا نہیں کھاؤں گا جب میرے مہمانوں کو نہیں کھلایا گیا۔ عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پہلے مہمانوں کو کھانا کھلایا گیا۔ ظاہر ہے واقعہ ایسا ہی ہوا ہو گا، مہمانوں کے بعد گھر میں کھانا شروع کیا، ہم لوگ کھا رہے تھے، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے نہ کھانے کی قسم کھالی تھی۔

"وأیم اللہ ما کنا نأخذ من لقمة إلا ربا من أسفلها أکثر منها" ہم نے کھانا شروع کیا اور ہم جوں جوں کھانا کھاتے جا رہے تھے نیچے اور زیادہ کھانا نکل آتا تھا۔ **قال: "وشبعوا"** اس کے نتیجے میں ہم سب گھر والے اور مہمان سیر ہو گئے **"وصارت أکثر مما کانت قبل ذلک"** ہم سب نے سیر ہو کر کھایا، پھر بھی وہ کھانا پہلے سے زیادہ باقی رہ گیا، **"فنظر الیها أبو بکر"** ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کو دیکھا، **"فإذا هی کما هی أو أکثر منها"** جتنا وہ تھا اتنا ہی باقی تھا یا اس سے زیادہ تھا۔

"فقال لإمراته": انہوں نے اپنی اہلیہ سے کہا **"یا أخت بنی فراس، ما هذا؟"** یہ کیا قصہ ہے کہ مہمانوں نے بھی کھالیا مگر پھر بھی پہلے سے زیادہ باقی ہے۔ **قالت: "لا و قرّة عینی"** قسم میری آنکھوں کی ٹھنڈک کی، **"لهی الآن أکثر منها قبل ذلک بثلاث مرّات. لا و قرّة عینی"** میں جو "لا" ہے اس کا کوئی معنی نہیں ہے۔ میری آنکھوں کی ٹھنڈک کی قسم، اس سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مراد ہے۔ **"لهی الآن" الخ** یہ کھانا پہلے سے تین گنا زیادہ ہے، **"فأکل منها أبو بکر"** اس موقع پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی اس کھانے میں سے کھایا اور کہا **"إنما کان ذلک من الشیطان، یعنی یمینه"** میں نے جو قسم کھائی تھی کہ میں یہ کھانا نہیں کھاؤں گا یہ شیطان کا عمل تھا۔

آپ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ اس کھانے میں اللہ جل جلالہ نے برکت دی ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے قسم توڑ کر کھانا کھالیا اور فرمایا وہ قسم ایک شیطانی عمل تھا۔

"ثم أکل منها لقمة ثم حملها إلی النبی ﷺ" چونکہ یہ غیر معمولی واقعہ تھا اس لئے کھانا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لے گئے **"فاصبحت عنده"** صبح تک کھانا آپ ﷺ کے پاس رہا۔

آگے اسی سلسلے کا دوسرا واقعہ نقل کرتے ہیں **"وکان بیننا و بین قوم عقد فمضی الأجل ففرقنا اثنی عشر رجلا مع کل رجل منهم أناس"** اس کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں:

پہلا مطلب یہ ہے کہ ایک قوم کے ساتھ ہمارا جنگ بندی کا معاہدہ تھا اور قریبی زمانہ میں وہ جنگ بندی کا معاہدہ ختم ہو چکا تھا اور مدت پوری ہو چکی تھی۔ ہمارا اس قوم پر چڑھائی کرنے کا ارادہ تھا، اس کے لئے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بارہ دستے بنائے اور ہر دستے کا ایک امیر تھا اور ہر امیر کے ساتھ بہت سے آدمی تھے۔ ان کے کھانے کا انتظام بھی کرنا تھا، تو جو کھانا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاں سے حضور ﷺ کے پاس پہنچا تھا، حضور ﷺ نے وہ

بارہ دستوں میں تقسیم فرمادیا اور سب لوگوں نے وہ کھالیا۔

دوسرا مطلب بعض لوگوں نے اس کا یہ بیان کیا ہے کہ ایک قوم کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ تھا، مدت ختم ہوگئی تھی، اب اس قوم کے ساتھ معاہدہ کی تجدید کرنا مقصود تھا، تجدید کے لئے بارہ نقیب مقرر کئے گئے اور ہر نقیب کے ساتھ کچھ لوگ تھے، تو ان سب کو وہ کھانا کھلایا گیا۔ بعض شراح کے نزدیک یہ دوسرا قول راجح ہے۔

"اللّٰہ أعلم کم مع کل رجل" اللہ ﷻ بہتر جانتا ہے کہ ہر آدمی کے ساتھ کتنے آدمی تھے۔

"فأکلوا منہا أجمعون" بہرحال سب نے کھانا کھالیا۔

اس واقعہ میں مقصود یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ حضور اقدس ﷺ کے ساتھ عشاء کے بعد بھی بیٹھے رہے، حضور ﷺ نے عشاء کے بعد کھانا تناول فرمایا، صدیق اکبرؓ بیٹھے رہے، ظاہر ہے کچھ باتیں بھی کی ہوں گی، وہاں سے اپنے گھر آئے، گھر والوں سے بات چیت کی، ڈانٹ ڈپٹ کی، پھر مہمانوں کو کھانا کھلایا، اس دوران بھی کچھ بات چیت کی ہوگی۔

اس ساری تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ عشاء کے بعد گفتگو کی ممانعت مطلق نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

كتاب الأذان

٦٠٣ - ٦٥٠

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۰ ۔ کتاب الأذان

(۱) باب بدء الأذان

اذان کی ابتدا کا بیان

وقوله عز وجل :

﴿ وَ إِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ط ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴾

[المائدة : ۵۸]

وقوله :

﴿ إِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ ﴾

[الجمعة: ۹]

اذان کی مشروعیت

یہ پہلا باب ہے "باب بدء الاذان" کہ اذان کب شروع ہوئی۔

اس میں روایات نقل کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اذان کی ابتدا مدینہ منورہ میں ہوئی ہے، کیونکہ یہ دونوں آیتیں مدنی ہیں۔

پہلی آیت:

"وَ اِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ"

میں فرمایا ہے کہ جب تم اذان کی نداء دیتے ہو تو یہ کافر لوگ اس کو مزاق اور کھیل بناتے ہیں کیونکہ ان کو عقل نہیں ہے۔

جب اذان شروع ہوئی تو یہودیوں نے کہا کہ یہ کیا بدعت شروع کی ہے اس پر آیت کریمہ نازل ہوئی اور چونکہ آیت کریمہ مدنی ہے، لہٰذا اس طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ اذان کا آغاز مدینہ منورہ میں ہوا ہے۔

اور دوسری آیت:

"اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ" میں فرمایا ہے کہ اذان بھی جمعہ کی فرضیت کے ساتھ فرض ہوئی ہے۔ چنانچہ جمہور محدثین ومؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ اذان کی مشروعیت مدینہ منورہ میں شروع ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کو خواب میں اذان سکھلائی گئی، اس کی کوئی حدیث امام بخاری رحمہ اللہ کی شرط کے مطابق نہیں تھی لہٰذا وہ روایت نہیں کی بلکہ بدء الاذان کے مدینہ منورہ میں ہونے پر ان دو آیات سے استدلال کیا۔

اذان کا آغاز کس سن میں ہوا؟

پھر اس بارے میں روایات مختلف ہیں کہ اذان کا آغاز کس سن میں ہوا؟

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اس کو ترجیح دی ہے کہ ۱ھ میں ہی اذان شروع ہو چکی تھی۔ کچھ احادیث ایسی بھی آئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اذان مکہ مکرمہ ہی میں شروع ہو چکی تھی، چنانچہ معجم طبرانی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اسراء کے وقت اللہ جل جلالہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اذان کی وحی فرمائی مگر اس کی سند میں طلحہ بن زید متروک ہیں۔[۱]

دارقطنی کی ایک روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت اذان کا حکم دیدیا تھا جب نماز فرض ہوئی، مگر اس کی سند بھی ضعیف ہے۔[۲]

حافظؒ نے اس طرح کی اور روایات بھی نقل کی ہیں مگر تصریح فرمائی ہے کہ وہ سب ضعیف ہیں۔[۳]

۶۰۳ ـ حدثنا عمران بن ميسرة قال: حدثنا عبد الوارث قال: حدثنا خالد عن أبي قلابة، عن أنس قال: ذكروا النار والناقوس، فذكروا اليهود والنصارى، فأمر بلال

۱، ۲، ۳ والروايات التي تدل على أن التأذين شرع ليلة المعراج فقد حكم عليها المحدثون بالضعف، كما بسط في السعاية نقلا عن المبسوط، وكذا ماروى في شرعيته بمكة قبل الهجرة الخ، فيض الباري، ج:۲، ص:۱۵۶، وفتح الباري، ج:۲، ص:۷۸، وشرح الزرقاني، ج:۱، ص:۱۹۸.

أن يشفع الأذان وأن يوتر الإقامة. [أنظر: ۶۰۵ ، ۳۴۵۷] [۴]

یہ حضرت انس ﷺ کا واقعہ ہے کہ لوگوں نے آگ اور ناقوس کا ذکر کیا یعنی جس طرح مجوس لوگوں کو جمع کرنے کے لئے آگ جلاتے ہیں اس طرح ہم بھی آگ جلائیں یا جس طرح نصرانی ناقوس بجاتے ہیں ہم بھی ناقوس بجائیں۔

" فذكروا اليهود والنصارى "

ابوالشیخ کی روایت میں ہے کہ جب ناراور ناقوس کی تجویز پیش کی گئی تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا یہ مجوس اور یہود ونصاریٰ کا شعار ہے اور پھر حضرت بلال ﷺ کو حکم دیا گیا کہ وہ اذان کو شفعاً شفعاً کہیں اور اقامت کو وتراً وتراً کہیں۔

روایت کے ظاہری الفاظ سے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ اسی مشورے کی مجلس میں حضرت بلال ﷺ کو اذان شفعاً شفعاً اور اقامت وتراً وتراً کہنے کا حکم دیا گیا، لیکن درحقیقت یہاں اختصار ہے۔ حضرت بلال ﷺ کو یہ حکم بعد میں دیا گیا، اس وقت حضرت بلال ﷺ کو محض اعلان کا حکم دیا گیا تھا، بعد میں جب حضرت عبداللہ بن زید ﷺ نے خواب میں اذان دیکھی تو پھر باقاعدہ اذان کا آغاز ہوا۔

چنانچہ اگلی حدیث میں اس کی وضاحت آنے والی ہے۔

۶۰۴ ۔ حدثنا محمود بن غيلان قال: حدثنا عبد الرزاق قال: أخبرنا جريج قال: أخبرني نافع أن ابن عمر كان يقول: كان المسلمون حين قدموا المدينة يجتمعون فيتحيون الصلاة ليس ينادى لها، فتكلموا يوما في ذلك فقال بعضهم: اتخذوا ناقوسا مثل ناقوس النصارى، وقال بعضهم: بل بوقا مثل قرن اليهود. فقال عمر: أولا تبعثون رجلا ينادي بالصلاة؟ فقال رسول الله ﷺ: يابلال قم فناد بالصلاة. [۵، ۶]

[۴] وفي صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب الأمر بشفع الأذان وإيتار الإقامة، رقم: ۵۶۹، وسنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ما جاء في افراد الإقامة، رقم: ۱۷۸، وسنن النسائي، كتاب الأذان، باب تثنية الأذان، رقم: ۶۲۳، وسنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب في الإقامة، رقم: ۴۲۸، وسنن ابن ماجة، كتاب الأذان والسنة فيه، باب إفراد الإقامة، رقم: ۷۲۱، ومسند احمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند أنس بن مالك، رقم: ۱۱۵۶۳، ۱۲۵۰۳، وسنن الدارمي، كتاب الصلاة، باب ومن مسند علي بن أبي طالب، رقم: ۱۱۹۸.

[۵] لا يوجد للحديث مكررات.

[۶] وفي صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب بدء الأذان، رقم: ۵۶۸، وسنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ماجاء في بدء الأذان، رقم: ۱۷۵، وسنن النسائي، كتاب الأذان، باب بدء الأذان، رقم: ۶۲۲، ومسند احمد، مسند المكثرين من الصحابة، باب باقي المسند السابق، رقم: ۶۰۷۲.

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب مسلمان مدینہ منورہ آئے تو نماز کے لئے جمع ہو جایا کرتے اور نماز کا انتظار کرتے تھے یعنی نماز کے وقت کا اندازہ لگایا کرتے تھے کہ کس وقت جماعت کھڑی ہوگی **((لیس یونادی لها))**، نماز کے لئے کوئی اعلان نہیں کیا جاتا تھا۔ **"فتکلموا یوما فی ذالک فقال بعضهم : اتخذوا قوسا مثل ناقوس النصاری ، وقال بعضهم : بل بوقا مثل قرن الیهود"**. بعض نے کہا ناقوس بناؤ اور بعض نے کہا بوق بناؤ۔ بیل کے سینگ سے بنا کر اس میں پھونکتے تھے تو اس سے آواز نکلتی تھی، تو کہا کہ بوق بناؤ، اس سے پتہ چل جائے گا کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے، **"فقال عمر"** حضرت عمرؓ نے کہا **"او لا تبعثون رجلا ینادی بالصلاۃ؟"** یہ سب طریقے تو دوسروں کے ہیں، ایسا کیوں نہ کریں کہ ایک آدمی کو بھیج دیا کریں جو نماز کا اعلان کرے **"فقال رسول ﷺ یا بلال، قم فناد بالصلاۃ"**.

اب یہاں **"بالصلاۃ"** کہا، اس کا زیادہ ظاہری مفہوم تو یہ ہے کہ اس سے اذان معروف مراد نہیں ہے بلکہ **"الصلوٰۃ جامعة"** کا اعلان ہے، کیونکہ اس وقت تک اذان مشروع نہیں ہوئی تھی، لیکن اگر یہ کہا جائے جیسا کہ بعض حضرات نے کہا ہے اور محشی نے بھی یہ لکھا ہے کہ **"بالصلاۃ"** سے اذان معہود مراد ہے تو اس صورت میں **"فقال رسول ﷺ"** میں "ف" تراخی کثیر کے لئے ہے، یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تجویز دی تھی بات ختم ہوگئی، اس کے بعد جب حضرت عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ کو خواب میں اذان دکھائی گئی تو اس وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا کہ نماز کے لئے اذان دیں، لیکن میرے خیال میں پہلی توجیہ زیادہ مناسب ہے اور کسی تاویل کی ضرورت نہیں ہے۔

(۳) باب : الاقامة واحدة، إلا قوله: قد قامت الصلاة.

"قد قامت الصلاۃ" کے علاوہ اقامت کے الفاظ ایک ایک بار کہنے کا بیان

۶۰۷ـ حدثنا علی بن عبد اللہ قال: حدثنا إسماعیل بن ابراهیم قال: حدثنا خالد عن أبی قلابة، عن أنس قال: أمر بلال أن یشفع الأذان وأن یوتر الإقامة . قال اسماعیل فذکرت لایوب فقال: إلا الاقامة [راجع: ۶۰۳]

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا کہ اذان کو شفعاً شفعاً کہیں اور اقامت کو وتراً کہیں سوائے اقامت یعنی **"قدقامت الصلاۃ"** کے کہ **"قدقامت الصلاۃ"** کو بھی شفعاً شفعاً کہیں۔

یہ حدیث امام بخاری رحمہ اللہ نے پیچھے کئی جگہ روایت کی ہے، یہاں اس پر باب قائم کیا ہے کہ **"الإقامة واحدة"**.

اذان اور اقامت کے شفعاً اور وتراً ہونے میں اختلاف ائمہ

جہاں تک اذان کے شفعاً شفعاً ہونے کا تعلق ہے، وہ مسئلہ متفق علیہ ہے کہ اذان میں شہادتین اور حیعلتین شفعاً ادا ہوں گے لیکن اقامت جس کے لئے یہاں باب قائم کیا ہے، امام بخاری رحمہ اللہ اس حدیث کی بنیاد پر یہ فرمارہے ہیں کہ اقامت میں شہادتیں اور حیعلتیں ایک ایک مرتبہ کہے جائیں گے البتہ **"قدقامت الصلاۃ"** دو مرتبہ کہا جائے گا۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

البتہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک پوری اقامت وتراً ہے، یہاں تک کہ **"قدقامت الصلاۃ"** بھی ایک ہی مرتبہ کہا جائے گا، اور حدیث میں جو **"الا الاقامة"** کا استثناء آیا ہے، مالکیہ کہتے ہیں کہ وہ ایوب سختیانی کا تفرد ہے اور اہل مدینہ کا عمل اس کے خلاف ہے، اس لئے حجت نہیں ہے۔[۷]

امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری رحمہما اللہ کے نزدیک اقامت بھی اذان کی طرح شفعاً شفعاً ہے یعنی شہادتین اور حیعلتین بھی دو دو مرتبہ کہے جائیں گے۔

حنفیہ کی دلیل

حنفیہ اور سفیان ثوری رحمہما اللہ کی دلیل وہ حدیث ہے جو ترمذی میں حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ عبداللہ بن زید ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ **"کان اذان رسول اللہ ﷺ شفعا شفعا فی الأذان والاقامة"**.[۸]

اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کا حضرت عبداللہ بن زید ﷺ سے سماع ثابت نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ حضرت عمر ﷺ کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے اور حضرت عبداللہ بن زید ﷺ کی وفات کے وقت ان کی عمر تحمل روایت کے لئے کافی تھی، لہٰذا معاصرت ثابت ہے اور امام مسلم رحمہ اللہ کی شرط کے مطابق عنعنہ کے لئے صرف معاصرت کافی ہے اس میں ثبوت سماع ولقاء ضروری نہیں ہے، لہٰذا یہ روایت قابل استدلال ہے۔

حنفیہ کی دوسری دلیل حضرت ابومحذورہ ﷺ کی اذان ہے جو ترمذی میں ہے **"عن أبی محذورۃ أن النبی ﷺ علمه الأذان تسع عشرۃ کلمة والاقامة سبع عشرۃ کلمة"** اذان سترہ کلمات پر مشتمل تھی اور اقامت انیس کلمات پر مشتمل تھی اور یہ اس وقت بنتی ہے جب شفعاً شفعاً کہی جائے۔[۹]

---

۷ شرح ابن بطال، ج: ۲، ص: ۲۳۳.

۸ سنن الترمذی، باب ماجاء أن الاقامة مثنی مثنی، رقم: ۱۹۴.

۹ سنن الترمذی، باب ماجاء فی الترجیع فی الأذان، رقم: ۱۹۲، ج: ۱، ص: ۳۶۷.

میرے نزدیک سب سے قوی دلیل حضرت سوید بن غفلہ ﷺ کی روایت ہے جو طحاوی میں ہے۔[۱۰]
وہ کہتے ہیں "**سمعت بلالاً یؤذن مثنی ویقیم مثنی**" میں نے حضرت بلال ﷺ کو سنا وہ اذان بھی دو دو مرتبہ کہتے تھے اور اقامت بھی دو دو مرتبہ کہتے تھے اور سوید بن غفلہ ﷺ ان حضرات میں ہیں جو "**مخضرمین**" ہیں، یعنی حضور ﷺ کا زمانہ پایا اور زیارت نہ ہوئی، یہ اس وقت آئے جب حضور ﷺ کی وفات ہو چکی تھی یعنی یہ اس دن مدینہ طیبہ پہنچے ہیں جس دن حضور اکرم ﷺ کا جسد مبارک دفن کیا گیا، لہٰذا ظاہر یہ ہے کہ انہوں نے حضرت بلال ﷺ کی اذان آپ ﷺ کی وفات کے بعد سنی، لہٰذا جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ حضرت بلال ؓ ﷺ کی اذان میں حضرت ابومحذورہ ﷺ کے واقعہ کے بعد تغیر پیدا ہو گیا تھا، اس روایت سے ان کی تردید ہو جاتی ہے۔[۱۱]

لہٰذا انہوں نے حضرت بلال ﷺ کو صدیق اکبر ﷺ کے ابتدائی عہد خلافت میں اذان دیتے ہوئے سنا، معلوم ہوا حضرت بلال ﷺ کا آخری عمل مثنیٰ مثنیٰ پر مشتمل تھا۔ مجموعہ روایت پر غور کرنے کے بعد تمام توجیہات میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی توجیہ و تحقیق زیادہ بہتر اور راجح معلوم ہوتی ہے؛ وہ فرماتے ہیں: "**ان الاختلاف فی کلمات الأذان کاختلاف فی أحرف القرآن کلها شاف**"۔

یعنی درحقیقت اذان کے یہ تمام صیغے شروع ہی سے منزل من اللہ تھے۔ حضرت بلال ﷺ کی اذان میں ترجیع نہ تھی، البتہ حضرت ابومحذورہ ﷺ کی اذان میں ترجیع تھی، اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت سعد القرظ ﷺ موذن قبا کی اذان ترجیع پر مشتمل تھی۔[۱۲]

"**فدل علی إنه لم یکن مخصوصا بأبی محذورة**" جبکہ حضرت سعد القرظ ﷺ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن زبیر ﷺ کے عہد خلافت میں بغیر ترجیع کے اذان دیا کرتے تھے۔[۱۳]

مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت عبداللہ بن عمر ﷺ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ شہادتین کو تین مرتبہ کہتے تھے، اس مجموعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ سب طریقے آنحضرت ﷺ سے ثابت اور جائز ہے، البتہ

---

[۱۰] عن سوید بن غفلة قال سمعت بلا لا یؤذن مثنی ویقیم مثنی فهذا بلا ل قد روی عنه فی الأقامة مایخالف ما ذکر أنس وفی حدیث أبی محذورة أن رسول اللهﷺ علمه الاقامة مثنی مثنی ، شرح معانی الآثار ، ج: ۱، ص: ۱۳۴.

[۱۱] سوید بن غفلة بفتح المعجمة والفأ ابو امیه الجعفی مخضر م من کبار التابعین قدم المدینة یوم دفن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم وکان مسلماً فی حیاته ثم نزل الکوفة ومات سنة ثمانین وله مائة وثلاثون سنة ع ، تقریب التهذیب ، ج: ۱، ص: ۳۰۹، رقم: ۲۶۹۵، دارابن حزم ، ۱۴۲۰ھ.

[۱۲] سنن الدارقطنی ، باب ذکر سعد القرظ ، رقم: ۱، ج: ۱، ص: ۲۳۶.

[۱۳] ....أنه سمع ابن سعد القرظ فی أمارة ابن الزبیر یؤذن الاولیٰ الخ ، مصنف عبد الرزاق ، رقم: ۱۷۸۰، ج: ۱، ص: ۴۵۹.

حنفیہ نے عدم ترجیع کو اس وجہ سے راجح قرار دیا ہے کہ حضرت بلال ﷺ جو حضر وسفر میں حضور ﷺ کے ساتھ رہے ہیں ان کا عام معمول بغیر ترجیع کے اذان دینے کا رہا ہے۔[۱۴]

اور عبد اللہ بن زید ﷺ کے روایت جو باب اذان میں اثر کی حیثیت رکھتی ہے وہ بغیر ترجیع کے ہے لہٰذا عدم ترجیع راجح ہے، البتہ ترجیع کے جواز میں کوئی کلام نہیں ہے۔

(۵) باب رفع الصوت بالنداء ،

اذان میں آواز بلند کرنے کا بیان

"وقال عمر بن عبد العزيز : أذن أذانا سمحا ، والا فاعتزلنا".

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا مقولہ ذکر کیا ہے جو انہوں نے اپنے مؤذن سے کہا ''ہلکی پھلکی اذان دیا کرو'' **"سمحاً"** کے معنی ہیں ہلکی۔

ہلکی اذان کا کیا مطلب ہے؟ اس بارے میں مختلف اقوال:

بعض حضرات نے اس کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ ان کے مؤذن بہت محنت اور مشقت اٹھا کر اذان دیا کرتے تھے جیسا کہ بعض لوگ اس طرح اذان دیتے ہیں جیسے کشتی لڑ رہے ہوں، ہر حرف کو تکلف اور تصنع سے ادا کرتے تھے تو حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا یہ سب تشدد اور تکلف چھوڑ دو، ہلکی پھلکی سیدھی سادھی اذان دیا کرو، تشدد اختیار کرنا درست نہیں۔

بعض حضرات نے اس کی یہ تفسیر بیان کی ہے کہ وہ گا گا کر اذان دیا کرتے تھے جیسا کہ بعض گانے کا انداز اختیار کرتے ہیں، آپؒ نے فرمایا یہ انداز ٹھیک نہیں ہے سیدھی طرح اذان دو۔

اس تفسیر کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ یہ واقعہ ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے اور اس میں یہ لفظ ہیں

" أن مؤذنا أذن فطرب في أذانه ، فقال له عمر بن عبد العزيز أذن أذانا سمحا و إلا فاعتزلنا ".[۱۵]

چنانچہ حکم یہی ہے کہ اس طرح اذان دینا جو تغنی کے مشابہ ہو اور جس میں آواز کو غیر معمولی طور پر گھمایا پھرایا جائے اور تطریب کی صورت اختیار کر لے، یہ خلاف سنت ہے۔

---

[۱۴] مصنف ابن ابی شیبة ، کتاب الاذان والاقامة ، باب ماجاء فی الاذان والاقامة کیف ھو ، رقم: ۲۱۲۰ ، کان اذان ابن عمر ..... ثلاثا اللہ اکبر احسبه ، ج: ۱ ، ص: ۱۸۵ ، مکتبة الرشد ، الریاض ، ۱۴۰۹ھ۔

[۱۵] مصنف ابن ابی شیبة رقم: ۲۳۷۵ ، ج: ۱ ، ص: ۲۰۷ ، و فتح الباری ، ج: ۲ ص: ۸۸۔

لیکن یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ایسی خشک اذان ہو جس کے اندر لحن ہی نہ ہو، جس طرح کا لحن قرآن کے اندر جائز ہے اس طرح اذان کے اندر بھی جائز ہے، قرآن کی تغنی بھی جائز نہیں اور اذان کی تغنی بھی جائز نہیں۔

(٦) باب ما يحقن بالأذان من الدماء

اذان سن کر قتال وخون ریزی بند کرنا چاہیئے

۶۱۰ - حدثني قتيبة بن سعيد قال: حدثنا اسمٰعيل بن جعفر، عن حميد، عن أنس: عن النبي ﷺ أنه كان إذا غزا بنا قوماً لم يكن يغزو بنا حتى يصبح و ينظر، فان سمع أذانا كف عنهم، وإن لم يسمع أذانا أغار عليهم. قال: فخرجنا إلى خيبر فانتهينا إليهم ليلاً، فلما أصبح ولم يسمع أذانا ركب وركبت خلف أبي طلحة وأن قدمي لتمس قدم النبي ﷺ. قال: فخرجوا إلينا بمكاتلهم ومساحيهم فلما رأوا النبي ﷺ قالوا: محمد و الله، محمد و الخميس، قال: فلما رآهم رسول الله ﷺ قال: "الله اكبر، الله اكبر خربت خيبر، إنا أذا نزلنا بساحة قوم فساء صباح المنذرين". [راجع: ۳۷۱]

شعائر اسلام

اذان شعائر اسلام میں سے ہے، اسی وجہ سے حضور اقدس ﷺ نے اس کو لوگوں کے خون اور جانوں کی حفاظت کی علامت کے طور پر استعمال کیا کہ جب آپ ﷺ کسی بستی سے اذان سن لیتے تو حملہ نہ کرتے اور اذان نہ سنتے تو حملہ کرتے۔

معلوم ہوا کہ یہ شعائر اسلام میں سے ہے اور ان چیزوں میں سے ہے جو اگرچہ فرض تو نہیں ہے، لیکن اگر کوئی جماعت اس کی تارک ہو جائے تو اس کے خلاف قتال واجب ہے۔[۶]

(٧) باب ما يقول اذا سمع المنادى

اذان سنتے وقت کیا کہنا چاہیئے

۶۱۱ - حدثنا عبد الله بن يوسف قال: أخبرنا مالک، عن ابن شهاب، عن عطاء

[۶] رواه أحمد والطبراني ولأنهما من شعائر الاسلام الظاهرة فكانا واجباً كالجهاد قال هذا تجب على جماعة الرجال ....ان اتفق أهل بلد على تركهما قاتلهم الإمام لأنها من أعلام الدين الظاهرة فقوتلوا على الترک کصلاة العيد والمراد بالامام الخليفة الخ، المبدع، ج: ۱، ص: ۳۱۲، وشرح فتح القدير، ج: ۱، ص: ۲۴۰، وفتح الباری، ج: ۲، ص: ۹۰، وعمدة القاری، ج: ۴، ص: ۱۶۳.

بن يزيد الليثي ، عن أبي سعيد الخدري، أنّ رسول الله ﷺ قال: إذا سمعتم النداء فقولوا مثل مايقول المؤذن .

یہ تغلیباً فرمایا ہے ورنہ حیعلتین کا جواب حوقلہ ہے۔

(۹) باب الاستهام فى الأذان

اذان دینے والے کے لئے قرعہ ڈالنے کا بیان

"ويذكر أن أقواما اختلفوا في الأذان فاقرع بينهم سعد".

۶۱۵ ـ حدثنا عبد الله بن يوسف قال: أخبرنا مالك، عن سمى مولى أبى بكر، عن أبى صالح، عن أبى هريرة أن رسول الله ﷺ قال: لو يعلم الناس ما فى النداء و الصف الأول ثم لم يجدوا إلا ان يستهموا عليه لاستهموا، و لو يعلمون ما فى التهجير لا ستقوا إليه. و لو يعلمون ما فى العتمة و الصبح لا توهما و لو حبواً [أنظر: ۶۵۴، ۷۲۱، ۲۶۸۹] [۱۷]

اذان کے بارے میں قرعہ اندازی کرنا کہ کون اذان کہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے حدیث روایت کی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا اگر لوگوں کو پتہ چل جائے کہ اذان دینے کی اور صف اول کی کیا فضیلت ہے تو قرعہ اندازی کرنی پڑے۔

یعنی لوگ فضیلت حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کریں اور ہر ایک یہ چاہے کہ فضیلت میرے حصے میں آئے، جس کی وجہ سے قرعہ اندازی کرنا پڑے، اور یہ واقعہ عملاً پیش بھی آیا جس کی طرف ترجمۃ الباب میں امام بخاری رحمہ اللہ نے اشارہ کیا **"ويذكر أن اقواما اختلفوا في الاذان فاقرع بينهم سعد"** کہ ایک قوم کے درمیان اذان کے بارے میں اختلاف ہو گیا تھا تو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ان کے درمیان قرعہ اندازی کی تھی۔

---

[۱۷] وفى صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب تسوية الصفوف واقامتها وفضل الاول فالأول منها، رقم: ۶۶۱، وسنن النسائي، كتاب المواقيت، باب الرخصة فى أن يقال للعشاء العتمة، رقم: ۵۳۷، وكتاب الأذان، باب الاستهام على التأذين، رقم: ۶۶۵، وسنن ابن ماجة، كتاب المساجد والجماعات، باب صلاة العشاء والفجر فى جماعة، رقم: ۷۸۹، ومسند أحمد، باقى مسند المكثرين، باب مسند أبى هريرة، رقم: ۶۹۲۸، ۷۲۱۲، ۷۶۷۹، ۸۵۱۷، ۹۶۳۵، ۹۷۱۹، وموطأ مالك، كتاب النداء للصلاة، باب ماجاء فى النداء للصلاة، رقم: ۱۳۶، باب ماجاء فى العتمة والصبح، رقم: ۲۸۹.

یہ روایت امام طبری اور سیف بن عمرو نے روایت کی ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ کو جب حضرت عمر ؓ نے قادسیہ سے ایران پر حملہ کرنے کے لئے امیر بنایا تھا تو وہاں انہوں نے ایک مؤذن مقرر کیا، وہ مؤذن شہید ہو گئے یا بیمار ہو گئے جس کی وجہ سے اذان دینے والا باقی نہ رہا، اب اذان دینے کے لئے اتنے افراد اکٹھے ہو گئے کہ یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ کون اذان دے حضرت سعد ؓ کو قرعہ اندازی کرنی پڑی۔ [۱۸]

"استهم" کے معنی قرعہ ڈالنے کے ہیں، اصل میں تیر ڈال کر نکالتے تھے اس کو بھی استہام کہتے ہیں۔

"ولو يعلمون مافى التهجير" اگر لوگوں کو پتہ چل جائے کہ جلدی نماز کو جانے میں کیا فضیلت ہے، **"تهجير ک"** کے معنی ہیں تبکیر، یعنی جلدی نماز کے لئے جانا، اور اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ عشاء اور فجر کی نماز میں جانے کی کیا فضیلت ہے تو وہ آئیں **"ولو حبوا"** چاہے گھٹنوں کے بل آنا پڑے۔

(۱۰) باب الكلام فى الأذان

اذان میں کلام کرنے کا بیان

"وتكلم سليمان بن صرد فى أذانه، وقال الحسن: لا بأس أن يضحک وهو يؤذن أويقيم".

۶۱۶ ـ حدثنا مسدد قال: حدثنا حماد عن أيوب وعبد الحميد صاحب الزيادي وعاصم الأحول عن عبد الله بن الحارث قال: خطبنا ابن عباس فى يوم رزغ فلما بلغ المؤذن: حى على الصلاة، فأمره أن ينادى: الصلاة فى الرحال، فنظر القوم بعضهم إلى بعض، فعل هذا من هو خير منه وإنها عزمة [أنظر: ۶۶۸، ۹۰۱] [۱۹]

یہ باب قائم کیا ہے کہ اذان کے اندر بات کرنے کا کیا حکم ہے؟ یعنی مؤذن نے ابھی اذان کے ایک دو کلمے کہے اس کے بعد وہ بات کرنا چاہے تو اس کا کیا حکم ہے؟ فرمایا **"وتكلم سليمان بن صرد فى اذانه"** سلیمان بن صرد نے اپنی اذان کے دوران بات کی۔

یہ روایت امام بخاری رحمہ اللہ کے شیخ ابونعیم نے **"كتاب الصلاة"** میں نکالی ہے۔

---

[۱۸] شرح الزرقانی، ج: ۱، ص: ۲۰۲، وفتح الباری، ج: ۲، ص: ۹۶، والمغنی، ج: ۱، ص: ۲۵۶، وعمدة القاری، ج: ۴، ص: ۱۷۴.

[۱۹] وفى صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب الصلاة فى الرحال فى المطر، رقم: ۱۱۲۸، وسنن أبى داؤد، كتاب الصلاة، باب التخلف عن الجماعة فى الليلة الباردة أو ليلة المطرة، رقم: ۹۰۰، وسنن ابن ماجة، كتاب اقام الصلاة والسنة فيها، باب الجماعة فى الليلة المطيرة، رقم: ۹۲۹.

"وقال الحسن" اور حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ **"لابأس ان یضحک وھو یؤذن أو یقیم"** اُذان اور اقامت کے دوران اگر آدمی ہنس دے تو کوئی حرج نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا یہ اثر کہیں نہیں ملا، البتہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ان کا یہ مذہب متعدد طرق سے مروی ہے کہ وہ اذان کے دوران بات کرنے کو جائز سمجھتے تھے یعنی دوران اذان بات کرنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ [۲۰]

دوران اذان کلام کرنا اور مذاہب ائمہ

حضرت عروہ، عطاء اور قتادہ رحمہم اللہ کا بھی یہی مذہب ابن المنذر نے نقل کیا ہے اور امام احمد رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک ہے، البتہ ابراہیم نخعی، محمد بن سیرین اور امام اوزاعی رحمہم اللہ سے کراہت منقول ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ اسے ممنوع کہتے ہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہ اور صاحبین رحمہما اللہ اسے خلاف اولیٰ قرار دیتے ہیں۔

امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کا مذہب بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ اسے مکروہ کہتے ہیں، الا یہ کہ کوئی بات نماز ہی سے متعلق ہو۔ حنفیہ کی کتابوں میں بھی کراہت منقول ہے، البتہ اگر تھوڑا سا کلام ہو تو اعادہ کی ضرورت نہیں اور اگر کلام کثیر ہو تو استیناف کرنا ہوگا، جیسا کہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے۔ [۲۱]

حضرت امام بخاری رحمہ اللہ کا مذہب ترجمۃ الباب سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اذان کے دوران کچھ گفتگو کرے تو کوئی مضائقہ نہیں، اذان میں کوئی کراہت بھی نہیں اور اس عمل کا کوئی گناہ بھی نہیں، اذان ہو جائے گی۔

انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں ہے کہ ابر آلود دن تھا، بارش کا امکان تھا، مؤذن اذان دے رہا تھا جب **"حيّ على الصلاة"** پر پہنچا تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ اعلان کر دو **"الصلاة في الرحال"** لوگ اپنے اپنے گھروں میں نماز پڑھیں، یعنی بارش کی وجہ سے فرمایا **"الصلاة في الرحال"** اب یہ جملہ اذان کا حصہ نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ دوران اذان کلام جائز ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ معمولی سا ایک آدھ کلمہ ضرورت کے تحت جائز ہے مثلاً اللہ اکبر اللہ اکبر کہا تھا کہ اسپیکر

---

[۲۰] مصنف ابن ابی شیبة، من رخص للمؤذن أن یتکلم فی اذانه، رقم: ۲۱۹۸، ۲۲۰۳، ج: ۱، ص: ۱۹۲، ۱۹۳، والتاریخ الکبیر، رقم: ۳۵۸، ج: ۱، ص: ۱۲۲، وتغلیق التعلیق، باب الکلام فی الاذان، ج: ۲، ص: ۲۶۲.

[۲۱] فتح الباری ج۲: ص ۹۷، ولامع الدراری ج ۱: ص ۲۳۹، ۲۴۰، وعمدة القاری، ج: ۴، ص: ۱۷۹، فیض الباری، ج: ۲، ص: ۱۶۹، أنظر حاشیه: ۱.

خراب ہوگیا، کسی قریب شخص سے کہا کہ بھائی اسے ٹھیک کردیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن لمبی بات بلاضرورت چھوٹا ہی کلمہ کیوں نہ ہو، یہ جائز نہیں البتہ جائز نہ ہونے کے باوجود اذان ہوجائے گی، اس کا اعادہ واجب نہیں۔[۲۲]

امام بخاری رحمہ اللہ نے جو حدیث باب سے استدلال کیا ہے وہ استدلال تام نہیں ہے، کیونکہ **"الصلوٰۃ فی الرحال"** کا اعلان ایسے موقع پر ایک تو امر مشروع ہے، لہٰذا کلام کی تعریف میں داخل نہیں۔

دوسرا یہ کہ اس کا عام طریقہ یہ ہے کہ پہلے اذان پوری کردی جائے، پھر اعلان کیا جائے **"الصلاۃ فی الرحال"** چنانچہ آگے **"باب أذان المسافر"** میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث آرہی ہے، اس سے یہی معلوم ہوتا ہے اور بہت سے علماء مثلاً امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے جو **"حی علی الصلوٰۃ"** پر پہنچ کر اعلان کروایا تو یہ ان کا اپنا اجتہاد ہے اور اسی کو ابن خزیمہ، ابن حبان اور محبّ طبری رحمہم اللہ نے اختیار فرمایا ہے۔[۲۳]

اصل طریقہ یہی ہے کہ اذان پوری ہوجائے تو اس کے بعد اعلان کرے **"الصلوٰۃ فی الرحال"**.[۲۴]

اس میں حضرت عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا **"فی یوم رزغ"** ایک کیچڑ والے دن میں۔ **"رزغ"** [بسكون الزا وقيل بفتحها] اصل میں کیچڑ کو کہتے ہیں اور مراد یہ ہے کہ اس دن بارش کی وجہ سے جب مؤذن **"حی علی الصلوٰۃ"** تک پہنچا تو

---

۲۲ قوله ولو رد سلام أو تشميت عاطس ، أو نحوهما لا في نفسه بعد الفراغ على الصحيح سراج وغيره ، قال في النهر ومنه التنحنح الا لتحسين صوته قوله استأنفه الا اذا كان الكلام يسيرا خانية (حاشيه ابن عابدين ، ج: ١ ، ص: ٣٨٩ ، وبدائع الصنائع ، ج: ١ ، ص: ١٤٩ ، وفيض البارى ، ج: ٢ ، ص: ١٦٩ .

۲۳ ....أن بن عباس قال لمؤذنه فى يوم مطير اذا قلت أشهد أن محمداً رسول الله فلاتقل حى على الصلاة قل صلوا فى بيوتكم فكان الناس استنكروا ذالك فقال أتعجبون من ذا فقد فعله من هو خير منى ان الجمعة عزمة وانى كرهت أن اخرجكم فتمشوا فى الطين والدحض ، صحيح ابن خزيمة ، باب أمر الإمام المؤذن بحذف حى على الصلاة والأمر بالصلاة فى البيوت بدله ، رقم: ١٨٦٥ ، ج:٣ ، ص: ١٨٠ ، وصحيح ابن حبان ، رقم: ٢٠٨٠ ، ج:٥ ، ص: ٤٣٦.

۲۴ ذكره الحافظ فى الفتح : فلما بلغ المؤذن حى على الصلاة فأمره ــــ كذا فيه ، وكان هذا حذفاً تقديره أراد أن يقولها فأمره ، ويؤيده رواية ابن علية "اذا قلت أشهد أن محمد رسول الله فلا تقل حى على الصلاة فى يوم المطر" وكأنه نظر الى المعنى لأن حى على الصلاة والصلاة فى الرحال وصلوا فى بيوتكم يناقض ذلك ، وعند الشافعى وجه انه يقول ذلك بعد الأذان ، وآخر أنه يقوله بعد الحيعلتين ، والذى يقتضيه الحديث ماتقدم الخ ، ج: ٢ ، ص: ٩٨ .

انہوں نے اس کو حکم دیا کہ یہ اعلان کردو **"الصلوٰۃ فی الرحال"** لوگ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کہ یہ کیا چکر ہوگیا، ابھی اذان ہو رہی تھی اور ابھی **"الصلوٰۃ فی الرحال"** کہنا شروع کردیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا **"فعل هذا من هو خير منه"** یہ عمل اس شخص نے کیا جو اس مؤذن سے بہتر تھا یعنی حضور اقدس ﷺ نے یا حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے ایسا عمل کیا **"وإنها عزمة"** اور ایسا کرنا عزیمت ہے یعنی یہ بھی دین کا ایک مستحکم حصہ ہے، یہ نہ سمجھنا کہ میں نے دین میں کوئی تحریف کی ہے۔

(۱۱) باب أذان الأعمى إذا كان له من يخبره

جب کہ نابینا کے پاس کوئی ایسا شخص ہو جو اسے بتلائے کہ اس کا اذان دینا درست ہے

۶۱۷ ـ حدثنا عبد الله بن مسلمة، عن مالك، عن ابن شهاب، عن سالم بن عبد الله عن أبيه أن رسول الله ﷺ قال: أن بلالا لا يؤذن بليل، فكلوا واشربوا حتى ينادى ابن أم مكتوم قال: وكان رجلا أعمى لا ينادى حتى يقال له، أصبحت أصبحت [أنظر: ۶۲۰، ۶۲۳، ۱۹۱۸، ۲۶۵۶، ۷۲۴۸][۲۵]

اعمیٰ کا اذان دینا جائز ہے

حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نابینا تھے، وہ صبح کی اذان اس وقت تک نہ دیتے تھے جب تک لوگ یہ نہ کہدیں کہ صبح ہو رہی ہے۔ یہ بات اس لئے کہی کہ شروع میں معاملہ الٹ تھا حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ رات کو سحری کی اذان دیتے تھے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ فجر کی اذان دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ انہوں نے غلط اذان دے دی، شاید وہ صبح کاذب کو دیکھ کر یہ سمجھے ہوں گے کہ صبح طلوع ہوگئی ہے جبکہ حقیقت میں طلوع نہیں ہوئی تھی، آنکھوں میں بھی کچھ کمزوری آگئی تھی۔ اس کی تلافی کے لئے ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے ان سے اعلان

---

۲۵ وفي صحيح مسلم، كتاب الصيام، باب بيان أن الدخول في الصوم يحصل بطلوع الفجر وأن له، رقم: ۱۸۲۸، و سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ما جاء في الأذان بالليل، رقم: ۱۸۷، وسنن النسائي، كتاب الأذان، باب المؤذنان للمسجد الواحد، رقم: ۶۳۴، ومسند أحمد، مسند المكثرين من الصحابة، باب مسند عبد الله بن عمر بن الخطاب، رقم: ۴۳۲۳، ۴۹۴۸، ۵۰۶۴، ۵۱۶۷، ۵۲۴۱، ۵۵۸۸، ۵۷۷۷، وموطأ مالك، كتاب النداء للصلاة، باب قدر السحور من النداء، رقم: ۱۴۷، ۱۴۸، وسنن الدارمي، كتاب الصلاة، باب في وقت أذان الفجر، رقم: ۱۱۶۴.

کروایا" اف العبد قد نام " کہ بندہ سوگیا تھا۔[۲۶]

اور پھراسی اثنا میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ "لایغرّنکم اذان بلال فان فی بصرہ شیئاً" بلال ؓ کی اذان سے دھوکہ نہ کھایا کرو، اس کی انکھوں میں گڑبڑ ہے، جس کی وجہ سے یہ بعض اوقات وقت سے پہلے اذان دیتے ہیں۔[۲۷]

جب یہ واقعات زیادہ پیش آئے تو آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن ام مکتوم ؓ کو بدل دیا کہ آپ فجر کی اذان دیا کریں اور حضرت بلال ؓ سحری کی اذان دیا کریں۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ حضرت بلال ؓ کی تو معمولی بینائی کم تھی اور یہ تو پورے ہی نابینا تھے، ان کو کیسے مقرر کردیا تو اس شبہ کا ازالہ کردیا کہ "وکان رجلا أعمی لاینادی حتی یقال لہ :أصبحت أصبحت" یہ نابینا تھے، اپنی آنکھ پر بھروسہ نہیں کرتے تھے، جب تک لوگ آکر یہ نہیں کہتے تھے کہ صبح ہوگئی اس وقت تک اذان نہیں دیتے تھے۔

بہرکیف امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث سے استدلال فرمایا ہے، کہ اعمیٰ کا اذان دینا جائز ہے۔ حنفیہ کا بھی یہی مسلک ہے اور علامہ نووی رحمہ اللہ نے جو حنفیہ کی طرف منسوب کیا ہے کہ وہ اذان "اعمی" کو جائز نہیں کہتے، وہ درست نہیں۔[۲۸]

البتہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے محیط سے کراہت نقل کی ہے اگر یہ نقل صحیح ہو تو اس صورت پر محمول ہوگی کہ جب اعمیٰ سے وقت میں اشتباہ کا اندیشہ ہو، چنانچہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے عدم کراہت کی تصریح فرمائی ہے۔[۲۹]

---

[۲۶] عن ابن عمر : ان بلالاً اذن بلیل فامرہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم أن ینادی أن العبد قد نام (ای سها عن وقت صلاۃ الصبح ،....عن ابن عمر رضی اللہ عنہما أن بلالا اذن قبل طلوع الفجر فأمرہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم أن یرجع فنادی الا أن العبد قد نام فرجع الا ان العبد قد نام فهذا ابن عمر رضی اللہ عنہما یروی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ماذکرنا الخ ، شرح معانی الآثار ، باب التأذین للفجر ای وقت هو بعد طلوع الفجر أو قبل ذلک ، ج: ۱، ص: ۱۳۹ .

[۲۷] ......عن انس رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لایغرنکم أذان بلال فإن فی بصرہ شیئا فدل ذلک علی أن بلالاً کان یرید الفجر فیخطئه لضعف بصرہ الخ ، شرح معانی الآثار ، ج: ۱، ص: ۱۴۰ .

[۲۸] ونقل النووی عن أبی حنیفة وداؤد أن أذان الاعمیٰ لایصح وتعقبه السروجی بأنه غلط علی أبی حنیفة نعم فی المحیط للحنیفة کراهة ، کذا فی شرح الزرقانی ، ج: ۱، ص: ۲۲۶، وفتح الباری ج: ۲، ص: ۹۹ .

[۲۹] قال العینی فی العمدة :قلت : هذا غلط لم یقل به ابو حنیفة ، وانما ذکر اصحابنا أنه یکرہ ، ذکرہ فی "المحیط" وفی "الذخیرة" و"البدائع" : غیرہ أحب ، فکان وجه الکراهة لأجل عدم قدرته علی مشاهدة دخول الوقت ، وهو فی الأصول مبنی علی المشاهدة ، ج: ۲، ص: ۱۸۰ .

(١٢) باب الأذان بعد الفجر

فجر کے طلوع ہونے کے بعد اذان کہنے کا بیان

٦١٨ - حدثنا عبد الله بن يوسف: أخبرنا مالك، عن نافع، عن عبدالله بن عمر قال: أخبرتني حفصة أن رسول الله ﷺ كان إذا أعتكف المؤذن للصبح وبدا الصبح صلىّ ركعتين خفيفتين قبل أن تقام الصلاة. [أنظر: ١١٧٣، ١١٨١] [٣٠]

بعد از فجر اذان کا حکم

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ نے پہلے "**باب الأذان بعد الفجر**" قائم کیا ہے اس لئے کہ اذان میں اصل یہی ہے کہ دخول وقت کے بعد ہو، لہٰذا اس کو مقدم رکھا، اور دخول وقت سے پہلے جواذان ہے وہ اصل کے خلاف ہے اگر چہ بعض حضرات ائمہ اس کو فجر کے سلسلے میں جائز کہتے ہیں جیسا کہ آگے اس کی تفصیل آئے گی ان شاء اللہ، اس واسطے فجر سے پہلے اذان دینے کا بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا لیکن یہ خلاف اصل ہے، لہٰذا یہاں اصل کو مقدم کیا۔

اس باب میں وہ روایت ہیں جس میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ "**أن رسول الله ﷺ كان إذا أعتكف المؤذن للصبح**" جب مؤذن صبح کے لئے کھڑا ہو جاتا۔ "**أعتكف**" سے یہاں لغوی معنی "کھڑا ہونا" مراد ہے، اعتکاف مراد نہیں ہے یعنی جب مؤذن اذان دینے کے لئے آجاتا اور اس انتظار میں ٹھہرا رہتا کہ صبح ہو تو میں اذان دوں، "**وبدا الصبح**" اور صبح ظاہر ہو جاتی۔

یہاں موضع استدلال یہ ہے کہ مؤذن اتنی دیر ٹھہرا کرتا تھا کہ صبح صادق طلوع ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ اذان صبح صادق کے بعد ہوا کرتی تھی اور یہی مقصود بالترجمہ ہے۔

---

[٣٠] وفي صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها باب استحباب ركعتي سنة الفجر والحث عليهما وتخفيفهما، رقم: ١١٨٤، وسنن النسائي، كتاب المواقيت، باب الصلاة بعد طلوع الفجر، رقم: ٥٧٩، وكتاب قيام الليل وتطوع النهار، باب وقت ركعتي الفجر، رقم: ١٧٣٩، ١٧٥٢، ١٧٥٦، وسنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب ماجاء في الركعتين قبل الفجر، رقم: ١١٣٥، ومسند أحمد، باقي مسند الانصار، باب حديث حفصة أم المؤمنين بنت عمر بن الخطاب، رقم: ٢٥٢١٩، ٢٥٢٢٣، وموطأ مالك، كتاب النداء للصلاة، باب ماجاء في ركعتي الفجر، رقم: ٢٦٠، وسنن الدارمي، كتاب الصلاة، باب القرأة في ركعتي الفجر، رقم: ١٤٠٨.

جب صبح ظاہر ہو جاتی تو "صلّی رکعتین خفیفتین قبل أن تقام الصلوٰة" آپ ﷺ ہلکی ہلکی دو رکعتیں نماز قائم ہونے سے پہلے پڑھا کرتے تھے، وہ سنت فجر ہیں۔

(۱۳) باب الأذان قبل الفجر

فجر کی اذان صبح ہونے سے پہلے کہنے کا بیان

۶۲۱ ـ حدثنا أحمد بن یونس قال: حدثنا زهیر قال: حدثنا سلیمان التیمی، عن أبی عثمان النهدي، عن عبد الله بن مسعود عن النبی ﷺ قال: لایمنعن أحدکم ـ أو أحدا منکم ـ أذان بلال من سحوره فإنه یؤذن أو ینادی بلیل لیرجع قائمکم، ولینبه نائمکم، ولیس أن یقول: الفجر أو الصبح وقال بأصابعه ورفعها إلی فوق، وطأطأ إلی أسفل ـ حتی یقول هکذا، وقال زهیر بسبابتیه أحداهما فوق الأخری ثم مدهما عن یمینه وشماله. [أنظر: ۵۲۹۸، ۷۲۴۷] [۱۳]

طلوع فجر سے قبل اذان کا حکم

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا، "**لایمنعن أحدکم أواحدا منکم أذان بلال** رضی اللہ عنہ **من سحوره**" الخ تم میں سے کسی شخص کو بلال کی اذان سحری کھانے سے منع نہ کرے، کیونکہ وہ رات کے وقت اذان دیتے ہیں تاکہ تم میں سے کھڑے ہوئے لوگ لوٹ آئیں، "**لیرجع قائمکم، یا لیرجع قائمکم**" اس کے معروف معنی جو اکثر حضرات نے بیان فرمائے ہیں وہ یہ ہیں کہ جو شخص تہجد پڑھ رہا ہے یا تہجد میں کھڑا ہے وہ ان کی اذان سن کر لوٹ آئے کہ بھائی اب صبح قریب ہے، لہٰذا اب تہجد ختم کر کے سحری کھالیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی توجیہ

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میری سمجھ میں اس کے یہ معنی آئے ہیں کہ "**قائمکم**" سے

---

[۱۳] وفی صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب بیان أن الدخول فی الصوم یحصل بطلوع الفجر وان له الأکل، رقم: ۱۸۳۰، وسنن أبی داؤد، کتاب الصوم، باب وقت السحور، رقم: ۲۰۰۰، وسنن ابن ماجة، کتاب الصیام، باب ماجاء فی تأخیر السحور، رقم: ۱۶۸۲، ومسند أحمد، مسند المکثرین من الصحابة، باب مسند عبد الله بن مسعود، ۳۴۷۲، ۳۵۳۳، ۳۹۲۳.

مراد وہ لوگ ہیں جو قضاء حاجت کے لئے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اب وہ ان کی آواز سن کر لوٹ آئیں، کیونکہ صبح طلوع ہونے والی ہے، لہٰذا آکر جلدی سے تہجد پڑھ لیں تا کہ صبح ہونے سے پہلے پہلے تہجد کی نماز پڑھ سکیں۔

"ولینبہ نائمکم" اور اس لئے اذان دیتے ہیں تا کہ تم میں سے جو لوگ سونے والے ہیں ان کو بیدار کر دیں، یا تو تہجد پڑھنے کے لئے یا سحری کھانے کے لئے **"ولیس ان یقول الفجرا والصبح" الخ**، اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ فجر یہ نہیں ہے کہ یوں ہو جائے اور اوپر سے آپ ﷺ نے اشارہ فرمایا یعنی وہ روشنی جو سیدھی لمبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ یوں ہو جائے یعنی عرضاً پھیل جائے۔

تو اشارہ فرما دیا کہ مستطیل ہوتی ہے وہ حقیقت میں صبح نہیں ہوتی لہٰذا اس پر صبح کے احکام جاری نہیں ہوتے۔ حقیقت میں صبح وہ ہے جو دائیں بائیں، عرضاً پھیل جائے۔ چنانچہ فرمایا **"ولیس أن یقول الفجر أو الصبح"** زبان سے تو اتنا لفظ بیان فرمایا **"وقال باصابعہ ورفعھا إلی فوق وطأ طأ الیٰ اسفل"** اوپر اٹھایا پھر نیچے کی طرف کیا، **"حتی یقول ھکذا"** جب تک کہ ایسا نہ کر دیں۔

"وقال زھیر: بسبابتیہ" اپنے سبابتین سے اشارہ فرمایا **"أحداھما فوق الأخری"** ایک سبابہ کو دوسری کے اوپر رکھا **"ثم مدھما عن یمینہ وشمالہ"**.

یہ بتلانا مقصود ہے کہ جو سبابہ نیچے سے اوپر کو جاتی ہے وہ ہے اور وہ رات کا منتہی اور دن کا مبتدا نہیں ہے۔

اس حدیث میں چند مسائل قابل ذکر ہیں:

طلوع فجر سے قبل اذان فجر اور اختلاف ائمہ

ائمہ ثلاثہ کا مسلک

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ائمہ ثلاثہ یعنی امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ اور حنفیہ میں سے امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے اس حدیث سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ فجر کی اذان طلوع فجر سے پہلے بھی جائز ہے اگر فجر سے پہلے اذان دے دی جائے تو وہ اذان کافی ہو جائے گی، اعادہ کی حاجت نہیں ہے۔[۳۲]

حدیث باب سے استدلال کیا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ طلوع فجر سے پہلے اذان دیا کرتے تھے۔

حنفیہ کا مسلک

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ طلوع فجر سے پہلے اذان جائز نہیں ہے کیونکہ اذان دخول وقت کا

---

۳۲ احتج بہ الأوزاعی وعبد اللہ بن المبارک ومالک والشافعی واحمد واسحاق وداؤد وابن جریر الطبری فقالوا: یجوز أن یؤذن للفجر قبل دخول وقتہ، وممن ذھب الیہ: ابو یوسف، واحتج أیضاً بما رواہ البخاری أن عائشۃ عن النبی انہ قال: ان بلالاً یؤذن بلیل فکلوا واشربوا حتی یؤذن ابن ام مکتوم. عمدۃ القاری، ج:۴، ص: ۱۸۲.

اعلان ہے، لہٰذا دخول وقت کے بعد ہی ہونی چاہئے اگر وقت سے پہلے دی جائے تو وہ اعلان نہیں بلکہ اضلال ہوا۔ اس لئے جائز نہیں، یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل ہے۔

علاوہ اس قیاس کے کہ یہ اعلام نہیں اضلال ہو جائے گا، طحاوی اور ابوداؤد کی حدیث ہے کہ ایک مرتبہ حضرت بلال ﷺ نے وقت سے پہلے اذان دے دی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ اور اعلان کرو کہ **"انّ العبد قد نام"** تو باقاعدہ اعلان کروایا اور اس کے بعد حضرت عبداللہ بن ام مکتوم ﷺ کو مقرر کیا جو اس وقت تک اذان نہ دیتے تھے جب تک لوگ **"أصبحت أصبحت"** نہ کہہ دیتے۔[۴۳]

اس لئے جہاں تک حدیث باب سے استدلال کا تعلق ہے تو میری عقل حیران ہے کہ ائمہ ثلاثہ اس سے کیسے استدلال کرتے ہیں جبکہ اس حدیث میں صراحۃً موجود ہے کہ ابن ام مکتوم ﷺ صبح کے وقت میں اذان دیتے تھے۔ ان کا استدلال اس وقت تام ہوتا کہ جب رات کی اذان پر اکتفا کیا گیا ہوتا اور طلوع صبح صادق کے بعد دوبارہ اذان نہ دی گئی ہوتی، لیکن وہ خود بھی مانتے ہیں اور روایت میں بھی صراحت ہے کہ حضرت بلال ﷺ کی اذان پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ طلوع فجر کے بعد حضرت عبداللہ بن ام مکتوم ﷺ اذان دیتے تھے، لہٰذا اس سے کیسے استدلال درست ہوسکتا ہے؟

البتہ اگر کوئی ایسا واقعہ بیان کیا جائے جس میں رات ہی میں اذان دی گئی ہو طلوع فجر سے پہلے پہلے اور پھر طلوع فجر کے بعد دوبارہ اذان نہ دی گئی ہو تو پھر ائمہ ثلاثہ کی دلیل بن سکتا ہے۔

دوسرا مسئلہ اس حدیث میں حضرت بلال ﷺ کی اذان کا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ طلوع فجر سے پہلے اذان کیوں دی جاتی تھی؟

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ایسا صرف رمضان میں سحری کے لئے اٹھانے کے واسطے کیا جاتا تھا، جیسا کہ روایت کے الفاظ **"کلوا واشربوا"** اس پر دلالت کررہے ہیں **"لایمنعن أحدکم أوأحداً منکم أذان بلال من سحورہ"** معلوم ہوا یہ رمضان کا زمانہ ہے۔ اس اذان سے مقصود لوگوں کو سحری کے لئے بیدار کرنا تھا، فجر کی اذان مراد نہیں تھی، خود حضور اقدس ﷺ نے وجہ بھی بیان کردی کہ **"لیرجع قائمکم ولینبّہ نائمکم"**.

---

۴۳ وقال الثوری وأبی حنیفة ومحمد وزفر بن الهذیل : لایجوز ان یؤذن للفجر ایضا الا بعد دخول وقتها ، کما لا یجوز لسائر الصلوات الا بعد دخول وقتها ، لانه للاعلام به ، وقبل دخوله تجهیل ولیس باعلام ، فلا یجوز———

ومن اقوی الد لائل علی أن أذان بلال لم یکن لاجل الصلاة مارواه الطحاوی من حدیث حماد بن سلمة .... عن ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنهم ، ان بلالا أن ..... ، شرح معانی الآثار ، باب التأذین للفجر أی وقت هو بعد طلوع الفجر أو قبل ذلک ، ج: ۱ ، ص: ۱۳۹ ، وسنن أبی داؤد ، بـاب فی الأذان قبل دخول الوقت ، رقم: ۵۳۲ ، ج: ۱ ، ص: ۱۴۶ ، وعمدة القاری ، ج: ۴ ، ص: ۸۳ ، وفتح الباری ، ج: ۲ ، ص: ۱۰۴ .

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج بھی ایسا کیا جا سکتا ہے کہ سحری کے وقت اذان دے دی جائے؟

اس میں خود فقہاء حنفیہ کے دو قول ہیں:

بعض کہتے ہیں کہ جائز ہے اور بعض کہتے ہیں ایسا نہ کریں کیونکہ اس میں اشتباہ کا اندیشہ ہے۔ صحابہ کرام ﷺ سے بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ بعد میں اس کو معمول بنایا ہو۔

بعض حضرات نے اس کی توجیہ یوں کی ہے کہ یہ مستقل اذان تھی اور سحری کے لئے جگانے کے لئے نہیں تھی بلکہ اذان تہجد تھی۔ حنفیہ اذان تہجد کی مشروعیت کے قائل نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اذان صرف فرائض کے لئے ہے، یہاں تک کہ واجبات کے لئے بھی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ عیدین اور کسوف کے لئے اذان نہیں، تہجد چونکہ نوافل میں سے ہے، لہٰذا تہجد کے لئے بھی اذان نہیں ہے۔

رہی یہ بات کہ حضرت بلال ﷺ کی اذان تہجد کے لئے ہوتی تھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ شروع میں ایسا ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت بلال ﷺ کو اس کا حکم دیا تھا لیکن پھر صحابۂ کرام ﷺ کا عمل اس پر جاری نہیں رہا۔[۳۴]

چنانچہ طحاوی رحمہ اللہ نے علقمہ کی روایت ذکر کی ہے کہ ایک مرتبہ وہ کسی جگہ گئے جہاں انہوں نے دیکھا کہ مؤذن نے تہجد کے وقت اذان دی، انہوں نے کہا **"انه خالف سنته أصحاب رسول الله ﷺ"** اگر یہ شخص سوتا رہتا تو بہتر تھا کیونکہ اس نے اصحاب رسول اللہ ﷺ کی سنت کی مخالفت کی ہے۔

اب یہ علقمہ حضرت ابن عمر ﷺ سے روایت کرتے ہیں اور عبداللہ بن عمر ﷺ **"حديث باب أن بلالا يؤذن بليل"** کے بھی راوی ہیں۔ یہاں اگرچہ حضرت ابن مسعود ﷺ سے مروی ہے لیکن دوسری جگہ عبداللہ بن عمر ﷺ سے بھی مروی ہے تو باوجود اس حدیث کے راوی ہونے کے انہوں نے تہجد کی اذان پر نکیر فرمائی، اور وجہ یہ بتلائی کہ یہ صحابۂ کرام ﷺ کی سنت کے خلاف ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے بعد صحابۂ کرام ﷺ نے اذان تہجد کو بند کر دیا تھا۔ اس لئے اذان تہجد کے بارے میں حنفیہ کا مؤقف یہ ہے کہ وہ مشروع نہیں، چنانچہ بعد میں کہیں نہیں آیا کہ صدیق اکبر ﷺ، حضرت عمر ﷺ، عثمان ﷺ، علی ﷺ اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں تہجد کی اذان ہوا کرتی ہو، اس لئے حنفیہ کہتے

---

[۳۴] **قلت : قال البيهقي :ان صح هذا يحمل عند الجمهور على أنه ﷺ قال حين كان المنادى ينادى قبل طلوع الفجر بحيث يقع شربه قبل طلوع الفجر اه. قلت ويستفاد منه أن الأذان قبل الفجر كان فى زمان ثم انقطع فيما بعده ولذا حمله على زمان تعدد الأذان فلو كان الاذان قبل الفجرا امرا مستمراً لم تكن في قوله " حين كان المنادى الخ" فائدة .ثم اذاعلمت جواز الأكل بعد الصبح من رواية الطحاوى صراحةً فلا فائدة من هذا التأويل والله تعالىٰ أعلم ، فيض البارى ، ج:٢، ص:١٧٥، حاشية : ١.**

ہیں کہ تہجد کی اذان نہیں ہے۔[۳۵]

(۱۴) باب كم بين الأذان والإقامة ومن ينتظر إقامة الصلاة؟

اذان اور اقامت کے درمیان کتنا فصل ہونا چاہیئے اور اس شخص کا بیان جو اقامت کا انتظار کرے

۶۲۴ ـ حدثنا اسحاق الواسطي قال: حدثنا خالد عن الجريري عن ابن بريدة، عن عبد الله بن مغفل المزني أن رسول الله ﷺ قال: بين كل أذانين صلاة ثلاثا لمن شاء. [أنظر: ۶۲۷][۳۶]

آپ ﷺ نے تین مرتبہ یہ بات ارشاد فرمائی کہ "**بين كل اذانين صلوة**" پھر فرمایا "**لمن شاء**" یعنی واجب نہیں ہے، لیکن جو پڑھنا چاہے۔ تو اذان اور اقامت کے دوران کوئی نہ کوئی نماز پڑھ سکتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ پانچوں وقتوں میں اذان اور اقامت کے دوران کوئی نہ کوئی نماز مشروع ہے اسی سے عشاء کی نماز سے پہلے کی رکعتوں کی دلیل ملتی ہے، باقی نمازوں کی رکعتیں تو صراحۃً ثابت ہیں۔

---

[۳۵] وأخرج الطحاوی عن سفيان بن سعيد أنه قال له رجل إني أؤذن قبل طلوع الفجر لأكون أول من يقرع باب السماء بالنداء فقال سفيان لا حتى ينفجر الفجر وقد روى عن علقمة عن هذا الشيء.

وعن علقمة عنده قال ابراهيم: قال شيعنا علقمة إلى مكة فخرج بليل فسمع مؤذنا يؤذن بليل فقال أما هذا فقد خالف سنة أصحاب رسول الله ﷺ لو كان نائماً كان خيرا له فاذا طلع الفجر أذن فأخبر علقمة أن التأذين قبل طلوع الفجر خلاف لسنة أصحاب رسول الله ﷺ، شرح معاني الآثار، ج: ۱، ص: ۱۴۱ ومصنف ابن أبي شيبة، ج: ۱، ص: ۱۹۴، رقم: ۲۲۲۴.

وفي مصنف عبد الرزاق عن ابراهيم: قال كانوا اذا اذن المؤذن بليل أتون فقالوا اتق الله وأعد اذانك، رقم: ۱۸۸۹، ج: ۱، ص: ۴۹۱، وفي التمهيد، ج: ۱، ص: ۲۰، وراجع: لتفاصيله نصب الراية للزيلعي، ج: ۱، ص: ۲۸۵، وفيض الباري، ج: ۲، ص: ۱۷۱.

[۳۶] وفي صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين و قصرها، باب بين كل أذانين صلاة، رقم: ۱۳۸۴، وسنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ماجاء في الصلاة قبل المغرب، رقم: ۱۷۰، وسنن النسائي، كتاب الأذان، باب الصلاة بين الأذان والإقامة، رقم: ۶۷۴، وسنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب الصلاة قبل المغرب، رقم: ۱۰۹۱، وسنن ابن ماجه، كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها، باب ماجاء في الركعتين قبل المغرب، رقم: ۱۱۵۲، ومسند أحمد، أوّل مسند المدنيين أجمعين، ۱۶۱۸۸، أول مسند البصريين، رقم: ۱۹۶۳۶، ۱۹۶۵۱، ۱۹۶۶۵، وسنن الدارمي، كتاب الصلاة، باب حديث عبد الله بن مغفل المزني عن النبي، رقم: ۱۴۰۴.

فجر سے پہلے دو رکعت، ظہر سے پہلے چار، عصر سے پہلے چار، مغرب سے پہلے کا بھی پیچھے گزر چکا ہے اور یہاں بھی آرہا ہے لیکن عشاء سے پہلے نماز پڑھنے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔
اس لئے بعض خشک قسم کے غیر مقلدین نے کہدیا کہ یہ بدعت ہے، کیونکہ روایات میں کہیں اس کا تذکرہ نہیں ہے، لیکن حدیث باب کہہ رہی ہے کہ "**بین کل أذانین صلوٰۃ**" اس کے عموم میں عشاء بھی داخل ہے۔

عشاء سے پہلے چار رکعت کی تخصیص کیسے ہوئی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تخصیص قیاس کے ذریعہ ہوئی، کیونکہ ہر نماز سے پہلے جو رکعتیں مشروع ہیں، وہ اس نماز کی تعداد کے مطابق ہیں۔ فجر کی دو رکعتیں فرض ہیں تو اس سے پہلے سنتیں بھی دو ہیں۔ ظہر کی چار رکعتیں فرض ہیں تو اس سے پہلے سنتیں بھی چار ہیں۔ عصر کے چار فرض ہیں تو اس سے پہلے سنتیں بھی چار ہیں۔ مغرب میں تین رکعتیں چونکہ خلاف عادت ہیں اس کے مقابل دو رکعتیں ہوگئیں۔ اور عشاء کے چار فرض ہیں، لہٰذا اس سے پہلے بھی چار رکعتیں ہونی چاہئیں۔ اس قیاس کی بنا پر علماء نے یہ ذکر کیا ہے۔ [۳۷]

علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ نے "**بدائع الصنائع**" میں اربعہ قبل العشاء کی ایک روایت ذکر کی ہے۔ [۳۸]
لیکن مجھے باوجود تلاش کے وہ کتب حدیث میں نہیں ملی ہے کہ اس کا حوالہ دیتا۔ [۳۹]

---

۳۷ لأن العشاء نظير الظهر في أنه يجوز التطوع قبلها وبعدها . بدائع الصنائع ، ج: ١، ص: ٢٨٥ .

وامّا الاربع قبلها (أي قبل صلاة العشاء) فلم يذكر في خصوصها حديث لكن يستدل له بعموم مارواه الجماعة من حديث عبد الله بن مغفل رضي الله عنه الخ فهذا مع عدم المانع من التنفل قبلها يفيد الاستحباب ، لكن كونها اربعاً يتمشئ على قول أبي حنيفة رحمه الله ، لأنها الأفضل عنده ، فيحمل عليها حملا للمطلق على الكامل ذاتا ووصفا اه، الخ ، اعلاء السنن ، ج:٧، ص: ٢٠ .

۳۸ وإنما قال في الأصل أن التطوع بالاربع قبل العشاء حسن لان التطوع بها لم يثبت أنه من السنن الراتبة ولو فعل ذلك فحسن ، بدائع الصنائع ، ج: ١، ص: ٢٨٥ .

۳۹ ففي سنن سعيد بن منصور من حديث البراء رفعه من صلى قبل العشاء اربعا كان كانما تهجد من ليلته الخ ، الدراية، ج: ١، ص: ١٩٨ ، وقال انها مفسرة في الحديث على نحو ماذكر وهي ركعتان قبل الفجر واربع قبل الظهر وبعد ها ركعتان واربع قبل العصر وان شاء ركعتين وركعتا ن بعد المغرب واربع قبل العشاء واربع بعدها وان شاء ركعتين ثم قال غير انه لم يذكر الاربع قبل العصر في الحديث فلهذا سماه في الاصل حسنا وخير لاختلاف الآثار والافضل هو الاربع ولم يذكر الأربع قبل العشاء ولهذا كان مستحبا لعدم المواظبة وذكر فيه ركعتين بعد العشاء وفي غير ذكر الاربع فلهذا خير الا أن الاربع أفضل خصوصا عند أبي حنيفة ، نصب الراية ، باب النوافل ، ج: ٢، ص: ١٣٧ .

۶۲۵ ـ حدثنا محمد بن بشار قال: حدثنا غندر قال: حدثنا شعبة قال : سمعت عمرو بن عامر الأنصاري عن أنس بن مالک قال: كان المؤذن اذا أذن قام نأس من أصحاب النبی ﷺ يبتدرون السواري حتى يخرج النبی ﷺ وهم كذلک يصلون الر كعتين قبل المغرب ولم يكن بينهما شيء قال: وقال عثمان بن جبلة وأبو داؤد عن شعبة : لم يكن بينهما إلا قليل [راجع: ۵۰۳]

''ركعتين قبل المغرب'' کا ثبوت

حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ جب مؤذن اذان دیتا تو اصحاب محمد ﷺ میں سے چند لوگ جلدی سے ستونوں کی طرف دوڑتے تھے، یہاں تک کہ حضور اقدس ﷺ نکل آتے ''**وهم كذلك يصلون**'' اور وہ مغرب سے پہلے کی دو رکعتیں پڑھ رہے ہوتے تھے۔ یہ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کی ''**ركعتين قبل المغرب**'' پر دلیل ہے۔ (مسئلہ پہلے گزر چکا ہے)

حنفیہ کی طرف منسوب ہے کہ وہ اس کو مکروہ تنزیہی کہتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ تعجیل مغرب کی احادیث بہت قوی ہیں، آنحضرت ﷺ نے تعجیل مغرب کا حکم دیا اور یہ دو رکعتیں تعجیل مغرب کے منافی ہیں، اگر سب سے کہیں گے کہ پڑھو تو کوئی پہلے شروع کرے گا، کوئی بعد میں، اس لئے اس میں بہت وقت نکل جانے کا اندیشہ ہے۔ لیکن صحیح اور انصاف کی بات یہ ہے کہ ''**ركعتين قبل المغرب**'' کی کراہیت پر کوئی دلیل نہیں ہے اور جواز کے دلائل بہت سارے ہیں مثلاً ''**بين كل اذا نين صلوٰة**'' اور حدیث باب جس میں صحابہ کرام ؓ سے پڑھنا ثابت ہے وغیرہ۔

حنفیہ کے دلائل

جہاں تک تاخیر کی بات ہے تو دو رکعت میں کتنی تاخیر ہوگی، مشکل سے دو منٹ لگیں گے، جب تک اشتباک نجوم نہ ہو جائے اس وقت تک مکروہ نہیں ہے، اس واسطے وجہ کراہیت کوئی نہیں۔

حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ بھی فرماتے ہیں کہ اس کو مکروہ سمجھنا صحیح نہیں ہے اور شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بھی ترمذی کی تقریر میں یہی فرمایا ہے کہ اس کو مکروہ سمجھنا صحیح نہیں ہے، اگرچہ بخاری کی تقریر میں اس کے برعکس بات نظر آرہی ہے لیکن پتہ نہیں کون سا مقدم اور کون سا قول مؤخر ہے۔ بہر حال حضرت گنگوہی رحمہ اللہ جو سید الطائفہ ہیں اور ابو حنیفہ آخر کے لقب سے مشہور ہیں۔ ان کا کہنا یہی ہے کہ اس کو مکروہ کہنا غلط ہے، لہٰذا جہاں کہیں تاخیر مغرب کا اندیشہ نہ ہو وہاں پڑھ لینی چاہئے۔

احناف اس کے جواب میں دلیل کے طور پر سنن دار قطنی، بیہقی اور مسند بزار کی اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جس میں مغرب کا استثناء موجود ہے، چنانچہ دار قطنی اور بیہقی میں روایت ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے: **"ان عند کل اذانین رکعتین ماخلا صلاۃ المغرب"**.[۴۰]

اس پر بعض حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ استثناء ضعیف ہے حتیٰ کہ علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے، کیونکہ اس روایت کا مدار حیان پر ہے، جنہیں فلاس نے کذاب قرار دیا ہے۔[۴۱]

اس کے جواب میں حضرت علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے **"اللآلی المصنوعة فی الاحادیث الموضوعة"** میں فرماتے ہیں کہ درحقیقت حیان نام کے دو راوی ہیں: حیان بن عبداللہ الدارمی[۴۲] اور دوسرے حیان بن عبید اللہ البصری، حیان دارمی کو بلاشبہ فلاس نے کذاب قرار دیا ہے، لیکن حیان بصری صدوق ہیں اور یہ روایت انہی سے مروی ہے۔[۴۳]

پھر امام بیہقی نے امام ابن خزیمہ رحمہما اللہ کا بھی قول نقل کیا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

" و زاد علماً بأن هذه الرواية خطأ أن ابن المبارک قال فی حدیثه کهمس فکان بن بریدة یصلی قبل المغرب رکعتین فلو کان بن بریدة قد سمع من أبیه عن النبی ﷺ هذا الإستثناء الذی زاد حیان بن عبید الله فی الخبر ما خلا صلاة المغرب لم یکن یخالف خبر النبی ﷺ".[۴۴]

اگر امام بیہقی رحمہ اللہ اور ابن خزیمہ رحمہ اللہ کا یہ خیال درست ہو تو اس روایت سے حنفیہ کا استدلال کمزور ہو جاتا ہے۔

البتہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس پر اعتراض کیا ہے: **"ورواه حیان بن عبید الله عن عبد الله بن بریدة وأخطأ فی إسناده وأتی بزیادة لم یتابع علیها".**

---

[۴۰] سنن الدار قطنی، باب الحث علی الرکوع بین الاذانین فی کل صلاة والرکعتین قبل المغرب والاختلاف فیه، رقم: ۱، ص: ۲۶۴، وسنن البیهقی الکبری، رقم: ۴۲۷۱، ج: ۲، ص: ۴۷۴.

[۴۱] عمدة القاری، ج: ۴، ص: ۱۹۴.

[۴۲] حیان بن عبد الله أبو جبلة الدارمی، قال الفلاس کذاب وکان صائغاً الخ، میزان الإعتدال فی نقد الرجال، رقم: ۲۳۸۹، ج: ۲، ص: ۴۰۰، ولسان المیزان، رقم: ۱۵۲۴، ۱۵۲۵، ج: ۲، ص: ۳۸۹.

[۴۳] وقال أبو حاتم صدوق وقال اسحاق بن راهویة حدثنا روح بن عباد حدثنا حیان بن عبید الله وکان رجل صدق وذکره بن حبان فی الثقات، ج: ۱، ص: ۲۳۰، وقال ابن حزم مجهول فلم یصب، لسان المیزان، رقم: ۱۵۲۶، ج: ۲، ص: ۳۷۰.

[۴۴] سنن البیهقی الکبریٰ، باب من جعل قبل صلاة المغرب رکعتین، رقم: ۴۲۷۲، ج: ۲، ص: ۴۷۴.

البتہ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جہاں جماعت میں وقت ہوتو وہاں پڑھ لینی چاہئے، جیسے حرمین شریف میں ہوتا ہے، تو خواہ مخواہ اس ضد میں بیٹھے رہنا کہ میں حنفی ہوں، چاہے کچھ بھی ہو جائے میں بیٹھا رہوں گا، یہ درست نہیں۔ اس صورت میں پڑھ لینی چاہئے۔

یہ خروج عن التقلید نہیں ہے

پہلے بھی بتایا ہے کہ جہاں حدیث آجائے اور اس کے معارض کوئی چیز موجود ہو اور کوئی متبحر عالم اس حدیث صحیح کی وجہ سے امام کے قول کو چھوڑ کر حدیث پر عمل کرے، تو اس کو خروج عن التقلید نہیں کہتے، کیونکہ خود امام کا کہنا ہے **"اذاصح الحدیث فھو مذھبی"** اسی واسطے خود متأخرین حنفیہ نے ایک جگہ نہیں، دسیوں جگہ امام کے قول کے خلاف فتوی دیا ہے۔ [۴۵]

ایک بات ایسی ہے جس سے ہمیشہ پرہیز کرنا چاہئے اور وہ ہے فتنہ پیدا کرنا۔ اب یہ دو رکعت پڑھنا جائز ہے اور جہاں وقت ہو وہاں پڑھ لینا چاہئے لیکن کوئی ایسی جگہ ہے جہاں رکعتین قبل المغرب کی ہوا بھی نہیں لگی، اگر وہاں جاکر شروع کردیں تو فتنہ پیدا ہو جائے گا اور چہ میگوئیاں شروع ہو جائیں گی، تو ایسی جگہ نہ پڑھیں، البتہ جب موقع ملے مسئلہ بتادیں کہ یہ بھی جائز ہے۔

(۱۷) باب من قال: لیؤذن فی السفر مؤذن واحد

کیا سفر میں ایک ہی موذن کو اذان دینا چاہیے

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس پر جو باب قائم کیا ہے **"باب من قال: لیؤذن فی السفرمؤذن واحد"** اس سے ایک مسئلہ کی طرف اشارہ ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ بنوامیہ کے دور سے اذان کا یہ طریقہ معروف ہوا تھا کہ جس کو **"اذان الجوق"** کہتے ہیں کہ حرم میں جتنے منارے ہیں ہر منارے پر ایک مؤذن چڑھ جاتا تھا، ایک منارہ سے مؤذن کہتا اللہ اکبر اللہ اکبر اور خاموش ہو جاتا، پھر دوسرے منارہ والا کہتا اللہ اکبر اللہ اکبر اور خاموش ہو جاتا، پھر تیسرے منارہ والا، چوتھے پانچویں والا حرم مکہ میں پانچ منارے تھے، جب پانچوں اللہ اکبر کہہ دیتے تو پھر اللہ اکبر اللہ اکبر پہلے منارے والا کہتا پھر چاروں کہتے، اس کے بعد اسی طرح **"أشھد أن لا الہ الا اللہ"** کہتے، تو پانچوں آدمی مل

---

[۴۵] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: عقد الجید، ج: ۱، ص: ۲۷، ۳۲، والعارف الشعرانی عن کل من الائمة الأربعة أنه قال: اذا صح الحدیث فھو مذھبی الخ حاشیة ابن عابدین، ج: ۱، ص: ۳۸۵.

کراذان دیتے تھے اس کو اذان الجوق کہتے ہیں۔[۴۶]

یہ طریقہ بنوامیہ کے دور سے شروع ہوا تھا اور ابھی تقریباً دس سال پہلے تک جاری رہا، اسی طرح ہوتا تھا۔

پہلی دفعہ جب میں حج کے لئے گیا تو اس وقت میں بچہ تھا، وہاں جا کر دیکھا کہ اذان میں آدھا گھنٹہ لگتا ہے اس لئے کہ حرم کے جتنے منارے ہیں ہر ایک میں ایک مؤذن کھڑا ہے اور اذان دے رہا ہے بعد میں ایسا بھی ہوا کہ سب اکھٹے اذان دینے لگے اور اب جب سے لاؤڈ اسپیکر کا شیوع ہوا ہے یہ قصہ ختم ہوگیا۔ اب ایک ہی مؤذن اذان دیتا ہے، اب آٹھ چند سالوں سے ایک ہی مؤذن اذان دے رہا ہے۔

تو یہ جو مختلف مناروں پر مختلف مؤذن کھڑے ہو کر اذان دیا کرتے تھے اس کو اذان الجوق کہتے تھے۔ بعض حضرات اس اذان الجوق کو بدعت کہتے ہیں لیکن دراصل یہ حضرت فاروق اعظم ﷺ کے عمل سے نکلتی ہے۔ بخاری میں جہاں حدیث رجم کا ذکر آتا ہے وہاں یہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم ﷺ خطبہ دینے کے لئے تشریف لائے اور خطبہ کے لئے ممبر پر بیٹھے، **"فلما سکت المؤذنون"** جب مؤذن خاموش ہو گئے تو حضرت فاروق اعظم ﷺ کھڑے ہوئے اور خطبہ دیا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر ﷺ کے زمانہ میں بھی مؤذن ایک سے زائد تھے۔ دوسری طرف اذان الجوق کا رواج بکثرت ہوگیا تھا اس لئے بعض لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ اذان کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ متعدد مؤذن اذان دیں، اگر اکیلا آدمی اذان دے تو وہ خلاف سنت یا کم از کم خلاف اولیٰ ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہاں یہ باب قائم کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ایک مؤذن کی اذان خلاف اولیٰ نہیں ہے، کیونکہ حدیث باب میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے **"فلیؤذن لکم أحدکم"** ایک کو اذان دینے کا حکم دیا، معلوم ہوا ایک کا آذان دینا سنت کے عین مطابق ہے، اگر چہ یہ حکم سفر میں ہے لیکن اس باب میں سفر اور حضر میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ سفر میں ایک اذان زیادہ بہتر ہے اس واسطے کہ حضر میں متعدد مؤذنین کی ضرورت پیش آتی ہے، بڑے شہروں میں اگر مؤذن ایک مینار پر کھڑے ہوکر اذان دے گا تو ضروری نہیں کہ اس کی آواز چاروں طرف پہنچ جائے، لہٰذا مختلف جگہوں پر کھڑے ہو کر اذان دینے میں دوسری تمام جگہوں پر آواز پہنچنے کا یقین ہو جاتا ہے، بخلاف سفر کے کہ وہاں لوگ مجتمع ہوتے ہیں، لہٰذا ایک سے زیادہ مؤذن کی ضرورت نہیں، اس لئے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ اسی طرح اگر مسجد ہی بڑی ہو تو پھر لاؤڈ اسپیکر نے ہمیں بہت ساری چیزوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔

۶۲۸ - حدثنا معلی بن أسد قال: حدثنا وهیب، عن أیوب عن أبی قلابة عن

---

[۴۶] أن أول من احدث أذان اثنين معا بنو امية اه.، حاشية ابن عابدين، مطلب في الجوق، ج: ۱، ص: ۳۹۰.

مالک بن الحويرث : أتيت النبي ﷺ في نفر من قومي ، فأقمنا عنده عشرين ليلة. وكان رحيما رفيقا . فلما رأى شوقنا إلى أهالينا قال: أرجعوا فكونوا فيهم وعلموهم وصلوا ، فإذا حضرت الصلاة فليؤذن لكم أحدكم ، وليؤمكم أكبركم " [أنظر : ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۵۸ ، ۶۸۵ ، ۸۱۹ ، ۲۸۴۸ ، ۶۰۰۸ ، ۷۲۴۶][۴۷]

اتباع دین کی تعلیم

حضرت مالک بن حویرث ﷺ فرماتے ہیں کہ میں اپنی قوم کے کچھ لوگوں کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور بیس راتوں تک آپ ﷺ کے پاس قیام اختیار کیا اور مقیم ہوگیا، "**وكان رحيماً رفيقا**" آپ ﷺ بڑے رحم والے اور نرم دل تھے۔ "**فلما رأى شوقنا إلى أهالينا**" جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ ہمارے دل میں اپنے گھر والوں کا اشتیاق پیدا ہو رہا ہے، بیس دن سے آئے ہوئے ہیں اور نہ جانے سفر میں کتنا وقت لگا ہو، اس لئے دیکھا کہ گھر والوں کا اشتیاق پیدا ہو رہا تو آپ ﷺ نے فرمایا "**إرجعوا فكونوا فيهم**" جاؤ واپس لوٹ جاؤ اور انہی کے پاس رہو۔ "**وعلموهم وصلوا**" اور جو کچھ یہاں پر سیکھا ہے جا کر ان کو اس کی تعلیم دو اور نماز پڑھو۔

"**فاذا حضرت الصلاة**" جب نماز کا وقت آجائے تو "**فليؤذن لكم أحدكم**" تم میں سے ایک اذان دے "**وليؤمكم أكبركم**" اور تم میں سے جو عمر میں بڑا ہو وہ امامت کرے۔ چونکہ علم میں یہ سب برابر تھے اس لئے کہ اکٹھے ہی آ کر حضور ﷺ سے علم حاصل کیا تھا، لہٰذا عمر میں بڑا ہونے کو ترجیح دی کہ جو زیادہ عمر والا ہو وہ تمہاری امامت کرے۔

جتنی مقدار علم کی حاصل کرنا فرض عین ہے وہ تو ہر حال میں حاصل کرنی ہے یہاں تک کہ اس میں

[۴۷] وفي صحيح مسلم ، كتاب المساجد ومواضع الصلاة ، باب وجوب صوم رمضان لرؤية هلال والفطر لرؤية الهلال ، رقم: ۱۰۸۰ ، وسنن الترمذي ، كتاب الصلاة ، باب ماجاء في بدء الأذان. رقم: ۱۸۹ ، وسنن النسائي ، كتاب الأذان ، باب أذان المنفردين في السفر ، رقم: ۶۳۰ ، والكتاب الإمامة ، باب تقديم ذوي السن ، رقم: ۷۷۳ ، وسنن أبي داؤد ، كتاب الصلاة ، باب من أحق بالإمامة ، رقم: ۴۹۸ ، وسنن ابن ماجة ، كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها ، باب من أحق بالإمامة رقم: ۹۶۹ ، ومسند أحمد ، مسند المكيين ، باب حديث مالک بن الحويرث ، رقم: ۱۵۰۴۵ ، أول مسند البصريين ، باب بقية حديث مالک بن الحويرث ، رقم: ۱۹۶۲۴ ، وسنن الدارمي ، كتاب الصلاة ، باب من أحق بالأمالة ، رقم: ۱۲۲۵ .

والدین کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے، لیکن فرض عین کی مقدار حاصل ہونے کے بعد مزید علم کے حصول کی صورت میں گھر والوں کے حالات کو مدنظر رکھنا چاہئے۔ اگر اس کی وجہ سے گھر والوں کو پریشانی لاحق ہوتی ہو یا حقوق واجبہ فوت ہوتے ہوں تب تو بالکل ہی ناجائز ہے، مثلاً والدین بیمار ہوں اور گھر میں کوئی اور دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے، ایسی صورت میں بیٹا کہے میں مولوی بننے جارہا ہوں، تو یہ ناجائز ہے۔ اور اگر ان کی دیکھ بھال کے لئے کوئی اور موجود ہو تو پھر اگر یہ اندیشہ ہو کہ میرے جانے سے ان کو شدید صدمہ پہنچے گا، اس وقت بھی اولیٰ یہ ہے کہ ان کے پاس رہے، **"والناس عنه غافلون"**.

البتہ اگر ان کو راضی کر کے آئیں تو پھر ٹھیک ہے، ورنہ **"ففيهما فجاهد"** یہ نہیں ہے کہ ایک طرف رخ ہو گیا تو دین کے دوسرے شعبوں کو خیر باد کہہ دیں۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک کے احکام کو پس پشت ڈال دیں، یہ صحیح نہیں۔ سب کام اسی طرح کریں جیسے شریعت نے بتائے ہیں۔ دین اتباع کا نام ہے نہ کہ شوق پورا کرنے کا۔ کاش کہ یہ حقیقت ہمارے دل میں اتر جائے کہ دین کس چیز کا نام ہے۔

ہمیں مولوی و مفتی بننے، تبلیغی جماعت اور جہاد میں جانے کا شوق ہے، لیکن ہم شوق کو نہ دیکھیں، یہ دیکھیں کہ اس مرحلہ پر دین کا کیا تقاضا ہے، جو دین کا تقاضا ہے اس پر عمل کریں، چاہے شوق اور جذبات کچھ بھی ہوں۔

یہ حضرات تشریف لائے تھے، کل بیس دن گزرے تھے، ابھی چلہ بھی نہیں ہوا تھا لیکن گھر والوں کی طرف شوق پیدا ہونے لگا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ، اس لئے کہ فرض عین کی مقدار حاصل ہوگئی، اب اپنے گھر والوں کا خیال کرو اور دعوت و تبلیغ کے نقطۂ نظر سے بھی وہ مقدم ہیں اس لئے جو کچھ سیکھا ہے ان کو جا کر سکھاؤ اور ان کو دعوت دو تا کہ وہ اپنی عبادات درست طریقہ پر انجام دیں۔

اس لئے دیکھنا یہ ہے کہ کس موقع پر دین کا کیا تقاضا ہے، یہ کانٹے کی بات ہے۔ اللہ ﷻ دل میں بٹھا دیں اور یہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ اس کا فیصلہ کرے، بلکہ یہ شیخ کا کام ہوتا ہے کہ وہ راہنمائی کرے، انسان کا اپنا فیصلہ بسا اوقات اس کی اپنی ذاتی خواہشات اور جذبات کے تابع ہوتا ہے، جیسی خواہشات دل میں پیدا ہوتی ہیں ایسی دلیلیں سمجھ میں آجاتی ہیں، خاص طور پر مولوی لوگ۔

میرے والد صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ مولوی کا شیطان بھی مولوی ہوتا ہے، وہ اس کو بہکانے کے لئے صریح گناہ کی طرف نہیں لے کر جائے گا بلکہ وہ اس کو تاویل اور دلیل سکھائے گا۔

جیسی خواہشات ہوتی ہیں ایسی دلیلیں بھی بن جاتی ہیں اس لئے اپنے فیصلے پر بھروسہ نہیں ہوتا تو کسی شیخ کی طرف رجوع کر کے اس سے فیصلہ کرایا جائے کہ اس وقت دین کا کیا تقاضہ ہے۔

(۱۸) باب الأذان للمسافرين إذا كانوا جماعة والإقامة، وكذلك بعرفة وجمع

مسافر کے لئے اگر جماعت ہو تو اذان و اقامت کہنے کا بیان اور اسی طرح مقام عرفات اور مزدلفہ میں بھی

"وقول المؤذن : الصلوٰة في الرحال؛ في الليلة الباردة أو المطيرة".

سفر میں اذان کا حکم

سفر کی حالت میں اگر جماعت ہو تو اذان اور اقامت دونوں مستحب ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس باب میں یہی مسئلہ بیان فرمایا ہے کہ منفرد کے لئے بھی اذان مشروع ہے۔ چنانچہ پیچھے **"باب رفع الصوت بالنداء"** میں حضرت ابوسعید خدری ﷛ نے منفرد کو ہی فرمایا تھا کہ **"فاذا كنت في غنمك أو باديتك فأذنت للصلوٰة فارفع صوتك بالنداء"**.

جمہور کے نزدیک سفر کی حالت میں اذان و اقامت مستحب ہے مگر حضرت عطاء رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ وہ اس کو واجب کہتے تھے، چنانچہ اگر کسی نے بغیر اذان اور اقامت کے نماز پڑھ لی تو انہوں نے اعادے کا حکم دیا۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ اگر اقامت بھول گیا تو اعادہ کرے۔[۴۸]

البتہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ شاید ان کے نزدیک اعادہ مستحب ہو۔

حنفیہ کی کتابوں میں اذان کو ہر حالت میں مسنون کہا گیا ہے خواہ حضر ہو یا سفر، جماعت ہو یا انفراد کی حالت ہو، لیکن اگر شہر میں گھر کے اندر جماعت کی جائے تو اذان کا ترک مکروہ نہیں، کیونکہ **"اذان الحئی"** کافی ہے۔[۴۹]

لیکن علامہ شامی رحمہ اللہ کی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسافر کے لئے بھی ترک اذان مکروہ نہیں، ترک اقامت مکروہ ہے، **"ان ترک الاقامة يكره للمسافر دون الأذان"**.[۵۰]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حنفیہ کے نزدیک مسافر کے لئے اذان مسنون ہونے کا مطلب استحباب ہے، اس کی تائید مصنف عبدالرزاق میں حضرت ابن عمر ﷛ کے ایک اثر سے ہوتی ہے، جس میں انہوں نے فرمایا کہ **"انما التأذين لجيش أو ركب عليهم امير فينادى بالصلوٰة ليجتمعوا الها، فاما غير**

---

۴۸ عمدة القارى، ج: ۵، ص: ۱۴۳.

۴۹ حاشية ابن عابدين، ج: ۱، ص: ۳۸۴، ۳۹۵.

۵۰ حاشية ابن عابدين، ج: ۱، ص: ۳۸۸، و البحر الرائق، ج: ۱، ص: ۲۷۱.

هم فاماهي الاقامة ". [۵۱]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس اثر کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔[۵۲]

"**مطيرة**" کے میم پر زبر ہے اور یہ "**فعيلة**" کے وزن پر ہے، جو "**ماطرة**" کے معنی میں ہے یعنی وہ رات جس میں بارش ہو۔

۶۳۱ - حدثنا محمد بن المثنى قال: حدثنا عبد الوهاب قال: حدثنا أيوب عن أبى قلابة قال: حدثنا مالک قال: أتينا إلى النبى ﷺ ونحن شببة متقاربون فأقمنا عنده عشرين يوما وليلة ، وكان رسول الله ﷺ رحيما رفيقا فلما ظن أنا قد اشتهينا أهلنا أوقد اشتقنا سألنا عمن تركنا بعدنا فأخبرناه . قال: إرجعوا إلى أهليكم فأقيموا فيهم وعلموهم ومروهم ، وذكر أشياء أحفظها أو لا أحفظها. وصلوا كما رأيتمونى أصلى فإذا حضرت الصلاة فليؤذن لكم أحدكم وليؤمكم أكبركم . [راجع: ۶۲۸]

یعنی حضور اقدس ﷺ نے کچھ چیزوں کا ذکر کیا، اب راوی کہتے ہیں کہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ مجھے وہ یاد ہیں لیکن میں بیان نہیں کر رہا ہوں یا یہ کہا تھا کہ مجھے وہ یاد نہیں ہیں، اس میں مجھے شک ہے یعنی راوی کو شک ہے کہ "**حفظها أو لا أحفظها**".

۶۳۲ - حدثنا مسدد قال: حدثنا يحيى ، عن عبيدالله بن عمر قال: حدثنى نافع قال: أذن ابن عمر فى ليلة باردة بضجنان، ثم قال: صلوا فى رحالكم ، وأخبرنا أن رسول الله ﷺ كان يأمر مؤذن ثم يقول على إثره : ألا صلوا فى الرحال فى اللية البارده أوالمطيرة فى السفر. [أنظر: ۶۶۶] [۵۳]

---

[۵۱] .... قال قلت لنافع كم كان ابن عمر يؤذن فى السفر قال أذانين إذا طلع الفجر أذن بالأولى فأما سائر الصلوات فإقامة إقامة لكل صلاة كان يقول انما التاذين لجيش أو ركب سفر عليهم أمير فينادى بالصلاة ليجتمعوا لها فأما ركب هكذا فإنما هى الإقامة ، مصنف عبد الرزاق ، باب الأذان فى السفر والصلاة فى الرحال ، ج:۱ ،ص:۴۹۲ ، رقم : ۱۸۹۷ ، المكتب الإسلامى ، بيروت ، ۱۴۰۳ھ.

[۵۲] فتح البارى ، ج:۲ ،ص: ۱۱۱ .

[۵۳] وفى صحيح مسلم ، كتاب صلاة المسافرين وقصرها باب الصلاة فى الرحال فى المطر ، رقم:۱۱۲۶ ، وسنن النسائى ، كتاب الأذان ، باب الأذان فى التخلف عن شهود الجماعة فى الليلة ، رقم: ۶۴۸ ، وسنن أبى داؤد كتاب الصلاة ، رقم:۸۹۶ ، وسنن ابن ماجه ، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها ، باب التخلف عن الجماعة فى الليلة الباردة أو الليلة المطيرة ، رقم:۹۲۷ ، ومسند أحمد ، مسند المكثرين ، من الصحابة ، باب مسند عبد الله بن عمر بن الخطاب ، رقم:۴۸۴۲ ، ۵۲۴۳ ، ۴۹۰۴ ، ۵۰۵۰ ، ۵۵۳۸ . وموطأ مالک ، كتاب النداء للصلاة ، باب النداء فى السفر وعلى غير وضوء ، رقم:۱۴۳ .

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک سخت سرد رات میں ضجنان کے مقام پر اذان دی اور پھر یہ اعلان کیا **"صلوّا فی رحالکم"** تم اپنے گھروں میں نماز پڑھو، جماعت کے لئے آنے کی ضرورت نہیں ہے، **"وأخبرنا"** اور ہمیں بتایا کہ **" أن رسول اللہ ﷺ کان یامر مؤذنا یؤذن ثم یقول علیٰ اثرہ "** بعض اوقات آپ ﷺ مؤذن سے اذان کہلواتے، پھر بعد میں اعلان کرواتے۔ **"الا صلوّا فی الرحال"** کہ گھروں میں نماز پڑھ لو **"فی اللیلة الباردة"** جب بہت سردی ہوتی **"أو المطیرة فی السفر"** یا سفر میں اس رات میں بارش ہو رہی ہوتی تو کہہ دیتے کہ اپنی جگہ نماز پڑھ لو۔ معلوم ہوا کہ شدید بارش جس میں لوگوں کے مسجد تک آنے میں شدید مشقت کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں ترک جماعت کا عذر ہے۔

اس روایت میں صراحت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ اعلان اذان پوری کرنے کے بعد کیا۔ پیچھے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں گزرا ہے کہ جب حیعلتین پر پہنچے تو اعلان کروایا۔

علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دونوں طریقے جائز ہیں لیکن اولیٰ یہ ہے کہ اذان کے بعد اعلان کیا جائے۔[۵۴]

غالباً وجہ یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث باب صریح ہے کہ اعلان اذان کے بعد کیا گیا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں احتمال ہے کہ انہوں نے حیعلتین پر پہنچنے کے بعد مؤذن سے کہا ہو اور مقصد یہ ہو کہ اذان کی تکمیل کے بعد یہ اعلان کر دے۔ واللہ اعلم

(۱۹) باب: هل یتتبع المؤذن فاہ وهاهنا ؟وهل یلتفت فی الأذان؟

کیا موذن اپنا منہ اِدھر اُدھر پھیرے؟ اور کیا وہ اذان میں اِدھر اُدھر دیکھ سکتا ہے؟

"ویذکر عن بلال أنه جعل إصبعیه فی أذنیه ، وکان ابن عمر لا یجعل إصبعیه فی أذنیه. وقال ابراهیم :لا بأس أن یؤذن علی غیر وضوء. وقال عطاء: الوضوء حق وسنة . وقالت عائشة: کان النبی ﷺ یذکر اللہ علی کل أحیانه".

۶۳۴ ـ حدثنا محمد بن یوسف قال: حدثنا سفیان، عن عون بن أبی جحیفة عن أبیه: أنه رأی بلالا یؤذن فجعلت اتتبع فاہ هاهنا بالأذان .

اس ترجمۃ الباب میں امام بخاری رحمہ اللہ نے کئی باتیں جمع کی ہیں:

ایک یہ کہ کیا مؤذن اپنے منہ کو ادھر ادھر لے جائے یعنی عام طور پر منارہ وغیرہ میں جو اذان دی جاتی تھی وہ بند ہوتا تھا اور اس میں اِدھر اُدھر روشندان ہوتے تھے، تو کیا مؤذن کو چاہئے کہ وہ کبھی اس روشندان سے منہ

---

[۵۴] عمدۃ القاری، ج ۴ : ص ۲۰۴.

نکال کر کہے ”حی علی الصلوٰۃ“ اور کبھی اس روشندان سے کہے ”حی علی الصلوٰۃ. یتتبع المؤذن فاہ ھا ھنا وھنا“. کیا ایسا کرے؟

آگے حدیث میں ہے کہ حضرت بلال ﷺ ایسا کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ ایسا کرنا چاہئے، جہاں دونوں طرف آواز پہنچانا منظور ہو۔

”وھل یلتفت فی الأذان ؟“ کیا اذان میں التفات کرے یعنی دائیں بائیں مڑے جیسے ”حی علیٰ الصلوٰۃ“ کہتے ہوئے دائیں طرف اور ”حی علی الفلاح“ کہتے ہوئے بائیں طرف مڑتے ہیں۔ حضرت بلال ﷺ سے یہ التفات ثابت ہے بلکہ اقامت میں بھی ثابت ہے ”والناس عنه غافلون“.

حنفیہ کے نزدیک اقامت میں بھی ”حی علی الصلوٰۃ“ کہتے ہوئے دائیں طرف اور ”حی علی الفلاح“ کہتے ہوئے بائیں طرف منہ موڑنا چاہئے، علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے اس کی تصریح کی ہے، بلکہ کہتے ہیں کہ بچے کے کان میں اذان دیتے وقت بھی دائیں بائیں التفات کرے، تو یہ التفات بھی مسنون ہے۔

اور حدیث سے ثابت ہے کہ: ”ویذکر عن بلال أنه جعل إصبعیه فی أذنیه“ کانوں میں انگلیاں دیتے تھے، اس سے آواز بلند ہوتی ہے اور دور تک جاتی ہے، یہ بھی ثابت ہے۔[۵۵]

”وکان ابن عمر لا یجعل إصبعیه فی أذنیه“ عبداللہ بن عمر ﷺ کانوں میں انگلیاں نہیں دیتے تھے بلکہ ویسے ہی اذان دیتے تھے۔ پتہ چلا کہ کانوں میں انگلیاں دینا ضروری نہیں ہے، اگر دیدے تب بھی ٹھیک ہے، نہ دیں تب بھی کوئی گناہ نہیں۔

”وقال ابراھیم“: ابراہیم ابن حیی فرماتے ہیں کہ ”لاباس ان یؤذن علی غیر وضو“ بغیر وضو کے بھی اذان دینا جائز ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگرچہ افضل یہی ہے کہ وضو کر کے اذان دے لیکن اگر بغیر وضو کے دیدی تب بھی اذان ہو جائے گی۔

ایسا لگتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا مسلک بھی یہی ہے، چنانچہ اس پر کئی استدلال کئے ہیں۔ فرمایا ”وقال عطاء: الوضوء حق وسنة“ عطاء نے کہا کہ وضو سنت ہے فرض نہیں ہے انہوں نے وضو کو صحت اذان کی شرط قرار نہیں دیا۔

---

۵۵ ضم أصابعه الأربع ووضعها علی أذنیه وکذا أحدی یدیه علی ماروی عن الإمام .

وقال الترمذی : علیه العمل عند أهل العلم فی الأذان ... وقال بعض أهل العلم ”وفی الإقامة أیضاً، وهو قول الأوزاعی. وقال ابن بطال : وهو باح عند العلماء، وروی أبو یوسف عن أبی حنیفة ﷺ : أن جعل أحدی یدیه علی اذنیه فحسن، وبه قال أحمد، کذا ذکره العینی فی العمدة، ج:۴، ص:۲۰۷، وحاشیة ابن عابدین، ج:۱، ص:۳۸۸.

"**وقالت عائشة : كان النبی ﷺ يذكر الله على كل أحيانه**" حضور ﷺ ہر وقت اللہ کا ذکر کیا کرتے تھے۔اس سے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ اذان بھی ایک ذکر ہے، لہٰذا حالت حدث میں بھی جائز ہے۔

البتہ امام محمد رحمہ اللہ نے الجامع الصغیر میں یہ فرمایا ہے کہ جنابت کی حالت میں اذان دے دی تو اعادہ کرنا مجھے زیادہ پسند ہے، تاہم اگر اعادہ نہ کیا تب بھی اذان ہو جائے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ بغیر وضو کے اذان دینا خلاف اولیٰ ہے، مکروہ نہیں مگر اقامت بغیر وضو کے کہنا مکروہ ہے کیونکہ ایسی حالت میں اقامت کہنے والے کو نماز کے لئے وضو کرنا پڑے گا اور طویل فصل لازم آئے گا۔[۵۶]

(۲۰) باب قول الرجل: فاتتنا الصلوٰة

آدمی کا یہ کہنا کہ ہماری نماز جاتی رہے

"**و كره ابن سيرين أن يقول : فاتتنا الصلاة ، و لكن ليقل : لم ندرک ، و قول النبی ﷺ أصح**".

اگر کسی شخص سے نماز چھوٹ جائے یعنی وہ وقت پر نہ پڑھ سکے یا جماعت نہ مل سکے تو کیا وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ "**فاتتنا الصلوٰة**" اس پر باب قائم کیا ہے۔ یہ باب قائم کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی جیسا کہ خود امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب میں نقل کیا ہے کہ محمد ابن سیرین رحمہ اللہ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ صلوٰۃ کی طرف فوت کی نسبت کی جائے۔

"**فاتتنا الصلاة**" میں "**فات**" فعل ہے اور "**صلوٰة**" اس کا فاعل ہے۔ امام ابن سیرین رحمہ اللہ اس کو اس لئے ناپسند کرتے تھے کہ نماز جیسی عبادت کے لئے فوت کا لفظ استعمال کرنا ادب کے خلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس کے بجائے یوں کہیں "**لم ندرک الصلوٰة**" ہم نے نماز نہیں پائی جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہر چیز کی نسبت اللہ جل جلالہ کی طرف فرمائی۔ "**هو يطعمني ويسقين**" وغیرہ، لیکن مرض کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کی حالانکہ وہ بھی اللہ جل جلالہ کی تخلیق ہے فرمایا "**واذا مرضت فهو يشفين**" تو ادب اور تہذیب کا تقاضہ ہے کہ مقدس چیز کی طرف کسی غلط یا ناپسندیدہ فعل کی نسبت نہ کی جائے۔

امام بخاری رحمہ اللہ یہاں اس بات کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ محمد ابن سیرین رحمہ اللہ کا یہ قول شرعی حکم نہیں ہے، "**فاتتنا الصلاة**" کہنا بھی جائز ہے اور حضور اقدس ﷺ سے ثابت ہے۔ جو حدیث مرفوع

---

۵۶ وذكر محمد فی (الجامع الصغير): اذا أذن الجنب أحب إلى أن يعيد الأذان وان لم يعد اجزاه ،عمدة القاری ج:۴ص:۲۰۷، دار الفكر بيروت ، وبداية المبتدی ، ج: ۱ ، ص: ۱۳.

روایت کی ہے اس میں خود حضور ﷺ نے فوت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ جائز ہے، البتہ اگر کوئی شخص بطور احتیاط دوسرا لفظ استعمال کرے تو یہ بھی درست ہے لیکن اس پر نکیر نہیں کرنی چاہئے، اس لئے کہ اگر نکیر کی بات ہوتی تو خود حضور ﷺ یہ لفظ استعمال نہ فرماتے۔

آگے فرمایا **"وهو قول النبی ﷺ أصح"** یہاں **"أصح"** کے معنی **"أحق بالأخذ"** کے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کی مراد یہ ہے کہ محمد ابن سیرین رحمہ اللہ کے قول پر عمل کے بجائے نبی کریم ﷺ کے طریقہ پر عمل کرنا زیادہ مناسب ہے۔

۶۳۵ ـ حدثنا أبو نعيم قال : حدثنا شيبان عن يحيىٰ ، عن عبد الله بن أبي قتادة ، عن أبيه قال: بينما نحن نصلي مع النبي ﷺ اذ سمع جلبة الرجال فلما صلى قال : " ماشأنكم ؟" قالوا : إستعجلنا إلى الصلاة ، قال : " فلا تفعلوا ، اذا أتيتم الصلاةَ فعليكم بالسكينة ، فماأدركتم فصلوا ، وما فاتكم فأتموا ". [۵۷]

فرماتے ہیں ہم نبی کریم ﷺ کے پاس تھے اتنے میں آپ ﷺ نے کچھ لوگوں کا شور سنا، **"جلبة"** کے معنی شور کے ہیں۔

" فلما صلى " جب نماز پڑھ چکے تو آپ ﷺ نے فرمایا **" ما شأنكم ؟"** تمہارا کیا حال ہے؟ **"قالوا : استعجلنا الى الصلاة"** انہوں نے کہا کہ ہم دوڑ دوڑ کر نماز کے لئے آرہے تھے، **"قال : فلا تفعلوا"** آئندہ اس طرح دوڑ دوڑ کر مت آنا، **"اذا أتيتم الصلاة فعليكم بالسكينة"** جب نماز کے لئے آؤ تو تم پر سکینت ہونی چاہئے بھاگ دوڑ کر مت آؤ **"فما أدركتم فصلوا "** نماز کا جو حصہ پاؤ وہ پڑھ لو، **"وما فاتكم فأتموا"** اور جو حصہ نماز کا فوت ہو جائے اس کو بعد میں پورا کرلو۔

امام بخاری رحمہ اللہ اشارۃ النص سے استدلال فرما رہے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے نماز کے بعض حصے کے لئے **"فات"** کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ معلوم ہوا کہ **"فات"** کا لفظ استعمال کرنا جائز ہے، اور محمد ابن سیرین رحمہ اللہ کا قول شرعی حکم نہیں ہے بلکہ ان کا ذوق ہے۔

یاد رکھیں ایک شرعی حکم ہوتا ہے وہ فرض، واجب، سنت، مستحب یا افضل ہے، یہ سب احکام شرعیہ ہیں اور ان کے مختلف مراتب ہیں اور یہ سب شارع سے ثابت ہیں۔

ایک ہوتی ہے ذوق کی بات، یعنی وہ کوئی حکم شرعی تو نہیں ہوتا لیکن کسی بزرگ کا مذاق ہوتا ہے، اس

---

۵۷ وفي صحيح مسلم ، كتاب المساجد ومواضع الصلاة ، باب استحباب اتيان الصلاة بوقار وسكينة والنهى عنه رقم :۹۴۸، ومسند أحمد ، باقي مسند الانصار ، باب حديث أبي قتادة الأنصاري ، رقم: ۲۱۵۲۰، وسنن الدارمي ، كتاب الصلاة ، باب كيف يمشي الى الصلاة ، رقم: ۱۲۵۲ .

مذاق کی پیروی بھی فی الجملہ اچھی بات ہے لیکن وہ حکم شرعی نہیں ہوتا۔ کسی آدمی کا ذہن کسی ایسے نکتے کی طرف چلا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ کسی لفظ کے استعمال سے پرہیز کرتا ہے تو کچھ بعید نہیں کہ اللہ ﷻ اس تأدب کی وجہ سے اس کو ثواب بھی دیدیں، اگرچہ ہم اس کو مستحب اور اس کے خلاف کو مکروہ بھی نہیں کہیں گے۔

تو علامہ ابن سیرین رحمہ اللہ کے ذوق کی بات ہے کہ ان پر یہ گراں گزرتا تھا کہ وہ نماز کے لئے فوت کا لفظ استعمال فرمائیں، اب یا تو ان تک حضور ﷺ کی حدیث نہیں پہنچی ہوگی یا حدیث تو پہنچی ہوگی لیکن وہ سمجھتے ہوں گے کہ حضور ﷺ کا مقام بہت اعلیٰ ہے، جب اس کے متبادل الفاظ موجود ہیں تو ہمیں یہ لفظ استعمال نہیں کرنا چاہئے۔

ایسی ہی ایک ذوق کی بات یہ بھی ہے کہ ہم اکثر و بیشتر یہ جملہ استعمال کرتے ہیں کہ نماز سے فارغ ہوجائیں پھر کھانا کھالیں۔ حضرت والد صاحب رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ فرمایا کھانا کھالو، ہم بھائیوں میں سے کسی نے کہدیا کہ نماز سے فارغ ہوجائیں پھر کھاتے ہیں۔ حضرت والد صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا بھائی یہ کیا کہہ دیا، کیا نماز فارغ ہونے کی چیز ہے؟

اگر اس جملہ کا تجزیہ کریں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ نماز ایک بوجھ ہے وہ سر سے اتر جائے تو پھر اصل مقصود کی طرف جائیں جو کہ کھانا کھانا ہے، یعنی کھانا ایسی حالت میں کھائیں کہ سر پر کوئی بوجھ نہ ہو، تو گویا نماز کو بوجھ قرار دیا، یہ کتنی بے ادبی کی بات ہے، الحمد للہ اس وقت سے لے کر آج تک پھر کبھی بھی نماز کے لئے فارغ ہونے کا لفظ استعمال نہیں کیا۔

تو حضرت والد صاحب رحمہ اللہ اس کو برا سمجھتے تھے کہ یہ کہیں پہلے نماز سے فارغ ہوجائیں، کیونکہ نماز فارغ ہونے کی چیز نہیں ہے بلکہ دوسری چیزیں ایسی ہیں کہ ان سے فارغ ہو کر نماز کی طرف جائیں، تو قرآن کریم میں ہے **"فاذا فرغت فانصب"** جب اور کاموں سے فارغ ہوجاؤ تو پھر نماز کے اندر اپنے آپ کو تھکاؤ۔

یہ ذوق کی بات ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ فارغ ہونے کا لفظ استعمال کرنا حرام یا ناجائز ہے یا حکم شرعی کے طور پر مکروہ ہے بلکہ اس مذاق کے تحت یہ ادب کا تقاضا ہے۔

اسی طرح اگر گاڑی میں جارہے ہیں راستے میں کوئی آدمی مل گیا پوچھا کہ بھائی کہاں جارہے ہیں؟ اس نے کہا فلاں جگہ، کہتے ہیں چلیں میں آپ کو وہاں پر چھوڑ دیتا ہوں، یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

ہمارے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی صاحب رحمہ اللہ ایک مرتبہ کہیں تشریف لے جارہے تھے، میں گاڑی مین تھا، میں نے کہا حضرت میں آپ کو گاڑی میں چھوڑ دیتا ہوں، حضرت نے فرمایا بھئی! ہمیں چھوڑنا مت پہنچادو۔

مطلب یہ ہے کہ لفظ ''چھوڑنا'' مناسب نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ خراب چیز ہے، بوجھ ہے جس سے

جان چھڑانی ہے، بلکہ صحیح لفظ یہ ہے کہ آئیں میں آپ کو پہنچا دیتا ہوں۔

انگریزی میں جو لفظ استعمال ہوتا ہے وہ اس سے بھی برا ہے وہ ہے ''ڈراپ کرنا'' کہ آئیں میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں، ڈراپ کرنے کے لفظی معنی ہیں ''اوپر سے پھینکنا'' یہ اور زیادہ بدتمیزی کا لفظ ہے۔

اب یہ کہنا حرام یا ناجائز تو نہیں لیکن مذاقِ سلیم کے خلاف ہے، تو یہ تعبیرات ادب اور ادبی مذاق کے نتیجے میں اختیار کی جاتی ہیں، جن کو اللہ ﷻ ذوقِ رفیع عطا فرماتے ہیں ان کی نگاہیں ان تعبیرات کے دقائق کی طرف جاتی ہیں اور اس کی وجہ سے اللہ ﷻ ان کے دل میں یہ بات ڈال دیتے ہیں۔

محمد ابن سیرین رحمہ اللہ نے جو بات فرمائی، خشک لوگ کہتے ہیں کہ یہ حدیث مرفوع کے خلاف ہے، تو یہ حدیث مرفوع کے خلاف نہیں ہے کیونکہ وہ کوئی حکم شرعی نہیں فرما رہے ہیں بلکہ اپنے ذوق کی بات کر رہے ہیں کہ مجھے نماز کے لئے فوت کا لفظ استعمال کرنا اچھا نہیں لگتا، لہٰذا نہ ان پر کوئی ملامت ہے اور نہ ان کی اتباع کرنے والے پر، البتہ اگر کوئی اس کو حکم شرعی قرار دے تو اس پر ملامت ہے کیونکہ حضور ﷺ نے فوت کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

میں نے اپنے والد صاحب رحمہ اللہ سے سنا کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے سبق کے دوران اگر کوئی ایسی بات آجاتی تو کثرت سے یہ فرمایا کرتے تھے کہ ''میاں یہ ذوق کی باتیں ہیں اور ذوق مرگیا دلی میں'' استاذ ذوق دلی کا مشہور شاعر تھا، تو فرماتے یہ ذوق کی باتیں ہیں اور ذوق مرگیا دلی میں، لہٰذا لوگ حقیقت نہیں سمجھتے۔

(۲۲) باب : يقوم الناس اذا رأوا الإمام عند الإقامة ؟

تکبیر کے وقت جب لوگ امام کو دیکھ لیں تو کس وقت کھڑے ہوں؟

۶۳۷ ـ حدثنا مسلم بن ابراهيم قال: حدثنا هشام قال: كتب إلي يحيى بن أبي كثير عن عبد الله بن أبي قتادة، عن أبيه قال: رسول الله ﷺ اذا أقيمت الصلاة فلا تقوموا حتى تروني. [أنظر : ۶۳۸، ۹۰۹][۵۸]

۵۸ وفي صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب متى يقوم الناس للصلاة، رقم: ۹۴۹، وسنن الترمذي، كتاب الجمعة عن رسول الله، باب كراهية أن ينتظر الناس الإمام وهم قيام عند افتتاح، رقم: ۵۴۰، وسنن النسائي، كتاب الأذان، باب إقامة المؤذن عند خروج الإمام، رقم: ۶۸۰، وسنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب تخفيف الاخريين، رقم: ۴۵۴، ومسند أحمد، باقي مسند الأنصار، باب حديث أبي قتادة الانصاري، رقم: ۲۱۵۳۶، ۲۱۵۴۱، ۲۱۵۶۵، ۲۱۵۸۳، وسنن الدارمي، كتاب الصلاة، باب متى يقوم الناس اذا اقيمت الصلاة، رقم: ۱۲۲۳.

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب نماز کھڑی ہو جائے یعنی اقامت ہو جائے تو جب تک مجھے نکلتے ہوئے نہ دیکھ لو مت کھڑے ہو۔

امام اور مقتدی اقامت کے وقت کب کھڑے ہوں

حضور ﷺ اور صحابہ ؓ کا تعامل

اس معاملہ میں رسول اللہ ﷺ، صحابۂ کرام ؓ کا تعامل کیا اور کس طرح رہا ہے اس پر حضرت ابو ہریرہ ؓ کی روایت کردہ احادیث سے سمجھ لینا چاہئے، اس مسئلہ کے متعلق چھ احادیث ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کا اپنا عمل بیان فرمایا ہے۔

۱۔ ''كان بلال يؤذن اذا دحضت فلا يقيم حتى يخرج النبى ﷺ فاذا خرج أقام الصلاة حين يراه''. [۵۹]

حضرت بلال ؓ اذان ظہر اس وقت دیتے تھے جب آفتاب کا زوال ہو جاتا، پھر اقامت اس وقت تک نہ کہتے تھے جب تک نبی کریم ﷺ مکان سے باہر نہ آجاتے، جب باہر تشریف لاتے تو نماز کی اقامت کہتے تھے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ:

۲۔ ''عن أبى هريرة أن الصلاة كانت تقام لرسول الله ﷺ فيأخذ الناس مصافهم قبل أن يقوم النبى ﷺ مقامه''. [۶۰]

رسول اللہ ﷺ کی امامت کے لئے نماز کھڑی کی جاتی تھی اور لوگ آپ کے کھڑے ہونے سے پہلے اپنی اپنی جگہ صفوں میں لے لیتے تھے۔

۳۔ ''سمع أبا هريرة يقول أقيمت الصلاة، فقمنا فعدلنا الصفوف قبل أن يخرج إلينا رسول الله ﷺ''. [۶۱]

حضرت ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ ایک بار نماز کھڑی کی گئی تھی، ہم کھڑے ہوئے اور حضور اکرم ﷺ کے ہماری طرف نکلنے سے پہلے ہی ہم نے صفیں درست کرلیں۔

۴۔ ''عن أبى قتادة قال قال رسول الله ﷺ اذا أقيمت الصلاة فلا تقوموا حتى ترونى''. [۶۲]

---

۵۹ صحيح مسلم، باب متى يقوم الناس للصلاة، ج: ۱، ص: ۴۲۳، رقم: ۶۰۶، بيروت.

۶۰، ۶۱ صحيح مسلم، باب متى يقوم الناس للصلاة، ج: ۱، ص: ۴۲۳، رقم: ۶۰۵، بيروت.

۶۲ صحيح مسلم، باب متى يقوم الناس للصلاة، ج: ۱، ص: ۴۲۳، رقم: ۶۰۴، بيروت، وصحيح البخارى، باب متى يقوم الناس اذا رأوا الإمام عند الإقامة، رقم: ۶۱۱.

حضرت ابوقتادہ ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب نماز کھڑی ہو جائے تو تم کھڑے نہ ہو جب تک مجھے اپنی طرف آتا ہوا نہ دیکھ لو۔

۵۔ "قال الحافظ ويشهد له ما رواه عبد الرزاق عن ابن جريج عن ابن شهاب أن الناس كانوا ساعة يقول المؤذن الله أكبر يقومون إلى الصلاة فلا يأتي النبي ﷺ حتى تعتدل الصفوف". [۶۳]

ابن شہاب سے مروی ہے جس وقت مؤذن اللہ اکبر کہتا تھا لوگ نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے اور حضور ﷺ کے تشریف لانے تک صفیں درست ہو جاتی تھیں۔

۶۔ "عن عبد الله بن أبي أوفىٰ قال كان بلال اذا قال قد قامت الصلاة نهض رسول الله ﷺ بالتكبير. [۶۴]

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی ﷺ نے فرمایا کہ حضرت بلال ﷺ جب **"قد قامت الصلاة"** کہتے تھے تو رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوتے تھے۔

یہ چھ احادیث ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کا اپنا عمل اس مسئلہ کے متعلق بیان فرمایا ہے:

پہلی حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ حضرت بلال ﷺ کی عام عادت یہ تھی کہ حجرہ شریفہ کی طرف نظر رکھتے تھے جب رسول اللہ ﷺ کو دیکھتے کہ آپ ﷺ باہر تشریف لے آئے تو اقامت شروع کرتے تھے۔

دوسری اور تیسری حدیث سے بھی یہ ثابت ہوا کہ صحابۂ کرام ﷺ کی عام عادت یہ تھی کہ جب مؤذن تکبیر شروع کرے تو سب لوگ کھڑے ہو کر صفوف کی درستی کر لیتے تھے، امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں تیسری حدیث کے جملہ **"فعدلنا الصفوف"** پر فرمایا کہ:

" اشارة إلى أنه هذه سنة معهودة عندهم و قد أجمع العلماء عمل استحباب تعديل الصفوف".

اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ یہ ان کے نزدیک سنت ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ صفیں سیدھی کرنا مستحب ہے۔

چوتھی حدیث سے معلوم ہوا کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ حضرت بلال ﷺ نے حضور اکرم ﷺ کے گھر سے باہر تشریف لانے سے پہلے ہی اقامت شروع کردی اور حسب دستور سب صحابہ اقامت شروع ہوتے ہی کھڑے ہو گئے، پھر نبی کریم ﷺ کو کچھ دیر لگی تو آپ ﷺ نے یہ ہدایت فرمائی کہ میرے نکلنے سے پہلے کھڑے نہ ہو، مقصد اس کا ظاہر ہے کہ لوگوں کو مشقت سے بچانے کے لئے فرمایا اور اس حدیث کے الفاظ

---

[۶۳] شرح الزرقانی، ج: ۱، ص: ۲۱۴.

[۶۴] كذا ذكره في مجمع الزوائد، ج: ۲، ص: ۱۰۳.

"لا تقوموا حتی ترونی" یعنی اس وقت تک کھڑے نہ ہو جب تک یہ نہ دیکھ لو کہ میں گھر سے باہر آ گیا ہوں، اس لفظ سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ میرے باہر آ جانے کے بعد کھڑے ہونے میں کوئی حرج نہیں۔

پانچویں حدیث میں اصل عادت اور عام تعامل یہ معلوم ہوا کہ حضرت بلال ﷺ اقامت اُس وقت شروع کرتے جب دیکھ لیتے کہ آپ ﷺ حجرۂ شریفہ سے باہر تشریف لے آئے، اور اقامت شروع ہوتے ہی حسبِ دستور صحابۂ کرام ﷺ کھڑے ہو کر صفوف کی درستی کر لیتے تھے۔

چھٹی حدیث سے ایک خاص صورت یہ بھی معلوم ہوئی کہ بعض اوقات رسول اللہ ﷺ نماز سے پہلے ہی مسجد میں تشریف فرما ہوتے تھے، تو آپ ﷺ اس وقت کھڑے ہوتے تھے جب مؤذن **"قد قامت الصلوٰۃ"** پر پہنچتا تھا، اس سے ظاہر یہ ہے کہ عام صحابۂ کرام ﷺ بھی آپ ﷺ کے ساتھ اسی وقت کھڑے ہوتے ہوں گے۔

ان مجموعۂ روایاتِ حدیث سے ایک بات قدرے مشترک کے طور پر یہ ثابت ہوئی کہ جب نبی کریم ﷺ پہلے سے مسجد میں تشریف فرما نہ ہوتے بلکہ گھر میں سے تشریف لاتے تھے تو آپ ﷺ کو دیکھتے ہی حضرت بلال ﷺ اقامت شروع کرتے اور سب صحابۂ کرام ﷺ شروع اقامت سے کھڑے ہو کر تعدیلِ صفوف کرتے تھے، آپ ﷺ نے اس کو کبھی منع نہیں فرمایا، البتہ گھر میں سے باہر تشریف لانے سے پہلے اقامت کہنے اور لوگوں کے کھڑے ہونے سے منع فرمایا ہے وہ بھی از روئے شفقت ممانعت تھی جس کو فقہاء کرام کی زبان میں مکروہ تنزیہی کہا جا سکتا ہے۔

تعاملِ خلفائے راشدین ﷺ

حضرت عمر ﷺ صفیں درست کرنے کے لئے لوگ متعین کر دیتے تھے اور صفیں درست ہونے کی خبر جب تک نہ دی جاتی اس وقت تک تکبیر تحریمہ نہ کہتے تھے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کی ہے کہ حضرت علی ﷺ اور حضرت عثمان ﷺ بھی اس امر کا اہتمام فرماتے تھے۔

حضور ﷺ کا عمل اور خلفائے راشدین میں سے حضرت عمر بن خطاب، حضرت عثمان اور حضرت علی ﷺ کا تعامل اور عام عادت یہ معلوم ہوئی کہ وہ صفوں کی درستی کی خود بھی نگرانی کرتے تھے اور جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ صفیں سب درست ہو گئیں یعنی نہ صف کے درمیان میں کوئی جگہ چھوڑی گئی اور نہ آگے پیچھے رہے اُس وقت تکبیر نماز کی شروع فرماتے تھے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ جب ہی ہو سکتا ہے جب لوگ شروع اقامت سے کھڑے ہو جائیں جیسا کہ احادیثِ مرفوعہ سے صحابۂ کرام ﷺ کی عام عادت بھی ثابت ہو چکی ہے ورنہ اگر حی علی الصلوٰۃ یا حی علی الفلاح یا قد قامت

الصلوٰۃ پر لوگ کھڑے ہوں تو اس کے بعد یہ تسویہ صفوف کا انتظام کیا جائے تو یہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ اقامت ختم ہو جانے کے کافی دیر بعد نماز شروع ہو، حالانکہ یہ باتفاق علماء مذموم ہے۔

ائمہ اربعہ کا مذہب

ائمہ اربعہ کے مذاہب کا خلاصہ یہ ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اقامت ختم ہونے کے بعد کھڑا ہونا مستحب ہے، امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک حسب روایت قاضی عیاض رحمہ اللہ شروع اقامت ہی سے کھڑا ہونا مستحب ہے، البتہ کسی خاص حد تک قیام واجب نہیں، بلکہ لوگوں کو ان کی سہولت پر چھوڑا جائے۔[۶۵]

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مذہب یہ معلوم ہوا کہ جب مؤذن "**قد قامت الصلوٰۃ**" کہے اس وقت کھڑا ہونا چاہئے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب میں تفصیل ہے کہ امام اور مقتدی اگر اقامت سے پہلے ہی مسجد میں موجود تھے تو صحیح روایت کے مطابق حی علی الفلاح پر اٹھ جانا چاہئے، اور اگر امام باہر سے آ رہا ہو تو اگر وہ محراب کے کسی دروازے سے یا اگلی صف کے سامنے سے آئے تو جس وقت مقتدی امام کو دیکھیں اس وقت کھڑے ہو جائیں، اور اگر وہ پچھلی صفوف کی طرف سے آ رہا ہے تو جس صف سے گزرے وہ صف کھڑی ہوتی چلی جائے۔

حنفیہ کے مذہب کی تفصیل میں جہاں یہ بیان کیا ہے کہ جب امام اقامت سے پہلے ہی مسجد میں موجود ہو تو حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا چاہئے اس کی علت یہ بیان فرمائی ہے کہ: "**لانہ أمر یستجب المسارعۃ إلیہ**" حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا اس لئے افضل ہے کہ لفظ حی علی الفلاح کھڑا ہونے کا امر ہے، اس لئے کھڑا ہونے کی طرف مسارعت کرنا چاہئے۔[۶۶]

مذاہب ائمہ اربعہ میں دو باتیں متفق علیہ ہیں:

ایک یہ ہے کہ یہ سب اختلاف محض افضلیت و اولویت کا ہے؛ اس میں کوئی جانب ناجائز یا مکروہ نہیں اور کسی کو کسی پر نکیر و اعتراض کرنے کا حق نہیں، اسی لئے مذاہب اربعہ کے متبعین میں کبھی اس پر جھگڑا نہیں سنا گیا۔

دوسرے یہ کہ باجماع صحابہ و تابعین و اتفاق ائمہ اربعہ صفوں کی تعدیل و درستی واجب ہے جو نماز شروع ہونے سے پہلے مکمل ہو جانا چاہئے اور یہ اس صورت میں ہو سکتی ہے جبکہ عام آدمی شروع اقامت سے کھڑے ہو جائیں، بقول امام مالک رحمہ اللہ کوئی کمزور ضعیف بعد میں بھی کھڑا ہو تو مضائقہ نہیں۔[۶۷]

خلاصہ یہ ہے کہ جس وقت امام اور مقتدی سب اقامت سے پہلے مسجد میں موجود ہوں تو امام اعظم ابوحنیفہ، امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کے نزدیک حی علی الفلاح اور قد قامت الصلوٰۃ پر کھڑا ہونا اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک آخر اقامت پر کھڑا ہونا افضل ہے اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک شروع ہی سے کھڑا ہونا افضل ہے، اور خلفائے راشدین اور عام صحابۂ کرام ﷺ کا تعامل بھی اسی پر شاہد ہے۔[۶۸]

اور اسی تعامل کی بناء پر حضرت سعید بن میتب ؓ کا مذہب یہ ہے کہ شروع اقامت ہی سے سب کو کھڑا ہو جانا صرف مستحب نہیں بلکہ واجب ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے پہلے کھڑا ہونا حرام ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ فعل عبث ہے اور اس کا کوئی فائدہ نہیں، لہٰذا جب میں نکل آؤں تب کھڑے ہوا کرو۔ [۶۹]

ہماری بعض کتب حنفیہ میں لکھا ہوا ہے **"ویقوم عند حی علی الفلاح"** کہ مقتدی کو چاہئے جب اقامت کہنے والا **"حیّ علی الفلاح"** کہے اس وقت کھڑا ہو۔ [۷۰]

بعض لوگوں نے اس کا انتہائی مبالغہ آمیز مطلب لیا ہے، خاص طور سے ہمارے بریلوی دوستوں نے اس کے یہ معنی لئے ہیں کہ **"حیّ علی الفلاح"** سے پہلے کھڑا ہونا جائز نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب اقامت شروع ہوتی ہے تو جو لوگ پہلے کھڑے ہوتے ہیں وہ بھی بیٹھ جاتے ہیں، بیٹھنے کا خاص اہتمام کرتے ہیں اور جب مکبر **"حیّ علی الفلاح"** کہتا ہے تو فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فقہاء حنفیہ کا یہ مقصود نہیں تھا، بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ **"حیّ علی الفلاح"** پر کوئی شخص بیٹھا نہ رہے، زیادہ سے زیادہ **"حیّ علی الفلاح"** پر کھڑے ہو جائیں، نہ یہ کہ **"حیّ علی الفلاح"** سے پہلے کھڑے ہوں تو **"یقوم عند حیّ علی الفلاح"**

۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹ قال القاضي رحمه الله تعالى يجمع بين مختلف هذه الاحاديث بأن بلا لا ؓ كان يراقب خروج النبي ﷺ من حيث لايراه غيره أو الا القليل فعند اول خروجه يقيم ولا يقوم الناس حتى يروه ثم لا يقوم مقامه حتى يعدلوا الصفوف وقوله في رواية أبي هريرة ؓ فيأخذ الناس مصافهم قبل خروجه لعله كان مرة أو مرتين ونحوهما لبيان الجواز أو لعذر ولعل قوله ﷺ فلا تقوم حتىٰ تروني كان بعد ذلك قال العلماء والنهي عن القيام قبل ان يروه لئلا يطول عليهم القيام ولأنه قد يعرض له عارض فيتأخر بسببه .

واختلف العلماء من السلف فمن بعدهم متى يقوم الناس للصلاة ومتى يكبر الإمام فمذهب الشافعي رحمه الله وطائفة أنه يستحب أن لايقوم أحد حتى يفرغ المؤذن من الإقامة .

ونقل القاضي عياض عن مالك رحمه الله وعامة العلماء أنه يستحب أن يقوموا اذا أخذ المؤذن في الإقامة وكان أنس يقوم اذا قال المؤذن قد قامت الصلوة وبه قال أحمد رحمه الله وقال أبوحنيفة ؓ والكوفيون يقومون في الصف اذا قال حي على الصلاة واذا قال قد قامت الصلاة كبر الإمام وقال جمهور العلماء من السلف والخلف لايكبر الإمام حتى يفرغ المؤذن من الإقامة الخ ،شرح النووي على صحيح مسلم ج:۵، ص:۱۰۳ ، بيروت ، وفتح الباري ، ج:۲، ص:۱۲۰ ، وفيض القدير ، ج:۱، ص:۲۹۴ ، وعمدة القاري ، ج:۴، ص:۲۱۵ .

۷۰ عمدة القاري ، ج:۴، ص:۲۱۵ ، وفتح الباري ، ج:۲، ص:۱۲۰ ، ومختصر اختلاف العلماء ، ج:۱، ص:۱۹۶ .

کے معنی یہ ہیں کہ **"حیّ علی الفلاح"** تک سب کھڑے ہو جائیں، حضور اقدس ﷺ اور صحابہ کرام ﷺ کے طرز عمل سے یہ بات بالکل واضح ہے۔

لہٰذا صحیح بات یہ ہے کہ کوئی **"حیّ علی الفلاح"** تک بیٹھنا چاہے تو اس کی گنجائش ہے، لیکن اس کا اہتمام کرنا کہ اگر کھڑے بھی ہیں تو بیٹھ جائیں اور **"حیّ علی الفلاح"** پر سب ایک دم کھڑے ہو جائیں، یہ بے اصل بات ہے۔

اس موضوع پر حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ کا ایک مستقل رسالہ ہے **"رفع الملامة عن القیام عند اول القیامة"** جو جواہر الفقہ میں چھپا ہوا ہے۔[۱]

(۲۴) باب : هل یخرج من المسجد لعلة ؟

کیا مسجد سے کسی عذر کی بنا پر نکل سکتا ہے؟

۶۳۹ ۔ حدثنا عبد العزیز بن عبد اللّٰہ قال : حدثنا ابراهیم بن سعید ، عن صالح بن کیسان ، عن ابن شهاب ، عن أبی سلمة عن أبی هریرة : أن رسول اللّٰہ ﷺ خرج وقد أقیمت الصلاة و عدلت الصفوف حتی اذا قام فی مصلاه انتظرنا أن یکبر انصرف ، قال: علی مکانکم فمکثنا علی هیئتنا حتیّ خرج الینا ینطف رأسه ماء وقد اغتسل. [راجع : ۲۷۵]

یہ حدیث پہلے بھی گزر چکی ہے کہ تکبیر ہو چکی تھی اس کے باوجود آپ ﷺ دوبارہ گھر تشریف لے گئے اور پھر وہاں سے غسل کر کے آئے، کیونکہ یاد آیا کہ آپ ﷺ پر غسل واجب ہے۔

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب قائم کیا ہے کہ **"هل یخرج من المسجد لعلة ؟"** اس سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ حدیث میں جو آیا ہے کہ جب مسجد میں اذان ہو جائے تو پھر وہاں سے نہ نکلو یعنی ایک شخص مسجد میں ہے اور اذان ہو گئی تو اب اسے مسجد سے نہیں نکلنا چاہئے۔

امام بخاری رحمہ اللہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ اذان کے بعد بھی آدمی کسی ضرورت اور حاجت کی وجہ سے مسجد سے جا سکتا ہے، خاص طور پر جب مسجد واپس آنے کا ارادہ بھی ہو۔

"لعلة" کسی سبب سے یہاں سبب یہ تھا کہ آپ ﷺ کو جنابت یاد آ گئی تھی۔ معلوم ہوا کہ اذان کے بعد ہی نہیں اگر اقامت کے بعد بھی کسی علت کی وجہ سے کوئی شخص باہر جانا چاہے تو اس کی گنجائش ہے۔

---

[۱] مسئلہ کی تحقیق و دلائل کے لئے ملاحظہ فرمائیں : جواهر الفقه ، ج: ۱ ، ص: ۳۰۹.

فقہاء کرامؒ نے جو یہ فرمایا کہ اذان کے بعد نہ نکلو اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا جو اذان کے بعد نکل رہا تھا تو فرمایا "أما هذا فقد عصى أبا القاسم." رواه مسلم والأربع ۔[۴۲]

یہ اس صورت میں ہے جب کوئی حاجت نہ ہو، بلا وجہ جائے، اگر کوئی حاجت ہے اور واپس آنا چاہتا ہے تو پھر جائز ہے۔

اور اگر کسی دوسری مسجد میں کسی حاجت کی وجہ سے جانا ہے اور متیقن ہے کہ وہاں جماعت مل جائے گی تو جائز ہے، اس پر تقریباً سارے فقہاء متفق ہیں۔ یہیں سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ حدیث کے عموم میں رائے سے بھی تخصیص پیدا کی جاتی ہے۔

یہ ذرا نازک بات کہہ رہا ہوں، حنفی لوگ بڑے بدنام ہیں کہ یہ رائے سے حدیث کے خلاف عمل کرتے ہیں، یہ ان مواقع میں سے ہے جہاں رائے کے ذریعہ حدیث میں تخصیص پیدا کی گئی ہے۔ جب حدیث کی علت بالکل واضح ہو تو پھر تخصیص کے لئے نص کی ضرورت نہیں ہوتی۔

چنانچہ دیکھیں حضور ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا یہ جوتے لے کر جاؤ اور جو بھی ملے اس کو جنت کی خوشخبری سناؤ۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سنا تو روک دیا۔ اب بظاہر یہ حضور ﷺ کے خلاف کیا، لیکن یہ وہ جگہ ہے جہاں نص کے حکم میں رائے سے تخصیص کی اور علت واضح ہے کہ تنہا "**لا الٰہ الا اللّٰہ**" کہنا نجات ابدی اور نجات کامل کے لئے کافی نہیں، لہٰذا ایسا نہ ہو کہ لوگ گڑبڑ میں مبتلا ہو جائیں، اس لئے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو جو فرستادہ رسول تھے۔ روک دیا۔ حضور ﷺ کو اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے بھی ان پر کوئی نکیر نہیں فرمائی۔

اسی طرح خروج من المسجد کی علت بھی بالکل واضح ہے اگر اذان کے بعد نکلنا بطور اعراض ہو یا ایسے وقت نکلے کہ جماعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو، یا اس سے لوگوں کو جماعت میں شامل نہ ہونے کی ترغیب ہو، تو پھر منع ہے، لیکن جہاں کوئی عذر یا علت ہو تو وہاں جائز ہے۔

تو نص کے عموم میں بعض اوقات رائے سے تخصیص کی جاتی ہے جبکہ علت بالکل واضح ہو اور غیر مختلف فیہ

۴۲، ۴۳ روى عن أبي هريرة أنه رأى رجلاً يخرج من المسجد بعد أن اذن المؤذن بالعصر، فقال: أما هذا فقد عصى أبا القاسم، رواه مسلم والاربعة.

قلت: هذا محمول على من خرج بغير ضرورة، وقد أوضح ذلك مارواه الطبراني في الاوسط: من طريق سعيد بن المسيب عن أبي هريرة عن النبي صلى الله عليه وسلم، ولفظه: لايسمع النداء في مسجدي ثم يخرج منه الا لحاجة ثم لايرجع اليه الا منافق، عمدة القاري، ج:۴، ص:۲۱۶.

ہو۔اب یہ بھی نہیں ہے کہ ہر ایک کے ہاتھ میں ہتھیار دیدو کہ اپنی رائے سے نص میں تخصیص کرو بلکہ یہ اس وقت ہے جب علت اتنی بدیہی ہو کہ ہر آدمی سمجھ سکتا ہو اور اس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔

یہاں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقامت اور نماز کے دوران اتنا فصل ہوا کہ آنحضرت ﷺ غسل کر کے واپس تشریف لائے، لیکن اقامت کے اعادہ کا ذکر نہیں ہے، جبکہ فقہاء یہ فرماتے ہیں کہ طویل فصل کی صورت میں اقامت کا اعادہ کرنا چاہئے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو عدم ذکر عدم شئی کو مستلزم نہیں ہوتا۔ دوسرے علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب فصل کسی دینی ضرورت سے ہو تو اعادہ کی ضرورت نہیں۔[۴۳]

(۲۶) باب الرجل للنبی ﷺ : ماصلینا

آدمی کا یہ کہنا کہ ہم نے نماز نہیں پڑھی

علامہ ابن بطال رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس ترجمۃ الباب سے امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے قول کی تردید ہے۔ ان کی طرف منسوب ہے کہ انہوں نے **"ماصلیت"** کہنے کو منع فرمایا ہے۔

لیکن حافظ ابن حجر اور علامہ عینی رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ ان کا قول اس شخص کے بارے میں ہے جو نماز کے انتظار میں بیٹھا ہو، اور کوئی شخص آکر پوچھے کہ کیا تم نے نماز پڑھ لی ہے؟ اس کے جواب میں اسے **"ماصلینا"** نہیں کہنا چاہئے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ابھی نماز نہیں شروع ہوئی۔ البتہ جو شخص منتظر صلوٰۃ نہ ہو اور وہ بیان واقعہ کے طور پر یہ کہے کہ میں نے نماز نہیں پڑھی تو اس میں ابراہیم نخعی رحمہ اللہ بھی کراہت نہیں سمجھتے. حدیث باب سے بھی اس کا جواز ثابت ہے۔[۴۴]

(۲۷) باب الإمام تعرض له الحاجة بعد الإقامة

اقامت کے بعد اگر امام کو کوئی ضرورت پیش آجائے

۶۴۲ ۔ حدثنا أبو معمر عبد الله بن عمرو قال : حدثنا عبد الوارث قال : حدثنا

---

[۴۴] وقال ابن بطال: فيه رد لقول ابراهيم النخعي : يكره أن يقول الرجل : لم نصل ،وكراهة النهي ليست على اطلاقها ، بل انما هي في حق منتظر الصلاة ، ومنتظر الصلاة في الصلاة ، فقول المنتظر : ماصلينا يقتضي نفي ما أثبته الشارح ، فلذلك كرهه ، والدليل على ذلك وأن البخاري لو اراد الرد عليه مطلقا لصرح بذلك كما صرح بالرد على ابن سيرين في ترجمة : فاتتنا الصلاة ، عمدة القاري ،ج:۴، ص: ۲۱۹.

عبد العزيز بن صهيب ، عن أنس قال: أقيمت الصلاة و النبي ﷺ يناجي رجلاً في جانب المسجد فما قام الى الصلاة حتى نام القوم .[أنظر : ۶۴۳ ، ۶۲۹۲]

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ نماز کی اقامت ہوگئی اس کے بعد نبی کریم ﷺ مسجد کے ایک گوشہ میں ایک شخص کے ساتھ سرگوشی کرتے رہے، یعنی اقامت ہوگئی لیکن آپ ﷺ کسی شخص کے ساتھ چپکے چپکے کوئی بات کرتے رہے۔

"فما قام الى الصلوٰة حتى نام القوم" پھر آپ ﷺ نماز کے لئے نہیں کھڑے ہوئے یہاں تک کہ لوگ سونے لگے یعنی اتنی دیر ہوگئی کہ لوگوں کو نیند آنے لگی۔

اس پر امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب قائم کیا ہے کہ اگر امام کو اقامت کے بعد کوئی حاجت پیش آجائے اور وہ نماز شروع کرنے میں دیر کردے تو اس کی بھی گنجائش ہے۔

یہاں اس روایت میں یہ تفصیل تو نہیں ہے کہ وہ صاحب کون تھے؟ جن سے اتنی دیر تک باتیں کرتے رہے اور نماز کو ان کی وجہ سے روکے رکھا، اس کی کیا وجہ تھی؟ اس روایت میں اس کی صراحت نہیں ہے، یہاں تک کہ حافظ ابن حجر اور علامہ عینی رحمہما اللہ بھی یہ کہہ گئے کہ ہمیں اس کی تشریح میں کوئی روایت نہیں ملی۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب حافظ اور عینی رحمہما اللہ جیسے لوگوں کو روایت کی تشریح نہیں ملی تو مجھے جستجو پیدا ہوئی اور میں نے کتابوں میں تلاش کرنا شروع کیا۔ بہت محنت کے بعد امام بخاری رحمہ اللہ کی کتاب **"الأدب المفرد"** میں ان صاحب کا نام بھی مل گیا اور یہ بات بھی مل گئی ہے کہ انہوں نے آکر کہا یا رسول اللہ! مجھے اتنی ضروری کرنی ہے کہ اگر درمیان میں جماعت کی وجہ سے تاخیر ہوگئی تو فلاں نقصان ہو جائے گا۔[۷۵]

اس سے پتہ چلا کہ آپ ﷺ نے جو تاخیر فرمائی تھی وہ اس شخص کو نقصان سے بچانے کے لئے فرمائی تھی۔

یاد رکھیں! علم بہت محنت چاہتا ہے۔ اس ایک حدیث کی تلاش میں کتنی محنت کی گئی **"الأدب المفرد"** میں اس حدیث کا ملنا کوئی آسان بات نہیں، اس لئے کہ **"الأدب المفرد"** میں **"کتاب الصلوٰۃ، کتاب الصوم"** وغیرہ نہیں ہیں، بلکہ اس میں آداب ہیں جن کی وجہ سے یقیناً خوب مطالعہ اور مشقت کے بعد یہ حدیث ملی ہوگی، تو درحقیقت طلب علم نام ہے نہ مٹنے والی پیاس کا۔

میرے والد ماجد رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے نزدیک طالب علم وہ ہے جس کے دماغ میں ہر وقت کوئی نہ کوئی علمی مسئلہ چکر کاٹ رہا ہو، یہ نہیں کہ سبق پڑھ لیا، اب چلو کھانا کھاؤ، چھٹی ہوگئی، بلکہ جب تک کوئی خلش دل میں کھٹکتی ہو اور حل نہ ہو جائے اس وقت تک چین نہیں آتا۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کو اللہ جل جلالہ نے طلب علم کا وہ مقام بخشا تھا کہ سوائے اپنے حوائج ضروریہ کے ہر وقت علم کے ساتھ مشغول تھے۔ علماء دیوبند

۷۵ حكاية مفيدة للطلبة فليراجع : فيض الباري ، ج: ۲، ص: ۱۸۹، وحاشيه : ۱.

کیا تھے۔ علماء دیو بند کا نام تو بہت سنا ہے اور مسلک دیو بند نام رکھ دیا ہے رد بریلویت کا، لیکن علماء دیو بند کیا ہوتے ہیں۔

اس پر حضرت والد صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں دیو بند میں ملا حسن پڑھا کرتا تھا، مطالعہ کر رہا تھا، مطالعہ کے دوران کوئی اشکال پیدا ہو گیا اگر اشکال پیدا ہوتا تو اس کے حل کرنے کا آسان طریقہ یہ تھا کہ جا کر حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ سے پوچھ لیں۔ میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے پاس جانے کیلئے نکلا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی جگہ پر نہیں ہیں، جب اپنی جگہ پر نہ ہوں تو اس کا مطلب یہ تھا کہ کتب خانہ میں ہوں گے، کوئی تیسری جگہ نہیں تھی، چنانچہ میں کتب خانہ پہنچ گیا۔

دار العلوم دیو بند میں کتب خانہ اس طرح تھا جس طرح ہمارے ہاں دار العلوم میں ہے کہ نیچے دار الافتاء اور اوپر گیلری۔ والد صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں دروازہ سے داخل ہوا تو دیکھا کہ حضرت اوپر بیٹھے ہیں، میرے ہاتھ میں ملا حسن کتاب تھی۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ والد صاحب رحمہ اللہ سے بہت محبت فرمایا کرتے تھے۔ والد صاحب رحمہ اللہ کا قد وقامت، جثہ ذرا چھوٹا تھا اس لئے وہ انھیں ''ملا مختصر'' کہتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اوپر سے دیکھا اور کہا ہاں بھائی ملا مختصر! کیسے آنا ہوا؟

حضرت! ایک مسئلہ حل نہیں ہوا، وہ پوچھنے آیا ہوں، پوچھا کون سی کتاب ہے؟ کہا حضرت ملا حسن۔ فرمایا پڑھو کہاں شبہ پیدا ہوا۔ حضرت والد صاحب رحمہ اللہ نے نیچے کھڑے عبارت پڑھی، ابھی صرف وہ عبارت پڑھی تھی جہاں شبہ پیدا ہوا تھا، شبہ کو بیان نہیں فرمایا تھا۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا اچھا تو تمہیں یہاں شبہ ہوا ہو گا اور پھر شبہ کی تقریر فرمائی، خود ہی شبہ کی تقریر فرمانے کے بعد فرمایا اس کا ایک جواب یہ ہے، دوسرا یہ ہے اور تیسرا یہ ہے۔

اللہ ﷻ نے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کو ایسا حافظہ بخشا تھا کہ ایک زمانہ میں بھوپال گئے اور وہاں رمضان المبارک گزارا، وہاں کوئی کتاب نہیں تھی، ان لوگوں سے کہا بھائی! مجھے کوئی کتاب پڑھنے کے لئے لا دو، فتح القدیر شرح ہدایہ وہاں تھی، بس سارے رمضان میں ''فتح القدیر'' ختم کر ڈالی، مطالعہ کر لی۔

چنانچہ وہ ساری فتح القدیر یاد تھی، بعض اوقات فتح القدیر کے حوالے اس طرح سناتے جیسے قرآن کریم سنا رہے ہوں۔ والد صاحبؒ فرماتے ہیں ایک مرتبہ فتح القدیر کی دو تین منٹ تک لمبی چوڑی عبارت پڑھی۔ طالب علم حیرانگی سے دیکھنے لگے، جب پڑھ چکے تو فرمایا جاہلین! یہ سمجھتے ہو کہ رات دیکھ کر آیا ہوں، دس سال پہلے ''بھوپال'' میں ''فتح القدیر'' مطالعہ کی تھی اس وقت کی یاد ہے، اللہ ﷻ نے ایسی قوت حافظہ عطا فرمائی تھی۔

حضرت والد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ حضرت شاہ صاحبؒ بیمار تھے، رات میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت شاہ صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ ہم بڑے پریشان ہوئے کہ رات کے وقت جائیں اور خبر

غلط ہوتو گھر والوں کو تکلیف ہوگی، بڑی مشکل سے فجر تک انتظار کیا، نماز فجر پڑھتے ہی ہم گئے۔

والد صاحب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں اور علامہ عثمانی اور ایک دو اور بزرگ تھے۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے مکان پر پہنچے، معلوم ہوا کہ حضرت باحیات ہیں، سوچا آئے ہیں تو عیادت بھی کرلیں، معلوم ہوا کہ گھر میں ایک حجرہ تھا جس میں ایک تخت بچھا ہوا تھا حضرت وہاں ہیں۔

وہاں جا کر دیکھا کہ حضرت تخت پر دوزانو بیٹھے ہوئے ہیں اور سامنے چوکی پر ایک کتاب رکھی ہے اور جھک کر اس کے مطالعہ میں مصروف ہیں، ابھی پوری روشنی بھی نہیں ہوئی تھی۔ فجر کے متصل بعد ہم لوگ گئے تھے اس لئے جھک کر کتاب کے نزدیک ہو کر مطالعہ کر رہے ہیں۔ خیر ہم پہنچے، سلام دعا ہوئی، صاحب **"فتح الملھم"** علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے شاگرد تو نہیں تھے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے شاگرد تھے، اس لحاظ سے استاذ بھائی تھے لیکن چونکہ قرن میں متاخر تھے، اس لئے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ سے استاذوں جیسا معاملہ تھا اور ساتھ ساتھ بے تکلفی بھی تھی۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ سے کہنے لگے کہ حضرت! آپ نے ہمارے بہت سے مسائل حل کئے ہیں اب ایک مسئلہ اور حل کردیں؟

حضرت نے فرمایا کہو کیا مسئلہ ہے؟ کہا حضرت! پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کو اس وقت کون سا ایسا مسئلہ درپیش ہو گیا ہے جس کی آپ نے تحقیق نہیں کر رکھی؟ کیونکہ سب مسائل تحقیق شدہ آپ کے ذہن میں پہلے سے موجود ہیں، اگر کوئی ایسا مسئلہ ہے جس کی ابھی تک تحقیق نہیں ہوئی ہے تو کیا کوئی فوری ضرورت کا مسئلہ ہے کہ باہر خبر وفات مشہور ہو رہی ہے اور آپ مطالعہ میں مصروف ہیں، اور اگر ایسی فوری نوعیت کا مسئلہ ہے تو ہم کہاں مر گئے ہیں، آپ ہم میں سے کسی کو حکم دیدیتے کہ اس مسئلے کی تحقیق کر کے بتادو، یہ جو آپ اپنی جان پر ظلم کر رہے ہیں کہ بیماری کی حالت میں صبح فجر کے بعد جبکہ روشنی بھی پوری طرح نہیں ہوئی مشکل سے کتاب دیکھ رہے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ مسئلہ حل نہیں ہو رہا ہے آپ حل کردیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے منہ اٹھایا اور کہا، ہاں بھائی ٹھیک ہے ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہئے، لیکن کیا کروں یہ بھی ایک "روگ" ہے، یہ بھی ایک بیماری ہے، اس کے بغیر چین نہیں آتا۔ یہ ہے **"طلب العلم من المھد الی اللحد"** جب یہ پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اللہ ﷻ علم کا کچھ حصہ عطا فرماتے ہیں اور جب یہ نہ ہو تو علم بڑی بے نیاز چیز ہے۔

وہ **"انلزمکموھا وأنتم لھا کارھون"** کا قائل نہیں ہے، اگر آدمی اس سے بے نیاز ہو تو وہ اس کو اپنا ذرہ بھی نہیں دیتا **"تلک أمانیھم فان العلم لایعطیک بعضه حتی تعطیه کلک"**۔

حافظ رحمہ اللہ نے لکھ دیا کہ مجھے اس آدمی کا پتہ نہیں چلا۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چین نہیں آیا، دل چاہا کہ تلاش کروں، پتہ نہیں کتنی محنت اٹھائی، تب جا کر **"الأدب المفرد"** میں حدیث ملی۔

اللہ ﷻ طلب علم کا یہ ذوق پیدا فرمادیں، (آمین) جب یہ ذوق پیدا ہو جائے گا تو یقین کریں کہ اس کائنات میں اس سے زیادہ لذیذ کوئی چیز نہیں ہے۔

اگر میں قسم اٹھاؤں تو حانث نہیں ہوں گا کہ اس کائنات میں طلب علم سب سے زیادہ لذیذ چیز ہے بشرطیکہ طلب علم کی حقیقت حاصل ہو جائے۔

(۲۸) باب الكلام اذا أقيمت الصلاة

اقامت ہو جانے کے بعد کلام کرنے کا بیان

٦٤٣ ـ حدثنا عياشٰ بن الوليد قال: حدثنا عبد الاعلىٰ قال: حدثنا حميد قال: سألت ثابتاً البناني عن الرجل يتكلم بعد ماتقام الصلاة ، فحدثني عن أنس بن مالک قال: أقيمت الصلاة فعرض للنبي ﷺ رجل فحبسه بعد ماأقيمت الصلاة . [راجع : ٦٤٢]

یہ بظاہر وہی واقعہ ہے جو پہلے بیان ہوا ہے کہ آپ کو ایک آدمی نے اقامت کے بعد روک لیا تھا۔

(۲۹) باب وجوب صلاة الجماعة

نماز باجماعت کے واجب ہونے کا بیان

"وقال الحسن : إن منعته أمه عن العشاء في الجماعة شفقة عليه لم يطعها".

٦٤٤ ـ حدثنا عبد الله بن يوسف قال : أخبرنا مالک عن أبي الزناد عن الأعرج ، عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ قال : " والذي نفسي بيده ، لقد هممتُ أن آمر بحطب ليحطب ثم آمر بالصلاة فيؤذن لها ، ثم آمر رجلاً فيؤم الناس ، ثم أخالف إلى رجال فأحرق عليهم بيوتهم: والذي نفسي بيده لو يعلم أحدهم أنه يجد عرقاً سمينا أو مرماتين حسنتين لشهد العشاء " . [أنظر : ٦٥٧ ، ٢٤٢٠، ٧٢٢٤] [٤٦]

٤٦ وفي صحيح مسلم ، كتاب المساجد ومواضع الصلاة ، باب فضل صلاة الجماعة وبيان التشديد في التخلف عنها ، رقم: ١٠٤٠ ، وسنن الترمذي ، كتاب الصلاة ، باب ماجاء في من يسمع النداء فلا يجيب ، رقم: ٢٠١ ، وسنن النسائي ، كتاب الامامة ، باب التشديد في التخلف عن الجماعة ، رقم: ٨٣٩ ، وسنن أبي داؤد ، كتاب الصلاة باب في التشديد في ترک الجماعة ، رقم: ٤٦١ ، وسنن ابن ماجه ، كتاب المساجد والجماعات ، باب التغليظ في التخلف عن الجماعة ، رقم: ٧٨٣ ، ومسند أحمد ، باقي مسند المكثرين ، باب مسند أبي هريرة ، رقم: ٧٥٧٥ ، ٧٨٠٢ ، ٧٩٠٨ ، ٨٤٤١ ، ٨٥٣٥ ، ٩٨٢٦ ، وموطأ مالک ، كتاب النداء للصلاة ، باب فضل صلاة الجماعة على صلاة الفذ ، رقم: ٢٦٦ ، وسنن الدارمي ، كتاب الصلاة ، باب فيمن تخلف عن الصلاة ، رقم: ١٢٤٣ .

ترک جماعت پر وعید

یہ حضرت ابو ہریرہ ﷺ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، مجھے خیال ہوا تھا کہ میں حکم دوں کہ لکڑیاں جمع کی جائیں، پھر حکم دوں کہ نماز کے لئے اذان دی جائے پھر ایک شخص کو حکم دوں کہ اقامت کرے، پھر میں ایسے لوگوں کے پاس جاؤں جو جماعت میں حاضر نہیں ہوتے، ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔

پھر فرمایا ''**والذی نفسی بیدہ لو یعلم احدھم انه یجد عرقاً سميناً الخ**'' قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر ان میں سے کسی کو پتہ ہو کہ اس کو ایک موٹی ہڈی یا بکریوں کے اچھے کھر مل جائیں گے تو وہ عشاء کی نماز میں ضرور حاضر ہو۔

یہ منافقین کی بات ہو رہی ہے جو عشاء کی نماز میں نہیں آتے تھے لیکن ذرا سے دنیاوی نفع کے لئے آ جائیں اور میں جو کہہ رہا ہوں کہ آخرت کے اعتبار سے اس کی اتنی فضیلت ہے اس کی وجہ سے نہیں آتے، تو یہ منافقین کا شیوہ فرمایا۔

''**مرماتین**'' **مرماء** کے معنی بعض نے بکری کے کھر سے کئے ہیں، بعض نے کہا کہ اس کی کروٹ میں ایک بوٹی ہوتی ہے اور بعض نے کہا کہ یہ وہ تیر ہے جس کی دھار نہیں ہوتی اور تیر اندازی کی مشق کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

تو یہ منافقین ذرا سے دنیا کے فائدے کے لئے آنے کو تیار ہیں اور آخرت کے لئے تیار نہیں ہیں۔

اس حدیث سے امام بخاری رحمہ اللہ نے ''**صلاۃ الجماعة**'' کے وجوب پر استدلال کیا ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا واجب ہے، کیونکہ اس میں سخت وعید ہے کہ ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔

فقہاء کرامؒ کی ایک جماعت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک واجب ہے بلکہ وہ اسے صحتِ صلاۃ کی شرط کہتے ہیں یعنی اگر اکیلے نماز پڑھی اور جماعت چھوڑ دی تو نماز ہی نہیں ہوگی، یہ ان کی ایک روایت ہے۔

ان کی دوسری روایت جو مفتی بہ ہے وہ یہ ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا واجب ہے، اگر چہ صحت صلاۃ کے لئے شرط نہیں ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ اس کو فرض کفایہ اور سنت علی العین قرار دیتے ہیں۔

حنفیہ کے ہاں بعض واجب کہتے ہیں بعض سنت مؤکدہ کہتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں سنت مؤکدہ کا اعلیٰ درجہ اور واجب کا ادنیٰ درجہ برابر ہوتے ہیں، اس لئے کوئی اختلاف نہیں۔ حضرت نے یہ تحقیق فرمائی ہے کہ جن لوگوں نے واجب کہا ہے انہوں نے اس بات پر نظر رکھی کہ اتنی وعیدیں آئی ہیں اور جنہوں نے واجب کہنے سے انکار کیا اور سنت مؤکدہ کہا انہوں نے اس

پر نظر رکھی کہ بہت سے اعذار ہیں جس کی وجہ سے ترک جماعت جائز ہے جن میں بعض معمولی معمولی عذر ہیں جیسے کھانا سامنے آ گیا تو ترک جماعت جائز ہے، تو انہوں نے کہا کہ واجبات کی یہ شان نہیں ہوتی کہ معمولی معمولی اعذار کی بنا پر ان کا وجوب ساقط ہو جائے، لہٰذا انہوں نے اس کو سنت مؤکدہ قرار دیا، لیکن یہ کہتے ہیں کہ اس کا ترک بالاتفاق بہت ہی شدید اور موجب اثم ہے، اگر بغیر عذر کے ہو، البتہ اعذار کی لمبی چوڑی فہرست ہے اگر ان اعذار کی بنا پر ترک جماعت ہو جائے تو ان شاء اللہ معاف ہے۔

اس لئے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ اختلاف درحقیقت تعبیر کا اختلاف ہے، مآل کار کے اعتبار سے زیادہ فرق نہیں۔ اسی بنیاد پر روایات سے ایک طرف جماعت کے معاملہ میں تغلیظ اور تشدید معلوم ہوتی ہے اور دوسری طرف معمولی اعذار کی وجہ سے ترک جماعت کی اجازت بھی مفہوم ہوتی ہے۔

(۳۰) باب فضل صلاة الجماعة،

نماز باجماعت کی فضیلت کا بیان

”وكان الأسود اذا فاتته الجماعة ذهب إلى مسجد اخر . وجاء انس إلى مسجد قد صلى فيه فاذن واقام وصلى جماعة“.

یہ باب جماعت کی فضیلت کے بارے میں ہے آگے فرمایا کہ اسود بن یزید جو تابعی ہیں اگر ان کی نماز ایک مسجد میں نکل جاتی تو وہ دوسری مسجد میں جماعت کی فضیلت حاصل کرنے کے لئے چلے جاتے تھے۔ آگے ایک اور بات ذکر کی کہ حضرت انس ﷺ ایک ایسی مسجد کے پاس آئے جس میں نماز ہو چکی تھی، آپ ﷺ نے وہاں اذان کہی، اقامت کہی اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھی۔

جماعت ثانیہ کا حکم

اس اثر سے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے جماعت ثانیہ کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ دوسرا استدلال ترمذی کی حدیث سے ہے کہ آپ ﷺ نے نماز پڑھی بعد میں ایک شخص اندر داخل ہوا جس سے جماعت چھوٹ گئی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ: **”ایکم یتجر علی هذا“** کوئی جوان کے ساتھ نماز پڑھے اور اجر حاصل کرے؟ [۷۷]

حضرت ابوبکر صدیق ﷺ نفل کی نیت سے ان کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور جماعت کرائی، تو یہ مسجد میں

---

۷۷ سنن الترمذی، باب ماجاء في الجماعة مسجد قد صلى فيه مرة .

جماعت ثانیہ ہوئی۔ یہ دو دلیلیں ہیں جن سے حضرات حنابلہ جماعت ثانیہ کے جواز پر استدلال کرتے ہیں۔

امام مالک، امام شافعی اور امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ تینوں اس پر متفق ہیں کہ عام حالات میں جس مسجد میں جماعت ہو چکی ہو اس میں جماعت ثانیہ جائز نہیں، مکروہ ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ اس مسجد کی بات ہے جس میں امام اور مؤذن مقرر ہوں، البتہ جو مسجدیں راستہ پر بنی ہوتی ہیں جن میں امام اور مؤذن مقرر نہیں ہوتے، وہاں یہی ہوتا ہے کہ جماعتیں آتی رہتی ہیں اور جماعت سے نمازیں پڑھتی رہتی ہیں، تو ایسی جگہ پڑھ سکتے ہیں۔ [۷۸]

دوسری بات یہ ہے کہ تداعی کے بغیر ہو، جس کی حد یہ ہے کہ مقتدی اور امام مل کر چار سے زائد نہ ہوں اور مسجد کے محراب سے ہٹ کر ایسی جگہ جماعت کریں جو ایک کنارہ سا ہو، اور اذان و اقامت نہ کہے تو بھی جائز ہے لیکن جہاں اندیشہ ہو کہ پوری جماعت کھڑی ہو جائے گی وہاں نہیں کرنا چاہئے۔

عدم جواز پر جمہور کی دلیل یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے عہد مبارک میں اس ایک واقعہ کے سوا جس میں آپ ﷺ نے فرمایا **"أیکم یتجر علی ھذا"** کہیں اور تکرار جماعت کا ذکر نہیں ہے، بلکہ خود حضور اقدس ﷺ کا عمل یہ منقول ہے۔

معجم طبرانی کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ باہر قباء وغیرہ تشریف لے گئے تھے، واپس تشریف لائے تو جماعت ہو چکی تھی، روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ **"فمال علی منزله مجمع أهله وصلّی به"**. گھر تشریف لے گئے، گھر والوں کو جمع کیا اور ان کو نماز پڑھائی. تو مسجد نبوی کی فضیلت کو ترک کر کے گھر میں جماعت کرائی۔ [۷۹]

مصنف ابن ابی شیبہ میں ایک روایت آتی ہے کہ صحابۂ کرام ؓ سے جب جماعت رہ جاتی تھی تو وہ اپنے گھروں کے زوایا میں جا کر پڑھتے تھے، کہیں یہ منقول نہیں ہے کہ باقاعدہ جماعت ہوتی تھی، اگر یہ عمل درست ہوتا تو صحابۂ کرام ؓ سے منقول ہوتا۔

پیچھے جو حدیث گزری ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا میرا دل چاہتا کہ امام کو کھڑا کروں اور جا کر ان کے گھروں کو لوگ لگا دوں جو جماعت میں نہیں آتے۔ اگر جماعت ثانیہ جائز ہوتی تو ان کے پاس عذر ہوتا کہ ہم

---

۷۸ وقال مالک و الشافعي : اذا کان المسجد علی طریق الإمام له أن یجمع فیه قوم بعد قوم، وحاصل مذهب الشافعي أنه : لا یکره في المسجد المطروق ، وکذا غیره إن بعد مکان الإمام ولم یخف فیه . عمدة القاری ، ج:۴، ص: ۲۳۱.

۷۹ ......عن عبد الرحمن بن أبي بکرة عن ابیه أن رسول الله صلی الله علیه وسلم أقبل من بعض نواحي المدینة یرید الصلاة فوجد الناس قد صلوا فذهب الی منزله فجمع أهله ثم صلی بهم ، المعجم الأوسط للطبراني ، ج:۷، ص: ۵۱، رقم: ۶۸۲۰.

دوسری جماعت کرلیں گے، تو یہ سب جمہور کے دلائل ہیں اور جہاں تک حضرت انس ﷺ کے واقعہ کا تعلق ہے، تو اس میں غالب یہ ہے کہ وہ مسجد طریق تھی، جس کی دو دلیلیں ہیں۔

ایک دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اذان بھی کہی اور اقامت بھی کہی اور جو جماعت ثانیہ کو جائز کہتے ہیں وہ بھی بغیر اذان اور اقامت کے جائز کہتے ہیں۔ اذان اور اقامت کے ساتھ جماعت ثانیہ کا دنیا میں کوئی بھی قائل نہیں ہے، لہٰذا انہوں نے جواذان اور اقامت کہی تو لازماً یہ مسجد طریق ہوگی اور ایک روایت سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے، مسند أبویعلی میں ہے کہ انہوں نے جس مسجد میں نماز پڑھی تھی اس کا نام مسجد بنوذریق تھا اور یہ مدینہ منورہ کی مشہور مساجد میں شامل نہیں۔

جہاں تک حضرت انس ﷺ کے واقعہ کا تعلق ہے تو عین ممکن ہے کہ یہ مسجد مسجد طریق ہی ہو، اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ مسند ابویعلی میں تصریح ہے کہ یہ مسجد بنی ثعلبہ تھی، اور اس نام سے مدینہ طیبہ میں کوئی معروف مسجد نہیں، اس سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ یہ مسجد طریق تھی، نیز اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ خود حضرت انس ﷺ سے مروی ہے: "**إن اصحاب رسول اللہ ﷺ کانوا إذا فاتتهم الجماعة صلّوا فی المسجد فرادی**" یہ جماعت ثانیہ کی نفی پر بالکل صریح ہے۔

تو ایسا لگتا ہے کہ یہ راستہ کی مسجد تھی اور اس میں امام اور مؤذن مقرر نہیں تھے، اس لئے اذان اور اقامت بھی کہی اور جماعت بھی کی، تو اس سے جماعت ثانیہ کے جواز پر استدلال درست نہیں۔

نیز مصنف ابن ابی شیبہ میں یہ صراحت بھی ہے کہ اس وقت جب جماعت کی تو آگے کھڑے ہونے کے بجائے وسط میں کھڑے ہوئے، جس کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے ہیئت تبدیل کردی اور حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر ہیئت تبدیل کردی جائے، جماعت محراب سے ہٹ کر ہو اور اذان و اقامت بھی نہ ہو تو پھر جائز ہے۔[۸۰]

خلاصہ یہ ہے کہ یہ مسجد طریق تھی یا یہ کہہ لیا جائے کہ یہ واقعہ "**حال یتطرق علیها احتمالات کثیرة**" لہٰذا محض اس کی بنیاد پر جماعت ثانیہ کا جواز نہیں ہوگا۔

اور مصلحت کی بات بھی یہ ہے کہ جب جماعت ثانیہ کا رواج ہو جاتا ہے تو لوگوں کے دل سے جماعت

---

۸۰ وعن ابی یوسف رحمہ اللہ فی الکبیری انها تجوز بدون الأذان والإقامة اذا لم تکن فی موضع الامام، ولعل ترک الأذان والإقامة مع ترک موضع الامام لتغییرها عن هیئة الجماعة الاولیٰ، وفی ظاهر الروایة أنها مکروهة. ثم ان روایة ابی یوسف رحمہ اللہ محلها فیمن فاتتهم الجماعة لاأنهم تعمدوا ذلک أو تعودوا، أما الر انس ص فلا دلیل فیه لما فی مصنف ابن ابی شیبة أنه جمع بهم وقام وسطهم ولم یتقدم علیهم فدل أنه قصد تغییر الشاکلة کما فعله ابو یوسف رحمہ اللہ، غیر ان ابا یوسف رحمہ اللہ غیرها بترک الأذانین وموضع الامام، فیض الباری، ج:۲، ص:۱۹۳.

اولیٰ کی اہمیت کا احساس مٹ جاتا ہے کہ چلیں دوسری جماعت میں شریک ہوجائیں گے وہ نہ ملی تو تیسری میں شریک ہوجائیں گے. جہاں جماعت ثانیہ کا رواج ہے وہاں لوگ جماعت میں شریک ہونے میں سستی کرتے ہیں، اس لئے بھی جماعت ثانیہ جماعت اولیٰ کے وقار کے خلاف ہے۔[81]

(۳١) باب فضل صلوٰة الفجر فی جماعة

فجر کی نماز جماعت سے پڑھنے کی فضیلت کا بیان

٦٥٠ ـ حدثنا عمر بن حفص قال: حدثنا أبي قال: الأعمش قال: سمعت سالما قال: سمعت أم الدرداء تقول: دخل علي أبو الدرداء وهو مغضب فقلت : ما أغضبک ؟ فقال: والله ماأعرف من أمة محمد ﷺ شيئاً إلا أنهم يصلّون جميعا.[82]

حضرت ام الدرداء ؓ نے پوچھا کہ آپ کو کس چیز نے غضبناک کیا ہے؟ فرمایا اللہ کی قسم میں نبی کریم ﷺ کے معاملات میں سے آج کل کچھ بھی نہیں پہچانتا سوائے اس کے کہ لوگ جماعت سے نماز پڑھ لیتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جماعت سے نماز تو پڑھ لیتے ہیں اور یہ اچھی بات ہے لیکن دین کے بقیہ احکام میں اب نبی کریم ﷺ کی اتباع نظر نہیں آرہی ہے، اس لئے غصہ آرہا ہے۔

٦٥١ ـ حدثنا محمد بن العلاء قال : حدثنا أبو أسامة عن بريد بن عبد الله، عن أبي بردة عن موسى قال : قال النبي ﷺ : أعظم الناس أجراً في الصلاة أبعدهم فأبعدهم ممشى، والذي ينتظر الصلاة حتى يصليها مع الإمام أعظم أجرا من الذي يصلي ثم ينام.[83]

فرماتے ہیں کہ نماز میں سب سے زیادہ اجر حاصل کرنے والا وہ ہے جو چلنے کے اعتبار سے دور رہتا ہو، جتنا دور سے چل کر آئے گا اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا۔

---

[81] ومالک وأبو حنيفة والأوزاعي لاتعاد الجماعة فی مسجد له امام راتب فی غير ممر الناس فمن فاتته الجماعة صلى منفرداً لئلا يفضى الى اختلاف القلوب والعداوة والتهاون فی الصلاة مع الامام ولانه مسجد له امام راتب فكره فيه اعادة الجماعة كمسجد النبی ﷺ ،المغنی ، ج:۲، ص:۵.

[82] وفی مسند أحمد ، مسند الأنصار ، باب باقی حديث أبی الدرداء ، رقم: ۲۰۷۱۱ ، ومسند القبائل ، باب من حديث أبی الدرداء عويمر ، رقم:۲۶۲۲۸.

[83] وفی صحيح مسلم ، كتاب المساجد ومواضع الصلاة ، باب فضل كثرة الخطا الى المساجد ، رقم: ۱۰۶۴.

اور وہ شخص جو نماز کا انتظار کرے یہاں تک کہ امام کے ساتھ دوسری نماز پڑھے اور اس شخص کے مقابلہ میں زیادہ عظیم اجر والا ہے جو نماز پڑھ کر سو جاتا ہے، مثلاً ایک شخص نے مغرب کی نماز پڑھی اور اس کے بعد عشاء کی نماز کے انتظار میں جاگ رہا ہے یہ زیادہ ثواب والا ہے بہ نسبت اس شخص کے جو نماز پڑھ کر سو جائے اور پھر اٹھ کر عشاء کی نماز پڑھے۔

دور سے چل کر آنے کی جو فضیلت بیان کی گئی ہے اس کی بنیاد پر بعض لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ چھوٹے چھوٹے قدم لینے چاہئیں اس لئے کہ جتنے زیادہ قدم ہوں گے اتنے ہی درجات بلند ہوں گے اور گناہ معاف ہوں گے۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ کہیں ثابت نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جو جتنی دور سے آئے گا اتنی ہی مشقت ہوگی اور مشقت کے بقدر اجر ملے گا۔

(۳۲) باب فضل التهجير الى الظهر

ظہر کی نماز اول وقت پڑھنے کی فضیلت کا بیان

۶۵۲ ــ حدثنا قتيبة عن مالك، عن سمي مولى أبي بكر، عن أبي صالح السمان، عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ قال: بينما رجل يمشي بطريق وجد غصن شوك على الطريق فأخذه فشكر الله له فغفر له [راجع: ۶۱۵ و أنظر: ۲۴۷۲]

جب کسی "منوّن" لفظ کے ساتھ صفت معرف باللام آرہی ہو تو وہاں تنوین کے نون کو ظاہر کر کے پڑھنا چاہئے، یہاں "عن أبی صالح السّمان" نہیں پڑھے گے بلکہ "عن أبی صالح ن السمّان" پڑھیں گے۔

(۳۳) باب احتساب الآثار

نیک کام میں ہر قدم پر ثواب ملنے کا بیان

۶۵۵ ــ حدثنا محمد بن عبد الله بن حوشب قال: عبد الوهاب قال: حدثنا حميد عن أنس قال: قال النبي ﷺ يا بني سلمة، ألا تحتيمون آثاركم؟ وقال: مجاهد في قوله: ﴿وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ﴾ [يٰس: ۱۲] **قال: خطاهم.** [أنظر: ۶۵۶، ۱۸۸۷][۸۴]

۸۴ وفي سنن ابن ماجه، كتاب المساجد والجماعات، باب الأبعد فالأبعد من المسجد أعظم أجراً، رقم: ۷۷۶. ومسند أحمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند أنس بن مالك، رقم: ۱۱۵۹۲، ۱۲۴۱۱، ۱۳۲۲۷.

بنو سلمہ مدینہ منورہ سے کچھ فاصلہ پر رہتے تھے، تقریباً ایک ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ان کا گھر تھا۔ ان کو مسجد نبوی میں آنے میں دیر لگتی تھی اس لئے انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ ہم اپنے گھر وہاں سے ختم کر کے مسجد کے قریب بنالیں تا کہ آنے جانے میں آسانی ہو۔ اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا۔ "**یابنی سلمة، ألا تحتبون آثارکم؟**" کیا تم اپنے آثار کے اجر کا حساب نہیں کرتے ہو؟ چنانچہ آگے روایت میں اس کی صراحت ہے۔

٦٥٦ ۔ وحدثنا ابن أبي مريم: أخبرنا يحيي بن أيوب حدثني حميد عن انس ان بني سلمة أرادوا أن يتحولوا عن مناز لهم فينزلوا قريباً من النبي ﷺ قال: فكره النبي ﷺ ان يعروا المدينة فقال: ألاتحتسبون آثاركم ؟ قال مجاهد : خطاهم آثارهم والمشي في الأرض بأرجلهم. [راجع: ٦٥٥]

"**أن بنی سلمة**" بکسر اللام ہے۔ "**أرادوا أن يتحوّ لوا عن منازلهم**" انہوں نے اپنے گھروں سے منتقل ہونے کا ارادہ کیا "**فینزلوا من النبی ﷺ قال: فکره النبی ﷺ ا ن یعرو المدینة**" حضور نبی کریم ﷺ نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ وہ لوگ مدینہ منورہ کو خالی چھوڑ دیں۔

"**اعریٰ ــ یعری**" کا معنی ہے بےلباس چھوڑ دینا، خالی چھوڑ دینا۔ مراد یہ ہے کہ جس جگہ یہ رہتے تھے اگر یہ وہاں سے اپنی بستی ختم کر کے قریب آ کر آباد ہوں گے تو اس کے نتیجے میں مدینہ منورہ کا آباد رقبہ کم ہو جائے گا اور نبی کریم ﷺ یہ نہیں چاہتے تھے کہ مدینہ منورہ کی آبادی اس طرح سمٹ جائے کہ وہ چھوٹا سا قصبہ ہو کر رہ جائے اس واسطے آنحضرت ﷺ نے اس کو ناپسند فرمایا لیکن جیسا کہ پہلے ذکر کیا یہ ایک ثانوی وجہ تھی۔

اس سے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ مسجد سے گھر دور بنانا اس لئے افضل ہے تا کہ آنے میں زیادہ مسافت قطع کرے اور اس سے اجر میں اضافہ ہو لیکن یہ استدلال اس لئے درست نہیں کہ:

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

ہر آدمی کے حالات مختلف ہوتے ہیں، حضور اقدس ﷺ کو پتہ تھا کہ یہ اگر چہ دور رہیں گے لیکن پھر بھی مسجد نبوی "**علی صاحبه الصلاة والتسلیمات**" میں حاضر ہوتے رہیں گے اور پابندی کریں گے، پابندی تو ہر حال میں کرنی ہے۔ اگر یہ قریب آ گئے تو یہ اس مسافت والے ثواب سے محروم ہو جائیں گے، اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں وہیں رہو تا کہ تمہارا ثواب جاری رہے۔ اگر ہم لوگ اس خیال سے دور چلے جائیں تو یہ شیطان کا دھوکہ ہوگا کیونکہ دور جا کر مسجد کی حاضری میں یقیناً فرق آئے گا۔

(۳۵) باب: اثنان فما فوقهما جماعة

دو یا دو سے زیادہ آدمی جماعت کے حکم میں داخل ہیں

۶۵۸ ـ حدثنا مسدد قال: حدثنا يزيد بن زريع قال: حدثنا خالد، عن أبي قلابة، عن مالك بن الحويرث عن النبي ﷺ قال: إذا حضرت الصلاة فأذنا وأقيما ثم ليؤ مكما أكبر كما. [راجع: ۶۲۸]

آپ ﷺ نے فرمایا "**ليؤ مكما أكبر كما**" معنی یہ ہیں کہ دو آدمی بھی مل کر جماعت کر سکتے ہیں۔

(۳۸) باب إذا أقيمت الصلاة فلا صلاة إلّا المكتوبة

جب نماز کی تکبیر ہو جائے تو سوائے نماز کے اور کوئی نماز نہیں

یہ باب قائم کیا ہے کہ جب فرض نماز کی اقامت ہو جائے تو پھر سوائے فرض نماز کے کوئی نماز مشروع نہیں یہ خود ایک حدیث کا جملہ ہے لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے وہ حدیث روایت نہیں کی، شاید اس وجہ سے کہ وہ ان کی شرط پر نہیں تھی، اس وجہ سے اس کو ترجمۃ الباب بنا دیا۔

۶۶۳ ـ حدثنا عبد العزيز بن عبد الله قال: حدثنا ابراهيم بن سعد، عن أبيه، عن حفص بن عاصم، عن عبدالله بن مالك بن بحينة قال: مر النبي ﷺ برجل قال: وحدثني عبد الرحمٰن قال: حدثنا بهز بن اسد قال: حدثنا شعبة قال أخبرني سعد ابن ابراهيم قال: سمعت حفص بن عاصم قال: سمعت رجلا من الأزد يقال له: مالك بن بحينة، أن رسول الله ﷺ لاث به الناس فقال له رسول الله ﷺ رأى رجلا وقد أقيمت الصلاة يصلي ركعتين، فلما انصرف رسول الله ﷺ لاث به الناس فقال له رسول الله ﷺ الصبح أربعا؟ الصبح أربعا؟ تابعه غندر ومعاذ عن شعبة عن مالك وقال: ابن اسحاق عن سعد عن حفص عن عبدالله بن بحينة. وقال حماد: أخبرنا سعد عن حفص عن مالك. [۸۵، ۸۶]

---

۸۵ لايوجد للحديث مكررات.

۸۶ وفي صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب كراهة الشروع في نافلة بعد شروع المؤذن، رقم: ۱۱۶۲، وفي سنن ابن ماجه، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب ماجاء في اذا أقيمت الصلاة فلا صلاة الا المكتوبة، رقم: ۱۱۴۳، ومسند أحمد، باقي مسند الأنصار، باب حديث عبد الله بن مالك ابن بحينه، رقم: ۲۱۸۴۳، وسنن الدارمي، كتاب الصلاة، باب اذا اقيمت الصلاة فلاصلاة الا المكتوبة، رقم: ۱۴۱۳.

"عن عبد الله عن مالک بن بحینة قال: مرّ النبيّ ﷺ برجل" ابھی متن پورا نہیں ہوا۔ درمیان میں امام بخاری رحمہ اللہ نے تحویل کردی **"قال وحدثني عبد الرحمٰن قال"** حفص کہتے ہیں کہ میں نے ایک ایسے صاحب کو حدیث سناتے ہوئے سنا جس کا نام مالک بن بحینہ تھا۔

اب یہ صراحۃً غلط ہے، اس میں کسی راوی سے شدید وہم ہوا ہے، اس کے مطابق حدیث کے راوی مالک بن بحینہ ہیں حالانکہ اصل راوی مالک بن بحینہ کے بیٹے عبداللہ بن مالک بن بحینہ ہیں جیسا کہ روایت میں ہے حفص بن عاصم کے بعد **"عن عبدالله بن مالک بن بحینه"** تو یہاں راویٔ حدیث عبداللہ بن مالک بن بحینہ ہیں، مالک بن بحینہ تو مسلمان ہی نہیں ہوئے، یہ کسی راوی کا وہم ہے۔

یہاں یہ بھی یاد رکھیں کہ بحینہ ان کے دادا کا نام نہیں ہے بلکہ ان کی والدہ کا نام ہے اور یہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ بعض اوقات کسی شخص کو ماں باپ دونوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تاکہ دوسروں سے ممتاز کیا جائے۔ جیسے **" محمدُ بنُ علی ابنُ حنفية "** حضرت علی ﷛ والد اور حنفیہ والدہ ہیں، ایسی صورت میں دونوں مرفوع ہوتے ہیں۔ **" محمد بنُ علی بن حنفية "** یہاں بھی اسی طرح ہے **" عبد اللّٰه بنُ مالک بنُ بحينة "**.

اگر **" عبدُ اللّٰه بنُ مالک بنِ بحينة "** پڑھیں گے تو غلط ہو جائے گا، کیونکہ اس صورت میں ابن بحینہ مالک کی صفت بن جائے گی اور معنی ہوگا مالک بیٹے ہیں بحینہ کے، حالانکہ وہ شوہر ہیں، اس لئے مرفوع پڑھنا چاہئے۔

فرماتے ہیں کہ **"أن رسول الله ﷺ رأى رجلا وقد أقيمت الصلاة يصلّي ركعتين "** جماعت کھڑی ہوچکی تھی یعنی اقامت ہوچکی تھی، آپ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ دو رکعتیں پڑھ رہا ہے۔

"فلما انصرف رسول الله ﷺ " جب آپ ﷺ فارغ ہوئے **"لاث به الناس "** تو لوگ اس کے اردگرد اکٹھے ہوگئے، **"فقال له رسول الله ﷺ الصبح أربعاً؟ "** کیا صبح کی چار رکعت پڑھ رہے ہو؟

اس باب سے جو مسئلہ متعلق ہے وہ یہ ہے کہ ظہر، عصر، عشاء اور تبعاً مغرب، ان کے بارے میں تمام ائمہ کرام کا اتفاق ہے کہ جب اقامت ہو جائے تو کسی بھی شخص کو سنت میں مشغول نہ ہونا چاہئے بلکہ آکر جماعت میں شامل ہونا چاہئے لیکن فجر کی نماز کے بارے میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔

اقامت صلوٰۃ کے بعد فجر کی سنتیں اور اختلاف فقہاء

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ بھی اصح القولین میں اس بات کے قائل ہیں کہ اگر فجر کی جماعت کھڑی ہوگئی تو کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ سنتوں میں مشغول ہو بلکہ سیدھا آکر جماعت میں شامل

ہونا چاہئے۔

امام مالک رحمہ اللہ یہ فرماتے ہیں کہ اگر ایک رکعت ملنے کی توقع ہو تو خارج مسجد جا کر سنتوں میں مشغول ہونا چاہئے یعنی دو شرطیں ہیں: ایک خارج مسجد ہونا اور ایک رکعت کی توقع۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا صحیح قول بھی یہی ہے اور ظاہر الروایۃ بھی یہی ہے کہ دو شرطوں کے ساتھ سنتوں میں مشغول ہونا جائز ہے: ایک یہ کہ پوری رکعت ملنے کی توقع ہو اور دوسری یہ کہ خارج مسجد ادا کی جائیں، مسجد میں نہیں۔

امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر ایک پوری رکعت ملنے کی توقع نہیں ہے لیکن قعدۂ اخیرہ میں شامل ہو جانے کی توقع ہو، تب بھی سنت فجر میں مشغول ہو جانا جائز ہے یعنی یہ اندازہ ہے کہ رکعت تو نہیں ملے گی لیکن سلام سے پہلے پہلے جا کر قعدہ میں شامل ہو جاؤں گا تب بھی مشغول ہو جائے تو جائز ہے۔

امام محمد رحمہ اللہ نے پہلی شرط میں تو توسّع کیا ہے لیکن دوسری شرط خارج مسجد میں توسّع نہیں کیا، یعنی مسجد سے باہر ہی پڑھے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ نے دوسری شرط میں توسّع کر دیا، انہوں نے کہا کہ خارج مسجد تو جائز ہے ہی، لیکن داخل مسجد بھی جائز ہے بشرطیکہ صفوف جماعت سے دور کسی گوشہ میں ہو۔[۸۷]

اس سے پتہ چلا کہ آج کل جو طریقہ ہے کہ عین جماعت کی پچھلی صف میں یا دو تین صفوں کے فاصلے پر

---

۸۷ وقال الامام أبو حنيفة رحمه الله تعالىٰ على ما تقرر عندی من مذهبه أنه يركعهما خارجه بشرط ادراک ركعة، ولعل التخصيص بالركعةمن الاجتهاد ناظراًالى مثل حديث من ادرک ركعة فقد ادرک الصلاة ولا رواية عنه فی داخل المسجد وهذا هو المذهب عندی كما فی الجامع الصغير والبدائع، واختاره صاحب الهداية وصرحوا به فی باب ادراک الفريضة وصرح به علماء المذاهب الأخرىٰ ايضا كالقسطلانی من الشافعية وابن الرشد والباجی من المالكية، ثم وسع محمد رحمه الله تعالىٰ فی ادراک ركعة وأجاز بهما عند ادراک القعدة ايضا، ثم مشايخنا رحمهم الله تعالىٰ وسعوا بهما فی المسجد ايضاً وأظن ان اول وسع بهما فی المسجد هو الطحاوی فمذهب الى جوازهما فی ناحية المسجد بشرط الفصل بينهما وبين المكتوبة حتىٰ لايعد واصلا بينهما وبين المكتوبة وهو مثار النهی عنده، ولعلک علمت أن القيدين الذين كان صاحب المذهب ذكرهما ارتفع أحدهما بتوسيع محمد رحمه الله تعالىٰ والآخر بتوسيع الطحاوی رحمه الله تعالىٰ؛ أما أنا فاعمل بمذهب الامام أبی حنيفة وقد أفتی به الناس غير أنی لا انا ذع من صلاهما فی المسجد. واقول لعله أخذ بقول محمد رحمه الله تعالىٰ والطحاوی رحمه الله تعالىٰ فقد علمته، وتمسكه من حديث الباب فانه يدل على النهی عن الصلاة بعد الاقامة مطلقا سواء كان فی المسجد أو خارجه، فيض البارى، ج: ۲، ص: ۱۹۸، وعمدة القارى، ج: ۴، ص: ۲۵۷.

سنتیں پڑھی جاتی ہیں یہ کسی بھی مذہب میں جائز نہیں ہے۔ راجح تو یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اصل مذہب پر عمل کیا جائے۔ محققین حنفیہ نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول کو ترجیح دی ہے، اگر چہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے ضعفاء کا خیال کرتے ہوئے امام طحاوی رحمہ اللہ کے قول پر فتویٰ دیا ہے، لیکن ہمارے محققین حنفیہ جن میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ بھی داخل ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نہیں مانتا، وہ امام حنیفہ رحمہ اللہ کے اصل مذہب کے قائل ہیں کہ ایک رکعت ملنے کی توقع ہو اور خارج مسجد ہو۔

دوسری بات یہاں یہ بھی سمجھ لیں کہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے جوزاویہ مسجد میں پڑھنے کی اجازت دی ہے وہ اس زمانہ میں دی ہے جب لاؤڈ اسپیکر نہیں ہوتا تھا اور زاویہ میں پڑھنے سے امام کی آواز کے ساتھ تعارض نہیں ہوتا تھا، لیکن اب جبکہ لاؤڈ اسپیکر میں نماز ہورہی ہے ایسی صورت میں مجھے مسجد میں پڑھنے کے جواز میں شک ہے، کیونکہ اس میں آوازوں کا تعارض ہوتا ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ مسجد سے باہر پڑھی جائیں، تو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تو بالکل اس کے جواز کے قائل ہی نہیں وہ کہتے ہیں کہ جب فرض کی تکبیر شروع ہوگئی **"فلا صلوة الا المكتوبة"** اب گھر میں پڑھنا بھی جائز نہیں، ان کے نزدیک یہ ایک آسانی ہے کہ سنتیں طلوع آفتاب سے پہلے پڑھی جاسکتی ہیں، اس لئے وہ کہتے ہیں فرض میں شامل ہوجائے اور سنتیں بعد میں پڑھے۔

حنابلہ کا استدلال ہے **" أقيمت الصلاة فلا صلوٰة الا المكتوبة "** یہ عام ہے کہ جب بھی اقامت ہو اس میں فجر وغیرہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ حنفیہ اور مالکیہ نے بیہقی کی ایک روایت سے استدلال کیا ہے جس میں **" الا الفجر "** کا استثنیٰ آیا ہے لیکن وہ انتہائی ضعیف ہے، قابل استدلال نہیں قرار دی گئی۔

اکثر محدثین نے اس کو ضعیف کہا ہے، اگر چہ علامہ عینی رحمہ اللہ نے اس کو قابل استدلال بنانے کے لئے زور لگایا ہے، لیکن وہ ضعیف ہے۔

حنفیہ اور مالکیہ کا استدلال بہت سے صحابۂ کرام ﷺ کے آثار پر مبنی ہے، نیز ابوداؤد کی ایک حدیث جس میں نبی کریم ﷺ نے فجر کی تاکید فرمائی ہے۔ **"لاتدعوهما ولو طردتكم الخيل "** اور آثار صحابہ ﷺ میں سے حضرت عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس اور عبداللہ عمر ﷺ ان تینوں سے منقول ہے کہ یہ نماز فجر قائم ہونے کے بعد سنت پڑھ لیا کرتے تھے اور اس پر امام طحاوی اور ابن ابی شیبہ رحمہما اللہ نے یہ آثار روایت کئے ہیں کہ:

عن ابن مسعود : انه دخل المسجد و قد أقيمت صلاة الصبح فركع ركعتي الفجر الى اسطوانة بمحضر حذيفة و أبي موسى : قال ابن بطال : و روى مثله عن عمر بن الخطاب و أبي الدرداء و ابن عباس، وعن إبن عمر انه أتى المسجد لصلاة الصبح فوجد الامام يصلي فدخل بيت حفصة فصلى ركعتين ثم دخل في صلوٰة الامام . و عن

ابن أبی شیبة عن ابراهیم کان یقول : ان بقی من صلاتک شئی فأتممه ، وعنه اذا افتتحت الصلاة تطوعا و أقیمت الصلاة فاتم .[۵۸]

مگر اکثر سے یہ منقول ہے کہ یہ خارج مسجد پڑھتے تھے، صرف ایک حضرت مسروق رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ وہ کسی زاویۂ مسجد میں بھی پڑھ لیتے تھے، حضرت سعید ابن عمرؓ سے ابن عمر شیبہ نے نقل کیا کہ وہ مسجد کے دروازے کے آس پاس پڑھ لیتے تھے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ زاویۂ مسجد میں پڑھ لے۔ فرماتے ہیں کہ فقہاء صحابہؓ کا عمل مستقل دلیل ہے اور حدیث کے ایک راوی خود حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں جب وہ خود یہ عمل کررہے ہیں تو معلوم ہوا کہ فجر میں فی الجملہ گنجائش ہے مگر گنجائش اتنی ہی ہے جتنی عرض کی۔

یہاں حدیث نقل کی ہے کہ حضورﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا جو اقامت کے بعد دو رکعتیں پڑھ رہا تھا یہ فجر کا واقعہ ہے۔ آپﷺ نے اس پر نکیر فرمائی۔ مالکیہ اور حنفیہ کہتے ہیں کہ نکیر کی وجہ یہ تھی کہ وہ صف کے بالکل پاس کھڑا تھا، اگر باہر زاویہ میں پڑھتے تو آپﷺ نکیر نہ فرماتے کیونکہ بعد میں دوسرے صحابۂ کرامؓ نے اس پر عمل کیا ہے۔

یہ توجیہ کی گئی ہے اگرچہ حدیث باب میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے لیکن اگر اس توجیہ کو مان لیا جائے تو صف کے قریب کی ممانعت معلوم ہوگئی، لہٰذا اس سے احتراز ضروری ہے۔

(۳۹) باب حد المریض أن یشهد الجماعة

مریض کسی حد تک کی بیماری میں حاضر باجماعت ہو

۶۶۴ــ حدثنا عمر بن حفص قال: حدثني أبي قال: حدثنا الأعمش عن ابراهیم: قال الأسود: کنا عند عائشة رضی الله عنها فذکرنا المواظبة علی الصلاة والتعظیم لها، قالت لما مرض رسول الله ﷺ مرضه الذي مات فیه فحضرت الصلاة فأذن فقال : مروا أبا بکر فلیصل بالناس، فقیل له : أن أبا بکر رجل اسیف اذا قام في مقامک لم یستطع ان یصلي بالناس واعاد فاعادوا له ، فاعاد الثالثة فقال: إنکن صواحب یوسف، مروا أبا بکر فلیصل بالناس فخرج أبو بکر یصلي فوجد النبي ﷺ من نفسه خفة فخرج یهادی بین رجلین کاني أنظر رجلیه یخطان الأرض من الوجع ، فاراد أبو بکر أن یتأخر فاوما إلیه

---

۵۸ عمدة القاری ، ج:۴، ص: ۲۵۸.

النبي ﷺ أن مكانك ثم أتي به حتى جلس إلى جنبه. فقيل للأعمش: وكان النبيﷺ يصلي وأبو بكر يصلي بصلابه والناس يصلون بصلاة أبي بكر، فقال: برأسه: نعم رواه أبو داود عن شعبة عن الأعمش بعضه وزاد أبو معاوية عن الأعمش: جلس عن يسار أبي بكر فكان أبو بكر يصلي قائما [راجع: ۱۹۸]

۶۶۵ــ حدثنا ابراهيم بن موسى قال: أخبرنا هشام بن يوسف، عن معمر، عن الزهري، قال: أخبرني عبيدالله بن عبد الله قال: قالت عائشة: لما ثقل النبي ﷺ واشتد وجعه إستأذن أزواجه أن يمرض في بيتي فأذن له، فخرج بين رجلين تخط رجلاه الأرض. وكان بين العباس ورجل آخر. قال عبيد الله بن عبد الله: فذكرت ذلك لابن عباس ما قالت عائشة. فقال لي: وهل تدري من الرجل الذي لم تسم عائشة؟ قلت: لا قال: هو علي بن أبي طالب [راجع: ۱۹۸]

اس ترجمۃ الباب میں بعض نسخوں میں ''حد'' کا لفظ ہے اور ''حد'' کے معنی ہیں جس میں مریض کے لئے گنجائش ہے کہ وہ جماعت میں نہ آئے۔ بعض لوگوں نے اس حد کی تشریح اس طرح کی ہے کہ مرض کی وہ کونسی حد ہے کہ جس کے بعد ترک جماعت جائز ہوجاتا ہے اور اس میں حضور اکرم ﷺ کی مرض الوفات کا واقعہ نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ دو آدمیوں کے سہارے مسجد میں تشریف لائے۔

بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ یہ ''حد'' نہیں ہے بلکہ ''جد'' ہے **''باب جد المريض ان يشهد الجماعة''** مریض کا کوشش کرنا کہ وہ کسی طرح جا کر جماعت میں شامل ہوجائے، گویا ایسا کرنا مستحب ہے، باعث اجر ہے کہ اگر چہ بیماری کی وجہ سے رخصت تھی لیکن عزیمت پر عمل کرتے ہوئے مسجد میں چلا آتا ہے اور حدیث اس کے بھی مناسب ہے کہ حضور اکرم ﷺ دو آدمیوں کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر تشریف لائے۔

لیکن زیادہ تر نسخوں میں ''حد'' کا لفظ ہے اس لئے ''حد'' کو مدنظر رکھتے ہوئے ترجمۃ الباب کی یہ توجیہ مجھے زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مرض کی وہ کونسی حد ہے کہ اس تک پہنچنے کے باوجود آدمی کے لئے جماعت میں حاضر ہونا افضل اور ترک جماعت جائز ہوجاتا ہے، ہر اس وقت کہ جب آدمی کو شدید مشقت ہو اور مرض کے ازدیاد کا اندیشہ ہو لیکن ایک حد ایسی آتی ہے کہ پھر اس کے لئے مسجد جانا جائز نہیں رہتا۔ اگر مرض اتنا شدید ہوگیا کہ اندیشہ ہے کہ اگر مسجد چل کر جائے گا چاہے دوسرے اٹھا کر لے جائیں تو وہ مرجائے گا تو ایسی حالت میں مسجد جانا جائز نہیں۔

تو کہنا یہ چاہ رہے ہیں کہ وہ حد کہ جس حد تک آدمی مسجد میں جا کر نماز پڑھ سکتا ہے کہ دوسروں کے سہارے چلا جائے اور دوسروں کے سہارے جانے سے اس کے ازدیاد مرض کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔

اگر پہلی توجیہ لیں کہ وہ کون سی حد ہے جس میں ترک جماعت جائز ہوتا ہے اور اس میں یہ حدیث لے کر آئے تو اس کا نتیجہ یہ نکلنا چاہئے کہ جب تک آدمی دو آدمیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر آنے پر قادر ہو، تب بھی آئے اس کے لئے ترک جماعت جائز نہیں، حالانکہ یہ کسی کا مسلک نہیں ہے اس لئے مجھے دوسری توجیہ جو ابھی ذکر کی وہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"**أسیف**" اس کے معنی ہیں رقیق القلب۔

اس بات کو سمجھ لیجئے کہ جب حضور اکرم ﷺ تشریف لائے تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پیچھے ہٹنا چاہا، مقصد یہ تھا کہ اب آپ آکر نماز پڑھائیں تو حضور اکرم ﷺ نے ان کو اشارہ کیا کہ اپنی جگہ پر رہو "**ثم أتی به**" پھر آپ ﷺ کو لایا گیا "**حتی جلس الیٰ جنبه**" یہاں تک کہ آپ ﷺ ان کے برابر میں بیٹھ گئے۔ حضرت اعمش سے ان کے شاگرد نے پوچھا کہ کیا مطلب ہے کہ "**وکان النبی ﷺ یصلی وأبو بکر یصلی بصلوته**" کہ نبی اکرم ﷺ نماز پڑھا رہے تھے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی نماز کی اقتداء کر رہے تھے "**والناس یصلون بصلوات أبی بکر**" اور لوگ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نماز کی اقتدا کر رہے تھے۔ "**فقال براسه. نعم**" تو حضرت اعمش نے اشارہ سے کہا کہ ہاں یہی بات تھی۔

اس میں روایات مختلف ہیں کہ اس موقع پر جب حضور اکرم ﷺ تشریف لائے تو آیا آپ نے نماز پڑھائی یا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھانا جاری رکھا اور آپ ﷺ نے ان کی اقتداء کی۔ زیادہ تر روایتوں میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے نماز پڑھائی، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جہاں سے قرأت چھوڑی تھی اس کے بعد سے حضور ﷺ نے شروع کی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دوسرے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تک تکبیرات کو منتقل کیا، لیکن بعض روایتوں میں یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے منع کر دیا تھا کہ تم اپنی جگہ پر رہو اور خود قریب جا کر بیٹھ گئے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی امامت جاری رکھی۔[۸۹]

بعض حضرات نے ان روایات میں تطبیق کا طریقہ اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ اصل میں یہ دونوں الگ الگ واقعات ہیں:

ایک واقعہ میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بجائے حضور اکرم ﷺ امام بن گئے تھے۔

دوسرے واقعہ میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے نماز جاری رکھی تھی۔

تو دونوں الگ الگ واقعات ہیں اور الگ الگ نمازوں کے ہیں، لہٰذا کوئی تعارض نہیں علامہ عینی رحمہ اللہ کا رجحان اسی طرف ہے، کیونکہ جن روایات میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی امامت کا ذکر ہے سنداً قوی ہیں، مثلاً ترمذی کی روایت "**صلی خلف ابی بکر فی مرضه الذی مات فیه قاعدا**" نیز وہ فرماتے ہیں کہ

---

۸۹ عمدة القاری، ج:۴، ص:۲۶۲۔

ایک واقعے میں آپ ﷺ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سہارے سے آئے تھے اور دوسرے واقعے میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور نوبہ رضی اللہ عنہ کے سہارے سے، جیسا کہ ابوحاتم نے روایت کیا ہے۔[۹۰]

اور بعض حضرات نے اس کو ترجیح دی ہے کہ جس روایت میں آیا ہے کہ اس کے بعد حضور اقدس ﷺ نے نماز شروع کردی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بطور مقتدی کھڑے رہے، اس کو دو وجوہ سے ترجیح دی۔

ایک تو یہ کہ ایسی روایات کی کثرت ہے، دوسری یہ ہے کہ ایسی روایات کرنے والے زیادہ ثقہ ہیں اور تیسرے یہ کہ آپ آگے دیکھیں گے **"باب ھل یأخذ الامام الشک"** اور **"فجاء النبی ﷺ جلس عن یسار أبی بکر"** جب آپ ﷺ تشریف لائے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بائیں جانب بیٹھے، تو اگر مقتدی ہوتے تو دائیں جانب بیٹھتے تو اس کی وجہ سے بھی اس کو ترجیح دی ہے کہ آپ ﷺ امام بن گئے تھے، اس کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اقتدا کی۔

جب یہ بات طے ہوگئی کہ حضور اقدس ﷺ نے امامت شروع کردی تھی تو یہاں یہ سوال پیدا ہوا کہ امام جب نماز پڑھا رہا ہو اور اس کو کوئی حدث وغیرہ لاحق ہو جائے تب تو بالاجماع جائز ہے کہ وہ استخلاف کرے یعنی اپنے میں سے کسی شخص کو آگے کھڑا کردے کہ تم میری جگہ امامت کرو، لیکن اگر امام کو کوئی عذر نہ ہو، نہ حدث لاحق ہو، نہ کوئی اور عذر لاحق ہوا، تو اس صورت میں بلاوجہ استخلاف جائز نہیں۔

حنفیہ کے نزدیک جب بلاوجہ کسی کو کہا جائے کہ تم نماز پڑھاؤ، تو اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ اگرچہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک نماز فاسد نہیں ہوتی۔

امام شافعی رحمہ اللہ اسی واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ اس صورت میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کوئی عذر نہیں تھا لیکن انہوں نے حضور ﷺ کو استخلاف کیا۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں نماز ہی نہیں ہوگی اور وہ اس واقعہ کو نبی ﷺ کی خصوصیت پر محمول کرتے ہیں اور خصوصیت یہ ہے کہ جب سرکار دو عالم ﷺ تشریف فرما ہوں تو اس وقت میں آپ ﷺ کا نماز پڑھانا ہی افضل ہے اور امت کے لوگوں کو چاہئے کہ حتی الامکان آپ ﷺ کی اقتدا کریں۔ اس وجہ سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹے اور حضور ﷺ نے آگے بڑھ کر نماز پڑھائی۔ تو یہ آپ ﷺ کی خصوصیت تھی، آپ ﷺ کے لئے درست تھا، دوسروں کے لئے جائز نہیں۔

(۴۰) باب الرخصة في المطر والعلة أن يصلي في رحله

بارش اور عذر کی بناء پر گھر میں نماز پڑھ لینے کی اجازت کا بیان

۶۶۶ ۔ حدثنا عبد الله بن يوسف قال : أخبرنا مالک ، عن نافع : أن ابن

[۹۰] عمدة القاری، ج:۵، ص:۱۸۷، ۱۸۸۔

عمر اذن بالصلاة في ليلة ذات برد و ريح ، ثم قال : الا صلوا في الرحال . قال : أن رسول الله ﷺ كان يامر المؤذن إذا كانت ليلة ذات برد و مطر يقول : الا صلوا في الرحال . [راجع : ٦٣٢]

حضرت عبداللہ بن عمر ؓ نے رات کے وقت میں اذان دی، سردی تھی اور ہوا تیز چل رہی تھی اذان پوری دینے کے بعد اعلان کرایا "**الاصلوا فی الرّحال**" اور ساتھ کہا حضور ﷺ ایسا ہی کرتے تھے۔ عبداللہ بن عباس ؓ کی روایت پیچھے گزری ہے اور آگے بھی آرہی ہے کہ مؤذن ابھی "**حي على الصلاة**" تک ہی پہنچا تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بس ابھی اعلان کردو۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اذان پوری نہیں ہوئی تھی کہ اس سے پہلے ہی "**صلوّا فی الرحال**" کا اعلان کردیا۔ یہ عبداللہ بن عباس ؓ کا عمل ہے۔

دونوں میں بظاہر راجح عبداللہ بن عمر ؓ کا عمل ہے جس کا قرینہ یہ ہے کہ عبداللہ بن عمر ؓ انتہائی شدید التمسک مشہور ہیں۔ جو بات انہوں نے نبی کریم ﷺ سے سن لی یا دیکھ لی تو اس کو مضبوطی سے پکڑ لیتے، اجتہاد اور قیاس زیادہ نہیں کرتے تھے اور عبداللہ بن عباس ؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اصحاب اجتہاد ورائے میں سے تھے یعنی ان کے اپنے استنباطات اور قیاسات بھی بہت ہیں، اسی لئے عبداللہ بن عمر ؓ کے عزائم مشہور ہیں اور عبداللہ بن عباس ؓ کے رُخص مشہور ہیں۔

عبداللہ بن عمر ؓ صاحب العزائم ہیں اور حضرت عبداللہ بن عباس ؓ صاحب الرّخص ہیں۔ تو جب دونوں میں تعارض ہوجاتا ہے تو حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کی بات روایۃً زیادہ صحیح سمجھی جاتی ہے کیونکہ وہ اپنے قیاس سے کچھ نہیں کرتے تھے، لہٰذا جب انہوں نے پوری اذان دینے کے بعد "**الا صلوّ افی الرحال**" کا اعلان فرمایا، تو معلوم ہوا کہ یہ حدیث کے زیادہ مطابق ہے۔

بخلاف حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کے کہ ہوسکتا ہے انہوں نے اپنی رائے سے یہ زیادہ کردیا کہ "**حي على الصلوٰة**" پر پہنچے تو کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ اب آنا واجب ہوگیا، لہٰذا ابھی فوراً اعلان کرو "**الا صلوافی الرحال**".

٦٦٧ ـ حدثنا اسماعيل قال: حدثني مالك ، عن ابن شهاب عن محمود بن الربيع الأنصاري: أن عتبان بن مالك كان يؤم قومه وهو أعمى ، وأنه قال لرسول ﷺ يارسول الله إنها تكون الظلمة والسيل وأنا رجل ضرير البصر، فصل يا رسول الله في بيتي مكانا اتخذه مصلى ، فجاءه رسول الله ﷺ فقال: أين تحب أن أصلي فأشار إلى مكان من البيت فصلى فيه رسول الله ﷺ [راجع: ٤٢٤]

(۴۱) باب هل يصلي الإمام بمن حضر وهل يخطب يوم الجمعة في المطر؟

کیا امام جس قدر لوگ موجود ہیں ان ہی کے ساتھ نماز پڑھ لے اور کیا جمعہ کے دن بارش میں بھی خطبہ پڑھے یا نہیں؟

۶۶۸ ۔ حدثنا عبداللّٰه بن عبدالوهاب قال: حدثنا حماد بن زيد قال: حدثنا عبدالحميد صاحب الزيادي قال: سمعت عبدالله بن الحارث قال: خطبنا ابن عباس في يوم ذي ردغ فأمر المؤذن لما بلغ حي على الصلاة قال: قل: الصلاة في الرحال فنظر بعضهم الى بعض كأنهم انكروا فقال: كأنكم أنكرتم هذا أن هذا فعله من هو خير مني. يعني النبي ﷺ إنها عزمة وإني كرهت أن أخرجكم. وعن حماد، عن عاصم، عن عبدالله بن الحارث، عن عباس نحوه غير أنه قال: كرهت أن أؤثمكم فتجيئون تدوسون الطين الى ركبكم. [راجع : ۶۱۶]

"**كرهت أن أؤثمكم**" میں نے اس بات کو ناپسند کیا کہ میں تمہیں گنہگار کروں، اس طرح کہ تم اس حالت میں آؤ کہ کیچڑ کو اپنے گھٹنوں تک روندر ہے ہو۔

اس میں گنہگار ہونے کی کیا بات ہے "**كرهت أن أؤثمكم؟**" جواب یہ ہے اس طرح کہ جب مشقت اٹھا کر آؤ گے کہ گھٹنے تک کیچڑ میں لت پت ہوں گے، تو دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ ہم اگر نماز کو نہ آتے تو اس میں نہ مبتلا ہوتے، یہ بات باعث اثم ہو جائے گی۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس پر ترجمۃ الباب قائم کیا ہے کہ "**هل يصلى الإمام بمن حضر؟ وهل يخطب يوم الجمعة فى المطر؟**"

دوسری روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ واقعہ یوم الجمعہ کا تھا۔ پہلے معلوم ہوا کہ جہاں مطر کی حالت میں پنج وقتہ نماز میں جائز ہے کہ آدمی گھر میں پڑھ لے تو جمعہ کے اندر بھی اگر شدید بارش ہو رہی ہو تو ترک جمعہ کا عذر ہے یعنی گھر میں ظہر پڑھ لے۔

دوسرا یہ کہ اگر جمعہ ہے اور اعلان کر دیا "**ألا صلوا فى الرحال**" کہ گھر میں رہو لیکن کچھ لوگ اگر مسجد

میں آ گئے تو جو لوگ مسجد میں موجود ہیں ان کے ساتھ نماز پڑھنا جائز ہے اور جب جمعہ ہے تو خطبہ دینا بھی جائز ہے، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا کہ اوروں کو تو منع کر دیا لیکن جو لوگ موجود تھے، ان کے ساتھ نماز بھی پڑھی اور خطبہ بھی دیا۔

۶۶۹ ـ حدثنا مسلم قال: حدثنا هشام ، عن يحيى ، عن أبي سلمة ، قال: سالت أبا سعيد الخدري فقال: جاء ت سحابة فمطرت حتى سأل السقف وكان من جريد النخل فأقيمت الصلاة فرأيت رسول الله ﷺ يسجد في الماء والطين حتى رأيت أثر الطين في جبهته. [أنظر: ۸۱۳، ۸۳۶، ۲۰۱۶، ۲۰۱۸، ۲۰۲۷، ۲۰۳۶، ۲۰۴۰] [۹۱]

یہ رمضان کی اکیسویں شب تھی، جس میں یہ واقعہ پیش آیا اور وہاں لیلۃ القدر میں بھی آئے گی۔

سوال: اس روایت میں حضور ﷺ کی امامت کا ذکر ہے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کو پیچھے کیا، جبکہ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے امامت کی۔

جواب: حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی امامت کا واقعہ الگ ہے، اس کا اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔

۶۷۰ ـ حدثنا آدم قال: حدثنا شعبة قال: حدثنا أنس بن سيرين قال: سمعت أنسا يقول: قال رجل من الأنصار: إني لا أستطيع الصلاة معك، وكان رجلا ضخما، فصنع للنبي ﷺ طعاما فدعاه الى منزله فبسط له حصيرا، ونضح طرف الحصير فصلى عليه ركعتين فقال: رجل من آل الجارود لأنس أكان النبي ﷺ يصلي الضحي؟ قال: ما رأيته صلاها إلا يومئذ. [أنظر: ۱۱۷۹، ۶۰۸۰] [۹۲]

یہ بھی وہی عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے کہا کہ وہ ذرا موٹے آدمی ہیں، دور سے آنا مشکل ہوتا ہے تو آپ ﷺ نے ان کو اجازت دے دی، البتہ ابن ماجہ کی روایت میں یہاں "**بعض عمومة أنس**" وارد ہے اور حضرت عتبان رضی اللہ عنہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے چچا نہیں تھے، البتہ چونکہ دونوں کا تعلق قبیلۂ خزرج سے ہے، اس لئے مجازاً اس کو چچا کہنے کا احتمال ہے۔ [۹۳]

---

۹۱ وفي صحيح مسلم ، كتاب الصيام ، باب فضل ليلة القدر والحث على طلبها وبيان محلها وأرجى ، رقم : ۱۹۹۳ ، وسنن أبي داؤد ، كتاب الصلاة ، باب السجود على الأنف ، رقم: ۷۷۷ ، ومسند احمد ، باقي مسند المكثرين ، باب مسند أبي سعيد الخدري ، رقم : ۱۰۶۱۰ ، ۱۰۷۵۷ ، ۱۱۱۵۱ ، ۱۱۲۷۹ .

۹۲ وفي سنن أبي داؤد ، كتاب الصلاة ، باب الصلاة الحصير ، رقم : ۵۶۱ ، ومسند أحمد ، باقي مسند المكثرين، باب مسند انس بن مالك ، رقم : ۱۱۸۸۰ ، ۱۳۵۸۷ .

۹۳ فتح الباري ، ج: ۲، ص: ۱۵۸ .

بہر کیف آپ ﷺ نے حضرت عتبان ؓ کو اجازت دی مگر عبداللہ بن ام مکتوم ؓ کو اجازت نہیں دی، انہوں نے کہا کہ میں دور رہتا ہوں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اذان کی آواز سنتے ہو، انہوں نے کہا جی ہاں، تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں پھر آؤ، حالانکہ وہ بھی اعمٰی تھے۔ تو وجہ یہ ہے کہ عبداللہ بن ام مکتوم ؓ اذان کی آواز سنتے تھے وہ اور بھی دور ہوں گے، جہاں آواز نہیں سنتے ہوں گے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں کہا "**رجلا ضخما**" ان کا بدن بھاری تھا، تو ایک تو نابینا تھے، دوسرا ان کا بدن بھاری تھا، تو آنے میں دشواری تھی، تیسرے دور بھی زیادہ، جبکہ عبداللہ بن ام مکتوم ؓ اعمٰی تو ضرور تھے لیکن ان کے بارے میں روایات میں یہ نہیں ہے کہ ان کا بدن بھاری تھا یا ان کا فاصلہ ان سے زیادہ تھا۔[94]

(۴۲) باب اذا حضر الطعام و أقيمت الصلاة،

اگر کھانا آجائے اور نماز کی اقامت ہو جائے

"وكان ابن عمر يبدأ بالعشاء وقال: ابو الدرداء من فقه المرء اقباله على حاجته حتى يقبل على صلاته وقلبه فارغ".

۶۷۱ ـ حدثنا مسدد قال: حدثنا يحيىٰ، عن هشام، قال: حدثني أبي قال: سمعتُ عائشة عن النبى ﷺ أنه قال: "اذا وضع العشاء و أقيمت الصلاةُ فأبدؤا بالعَشاء". [انظر: ۵۴۶۵][95]

۶۷۲ ـ حدثنا يحيىٰ بن بكير قال: حدثنا الليث عن عقيل عن ابن شهاب، عن أنس بن مالك أن رسول الله ﷺ قال: "اذا قدم العشاء فأبدؤا به قبل أن تصلوا صلاة المغرب ولا تعجلوا عن عشائكم". [أنظر: ۵۴۶۳]

۶۷۳ ـ حدثنا عبيد بن اسماعيل، عن أبي أسامة، عن عبيد الله، عن نافع، عن ابن عمر قال: قال رسول الله ﷺ: "اذا وضع عَشاء أحدكم وأقيمت الصلاةُ فأبدؤا بالعَشاء ولا يعجل حتى يفرغ منه". وكان ابن عمر يوضع له الطعامُ وتقام الصلاة

---

94 وراجع فيض البارى، ج:۲، ص:۲۶۔

95 وفى صحيح مسلم، كتاب المساجد و مواضع الصلاة، باب كراهة الصلاة بحضرة الطعام الذى يريد أكله فى الحال، رقم: ۸۶۷، وسنن ابن ماجة، كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها، باب إذا حضرت الصلاة ووضع العشاء، رقم: ۹۲۵، ومسند احمد، باقى مسند الأنصار، باب حديث السيدة عائشة، رقم: ۲۲۹۹۰، ۲۳۱۱۲، ۲۴۴۴۲، وسنن الدارمى، كتاب الصلاة، باب إذا حضر العشاء وأقيمت الصلاة، رقم: ۱۲۴۹۔

فلا یأتیها حتی یفرغ وإنه یسمع قراء ة الإمام . [أنظر : ۶۷۴ ، ۵۴۶۴]

۶۷۴ ــ وقال زهیر و وهب بن عثمان عن موسیٰ بن عقبة ، عن نافع ، عن ابن عمر قال : قال النبی ﷺ : " اذا کان أحدکم علی الطعام فلا یعجل حتی یقضی حاجته منه و ان أقیمت الصلاۃُ " . رواه ابراهیم بن المنذر عن وهب بن عثمان ، ووهبٌ مدنی .

یہ حدیث ہے جس میں آیا ہے کہ جب عِشاء اور عَشاء دونوں ایک ساتھ آجائیں تو عَشاء کو مقدم کرو۔ اس کی وجہ بعض نے یہ بیان کی ہے کہ یہ اس صورت میں ہے کہ جب کھانے کے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ جب بھوک زیادہ لگ رہی ہو۔ تو تمام اقوال میں قولِ فیصل یہ ہے کہ اصل مدار اس پر ہے کہ آیا نماز میں مشغول ہونے سے ذہن کھانے کی طرف لگا رہے گا یا نہیں، اگر کھانے کی طرف ذہن لگا رہے گا تو پہلے کھانا کھالے اور ایسی صورت میں یہ ترک جماعت کا بھی عذر ہے، لیکن اگر خیال یہ ہے کہ نہیں، تو پھر اس صورت میں نماز کو مقدم کرنا جائز ہے۔

بعض اہل ظاہر یہ کہتے ہیں کہ اگر کھانا آجانے کی صورت میں کوئی نماز پڑھے گا تو نماز ہی نہیں ہوگی۔ یہ ابن حزم کا قول ہے، اوروں میں سے کسی نے یہ قول نہیں کیا۔

اصل بات وہی ہے جو میں نے عرض کی کہ بنیاد اشتغالِ ذہن ہے، یا یہ کہ مہمان ہے اس کے لئے کھانے کا انتظام کیا اور وہ ایک دم اس کو چھوڑ کر جماعت کے لئے چلا گیا، اب اس بیچارے کے لئے زبردست زحمت ہے، کھانا ٹھنڈا ہوگیا، اب آگ جلائے، دوبارہ گرم کرے تو ایسی صورت میں یہ جائز ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی مدنظر رکھنی چاہئے کہ صحابہ کرام ؓ کے عہد مبارک میں اور ہمارے زمانے میں فرق ہے۔ صحابۂ کرام ؓ کے زمانے میں کھانا کوئی ایسا لمبا چوڑا کام نہ تھا کہ گھنٹے لگ رہے ہوتے، انواع واقسام کی چیزیں ہیں، دسترخوان چنا جارہا ہے، یہ پلیٹ آرہی ہے اور ڈشیں اٹھائی جارہی ہے، یہ دھندا نہیں تھا۔ مختصر سا کام تھا، تھوڑا سا کھانا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں تو ایک طومار ہے، لہٰذا اس میں اتنی دیر لگتی ہے کہ جماعت کے فوت ہونے کا احتمال ہوتا ہے تو اس صورت میں اور اس صورت میں فرق ہے۔ بس جلدی جلدی کھا کر نماز میں شریک ہو جاؤ، لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ اگر ذہن بہت زیادہ مشغول ہونے کا اندیشہ نہیں ہے تو پہلے نماز پڑھ لو۔ اصل وجہ وہی ہے جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمائی ہے کہ میں کھانے کو نماز بنالوں یہ اس سے بہتر ہے کہ نماز کو کھانا بنالوں۔ [۹۶]

تو یہ اصل بات ہے، جہاں اس کا اندیشہ ہو وہاں پر یہ حکم ہے۔

---

۹۶ وما أظرف ما روی عن إمامنا رحمه الله تعالیٰ لأن یکون أکلی کله صلاة أحب إلی من أن تکون صلاتی کلها أکلا ، فیض الباری ، ج:۲، ص:۲۰۷.

(۴۳) باب اذا دعی الإمام إلی الصلاۃ وبیدہ ما یأکل.

جب نماز کے لئے امام بلایا جائے اور اس کے ہاتھ میں وہ چیز ہو وکھا رہا ہو

۶۷۵ ـ حدثنا عبد العزیز بن عبد اللہ قال : حدثنا ابراھیم ، عن صالح ، عن ابن شھاب قال : أخبرني جعفر بن عمرو بن أمیۃ أن أباہ قال : رأیت رسول اللہ ﷺ یأکل ذراعاً یحتز منھا فدعی إلی الصلاۃ فقام فطرح السکین فصلی ولم یتوضأ . [راجع : ۲۰۸]

اب یہاں آپ ذراع تناول فرمارہے تھے لیکن نماز کے لئے بلایا گیا تو آپ ﷺ چھوڑ کر چلے گئے، تو پتہ چلا کہ کھانا چھوڑ کر جانا بھی جائز ہے۔ اب یہ بھی ممکن ہے کہ بیان جواز مقصود ہو کہ یہ جو میں نے کہا تھا کہ پہلے کھانا کھایا کرو، یہ کوئی ابدی بات نہیں ہے بلکہ ایسا کرنا بھی جائز ہے اور اس سے اس کی بھی تائید ہوتی ہے جو عرض کیا گیا کہ کھانے کا حکم اس وقت ہے جب کھانے کی طرف ذہن مشغول ہو، جب نہ ہو تو جائز ہے۔

(۴۴) باب من کان فی حاجۃ أھلہ فأقیمت الصلاۃُ فخرج

جو شخص گھر کے کام کاج میں ہو اور نماز کی تکبیر کہی جائے تو نماز کے ئے کھڑا ہو جائے

۶۷۶ ـ حدثنا آدم قال : حدثنا شعبۃ قال : حدثنا الحکم ، عن ابراھیم ، عن الأسود قال : سألت عائشۃ رضی اللہ عنھا : ما کان النبی ﷺ یصنع فی بیتہ ؟ قالت : کان یکون فی مھنۃ أھلہ . تعنی : فی خدمۃ أھلہ . فإذا حضرت الصلاۃُ خرج إلی الصلاۃ . [أنظر : ۵۳۶۳، ۶۰۳۹]

(۴۵) باب من صلی بالناس وھو لایرید إلا أن یعلمھم صلاۃ النبی ﷺ وسنتہ

اس شخص کا بیان جو لوگوں کو صرف اس لئے نماز پڑھائے کہ انہیں رسول اللہ کی نماز اور ان کی سنت سکھائے

۶۷۷ ـ حدثنا موسیٰ بن اسماعیل قال : حدثنا وھیب قال : حدثنا أیوب عن أبی

قلابة قال : جاء نا مالک بن الحويرث في مسجدنا هذا فقال : إني لأصلي بكم وما أريد الصلاة ، أصلي كيف رأيت النبي ﷺ يصلي ، فقلتُ لأبي قلابة : كيف كان يصلي ؟ قال : مثل شيخنا هذا . قال : وكان شيخنا يجلس اذا رفع رأسه من السجود قبل أن ينهض في الركعة الأولى . [أنظر : ۸۰۲ ، ۸۱۸ ، ۸۲۴] [۹۷]

کہتے ہیں کہ مالک بن حویرث ﷺ ہماری اس مسجد میں آئے اور کہا کہ آؤ میں تمہیں نماز پڑھاتا ہوں اور کہتے ہیں" **وما أريد الصلاة** " کہ میرا مقصد صرف نماز پڑھنا نہیں ہے بلکہ "**أصلي كيف رأيت النبي ﷺ يصلي**" میں آپ کو سکھانا چاہتا ہوں اور سکھانے کے لئے اس طرح نماز پڑھتا ہوں جس طرح حضور ﷺ نے نماز پڑھی تھی۔

اس پر امام بخاری رحمہ اللہ نے باب باندھا کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھائے اور مقصود دوسرے کو تعلیم دینا ہو تو بعض لوگوں کو شبہ ہوسکتا تھا کہ یہ نماز تو نہ ہوئی ، اس لئے کہ نماز تو وہ ہے جو اللہ ﷻ کے لئے پڑھی جائے اور جب مقصود تعلیم ہو تو یہ اللہ ﷻ کے لئے نہ ہوئی یعنی نیت صحیح نہ ہوئی ، جب نیت صحیح نہ ہوئی تو نماز صحیح نہیں ہونی چاہئے۔

لیکن امام بخاری رحمہ اللہ اس واقعے سے استدلال کر رہے ہیں کہ ایسا کرنا جائز ہے اور جائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم دین کا ایک شعبہ ہے اور وہ ارضاءِ الٰہی کی نیت ہوئی ، لہٰذا وہ نیت صلوٰۃ کے منافی نہیں ہے ، اس لئے نماز صحیح ہو جائے گی۔

آگے کہتے ہیں کہ "**فقلت لابي قلابة** " ایوب سختیانی کہتے ہیں کہ میں نے ابوقلابہ سے پوچھا "**كيف كان يصلي** " مالک بن حویرث کیسے نماز پڑھا کرتے تھے "**قال : مثل شيخنا هذا** " ایک بزرگ عمرو بن سلمہ بیٹھے تھے ، ان کی طرف اشارہ کر کے کہا ، جس طرح یہ شیخ نماز پڑھتے ہیں ، مالک بن حویرث نے اس طرح نماز پڑھائی۔ "**كماسيأتي في باب اللبث بين السجدتين**"۔

" **وكان شيخنا يجلس اذا رفع رأسه من السجود قبل أن ينهض في الركعة الأولى**".

---

[۹۷] وفي صحيح مسلم ، كتاب المساجد و مواضع الصلاة ، باب من أحق بالإمامة ، رقم: ۱۰۸۰ ، وسنن الترمذي ، كتاب الصلاة ، باب ماجاء كيف النهوض من السجود ، رقم : ۲۶۴ ، وسنن النسائي ، كتاب الأذان ، باب اجتزاء المرء بأذان غيره في الحضر ، رقم : ۶۳۱ ، و كتاب التطبيق ، باب الإستواء للجلوس عند الرفع من السجدتين ، رقم : ۱۱۳۹ ، وسنن أبي داؤد ، كتاب الصلاة ، باب النهوض في الفرد ، رقم : ۷۱۶ ، ومسند احمد ، أول مسند البصريين ، باب بقية حديث مالک بن الحويرث ، رقم : ۱۹۶۲۴ ، وسنن الدارمي ، كتاب الصلاة ، باب من أحق بالإمامة ، رقم : ۱۲۲۵ .

اور شیخ جب نماز پڑھتے تھے تو پہلی رکعت میں جب سجدے سے اٹھتے تو تھوڑی دیر بیٹھا کرتے تھے یعنی جلسۂ استراحت کرتے تھے۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے اس سے جلسۂ استراحت کی مسنونیت پر استدلال کیا۔

جمہور کے نزدیک یہ مسنون نہیں ہے اور مالک بن حویرث کی روایت میں جو حضور ﷺ سے منقول ہے اس کو حالت تبدن پر محمول کیا ہے کہ آپ ﷺ کا بدن مبارک جب آخر عمر میں بھاری ہوگیا تھا تو اس وقت ایسا کرلیا کرتے تھے۔

لیکن حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ میں اس تأویل کو قبول نہیں کرتا، میرے خیال میں یہ بیان جواز پر محمول ہے کہ کبھی کبھی آپ ﷺ نے بیان جواز کے لئے ایسا کیا ہے، لیکن عام معمول ایسا نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آگے یہ حدیث اس موضوع پر مستقلاً آجائے گی۔ وہاں یہ ہے کہ سائل نے سوال کیا کہ مالک بن حویرث نے کیا لیکن میں نے کسی اور صحابی ﷺ کو کرتے نہیں دیکھا تو معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام ﷺ کا عام معمول ایسا نہیں تھا۔

(۴۶) باب : أهل العلم و الفضل أحق بالإمامة

علم وفضل والا امامت کا زیادہ مستحق ہے

۶۷۸ ـ حدثنا اسحق بن نصر قال : حدثنا حسين ، عن زائدة، عن عبد الملك بن عمير ، قال : حدثني أبوبردة ،عن أبي موسىٰ قال : مرض النبي ﷺ فاشتد مرضه فقال : " مروا أبا بكر فليصل بالناس " . قالت عائشة : إنه رجل رقيق ، إذا قام مقامك لم يستطع أن يصلي بالناس . قال : "مروا أبا بكر فليصل بالناس " فعادت . فقال : مري أبا بكر فليصل بالناس فانكن صواحب يوسف " فأتاه الرسول فصلى بالناس في حياة النبي ﷺ . [أنظر : ۳۳۸۵][۹۸]

۶۷۹ ـ حدثنا عبد الله بن يوسف قال : أخبرنا مالك ، عن هشام بن عروة ، عن أبيه ، عن عائشة أم المؤمنين أنها قالت : إن رسول الله ﷺ قال في مرضه : " مروا أبا بكر يصلي بالناس " قالت عائشة : قلتُ : إن أبا بكر اذا قام في مقامك لم يسمع الناس من

[۹۸] وفي صحيح مسلم ، كتاب الصلاة ، باب استخلاف الإمام إذا عرض له عذر من مرض وسفر ، رقم : ۶۳۸، ومسند أحمد أوّل مسند الكوفيين ، باب حديث أبي موسى الأشعري ، رقم : ۱۸۸۶۹ .

البكاء ، فمر عمر فليصل بالناس . فقالت عائشة : فقلت لحفصة : قولي له : إن أبا بكر اذا قام في مقامك لم يسمع الناس من البكاء فمر عمر فليصل بالناس . ففعلت حفصة ، فقال رسول الله ﷺ : "مه إنكن لأنتن صواحب يوسف ، مروا أبا بكر فليصل بالناس " . فقالت حفصة لعائشة : ما كنتُ لأصيب منك خيراً . [راجع : ١٩٨]

٦٨٠ ـ حدثنا أبو اليمان قال: أخبرنا شعيب عن الزهري قال: أخبرني انس بن مالك الأنصاري وكان تبع النبي ﷺ وخدمه وصحبه : أن أبا بكر كان يصلي بهم في وجع النبي ﷺ الذي توفي فيه حتى اذا كان يوم الاثنين وهم صفوف في الصلاة فكشف النبي ﷺ ستر الحجرة ينظر إلينا وهو قائم كأن وجهه ورقة مصحف، ثم تبسم يضحك فهممنا أن نفتتن من الفرح برؤية النبي ﷺ فنكص ابو بكر ﷺ على عقبيه ليصل الصف ، وظن أن النبي ﷺ خارج الى الصلاة، فأشار إلينا النبي ﷺ أن أتموا صلاتكم وأرخى الستر، فتوفي من يومه. [أنظر: ٦٨١، ٧٥٤، ١٢٠٥، ٤٤٤٨]

٦٨١ ـ حدثنا أبو معمر قال : حدثنا عبد الوارث قال : حدثنا عبد العزيز عن أنس قال : لم يخرج النبي ﷺ ثلاثا ، فأقيمت الصلاة فذهب أبو بكر يتقدم فقال نبي الله ﷺ بالحجاب ، فرفعه، فلما وضح وجه النبي ﷺ مارأينا منظرا كان أعجب إلينا من وجه النبي ﷺ حين وضح لنا، فاومأ النبي ﷺ بيده إلى أبي بكر أن يتقدم ، وأرخى النبي ﷺ الحجاب فلم يقدر عليه حتى مات. [راجع. ٦٨٠]

"فلم يقدر عليه" یعنی اس کے بعد کسی کو آپ کی زیارت کی قدرت نہیں ہوئی۔

٦٨٢ ـ حدثنا يحيى بن سلمان قال: حدثنا ابن وهب قال: حدثني يونس ، عن ابن شهاب عن حمزة بن عبدالله أنه أخبره عن أبيه قال: لما اشتد برسول الله ﷺ وجعه ، قيل له في الصلاة فقال: مروا با بكر فليصل بالناس. قالت عائشة إن أبابكر رجل رقيق اذا قرأ غلبه البكاء قال: مروه فليصل. فعاودته قال: مروه فليصل ، إنكن صواحب يوسف. تابعه الزبيدي ، وابن أخي الزهري ، واسحاق بن يحي الكلبي عن الزهري . وقال عقيل ومعمر عن الزهري، عن حمزة عن النبي ﷺ .

اہل علم اور اہل فضل امامت کے زیادہ اُحق ہیں، حنفیہ کا یہی مسلک ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "أقرأ أحق بالإمامة" ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ ترمذی کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں یہ آیا ہے کہ " **أحق الناس بالإمامة أقرئهم فاذا كانوا فی القرأة سواء فاعلمهم بالسنة**" تو حنفیہ کے نزدیک "**أعلم**" افضل ہے اور شافعیہ کے نزدیک "**أقرأ**" افضل ہے۔

عام طور سے جن روایتوں میں "**أقرأ**" کی افضلیت کا ذکر آیا ہے تو صاحب ہدایہ اور دوسرے علماء نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اس زمانے میں جو "**أقرأ**" ہوتا تھا وہی "**أعلم**" بھی ہوتا تھا، لہٰذا جب "**أقرأ**" کہا تو اس سے مراد "**أعلم**" ہی ہے، لیکن یہ جواب اس لئے درست نہیں معلوم ہوتا کہ ترمذی کی روایت میں صراحت ہے کہ "**فان كانوا فی القرأة سواء فاعلمهم بالسنة**"۔

لہٰذا صحیح توجیہ یہ ہے کہ شروع میں قرأۃ قرآن کی فضیلت بیان کرنے کے لئے "**أقرأ**" کی امامت کو افضل قرار دیا گیا تھا، لیکن آپ ﷺ کا آخری عمل جس کا ذکر یہاں آرہا ہے کہ آپ ﷺ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو امام بنایا، حالانکہ "**أقرأ**" ابی بن کعب رضی اللہ عنہ تھے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب اسی مقصد کے لئے قائم کیا ہے، گویا ان کا مذہب حنفیہ کے مذہب کے مطابق ہے کہ اہل علم افضل ہے اور اس میں مرض وفات کا واقعہ دوبارہ نقل کیا ہے کہ اس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امام بنایا گیا۔

"**فقالت حفصة لعائشة : ما كنتُ لأصيب منک خيراً**"۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ مجھے تم سے کبھی کوئی بھلائی نہیں پہنچی۔ جیسے بے تکلفی کے عالم میں کہتے ہیں، کیونکہ حضرت عائشہؓ نے حضرت حفصہؓ سے کہا تھا کہ آپ تجویز پیش کیجئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو امام بنائیں۔ حضور ﷺ نے اس پر تھوڑا سا ناگواری کا اظہار فرمایا، تو اس ناگواری کا سبب حضرت عائشہؓ بنی، تو اس لئے انہوں نے کہا کہ مجھے تم سے کبھی کوئی خیر نہیں پہنچی۔ وہ جو مغافیر والا قصہ تھا اس میں بھی حضرت حفصہؓ کو حضرت عائشہؓ کی وجہ سے پریشانی لاحق ہوئی تھی۔

(۴۷) باب من قام إلى جنب الإمام لعلة

کسی عذر کی بنا پر مقتدی کا امام کے پہلو میں کھڑے ہونے کا بیان

۶۸۳ ــ حدثنا زكريا بن يحيى قال : حدثنا ابن نمير قال : أخبرنا هشام بن عروة عن أبيه عن عائشة رضى الله عنها قالت : أمر رسول الله ﷺ أبا بكر أن يصلى بالناس فى مرضه فكان يصلى بهم ، قال عروة : فوجد رسول الله ﷺ فى نفسه خفة فخرج ، فإذا أبو

بكر يؤم الناس ، فلما رآه أبو بكر استأخر فأشار إليه أن كما أنت ، فجلس رسول الله ﷺ حذاء أبي بكر إلى جنبه ، فكان أبو بكر يصلي بصلاة رسول الله ﷺ والناس يصلون بصلاة أبي بكر . [راجع :۱۹۸] [۹۹]

(۴۸) باب من دخل ليؤمّ الناس فجاء الإمام الأول فتأخر الأول أولم يتأخر جازت صلاته:

اگر کوئی آدمی لوگوں کی امامت کے لئے جائے پھر امام اول آجائے تو پہلا شخص پیچھے ہٹے یا نہ ہٹے اس کی نماز ہو جائے گی

۶۸۴ ـ حدثنا عبدالله بن يوسف قال: أخبرنا مالك ، عن أبي حازم بن دينار ، عن سهل بن سعد الساعدي : أن رسول الله ﷺ ذهب إلى بني عمرو بن عوف ليصلح بينهم ، فحانت الصلاة فجاء المؤذن إلى أبي بكر فقال : أتصلي للناس فأقيم ؟ قال : نعم ، فصلى أبو بكر ، فجاء رسول الله ﷺ والناس في الصلاة فتخلص حتى وقف في الصف فصفق الناس. وكان أبو بكر لا يلتفت في صلاته . فلما أكثر الناس التصفيق التفت فرأى رسول الله ﷺ فأشار إليه رسول الله ﷺ أن امكث مكانك ، فرفع أبو بكر رضي الله عنه يديه فحمد الله على ما أمره به رسول الله ﷺ من ذلك ثم استأخر أبو بكر حتى استوى في الصف وتقدم رسول الله ﷺ فصلى ، فلما انصرف قال : « يا أبا بكر ما منعك أن تثبت إذ أمرتك ؟ » فقال أبو بكر : ما كان لابن أبي قحافة أن يصلي بين يدي رسول الله ﷺ . فقال رسول الله ﷺ : « مالي رأيتكم أكثرتم التصفيق؟ من رابه شيء في صلاته فليسبح ، فإنه إذا سبح التفت إليه، وإنما التصفيق للنساء » . [أنظر: ۱۲۰۱ ، ۱۲۰۴ ، ۱۲۱۸ ، ۱۲۳۴ ، ۲۶۹۰ ، ۲۶۹۳ ، ۷۱۹۰]

مقصود بخاری رحمہ اللہ

امام بخاری رحمہ اللہ کا منشأ یہ ہے کہ دونوں صورتیں جائز ہیں، چاہے پیچھے ہٹے یا نہ ہٹے اور پھر اس

[۹۹] حدیث باب کی تشریح کے لئے ملاحظہ فرمائیں: انعام الباری ، ج: ۲، ص: ۳۲۵، رقم الحدیث : ۱۹۸ ، کتاب الوضوء.

میں اسی مرض الوفات والی حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے۔ **"فیہ عائشة عن النبی ﷺ"** کہ جس میں آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور آپ نے امامت فرمائی، لیکن یہاں جو حدیث موصولاً ذکر کی ہے، یہ مرض الوفات کی نہیں بلکہ مرض الوفات سے پہلے کی حالت کی ہے۔ یہ حدیث حالت صحت والی پہلے نہیں گزری، اس لئے اس کا ترجمہ یہ ہے **"عن سهل بن سعد الساعدی أن رسول الله ﷺ ذهب إلى بنی عمرو ابن عوف لیصلح بینهم"**.

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بنو عمرو ابن عوف میں ان کے درمیان صلح کرانے کے لئے گئے، ان کا آپس میں کوئی جھگڑا ہوگیا ہوگا، جس کی وجہ سے ان کی مصالحت کے لئے تشریف لے گئے۔ **"فحانت الصلاة"** اب آپ تو ان لوگوں کے ساتھ مشغول تھے، اتنے میں نماز کا وقت ہوگیا۔ دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر کا وقت آ گیا، تو مؤذن حضرت بلال رضی اللہ عنہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ **"اتصلّی للناس فأقیم"** ؟ کہ حضور اقدس ﷺ تو تشریف فرما نہیں ہیں، کیا آپ نماز پڑھا دیں گے؟ **"فأقیم"** تاکہ میں اقامت کہوں، **"قال نعم"** صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کہا ٹھیک ہے۔ حضور ﷺ ابھی تک تشریف نہیں لائے، چلو نماز پڑھ لیتے ہیں۔ **"فصلی أبوبکر"** حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھانی شروع کردی۔ **"فجاء الرسول والناس فی الصلاة"** آپ ﷺ تشریف لائے اس حالت میں کہ لوگ نماز میں مشغول تھے **"فتخلّص حتی وقف فی الصف"** تخلص کے معنی آپ ﷺ نے راہ پائی، راستہ بنایا، یعنی صفوں کو چیرتے ہوئے راستہ بنا کر آپ ﷺ اگلی صف کی طرف تشریف لے گئے۔ **"حتی وقف فی الصف"** یہاں تک کہ صف میں جا کر کھڑے ہو گئے یعنی آپ ﷺ کا منشاء یہ تھا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اقتداء کریں اور نماز میں شامل ہو جائیں، تو آپ ﷺ صفوں کو چیرتے ہوئے تشریف لے گئے اور وہاں جا کر کھڑے ہو گئے۔ **"فصفّق الناس"** لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ مطلب یہ تھا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو پتہ چل جائے کہ حضور ﷺ تشریف لے آئے۔ **"وکان أبوبکر لایلتفت فی الصلاة"** صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نماز پڑھتے ہوئے کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ **"فلمّا اکثر الناس التصفیق"** جب لوگوں نے تصفیق زیادہ شروع کردی تو **"التفت"** صدیق اکبر رضی اللہ عنہ متوجہ ہوئے **"فرأی رسول الله"** دیکھا تو رسول اللہ ﷺ تشریف فرما ہیں، **"فأشار إلیه رسول الله ﷺ خذ مکانک"** آپ ﷺ نے اشارے سے فرمایا! اپنی جگہ کھڑے رہو، پیچھے آنے کی ضرورت نہیں۔ **"فرفع أبوبکر یدیه وحمد الله علی مامرهٗ به رسول الله ﷺ"** صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ہاتھ اٹھائے، اللہ جل جلالہ کا شکریہ ادا فرمایا، اس بات پر کہ آپ نے انہیں حکم دیا، یعنی سرکار دو عالم ﷺ کا یہ فرمانا کہ اپنی جگہ کھڑے رہو اور آپ کی امامت کی توثیق فرمانا بلکہ آپ کی امامت ہی میں نماز ادا کرنے کا ارادہ فرمانا یہ بات صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے لئے اتنی باعث سعادت تھی کہ اس پر بے ساختہ اللہ جل جلالہ کا شکریہ ادا فرمایا۔ اب شکر زبان سے ادا کیا یا دل

میں، یہ روایت میں موجود نہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ دِل دِل میں ادا کیا یعنی بے ساختہ ہاتھ تو اٹھ گئے اللہ ﷻ کے شکر کے لئے مگر شکر زبان سے نہیں بلکہ دِل سے ادا کیا۔ چنانچہ حنفیہ کا کہنا ہے کہ کوئی ایسا موقع آئے جو اللہ ﷻ کی حمد کا ہے تو آدمی کو الحمد للہ زبان سے نہیں کہنا چاہئے بلکہ دِل میں کہنا چاہئے لیکن اگر کہہ دیا تو نماز فاسد نہیں ہوگی۔ چنانچہ حکم یہی ہے کہ فرض کرو اگر نماز کے اندر چھینک آجائے تو "**الحمدللہ**" زبان سے نہیں کہنا چاہئے دِل دِل میں کہنا چاہئے۔ پھر بھی اگر کوئی کہہ دے تو نماز فاسد نہیں ہوگی۔

اور "**الحمدللہ**" کا جواب "**یرحمک اللہ**" اگر کہہ دیا، یعنی دوسرے کو چھینک آئی، تم نے کہہ دیا "**یرحمک اللہ**" تو نماز فاسد ہو جائے گی، کیونکہ یہ ایک انسان سے خطاب ہے۔

سوال: یہاں دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر ؓ نے نماز کے دوران ہاتھ اٹھائے اور حدیث میں اس پر نکیر نہیں ہے، جبکہ فقہاء فرماتے ہیں کہ نماز کے دوران حمد یا دعا کے لئے ہاتھ نہیں اُٹھانے چاہئیں۔

جواب: حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے مسند احمد کے حوالے سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضرت صدیق اکبر ؓ سے آنحضرت ﷺ نے پوچھا "**لم رفعت یدیک**"؟ اس سے پتہ چلا کہ آپ کو یہ عمل نامانوس معلوم ہوا، البتہ آپ نے اس پر شدت سے نکیر اس لئے نہیں فرمائی کہ یہ امر حضرت صدیق اکبر ؓ سے بے اختیار اور اچھی نیت سے ہوا تھا اور بعض اوقات تقریر عمل پر نہیں، بلکہ نیت پر ہوتی ہے۔ اس کی متعدد مثالیں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بیان فرمائی ہیں۔ [۱۰۰]

"**ثمّ استأخر أبوبكر**" شکر تو ادا کر دیا لیکن پھر پیچھے ہٹنا شروع کر دیا "**حتی استوی فی الصف**" یہاں تک کہ صف کے برابر آگئے "**وتقدم رسول اللہ ﷺ**" اور آپ آگے بڑھے۔ "**فصلّی**" آپ ﷺ نے نماز پڑھائی۔ "**فلما انصرف**" جب فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا "**یا أبابکر ما منعک ان تثبت ان امرتک**" جب میں نے کہہ دیا تھا کہ بھائی کھڑے رہو، پھر کیوں کھڑے نہیں رہے؟ کس چیز نے کھڑے رہنے سے روکا، تو صدیق اکبر ؓ نے جواب میں فرمایا کہ "**ما کان لابن أبی قحافة ان یصلّی بین یدی رسول اللہ ﷺ**" ابو قحافہ کے بیٹے کی مجال نہ تھی کہ وہ رسول اکرم ﷺ کے سامنے کھڑے ہو کر نماز پڑھائے۔ تو آپ نے پھر اس کے اوپر بھی کوئی انکار نہیں فرمایا۔

فقال رسول اللہ ﷺ "مالی رأیتکم اکثرتم التصفیق؟"

پھر صحابہ ؓ سے فرمایا کہ تم نے نماز کے دوران بہت تالیاں بجائیں؟ "**من رابه شیٔ فی صلاته فلیسبح**" کسی کو نماز کے اندر کوئی ضرورت پیش آئے تو "**فلیسبح**" تسبیح کہے یعنی "**سبحانہ اللہ**" کہے۔ "**فانه اذا سبح التفت الیه**" اس لئے کہ جب وہ تسبیح کہے گا تو لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔

---

[۱۰۰] راجع: فیض الباری، ج:۲، ص: ۲۱۱، ۲۱۲.

"وانما التصفیق للنساء" تالیاں بجانا تو عورتوں کا کام ہے، تو تعلیم دیدی کہ امام کو کسی بات پر متنبہ کرنا ہو تو ایسے موقع پر تسبیح کرنی چاہئے۔

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ یہاں لائے تو ساتھ میں ترجمۃ الباب میں یہ فرمایا کہ اگر امام اول آجائے تو امام راتب جس شخص نے پہلے نماز پڑھانی شروع کردی **"فتاخر الأوّل أولم یتاخر جازت صلاته"** وہ چاہے تو پیچھے ہٹ جائے اور چاہے نہ ہٹے، دونوں صورتوں میں نماز ہو جائے گی۔ اس حدیث سے دونوں باتیں ثابت کرنی مقصود ہیں۔ اس واسطے کہ شروع میں نبی کریم ﷺ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ تم اپنی جگہ پر کھڑے رہو، جب سے پتہ چلا کہ ان کے لئے پیچھے ہٹنا ضروری نہیں تھا۔ اگر وہ پیچھے نہ ہٹتے تو جائز ہوتا، لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹ گئے اور پھر آپ نے انکے پیچھے ہٹنے پر خود آگے جا کر نماز پڑھائی۔ تو یہ امر اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ ایسا کرنا بھی جائز ہے۔ تو اس لئے کہا **"فتأخر أولم یتاخر جازت صلاته"**۔

پھر اس میں اختلاف ہے کہ ایک امام نماز پڑھا رہا ہے اس کو کوئی عذر لاحق ہو جاتا ہے استمرار سے جیسے حدث لاحق ہو گیا تو بالاتفاق استخلاف مشروع ہے لیکن اس قسم کا کوئی عذر پیش نہیں آیا بلکہ امام کے علم میں یہ بات آگئی کہ میرا کوئی بڑا پیچھے آکر کھڑا ہو گیا ہے اور وہ اس کی خاطر استخلاف کرے کہ خود پیچھے ہٹے اور بڑے کو آگے کردے ایسا کرنا جائز ہے کہ نہیں۔

بعض فقہائے کرام اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے اس کو جائز قرار دیتے ہیں، شاید امام بخاری رحمہ اللہ کا مذہب بھی یہی ہے، اسی لئے ترجمۃ الباب میں انہوں نے دونوں باتیں قائم کی ہیں، لیکن حنفیہ کے نزدیک یہ جائز نہیں اور حدیث باب ہو یا حدیث مرضِ وفات۔ دونوں کے بارے میں حنفیہ کا کہنا یہ ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیت تھی کہ جب آپ تشریف فرما ہیں تو آپ کا آگے بڑھنا ہی ہر حالت میں احق اور اولیٰ ہے، لہٰذا اس کو حاصل کرنے کے لئے اس پہلے والے امام کے لئے جائز ہے کہ پیچھے ہٹ جائے اور حضور ﷺ کو آگے بڑھائے لیکن کسی دوسرے کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں۔

(۴۹) باب اذا استووا فی القراءة فلیؤمهم أکبرهم

اگر کچھ لوگ قرأت میں مساوی ہوں تو جو ان میں زیادہ عمر والا وہ امامت کرے

۶۸۵۔ حدثنا سلیمٰن بن حرب قال: حدثنا حماد ابن زید .... فلیؤذن لکم احدکم ولیؤمکم أکبرکم.

اس میں یہ ثابت کردیا کہ جہاں لوگ قرأت اور علم میں برابر ہوں، تو پھر **"اکبرهم سنًا"** ترجیح ہوگی۔

(۵۰) باب إذا زار الإمام قوما فأمّهم

اگرامام کچھ لوگوں سے ملنے جائے تو ان کا امام ہوسکتا ہے

۶۸۶ ـ حدثنا معاذ بن أسد قال: أخبرنا عبد الله قال: أخبرنا معمر عن الزهری قال: أخبرنی محمود بن الربیع قال: سمعت عتبان بن مالک الأنصاری قال: استأذن النبی ﷺ فأذنت له، فقال: «أین تحب أن أصلی من بیتک؟» فأشرت له إلی المکان الذی أحب فقام وصففنا خلفه ثمّ سلّم وسلّمنا. [راجع: ۴۲۴]

یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ بعض روایتوں میں جو آتا ہے کہ **"لایؤم الرجل فی سلطانه"** یا **"صاحب المنزل أحق بالامامة"** تو یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ ہمیشہ صاحب منزل ہی امام بنے بلکہ صاحب منزل اگر خود اجازت دے یا کسی دوسرے سے درخواست کرے تو دوسرے کا امام بننا بھی جائز ہے جبکہ وہ بڑا ہو جیسا کہ حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کے گھر میں رسول اللہ ﷺ نے امامت فرمائی۔

(۵۱) باب إنما جعل الإمام لیؤ تم به

امام اسی لئے مقرر کیا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے

"وصلی النبی ﷺ فی مرضه الذی توفی فیه بالناس وهو جالس. وقال ابن مسعود: إذا رفع قبل الإمام یعود فیمکث بقدر ما رفع ثم یتبع الإمام. وقال الحسن فیمن یرکع مع الإمام رکعتین ولا یقدر علی السجود: یسجد للرکعة الأخیرة سجدتین ثم یقضی الرکعة الأولی لسجودها، وفیمن نسی سجدة حتی قام: یسجد".

"باب إنما جعل الامام لیؤتم به"

یہ حدیث کا حصہ ہے **"إنما جعل الإمام لیؤتم به"** اور آگے وہ حدیث ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ نے موصولاً کئی طریقوں سے روایت بھی کی ہے لیکن اس کو ترجمۃ الباب بنایا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حدیث گویا ایک اصل کلی بیان کر رہی ہے کہ امام کو اللہ جل جلالہ نے امام اس لئے بنایا تا کہ لوگ اس کی اقتداء کریں۔ اب اس اصول پر بہت سے جزوی مسائل متفرع ہوتے ہیں، ان میں سے بعض کی طرف امام بخاری رحمہ اللہ نے اس ترجمۃ الباب میں اشارہ کیا ہے اور بعض ان شاء اللہ متعلقہ احادیث کے اندر آئیں گے۔

پہلی بات جو امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمائی کہ:

وصلّی النبی ﷺ فی مرضه الذی توفی فیه بالناس وهو جالس۔

آپ نے نماز پڑھی بلکہ صحیح روایت کے مطابق پڑھائی، اس مرض میں جس میں آپ کی وفات ہوئی یعنی مرض وفات میں، "**وهو جالس**" بیٹھ کر پڑھائی اور باقی صحابۂ کرام ﷺ کھڑے ہوکر آپ کی اقتداء کررہے تھے۔ اس سے امام بخاری رحمہ اللہ اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کا آخری عمل یہ تھا کہ امام بیٹھ کر امامت کررہا ہے اور مقتدی کھڑے ہوکر اقتداء کررہے ہیں۔ تو اس صورت کا جواز اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے اور اس کی طرف اشارہ اس لئے کردیا کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر امام بیٹھ کر نماز پڑھائے تو مقتدیوں کو بھی بیٹھ کر پڑھنی چاہئے جیسا کہ آگے ایک حدیث میں آرہا ہے، مزید تفصیل اس حدیث کے اگلے حصے میں آئے گی، امام بخاری رحمہ اللہ نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔

آگے فرمایا:

"وقال ابن مسعود اذا رفع قبل الإمام يعود فيمكث بقدر ما رفع ثم يتبع الإمام".

یہ جزئیہ بھی حضرت عبداللہ ابن مسعود ﷺ نے "**إنما جعل الإمام ليؤتم به**" کے قاعدۂ کلیہ سے مستنبط فرمایا ہے، تو چونکہ امام کو اللہ جل جلالہ نے یہ مقام بخشا ہے کہ مقتدی اس کی اقتداء کریں لہٰذا مقتدیوں کو چاہئے کہ وہ جو کام کریں امام کے بعد کریں، امام سے آگے نکلنے کی کوشش نہ کریں، لہٰذا امام اگر رکوع میں ہے تو جب تک رکوع میں ہے تو مقتدی کو بھی رکوع ہی میں رہنا ہے۔ جب تک امام سجدے میں ہے تو مقتدی کو بھی سجدے ہی میں رہنا چاہئے اس سے پہلے سر نہ اٹھانا چاہئے، مثلاً اگر کسی نے امام سے پہلے غلطی سے سر اٹھالیا تو عبداللہ بن مسعود ﷺ فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں وہ دوبارہ سجدے میں جائے اور جتنی دیر اس نے سر اٹھائے رکھا ہے اتنی دیر امام کے سجدہ سے سر اٹھانے کے بعد یہ سجدے میں ہی رہے پھر اٹھے، مثلاً سر اتنی دیر اٹھایا تھا کہ دو مرتبہ سبحان اللہ کہا جاسکے اب جب امام اٹھائے گا تو امام کے اٹھنے کے بعد دو تسبیح کی بقدر سجدے میں ہی رہے پھر اُٹھے، لیکن یہاں حنفیہ کے نزدیک حکم یہ ہے کہ جب تک امام سجدے میں ہے مقتدی کو دوبارہ سجدے میں چلے جانا چاہئے، لیکن حنفیہ نے یہ شرط نہیں لگائی کہ جتنی دیر پہلے اٹھا تھا امام کے اٹھنے کے بعد اتنی دیر ضرور سجدے میں رہے۔

"وفي الطحطاوي على المراقي فلو رفع المقتدئ رأسه من الركوع أو السجود قبل الإمام ينبغي له أن يعود لتزول المخالفة بالموافقة".

"**وقال ابن مسعود اذا رفع قبل الإمام**" اگر کسی شخص نے امام سے پہلے سر اُٹھالیا۔ "**يعود**" دوبارہ سجدے میں لوٹ جائے "**فيمكث بقدر ما رفع**" اور سجدے میں اتنی مقدار رہے جتنی دیر اس

نے سر اُٹھایا تھا "ثم یتبع الإمام" پھر امام کی اتباع کرے۔

وقال الحسن فیمن یرکع مع الإمام رکعتین ولا یقدر علی السجود۔

حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے امام کے ساتھ دو رکعتیں پڑھیں اور سجدے پر قادر نہیں ہے تو آخری رکعت کے لئے دو سجدے کرے گا، پھر پہلی رکعت دو سجدوں کے ساتھ قضاء کرے گا۔

کہنے کا منشأ یہ ہے کہ ایک شخص آ کر امام کے ساتھ شامل ہوا اور دو رکعتوں کی نماز تھی اور وہ سجدے پر قادر نہ ہو سکا۔ فرض کرو کہ بہت شدید ہجوم تھا بعض اوقات عیدین کے موقع پر حرمین میں اتنی جگہ بھی نہیں ہوتی کہ وہ سجدہ کر سکے، تو ایسی صورت میں حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آخری رکعت کے بعد دو سجدے کر لے گا، پھر پہلی رکعت سجدے کے ساتھ قضاء کرے گا یعنی پہلی رکعت میں اس کو سجدے کا موقع نہیں ملا، دوسری رکعت میں مل گیا، تو دوسری رکعت تو سجدے کے ساتھ ہوگئی بعد میں پہلی رکعت جو بغیر سجدے کے ہوئی تھی اس کو قضاء کر لے۔

حنفیہ کے نزدیک حکم یہ ہے کہ اگر سامنے والے کی پشت پر سجدہ کر سکتا ہے تو سجدہ کر لے لیکن اگر سجدہ نہیں کر سکا تو دوسری رکعت کے دو سجدے تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد فوراً کر لے اور پہلی رکعت کے دو سجدے چھوٹے ہیں، ان کے بارے میں حنفیہ سے دو قول مروی ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ پہلی رکعت کے سجدے بھی اسی وقت کر لے، اور اس طرح امام کے سلام پھیرنے کے بعد چار سجدے کرے گا جن میں سے دو دوسری رکعت کے ہوں گے اور دو پہلی رکعت کے، اس کے بعد سلام پھیر دے گا تو نماز ہو جائے گی۔

دوسرا قول حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے مطابق ہے یعنی پہلی رکعت کے صرف دو سجدے کر لینا کافی نہیں بلکہ پوری رکعت قضا کرنا ضروری ہے۔

یہ اختلاف اسی اصول پر مبنی ہے کہ ارکان میں ترتیب کا لحاظ صحتِ صلوۃ کے لئے شرط ہے یا نہیں۔ اصح یہ ہے کہ مراعات ترتیب ضروری ہے، لہٰذا فتویٰ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے قول پر ہی دینا چاہئے۔[۱۰۱]

"وفی من نسی سجدۃ حتی قام: یسجد".

اور جو شخص ایک سجدہ بھول گیا یہاں تک کہ وہ کھڑا ہو گیا تو سجدے کی طرف واپس آئے یعنی فرض کرو کہ ایک شخص نے دو سجدے کی بجائے ایک سجدہ کیا اور ایک سجدہ کر کے بھول گیا اور اگلی رکعت کے لئے کھڑا ہوا تو سجدے کے لئے واپس آنا چاہئے اور یہی اصول حنفیہ کے ہاں فرائض صلوٰۃ کا ہے۔ چنانچہ "**والناس عنہ غافلون**" یعنی اگر کوئی فرض ترک ہو جائے اور اگلے رکن میں یاد آ جائے تو چاہئے کہ واپس آئے یہاں تک کہ فقہاء نے فرمایا ہے کہ، ایک شخص نے سورۂ فاتحہ پڑھی اور ضم سورت بھول گیا اور ضم سورت کی بجائے رکوع میں

---

[۱۰۱] راجع: لامع الدراری، ج: ۱، ص: ۲۶۰.

چلا گیا اور اگر رکوع ہی میں یاد آجائے کہ میں نے ضم سورت نہیں کیا ہے تو کیا حکم ہے؟

حکم یہ ہے کہ قیام کی طرف واپس آجائے اور ضم سورت کرے اور ضم سورت کرنے کے بعد دوبارہ رکوع کرے اور پھر آخر میں جا کر سجدۂ سہو کرے۔ لوگوں کو عام طور پر یہ مسئلہ معلوم نہیں ہوتا یا غفلت میں ہوتے ہیں۔ ضم سورت رکوع میں یاد آگیا تو لوگ سمجھتے ہیں کہ آخر میں جا کر سجدۂ سہو کرلیں گے کیونکہ واجب ترک ہو گیا واپس لوٹتے نہیں، یہ بڑی سخت غلطی ہے واپس آکر پھر دوبارہ رکن کا اعادہ کرے اور آخر میں سجدۂ سہو کرلے۔ "**وفیمن نسی سجدة حتی قام : یسجد**" تو یہی بات یہاں پر کہہ رہے ہیں کہ سجدہ بھول گیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا تو کیا کرے گا؟ سجدے کا اعادہ کرے گا۔ آگے حدیث وہی نقل کی ہے جو حضور ﷺ کے مرضِ وفات کی ہے۔

۶۸۷ ــ حدثنا احمد بن یونس قال : حدثنا زائدة ، عن موسی بن أبی عائشة ، عن عبید اللّٰه بن عبد اللّٰه بن عتبة قال : دخلت علی عائشة فقلت : ألا تحدثینی عن مرض رسول اللّٰه ﷺ ؟ قالت: بلی ، ثقل النبی ﷺ فقال : ((أصلی الناس ؟)) فقلنا : لا یا رسول اللّٰه وهم ینتظرو نک . قال : ((ضعوا لی ماء فی المخضب)) . قالت : ففعلنا ، فاغتسل فذهب لینوء فأغمی علیه ثم أفاق . فقال رسول اللّٰه ﷺ : ((أصلی الناس ؟)) قلنا: لا ، هم ینتظرونک یا رسول اللّٰه. قال : ((ضعوا لی ماء فی المخضب)) . قالت : فقعد فاغتسل ثم ذهب لینوء فأغمی علیه ثم أفاق . فقال : ((أصلی الناس ؟)) قلنا: لا ، هم ینتظرونک یا رسول اللّٰه. فقال : ((ضعوا لی ماء فی المخضب)) . فقعد فاغتسل ثم ذهب لینوء فأغمی علیه ثم أفاق . فقال : ((أصلی الناس ؟)) قلنا: لا ، هم ینتظرونک یا رسول اللّٰه. ــ والناس عکوف فی المسجد ینتظرون رسول اللّٰه ﷺ لصلاة العشاء الآخرة ــ فأرسل النبی ﷺ ، إلی أبی بکر بأن یصلی بالناس فأتاه الرسول فقال : إن رسول اللّٰه ﷺ یأمرک أن تصلی بالناس . فقال أبو بکر ، وکان رجلا رقیقا : یا عمر صل بالناس . فقال له عمر : أنت أحق بذلک . فصلی أبو بکر تلک الأیام . ثم إن النبی ﷺ وجد من نفسه خفة فخرج بین رجلین أحدهما العباس لصلاة الظهر وأبو بکر یصلی بالناس ، فلما رآه أبو بکر ذهب لیتأخر فأومأ إلیه النبی ﷺ بأن لا یتأخر . قال : ((أجلسانی إلی جنبه)) ، فأجلساه إلی جنب أبی بکر قال : فجعل أبو بکر یصلی وهو قائم بصلاة النبی ﷺ والناس بصلاة أبی بکر ، والنبی ﷺ قاعد . قال عبید اللّٰه : فدخلت علی عبد اللّٰه بن عباس فقلت له : ألا أعرض علیک ما حدثتنی عائشة عن مرض النبی ﷺ ؟ قال : هات . فعرضت علیه حدیثها

فما أنكر منه شيئا غير أنه قال : أسمت لك الرجل الذى كان مع العباس ؟ قلت : لا ، قال: هو علی ابن أبي طالب ﷺ . [راجع : ۱۹۸]

۶۸۸ ـــ حدثنا عبد الله بن يوسف قال : أخبر مالك ، عن هشام بن عروة ، عن أبيه ، عن عائشة أم المؤمنين أنها قالت : صلى رسول الله ﷺ في بيته وهو شاك ، فصلى جالسا وصلى وراء ه قوم قياما ، فأشار إليهم أن اجلسوا ، فلما انصرف قال : ((إنما جعل الإمام ليؤتم به ، فإذا ركع فاركعوا ، وإذا رفع فارفعوا ، وإذا قال : سمع الله لمن حمده ؛ فقولوا : ربنا ولك الحمد ، وإذا صلى جالسا فصلوا جلوسا)) . [أنظر : ۱۱۱۳ ، ۱۲۳۶، ۵۶۵۸]

۶۸۹ ـ حدثنا عبد الله بن يوسف قال: أخبرنا مالك عن ابن شهاب عن انس بن مالك: أن رسول الله ﷺ ركب فرسا فصرع عنه فجحش شقه الايمن ، فصلى صلاة من الصلوات وهو قاعد ، فصلينا وراء ه قعودا، فلماانصرف قال: ((انّما جعل الامام ليؤتم به، فاذا صلى قائما فصلوا قياما ، فاذا ركع فاركعوا، واذا رفع فارفعوا، واذا قال: سمع الله لمن حمده ، فقولوا: ربنا ولك الحمد . واذا صلى قائما فصلوا قياما واذا صلى جالسا فصلوا جلوسا أجمعون)). قال أبو عبد الله : قال الحميدى :قوله : ((اذا صلى جالسا فصلوا جلوسا)) هو فى مرضه القديم ثم صلى بعد ذلك النبى ﷺ جالسا. والناس خلفه قيام لم يأمرهم با لقعود وانّما يؤخذ بالآخر فالآخر من فعل النبى ﷺ . [راجع :۳۷۸][۱۰۲]

(۵۴) باب إمامة العبد والمولى

غلام اور آزاد کردہ غلام کی امامت کا بیان

وكانت عائشة يؤمّها عبدها ذكوان من المصحف ، وولد البغى والأعرابى والغلام الذى لم يحتلم لقول النبى ﷺ : ((يؤمّهم أقرؤهم لكتاب الله))، ولا يمنع العبد من الجماعة بغير علة.

اس باب میں امام بخاری رحمہ اللہ نے امامت کے متعدد مسائل بیان فرمائے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

إمامة العبد والمولى

[۱۰۲] تشریح ملاحظہ فرمائیں: انعام الباری، ج:۲، ص: ۳۲۵، رقم الحدیث :۱۹۸ ، کتاب الوضوء .

جمہور کے نزدیک عبد اور مولیٰ کی امامت درست ہے اور سلف میں امامت عبد کے بہت سے واقعات ملتے ہیں اور حنفیہ سے جو کراہت منقول ہے وہ اس کے **"مشغول بخدمة السيد"** ہونے کی وجہ سے ہے، لہٰذا جہاں ایسا نہ ہو تو کراہت بھی نہیں اور بعض حضرات نے وجہ یہ بتائی کہ امامت ایک جلیل القدر منصب ہے، لہٰذا ایسے شخص کو امام بنانا چاہئے جس کی وقعت دلوں میں ہو، اس کے باوجود یہ کراہت تنزیہی ہے۔ اور جہاں کوئی دوسری وجہ ترجیح ہو وہاں یہ بھی نہیں۔ [۱۰۳]

وكانت عائشة يؤمّها عبدها ذكوان من المصحف

ظاہر یہ ہے کہ اسی جماعت میں دوسرے لوگ بھی ہوتے ہوں گے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پردے کے پیچھے اقتداء کرتی ہوں گی۔

یہ اثر مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ میں مروی ہے اور اس سے امام احمد رحمہ اللہ نے نماز کے دوران مصحف کو دیکھ کر قرأت کے جواز پر استدلال کیا ہے اور یہ مذہب بہت سے تابعین مثلاً محمد بن سیرین، حسن بصری، حکم، عطاء رحمہم اللہ سے مروی ہے۔ [۱۰۴]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے کہ ان کا غلام پیچھے مصحف لے کر کھڑا ہو جاتا اور جہاں آپ اٹکتے، وہ مصحف آگے کر دیتا۔

امام مالک رحمہ اللہ نے تراویح میں اس کو جائز کہا ہے، ابراہیم نخعی، سعید ابن المسیب، شعبی، ابو عبد الرحمٰن سلمی مجاہد، حماد اور قتادہ رحمہم اللہ سے مروی ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ ابن حزم کا بھی یہی مسلک ہے۔

امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک نماز فاسد نہیں ہوتی، مگر **"تشبّه بأهل الكتاب"** کی وجہ سے ایسا کرنا مکروہ ہے۔ [۱۰۵]

---

۱۰۳ فيض الباری، ج: ۲، ص: ۲۱۷.

۱۰۴ حدثنا ابن علية عن ايوب قال سمعت القاسم يقول كان يؤم عائشة عبد ذكر في المصحف، مصنف ابن شيبة، باب في الرجل يؤم القوم وهو يقرأ في المصحف، رقم: ۷۲۱۶، ج: ۲، ص: ۱۲۳.

۱۰۵ عن سليمان بن حنظلة البكري أنه مر على رجل يؤم قوماً في المصحف فضربه برجله.

وعن أبي عبد الرحمن أنه كره أن يؤم في المصحف.

وعن ابراهيم أنه كره أن يؤم الرجل في المصحف كراهة أن يتشبهوا بأهل الكتاب، مصنف ابن أبي شيبة، باب من كرهه، رقم: ۷۲۲۴، ۷۲۲۵، ۷۲۲۶، ج: ۲، ص: ۱۲۳.

امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی اسی قسم کا قول مروی ہے۔[۱۰۶]

حنفیہ کی دلیل ابن ابی داؤد رحمہ اللہ کی کتاب "**المصاحف**" میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اثر ہے:

"**نهانا امیر المؤمنین أن نؤم الناس فی المصاحف**".[۱۰۷]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی ممانعت فرمائی تھی۔ اس کے علاوہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ نے "**مسیئ فی الصلوٰۃ**" کی حدیث سے بھی حنفیہ کے مسلک پر استدلال کیا ہے، جس میں ہے "**إن کان معک قرآن فاقرأ وإلا فاحمدالله عز وجل**" اس میں قرآن یاد نہ ہونے کی صورت میں حمد وتکبیر کا حکم دیا گیا ہے اگر "**قرأة من المصحف**" جائز ہوتی تو کہا جاتا کہ دیکھ کر قرآن پڑھ لو۔[۱۰۸]

بعض حنفیہ نے فساد کی علت عمل کثیر بتائی ہے اور بعض نے "**تلقن من الخارج**" دوسری علت حنفیہ کے نزدیک راجح ہے، چنانچہ اگر عمل کثیر لازم نہ آئے تب بھی "**قرأة من المصحف**" موجب فسادِ صلوٰۃ ہوگی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس اثر کا جواب حنفیہ نے یہ دیا ہے کہ یہ محتمل ہے اور یہ ممکن ہے کہ مصحف سے امامت کرنے کا مطلب یہ ہو کہ وہ نماز سے پہلے یا تراویحہ کے دوران مصحف دیکھ کر یاد کر لیتے ہوں۔

---

[۱۰۶] من المصحف ـ ظاهره يدل على جواز القراءة من المصحف في الصلوة، وبه قال ابن سيرين والحسن والحكم وعطاء، وكان أنس يصلي وغلام خلفه يمسك له المصحف، واذا تعايا في آية فتح له المصحف. واجازه مالك في قيام رمضان، وكرهه النخعي وسعيد بن المسيب والشعبي، وهو رواية عن الحسن. وقال: هكذا يفعل النصارى، وفي مصنف ابن أبي شيبة وسليمان بن حنظلة ومجاهد بن جبير وحماد وقتادة، وقال ابن حزم: لاتجوز القراءة من المصحف ولا من غيره لمصل اماما كان أو غيره، فان تعمد ذلك بطلت صلاته وبه قال ابن المسيب والحسن والشعبي وأبو عبد الرحمن السلمي وهو مذهب أبي حنيفة والشافعي، قال صاحب ((التوضيح)): وهو غريب لم آره عنه.

قلت: القراءة من مصحف في الصلاة مفسدة عند أبي حنيفة لأنه عمل كثير، وعند أبي يوسف ومحمد يجوز، لأن النظر في المصحف عبادة، ولكنه يكره لما فيه من التشبه بأهل الكتاب في هذه الحالة، وبه قال الشافعي وأحمد، وعند مالك وأحمد في رواية. لاتفسد في النفل فقط، عمدة القاري، ج:۴، ص:۳۱۴، وفيض الباري، ج:۲، ص:۲۱۷، ومصنف ابن أبي شيبة، ج:۲، ص:۱۲۳.

[۱۰۷] لامع الدراري، ص: ۲۶۵، ج: ۳. أن عمر رضي الله تعالىٰ عنه كان ينهى عنه، فيض الباري، ج:۲، ص:۲۱۷، والمغني، ج:۱، ص:۳۳۵.

[۱۰۸] لامع الدراري، ج:۱، ص:۲۶۵.

" و ولد البغیّ و الأعرابی".

امام بخاری رحمہ اللہ نے ان کی امامت کے جواز پر " **یؤمّهم اقرأهم لكتاب الله**" کے عموم سے استدلال کیا ہے۔

حنفیہ کی کتابوں میں ان کی امامت کو مکروہ قرار دیا گیا ہے۔

موطأ امام مالک رحمہ اللہ میں روایت ہے کہ: "**ان رجلا كان يؤم الناس بالعقيق فأرسل إليه عمربن عبدالعزيز فنهاه قال مالك وإنمانهاه لأ نه كان لايعرف أبوه**". [۱۰۹]

نیز ابن ماجہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے آنحضرت ﷺ کا ایک خطبہ مروی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں "...... **الا لا تؤمن امرأة رجلا و لايؤم أعرابى مهاجرا ولا يؤم فاجر مؤمناًالا أن يقهره بسلطان يخاف سيفه وسوطه**". [۱۱۰]

حضرت علامہ ظفر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ نے "اعلاء السنن" میں فرمایا ہے کہ اگر چہ یہ حدیث سنداً ضعیف ہے، مگران امور کی صحت پر دوسرے قرائن موجود ہیں۔ [۱۱۱]

علامہ عینی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔"**لا يتقدم الصف الاوّل أعرابى ولاعجمى ولاغلام لم يحتلم**". [۱۱۲]

البتہ بچے کے علاوہ دوسرے لوگوں میں کراہت کی وجہ لوگوں کے دلوں میں وقعت کا نہ ہونا ہے، لہٰذا اگر یہ لوگ علم وقرأت وغیرہ میں ممتاز ہوں تو کراہت نہیں اور بچے میں علت اس کا غیر مکلّف ہونا ہے۔

"والغلام الذى لم يحتلم".

نابالغ کی امامت کا مسئلہ

یہ اختلافی مسئلہ ہے، بظاہر امام بخاری رحمہ اللہ صبی ممیز کی امامت جائز سمجھتے ہیں اور یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔

حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ فرائض میں عدم جواز پر متفق ہیں، البتہ حنابلہ نوافل میں جائز کہتے ہیں اور مالکیہ کہتے ہیں کہ جائز تو نہیں مگر نوافل میں نماز صحیح ہو جائے گی۔

[۱۰۹] موطا مالک ،باب العمل فى صلاة الجماعة ،رقم: ۳۰۳،ج: ۱،ص: ۱۳۴.

[۱۱۰] سنن ابن ماجه ،باب فى فرض الجمعة ،رقم: ۱۰۸۱.

[۱۱۱] اعلاء السنن ،ج: ۴،ص: ۲۳۰.

[۱۱۲] اخرجه الدارقطنى ، باب من يصلح أن يقوم خلف الامام ،رقم: ۱،ج: ۱،ص: ۱۸۱.

حنفیہ کے نزدیک فی اصح القولین نوافل میں بھی جائز نہیں، مجوزین حضرت عمرو بن سلمہ ﷺ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو پیچھے گذر گئی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ابتداء اسلام کا واقعہ ہے، ورنہ کشفِ عورت کے باوجود نماز کو جائز کہنا پڑے گا اور ''**رفع القلم عن ثلاث**'' سے معلوم ہوتا ہے کہ نابالغ کے اعمال غیر معتبر ہیں۔ پھر وہ امامت کیسے کرسکتا ہے؟ نیز حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ اور حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ سے مروی ہے کہ انہوں نے نابالغ کی امامت کو ناجائز قرار دیا۔

حضرت ابن عباس ﷺ کا قول ہے ''**لایؤم الغلام حتی یحتلم**'' اور ابن مسعود ﷺ کا ارشاد ہے ''**لا یوم الغلام حتی یجب علیه الحدود**''. [۱۳]

(۵۵) باب : إذا لم يتم الامام واتمّ من خلفه

اگر امام اپنی نماز کو پورا نہ کرے اور مقتدی پورا کریں

۶۹۴ـ حدثنا الفضل بن سهل قال : حدثنا الحسن بن موسى الأشيب قال : حدثنا عبد الرحمٰن بن عبد الله بن دينار ، عن زيد بن أسلم ، عن عطاء بن يسار ، عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ قال : ((يصلون لكم فإن أصابوا فلكم ولهم وإن أخطؤا فلكم وعليهم)) . [۱۴]

''**فان اخطئوا فلكم وعليهم**'' یعنی انہوں نے غلطی کی تو تمہیں ثواب ہوگا، ان کو گناہ ہوگا۔ اس سے امام بخاری نے امام شافعی رحمہما اللہ کے اس مسلک کی تائید کی ہے کہ امام اگر نماز میں کسی عمل مفسد کا ارتکاب کرے تو اس کی نماز فاسد ہوتی ہے، مقتدی کی نماز فاسد نہیں ہوتی۔ مگر یہ استدلال بہت ضعیف ہے۔

ایک تو اس لئے کہ یہ حدیث درحقیقت ائمہ کے نماز کو وقت سے مؤخر کرنے کے سلسلے میں وارد ہوئی ہے جیسا کہ ظالم حکمران نماز کو تاخیر سے پڑھتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اس غلطی کا گناہ ان پر ہوگا تم پر نہیں، لہٰذا یہ حدیث نماز میں عمل مفسد کے ارتکاب سے متعلق نہیں ہے۔

دوسرے اس حدیث میں گناہ اور ثواب کا ذکر ہے، فساد یا عدم فساد کا نہیں۔

نیز حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حدیث میں ''**اتمام**'' کا لفظ دلالت کررہا ہے کہ یہ حدیث امور

---

[۱۳] عمدة القاری، ج: ۴، ص: ۳۱۵.

[۱۴] وفی مسند احمد، باقی مسند المكثرين، باب باقی المسند السابق، رقم: ۸۳۰۹، ۱۰۵۰۹.

زائدہ سے متعلق ہے، یعنی سنن ومستحبات وغیرہ سے کہ اگر امام ان میں کوتاہی کرے تو مقتدی پر اس کا اثر نہیں پڑتا یہ ارکان وشرائط سے متعلق نہیں۔

حنفیہ کی دلیل معروف حدیث ہے **"الإمام ضامن"** اور **"انّما جعِل الإمام ليؤتمّ به"** اگر امام کی نماز فاسد ہے تو اس کے افعال صلوۃ معتبر ہی نہیں، پھر اقتدا کیسے ہوگی؟

یہاں یہ واضح رہے کہ بعض حضرات نے امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کے بارے میں بھی یہ نقل کیا ہے کہ وہ امام شافعی رحمہ اللہ کے ہم نوا ہیں، لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ صرف اس مسئلے میں ان کے ہم خیال ہیں، کہ اگر امام نے نادانستگی میں بحالتِ حدث نماز پڑھادی، بعد میں حدث کا پتہ چلا تو یہ حضرات فرماتے ہیں کہ صرف امام کی نماز فاسد ہوئی، مقتدیوں کی نہیں۔ باقی مفسدات میں وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ امام کی نماز کا فساد مقتدی کی نماز کے فساد کو مستلزم ہے۔[۱۱۵]

(۵۶) باب امامة المفتون والمبتدع

مبتلائے فتنہ اور بدعتی کی امامت کا بیان

"مفتون" سے مراد باغی ہیں جو امام برحق کے خلاف خروج کر کے فتنے میں مبتلا ہوں اور **"مبتدع"** سے مراد وہ لوگ ہیں جو اہلِ السنہ والجماعۃ کے عقائد کے خلاف عقائد رکھتے ہوں، بشرطیکہ ان کا عقیدہ کفر کی حد تک نہ پہنچا ہو۔ ان کا حکم یہ ہے کہ انہیں باختیارِ خود امام بنانا جائز نہیں لیکن اگر کہیں اور جماعت ملنے کی امید نہ ہو تو ان کے پیچھے پڑھنا انفراد سے افضل ہے اور نماز ہر صورت میں ہو جاتی ہے، اعادہ واجب نہیں۔

۶۹۵ ـ قال أبو عبد الله : وقال لنا محمد بن يوسف : حدثنا الأوزاعي قال : حدثنا الزهري، عن حميد بن عبد الرحمٰن، عن عبيد الله بن عدى بن خيار : أنه دخل على عثمان بن عفان ﷺ وهو محصور فقال : إنك إمام عامة ونزل بک مانرى ويصلى لنا إمام فتنة ونتحرج. فقال : الصلاة أحسن ما يعمل الناس فاذا أحسن الناس فأحسن معهم. وإذا أساؤا فاجتنب إساء تهم. وقال الزبيدى : قال الزهرى : لا نرى أن يصلّى خلف المخنّث إلاّمن ضرورة لابدّ منها.

"فاذاأحسن الناس فأحسن معهم" یہ جملہ ایک خلیفۂ راشد ہی کہہ سکتا ہے۔ جو لوگ ناحق خلیفۂ راشد کی جان کے درپے ہیں اور جنہوں نے خلیفۂ راشد کو ظلماً قید کر کے مسجد پر قبضہ کیا ہوا ہے، ان کے بارے میں

---

[۱۱۵] تفصیل کے لئے دیکھئے : لا مع الدراری ص۲۶۷ ج۱۔

بھی حکم شرعی بیان کرنے میں ذاتی جذبات کی کوئی پرچھائیں پڑنے نہیں دیں بلکہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے کی اجازت دی۔

اسلام کی تعلیم درحقیقت یہی ہے کہ ہر معاملے میں اعتدال اور توازن برقرار رکھا جائے اور کسی اختلاف کو اپنی حد سے آگے بڑھنے نہ دیا جائے۔

"أن یصلّی خلف المخنّث" یہ لفظ نون کے کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ مخنث کے لفظ سے تین قسم کے اشخاص مراد لئے جاتے ہیں، مگر ہر ایک کا حکم الگ ہے:

پہلی قسم خُنثیٰ ہے، یعنی جس کے بارے میں یہ تعین نہ ہو سکے کہ وہ مرد ہے یا عورت، کیونکہ اس کے اعضاء مخصوصہ دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ اس کے پیچھے مردوں کی کا نماز کسی حال میں جائز نہیں، کیونکہ اس کے عورت ہونے کا احتمال ہے اور وہ اپنے جیسے خنثیٰ کی امامت بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ اس بات کا احتمال ہے کہ امام عورت اور مقتدی مرد ہو۔

دوسری قسم میں وہ اشخاص داخل ہیں جو مرد ہوتے ہیں، مگر ان کے اعضاء اور لب و لہجے میں خلقی طور پر نسوانیت ہوتی ہے، وہ بتکلف عورت بننے کی کوشش نہیں کرتے۔ ایسے لوگ کسی گناہ کے مرتکب نہیں، اس لئے ان کی امامت جائز ہے۔

تیسری قسم وہ ہے جو مرد ہوتے ہیں مگر بتکلف عورتوں جیسی ادائیں اور اُن کا سا لب و لہجہ بناتے ہیں، اُن کا یہ عمل چونکہ ناجائز ہے اس لئے ان کے پیچھے نماز اسی طرح ناجائز ہے جیسے کسی فاسق کے پیچھے۔ یہاں بظاہر امام زہریؒ کی مراد یہی تیسری قسم ہے۔

"إلّا من ضرورة لابدّ منها" مثلاً یہ کہ کوئی مخنث حاکم بن جائے اور اس کی امامت سے نجات کا کوئی راستہ نہ ہو۔

(۵۷) باب : یقوم عن یمین الإمام بحذائه سواء إذا كانا اثنين

جب دو نمازی ہوں تو مقتدی امام کے دائیں طرف اس کے برابر میں کھڑا ہو

۶۹۷ ــ حدثنا سليمان بن حرب قال : حدثنا شعبة ، عن الحكم قال : سمعت سعيد بن جبير ، عن ابن عباس رضي الله عنهما قال : بت في بيت خالتي ميمونة فصلى رسول الله ﷺ العشاء ، ثم جاء فصلى أربع ركعات ثم نام ، ثم قام فجئت فقمت عن يساره فجعلني عن يمينه فصلى خمس ركعات ، ثم صلى ركعتين ثم نام حتى سمعت غطيطه أو قال : خطيطه ، ثم خرج إلى الصلاة . [راجع : ۱۱۷]

(۵۸) باب : إذا قام الرجل عن يسار الإمام فحوله الإمام إلى يمينه لم تفسد صلاتهما

اگر کوئی شخص امام کے بائیں جانب کھڑا ہوا اور امام اس کو اپنے دائیں طرف پھیر دے تو کسی کی نماز فاسد نہ ہوگی

۶۹۸ ـ حدثنا أحمد قال : حدثنا ابن وهب قال : حدثنا عمرو عن عبد ربه بن سعيد ، عن مخرمة بن سليمان ، عن كريب مولىٰ ابن عباس عن ابن عباس رضي الله عنهما قال : نمت عند ميمونة والنبي ﷺ عندها تلك لليلة فتوضأ ثم قام يصلي فقمت عن يساره فأخذني فجعلني عن يمينه فصلى ثلاث عشرة ركعة ، ثم نام حتى نفخ وكان إذا نام نفخ ثم أتاه المؤذن فخرج فصلى ولم يتوضأ . قال عمرو : فحدثت به بكيرا فقال : حدثني كريب بذلك . [راجع : ۱۱۷] [۱۶]

(۵۹) باب: إذا لم ينو الإمام أن يؤم ثم جاء قوم فأمهم

اگر امام نے امامت کی نیت نہ کی ہو پھر کچھ لوگ آجائیں اور وہ ان کی امامت کرے

۶۹۹ ـ حدثنا مسدد قال: إسماعيل بن إبراهيم عن أيوب ،عن عبدالله بن سعيد بن جبير،عن أبيه ، عن ابن عباس قال:بت عند خالتي ميمونة فقام النبي ﷺ يصلي من الليل فقمت أصلي معه، فقمت عن يساره ، فأخذ برأسي فأقامني عن يمينه .[راجع:۱۱۷]

یہ واقعہ کئی جگہ ابواب قائم کرکے لا رہے ہیں۔ یہاں اس باب میں امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے نماز شروع کی اور پھر کسی نے پیچھے سے آکر اس کی اقتدا کی تو یہ جائز ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ مسئلہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگرچہ جس وقت اس نے تکبیر تحریمہ کہی اس وقت اس کا مقصود امامت کرنا نہیں تھا، لیکن بعد میں کچھ لوگ پیچھے کھڑے ہوگئے اور اقتدا کر لی تو اس کی اقتدا اور امام کی امامت درست ہو جائے گی اور نماز صحیح ہو جائے گی۔

[۱۶] حدیث باب کی تشریح انعام الباری: ج:۲،ص:۱۹۳، رقم الحدیث : ۱۱۷، "کتاب العلم" میں ملاحظہ فرمائیں۔

یہاں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے آپ ﷺ انہیں بائیں سے ہٹا کر دائیں طرف لے آئے اور نماز پڑھادی، اس سے پتہ چلا کہ اگر کوئی دوران نماز آ کر شامل ہو جائے تب بھی امامت کی نیت معتبر ہے۔

(٦٠) باب إذا طول الإمام و كان للرجل حاجة فخرج وصلى

اگر امام نماز کو طول دے اور کوئی شخص اپنی کسی ضرورت کی وجہ سے نماز توڑ کر چلا جائے اور نماز پڑھ لے

٧٠٠ ـ حدثنا مسلم قال : حدثنا شعبة ، عن عمرو ، عن جابر بن عبد الله : أن معاذ بن جبل كان يصلي مع النبي ﷺ ثم يرجع فيؤم قومه . [أنظر: ٧٠١، ٧٠٥، ٧١١، ٦١٠٦] [١٧]

٧٠١ ـ قال حدثني محمد بن بشار قال:حدثنا غندر قال: حدثنا شعبة عن عمرو قال: سمعت جابر بن عبد الله قال: كان معاذبن جبل يصلي مع النبي ﷺ ثم يرجع فيؤم قومه ،فصلى العشاء فقرأبالبقرة ،فانصرف الرجل فكان معاذيناول منه ،فبلغ النبي ﷺ فقال : (فتان، فتان ، فتان) ثلاث مرار أوقال: (فاتناً ،فاتناً ،فاتناً)وأمرة بسورتين من أوسط المفصل .قال عمرو: لاأحفظهما. [راجع: ٧٠٠]

یہ حضرت معاذ بن جبل ﷺ کا مشہور واقعہ ہے، امام بخاری رحمہ اللہ یہاں اس کو کئی طریقوں سے لے کر آئے ہیں کہ یہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے، پھر جا کر اپنی قوم کو نماز پڑھایا کرتے تھے۔

حضرت جابر ﷺ کی روایت میں یہ فرمایا کہ حضرت معاذ ﷺ نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے اور پھر جا کر اپنی قوم میں نماز پڑھاتے تھے۔

---

[١٧] وفي صحيح مسلم ، كتاب الصلاة ، باب القراءة في العشاء ، رقم: ٧٠٩ ،وسنن الترمذي ، كتاب الجمعة عن رسول لله ، باب ماجاء في الذى يصلي الفريضة ثم يؤم الناس بعد ماصلى ، رقم: ٥٣٢، وسنن النسائي ، كتاب الإمامة ، باب اختلاف نية الإمام والمأموم ،رقم: ٨٢٦، وسنن أبي داؤد ، كتاب الصلاة ، باب في تخفيف الصلاة ، رقم: ٦٧١، ومسند أحمد ، باقي مسند المكثرين ، باب مسند جابر بن عبد الله ، رقم: ١٣٧٢٣ ، ١٣٧٨٧ ، ١٤٤٣٢ ، وسنن الدارمي ، كتاب الصلاة ،با قدر القرأة في العشاء ،رقم: ١٢٦٣ .

ایک مرتبہ اپنی قوم میں عشاء کی نماز پڑھائی اور اس میں سورۃ البقرۃ پڑھنی شروع کردی **"فانصرف الرجل"** ایک شخص بیچ میں سے اٹھ کر چلا گیا، اس نے دیکھا کہ لمبی چوڑی نماز ہو رہی ہے تو چلا گیا۔

دو باب کے بعد روایت میں اس کی تفصیل آرہی ہے کہ وہ شخص مشقت سے دو اونٹ چلا کر آرہا تھا، اس نے دیکھا نماز ہو رہی ہے تو وہ اونٹ باندھ کر نماز میں شامل ہو گیا۔ اس نے دیکھا سورت چل رہی ہے اور نماز ختم ہی نہیں ہو رہی ہے تو اس نے سوچا کہ جماعت کے ساتھ شامل رہنا میرے لئے مشکل ہے، اس لئے وہ جماعت چھوڑ کر اپنی نماز پڑھ کر چلا گیا۔

"فكان معاذ ينال منه" حضرت معاذ ؓ ان کو برا بھلا کہتے تھے کہ نماز توڑ کر چلا گیا۔

"فبلغ النبيّ ﷺ" آپ ﷺ کو اطلاع ملی، دوسری روایت میں آتا ہے کہ اسی نے جا کر حضور اقدس ﷺ کو شکایت کی کہ حضرت معاذ ؓ اس طرح کر رہے ہیں۔

"فقال: فتّان فتّان اوقال فاتناً فاتناً فاتناً" یعنی یہ کسی مقدر کی وجہ سے منصوب ہوگا۔ **"يكون فاتنا"** کہ حضرت معاذ ؓ فتنہ پیدا کر رہے ہیں، آپ ﷺ نے حضرت معاذ ؓ کو بلا کر ڈانٹا اور **"أمر بسورتين من أو سط المفصل"**.

"اوسط مفصّل" کی دو سورتیں بتائیں کہ اس طرح کی سورتیں پڑھا کرو، یہ نہیں کہ سورۂ بقرہ پڑھنی شروع کردو۔

"قال عمرو: لا احفظهما" عمرو بن دینار جو راوی ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں وہ دونوں بھول گیا لیکن اگلی روایت میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا **"سبح اسم ربك الاعلى"** اور **"والشمس وضحها"** اس قسم کی سورتیں پڑھا کرو۔ سورۂ بقرہ تمہارے لئے نماز میں پڑھنا صحیح نہیں۔

حدیث کا اصل مفہوم تو حضرت معاذ بن جبل ؓ کو تنبیہ فرمانا ہے کہ لوگوں کی حالت کی رعایت کئے بغیر نماز کو لمبا کر دینا فتنہ پیدا کرتا ہے، اس لئے تخفیف سے کام لینا چاہئے۔ فرض کریں لوگ تو دھوپ میں کھڑے ہوئے تپ رہے ہوں اور آپ نے لمبی سورۃ پڑھنی شروع کردی اور وہ بھی تجوید کے سارے قواعد اور ساری قرأۃ عشرہ جمع کر کے، تو اس سے فتنہ پیدا ہوگا، اسی لئے فرمایا **"من امّ قوماً فليخفف"**.

امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب قائم کیا ہے **"اذا طول الامام وكان للرجل حاجة فخرج وصلى"** کہ اگر امام نماز لمبی کردے اور آدمی کو کوئی حاجت ہو اور وہ نکل کر چلا جائے۔ ظاہر یوں لگتا ہے کہ ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت معاذ ؓ کو تنبیہ فرمائی، اس آدمی کو تنبیہ نہیں فرمائی کہ تم کیوں گئے؟

اسی سے ایک دوسرے مسئلہ کی طرف بھی اشارہ فرمایا کہ بعض فقہاء مثلاً شافعیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کسی

شخص کی رائے جماعت سے نماز شروع کرنے کے بعد تبدیل ہو جائے اور وہ کسی بھی وجہ سے اس امام کے پیچھے نماز نہ پڑھنا چاہے تو اس کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہیں سے رکوع کر دے اور اپنی نماز کو منفرد کی نماز کی طرف محول کر دے' اس کیلئے اس کو سلام پھیر کر نماز توڑنے کی ضرورت نہیں ہے، یعنی پہلے تو نیت کی تھی کہ میں اس امام کے پیچھے پڑھ رہا ہوں لیکن جب دیکھا کہ بہت لمبی پڑھا رہا ہے تو وہیں سے رکوع میں چلا جائے اور منفرد کے طریقے سے اپنی نماز پوری کر دے۔

حضرات شافعیہ کہتے ہیں کہ ایسا کرنا جائز ہے اور اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ اس آدمی نے حضرت معاذ ﷜ کی نماز کو ترک کر کے اسی سابق نماز پر بنا کر کے اپنی نماز پڑھ لی۔

جمہور فقہاء فرماتے ہیں کہ ایسا کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ فرض کریں اگر انتہائی ناگزیر صورت پیش آ گئی تو اس نماز کو قطع کرے، سلام پھیر دے اور از سر نو اپنی نماز منفرداً شروع کرے، سابق پر بنا نہیں ہوگی۔ مثلاً امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھ چکے تھے، دوسری رکعت میں تھے کہ معاملہ قابو سے باہر ہو گیا تو سلام پھیر دے اور پہلی رکعت سے انفراداً شروع کرے۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے شافعیہ کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ صحیح مسلم میں اس واقعہ میں صراحت ہے کہ ان صاحب نے سلام پھیرا اور پھر مسجد کے ایک گوشے میں اپنی نماز ادا کی۔[۱۱۸]

(۶۱) باب تخفيف الإمام في القيام وإتمام الركوع والسجود

قیام میں امام کے تخفیف کرنے اور رکوع وسجود کے پورا کرنے کا بیان

۷۰۲ ۔ حدثنا أحمد بن يونس قال: حدثنا زهير قال: حدثنا إسماعيل قال: سمعت قيسا قال: أخبرني أبو مسعود: أن رجلا قال: والله يا رسول الله إني لأتأخر عن صلاة الغداة من أجل فلان مما يطيل بنا، فما رأيت رسول الله ﷺ في موعظة أشد غضبا منه يومئذ ثم قال: (إن منكم منفرين، فأيكم ما صلى بالناس فليخفف فإن فيهم الضعيف والكبير وذا الحاجة). [راجع: ۹۰]

مسلمان کا کوئی عمل حتی الامکان تنفیر کا سبب نہ بنے

یہ دوسرا واقعہ ہے، حضرت ابو مسعود انصاری ﷜ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! قسم ہے میں صبح

---

۱۱۸ .... فانحرف رجل فسلم ثم صلى وحده وانصرف الخ، صحيح مسلم، رقم: ۴۶۵، باب القراءة في العشاء، ج: ۱، ص: ۳۳۹، وفيض الباري، ج: ۲، ص: ۲۲۳، وعمدة القاري، ج: ۴، ص: ۲۳۰، وفتح الباري، ج: ۲، ص: ۱۹۳.

کی نماز سے فلاں شخص کی وجہ سے پیچھے رہ جاتا ہوں، یعنی اپنے امام صاحب کی وجہ سے **"مما یطیل بنا"** کیونکہ وہ بہت لمبی نماز پڑھاتے ہیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ یہ لمبی نماز پڑھانے والے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ تھے۔[۱۱۹]

"فما رأیت رسول الله ﷺ الخ" میں نے حضور اقدس ﷺ کو کسی موعظہ میں اتنا غضب ناک نہیں دیکھا جتنا اس دن دیکھا۔

معلوم ہوا کہ جہاں کوئی شخص دین کی ایسی تصویر پیش کرے جو لوگوں کو بہکانے والی یا نفرت دلانے والی ہو تو یہ بدترین منکر ہے اور نکیر کا مستحق ہے۔ دعوت میں اس کا لحاظ رکھنے کی بہت ضرورت ہے، تمام داعیوں کو اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ وہ تنفیر کا سبب نہ بنیں، لوگوں کو گھیر گھیر کر بٹھائے، کسی کو ضرورت ہے، کسی کو حاجت ہے اور آپ نے زبردستی بٹھا دیا تو یہ تنفیر کا سبب بنے گا۔

وہاں تو حال یہ ہے کہ آنے والا کہہ رہا ہے **"عظنی یا رسول الله و أوجز"** کہ مجھے نصیحت فرمایئے، اور مختصر نصیحت فرمایئے۔ خود مختصر ہونے کی قید لگا رہا ہے۔

حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا، او خدا کے بندے! نصیحت بھی مانگتے ہو اور میرے اوپر قیدیں اور شرطیں بھی عائد کرتے ہو کہ مختصر نصیحت کرو۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ مختصر چاہتے ہو تو مختصر ہی سنو، فرمایا **"لا تغضب"** بس یہ نصیحت ہے۔ تو جیسا موقع اور محل ہے ایسی بات کرو، اس کے مطابق کام کرو۔ دعوت کا بھی محل دیکھو کہ یہ موقع ہے یا نہیں۔

بعض مرتبہ کسی جگہ سکوت اختیار کر لینا، تسامح کر جانا بھی مفید ہوتا ہے، بات کرنے کے لئے بعد میں کسی مناسب موقع کو تلاش کیا جاتا ہے۔ حضرت مولانا الیاس رحمہ اللہ؛ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائیں، ان کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب تھے حضرت کے پاس آتے تھے، کافی مانوس بھی ہو گئے تھے، وہ آتے نماز وغیرہ پڑھ لیتے، ان کے چہرہ پر داڑھی نہیں تھی۔ حضرت نے دیکھا بے چارہ کافی دنوں سے آتا ہے ایک دن کہا، بھائی! تمہارے چہرہ پر حضور ﷺ کی سنت کے آثار نہیں ہیں، وہ خاموش ہو گیا اور اس کے بعد دوبارہ نہیں آیا۔

حضرت نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ میں نے کچے توے پر روٹی ڈال دی، مطلب یہ ہے کہ ابھی اس بات کا موقع نہیں آیا تھا، ابھی اس کے اندر ایمان کی گرمی مزید پیدا کرنا مقصود تھی، تب وہ اس مرحلہ پر آتا۔ میں نے پہلے ہی یہ بات کہہ دی۔

---

[۱۱۹] قیل هو معاذ رضی الله عنه ، وقیل هو أبی رضی الله عنه لأنها واقعة الفجر ،وتطویل معاذ رضی الله عنه فی کان العشاء ومن یراهما متحداً یلتزم ان معاذا رضی الله عنه طول فیهما ، ومن جعلها قصة أبی رضی الله عنه ثم رأی جملة فان منکم منفرین الخ فی حدیث معاذ رضی الله عنه حکم بکونها وهماً فی حدیثه ، وصنیع البخاری یدل علی أنها ثابتة عنده وخالفه الحافظ رحمه الله تعالیٰ وقال انها وهم فی قصة معاذ رضی الله عنه .فیض الباری ،ج: ۲، ۲۳۲.

تو داعی کو یہ سب باتیں پیش نظر رکھنی پڑتی ہیں، اس کا نام ہے "**ادع الیٰ سبیل ربک با لحکمة والموعظة الحسنة**" اس لئے کوئی بھی ایسا اقدام جو لوگوں کی تنفیر کا سبب بنے، اس سے بچنا چاہئے۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ لوگوں کو تنفیر سے بچانے کے لئے خود کسی گناہ کا ارتکاب کرنا درست نہیں ہے، اپنے آپ کو گناہ سے بچانا واجب ہے، خواہ اس سے لوگ بھاگیں، برگشتہ ہوں یا خوش ہوں اس کی پرواہ نہیں ہے۔

یہ بڑا نازک کام ہے یہ پل صراط ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے کہ کس وقت انسان کیا طرز عمل اختیار کرے اور یہ صرف کتاب پڑھنے سے نہیں آتا یہ صحبت سے آتا ہے۔ اللہ ﷻ نے جن کو تفقہ فی الدین کا ملکہ عطا فرمایا ہے ان کی صحبت سے یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ کس مرحلہ پر کیا کام کروں؟ کہاں لچک پیدا کروں؟ کہاں ڈٹ جاؤں؟ اس کا فیصلہ بہت مشکل ہے۔ اللہ ﷻ کی خاص توفیق ہی ہوتی ہے، جس سے انسان اس بارے میں صحیح فیصلہ کرتا ہے ورنہ کبھی ڈگمگا جاتا ہے، کبھی ایسی لچک دے دیتا ہے جو مداہنت میں شامل ہوگئی، کبھی ایسا ڈٹ گیا اور اڑ گیا کہ تنفیر میں شامل ہوگیا، اس واسطے یہ باتیں صحبت میں رہ کر سیکھنے سے آتی ہیں۔

(۶۲) بابٌ : اذا صلى لنفسه فليطوّل ماشاء

جب کوئی شخص تنہا نماز پڑھے تو جس قدر چاہے طول دے

۷۰۳ ـ حدثنا عبد الله بن يوسف قال: أخبرنا مالك ، عن أبي الزناد ، عن الأعرج، عن أبي هريرة أنّ رسول الله ﷺ قال: ((اذا صلّى أحدكم للناس فليخفف فانّ منهم الضعيف والسقيم والكبير . واذا صلّى أحدكم لنفسه فليطوّل ماشاء)).

اذا صلّى أحدكم للناس فليخفف....

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تخفیف صلاۃ کا تعلق صرف قراءت سے ہے، دوسرے ارکان کی ادائیگی سے نہیں، لہٰذا رکوع وسجود میں تین سے زائد تسبیحات پڑھنا بلا کراہت جائز ہے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ سے دس تسبیحات کی مقدار رکوع وسجود میں ثابت ہے، نیز قراءت میں تخفیف کا مطلب یہ ہے کہ ہر نماز میں قدر مسنون سے آگے نہ بڑھے، لہٰذا فجر میں طوال مفصل پڑھنا تخفیف کے خلاف نہیں، لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ قراءت میں تغنی کی خاطر زیادہ دیر لگانا تخفیف کے خلاف ہے۔[۱۲۰]

[۱۲۰] اراد أن ينبه على محل التخفيف وهو القيام فيطول فيه ويقصر بحسب التارات والحالات، أما الركوع والسجود فيعمهما في كل حال قلت: ويعلم من سنة النبي ﷺ وهديه أنه كان لركوعه وسجوده مقداراً محدوداً بخلاف القيام فانه كان يختلف باختلاف الأحوال ، ثم ان هذا في الفرائض بقيت صلاة الليل فكان ركوعها وسجودها وقيامها كلها غير منتظمة لأنها كانت صلاته لنفسه والرجل مخير فيها ، فيض البارى ، ج: ۲، ص: ۲۳۲.

(۶۳) باب من شكا إمامه إذا طوّل،

جو شخص اپنے امام کی جب وہ نماز میں طوالت کرتا ہو شکایت کرے

وقال أبو أسيد: طوّلت بنا يابنيّ۔

اس باب میں امام بخاری رحمہ اللہ یہ بتا رہے ہیں کہ ایسے موقع پر امام کی شکایت کرنا بھی جائز ہے، یہ نہ ہو کہ مقتدی یہ سوچیں کہ اگر میں اپنے امام کی شکایت کروں گا تو آخرت میں پکڑا جاؤں گا۔

ایک مرتبہ ابواسید کے بیٹے نے امامت کروائی تو انہوں نے کہا **"طوّلت بنا يابنيّ"** اے بیٹے! تو نے بہت لمبی نماز پڑھی۔

مجھے یاد ہے ایک مرتبہ سفر کر رہے تھے، ٹرین جنگل میں رُک گئی، مغرب کا وقت تھا، بہت سارے لوگ موجود تھے، جماعت والے، مدرسوں والے اور دیگر لوگ بھی، سوچا ٹرین ٹھہر گئی ہے، نیچے اتر کر نماز پڑھ لیں جماعت ہو جائے گی کیونکہ ٹرین میں جماعت کرنا مشکل کام تھا۔

چنانچہ ایک آدمی کو آگے کر دیا اس نے **"لم يكن الذين"** بڑی تجوید کے ساتھ شروع کر دی، ابھی **"لم يكن" الخ** ختم نہیں ہوئی تھی کہ گاڑی چل پڑی۔ اب سب نماز توڑ توڑ کر بھاگنے لگے، تو یہ اس نے بے موقع کام کیا۔ ایسے میں **"والعصر"** اور **"انا اعطينك الكوثر"** پڑھ کر نماز پوری کرنی چاہئے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا واقعہ ہے کہ فجر کی نماز میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کو کھڑا کیا اور سورج نکلنے کے قریب تھا، انہوں نے معوذتین پڑھ کر نماز ختم کر دی۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا **"صار يعقوبنا فقيها"** کہ ہمارے یعقوب فقیہ ہو گئے۔

۷۰۴ ۔ حدثنا محمد بن يوسف قال: حدثنا سفيان عن اسماعيل بن أبي خالد، عن قيس بن أبي حازم، عن أبي مسعود قال: قال رجل: يا رسول الله إني لا تأخر عن الصلاة في الفجر مما يطيل بنا فلان فيها، فغضب رسول الله ﷺ، ما رأيته غضب في موضع كان أشد غضبا منه يؤمئذ. ثم قال: ((يا أيها الناس، إن منكم منفرين. فمن أم الناس فليتجوز، فإن خلفه الضعيف والكبير وذا الحاجة)). [راجع: ۹۰]

ما رأيته غضب في موضع كان أشد غضبا منه يؤمئذ۔

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کسی نصیحت کے وقت اتنا غصہ میں نہیں دیکھا جتنا اس دن دیکھا، آپ ﷺ اس بات سے بڑے ناراض ہوئے اور فرمایا **"يا أيها الناس"** اے لوگو! تم

لوگوں کو نمازوں اور احکام شرعیہ سے نفرت دلانے والے ہو، **"فمن أم الناس فليتجوز"** جو امام لوگوں کو نماز پڑھائے تو وہ ہلکی اور اختصار کے ساتھ نماز پڑھائے۔

فإن خلفه الضعيف والكبير وذا الحاجة ۔

کیونکہ مقتدیوں میں کچھ بیمار بھی ہوتے ہیں، کمزور بھی ہوتے ہیں، حاجت مند بھی ہوتے ہیں جن کو جلدی سے اپنے کام سے جانا ہے، اس لئے اتنی لمبی قراءت کرنا جس سے لوگوں کو دشواری ہو، یہ تمہارے لئے جائز نہیں، اگر کروگے تو تنفیر یعنی لوگوں کو شریعت سے نفرت دلانے کا گناہ ہوگا۔ حضرت ابومسعود ﷺ فرماتے ہیں کہ جتنا غصہ اس دن آپ ﷺ نے فرمایا اتنا غصہ کرتے ہوئے میں نے آپ ﷺ کو کبھی نہیں دیکھا۔

معلوم ہوا کہ شریعت کا کوئی کام ایسے بے تکے انداز میں انجام دینا جس سے لوگوں کو ترغیب کے بجائے تنفیر ہو وہ حضور ﷺ کو اتنا ناپسند تھا کہ آپ ﷺ نے اتنا غصہ کسی بات پر نہیں فرمایا جتنا اس پر فرمایا، کیونکہ آدمی جو کر رہا ہے وہ سمجھ رہا ہے کہ میں شریعت کے مطابق کر رہا ہوں اور اللہ ﷻ کو راضی کرنے کے لئے کر رہا ہوں، لیکن حقیقت میں وہ لوگوں کو شریعت سے بھگا رہا ہے، اس واسطے ایک مسلمان کو شریعت پر اس طرح عمل کرنا چاہئے کہ جس سے لوگوں کو تنفیر نہ ہو بلکہ ترغیب ہو۔[۱۲۱]

(۶۴) باب الإيجاز في الصلاة و إكمالها

نماز کو مختصر اور پورے طور پر پڑھنے کا بیان

۷۰۶ ۔ حدثنا أبو معمر قال: حدثنا عبد الوارث قال: حدثنا عبد العزيز عن أنس قال: كان النبي ﷺ يوجز الصلاة ويكملها .[۱۲۲]

"يوجز" اختصار بھی ہے، لیکن ساتھ ساتھ کمال بھی ہے کہ کوئی کوتاہی نہیں ہے۔ جتنی قرأت مسنون ہے، وہ بھی لیکن ساتھ ساتھ ایجاز بھی ہے۔

---

۱۲۱ مزید تشریح ملاحظہ فرمائیں: انعام الباری، ج:۲، ص:۱۲۲، رقم: ۹۰، کتاب العلم.

۱۲۲ وفي صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب أمر الأئمة بتخفيف الصلاة في تمام، رقم: ۷۱۹، وسنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ماجاء اذا أم أحدكم الناس فليخفف، رقم: ۲۲۰، وسنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب طول القيام من الركوع بين السجدتين، رقم: ۷۲۷، وسنن ابن ماجه، كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها، باب من أم قوما فليخفف، رقم: ۹۷۵، ومسند أحمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند أنس بن مالك، رقم: ۱۱۵۲۹، ۱۱۵۵۲، ۱۲۲۷۳، ۱۲۳۱۱، ۱۲۳۷۷، ۱۲۹۳۴، ۱۳۰۸۸، ۱۳۳۱۸، وسنن الدارمي، كتاب الصلاة، باب ما أمر الإمام من التخفيف في الصلاة، رقم: ۱۲۳۲.

حضور اقدس ﷺ لمبی لمبی سورتیں بھی پڑھتے تھے لیکن رواں پڑھتے تھے تا کہ زیادہ دیر نہ لگے۔ حرمین شریفین کے ائمہ اس کا بہترین نمونہ پیش کرتے ہیں، کہ لمبی سورتیں بھی پڑھتے ہیں لیکن رواں پڑھتے ہیں کہ اس میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔

۷۰۸ ـ حدثنا خالد بن مخلد قال: حدثنا سليمان بن بلال قال: حدثني شريک بن عبدالله قال: سمعت أنس بن مالک يقول: ماصليت وراء إمام قط أخف صلاة ولا أتم من النبي ﷺ وإن كان ليسمع بكاء الصبي فيخفف مخافة أن تفتن أمه.

خالد بن مخلد قطوانی کے بارے میں کتب رجال بھری ہوئی ہیں کہ یہ ضعیف راوی ہیں، ائمۂ جرح وتعدیل اور اکثر لوگوں نے ان کو ضعیف کہا ہے۔

اس بنیاد پر دو قسم کی غلطیاں پیدا ہوئی ہیں:

بعض لوگوں نے اس وجہ سے یہ اعتراض کیا کہ بخاری شریف کے بارے میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی ساری حدیثیں صحیح ہیں، یہ کہنا صحیح نہیں اس لئے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ایسے ضعیف راویوں کی احادیث بھی لی ہیں۔

دوسری طرف جن لوگوں نے امام بخاری رحمہ اللہ پر بھروسہ کیا تو ان سے یہ غلطی ہوئی کہ خالد بن مخلد سے امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت لی ہے اس لئے انہوں نے کہا ہم بھی لیتے ہیں، چنانچہ امام حاکم رحمہ اللہ سے مستدرک میں یہی غلطی ہوئی ہے انہوں نے یہ دیکھ کر کہ خالد بن مخلد کی تمام روایات کو صحیح سمجھ لیا اور چونکہ یہ رجال بخاری میں سے ہیں، اس لئے ان کی ساری روایات کو صحیح علیٰ شرط البخاری سمجھ لیا۔

لیکن واقعہ یوں ہے کہ خالد بن مخلد مختلف فیہ راوی ہیں اور امام بخاری رحمہ اللہ نے ان کی صرف وہ روایات لی ہیں جن کے بارے میں ان کو انفرادی طور پر اطمینان ہو گیا تھا کہ صحیح ہیں اور سلیمان بن بلال سے روایات نقل کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرے راویوں سے بھی ان کی روایتیں صحیح ہوں۔

امام حاکم رحمہ اللہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ متساہل ہیں اور تساہل کے اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ یہ آدمی بخاری کا راوی ہے، لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے ان سے کن حالات میں روایت لی تھی اور وہ کن حالات میں لے رہے ہیں اس طرف نظر نہیں کر پاتے۔

۷۰۹ ـ حدثنا علي بن عبد الله قال: حدثنا يزيد بن زريع قال: حدثنا سعيد قال: حدثنا قتادة أنس بن مالک حدثه: أن نبي الله ﷺ قال: (إني لأدخل في الصلاة وأنا أريد إطالتها فأسمع بكاء الصبي فأتجوز في صلاتي مما أعلم من شدة وجد أمه من بكائه). [أنظر: ۷۱۰]

دوسروں کو تکلیف سے بچانا، تکلیف سے جسمانی ہی نہیں بلکہ ذہنی تشویش بھی مراد ہے، کسی ذہنی تشویش میں مبتلا کرنا، اس سے بچنے کا اہتمام آپ کو ایک ایک سنت میں نظر آئے گا، بچہ رو رہا ہے تو آپ ﷺ نے نماز مختصر کردی کہ ماں کو تشویش ہوگی۔ جب نماز جیسے فریضہ میں آپ ﷺ نے اس بات کا اتنا اہتمام فرمایا تو عام زندگی میں اس کی کتنی اہمیت ہوگی؟

مگر ہمارے دماغ سے یہ پہلو بالکل ہی مٹ گیا ہے، اپنی ذات میں سوچ رہے ہیں کہ دوسرے کو تکلیف میں مبتلا کریں گے، اس کا خیال نہیں ہوتا کہ ہم کتنے بڑے گناہ کا ارتکاب کررہے ہیں۔

(٦٦) باب: إذا صلى ثم أم قوما

جب خود فرض پڑھ چکا ہو اس کے بعد لوگوں کی امامت کرے

۷۱۱ ۔ حدثنا سليمان بن حرب وأبو النعمان قالا: حدثنا حماد بن زيد، عن أيوب، عن عمرو بن دينار، عن جابر قال: كان معاذ يصلي مع النبي ﷺ ثم يأتي قومه فيصلي بهم. [راجع ۷۰۰]

یہ حدیث پہلے بھی گزر چکی ہے، مختلف مقاصد کے لئے اس پر مختلف تراجم قائم کئے ہیں۔

"اقتداء المفترض خلف المتنفل" کا حکم

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ نے جو ترجمۃ الباب قائم کیا ہے وہ **"اقتداء المفترض با لمتنفل"** سے متعلق ہے یعنی اس حدیث سے استدلال فرمایا ہے کہ اگر ایک شخص نے فرض نماز ادا کرلی اور پھر دوسری جگہ جا کر امامت کی، خود نفل کی نیت کی جبکہ مقتدی فرض کی نیت سے پڑھ رہے ہوں تو یہ اقتدا درست ہو جائے گی، اس کو **"اقتداء المفترض با لمتنفل"** کہتے ہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ اس کے قائل ہیں اور بظاہر امام بخاری رحمہ اللہ بھی اس کے قائل معلوم ہو رہے ہیں۔

حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

شافعیہ کا استدلال اس سے ہے **"انما جعل الإمام ليؤتم به"** کہ امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے۔ شافعیہ کہتے ہیں کہ اقتداء صرف افعالِ ظاہرہ میں ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ جب افعال ظاہرہ میں اقتدا ہے تو نیت جو اصل چیز ہے **"انما الأعمال بالنيّات"** اگر اس میں اقتدا نہیں ہے، ایک مشرق کو جا رہا ہے دوسرا مغرب کو جا رہا ہے، تو پھر وہ اقتدا کیسی ہوئی؟

تو اصل چیز نیت ہے اس میں اقتدا ہونی چاہئے "**انما جعل الامام لیؤتم به**" ہر چیز میں اقتداء ہو گی بشمول نیتِ اقتداء۔

دوسری بات یہ ہے کہ "**الامام ضامن**" امام ضامن ہے اور اصول یہ ہے "**ان الشیء لاتضمّن مافوقه**" کہ شئی اپنے مافوق کی ضامن نہیں ہوتی، اس سے بھی پتہ چلا کہ "**اقتداء المفترض بالمتنفل**" درست نہیں ہے۔

جہاں تک حضرت معاذ ﷛ والے واقعہ کا تعلق ہے تو حنفیہ کی طرف سے اس کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں۔

اصولی طور پر اتنا سمجھ لیجئے کہ حنفیہ جن اصول سے استدلال کر رہے ہیں وہ قواعد کلیہ ہے "**إنما جعل الامام لیؤتم به**" اور "**الإمام ضامن**" وغیرہ۔

اور حضرت معاذ ﷛ کا واقعہ واقعۂ جزئیہ ہے جس میں بہت سے احتمالات ہیں:

مثلاً حضرت معاذ ﷛ حضور اقدس ﷺ کے ساتھ جو نماز پڑھتے تھے وہ نفل کی نیت سے پڑھتے ہوں اور اپنی قوم کو جا کر فرض پڑھاتے ہوں۔

اس کے جواب میں بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ ایک روایت میں یہ الفاظ موجود ہیں کہ "**ھی لھم فریضة وله تطوّع**" کہ جب جا کر قوم کو نماز پڑھاتے تھے تو وہ قوم کے لئے فریضہ ہوتا تھا اور حضرت معاذ ﷛ کے لئے نفل ہوتا تھا۔ لیکن یہ جملہ اصل حدیث میں موجود نہیں ہے، راوی کا ادراج ہے۔ راوی عمر بن دینار یا ابن جریج میں سے کسی نے یہ لفظ بڑھا دیا۔ اب ان کو کہاں سے پتہ چلا کہ حضرت معاذ ﷛ کی نیت کیا تھی؟

لہٰذا یہ محض ان کا گمان ہے، اندر کی نیت کا کسی کو پتہ نہیں اس لئے اس وجہ سے یہ کہنا کہ حضرت معاذ ﷛ وہاں قوم کے ساتھ نفل پڑھتے تھے اور یہاں فرض پڑھتے تھے، اس کا کوئی جواز نہیں، تو عین ممکن ہے کہ وہ وہاں نفل پڑھتے ہوں اور قوم کو فرض پڑھاتے ہوں، یہ احتمال موجود ہے۔[۱۲۳]

قوی احتمال یہ ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھتے تھے اور قوم کو عشاء کی نماز پڑھاتے تھے یہاں کسی روایت میں یہ نہیں ہے "**یصلی مع النبیّ ﷺ العشاء**" اس کے برخلاف ترمذی میں اس کی صراحت موجود ہے "**یصلی مع النبیّ ﷺ المغرب**" بعض روایات میں آیا ہے "**یصلی بھم تلک الصلوة**"

"**یصلّی بھم تلک الصلوة**" سے لوگوں نے یہ بات نکالی کہ جو نماز عشاء کی حضور ﷺ کے ساتھ پڑھتے تھے وہی آ کر اپنی قوم کو بھی پڑھاتے تھے لیکن "**تلک الصلوة**" کے یہ معنی بھی ہوتے ہیں کہ جیسی نماز وہاں پڑھی ویسی ہی پڑھائی، یعنی صفتِ صلوۃ وہ ویسی ہی تھی، یہ مطلب نہیں کہ بعینہ وہی نماز تھی۔

---

۱۲۳ عمدة القاری، ج:۴، ص: ۲۳۱.

جواب ”على سبيل التسليم“

اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ کسی ایک واقعہ میں ایسا بھی ثابت ہے کہ عشاء کی نماز حضور اقدس ﷺ کے ساتھ پڑھی اور عشاء ہی کی نماز آ کر اپنی قوم کو پڑھائی اور وہاں فرض کی نیت کی یہاں قوم کو پڑھاتے وقت نفل کی نیت کی، تو اس پر حضور اقدس ﷺ کی تقریر ثابت نہیں بلکہ نکیر ثابت ہے۔

ابھی پیچھے روایت گزری ہے جس میں ہے کہ قرأت کیوں لمبی کی؟ لیکن مسند احمد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے پہلے ان کی لمبی قرأت پر نکیر فرمائی پھر فرمایا **”إما أن تصلی معی وإما أن تخفف علی قومک“** یا تو میرے ساتھ نماز پڑھو یا پھر اپنی قوم کے ساتھ تخفیف سے کام لو۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ یا تو میرے ساتھ نماز پڑھو یا ان کو پڑھا کر تخفیف سے کام لو تو پھر میرے ساتھ نہ پڑھو۔ تو اس میں آپ ﷺ نے ان کے اس عمل پر نکیر فرمائی کہ میرے ساتھ بھی پڑھو اور وہاں جا کر بھی پڑھاؤ۔ اس پر تقریر نہیں نکیر ثابت ہے۔

اس واسطے اس واقعہ سے **”صلوة المفترض خلف المتنفل“** ثابت نہیں اور اس کے مقابلہ میں اصول کلیہ راجح ہیں۔ علامہ ابن بطال رحمہ اللہ نے اس کا ایک جواب یہ بھی دیا ہے کہ یہ ابتداء اسلام کا واقعہ ہو سکتا ہے جب قراء کی کمی تھی، پھر امام طحاوی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ یہ اس دور کا واقعہ ہو سکتا ہے جب فرض دو مرتبہ پڑھنا جائز تھا، امام طحاوی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث روایت کی ہے کہ:

”ان رسول الله ﷺ نهى ان نصلى فريضة فى يوم مرّتين“.

امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: **”النهى لا يكون الا بعد الا باحة“.** [۱۲۴]

(۶۷) باب من أسمع الناس تكبير الإمام

اس شخص کا بیان جو مقتدیوں کو امام کی تکبیر سنائے

۷۱۲ - حدثنا مسدد قال: حدثنا عبد الله بن داؤد قال: حدثنا الأعمش، عن إبراهيم، عن الأسود، عن عائشة رضي الله عنها قالت: لما مرض النبي ﷺ مرضه الذي مات فيه أتاه بلال يؤذنه بالصلاة، فقال: ((مروا أبا بكر فليصل بالناس)) قلت: أبا بكر رجل أسيف، إن يقم مقامک يبک فلا يقدر على القرائة. قال: ((مرو أبابكر فليصل))،

---

[۱۲۴] شرح ابن بطال، ج:۲، ص:۳۳۷.

فقلت مثله ، فقال في الثالثة أو الرابعة : ((إنكن صواحب يوسف ،مروا أبابكر فليصل)) فصلى وخرج النبي ﷺ يهادىٔ بين رجلين كأني أنظر إليه يخط برجليه الأرض ، فلما رآه أبو بكر ذهب يتأخر فأشار إليه أن صل ،فتأخر أبوبكر ﷺ وقعد النبي ﷺ إلى جنبه وأبو بكر يسمع الناس التكبير .تابعه محاضر عن الأعمش .[راجع:۱۹۸]

یہاں صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اگر بیچ میں مکبر کھڑے ہو جائیں جیسا کہ طریقہ ہوتا ہے اور وہ امام کی تکبیرات کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے زور سے تکبیریں کہیں تو یہ جائز ہے، حضرت صدیق اکبر ؓ زور سے تکبیریں کہتے تھے تا کہ دوسرے لوگ سنیں۔

(۶۸) باب الرجل يأتم بالإمام .ويأتم الناس بالمأموم،

اگر ایک شخص امام کی اقتدا کرے اور باقی لوگ اس مقتدی کی اقتدا کریں

"ويذكر عن النبي ﷺ: ((ائتموا بي وليأتم بكم من بعد كم))".

۷۱۳ ـ حدثني قتيبة قال: حدثنا أبو معاوية ،عن الأعمش ،عن إبراهيم ،عن الأسود ، عن عائشة قالت: لما ثقل رسول الله ﷺ جاء بلال يؤذنه بالصلاة .فقال: (مروا أبابكر يصلي بالناس) فقلت: يا رسول الله إن أبابكر رجل أسيف ،وإنه متى مايقم مقامك لا يسمع الناس ، فلو أمرت عمر . فقال: مرو أبابكر أن يصلي بالناس)،فقلت لحفصة :قولي له:إن أبابكر رجل أسيف .وإنه متى يقم مقامك لم يسمع الناس فلوأمرت عمر. فقال:(إنكن لأنتن صواحب يوسف ،مروا أبابكر أن يصلي بالناس).فلما دخل في الصلاة وجد رسول الله ﷺ حتى جلس عن يسار أبي بكر ،فكان أبو بكر يصلي قائما . وكان رسول الله ﷺ يصلي قاعدا،يقتدى أبوبكر بصلاة رسول الله ﷺ والناس يقتدون بصلاة أبي بكر ﷺ .[راجع:۱۹۸]

یہاں پھر مرض وفات والی حدیث لائے ہیں جو پہلے بھی کئی بار لا چکے ہیں۔

اقتداء "بالتسلسل" کا حکم اور منشأ بخاریؒ

علامہ عینی فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمہما اللہ کا یہاں اس حدیث کو لانے کا منشأ حضرت امام شعبی رحمہ اللہ کے مذہب کی طرف اپنا میلان ظاہر کرنا ہے۔

حضرت امام شعبی رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر مجمع لمبا ہو اور بیچ میں مکبّر موجود ہوں تو یہ اقتداء بالتسلسل ہوگی کہ پہلی صف کے لوگ امام کی اقتداء کریں گے اور دوسری صف کے لوگ پہلی صف کی اور تیسری صف کے لوگ دوسری صف کی "**وهلم جرّا**"۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی شخص آ کر آخری صف میں شامل ہوا اس حال میں کہ امام تو رکوع سے اٹھ چکا ہے لیکن آخری صف سے اگلی صف ابھی رکوع میں ہی ہے، آنے والا شخص اس صف کو دیکھ کر رکوع کے لئے جھک گیا، اب امام اگرچہ کھڑا ہو چکا ہے لیکن پھر بھی اس شخص کو مدرک رکوع اور مدرکِ رکعت کہیں گے کیونکہ اقتداء بالتسلسل ہوتی ہے آخری صف اگلی صف کی اقتدا کر رہی ہے اور وہ ابھی رکوع کی حالت میں ہے۔ اس لئے وہ مدرکِ رکوع ہے۔

علامہ عینی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ اس باب سے امام شعبی رحمہ اللہ کے مذہب کی طرف میلان ظاہر کر رہے ہیں۔

علامہ عینی رحمہ اللہ نے امام شعبی رحمہ اللہ کا یہ مسلک نقل کیا ہے اور "فیض الباری" میں ابن جریر طبری رحمہ اللہ کا مسلک بھی یہی بیان کیا ہے۔[۱۲۵]

فرمایا" **باب الرجل يأتم بالإمام ويأتم الناس بالمأموم**" ایک آدمی تو امام کی اقتدا کر رہا ہے اور باقی لوگ اس مقتدی کی اقتدا کر رہے ہیں " **ويذكر عن النبي ﷺ: ائتموا بي و ليأتم بكم من بعد كم** " اور نبی کریم ﷺ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: تم میری اقتدا کرو اور مجھ سے پیچھے تمہاری اقتدا کریں گے۔ اس کے بعد حدیث لے کر آئے ہیں جس کے آخر میں ہے "**يقتدى أبو بكر بصلاة رسول الله ﷺ و الناس يقتدون بصلاة أبي بكر ﷺ**"۔

علامہ عینی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام بخاری کا مقصود شعبی اور ابن جریر رحمہم اللہ کے مذہب کی تائید کرنا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ منشا نہیں ہے، شعبی رحمہ اللہ اور ابن جریر کا اپنا تفرد ہے۔

جمہور کا قول یہ ہے کہ سب امام کے مقتدی ہیں، لہٰذا آخری صف والوں سمیت سب امام کی حرکات کا اعتبار کریں گے، اس پر اتفاق ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ سے اس کی توقع نہیں ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ میں شعبی رحمہ اللہ اور ابن جریر کا ساتھ دیا ہوگا۔[۱۲۶]

حدیث "**وليأتم بكم من بعد كم**" کے معنی یہ ہیں کہ تم میری نماز دیکھ کر اپنی نمازوں میں اس کی

---

۱۲۵ عمدة القاری، ج: ۴، ص: ۳۴۷، و فیض الباری، ج: ۲، ص: ۲۳۴.

۱۲۶ فتح الباری، ج: ۲، ص: ۲۰۴.

اقتدا کرو یعنی اس جیسی نماز پڑھو اور تمہیں دیکھ کر تمہارے بعد آنے والے اقتدا کریں یعنی تمہاری جیسی نماز پڑھیں۔ تو اس میں مقصود نماز کے طریقے میں اتباع ہے نہ کہ "اقتداء الصلواة".

(۶۹) باب: هل يأخذ الإمام ـ إذا شک ـ بقول الناس؟

امام کو جب شک ہو جائے تو کیا وہ مقتدیوں کے کہنے پر عمل کرے

۷۱۴ ـ حدثنا عبدالله بن مسلمة ،عن مالک بن أنس ،عن أيوب بن أبي تميمة السختياني ،عن محمد بن سيرين ،عن أبي هريرة :أن رسول الله ﷺ انصرف من اثنتين ، فقال له ذواليدين : أقصرت الصلاة أم نسيت يا رسول الله؟ فقال رسول الله ﷺ «اصدق ذواليدين» فقال الناس :نعم ، فقال رسول الله ﷺ فصلى اثنتين أخريين ثم سلم ثم كبر فسجد مثل سجوده أو أطول. [راجع: ۴۸۲]

یہ ذوالیدین کے واقعہ کی حدیث ہے، اس میں اصل مسئلہ فقہیہ کلام فی الصلوۃ کا ہے جو ان شاء اللہ اپنے موقع پر آئے گا۔

واقعہ ذوالیدین سے مقصود بخاریؒ

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ اس کو ایک اور مسئلہ بیان کرنے کے لئے لائے ہیں کہ اگر امام کو نماز کی رکعات کی تعداد میں شک ہو جائے تو آیا وہ لوگوں کے قول پر عمل کرے یا نہیں؟ اور استفہام کے ساتھ ترجمۃ الباب اس لئے قائم کیا ہے کہ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ ایسی صورت میں امام مقتدی کے کہنے کا پابند نہیں، جب تک اس کو خود یقین نہ ہو جائے کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے اس وقت تک وہ غلطی کی تلافی کا پابند نہیں، چاہے ساری جماعت مل کر کہہ رہی ہو کہ آپ سے غلطی ہوگئی ہے۔

مثال کے طور پر ساری جماعت کہہ رہی ہے کہ آپ نے تین رکعات پڑھی ہیں اگر اس کو یقین نہیں آیا اور وہ سمجھتا ہے کہ میں نے چار رکعات پڑھی ہیں تو اس کو چار رکعات ہی سمجھ کر اپنی نماز ختم کر دینے کا اختیار ہے، جب تک اس کو خود یقین نہ آجائے چاہے ایک کہے، دو کہیں یا دس کہیں یا پوری جماعت کہے، اس کا اعتبار نہیں، یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک ہے اور علامہ عینی رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ کا صحیح مذہب بھی یہی نقل کیا ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ ایک روایت میں یہ فرماتے ہیں کہ اگر اس کے سامنے ایک یا دو آمیوں نے کہا تو ان کے قول کا اعتبار کرنا اس کے اوپر واجب نہیں ہے لیکن اگر پوری جماعت کہہ رہی ہے تو پھر ان کے قول کا اعتبار کرنا

چاہئے، چاہے اس کو خود کچھ یاد نہ آیا ہو۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ یہ کہتے ہیں کہ اگر دو عادل آدمی یہ کہہ دیں تو امام کو چاہئے کہ وہ اس کو مانے، چاہے یاد آیا ہو یا نہ آیا ہو۔[۱۲۷]

اور علامہ ابن بطال رحمہ اللہ کے کلام سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔[۱۲۸]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام کی حالت دو حال سے خالی نہیں، ایک حال یہ ہے کہ امام کو سو فیصد یقین ہو، تب تو لوگوں کے کہنے کا کوئی اعتبار نہیں۔ لیکن اگر امام کو شک ہو دو مقتدی کہیں کہ نماز میں نقص رہ گیا ہے تو اعادہ واجب ہوگا۔[۱۲۹]

مقصد بخاری رحمہ اللہ

یہاں جب حضرت ذوالیدین ﷺ نے کہا تو آپ ﷺ نے پوچھا، معلوم ہوا کہ دوسرے لوگوں کی رائے معلوم کرنا اور پوچھنا مشروع ہے، یہی بیان کرنے کے لئے امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب قائم فرمایا۔

(۷۰) باب : إذا بكى الإمام في الصلاة

جب امام نماز میں روئے

" و قال عبد الله بن شداد : سمعت نشيج عمر و أنا في آخر الصفوف فقرأ ﴿إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَ حُزْنِي إِلَى اللهِ﴾ [يوسف:۱۸]

"بکاء فی الصلاۃ" کا حکم

رونا اگر کسی تکلیف یا مصیبت کی وجہ سے ہو تو مفسدِ صلوۃ ہے لیکن اگر خوف اور خشیت کی وجہ سے ہو تو نہ صرف یہ کہ مفسدِ صلوۃ نہیں ہے، بلکہ مطلوب ہے۔

اس میں حضرت عبداللہ بن شداد ﷺ کا اثر نقل کیا ہے کہ میں حضرت عمر ﷺ کی "نشیج" یعنی سسکیوں کی آواز سنتا تھا جبکہ میں آخری صف میں ہوتا تھا۔ آپ نماز پڑھا رہے ہوتے تھے اور اس کے اندر پڑھ رہے ہوتے تھے " اِنَّمَا اَشْكُوْ بَثِّي وَ حُزْنِي اِلَى الله " یعنی قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہوئے رو رہے

---

۱۲۷ المغني، ج : ۱، ص : ۳۸۰، دار الفكر، بيروت، سنة النشر ۱۴۰۵ هـ.

۱۲۸ شرح ابن بطال، ج: ۲، ص: ۲۴۳،۳۴۲.

۱۲۹ لامع الدراری، ص: ۲۷۸، ج : ۱.

ہوتے تھے اور میں ان کی سسکیوں کی آواز صف کے آخر میں سن رہا ہوتا تھا۔

(۷۳) باب الصف الاوّل

پہلی صف کا بیان

۷۲۰ ۔ حدثنا أبو عاصم .... ولو حبوا، ولو يعلمون ما في الصّف المقدم لاستهموا [راجع : ۶۱۵]

"**استهم**" کے معنی قرعہ ڈالنے کے ہیں، اصل میں تیر ڈال کر نکالتے تھے اس کو بھی استہام کہتے ہیں۔

اگر لوگوں کو پتہ چل جائے کہ جلدی نماز کو جانے میں کیا فضیلت ہے، یعنی جلدی نماز کے لئے جانا، اور اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ عشاء اور فجر کی نماز میں جانے کی کیا فضیلت ہے تو وہ آئیں "**ولو حبوا**" چاہے گھٹنوں کے بل آنا پڑے۔

(۷۵) باب إثم من لم يتم الصفوف

اس شخص کا گناہ جو صفیں پوری نہ کرے

۷۲۴ ۔ حدثنا معاذبن أسد قال :أخبرنا الفضل من موسى قال:أخبر نا سعيد بن عبيد الطائي عن بشير بن يسار الأنصاري ،عن أنس بن مالک:أنه قدم المدينة فقيل له:ماأنكرت منذيوم عهد ت رسول الله ﷺ ؟ قال:ماأنكرت شيأإلاأنكم لاتقيمون الصفوف .وقال عقبة بن عبيد عن بشير بن يسار :قدم علينا أنس المدينة ؛بهذا.

آپ نے کیا چیز بری سمجھی ہے اس دن سے کہ جس دن آپ نے حضور اقدس ﷺ کو پایا تھا یعنی حضور اقدس ﷺ کے زمانہ میں اور ہمارے زمانہ میں آپ نے کیا فرق پایا اور ہمارے طرز عمل میں ایسی کیا بات محسوس کی جو قابلِ نکیر ہو "**ما أنكرت شيأ إلا أنكم لا تقيمون الصفوف**"۔

(۷۶)باب إلزاق المنكب ،والقدم بالقدم في الصف،

صف کے اندر شانہ کا شانہ سے اور قدم کا قدم سے ملانے کا بیان

وقال النعمان بن بشير :رأيت الرجل منا يلزق كعبه بكعب صاحبه.

۷۲۵ ۔ حدثنا عمرو بن خالد قال: حدثنا زهير، عن حميد، عن أنس عن النبي ﷺ قال: «أقيموا صفوفكم فإني أراكم من وراء ظهري» وكان أحدنا يلزق منكبه بمنكب صاحبه وقدمه بقدمه. [راجع: ۷۱۸]

"وكان أحدنا يلزق منكبه بمنكب صاحبه وقدمه بقدمه".

"یلزق" کے لفظی معنی چپکانا مراد نہیں ہے، بلکہ محاذات مراد ہے کہ آدمیوں کے درمیان "فرجہ" نہ ہو۔

غیر مقلدین نے یہاں سے لے لیا اور وہ قدموں کو پھیلا پھیلا کر ایک دوسرے سے چپکاتے ہیں، حالانکہ جس طرح قدم کا قدم کے ساتھ الزاق مذکور ہے اسی طرح منکب کا منکب کے ساتھ بھی منقول ہے اور دونوں کا الزاق ایک ساتھ نہیں ہوسکتا، جب قدم کو قدم کے ساتھ ملائیں گے تو منکب منکب کے ساتھ نہیں مل سکتے۔ معلوم ہوا کہ حقیقت میں محاذات مراد ہے، نہ یہ کہ بالکل چپکا دیئے جائیں۔

(۷۸) باب: المرأة وحدها تكون صفا

تنہا عورت بھی ایک صف کی طرح ہے

۷۲۷ ۔ حدثنا عبد الله بن محمد قال: حدثنا سفيان، عن إسحاق، عن أنس بن مالک قال: صليت أنا ويتيم في بيتنا خلف النبي ﷺ وأمي أم سليم خلفنا. [راجع: ۳۸۰]

اس سے امام بخاری رحمہ اللہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تنہا ام سلیم رضی اللہ عنہا جو حضرت انس ﷺ کی والدہ تھیں، وہ پیچھے کھڑی ہوئی تھیں، تو صف میں صرف ایک عورت تھی، ایسا کرنا جائز ہے اور یہ متفق علیہ مسئلہ ہے۔

(۸۰) باب إذا كان بين الإمام وبين القوم حائط أو سترة

اگر امام اور لوگوں کے درمیان کوئی دیوار یا سترہ ہو

"وقال الحسن: لا بأس أن تصلي وبينك وبينه نهر. وقال أبو مجلز: يأتم بالإمام وإن اكان بينهما طريق أوجدار إذا سمع تكبير الإمام".

اختلاف مکان مانع اقتداء ہے

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب قائم کیا ہے کہ اگر امام اور مصلیوں کے درمیان کوئی دیوار حائل ہو یا کوئی اور سترہ حائل ہو، تب بھی اقتدا درست ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے بذات خود کوئی حکم نہیں بتایا، اس لئے کہ یہ مسئلہ فقہائے کرام کے درمیان مختلف فیہ ہے لیکن ان کا رجحان یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب بیچ میں کوئی حائل موجود ہو تو نماز جائز ہے۔

اختلاف فقہاء

حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حنفیہ کے نزدیک اختلاف مکان مانع اقتدا ہے، دوسرے ائمہ کے نزدیک نہیں اور دوسرے ائمہ کے نزدیک حائل مانع اقتداء ہے، حنفیہ کے نزدیک نہیں۔

اور امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک نہ اختلاف مکان مانع ہے نہ حائل۔

علامہ شعرانی رحمہ اللہ نے دوسرے ائمہ کی طرح حائل کے مانع ہونے کا جو مذہب نقل کیا ہے وہ اس وقت ہے جب وہ حائل مشاہدہ اور سماع صوت سے مانع ہو، جیسا کہ مغنی ابن قدامہ وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے، اس صورت میں حنفیہ کے نزدیک بھی نماز نہ ہوگی، لہٰذا اس مسئلہ میں اختلاف نہ رہا۔

البتہ اختلافِ مکان کی صورت میں اختلاف ہے کہ اس میں پہیوں والی گاڑی چل سکے تو وہ مانع اقتدا ہے۔

حنفیہ کا استدلال

حنفیہ کا استدلال حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اثر سے ہے جو علامہ عینی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں **"اذا کان بینہ وبین الامام طریق أو حائط أو نہر فلیس ھو معہ"** کہ اگر مقتدی اور امام کے درمیان کوئی راستہ ہو یا دیوار ہو یا نہر ہو تو پھر مقتدی کو امام کے ساتھ نہیں سمجھا جائے گا۔[۱۳۰]

اصل اصول وہی ہے جو پہلے گزرا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے **"إنما جعل الإمام لیؤتم بہ"** اور **"الإمام ضامن"** ان دو حدیثوں کو مضبوطی سے تھام رکھا ہے، اس کے نتیجے میں کہتے ہیں کہ امام اور مقتدی کے درمیان قوی رابطہ ہونا چاہئے، لہٰذا ہر وہ چیز جو اس رابطہ کو کاٹنے والی ہو وہ اس کو مفسدِ صلوۃ قرار دیتے ہیں، چاہے اس کا تعلق نیت سے ہو چاہے اس کا تعلق جسمانی بعد سے ہو یا اختلافِ افعال وحرکات سے ہو، تو ان صورتوں میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فسادِ صلوۃ کے قائل ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ اجازت اتنی غیر محدود نہیں ہے کہ جہاں بھی آواز پہنچ رہی ہو وہاں اقتداء درست ہے، ورنہ اب تو لاؤڈ اسپیکر کا زمانہ ہے بعض اوقات ایک کلومیٹر دور بھی آواز پہنچ جائے گی، ریڈیو، ٹیلیویژن کا زمانہ ہے ہزاروں کلومیٹر دور بھی آواز پہنچ جائے گی۔ آپ یہ کہیں کہ آواز آرہی ہے اور اللہ اکبر کہہ کر

۱۳۰ المبسوط للشیبانی، ج:۱، ص:۱۹۸، وعمدۃ القاری، ج:۴، ص:۳۶۶۔

امام کی اقتداء شروع کردیں تو یہ اقتداء نہ عُرفاً ہے نہ شرعاً، لہٰذا اس کی کوئی معقول حد ہونی چاہئے اور وہ حد یہی ہے کہ بیچ میں گاڑی چل سکے۔

حنابلہ کے مذہب میں اس مسئلہ میں خاصا توسع ہے، اس لئے حرمین شریفین میں یہ منظر خوب نظر آتا ہے کہ حرم سے تقریباً ایک فرلانگ، دو فرلانگ کے فاصلے پر بھی لوگ اپنی دکانوں میں نیت باندھ کر نماز شروع کر دیتے ہیں، کیونکہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ امام کی آواز آرہی ہے۔ اس سے امام اور مقتدی کے درمیان **"إنما جعل الإمام ليؤتم به"** اور **"الإمام ضامن"** کے تحت جو رابطہ ہونا چاہئے، وہ منقطع ہو جاتا ہے۔

آگے امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا **"لابأس أن تصلي وبينك وبينه نهر"** کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ تم اس حالت میں نماز پڑھو کہ تمہارے اور تمہارے امام کے درمیان ایک نہر آئے، شراح نے فرمایا اس سے نہر صغیر مراد ہے، یعنی چھوٹی سی نہر حائل ہو جیسے نالیاں ہوتی ہیں، اگر بڑا دریا ہو تو پھر ٹھیک نہیں ہے۔

وقال ابو مجلز: اور ابومجلز (جو کہ تابعین میں سے ہیں) فرماتے ہیں **"يأتم بالإمام وان كان بينهما طريق أوجدار اذاسمع تكبير الإمام"** کہ امام کی اقتدا کرسکتا ہے اگرچہ ان کے درمیان کوئی راستہ یا دیوار ہو جبکہ وہ امام کی تکبیر سنتا ہو۔

یہ سب باتیں تابعین کے آثار ہیں اور حضرت فاروق اعظم ﷺ کا جو اثر ذکر کیا **"اذا كان بينهما طريق اوجدار اونهر فليس هو معه"** ظاہر ہے یہ تابعین کے اثر پر مقدم ہے۔

۷۲۹ ۔ حدثني محمد قال: أخبرنا عبدة عن يحي بن سعيد الأنصاري، عن عمرة، عن عائشة قالت: كان رسول الله ﷺ يصلي من الليل في حجرته و جدار الحجرة قصير، فرأى الناس شخص النبي ﷺ فقام ناس يصلون بصلاته، فأصبحوا فتحدثوا بذلک، فقال ليلة الثانية فقام معه ناس يصلون بصلاته، صنعوا ذلک ليلتين أو ثلاثا حتى إذا كان بعد ذلک. جلس رسول الله ﷺ فلم يخرج، فلما أصبح ذكر ذلک الناس فقال: (إني خشيت أن تكتب عليكم صلاة الليل).

[أنظر: ۷۳۰، ۹۲۴، ۱۱۲۹، ۲۰۱۱، ۲۰۱۲، ۵۸۶۱] [۱۳۱]

[۱۳۱] وفي صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين و قصرها، باب الترغيب في قيام رمضان و هو التراويح، رقم: ۱۲۷۱، وسنن النسائي، كتاب قيام الليل وتطوع النهار، باب قيام شهر رمضان، رقم: ۱۵۸۶، وسنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب في قيام شهر رمضان، رقم: ۱۱۲۶، و مسند أحمد، باقي مسند الأنصار، باب باقي المسند السابق، رقم: ۲۴۱۹۴، ۲۵۱۰۳، و موطأ مالک، كتاب النداء للصلاة، باب الترغيب في الصلاة في رمضان، رقم: ۲۲۹.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ رات کی نماز اپنے حجرہ میں پڑھا کرتے تھے **"وجدار الحجرة قصير"** اور حجرہ کی دیوار چھوٹی تھی۔ **"فرأى الناس شخص النبي ﷺ فقام ناس يصلون بصلاته"** دیواریں چھوٹی ہونے کی وجہ سے صحابۂ کرام ﷺ نے حضور اقدس ﷺ کی ذات مبارک کو دیکھ لیا کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں تو انہوں نے وہیں اپنی نماز کی نیت باندھ لی جبکہ بیچ میں دیوار حائل تھی **"فاصبحوا فتحدثوا بذلك"** صبح اٹھ کر آپس میں باتیں کیں کہ آج تو ہمیں یہ سعادت نصیب ہوئی کہ حضور اقدس ﷺ نماز پڑھ رہے تھے ہم نے جا کر پیچھے نیت باندھ لی **"فقام ليلة الثانية"** آپ ﷺ دوسری رات بھی اسی طرح جاگ کر کھڑے ہوئے **"فقام معه ناس يصلون بصلاته"** کچھ لوگ پھر نیت باندھ کر کھڑے ہو گئے **"صنعوا ذلك ليلتين أو ثلاثا"** دو یا تین راتیں انہوں نے اس طرح کیا **"حتى إذا كان بعد ذلك"** یہاں تک کہ جب معاملہ آگے بڑھنے لگا تو **"جلس رسول الله ﷺ فلم يخرج"** آپ ﷺ بیٹھ گئے اور باہر نہیں نکلے تاکہ لوگوں کو پتہ نہ چلے کہ آپ ﷺ نماز پڑھ رہے ہیں گویا اس بات کی ہمت شکنی فرمائی کہ لوگ آکر آپ ﷺ کی اقتدا کریں۔ **"فلما أصبح ذكر ذلك الناس"** لوگوں نے ذکر کیا یا رسول اللہ! تین دن سے تو ایسا ہو رہا تھا آج آپ ﷺ نے موقع نہیں دیا" **فقال: إني خشيت أن تكتب عليكم صلاة الليل"** مجھے اندیشہ ہوا کہ تمہارے اوپر رات کی نماز فرض نہ کر دی جائے، شفقۃً میں نے اس سلسلہ کو ترک کر دیا۔

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود یہ ہے کہ آپ ﷺ حجرہ میں نماز پڑھ رہے تھے، صحابۂ کرام ﷺ نے دیکھا کہ آپ ﷺ نماز پڑھ رہے ہیں جا کر آپ ﷺ کے پیچھے اقتدا کر لی حالانکہ ان کے درمیان اور نبی کریم ﷺ کے درمیان حجرہ کی دیوار حائل تھی۔ معلوم ہوا کہ اگر دیوار حائل ہو تو اس کے باوجود مقتدی کا امام کی اقتدا کرنا جائز ہے اور اس حد تک مسئلہ متفق علیہ ہے کہ محض دیوار کے حائل ہونے سے اقتدا فاسد نہیں ہوتی، فاصلہ سے ہوتی ہے۔

دوسری یہ بات بھی اس حدیث سے معلوم ہوتی ہے کہ اگر ایک شخص نے منفرداً نماز شروع کی، اس وقت اس کی نیت امامت کی نہیں تھی، پیچھے سے کوئی آدمی آجائے اور آکر نیت باندھ لے تو اس میں کوئی حرج نہیں چاہے امام نے ابتدا سے امامت کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو، بعد میں جب دوسرا آدمی آکر شامل ہوگا تو اس کو پتہ لگ جائے گا، ظاہر ہے خود بخود نیت ہو جائے گی، شروع سے نیت کرنا ضروری نہیں۔

یہاں حجرہ کا ذکر ہے، ظاہری الفاظ سے یوں لگ رہا ہے کہ یہ حضور اقدس ﷺ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والا معروف حجرہ تھا جس میں آپ ﷺ قیام فرمایا کرتے تھے، لیکن آگے احادیث میں آئے گا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے وہ حجرہ مراد نہیں ہے بلکہ ہوتا یہ تھا کہ رمضان المبارک میں جب نبی کریم ﷺ اعتکاف فرماتے تھے تو اعتکاف کے لئے ایک چٹائی مبارک ہوتی تھی جو دن کے وقت زمین پر بچھا دی جاتی اور اس پر آپ

ﷺ تشریف فرماتے ہوتے اور رات کے وقت اس کو کھڑا کرکے ایک کمرے کی شکل دیدیتے اور اس میں آپ ﷺ رات کے وقت نماز پڑھا کرتے تھے۔ تو ہجرہ سے مراد چٹائی والا حجرہ ہے اور یہ نماز رمضان المبارک کی نماز ہے یعنی تراویح اور لوگوں کا آکر اقتدا کرنا بھی اسی نماز تراویح میں ہے، جیسا کہ اگلی روایتوں میں آرہا ہے، لہٰذا اس سے جن لوگوں نے تہجد کی نماز پر استدلال کیا ہے وہ استدلال درست نہیں اس لئے کہ یہ نماز تراویح کی تھی۔

(۸۱) باب صلاة الليل

نمازِ شب کا بیان

۷۳۰ - حدثنا إبراهيم بن المنذر قال: حدثنا ابن أبي الفديك قال: حدثنا ابن أبي ذئب، عن المقبري، عن أبي سلمة بن عبد الرحمٰن، عن عائشة رضي الله عنها: أن النبي ﷺ كان له حصير يبسطه بالنهار و يحتجره بالليل، فثاب إليه ناس فصلوا وراءه. [راجع: ۷۲۹]

اس حدیث میں صاف آگیا کہ آپ ﷺ کی چٹائی تھی جس کو آپ ﷺ دن کے وقت بچھا لیا کرتے تھے اور رات کے وقت اس کا حجرہ بنالیا کرتے تھے۔ "**فثاب إليه ناس فصلوا وراءه**" آپ ﷺ کو وہاں نماز پڑھتے دیکھ کر بعض لوگ آئے اور پیچھے صف بنالی۔

۷۳۱ - حدثنا عبد الأعلى بن حماد قال: حدثنا وهيب قال: حدثنا موسى بن عقبة عن سالم أبي النضر، عن بسر بن سعيد، عن زيد بن ثابت: أن رسول الله ﷺ اتخذ حجرة قال: حسبت أنه قال: من حصير. في رمضان فصلى فيها ليالي، فصلى بصلاته ناس من أصحابه، فلما علم بهم جعل يقعد، فخرج إليهم فقال: ((قد عرفت الذي رأيت من صنيعكم، فصلوا أيها الناس في بيوتكم، فإن أفضل الصلاة المرء في بيته، إلا المكتوبة)) قال عفان: حدثنا وهيب: حدثنا موسى: سمعت أبا النضر، عن بسر، عن زيد، عن النبي ﷺ. [أنظر: ۶۱۱۳، ۷۲۹۰]

یہاں صراحۃً آگیا کہ یہ حصیر کا حجرہ تھا اور جو نماز پڑھ رہے تھے یہ رمضان المبارک کا واقعہ ہے۔

(۸۲) باب إيجاب التكبير وافتتاح الصلاة

تکبیر تحریمہ کے واجب ہونے اور نماز شروع کرنے کا بیان

۷۳۲ - حدثنا أبو اليمان قال: أخبرنا شعيب، عن الزهري، قال: أخبرني أنس

ابن مالک الأنصاري: أن رسول الله ﷺ ركب فرسا فجحش شقه الأيمن. قال أنس ﷺ: فصلى لنا يومئذ صلاة من الصلوات وهو قاعد، فصلينا وراءه قعودا. ثم قال لما سلم: ((إنما جعل الإمام ليؤتم به فإذا صلى قائما فصلوا قياما وإذا ركع فاركعوا، وإذا رفع فارفعوا، وإذا سجد فاسجدوا. وإذا قال: سمع الله لمن حمده، فقولوا: ربنا ولک الحمد)).
[راجع: ۳۷۸]

افعالِ صلوۃ

یہاں سے امام بخاری رحمہ اللہ افعالِ صلوۃ کا ذکر فرما رہے ہیں، تکبیر سے لے کر سلام تک جتنے افعال ہیں ان کا یکے بعد دیگرے بیان ہوگا اور جو مشہور مختلف فیہ مسائل ہیں وہ آئیں گے۔

ان مباحث کا اصل مقام ترمذی اور ابوداؤد ہے اور درسِ ترمذی میں ان مسائل پر مفصل مباحث موجود ہیں، اس لئے جو بخاری شریف کے خصائص ہیں میں ان شاء اللہ صرف انہی پر کلام کروں گا، اور باقی مباحث کا ممکن ہوا تو بہت مختصر خلاصہ بیان ہوگا۔

روایت ذکر کی ہے **"حدثنا أبو اليمان الخ"** اس روایت میں اگرچہ تکبیر کا ذکر نہیں ہے لیکن اگلی روایت میں آ رہا ہے اور وہی مقصود بالترجمہ ہے۔

"اذا كبر فكبّروا" اس میں آپ ﷺ نے امر کا صیغہ استعمال فرمایا ہے جو ایجاب پر دلالت کرتا ہے۔

حنفیہ بھی صیغۂ تکبیر کے وجوب کے قائل ہیں، اختلاف صرف فرضیت میں ہے کہ حنفیہ کے نزدیک فرض نہیں ہے واجب ہے اور حنفیہ فرض اور واجب میں تفریق کرتے ہیں۔

ائمہ ثلاثہ کا کہنا یہ ہے کہ یہ فرض ہے ان کے نزدیک فرض اور واجب میں عملاً کوئی زیادہ فرق نہیں ہے، اگر کوئی صیغۂ تکبیر چھوڑ دے اور کوئی اور لفظ استعمال کر دے اللہ اجل، اللہ اعظم، تو حنفیہ کے نزدیک واجب کے ترک ہونے کی وجہ سے نماز واجب الاعادہ رہے گی، اس لئے عملاً کوئی خاص فرق نہ ہوا۔[۱۳۲]

(۸۳) باب رفع اليدين في التكبيرة الأولىٰ مع الإفتتاح سواء

پہلی تکبیر میں نماز شروع کرنے کے ساتھ دونوں ہاتھوں کے اٹھانے کا بیان

اس ترجمۃ الباب کا مقصد یہ ہے کہ جب تکبیر اولیٰ میں رفع یدین کیا جائے گا تو تکبیر کے ساتھ ساتھ کیا جائے گا۔ سواء کا مطلب یہ ہے کہ دونوں ساتھ ساتھ ہوں یعنی ادھر اللہ اکبر کہہ رہا ہے اُدھر ساتھ ساتھ ہاتھ

۱۳۲ مزید تفصیل ملاحظہ ہو: رقم الحديث ۳۷۸، كتاب الصلاة و عمدة القاری، ج: ۴، ص: ۳۷۳.

اٹھا رہا ہے، دونوں کام ساتھ ساتھ ہو رہے ہیں۔

۷۳۵ ـ حدثنا عبد الله بن مسلمة ،عن مالک ،عن ابن شهاب ،عن سالم بن عبدالله،عن أبيه:أن رسول الله ﷺ كان يرفع يديه حذو منكبيه إذاافتتح الصلاة ،وإذا كبر للركوع ،وإذارفع رأسه من الركوع رفعهما كذلک أيضا،وقال: ((سمع الله لمن حمده ، ربنا ولک الحمد)) وكان لا يفعل ذلک في السجود .[أنظر : ۷۳۶، ۷۳۸، ۷۳۹][۱۳۳]

(۸۴) باب رفع اليدين إذا كبر إذا و إذا ركع إذا رفع

دونوں ہاتھوں کے اٹھانے کا بیان جب تکبیر تحریمہ کہے اور جب رکوع کرے اور جب رکوع سے سر اٹھائے

۷۳۶ ـ حدثنا محمد بن مقاتل قال : أخبرنا عبد الله قال : أخبرنا يونس عن الزهري قال : أخبرني سالم بن عبد الله ، عن أبيه أنه قال : رأيت رسول الله ﷺ إذا قام في الصلاة رفع يديه حتى تكونا حذو منكبيه ، و كان يفعل ذلک حين يكبر للركوع ، و يفعل ذلک إذا رفع رأسه من الركوع،و يقول : ((سمع الله لمن حمده)) و لايفعل ذلک في السجود . [راجع :۷۳۵]

۷۳۷ ـ حدثنا إسحاق الواسطي قال:حدثنا خالد بن عبدالله،عن خالد ،عن أبي قلابة :أنه راى مالک بن الحويرث إذاصلى كبر ورفع يديه ، واذا أراد أن يركع رفع يديه واذا رفع رأسه من الركوع رفع يديه ،وحدث أن رسول الله ﷺ صنع هكذا.

[۱۳۳] وفي صحيح مسلم ، كتاب الصلاة ، باب استحباب رفع اليدين حذوا المنكبين مع تكبيرة،رقم:۵۸۷، وسنن الترمذي، كتاب الصلاة ، باب ماجاء في رفع اليدين عند الركوع ، رقم:۲۳۷، وسنن النسائي ، كتاب الافتتاح ، باب رفع اليدين قبل التكبير ، رقم:۸۶۷، وسنن أبي داؤد ، كتاب الصلاة، باب رفع اليدين في الصلاة ، رقم: ۶۱۹، وسنن ابن ماجه ، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها ، باب رفع اليدين اذا رفع راسه من الركوع ، ۸۴۸، ومسند أحمد ، مسند المكثرين من الصحابة ، باب مسند عبد الله بن عمر الخطاب، رقم: ۴۳۱۲، ۴۴۴۵، ۴۷۹۱، ۴۸۳۷، وموطأ مالک، كتاب النداء للصلاة ، باب افتتاح الصلاة ، رقم: ۱۴۹ ، وسنن الدارمي ، كتاب الصلاة ، باب القول بعد رفع الرأس من الركوع ، رقم: ۱۲۷۵ .

مسئلہ رفع یدین

یہ واضح رہے کہ ائمہ اربعہ کے درمیان رفع یدین کا اختلاف محض افضلیت اور عدم افضلیت کا ہے نہ کہ جواز اور عدم جواز کا، چنانچہ دونوں طریقے فریقین کے نزدیک بلا کراہت جائز ہیں۔

جہاں تک روایات کا تعلق ہے حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ سے رفع یدین اور ترک رفع دونوں ثابت ہیں:

اور یہاں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی یہ دونوں حدیثیں **"رفع یدین عند الرکوع وعندالرفع من الرکوع"** پر دلالت کرتی ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے **"جزء رفع الیدین"** میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ ترک رفع پر کوئی حدیث سنداً ثابت نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ امام بخاری رحمہ اللہ کا تسامح ہے، چنانچہ بہت سے کبار محدثین نے ان کی تردید فرمائی ہے، واقعہ یہ ہے کہ ترک رفع کے ثبوت پر متعدد صحیح روایات موجود ہیں۔

حنفیہ کے نزدیک رفع یدین حضور اقدس ﷺ سے ثابت ہے، لہٰذا ان حدیثوں کے بارے میں کوئی توجیہ، تاویل یا جواب کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ حنفیہ کا دعویٰ یہ ہے کہ رفع یدین بھی ثابت ہے اور ترکِ رفع یدین بھی ثابت ہے اور آخر الأمرین ترک رفع ہے۔[۱۳۴]

جس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد فرماتے ہیں: **"ألا أصلی بکم صلوة رسول اللہ ﷺ فصلیّ فلم یرفع یدیه الاّ فی اوّل مرّة ،أخرجه أصحاب السنن الاربعة".**

یہ حدیث حنفیہ کے مسلک پر صریح بھی ہے اور صحیح بھی۔[۱۳۵]

---

[۱۳۴] وقد اتقنّا الكلام فيه فى ((شرحنا للهداية)) والذى يحتج به الخصم من الرفع محمول على أنه كان فى ابتداء الاسلام ، لم نسخ . والدليل عليه أن عبد الله بن الزبير رأى رجلا يرفع يديه فى الصلاة عند الركوع وعند رفع رأسه من الركوع ، فقال له: لاتفعل ، فان هذا شئى فعله رسول الله ﷺ لم تركه ، ويؤيد النسخ مارواه الطحاوى باسناد صحيح :حدثنا ابن أبى داؤد ....قال: صليت خلف ابن عمر فلم يكن يرفع يديه الا فى التكبيرة الاولىٰ من الصلاة .قال الطحاوى : فهذا ابن عمر قد رأى النبى ﷺ ، يرفع لم ترک هو الرفع بعد النبى صلى الله عليه وسلم ، فلايكون ذلک الا وقد ثبت عنده نسخ ما قد كان رأى النبى ﷺ فعله .عمدة القارى ، ج:۴،ص: ۳۸۰.

[۱۳۵] .....عن علقمة قال قال عبد الله بن مسعود الا أصلى بكم صلوة رسول الله ﷺ فصلىّ فلم يرفع يديه الاّ فى اوّل مرّة ، ......قال أبو عيسىٰ حديث بن مسعود حديث حسن ،سنن الترمذى ، باب ماجاء أن النبى ﷺ لم يرفع الا فى أول مرة ، ج : ۲ ، ص: ۴۱، وسنن الدارمى ،رقم:۱۳۰۳ ، ج: ۱ ، ص: ۳۴۰، وسنن أبى داؤد ،باب من لم يذكر الرفع عند الركوع ، رقم: ۷۴۸، ج: ۱ ،ص: ۱۹۹ ، وسنن النسائى ، باب الرخصة فى ترک ذلک ، رقم:۱۰۵۸ ، ونصب الراية ، ج: ۱ ، ص: ۳۹۴.

تو حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ جو افقہ الصحابہ ؓ ہیں وہ بعد میں نبی کریم ﷺ کی نماز کا طریقہ بتاتے ہوئے صرف پہلی مرتبہ رفع یدین کرتے ہیں بعد میں نہیں کرتے۔

معلوم ہوا کہ حضور اقدس ﷺ کا آخری عمل ترک رفع کا تھا، البتہ آج بھی رفع یدین جائز ہے حنفیہ اس کا انکار نہیں کرتے، اختلاف صرف افضلیت میں ہے۔[۱۳۶]

حنفیہ کے نزدیک افضل ترک رفع ہے اس لئے کہ عبداللہ بن مسعود ﷺ جیسے افقہ الصحابہ حضور ﷺ کا آخری عمل یہ بتلا رہے ہیں۔[۱۳۷]

---

۱۳۶ فإن أحتج الخصم بحديث وائل بن حجر قال : ((رأيت رسول الله ﷺ يرفع يديه حين يكبر للصلاة وحين يركع وحين يرفع رأسه من الركوع يرفع يديه حيال أذنيه)) أخرجه أبو داؤد والنسائي ، فجوابه أنه ضاده مارواه ابراهيم النخعي عن عبد الله بن مسعود رضى الله تعالىٰ عنه ، أنه لم يكن رأى النبي ﷺ فعل ما ذكر من رفع اليدين في غير تكبيرة الإحرام ، فعبد الله أقدم صحبة لرسول الله ﷺ ، وأفهم بأفعاله من وائل ، وقد كان رسول الله ﷺ يحب أن يليه المهاجرون ليحفظوا عنه ، وكان عبد الله كثيرالولوج على رسول الله ﷺ ووائل بن حجر أسلم في المدينة في سنة تسع من الهجرة ، وبين إسلاميهما النتان وعشرون سنة ، ولهذا قال ابراهيم للمغيرة ، حين قال إن والأحدث أنه رأى ((رسول الله ﷺ يرفع يديه إذا افتتح الصلاة وإذا ركع وإذا رفع رأسه من الركوع)) : إن كان وائل رآه مرة يفعل ذلك ، فقد رآه عبد الله خمسين مرة لايفعل ذلك. عمدة القاري، ج:۴، ص: ۳۸۱.

۱۳۷ واعلم أن الأحاديث الصحاح في الرفع تبلغ إلى خمسة عشر وان سلكنا مسلك الأعمال فإلى ثلاثة وعشرين ولنا حديث ابن مسعود رضى الله عنه مرفوعا ومرسل آخر في التخريج للزيلعي فقد ثبت الأمران عندي ثبوتا لأمر دله ولا خلاف إلا في الإختيار وليس في الجواز . فما في الكبير شرح المنية والبدائع أنه مكروه تحريما متروك عندي نعم إن كان عندهما نقل من صاحب المذهب فهما معذوران فالقول بالكراهة في مسألة متواترة بين الصحابة رضى الله عنهم شديد عندي ، ثم تتبعت الكتب للتصريح بالجواز فوجدت أبا بكر الجصاص قد صرح في أحكام القرآن تحت قوله تعالى "كتب عليكم الصيام" أن المسألة إذا وردت فيها الأحاديث الصحاح من الجانبين فالخلاف فيها لا يكون إلا في الإختيار سيما إذا كانت كثيرة الوقوع منها الترجيع في الآذان و إفراد الإقامة والجهر بالتسمية ورفع اليدين وحينئذ فأسترحت حيث تخلصت رقبتي من الأحاديث الثابتة في الرفع ، والجصاص من القرن الرابع حتى أن الكرخي الذي هو من معاصري الطحاوي من تلامذته ، فرتبته أعلى من الكبيري والبدائع وصاحب البدائع أرفع رتبة من الكبيري وقد اشتهر في متأخري الحنفية القول بالنسخ وإنما تعلموه من الشيخ ابن الهمام ، والشيخ اختاره تبعا للطحاوي ، وقد علمت أن نسخ الطحاوي أعم مما في الكتب فإن المفضول بالنسبة إلى الفاضل والأضعف دليلا بالنسبة إلى أقواه كله منسوخ عنده كما يتضح ذلك لمن يطالع كتابه ، وكيف ماكان إذا ثبت عندي القول بالجواز ممن هو أقدم في الحنفية وساعدته الأحاديث أيضا فلا محيد إلا بالقول به وخلافه لا يسمع فمن شاء فليسمع. فيض الباري: ۲/۲۵۵.

خلاصۂ کیدانی میں جو یہ لکھا ہے کہ "رفع یدین" مسفد صلواۃ ہے، یہ بالکل بے اصل ہے حنیفہ کا یہ مذہب نہیں ہے۔

(۸۵) باب : إلى أين يرفع يديه ؟

تکبیر تحریمہ میں ہاتھوں کو کہاں تک اٹھائے

"وقال أبو حميد في أصحابه : رفع النبي ﷺ حذو منكبيه".

۷۳۸ ـ حدثنا أبو اليمان قال : أخبرنا شعيب ،عن الزهري قال:أخبرنا سالم ابن عبدالله أن عبد الله بن عمر رضى الله عنهما قال:رأيت النبي ﷺ افتتح التكبير في الصلاة فرفع يديه حين يكبر حتى يجعلهما حذو منكبيه ، وإذا كبر للركوع فعل مثله ، وإذا قال:(سمع الله لمن حمده) ، فعل مثله ، وقال: ((ربنا ولك الحمد)) ولا يفعل ذلك حين يسجد ولا حين يرفع رأسه من السجود [راجع:۷۳۵]

رفع یدین کہاں تک ہو

رفع یدین کہاں تک ہو، اس میں مشہور اختلاف ہے۔

امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ **"حذو منكبيه"** امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک **"حذاء اذنين"** تک ہوگا۔

دراصل روایات میں اختلاف ہے: بعض روایات میں **"حذو المنكبين"** آیا ہے، بعض میں آیا ہے **"الیٰ شحمتی اذنیه"** اور بعض میں سر کے کناروں تک۔ یہ تینوں روایات موجود ہیں۔ [۱۳۸]

---

[۱۳۸] وإنما لم يصرح بحده لكون الخلاف فيه ، لكن الظاهر الذى يذهب إليه ما هو مصرح فى حديث الباب ، كما هو الشافعية .

وأما الحنفية فإنهم أخذوا بحديث مالك بن الحويرث الذى رواه مسلم ولفظه : ((كان النبى ﷺ إذا كبر رفع يديه حتى يحاذى بهما أذنيه)) . وعن أنس مثله بسند صحيح من عند الدار قطنى ، وعن البراء من عند الطحاوى : ((يرفع يديه حتى يكون إبهاماه قريبا من شحمتى أذنيه)) . وعن وائل بن حجر : ((حتى حاذتا أذنيه)) عند أبى داود. وقال بعضهم ، ورجح الأول يعنى : ماذهب إليه الشافعى لكون إسناده أصح . قلت : هذا تحكم لكون الإسنادين فى الأصحية سواء ، فمن أين الترجيح؟ ، عمدة القارى ، ج: ۴،ص: ۳۸۴.

حنفیہ نے تینوں میں یہ تطبیق دی ہے کہ ہتھیلیوں کا نچلا حصہ **"حذو المنكبين"** ہے اور انگوٹھا **"حذو الأذنين"** ہے اور جو اوپر کا حصہ وہ **"حذو جانب الرأس"** ہے، البتہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ہاتھوں کی ہتھیلیوں کا رخ قبلہ کی طرف ہونا چاہئے۔ اس میں اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ اور طلبہ بھی غلطی کرتے ہیں۔ انگوٹھے کانوں کی لو سے مل جائیں یا کم از کم اس کے محاذی ہو جائیں اور ہتھیلیاں قبلہ رُخ ہوں، بعض لوگ کانوں کو پکڑ لیتے ہیں، یہ بھی فضول اور بے اصل ہے۔

(۸٦) باب رفع اليدين إذا قام من الركعتين

دونوں ہاتھوں کے اٹھانے کا بیان جب دو رکعتیں پڑھ کر اٹھے

۷۳۹ ـ حدثنا عياش قال: حدثنا عبد الأعلى قال: حدثنا عبيدالله، عن نافع، أن ابن عمر رضي الله عنهما كان إذا دخل في الصلاة كبر ورفع يديه، وإذا ركع رفع يديه، وإذا قال: سمع الله لمن حمده، رفع يديه، وإذا قام من الركعتين رفع يديه، ورفع ذلك ابن عمر إلى النبي ﷺ. ورواه حماد بن سلمة، عن أيوب عن نافع عن ابن عمر عن النبي ﷺ. و رواه ابن طهمان عن أيوب وموسى بن عقبة مختصرا. [راجع: ۷۳۵]

اس حدیث میں ہے کہ رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت کے علاوہ جب قعدہ اولیٰ سے تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوتے تب بھی رفع یدین کرتے۔ **"ورفع ذلك ابن عمر إلى النبیﷺ"** عبداللہ بن عمرؓ نے اس کو بھی نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب فرمایا۔

جبکہ شافعیہ، حنابلہ جو رفع یدین کے قائل ہیں وہ بھی **"قيام من الركعتين"** کے وقت رفع یدین کے قائل نہیں ہیں حالانکہ یہ حدیث صحیح ہے اور بخاری میں موجود ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ اس کی کوئی توجیہ کریں گے کہ پہلے تھا بعد میں منسوخ ہو گیا۔

حنفیہ کا کہنا یہ ہے کہ نماز کے اندر یہ صورتحال رہی ہے کہ حرکات کثرت سے قلت کی طرف منتقل ہوتی رہی ہیں۔[۱۳۹]

چنانچہ ابن ماجہ میں ایک حدیث عمیر بن حبیب سے مروی ہے کہ آپ ﷺ ہر تکبیر پر رفع یدین فرماتے

---

[۱۳۹] ...... عن أبي هريرة قال ثلاث كان رسول الله ﷺ يفعلهن تركهن الناس كان إذا قام إلى الصلاة رفع يديه مدا وكان يقف قبل القراءة هنيئة ..... وكان يكبر كلما خفض ورفع ..... ثلاث كان يعمل بهن تركهن الناس الخ، صحيح ابن خزيمه، ج: ۱، ص: ۲۴۱، رقم: ۴۷۳.

تھے، اگر چہ اس حدیث کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔[۱۴۰]

نیز امام طحاوی رحمہ اللہ نے ''مشکل الآثار'' میں ایک اسی مضمون کی حدیث نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انتقال کے وقت رفع یدین ہوتا تھا، پھر کمی ہوتی گئی۔[۱۴۱]

یہاں تک کہ آخر میں صرف تکبیر افتتاح کے وقت رہ گیا۔ خود حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے امام مالک رحمہ اللہ نے مدونہ میں روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے رفع صرف افتتاح کے وقت کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ خود حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ترکِ رفع کی روایات منقول ہیں۔[۱۴۲]

اس لئے حنفیہ نے اس کو ترجیح دی ہے۔[۱۴۳]

(۸۸) باب الخشوع في الصلاة

نماز میں خشوع کا بیان

۷۴۱ - حدثنا إسماعيل قال: حدثني مالک، عن أبي الزناد، عن الأعرج، عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ قال: ((هل ترون قبلتي ها هنا؟ والله لايخفى علي ركوعكم ولا خشوعكم، وإني لأراكم من وراء ظهري)). [راجع ۴۱۸]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا'' **هل ترون قبلتي ها هنا؟** '' کیا تم دیکھتے ہو کہ میرا قبلہ ادھر ہے؟ جس کا مطلب یہ ہے کہ میں پیچھے نہیں دیکھتا'' **و الله لايخفى علي ركوعكم ولا خشوعكم، وإني لأراكم من وراء ظهري**'' اس حدیث کو لانے کا منشأ یہ ہے کہ نماز میں خشوع بھی

---

[۱۴۰] عمدة القاری، ج:۴، ص: ۳۷۹.

[۱۴۱] انوار الباری، ج:۱۵، ص:۲۲۷۔

[۱۴۲] ورواه عن مالک جماعة منهم: القعنبي ويحيى بن يحيى الأندلسي فلم يذكر فيه الرفع عند الانحطاط إلى الركوع، وتابعه على ذلک جماعات، ورواه عشرون نفسا بإثباته، كما ذكره الدارقطني في (جمعه لغرائب مالک التي ليست في الموطأ). وقال جماعة: إن الاسقاط انما أتى من مالک، وهو الذي كان أو هم فيه، ونقله ابن عبد البر، قال: وهذا الحديث أحد الأحاديث الأربعة التي رفعها سالم بن عبد الله إلى ابن عمر وفعله، ومنها ماجعله عن ابن عمر عن عمر، والقول فيها قول سالم، ولم يلتفت الناس فيها إلى نافع، فهذا أحدها، كذا ذكره العيني في العمدة، ج:۴، ص:۳۸۳.

[۱۴۳] أنظر للتفصيل: فيض الباري، ج:۲، ص:۲۵۳.

ضروری ہے۔قرآن کریم میں جابجا خشوع کی اہمیت بیان فرمائی ہے۔اس حدیث میں بھی نبی کریم ﷺ نے باقاعدہ تنبیہ فرمائی ہے کہ نماز کے اندر خشوع کا اہتمام کرو۔

"هل ترون قبلتي ههنا" یعنی کیا تم دیکھتے ہو میرا قبلہ اس طرف ہے، مقصود یہ ہے کہ شاید تم یہ سمجھتے ہو کہ میں چونکہ قبلہ کے رُخ منہ کر کے نماز پڑھ رہا ہوں، لہٰذا بس مجھے قبلہ کی جانب ہی کی خبر ہے اور چیزوں کا پتہ نہیں۔

"واللہ مایخفی علي خشوعکم ولا رکوعکم" یعنی اللہ کی قسم! مجھ پر تمہارا خشوع اور رکوع مخفی نہیں ہے، اگرچہ میرا رُخ قبلہ ہی کی جانب کیوں نہ ہو اور میری نظریں سامنے ہی کی طرف کیوں نہ ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ **"اني لأراکم من وراءِ ظھري"** یعنی میں تم کو اپنی پشت کے پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں۔

"وراء ظهری" کا مطلب

بعض حضرات نے اس پر بحث کے دروازے کھول دیئے ہیں کہ نبی کریم ﷺ پشت کے پیچھے سے کس طرح دیکھتے تھے؟

اس سلسلے میں لوگوں نے اپنے اپنے تخیلات بیان فرمائے ہیں اور بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کی ایک آنکھ پیچھے بھی تھی یعنی باقاعدہ آنکھ کا اثبات کیا کہ جس طرح دو آنکھیں آگے تھیں تو ایک آنکھ پیچھے بھی تھی، حالانکہ دیکھنے کے لئے آنکھ کا ہونا کوئی ضروری نہیں کیونکہ جس خالق نے آنکھ میں دیکھنے کی قوت عطا فرمائی ہے وہ جب چاہے کسی اور شئی میں قوت بینائی عطا فرما دے اس کی قدرت سے کیا بعید ہے۔لہٰذا اعضاء کا بولنا عقلاً ممکن ہے اور نقلاً مخبر صادق نے خبر دی ہے۔

خشوع کے درجات

یہاں یہ سمجھ لو کہ خشوع مطلوب کے کئی درجات ہیں۔ایک درجہ تو فرض ہے اور وہ یہ ہے کہ کم از کم تکبیر تحریمہ کے وقت آدمی اپنا ذہن حاضر رکھے کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں، اس کے بغیر نماز نہ ہوگی۔ایک درجہ ایسا ہے جو اعلیٰ ترین درجہ ہے کہ پوری نماز میں اللہ ﷻ کے سوا کسی کا خیال نہ آئے **"أن تعبد اللہ کأنک تراہ فإن لم تکن تراہ فإنه یراک"**۔

ایک متوسط درجہ ہے جس کو حاصل کرنے کی ہر انسان کو کوشش کرنی چاہئے اور وہ یہ ہے کہ نماز کے وقت زبان سے جو الفاظ ادا کر رہا ہے وہ توجہ اور دھیان سے ادا کرے، اس کو پتہ ہو کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں **"الحمد للہ رب العالمین"** کہا تو پتہ ہو **"الحمد للہ رب العالمین"** کہا **"الرحمن الرحیم"** کہا تو پتہ ہو کہ

"الرحمن الرحیم" کہا۔ خشوع کا یہ درجہ حاصل کرنے کی فکر کرنی چاہیئے، یہ نہ ہو کہ بٹن دبا دیا اور مشین چل پڑی یہاں تک کہ نماز ختم ہوگئی۔

ہاں اگر غیر اختیاری طور پر کچھ خیالات آجائیں تو ان شاء اللہ وہ معاف ہیں بشرطیکہ جب تنبہ ہو تو دوبارہ نماز کے الفاظ کی طرف لوٹ جائیں۔

شروع میں توجہ الفاظ کی طرف، پھر رفتہ رفتہ ذو معنی (اللہ ﷻ) کی طرف بھی ہو جائے گی لیکن ابتدائی سیڑھی یہ ہے کہ جو الفاظ پڑھ رہا ہے اس کی طرف توجہ کرے، غیر اختیاری خیالات کی وجہ سے جو الفاظ پڑھے ہیں ان کو لوٹائے، اگر یہ کرتا رہے تو ان شاء اللہ خشوع کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔ اپنے اختیار سے غیر طاعت کا خیال لانا منع ہے، یہ اس لئے کہا کہ اگر طاعت کا خیال چاہے اپنے اختیار سے ہی لائے بالخصوص ضرورت کے وقت تب بھی جائز ہے جیسا کہ حضرت فاروق اعظم ؓ فرماتے ہیں **"اجهز جیشی وانا فی الصلوة"** کہ میں اپنے لشکر کو نماز کے اندر ترتیب دیتا ہوں، نماز بھی پڑھ رہے ہیں اور لشکر جہاد کو ترتیب بھی دے رہے ہیں لیکن چونکہ طاعت ہے اس لئے منافی صلوۃ بھی نہیں اور محظور بھی نہیں، لہٰذا اگر کوئی فقہی مسئلہ نماز میں سوچنے لگے تو یہ بھی جائز ہے، البتہ بلا ضرورت اس کا ترک اولی ہے۔

مشہور ہے امام غزالی رحمہ اللہ (احمد الغزالی اور بھائی کا نام محمد الغزالی) محمد الغزالی صوفی منش آدمی تھے اور یہ صوفی بھائی عالم بھائی کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے۔ والدہ نے پوچھا کہ کیوں نہیں پڑھتے؟ تو کہنے لگے کہ میں ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہوں تو یہ حیض و نفاس میں الجھے رہتے ہیں۔

والدہ بھی امام غزالی کی والدہ تھیں کہنے لگیں، بے وقوف اس کا ذہن تو فقہی مسئلہ میں الجھا ہوتا ہے چاہے وہ حیض و نفاس کا مسئلہ ہو لیکن تو تو تجسس اور عیب جوئی میں لگا ہوا ہے جو گناہ کبیرہ ہے۔

جس کے بارے میں صریح نص ہے **"ولا تجسسوا"** اس واسطے وہ تو گناہ نہیں کر رہا ہے، تم گناہ کر رہے ہو۔ خلاصہ یہ کہ اگر کوئی طاعت کا خیال با اختیار بھی لائے تو بھی جائز ہے لیکن غیر طاعت کا خیال با اختیار لانا جائز نہیں، بے اختیار آئے تو وہ معاف ہے ان شاء اللہ بشرطیکہ جب بھی تنبہ ہو فوراً وہ خیال لوٹا دے۔

بعض مرتبہ واعظین مایوس کر دیتے ہیں، جب خشوع کا بیان کریں گے تو اتنا اعلیٰ درجہ بیان کریں گے کہ لوگ سمجھتے ہیں یہ ہمارے بس میں ہی نہیں ہے۔ صحابۂ کرام ؓ کے واقعات ذکر کریں گے کہ جنگ کے دوران تیر لگ رہے ہیں، بیشک یہ اعلیٰ ترین مقام ہے اس کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے لیکن اس درجہ کا استغراق واجب نہیں، شریعت نے جو کام کرنے کا کہا ہے وہ پہلی سیڑھی ذکر کر دی کہ الفاظِ صلوۃ کی طرف توجہ کرے، جب خیال غیر اختیاری طور پر آئے تو دوبارہ لوٹ آئے اور اپنے اختیار سے خیالات نہ لائے بس یہی مطلوب ہے۔

(۸۹) باب مايقول بعد التكبير

تکبیر تحریمہ کے بعد کیا پڑھے؟

۷۴۳ ـ حدثنا حفص بن عمر قال: حدثنا شعبة، عن قتادة، عن أنس: أن النبي ﷺ وأبا بكر وعمر كانوا يفتتحون الصلاة بـ: ﴿الحمد لله رب العالمين﴾ [۱۴۴]

یہ امام مالک رحمہ اللہ کی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ تکبیر تحریمہ کے بعد "**سبحانک اللّٰھم**" اور "**بسم الله الرحمٰن الرحيم**" وغیرہ کچھ بھی پڑھا نہیں جائے گا، بس "**الله اکبر**" اور اس کے بعد "**الحمد لله رب العالمين**" نہ ثنا ہے، نہ توجیہ "**انی وجهت وجهي**" الخ نہ اور کچھ ہے، اس لئے کہ حدیث میں ہے "**يفتتحون الصلاة بِ الحمد لله رب العالمين**".

جمہور حنفیہ کا کہنا یہ ہے کہ "**يفتتحون الصلاة**" سے مراد "**يفتتحون الجهر**" ہے۔ یعنی جہر یہاں سے شروع کرے، اس سے پہلے ثناء، تسمیہ وغیرہ سراً ہوں گے۔

۷۴۴ ـ حدثنا موسىٰ بن إسماعيل قال: حدثنا عبدالواحد بن زياد قال حدثنا عمارة بن القعقاع قال: حدثنا أبو زرعة قال: حدثنا أبو هريرة قال: كان رسول الله ﷺ يسكت بين التكبير وبين القرأة إسكاتة، قال: أحسبه قال: هنية. فقلت: بأبي وأمي يارسول الله، إسكاتك بين التكبير وبين القرأة ماتقول؟ قال: ((أقول: اللّٰهم باعد بيني وبين خطاياي كما باعدت بين المشرق والمغرب، اللّٰهم نقني من الخطايا كما ينقى الثوب الأبيض من الدنس، اللّٰهم اغسل خطاياي بالماء والثلج والبرد)). [۱۴۵]

---

[۱۴۴] وفى صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب حجة من قال لايجهر بالبسملة، رقم: ۶۰۲، وسنن الترمذى، كتاب الصلاة، باب ماجاء فى افتتاح القراءة ب الحمد لله رب العالمين، رقم: ۲۲۹، وسنن النسائى، كتاب الافتتاح، باب البداءة بفاتحة الكتاب قبل السورة، رقم: ۸۹۲، وسنن أبى داؤد، كتاب الصلاة، باب من لم ير الجهر ب بسم الله الرحمن الرحيم رقم: ۸۰۵، ومسند أحمد، باقى مسند المكثرين، باب مسند أنس بن مالک، رقم: ۱۱۵۵۲، ۱۱۶۹۲، ۱۲۲۵۳، ۱۲۴۲۱، ۱۲۶۳۰، ۱۲۶۵۱، ۱۲۸۵۸، ۱۳۱۸۵، ۱۳۲۸۴، ۱۳۳۸۵، ۱۳۵۶۳، وسنن الدارمى، كتاب الصلاة، باب كراهية الجهر ب بسم الله الرحمن الرحيم، رقم: ۱۲۱۲.

[۱۴۵] وفى صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب مايقال بين تكبيرة الاحرام والقراءة، رقم: ۹۴۰، وسنن النسائى، كتاب الافتتاح، باب الدعاء بين التكبيرة والقراءة، رقم: ۸۸۵، وسنن أبى داؤد، كتاب الصلاة، باب السكتة عند الافتتاح، رقم: ۶۶۳، وسنن ابن ماجه، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب افتتاح الصلاة، رقم: ۷۹۶، ومسند أحمد، باقى مسند المكثرين، باب مسند أبى هريرة، رقم: ۶۸۶۷، باقى المسند السابق، ۱۰۰۰۵، وسنن الدارمى، كتاب الصلاة، باب فى السكتتين، رقم: ۱۲۱۶.

قال: كان رسول الله ﷺ يسكت بين التكبير وبين القرأة إسكاتة ، قال: أحسبه قال: هنية.

حضرت ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ تکبیر اور قرأت کے درمیان کچھ دیر خاموش رہا کرتے تھے۔ "**إسكاتة ، قال: أحسبه قال: هنيّة**" راوی کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ انہوں "**هنيّة**" بھی کہا تھا۔ "**هنية**" کا مطلب ہے تھوڑی دیر۔ "**فقلت : بأبي وأمي يا رسول الله**" میں نے کہا میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں "**إسكاتك بين التكبير وبين القرأة ماتقول؟**" آپ جو تکبیر اور قرأت کے درمیان خاموش رہتے ہیں تو کیا پڑھتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

"**اللّٰهم باعد بيني و بين خطا ياي كما باعدت بين المشرق و المغرب ، اللّٰهم نقني من الخطايا كما ينقى الثوب الأبيض من الدنس ، اللّٰهم اغسل خطا ياي بالماء الثلج و البرد**".

پڑھتا ہوں اس موقع پر نبی کریم ﷺ سے مختلف اذکار ثابت ہیں، یہ بھی ان میں سے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے "**انى وجهت وجهى للذى فطر السمٰوات و الأرض حنيفا و ما أنا من المشركين**" اور "**سبحانک اللّٰهم وبحمدک**" بھی ہے۔ یہ سب اذکار جائز ہیں لیکن حنفیہ نے ان میں سے ثناء یعنی "**سبحانک اللّٰهم وبحمدک**" کو ترجیح دی ہے اور سنن اربعہ والی احادیث اس کی تائید کرتی ہیں۔

(۹۰) باب:

۷۴۵ ـ حدثنا ابن أبي مريم قال: أخبرنا نافع بن عمر قال: حدثني ابن أبي مليكة ، عن أسماء بنت أبي بكر : أن النبي ﷺ صلى صلاة الكسوف فقام فأطال القيام ، ثم ركع فأطال الركوع ، ثم قام فأطال القيام ، ثم ركع فأطال الركوع ، ثم رفع ثم سجد فأطال السجود ، ثم رفع ثم سجد فأطال السجود ، ثم قام فأطال القيام ثم ركع فأطال الركوع ، ثم رفع فأطال القيام ، ثم ركع فأطال الركوع ، ثم رفع فسجد فأطال السجود ، ثم رفع ، ثم سجد فأطال السجود ثم انصرف فقال: « قد دنت مني الجنة حتى لو اجترأت عليها لجئتكم بقطاف من قطافها ، ودنت مني النار حتى قلت : أي رب أو أنا معهم ؟ فإذا امرأة ـ حسبت أنه قال: تخدشها هرة ـ قلت : ماشأن هذه؟ قالوا : حبستها حتى ماتت جوعا ، لا هي أطعمتها ولا أرسلتها تأكل » . قال نافع: حسبت أنه قال : « تأكل من خيش أو خشاش

الأرض)).[أنظر : ۲۳۶۴][۱۴۶]

یہاں بعض نسخوں میں باب بلا ترجمہ ہے اور بعض میں نہیں ہے، اور دونوں صورتوں میں "**باب مایقرأ بعد التکبیر**" سے حدیث کی مناسبت "**أطال القیام**" کے لفظ میں ہے، کیونکہ طول قیام میں دعا اور قراءت سب کچھ شامل ہو جاتی ہے۔[۱۴۷]

یہ صلوٰۃ کسوف کا واقعہ ہے، جو ان شاء اللہ تفصیل سے صلوٰۃ کسوف کے باب میں آئے گا۔ اس کے آخر میں فرمایا کہ جنت مجھ سے اس قدر قریب آ گئی ہے کہ "**حتی لو اجترأت علیها لجئتکم بقطاف من قطافها**" اگر میں جرأت کرتا تو اس کے پھلوں میں سے کوئی پھل تمہارے لئے توڑ کر لے آتا "**ودنت مني النار**" اور جہنم بھی میرے قریب لائی گئی" **حتی قلت : اي رب أوأنا معهم** " اتنی قریب آ گئی کہ میں نے کہا یا اللہ "**اتعذبها وانا معهم**" یعنی اللہ جل جلالہ نے آپ ﷺ کے بارے میں فرمایا ہے "**ماکان الله لیعذبهم وانت فیهم**" (الایة) اور ابھی میں ان کے درمیان موجود ہوں تو کیا پھر بھی عذاب دیں گے۔ "**فإذا امرأة . حسبت أنه قال: تخدشها هرة**" اچانک ایک عورت نظر آئی۔

راوی کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے شاید آپ ﷺ نے فرمایا تھا "**تخدشها هرة**" یعنی ایک عورت نظر آئی جس کو بلی کھسوٹ رہی تھی۔ "**قلت :ماشأن هذه؟**" میں نے پوچھا کہ یہ کیا قصہ ہے؟" **قالوا: حبستها حتی ماتت جوعا**" کہا اس نے بلی کو بند کر دیا تھا یہاں تک کہ وہ بھوک کی وجہ سے مرگئی۔ "**لا هي أطعمتها ولا أرسلتها تأکل**" نہ اس نے اس کو کھلایا اور نہ چھوڑا کہ وہ خود کھالے۔ "**قال نافع: حسبت أنه قال**" نافع کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ آگے یہ بھی فرمایا تھا کہ "**تأکل من خشیش أوخشاش الأرض**" زمین کے کیڑے مکوڑے کھالے۔ اس کے لئے بھی نہیں چھوڑا اور خود بھی نہیں کھلایا اور باندھ کر رکھا۔ اب اس کو اس کا عذاب دیا جا رہا تھا کہ وہ بلی اس کو جہنم میں کھسوٹ رہی تھی۔

(۹۱) باب رفع البصر إلی الإمام في الصلاة،

نماز میں امام کی طرف نظر اٹھانے کا بیان

وقالت عائشة :قال النبي ﷺ في صلاة الکسوف :((رأیت جهنم یحطم بعضها

[۱۴۶] وفی سنن النسائی ، کتاب الکسوف ، باب التشهد والتسلیم فی صلاة الکسوف ، رقم: ۱۴۸۱ ، وسنن ابن ماجه ، کتاب اقامة الصلاة والسنة فیها ، باب ماجاء فی صلاة الکسوف ، رقم: ۱۲۵۵ ، ومسند أحمد ، باقی مسند الأنصار ، باب حدیث اسماء بنت أبی بکر الصدیق ، رقم: ۲۵۷۱۶.

[۱۴۷] عمدة القاری ، ج:۴، ص:۴۱۵.

بعضا حين رأيتموني تأخرت)).

آنکھ اٹھا کر امام کو دیکھنا

اس میں یہ مسئلہ بیان کر رہے ہیں کہ نماز کے اندر آنکھ اُٹھا کر دیکھنا کہ امام کیا کر رہا ہے یہ جائز ہے۔ اس کے لئے امام بخاری رحمہ اللہ مختلف حدیثیں لائے ہیں کہ صحابۂ کرام ﷺ نے منہ اٹھا کر نبی کریم ﷺ کی طرف دیکھا۔ اس میں مسلک مختار یہی ہے کہ اگر آدمی گردن کو موڑے بغیر امام کو دیکھ لے یا دائیں بائیں تھوڑا بہت دیکھ لے تو یہ جائز ہے۔ اگرچہ مسنون یہی ہے کہ نگاہ موضع سجود پر رہے لیکن اتنا دیکھنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، یہی امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث یہاں لائے ہیں جو صلوٰۃ الکسوف کے بارے میں ہے کہ فرمایا **"رأيت جهنم يحطم بعضها بعضا حين رأيتموني تأخرت"** میں نے جہنم کو دیکھا کہ اس کا کچھ حصہ دوسرے حصے کو توڑ رہا ہے، **"حطم يحطم"** کے معنی ہیں توڑ رہا ہے پیچھے گزرا ہے۔ کہ **"اكل بعضها بعضا حين رايتموني تاخرت"** جب تم نے دیکھا کہ میں پیچھے ہٹا تھا۔ پتہ چلا کہ جب حضور ﷺ پیچھے ہٹے تھے تو صحابۂ کرامؓ نے حضور ﷺ کو دیکھا تھا، معلوم ہوا کہ امام کو دیکھنا جائز ہے۔

۷۴۶ ـ حدثنا موسى قال: حدثنا عبد الواحد قال: حدثنا الأعمش، عن عمارة ابن عمير، عن أبي معمر قال: قلنا لخباب: أكان رسول الله ﷺ يقرأ في الظهر والعصر؟ قال: نعم، فقلنا: بم كنتم تعرفون ذاك؟ قال: باضطراب لحيته. [أنظر: ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۷۷] [۱۴۸]

قال: قلنا لخباب: أكان رسول الله ﷺ يقرأ في الظهر والعصر؟

پوچھا کہ کیا حضور اقدس ﷺ ظہر اور عصر میں قرأت کرتے تھے؟

"قال: نعم، فقلنا: بم كنتم تعرفون ذاك؟ قال: باضطراب لحيته".

تو فرمایا **"نعم"** ہاں، پوچھا آپ کو کیسے پتہ چلتا تھا؟ حضرت خباب ﷺ نے فرمایا **"باضطراب لحيته"** آپ ﷺ کی داڑھی مبارک میں پڑھنے کی وجہ سے حرکت ہوتی تھی جو پیچھے سے نظر آرہی ہوتی تھی کہ آپ ﷺ کی لحیہ مبارکہ حرکت کر رہی ہے۔

---

۱۴۸ وفي سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب ماجاء في القراءة في الظهر، رقم: ۶۷۸، وسنن ابن ماجه، كتاب اقامة الصلاة، والسنة فيها، باب القراءة في الظهر والعصر، رقم: ۸۱۸، ومسند أحمد، اول مسند البصريين، باب حديث خباب بن الأرت عن النبي ﷺ، رقم: ۲۰۱۴۷، ۲۰۱۶۶، ۲۵۹۵۷

اس سے معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام ﷺ حضور اقدس ﷺ کی لحیہ مبارکہ کے اضطراب کو دیکھتے تھے، پتا چلا کہ یہ جائز ہے۔

۷۴۹ ۔ حدثنا محمد بن سنان قال : حدثنا فليح قال : حدثنا هلال بن علي ، عن أنس بن مالک قال : صلى لنا النبي ﷺ ثم رقى المنبر فأشار بيديه قبل قبلة المسجد . ثم قال : ((لقد رأيت الآن منذ صليت لكم الجنة والنار ممثلتين في قبلة هذا الجدار ، فلم أر كاليوم في الخير والشر)) ، ثلاثا. [راجع :۹۳]

"لقد رأيت الآن منذ صليت لكم الجنة والنار ممثلتين في قبلة هذا الجدار ، فلم أر كاليوم في الخير والشر".

آپ ﷺ نے فرمایا: کہ میرے اوپر ابھی جنت اور نار اس دیوار کے کنارے میں پیش کی گئی **"فلم أرَ الخير و الشر"** تو جنت جیسی خیر اور نار جیسا شر میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ یعنی جنت اتنی بہترین چیز تھی کہ اس سے پہلے اتنی بہترین چیز نہیں دیکھی اور جہنم ایسی شر تھی کہ اس سے پہلے العیاذ باللہ اس جیسا شر نہیں دیکھا۔

اب اگر اس کو سائنٹیفک طریقے سے منطبق کریں کہ جنت اور نار دیوار کے کونے میں آ گئی، تو نہیں کر سکتے۔ جبکہ جنت کا ادنیٰ ترین حصہ جو دیا جائے گا وہ دنیا سے ستر گنا زیادہ ہوگا، اب وہ دیوار کے کونے میں جنت اور نار کیسے آ گئی، تو اس کا تعلق عالم غیب سے ہے، اس کو اپنے ظاہری احوال اور مشاہدے کے قواعد پر منطبق کرنے کی کوشش ہی فضول ہے۔

(۹۲) باب رفع البصر إلى السماء في الصلاة

نماز میں آسمان کی طرف نظر اٹھانے کا بیان

۷۵۰ ۔ حدثنا علي بن عبد الله قال: أخبرنا يحيى بن سعيد قال: حدثنا ابن أبي عروبة قال: حدثنا قتادة أن أنس بن مالک حدثه قال: قال رسول الله ﷺ: ((ما بال أقوام يرفعون أبصارهم إلى السماء في صلاتهم؟)) فاشتد قوله في ذلک حتى قال: ((لينتهين عن ذلک أو لتخطفن أبصارهم)).

"لينتهينّ عن ذلک أو لتخطفن أبصارهم" یعنی یا تو نگاہیں آسمان کی طرف اٹھانے سے باز آجائیں، ورنہ ان کی آنکھیں اچک لی جائیں گی۔

(۹۳) باب الإلتفات فی الصلاة

نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنے کا بیان

۷۵۱ ۔ حدثنا مسدد قال: حدثنا أبو الأحوص قال: حدثنا أشعث بن سلیم، عن أبیه، عن مسروق، عن عائشة قالت: سألت رسول اللہ ﷺ عن الإلتفات فی الصلاة. فقال: ((هو اختلاس یختلسه الشیطان من صلاة العبد)). [أنظر: ۳۲۹۱][۱۴۹]

التفات فی الصلاۃ کا حکم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے **"التفات فی الصلوٰۃ"** کے بارے میں پوچھا یعنی نماز کے اندر کسی چیز کی طرف متوجہ ہونا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ اختلاس ہے جس کو شیطان بندہ کی نماز میں چھین کرلے جاتا ہے۔

اختلاس کہتے ہیں کسی سے زبردستی کوئی چیز چھین جھپٹ کر لے جانا، یعنی انسان اللہ جل جلالہ کے لئے نماز پڑھ رہا ہوتا ہے اور اس کو اس پر اجر مل رہا ہوتا ہے، شیطان آکر نماز کا اجر اس سے چھین کر لے جاتا ہے۔

اس روایت میں **"التفات فی الصلوٰۃ"** کی مذمت فرمائی۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑا بہت **"التفات فی الصلوٰۃ"** کو گوارا کیا گیا ہے، جیسا کہ آگے امام بخاری رحمہ اللہ مستقل باب قائم فرمارہے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے دیکھا کہ قبلہ کی جانب تھوک پڑا ہوا ہے، آپ ﷺ نے اس کو نماز کے اندر ہی مسل دیا، اس طرح کی کئی روایات ہیں۔

عندالحنفیہ وعندالجمہور دونوں روایات میں تطبیق یہ ہے کہ اگر یہ التفات گردن موڑے بغیر ہو صرف کنکھیوں یعنی گوشۂ چشم سے نگاہ ڈالی ہو تو یہ جائز ہے اور اگر گردن موڑنے کے ساتھ ہو اور قلیل ہو یعنی ایک آدھ مرتبہ ذرا سی گردن موڑ لی تو یہ مکروہ ہے اور اگر کثیر ہے یعنی بار بار گردن موڑ کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے تو یہ کثیر ہے اور مفسد صلوٰۃ ہے، یہ تطبیق ہے اور یہی حکم شرعی ہے۔

پھر جمہور کے نزدیک سنت یہ ہے کہ نگاہ موضع سجود پر ہے، البتہ مالکیہ کے نزدیک امام کی طرف دیکھنا مسنون ہے، جمہور کی تائید بیہقی میں حضرت محمد بن سیرین کی مرسل روایت ہوتی ہے۔

---

[۱۴۹] وفی سنن الترمذی، کتاب الجمعة عن رسول اللہ، باب ماذکر فی الالتفات، رقم: ۵۳۸، وسنن النسائی، کتاب السهو، باب التشدید فی الالتفات فی الصلاة، رقم: ۱۱۸۶، ومسند أحمد، باقی مسند الأنصار، باب حدیث السیدة عائشة، رقم: ۲۳۲۷۶، ۲۳۶۰۳.

نیز حضرت انس سے ایک روایت ہے "**قلت : يا رسول الله أين يضع بصري في الصلاة ، قال : عند موضع سجودك يا أنس ! قال قلت : يارسول الله هذا شديد لا أستطيع هذا ، قال : ففي المكتوبة اذاً**" لیکن امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کو روایت کر کے اسے ربیع بن بدر کی وجہ سے ضعیف کہا ہے، البتہ اس سے پہلے جو روایات ذکر کی ہیں، ان کے مجموع سے اس پر استدلال کیا ہے۔[۱۵۰]

(۹۴) باب: هل يلتفت لأمر ينزل به؟ أو يرى شيئا أو بصاقا في القبلة؟

نماز میں کوئی خاص واقعہ پیش آجائے یا سامنے تھوک یا کوئی چیز دیکھے تو کیا یہ جائز ہے

"وقال سهل: التفت أبو بكر ﷺ فرأى النبي ﷺ".

۷۵۳ ـ حدثنا قتيبة بن سعيد قال: حدثنا ليث، عن نافع، عن ابن عمر أنه قال: ((رأى النبي ﷺ نخامة في قبلة المسجد وهو يصلي بين يدي الناس فحتها)). ثم قال حين انصرف: ((إن أحدكم إذا كان في الصلاة فإن الله قبل وجهه فلا يتنخمن أحد قبل وجهه في الصلاة)) . رواه موسى بن عقبة وابن أبي رواد عن نافع. [راجع: ۴۰۶]

یہ باب قائم کیا ہے کہ "**هل يلتفت لأمر ينزل به؟ أو يرى شيئًا أو بصاقا في القبلة**"؟ کوئی واقعہ پیش آجائے تو اس کی وجہ سے التفات کرلے یا قبلہ کی جانب کوئی ایسی چیز پڑی ہوئی دیکھی جس کو نکالنا ضروری ہے اس کی وجہ سے التفات کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کسی حاجت کی وجہ سے التفات کا جواز ثابت ہے۔ حضرت سہل بن ساعدی ﷺ کی روایت ہے کہ صدیق اکبر ﷺ نے جب دیکھا کہ نبی کریم ﷺ تشریف لائے ہیں تو التفات کیا۔

۷۵۴ ـ حدثنا يحيى بن بكير: حدثنا الليث بن سعد، عن عقيل، عن ابن شهاب قال: أخبرني أنس بن مالك قال: بينما المسلمون في صلاة الفجر لم يفجأهم إلا رسول الله ﷺ قد كشف ستر حجرة عائشة ، فنظر إليهم وهم صفوف فتبسم يضحك، ونكص أبو بكر ﷺ على عقبيه ليصل له الصف، فظن أنه يريد الخروج و هم المسلمون أن يفتتنوا في صلاتهم، فأشار إليهم: أن اتموا صلاتكم، و أرخى الستر و توفي من آخر ذلك اليوم. [راجع: ۶۸۰]

"و هم المسلمون أن يفتتنوا في صلاتهم".

مسلمانوں کو خیال ہوا کہ وہ اپنی نمازوں کے بارے میں فتنہ میں مبتلا ہو جائیں گے، حضور اقدس ﷺ کے چہرۂ انور کا دیدار کر کے خوشی ہوئی، اس خوشی اور مسرت کی وجہ سے اندیشہ ہوا کہ کہیں نماز نہ ٹوٹ جائے۔

---

[۱۵۰] السنن الكبرىٰ، ص : ۲۸۴ ، ج : ۲.

یہاں مقصود یہ ہے کہ صدیق اکبر ﷺ اور صحابہ کرام ﷺ نے دیکھا کہ حضور اقدس ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کی طرف سے تشریف لا رہے تھے، ادھر صفیں بنی ہوئی تھیں، اب نظر اُسی وقت آسکتے تھے جب تھوڑا سا التفات کیا ہو، معلوم ہوا کسی حاجت کی وجہ سے التفات قلیل جائز ہے۔

اسفار فی الفجر میں حنفیہ کا استدلال

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نماز فجر اسفار میں ہو رہی تھی ورنہ حضور اقدس ﷺ کو صحابہ ﷺ اور صحابہ ﷺ کو حضور اقدس ﷺ نظر نہ آتے، یہ بھی حنفیہ کی دلیل ہے۔

(۹۵) باب وجوب القراءة للإمام والمأموم فی الصلوات كلها، فی الحضر و السفر، وما يجهر فيها وما يخافت.

تمام نمازوں میں خواہ وہ سفر میں ہوں یا حضر میں ہوں سری ہوں یا جہری، امام اور مقتدی کے لئے قرأت کے واجب ہونے کا بیان

۷۵۵ ـ حدثنا موسىٰ قال: حدثنا أبو عوانة قال: حدثنا عبدالملک بن عمير عن جابر بن سمرة قال: شكا أهل الكوفة سعدا إلى عمر ﷺ، فعزله وإستعمل، عليهم عمارا، فشكوا حتى ذكروا أنه لا يحسن يصلي، فأرسل إليه فقال: يا أبا إسحاق، إن هولاء يزعمون أنک لا تحسن تصلي. قال: أما أنا والله فإني كنت أصلي بهم صلاة رسول الله ﷺ، ما أخرم عنها، أصلي صلاة العشاء فأركد في الأوليين، وأخف في الأخريين . قال: ذاک الظن بک يا أبا إسحاق. فأرسل معه رجلا أو رجالا إلى الكوفة، فسأل عنه أهل الكوفة، ولم يدع مسجدا إلا سأل عنه و يثنون عليه معروفا حتى دخل مسجدا لبني عبس، فقام رجل منهم يقال له: أسامة بن قتادة . يكنىٰ أبا سعدة. قال: أما إذ نشدتنا فإن سعدا كان لا يسير بالسرية، و لا يقسم بالسوية، ولا يعدل في القضية: قال سعد: أما والله لادعون بثلاث: اللّٰهم إن كان عبدک هذا كاذبا، قام رياء وسمعة، فأطل عمره، وأطل فقره، و عرضه بالفتن قال: فكان بعد إذا سئل يقول: شيخ كبير مفتون أصابتني دعوة سعد. قال عبد الملک: فأنا رأيته بعد قد سقط حاجباه على عينيه من

الکبر، و إنه لیتعرض للجواری فی الطرق یغمزهن. [انظر: ۷۵۸، ۷۷۰][۱۵۱]

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی معزولی

یہ حدیث ذکر کی ہے کہ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "**شکا أهل الکوفة سعدًا إلیٰ عمر** رضی اللہ عنہ" اہل کوفہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی شکایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کی۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو عراق کا گورنر بنایا تھا اور کوفہ عراق کا دارالحکومت تھا۔ کوفہ والے بڑے فتنہ پرداز قسم کے لوگ تھے، مقولہ مشہور ہے "**الکوفی لا یوفی**" وہاں کے لوگ کسی بھی امیر کو ٹکنے نہیں دیتے تھے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ حضور اقدس ﷺ نے ان کے لئے یہ فرمایا "**ارم یا سعد فداک أبی و أمی**" ایسے صحابی وہاں امیر بنے تو ان کے خلاف بھی شکایتیں شروع کر دیں۔

جب انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی تو "**فعزله**" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو معزول کر دیا۔

معزول کرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپ نے اہل کوفہ کی شکایت کو درست تسلیم کر لیا کیونکہ خود آگے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "**ذاک الظنّ بک یا اسحاق**" میرا گمان یہی تھا کہ شکایتیں غلط ہیں اور آپ صحیح ہیں۔ نیز شہادت سے پہلے آپ نے جو وصیت فرمائی اس میں اپنے بعد خلیفہ کو حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے مشورہ کرتے رہنے کی تاکید کی، اور فرمایا کہ "**فانی لم اعزله عن عجز و لا خیانة**" جیسا کہ آپ انشاء اللہ "**کتاب المناقب، باب بیعة عثمان**" میں پڑھیں گے۔

معزول کرنے کی مختلف وجوہات

ایک یہ کہ ان کا اصول تھا کہ ایک گورنر کو ایک ہی جگہ پر زیادہ عرصہ نہیں رکھتے تھے، تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہاں کے لوگوں سے مل ملا کر سست پڑ جائیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ حتی الامکان یہی چاہتے تھے کہ گورنر غیر مختلف فیہ آدمی ہو وغیرہ وغیرہ۔

بہر حال ان کو معزول کر دیا "**واستعمل علیهم عمّارا**" اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو عامل بنایا اور خاص طور پر ان کو نماز کے لئے مقرر کیا۔

---

[۱۵۱] وفی صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب القراءة فی الظهر والعصر، رقم: ۶۸۹، وسنن النسائی، کتاب الافتتاح، باب الرکود فی الرکعتین الاولیین، رقم: ۹۹۲، وسنن أبی داؤد، کتاب الصلاة، باب تخفیف الأخریین، رقم: ۶۸۰، ومسند أحمد، مسند العشرة المبشرین بالجنة، باب مسند أبی اسحاق سعد بن أبی وقاص، رقم: ۱۴۲۸، ۱۴۶۶، ۱۴۷۵.

"**فشکو**" یہاں سمجھ لیں کہ یہ "**شکوا**" پہلے "**شکوا**" کی تفسیر ہے۔ یہاں جس طرح عبارت مذکور ہے اس میں ظاہر اور متبادر یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو عامل بنایا تو پھر حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی بھی شکایت کرنی شروع کر دی، لیکن یہ مراد نہیں ہے، بات یہاں ختم ہوگئی "**واستعمل علیھم عمّاراً**"۔

اب آگے "**فشکوا**" سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی جو شکایت کی تھی اس کی تفصیل آ رہی ہے۔

"**فشکوا**" اہل کوفہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی شکایت کی کہ "**حتیٰ ذکروا أنہ لا یحسن یصلی**" ان اللہ کے بندوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ نماز صحیح نہیں پڑھتے۔

دیگر شکایات میں سے ایک شکایت یہ تھی کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کا دروازہ ذرا موٹا لگایا تھا، وجہ اس کی یہ تھی کہ ان کا گھر بازار کے قریب تھا اور شور وشغب زیادہ تھا اس سے بچنے کے لئے موٹا دروازہ لگا لیا، اگر چہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے عمال کو یہ حکم تھا کہ وہ اپنے گھروں پر دربان نہ رکھیں۔

اب اہل کوفہ نے شکایت کی کہ انہوں نے موٹا دروازہ اس لئے لگایا ہے کہ ہم ان کے پاس شکایت لے کر نہ جا سکیں۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ بعض اوقات تیر اندازی کے لئے جایا کرتے تھے تو اس کی شکایت کر دی کہ یہ شکار کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہاں تک کہہ دیا کہ یہ نماز اچھی نہیں پڑھتے، یعنی عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کے بارے میں فرمایا "**فداک أبی و أمی**" وہ تو نماز اچھی نہیں پڑھتے اور اہلِ کوفہ اچھی پڑھتے ہیں، تو اس قسم کی شکایتیں تھیں۔

"**فقال: یا أبا إسحاق، إن ھؤ لاء یزعمون أنک لا تحسن تصلّی**"۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو کر بلا کر کہا کہ اے ابو اسحٰق! یہ لوگ دعویٰ کر رہے ہیں کہ آپ اچھی طرح نماز نہیں پڑھتے۔

"**قال: أمّا أنی و اللہ فإنی کنت أصلی بھم صلوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم**" میں تو ان کو ایسی نماز پڑھاتا تھا جیسی میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھاتے دیکھا تھا "**ما اخرم عنھا**" اس میں کوئی کمی نہیں کرتا تھا۔ "**خرم - یخرم**" کے معنی ہیں کمی کرنا۔

"**أصلّی صلوٰۃ العشاء فارکد فی الاولین وأحف فی الأخرین**" میں عشاء کی نماز پڑھاتا تھا تو پہلی دو رکعتوں میں "رکود" کرتا تھا۔ "رکود" کے معنی ہے ٹھہرنا، مراد طویل قیام یعنی پہلی دو رکعتوں میں طویل قرأت کرتا تھا اور دوسری دو رکعتوں میں ہلکی قرأت کرتا تھا۔

"**قال: ذاک الظنّ بک یا أبا إسحاق**" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے ابو اسحٰق آپ سے یہ گمان تھا کہ آپ اچھی نماز ہی پڑھائیں گے، بے شک یہ لوگ فضول باتیں کر رہے ہیں۔

چونکہ متعدد شکایات تھیں اس لیے ان کی تحقیق کے لئے **"فأرسل معه رجلا أو رجالا إلى الكوفة"** ایک یا زیادہ لوگوں کو کوفہ بھیجا، بھیجنے کا مقصد حضرت سعد رضی اللہ عنہ پر کوئی شک نہیں تھا، بلکہ یہ دکھانا تھا کہ ہر حاکم کے حالات کی تحقیق ہو سکتی ہے۔ **"فسأل عنه أهل الكوفة"** ان کے بارے میں اہل کوفہ کے تأثرات معلوم کئے **"ولم يدع مسجداً إلاسأل عنه"** جو لوگ ساتھ گئے تھے انہوں نے کوئی مسجد نہیں چھوڑی، ہر جگہ لوگوں سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بارے میں سوال کیا کہ یہ کیسے ہیں **"و يثنون عليه معروفا"** سب لوگ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی تعریف کرتے تھے **"حتى دخل مسجداً لبني عبس"** یہاں تک کہ بنو عبس کی ایک مسجد میں گئے اور وہاں کے لوگوں سے پوچھا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کیسے شخص ہیں؟ **"فقام رجل منهم، يقال له: أسامة بن قتادة"** ایک شخص کھڑا ہوا جس کا نام اسامہ بن قتادہ اور کنیت ابو سعدہ تھی۔ اس نے کہا **"اما إذ نشدتنا"** جب آپ نے ہم سے قسم دے کر پوچھا ہے کہ صحیح بتائیں۔

"نشد ۔ ينشد" بہت سارے معنی میں استعمال ہوتا ہے ان میں ایک معنی "قسم دے کر پوچھنا" بھی ہے۔

"فإن سعداً كان لا يسير بالسرية، ولا يقسم بالسوية ولا يعدل في القضيّة".

اس نے تین باتیں بیان کیں کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ سریہ میں نہیں جاتے، سریہ کے معنی لشکر کے ہیں یعنی جہاد نہیں کرتے۔

ذرا غور فرمائیں جو فاتح ایران ہے؛ جس نے پورا ایران فتح کیا۔ جس نے سب سے پہلے اللہ جل جلالہ کے راستے میں تیر چلایا، جس نے بدر واحد میں فدا کاری کا مظاہرہ کیا۔ ان کے بارے میں یہ تین اعتراضات کئے کہ:

پہلا اعتراض یہ کہ جہاد میں نہیں جاتے۔

دوسرا اعتراض یہ کہ جب مال غنیمت آتا ہے تو لوگوں میں برابر تقسیم نہیں کرتے۔

تیسرا اعتراض یہ کیا کہ فیصلوں میں انصاف نہیں کرتے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

"قال سعد: أما والله لأدعون بثلاث" دوسری روایت میں اس طرح کے الفاظ ہیں کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو پتا چلا تو فرمایا: **"أما والله لادعون بثلاث: اللهم إن كان عبدك هذا كاذبا، قام رياء وسمعة، فأطل عمره، وأطل فقره، و عرضه بالفتن"** یہ سارا سجع، قافیہ تجھے میرے ہی بارے میں سوجھا یعنی **"سريّة ، سوية وقضية"** فرمایا میں تیرے حق میں تین دعائیں کروں گا اور پھر یہ دعا فرمائی۔

"اللهم إن كان عبدك هذا كاذبا، قام رياء وسمعة" اے اللہ! اگر یہ بندہ جھوٹا ہے جو صرف دکھلاوے اور شہرت کی وجہ سے کھڑے ہو کر یہ باتیں کر رہا ہے، تاکہ کہا جائے کہ بڑا بہادر ہے جس نے اپنے گورنر کے خلاف منہ پر ایسی باتیں کہدی ہیں، **"فأطل عمره وأطل فقره و عرّضه بالفتن"** تو اے

اللہ! اس کی عمر بڑھا دیجئے اور اس کا فقر طویل کر دیجئے اور اس کو فتنوں کا نشانہ بنا دیجئے۔

ذرا غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ جیسے صحابی کے لئے کوئی شخص کھڑے ہو کر یہ کہدے کہ یہ جہاد نہیں کرتے، مال غنیمت برابر تقسیم نہیں کرتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عدل وانصاف سے فیصلہ نہیں کرتے۔ اس پر غصہ آنا طبعی بات ہے لیکن غصہ کے باوجود حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی احتیاط کا عالم یہ ہے کہ بددعا سے پہلے دو شرطیں لگائیں ایک یہ کہ اگر یہ جھوٹا، ہو دوسری یہ کہ ریاءً وسمعۃً یہ بات کہہ رہا ہو کہ، یعنی اگر اخلاص سے غلط بات کہہ رہا ہو تب بھی میں اس کے خلاف بددعا نہیں کرتا۔

معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص غلط فہمی کی وجہ سے اخلاص سے کوئی بات کہہ رہا ہو تو اس کے بارے میں بھی بددعا نہیں کرنی چاہئے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بددعا

اس شخص نے تین جملے کہے تھے، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بھی تین بددعائیں دیں:

پہلی بددعا یہ دی کہ یا اللہ! اس کی عمر طویل کر۔ بظاہر طویل عمر ہونا خود کوئی بددعا نہیں ہے لیکن ساتھ فرمایا **"واطل فقرہ"** کہ اس کا فقر بھی لمبا ہو اور ساتھ یہ فتنوں کا نشانہ بن جائے۔

اس نے جو تین جملے کہے تھے ان میں پہلی دو باتوں کا تعلق دنیوی امور سے تھا **"لا یسیر بالسریة ولا یقسم بالسویة"** اور تیسری چیز جو دین سے متعلق تھی اور سب سے خطرناک تھی اس کے مقابلے میں بددعا بھی دین کے بارے میں دی کہ یہ فتنہ میں مبتلا ہو جائے، العیاذ باللہ العظیم۔

"قال: فكان بعد إذا سئل" حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بددعا اس کے حق میں قبول ہوئی اور ایسا ہی ہوا کہ اس کی عمر لمبی ہوگئی، جب اس سے پوچھا جاتا تو کہتا **"شیخ کبیر مفتون"** میں ایک بڑا عمر رسیدہ بڈھا ہوں جو فتنے کا نشانہ بن گیا **"أصابتني دعوة سعد"** مجھے سعد رضی اللہ عنہ کی بددعا لگ گئی۔

"قال عبدالملک: فأنا رأیته بعد قد سقط حاجباه علی عینیه من الکبر"۔

میں نے دیکھا اس کی ابروئیں آنکھوں پر گر گئی تھیں یعنی عمر لمبی ہوئی اور اتنا بڈھا ہوا کہ ابروؤں کی کھال لٹک کر آنکھوں پر گر گئی تھی لیکن اس کے باوجود **"أنه لیتعرض للجواری فی الطرق یغمزهن"** راستہ میں کھڑا ہوتا اور جو لڑکیاں گزرتیں ان کا پیچھا کرتا اور ان کی چٹکی لینے کی کوشش کرتا۔ جہاں موقع ملتا ہاتھ پکڑ کے یا جسم پر جہاں بھی ہاتھ پڑتا اس کو دبانے کی کوشش کرتا۔ اللہ جل جلالہ پناہ میں رکھیں۔ آمین۔

یہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بددعا کا نتیجہ تھا کہ ایسے فتنے میں مبتلا ہوا کہ بڑھاپے میں بھی لڑکیوں کے پیچھے بھاگتا پھرتا تھا، العیاذ باللہ العظیم۔

جب اس نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ جیسی عظیم شخصیت کے بارے میں ایسی بری بات کہی تو اللہ جل جلالہ نے اس کو دنیا میں ہی اس کی عبرتناک سزا دے دی۔

اشکال: بعض اوقات یہ اشکال کیا جاتا ہے کہ اگر حضرت سعد رضی اللہ عنہ بددعا نہ دیتے تو کیا ہوتا؟

جواب: علماء نے فرمایا ہے کہ بددعا دینا بھی ان کی طرف سے شفقت ہی تھی کہ اس کو اس گناہ کا بدلہ آخرت کے بجائے دنیا میں ہی مل جائے اور یہاں سے پاک صاف ہو کر اللہ جل جلالہ کے پاس جائے، ورنہ: **"من عادی لی ولیا فقد آذنني بالحرب"**. [۱۵۲]

اللہ جل جلالہ آخرت میں کیا عذاب دیتا اس سے یہ دنیا کا عذاب بہتر ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس پر جو ترجمۃ الباب قائم فرمایا ہے **" باب وجوب القرأة للإمام و المأموم في الصلوٰت کلها، في الحضر والسفر، وما یجهر فیها وما یخافت"**.

ترجمۃ الباب کا مقصد

اس باب کے اندر یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ امام اور مقتدی دونوں کے لئے قرأت واجب ہے۔

لامع الدراری میں اس ترجمہ کے بہت سارے اجزاء ہیں کہ امام کے لئے قرأت واجب ہے۔ یہ بات تو اس حدیثِ باب سے سمجھ آگئی۔ اگرچہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ثابت ہوتا ہے اور عمل وجوب کی دلیل نہیں ہوتی، اسی لئے حنفیہ کے نزدیک قراءت صرف دو رکعتوں میں فرض ہے، باقی دو رکعتوں میں فرض نہیں، شافعیہ، حنابلہ اور مالکیہ کے نزدیک چاروں رکعتوں میں قراءت فرض ہے، مالکیہ کے نزدیک چاروں میں واجب ہے، مگر ایک رکعت میں قراءت چھوڑنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

"في الصلوٰت کلها" اس لئے کہہ دیا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں ابوداؤد میں ایک روایت مروی ہے، کہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ ظہر اور عصر میں قرأت ہے ہی نہیں، نہ سری ہے اور نہ جہری اور پیچھے حضرت خباب بن انس رضی اللہ عنہ کی جو حدیث گزری ہے کہ ان سے کسی نے پوچھا کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ظہر اور عصر میں قرأت کیا کرتے تھے؟ انہوں نے کہا ہاں، پوچھا، آپ کو کیسے پتہ چلا؟ کہا داڑھی کی حرکت سے، تو یہ سوال بھی اسی پس منظر میں کیا گیا تھا کیونکہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول مشہور ہو گیا تھا کہ ظہر اور عصر میں قرأت نہیں ہے۔

چونکہ بعض لوگوں کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ظہر اور عصر میں قرأت نہیں ہے، اس لئے فرمایا **"وجوب القرأة في الصلوٰت کلها"** اس سے اس مسلک کی تردید کی طرف اشارہ ہے اور حدیثِ باب میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا

---

[۱۵۲] تذکرة الحفاظ، ج:۴، ص:۱۴۶۳، وجامع العلوم والحکم، ج:۱، ص:۳۶۰.

یہ فرمانا کہ میں تو ویسے ہی نماز پڑھاتا تھا جیسے حضور ﷺ کو پڑھتے دیکھا تھا، اس سے پتہ چلا کہ وہ تمام نمازوں میں قرأت کرتے تھے۔

ترجمۃ الباب کے اجزاء کی تشریح

آگے فرمایا" **باب وجوب القرأة للإمام و المأموم** " کہ مأموم کے لئے بھی نمازوں میں قرأت واجب ہے۔

اس حدیث میں تو مقتدی کی قرأت کا کوئی ذکر نہیں ہے، البتہ اس کو حضرت عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت ہے جو آگے آرہی ہے "**إن رسول اللہ ﷺ قال: لا صلوٰة لمن لم يقرا بفاتحة الكتاب**" جو فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں۔ کہتے ہیں اس میں حکم عام ہے امام اور مقتدی دونوں کے لئے ہے، تو مأموم کا لفظ یہاں سے نکالا۔

آگے فرمایا" **في الحضر و السفر** " کہ یہ قرأت حضر میں بھی واجب ہے اور سفر میں بھی واجب ہے۔

حضر کے متعلق تو ساری روایات ہیں لیکن سفر کا ذکر نہ بظاہر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے، نہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے ورنہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے جو آگے آرہی ہے، تو سفر کا لفظ کیسے بڑھا دیا؟

اس کا منشأ یہ ہے کہ قرأت کے بارے میں سفر اور حضر کے احکام مختلف نہیں ہیں، جس طرح تعداد رکعت میں فرق ہے اس طرح قرأت میں فرق نہیں، جب حضر میں ثابت ہوگیا تو سفر میں بھی وہی حکم ثابت ہوگیا۔

آگے فرمایا"**وما يجهر فيها وما يخافت**" اور کس نماز میں قرأت جہراً پڑھی جائے اور کس میں آہستہ پڑھی جائے۔

یہاں روایت میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عشاء کی نماز کے بارے میں فرمایا" **أركد في الأوليين وأخف في الأخريين**"۔" **ركود**" کے معنی ٹھہرنے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ میں پہلی دو رکعتوں میں قیام نسبتاً لمبا کرتا ہوں اور آخری دو رکعتوں میں مختصر کرتا ہوں۔

تو پہلی دو رکعتوں میں جہر سے پڑھتے تھے اور نسبتاً طویل قرأت کرتے تھے اور دوسری دو رکعتوں میں سر سے پڑھتے تھے، اس سے "**جهر فيها وما يخافت**" کا بھی ذکر مناسب ہوگیا۔

۷۵۷ ۔ حدثنا محمد بن بشار قال: حدثنا يحيىٰ عن عبيداللہ قال: حدثني سعيد ابن أبي سعيد عن أبيه عن أبي هريرة: أن رسول اللہ ﷺ دخل المسجد فدخل رجل

فصلی فسلم علی النبی ﷺ فرد، فقال: ((ارجع فصل فإنک لم تصل))، فرجع فصلی کما صلی، ثم جاء فسلم علی النبی ﷺ فقال: ((ارجع فصلی فإنک لم تصل))، ثلاثا فقال: والذی بعثک بالحق ما أحسن غیره، فعلمنی. فقال: ((إذا قمت إلی الصلاة فکبر، ثم أقرا ما تیسر معک من القرآن، ثم أرکع حتی تطمئن راکعا، ثم أرفع حتی تعتدل قائما، ثم أسجد حتی تطمئن ساجدا، ثم أرفع حتی تطمئن جالسا، وافعل ذلک فی صلاتک کلها)). [أنظر: ۷۹۳، ۶۲۵۱، ۶۲۵۲، ۶۶۶۷]

اس میں مقصود بالترجمہ ہے **"ثم اقرأ ما تیسّر معک من القرآن"** اس میں قرأت کو واجب قرار دیا۔

(۹۶) باب القرأة فی الظهر

نمازِ ظہر میں قرأت کا بیان

حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ کا جو قول تھا کہ ظہر اور عصر میں قرأت نہیں ہے اب اس کی تردید میں ابواب قائم کئے ہیں جن میں ظہر اور عصر میں قرأت ثابت کی ہے، بعد میں حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ نے بھی اس سے رجوع فرمالیا تھا۔

۷۵۹ ۔ حدثنا أبو نعیم قال: حدثنا شیبان، عن یحیی، عن عبداللہ بن أبی قتادة، عن أبیه، قال: کان رسول اللہ ﷺ یقرأ فی الرکعتین الأولیین من صلاة الظهر بفاتحة الکتاب و سورتین یطول فی الأولی و یقصر فی الثانیة، و یسمع الآیة احیاناً و کان یقرأ فی العصر بفاتحة الکتاب و سورتین، وکان یطول فی الأولیٰ و کان یطول فی الأولی من صلاة الصبح، و یقصر فی الثانیة.[أنظر: ۷۶۲، ۷۷۶، ۷۷۸، ۷۷۹] [۱۵۳]

۱۵۳ وفی صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب القرائة فی الظهر والعصر، رقم: ۶۸۵، وسنن النسائی، کتاب الافتتاح، باب تطویل القیام فی الرکعة الاولیٰ من صلاة الظهر، رقم: ۹۶۴، ۹۶۶، وسنن أبی داؤد، کتاب الصلاة، باب ماجاء فی القراء ة فی الظهر، رقم: ۶۷۷، وسنن ابن ماجه، کتاب اقامة الصلاة والسنة فیها، باب الجهر بالآیة احیاناً فی صلاة الظهر والعصر، رقم: ۸۲۱، ومسند أحمد، باقی مسند الأنصار، باب حدیث أبی قتادة الأنصاری، رقم: ۲۱۴۸۲، ۲۱۵۲۰، ۲۱۵۶۹، ۲۱۵۹۶، وسنن الدارمی، کتاب الصلاة، باب کیف العمل بالقراء ة فی الظهر والعصر، رقم: ۱۲۶۰.

یہاں یہ فرمایا ہے کہ آپ ﷺ پہلی رکعت میں طویل قرأت فرماتے تھے اور دوسری رکعت میں اس سے کم، اس سے امام محمد رحمہ اللہ نے اس بات پر استدلال فرمایا ہے کہ ہر نماز میں پہلی رکعت طویل کرنا اور دوسری اس سے کم کرنا سنت ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا فرمانا یہ ہے کہ اور تمام نمازوں میں تو دونوں رکعتیں برابر ہوں، البتہ فجر میں پہلی رکعت طویل اور دوسری اس سے کم ہو۔

یہاں پہلی رکعت طویل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ثناء ہے، تعوذ اور تسمیہ ہے، اس کی وجہ سے وہ طویل ہو جاتی ہے، ورنہ مقدار قرأت دونوں میں برابر ہے۔[۱۵۴]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل صحیح مسلم میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے **"عنه عليه الصلاة والسلام كان يقرأ في صلاة الظهر في كل ركعة قدر ثلثين آية"**.[۱۵۵]

ترجمۃ الباب سے مناسبت؟

یہاں ظہر کا ذکر نہیں ہے، جبکہ ترجمۃ الباب **"باب القراۃ فی الظهر"** ہے۔

جواب یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو اس طرح قرار دیا کہ **" كنت أركد في الأولين و أخف في الأخريين"** کا تعلق صرف عشاء سے نہیں ہے بلکہ ہر رباعی نماز سے ہے کہ ہر رباعی نماز میں پہلی دو رکعت میں رکود کرتا ہوں اور دوسری رکعت میں کم کرتا ہوں، چونکہ ظہر بھی رباعی نماز ہے تو گویا امام بخاری رحمہ اللہ کا فرمانا یہ ہوا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے دو باتیں فرمائیں۔

ایک یہ کہ میں صلاۃ العشاء اور مغرب میں کوئی کمی نہیں کرتا اور آگے دوسرا جملہ ہر رباعی نماز کے بارے میں فرمایا کہ میں ہر پہلی دو رکعتوں میں رکود کرتا ہوں یعنی قرأت لمبی کرتا ہوں اور **"اخريين"** میں کم کرتا ہوں، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے۔

(۹۸) باب القرأۃ فی المغرب

مغرب کی نماز میں قرآن پڑھنے کا بیان

۷۶۴ ۔ حدثنی أبو عاصم عن ابن جریج، عن ابن أبي مليكة، عن عروة بن الزبير، عن مروان بن الحكم قال: قال لي زيد بن ثابت: ما لک تقرأ في المغرب بقصار، و قد

[۱۵۴] عمدة القاری، ج: ۴، ص: ۴۶۱.

[۱۵۵] صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب القراءة في الظهر و العصر، رقم: ۶۸۸.

سمعت النبی ﷺ یقرأ بطولی الطولین؟[۱۵۶]

مروان بن الحکم کہتے ہیں کہ مجھ سے زید بن ثابت ؓ نے فرمایا "**ما لک تقرأ فی المغرب بقصار**" مغرب میں آپ بہت چھوٹی سورتیں پڑھتے ہیں۔

"**و قد سمعت النبی ﷺ یقرأ بطولی الطولیین؟**" جبکہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دو طویل تر سورتوں میں سے جو زیادہ طویل سورت تھی وہ پڑھتے ہوئے سنا ہے۔

دوسری جگہ اس کی وضاحت آئی ہے کہ اس سے سورۂ اعراف مراد ہے۔ تو طولین سے سورۂ انعام اور اعراف مراد ہیں۔

بعض نے کہا کہ سورۂ آل عمران اور اعراف مراد ہیں اور چونکہ دونوں میں اعراف زیادہ طویل ہے، اس لئے اس کو طولی الطولیین کہا ہے۔

مروان بن حکم کی روایت کا حکم

سوال: مروان بن حکم کے بارے میں قول فیصل کیا ہے؟

جواب: قول فیصل یہ ہے کہ ان کے امیر بننے سے پہلے کی روایات قابلِ قبول ہین اور امیر بننے کے بعد کی روایات میں کلام ہوا ہے لیکن ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جان بوجھ کر جھوٹ بول دیں بلکہ جس طرح بہت سے لوگوں کا قاضی بن کر حافظہ ضعیف ہو جاتا ہے اسی طرح ان کا امیر بن کر حافظہ ضعیف ہو گیا۔ ان کی روایت میں ضعف حافظہ کی وجہ سے کلام کیا ہے اور بعض ایسے اعمال کی وجہ سے جو مختلف فیہ ہیں، بہر حال ان کی حدیث قابل قبول ہے۔

سوال: کیا ان کو صحابی کہہ سکتے ہیں؟

جواب: اگر چہ یہ پیدا تو حضور اقدس ﷺ کے زمانہ میں ہوئے تھے لیکن ان کا والد ان کو لے کر کہیں چلا گیا تھا اور وہیں انہوں نے ساری عمر گزاری۔ صحیح روایات سے حضور ﷺ کی زیارت ثابت نہیں اس لئے صحابی کہنا درست نہیں۔

سوال: بعض کتابوں میں آیا ہے کہ باپ اور بیٹا دونوں کو جلا وطن کرنے کا حکم دیا تو یہ اتنے شعور میں ہوں گے کہ ان کو بھی جلا وطن کرنے کا حکم دیا، لہٰذا نظر ثابت ہوگئی۔

---

۱۵۶ وفی سنن النسائی، کتاب الافتتاح، باب القراءة فی المغرب ب المص، رقم: ۹۸۰، وسنن أبی داؤد، کتاب الصلاة، باب قدر القراءة فی المغرب، رقم: ۶۸۹، ومسند أحمد، مسند الأنصار، باب حدیث زید بن ثابت عن النبی، رقم: ۲۰۶۴۶، ۲۰۶۵۴.

جواب: اس سے یہ لازم نہیں آتا، اس لئے کہ ان کی عمر بہت کم تھی اور کوئی بعید نہیں کہ یہ نہ آئے ہوں اور نہ دیکھا ہو۔ بہرحال جتنے بھی قضایا ہیں ان پر اعتقاد رکھتا ہوں، **''تلک امة قد خلت لها ما كسبت ولكم ما كسبتم ولا تسئلون عما كانوا يعملون''۔**

حدیث میں ہے کہ مغرب میں سورۂ اعراف پڑھتے تھے بظاہر پوری سورۃ پڑھنا مراد نہیں ہے اور اگر پوری پڑھنا مراد ہو تب بھی استدلال اس لئے تام ہوگا کہ پوری سورۂ اعراف سوا پارہ ہے، تقریباً ۲۵ منٹ میں پڑھ سکتے ہیں۔ اس وقت تک تو شفق احمر بھی غروب نہیں ہوتا، شفق احمر بھی تقریباً ایک گھنٹہ بعد غروب ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ قراءت کی مقدار مسنون سے متعلق تقریباً تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ فجر اور ظہر میں طوال مفصل، عصر اور عشاء میں اوساط مفصل اور مغرب میں قصار مفصل پڑھنا مسنون ہے، اس میں اصل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مکتوب ہے، جو انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا۔

آنحضرت ﷺ کا عام معمول بھی مجموعۂ روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے، البتہ کبھی اس کے خلاف بھی ثابت ہے، مثلاً مغرب کی نماز میں **''سورة الطور، سورة المرسلات''** اور **''سورة حمٓ الدخان''** کا پڑھنا، لیکن اس قسم کے واقعات بیان جواز پر محمول ہیں، تا کہ لوگ کسی خاص صورت کو واجب نہ سمجھ لیں۔ اور حضرت زید بن ثابت کے ارشاد کا مطلب بھی یہی ہے کہ قضاء کا ایسا التزام کرنا کہ اس کو لوگ واجب سمجھنے لگیں، مناسب نہیں ہے۔

خلاصہ یہ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نے مغرب میں سورۂ اعراف پڑھی۔

۷۷۲ ـ حدثنا مسدد: حدثنا إسماعيل بن إبراهيم قال: أخبرنا ابن جريج قال: أخبرني عطاء أنه سمع أبا هريرة رضي الله عنه يقول: ((في كل صلاة يقرأ، فما أسمعنا رسول الله ﷺ أسمعنا كم، وما أخفى عنا أخفينا عنكم، وإن لم تزد على أم القرآن اجزأت وإن زدت فهو خير)). [۱۵۷]

ضم سورۃ کا حکم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا **''في كل صلوٰة يقرأ''** ہر نماز میں قرأت کی جائے گی **''فما أسمعنا**

[۱۵۷] وفي صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة وانه اذا لم يحسن الفاتحة، رقم: ۶۰۱، وسنن النسائي، كتاب الافتتاح، باب قراءة النهار، رقم: ۹۲۰، وسنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب ماجاء في القراءة في الظهر، رقم: ۶۷۲، و مسند أحمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند أبي هريرة، رقم: ۷۱۹۰، ۷۳۷۱، ۷۶۶۴، ۸۱۶۹، ۸۲۲۹، ۸۹۶۲، ۹۰۲۰، ۹۲۴۳، ۹۳۸۵، ۹۹۳۲.

رسول اللہ ﷺ أسمعنا کم" جو ہم کو رسول اللہ ﷺ نے سنوایا ہم بھی تم کو سنوائیں گے، یعنی جس نماز میں حضور ﷺ نے جہراً قراءت کی ہم بھی جہراً کریں گے **"وما اخفی عنا اخفینا عنکم"** اور جو قراءت آپ ﷺ نے ہم سے مخفی رکھی یعنی سراً فرمائی، ہم بھی سراً کریں گے۔

آگے فرمایا **"وإن لم تزد علی أم القرآن أجزأت"** نماز ہوگئی۔ **"وإن زدت فهو خير"** اور اگر اضافہ کرو تو یہ بہتر ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد امام شافعی رحمہ اللہ کی دلیل ہے جو ضم سورۃ کو مستحب کہتے ہیں، واجب نہیں کہتے، یعنی ان کے نزدیک سورۂ فاتحہ واجب اور ضم سورۃ مستحب ہے۔[158]

حنفیہ کے نزدیک فاتحہ بھی واجب ہے اور ضم سورۃ بھی واجب ہے۔[159]

حنفیہ کی دلیل وہ روایت ہے جو ابو داؤد اور دوسری سنن وغیرہ میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا:

" لا صلوٰة الا بفاتحة الكتاب وما تيسّر يا وما زاد يا فصا عداً " اور بعض روایات میں **"لا صلوٰة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب فصا عداً"**.

ابن عدی نے الکامل میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے:

"لا تجزی المكتوبة إلا بفاتحة الكتاب و ثلاث آيات فصاعداً"۔[160]

---

[158]، [159]، [160] ما استدل به الشافعية على استحباب ضم السورة إلى الفاتحة، وهو ظاهر الحديث، وعند أصحابنا يجب ذلك ــــ وعندنا ضم السورة أو ثلاث من آيات من أي سورة شاء من واجبات الصلاة، وقد ورد فيه أحاديث كثيرة:

منها: ما رواه عمر بن الخطاب يقول: لا صلاة إلا بفاتحة الكتاب وسورة ماها، سنن البيهقي الكبرى، باب من قال يقرأ خلف الإمام فيما يجهر الخ، ج:٢، ص:١٦٧، رقم: ٢٧٥٨.

ورواه الترمذي و ابن ماجة من حديث أبي سعيد، قال قال رسول الله ﷺ: مفتاح الصلاة الطهور، وتحريمها التكبير، وتحليلها التسليم، ولا صلاة لمن لم يقرأ بالحمد وسورة فريضة أو في غيرها، سنن الترمذي، باب ماجاء في تحريم الصلاة وتحليلها، رقم: ٢٣٨، وابن ماجة، ج:١، ص: ٢٧٢، رقم: ٨٣٩.

وروى أبو داؤد من حديث أبي نضرة عنه قال: أمرنا أن نقرأ بفاتحة الكتاب وما تيسر. سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب من ترك القراءة في صلاته بفاتحة الكتاب، رقم: ٦٩٥.

ورواه ابن حبان في ((صحيحه)) ولفظه: أمرنا رسول الله ﷺ أن نقرأ الفاتحة وما تيسر، صحيح ابن حبان، ج:٥، ص: ٩٢، رقم: ١٧٩٠.

ونصب الراية، ج:١، ص:٣٦٥. وروى ابن عدي من حديث ابن عمر قال: قال رسول الله ﷺ: لا تجزى المكتوبة إلا بفاتحة الكتاب و ثلاث آيات فصاعداً، وعمدة القاري، ج:٣، ص:٢٧٨.

اس میں تین آیات کی بھی صراحت ہے اگرچہ اس کی سند کمزور ہے۔[۱۶۱]
البتہ دوسری روایات میں کہیں **"ما تیسّر"** آیا ہے، کہیں **"مازاد"** آیا ہے، کہیں **"فصا عدا"** آیا ہے، یہ تمام روایات اس پر دلالت کر رہی ہیں کہ جو حکم فاتحہ کا ہے وہی حکم ضم سورہ کا ہے۔

(۱۰۵) باب الجهر بقراء ة صلاة الصبح

نمازِ فجر کی قرأت میں بلند آواز سے پڑھنے کا بیان

"وقالت أم سلمة : طفت وراء الناس والنبی ﷺ یصلی ویقرأ بالطور".

۷۷۳ ـ حدثنا مسدد قال: حدثنا أبو عوانة، عن أبی بشر. هو جعفر بن أبی وحشیة، عن سعید بن جبیر، عن ابن عباس رضی الله عنهما قال: انطلق النبی ﷺ فی طائفة من اصحابه عامدین إلی سوق عكاظ، و قد حیل بین الشیاطین و بین خبر السماء، وأرسلت علیهم الشهب فرجعت الشیاطین إلی قومهم فقالوا: ما لكم؟ فقالوا : حیل بیننا و بین خبر السماء، وأرسلت علینا الشهب. قالوا : ما حال بینكم و بین خبر السماء إلا شئی حدث، فاضربوا مشارق الأرض و مغاربها فانظروا ما هذا الذی حال بینكم و بین خبر السماء. فانصرف أولئك الذین توجهوا نحو تهامة إلی النبی ﷺ وهو بنخلة عامدین إلی سوق عكاظ وهو یصلی بأصحابه صلاة الفجر، فلما سمعوا القرآن إستمعوا له، فقالوا : هذا والله الذی حال بینكم و بین خبر السماء. فهنالك حین رجعوا إلی قومهم فقالو: یاقومنا ﴿ إِنَّا سَمِعْنَا قُرآناً عَجَباً یَهْدِی إِلیٰ الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ وَلَنْ نُشْرِکَ بِرَبِّنَا أَحَداً﴾ [الجن: ۱] فأنزل الله علی نبیه ﷺ ﴿ قُلْ أوحِیَ إِلَیَّ﴾ و إنما أوحی إلیه قول الجن.[أنظر: ۴۹۲۱] [۱۶۲]

[۱۶۱] وثلاث آیات فصاعدا انتهی . وضعف عمر بن یزید وقال إنه منكر الحدیث الخ ، نصب الرایة ، ج: ۱، ص: ۳۶۵.

[۱۶۲] وفی صحیح مسلم ، كتاب الصلاة ، باب الجهر بالقراء ة فی الصبح والقراء ة علی الجن ، رقم: ۶۸۱ ، وسنن الترمذی ، كتاب تفسیر القرآن عن رسول الله ، باب ومن سورة الجن ، رقم: ۳۲۴۵، ومسند أحمد ، ومن مسند بنی هاشم ، باب بدایة مسند عبد الله بن العباس ، رقم: ۲۱۵۸ .

حدیث کی تشریح

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنے صحابۂ کرام ؓ کے ایک گروہ کے ساتھ سوق عکاظ کی طرف تشریف لے گئے۔

پہلے گزر چکا ہے کہ عکاظ کا میلہ لگا کرتا تھا اور حضور اقدس ﷺ اس میلہ میں دعوت وتبلیغ کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔

"وقد حیل بین الشیاطین و بین خبر السماء" اور یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب اللہ ﷻ نے شیاطین اور آسمان کی خبروں کے درمیان ایک آڑ پیدا کر لی تھی۔ شروع میں شیاطین آسمان تک پہنچ جاتے تھے اور ملأ اعلیٰ میں فرشتوں کی آنے والے واقعات کے بارے میں جو باتیں ہوتی تھیں ان میں سے کوئی اڑتی ہوئی خبر سُن لیتے اور آ کر کاہنوں کو بتا دیتے، کاہن وہ آدھی، تہائی بات لوگوں کو بتا دیتے جو کبھی کبھی سچی نکل جاتی۔

لیکن حضور ﷺ کی بعثت کے بعد شیاطین کا آسمان تک جانا بند کر دیا گیا، اس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ جب کوئی آسمان کی طرف جانا چاہتا تو اس کے پیچھے ایک شہاب ثاقب ڈال دیا جاتا جیسا کہ قرآن مجید میں ہے **"إلا من خطف الخطفة فاتبعه شهاب ثاقب"**.

تو فرمایا:

"و قد حیل بین الشیاطین و بین خبر السماء وارسلت علیهم الشهب".

شیاطین اور آسمانی خبروں کے درمیان حیلولہ ہوگئی تھی اور ان پر ستارے شہاب ثاقب چھوڑ دیئے گئے تھے جو ان کو مارتے تھے **"فرجعت الشیاطین إلیٰ قومهم فقالوا: مالكم؟"** یہ اپنے قبیلے والوں کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا کیا ہوا؟ واپس کیوں آ گئے؟

" فقالوا: حیل بیننا و بین خبر السماء وارسلت علینا الشهب. قالو: ما حال بینکم و بین خبر السماء شئی حدث".

جنات نے آپس میں کہا کہ ہمارے اور آسمان کے درمیان جو چیز حائل ہوئی وہ یقیناً کوئی نیا واقعہ پیش آیا ہے، جس کے نتیجے میں وہاں ہمارا داخلہ بند ہو گیا ہے **"فاضربوا مشارق الأرض و مغاربها الخ"** آپ مشرق و مغرب میں سفر کر کے دیکھیں کہ کیا نیا واقعہ پیش آیا ہے جس کی وجہ سے ہمیں آسمان سے روکا گیا ہے۔

"فانصرف أولئک الذین توجّهوا نحو تهامة إلى النبی ﷺ" مکہ مکرمہ کے پہاڑوں اور سمندر کے درمیان جو وادی ہے اس کو تہامہ کہتے ہیں۔

یہ جنات مختلف ٹکڑیوں میں بٹ گئے، ان میں سے بعض مشرق میں گئے، بعض مغرب میں، بعض شمال و

جنوب میں۔ وہ جنات جنہوں نے تہامہ کا رُخ کیا تھا وہ نبی کریم ﷺ کے پاس سے گزرے **"وهو بنخلة"** آپ ﷺ مقام نخلہ میں تشریف فرما تھے **"عامدين إلى سوق عكاظ"** سوق عکاظ کی طرف جا رہے تھے۔

"وهو يصلي باصحابه صلوٰة الفجر" اور آپ ﷺ صحابۂ کرام ﷺ کے ساتھ فجر کی نماز پڑھ رہے تھے۔

"فلما سمعوا القرآن إستمعوا له" جب قرآن پاک کی آواز آئی تو انہوں نے کان لگا کر سنا **"فقالو: هذا والله الذي حال بينكم و بين خبر السماء"** یہ وہ چیز ہے جس نے تمہارے اور آسمان کے درمیان رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔

"فهنا لک" یہیں پر بس، اب آگے جانے کی ضرورت نہیں ہے جس معاملہ کے لئے نکلے تھے وہ پورا ہو گیا۔

مقصود بخاری رحمہ اللہ

امام بخاری رحمہ اللہ کا یہاں اس روایت کو لانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ ﷺ فجر جہراً پڑھا رہے تھے، اتنی جہر سے قرأت کر رہے تھے کہ جنات نے اوپر سے جاتے ہوئے سن لیا، لہٰذا فجر میں جہری قرأت ثابت ہو گئی۔

۷۷۴ ۔ حدثنا مسدد قال: حدثنا إسماعيل قال: حدثنا أيوب، عن عكرمة عن ابن عباس قال: قرأ النبي ﷺ فيما أمر و سكت فيما أمر ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ [مریم: ۶۴] **و ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾** [الاحزاب: ۲۱].

جس میں آپ ﷺ کو جہری قرأت کا حکم ہوا وہاں جہر فرمایا اور جہاں سر کا حکم ہوا وہاں سر فرمایا۔ اس لئے خوامخواہ اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جہر کیوں ہے اور سر کیوں ہے؟ بس امر کی اتباع ہے۔

(۱۰۶) باب الجمع بين السورتين في ركعة، والقرأة بالخواتم، و بسورة قبل سورة، وباوّل سورة.

ایک رکعت میں دو سورتوں کے ایک ساتھ پڑھنے اور سورتوں کی آخری آیتوں اور ایک سورت کا قبل ایک سورت کے اور سورت کی ابتدائی آیتوں کے پڑھنے کا بیان

"ويذكر عن عبد الله بن السائب: قرأ النبي ﷺ المؤمنون في الصبح حتى إذا جاء

ذكر موسى وهارون أو ذكر عيسى أخذته سعلة فركع. وقرأ عمر في الركعة الأولى بمائة وعشرين آية من البقرة ، وفي الثانية بسورة من المثاني ، وقرأ الأحنف بالكهف في الأولى ، وفي الثانية بيوسف ، أو يونس ، وذكر أنه صلى مع عمر رضي الله عنه الصبح بهما. وقرأ ابن مسعود بأربعين آية من الأنفال ، وفي الثانية بسورة من المفصل . وقال قتادة فيمن يقرأ بسورة واحدة يفرقها في ركعتين ، أو يردد سورة واحدة في ركعتين : كل كتاب الله".

اس ترجمۃ الباب میں امام بخاری رحمہ اللہ نے قرأت سے متعلق کئی مسائل بیان فرمائے ہیں۔

ایک رکعت میں ایک سے زائد سورتیں پڑھنا

پہلا مسئلہ یہ ہے ایک ہی رکعت میں ایک سے زائد سورتیں پڑھنا جائز ہے۔

بعض صحابہؓ وتابعینؒ سے مروی ہے کہ وہ اس کو ناپسند فرماتے تھے۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں یہ مسلک ابوبکر بن عبدالرحمن بن الحارث، ابوعبدالرحمن سلمیؒ، حضرت زید بن خالد جہنیؓ، ابوالعالیہؒ وغیرہ سے مروی ہے۔

ابوالعالیہ رحمہ اللہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں **"يقول أعط كل سورة حظها من الركوع والسجود".** [۱۶۳]

لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے اس مسلک کے خلاف حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث باب سے استدلال کیا ہے جس میں صراحت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوسورتوں کو جمع فرمایا کرتے تھے۔

یہی مذہب سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ، متعدد تابعینؒ اور ائمہ اربعہ کا ہے اور متعدد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مثلاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت تمیم داریؓ سے بھی منقول ہے۔ [۱۶۴]

البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے حسن بن زیاد رحمہ اللہ کی روایت یہ ہے کہ دوسورتوں کو فرض میں جمع کرنا پسندیدہ نہیں، اگرچہ مکروہ بھی نہیں ہے اور نوافل میں تو بالکل ہی کوئی مضائقہ نہیں۔ [۱۶۵]

۱۶۳ مصنف ابن أبي شيبة ، باب فقرأ حتى ختمها من كان لا يجمع بين السورتين فما ركعة ، ج: ۱، ص: ۳۲۲، رقم: ۳۷۱۰ مكتبة الرشد ، الرياض ، ۱۴۰۹هـ.

۱۶۴ جواز الجمع بين السورتين في ركعة واحدة ، وعليه جزء من التبويب ، وإليه ذهب سعيد بن جبير..... والسجود ، مصنف عبد الرزاق ، ج: ۲، ص: ۱۴۹ ، رقم : ۲۸۵۵ ، باب القراءة في الركوع والسجود ، و عمدة القاري ، ج: ۴، ص: ۴۹۱.

۱۶۵ وكره في الكبيري في بعض الصور ـــــ ثم استدل صاحب البحر على الفرق بين التطوع والفريضة حيث لا يكره اختلال الترتيب في النافلة بأن كل ركعة من النفل صلاة برأسها ، فيض الباري ، ج: ۲، ص: ۲۸۷.

سورة کا آخری حصہ پڑھنا

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کسی سورت کا صرف آخری یا بیچ کا حصہ نماز میں پڑھنا جائز ہے۔

اس پر تنبیہ کی اس لئے ضرورت پیش آئی کہ امام احمد رحمہ اللہ سے مروی رحمہ اللہ کی روایت یہ ہے کہ وہ کسی سورت کے صرف آخری حصے کی قرأت کو ناپسند کرتے تھے۔

ان کا فرمانا یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ یا تو آپ ﷺ پوری سورت پڑھتے یا سورت کا اوّل حصہ، لہٰذا آپ ﷺ کی موافقت کا تقاضہ یہ ہے کہ آخر سے نہ پڑھا جائے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس مذہب کے خلاف حضرت قتادۃ رضی اللہ عنہ کے اس قول سے استدلال کیا ہے کہ **"کل کتاب اللہ"** جمہور کا مذہب بھی یہی ہے اور امام احمد رحمہ اللہ کی ایک روایت بھی اسی کے مطابق ہے۔

قراءۃ میں ترتیب مصحف عثمانی کی رعایت کا حکم

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک سورتوں کی قرأت میں مصحف عثمانی کی ترتیب کی رعایت نہ کرنا بلا کراہت جائز ہے، لہٰذا اگر پہلی رکعت میں **" قل ھو اللہ "** اور دوسری رکعت میں **"قل یا أیّھا الکفرون"** پڑھیں تو ان کے نزدیک کوئی کراہت نہیں۔

حنفیہ، مالکیہ اور شافعیہ رحمہم اللہ اس کو خلاف اولیٰ یا مکروہ تنزیہی قرار دیتے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ کی بھی ایک روایت یہی ہے۔[۱۶۶]

امام احمد اور امام مالک کی ایک ایک روایت امام بخاری رحمہم اللہ کے مطابق بھی ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے جواز پر احنف بن قیس رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے، جو انہوں نے تعلیقاً نقل کی ہے کہ انہوں نے پہلی رکعت میں سورۂ کہف اور دوسری میں سورۂ یوسف یا سورۂ یونس پڑھی۔

حنفیہ کا کہنا یہ ہے کہ مصحف عثمانی کی ترتیب پر اجماع ہے اور یہ ترتیب اگرچہ اجتہادی ہے مگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو آنحضرت ﷺ کے عمل پر ہی مبنی فرمایا ہے، لہٰذا اس کا اعتبار مستحب ہے، اور اس کے خلاف کرنا خلاف اولیٰ ہے۔

سورۃ کے ابتدائی حصہ کی قراءۃ کا حکم

چوتھا مسئلہ یہ ہے کسی سورت کا صرف ابتدائی حصہ پڑھنا، یہ بھی جائز ہے، اور عبداللہ بن السائب رضی اللہ عنہ کی جو حدیث امام بخاری رحمہ اللہ نے تعلیقاً نقل کی ہے، اس میں سورۂ مؤمنون کا ابتدائی حصہ پڑھنا ثابت ہے۔

---

۱۶۶ فتح الباری، ج:۲، ص:۲۵۷.

امام مالک رحمہ اللہ سے ایک روایت یہ ہے کہ سورت پوری پڑھنی چاہئے، اور کچھ حصے پر اکتفا مکروہ ہے۔[۱۶۷]

۷۷۵ ـ حدثنا آدم قال: حدثنا شعبة عن عمرو بن مرة قال: سمعت أبا وائل قال: جاء رجل إلى ابن مسعود فقال: قرأت المفصل الليلة فى ركعة. فقال: هذا كهذ الشعر، لقد عرفت النظائر التى كان رسول الله ﷺ يقرن بينهن، فذكر عشرين سورة من المفصل، سورتين من آل حم فى كل ركعة.[أنظر: ۴۹۹۶، ۵۰۴۳][۱۶۸]

حضرت ابو وائل ؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کے پاس آیا اور اس نے آ کر کہا **"قرأت المفصّل الليلة فى ركعة"** آج رات میں نے مفصل کی تمام سورتیں ایک رکعت میں پڑھیں۔

یہاں روایت مختصر ہے، ترمذی وغیرہ میں اس کا پس منظر بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے آ کر حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے پوچھا کہ قرآن کریم میں ہے **" وانهارٌ من ماء غير آسن"** یہ **"آسن"** ہے یا **"باسن"** ہے اور سوال اس انداز سے کیا کہ جیسے اور تو مجھے سارے قرآن کا پتہ ہے بس صرف یہ بتا دیں تو میں علامۂ قرآن بن جاؤں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ نے جواب میں فرمایا **"أكل القرآن قرأت غير هذا؟"** کیا اس کے سوا آپ نے سارا قرآن پڑھ لیا ہے؟ اس نے جواب میں فخر سے کہا کہ میں نے آج رات ایک رکعت میں مفصل کی ساری سورتیں پڑھ لی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ نے فرمایا **"هَذاً كهَذّ الشعر"** کیا تم نے اس طرح روانی میں پڑھ لیا جس طرح شعر پڑھا جاتا ہے۔ **"هذ يهذ"** کے معنی ہوتے ہیں اشعار کو تیزی سے پڑھنا۔

مطلب یہ ہے کہ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے، قرآن کریم کو اطمینان سے ترتیل کے ساتھ پڑھنا چاہئے۔

پھر فرمایا **" لقد عرفت النظائر التى كان رسول الله ﷺ يقرن بينهنّ"** وہ ایک جیسی سورتیں میرے علم میں ہے جن کو نبی کریم ﷺ نمازوں میں ملا کر پڑھتے تھے کہ ایک رکعت میں ایک جیسی دو یا تین سورتیں

---

[۱۶۷] هذا ملخص من لامع الدرارى، ج: ۱، ص: ۳۰۳.

[۱۶۸] وفى صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب ترتيل القراءة واجتناب الهذ وهو الإفراط فى السرعة، رقم: ۱۳۵۸، وسنن الترمذى، كتاب الجمعة عن رسول الله، باب ماذكر فى قراءة سورتين فى ركعة، رقم: ۵۴۷، وسنن النسائى، كتاب الافتتاح، باب قراءة سورتين فى ركعة، رقم: ۹۹۵، وسنن أبى داؤد، كتاب الصلاة، باب تحزيب القرآن، رقم: ۱۱۸۸، ومسند أحمد، مسند المكثرين من الصحابة، باب مسند عبد الله بن مسعود، رقم: ۳۴۲۵، ۳۷۶۲، ۳۹۳۹.

پڑھ لیتے۔ **"فذكر عشرين سورة من المفصّل"** مفصل کی بیس سورتوں کا ذکر کیا کہ آپ ﷺ ان میں سے دو دو سورتوں کو ملا کر پڑھا کرتے تھے، یہاں تفصیل نہیں ہے، دوسری روایات میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان بیس سورتوں کی تفصیل بھی بیان فرمائی ہے۔

(۱۰۷) باب: يقرأ في الأخريين بفاتحة الكتاب

آخری دونوں رکعتوں میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھی جائے

۷۷۶ ۔ حدثنا موسى بن إسماعيل قال: حدثنا همام، عن يحيى، عن عبدالله بن أبي قتادة، عن أبيه: أن النبي ﷺ كان يقرأ في الظهر في الأوليين بأم الكتاب و سورتين، وفي الركعتين الأخريين بأم الكتاب، ويسمعنا الآية. ويطول في الركعة الأولى ما لا يطيل في الركعة الثانية، و هكذا في العصر، و هكذا في الصبح. [راجع: ۷۵۹]

آخری رکعتین میں سورۃ فاتحہ کا حکم

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ چار رکعت والی نماز کی آخری دو رکعت میں بھی فاتحہ پڑھنا واجب ہے۔ یہ امام بخاری رحمہ اللہ کا مسلک ہے اور یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی مسلک ہے۔

ان حضرات نے اس روایت کے جملہ **"و في الركعتين الاخريين بأم الكتاب ويسمعنا الآية"** سے استدلال کیا ہے کہ آپ ﷺ پہلی دو رکعتوں میں بھی اُمّ الکتاب یعنی سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے اور کوئی سورت پڑھتے تھے اور دوسری دو رکعتوں میں ام الکتاب پڑھتے تھے اور ہمیں آیات سناتے تھے۔ تو آنحضرت ﷺ کا مداومت کے ساتھ آخری دو رکعتوں میں ام الکتاب پڑھنے سے استدلال کیا ہے کہ قرأت فاتحہ آخری دو رکعتوں میں بھی واجب ہے۔

تو اس سے امام شافعی رحمہ اللہ نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ قراءت چاروں رکعات میں فرض ہے، جبکہ حنفیہ کے نزدیک اولیین میں قراءت فرض ہے اور اخریین میں مسنون یا مستحب فقط۔

لہٰذا حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ آخری دو رکعتوں میں قرأت واجب نہیں بلکہ سنت ہے، اس لئے اگر کوئی شخص قرأت نہ کرے بلکہ سبحان اللہ، الحمدللہ کہہ کر رکعتیں پوری کر دے تو بھی نماز ہو جائے گی۔

حنفیہ کی دلیل مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا اثر ہے کہ **"اقرأ في الأولين و سبح في الأخريين"**۔

اس سے پتا چلا کہ تنہا تسبیح سے بھی کام چل سکتا ہے، قرأت واجب نہیں ہے۔ البتہ سنت ہے اور حدیث میں جو آیا ہے کہ آپ ﷺ پڑھا کرتے تھے، تو آپ ﷺ کے عمل سے سنت ہی ثابت ہوگی۔[۱۶۹]

(۱۱۱) باب جهر الإمام بالتأمين،

امام کا بلند آواز سے آمین کہنے کا بیان

"وقال عطاء: آمين دعاء، أمن ابن الزبير و من وراء ه حتى إن للمسجد للجة، و كان أبو هريرة ينادى الإمام: لا تفتنى بآمين، وقال نافع: كان ابن عمر لا يدعه ويحضهم، و سمعت منه فى ذلك خيرا".

آمین کا رواج

یہ باب قائم کیا ہے کہ امام کا تأمین میں جہر کرنا اور عطاء رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ آمین بھی ایک دعا ہے، کیونکہ آمین کے معنی ہیں اے اللہ! ہماری دعا قبول فرما اور یہ سریانی کلمہ ہے، چنانچہ توراۃ وانجیل میں بھی یہی کلمہ استعمال ہوا ہے اور آج تک یہود ونصاریٰ بھی آمین ہی کہتے ہیں، یہاں تک کہ انگریزی میں بھی آمین ہی کہتے ہیں، جب ان کا پادری دعا کراتا ہے تو اس کے جواب میں انگریز بھی آمین ہی کہتے ہیں۔

فرمایا" **امن ابن الزبير و من وراء ه حتى ان للمسجد للجّة**".

عبداللہ بن زبیر ﷺ اور ان کے مقتدیوں نے آمین کہی یہاں تک کہ مسجد کے اندر گونج پیدا ہو گئی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر ﷺ تأمین بالجہر کے قائل تھے، خود بھی جہراً پڑھتے تھے اور ان کے مقتدی بھی۔

"**وكان أبو هريرة ينادى الإمام: لا تفتنى بآمين**" حضرت ابو ہریرہ ﷺ امام کو آواز دیا کرتے تھے کہ میری آمین نہ چھڑوا دینا۔

---

[۱۶۹] وقال الكرماني : فيه حجة على من قال : إن الركعتين الأخريين ، إن شاء لم يقرأ الفاتحة فيهما ؟ قلت : قوله : ((وفى الأخريين بأم الكتاب)) لا يدل على الوجوب ، والدليل على ذلك مارواه ابن المنذر عن على رضى الله تعالى عنه ، أنه قال : اقرأ فى الأولين و سبح فى الأخريين ، وكفى به قدوة . وروى الطبرانى فى ((مجمعه الأوسط)) : عن جابر قال : ((سنة القراءة فى الصلاة أن يقرأ فى الأولين بأم القرآن وسورة ، وفى الأخريين بأم القرآن . وهذا حجة على من جعل قراءة الفاتحة من الفروض ، والله تعالى أعلم ، عمدة القارى ، ج:۴ ، ص:۴۹۵ ، ومصنف ابن أبى شيبه ، باب من كان يقرأ فى الأولين بفاتحة الكتاب وسورة فى الأخريين بفاتحة الكتاب ، رقم : ۳۷۴۲ ، ج:۱ ، ص:۳۲۵ ، والمعجم الأوسط ، ج:۹ ، ص:۱۰۰ ، رقم:۹۲۴۸ .

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو مروان بن حکم نے مؤذن مقرر کر دیا تھا، یہ اذان دینے چلے جاتے، بعض اوقات اذان کے بعد کچھ لوگ مل جاتے، بات چیت ہوتی، کوئی مسئلہ وغیرہ پوچھتے۔ اس میں کچھ دیر ہو جاتی تھی۔ جب واپس آتے تو امام نماز شروع کر چکا ہوتا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وہیں سے آواز دیتے کہ میری آمین مت چھڑوا دینا۔ **"لا تفتني بآمين"** مجھ سے مت چھوٹ جانا آمین کے ساتھ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم قرأت کر کے سورۂ فاتحہ پوری کر لو اور میں تمہارے پیچھے مقتدی ہو کر آمین نہ کہہ سکوں۔ یعنی اتنا ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ سورۂ فاتحہ پڑھو کہ میں بھی آ کر مل جاؤں یہاں تک کہ جب تم آمین پر پہنچو تو میں بھی آمین کہہ سکوں، وہ امام کے پیچھے آمین کہنے کا اتنا اہتمام کرتے تھے۔

امام بخاری رحمہ اللہ شاید اس سے تأمین بالجہر پر اس طرح استدلال کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہہ رہے ہیں تمہارے آمین تک پہنچنے سے پہلے پہلے نماز میں شامل ہو جاؤں کیونکہ جس وقت تم آمین کہو گے اسی وقت میں بھی کہوں گا اور تمہارے آمین کہنے کا پتا اس وقت چلے گا جب جہراً کہو گے، لہٰذا یہ واسطہ در واسطہ ہو کر آمین بالجہر کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

"وقال نافع: كان ابن عمر لا يدعه و يحضهم".

حضرت نافع فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بھی تامین کہنا نہ چھوڑتے تھے اور لوگوں کو بھی برانگیختہ کیا کرتے تھے کہ آمین کہا کرو **"و سمعت منه في ذلك خيراً"** اور میں نے ان سے اس بارے میں حدیث بھی سنی ہے، نافع کہتے ہیں کہ آمین کے بارے میں انہوں نے حدیث بھی سنائی ہے۔

۷۸۰ ۔ حدثنا عبدالله بن يوسف قال: أخبرنا مالك عن ابن شهاب، عن سعيد ابن المسيب و أبي سلمة بن عبدالرحمن أنهما أخبراه عن أبي هريرة أن النبي ﷺ قال: ((إذا أمن الإمام فأمنوا فإنه من وافق تأمينه تأمين الملائكة غفر له ما تقدم من ذنبه)). قال ابن شهاب: و كان رسول الله ﷺ يقول: ((آمين)). [أنظر: ۶۴۰۲]. [۱۷۰]

اس حدیث کو آمین بالجہر کے باب میں لا کر امام بخاری رحمہ اللہ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ:

---

[۱۷۰] **وفي صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب التسميع والتحميد والتأمين، رقم: ۶۱۸، وسنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ما جاء في فضل التأمين، رقم: ۲۳۲، وسنن النسائي، كتاب الإفتتاح، باب جهر الإمام بآمين، رقم: ۹۱۸، وسنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب التأمين وراء الإمام، رقم: ۸۰۱، وسنن ابن ماجة، كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها، باب الجهر بآمين، رقم: ۸۴۱، ومسند احمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند أبي هريرة، رقم: ۶۸۹۰، ۶۹۴۶، ۷۳۳۷، ۷۷۷۴، ۹۴۲۸، ۹۵۴۱، وموطأ مالك، كتاب النداء الصلاة، باب ماجاء في التأمين خلف الإمام، رقم: ۱۸۰، وسنن الدارمي، كتاب الصلاة، باب في فضل التأمين، رقم: ۱۲۸۱.**

"**إذا أمّن الإمام فأمّنوا**" جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو، اور امام کے آمین کہنے کا پتا اس وقت چلے گا جب وہ جہراً کہے، لہٰذا اس سے اشارۃ النص کے ذریعہ اس بات پر استدلال کر رہے ہیں کہ امام جو آمین کہے گا وہ جہراً ہوگی۔

حنفیہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ آگے جو حدیث آرہی ہے "**إن رسول الله ﷺ قال: إذا قال الإمام غير المغضوب عليهم ولا الضآلين فقولوا: آمين**" جب امام "**غير المغضوب عليهم ولا الضالين**" کہے تو تم آمین کہو۔

معلوم ہوا کہ "**إذا أمّن الإمام**، **الإمام**" سے مراد ہے کہ جب امام "**غير المغضوب عليهم ولا الضآلين**" کہہ کر فارغ ہو تو تم آمین کہہ دو تا کہ تمہاری آمین اس کی آمین کے ساتھ موافق ہو جائے۔

اگر "**امّن الامام**" سے یہ مراد لیں کہ جب تم امام کی آمین سن لو پھر آمین کہو تو اس صورت میں موافقت نہ ہوئی بلکہ امام کا پہلے کہنا لازم آئے گا اور مقتدی کا بعد میں، لہٰذا مراد یہ ہے کہ جب امام "**ولاالضآلين**" کہے تو تم آمین کہو، اس طرح موافقت ہو جائے گی۔[۱۷۱]

(۱۱۴) باب إذا ركع دون الصف

صف میں پہنچنے سے پہلے رکوع کر لینے کا بیان

۷۸۳ ـ حدثنا موسى بن إسماعيل قال: حدثنا همام، عن الأعلم وهو زياد، عن الحسن، عن أبي بكرة: أنه انتهى إلى النبي ﷺ وهو راكع فركع قبل أن يصل إلى الصف، فذكر ذلك للنبي ﷺ فقال: ((زَادَكَ اللّٰهُ حِرصاً وَلَا تَعُد)).

خلفِ صفوف اکیلے نماز پڑھنے کا حکم

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نماز کے لئے آرہے تھے جب مسجد میں نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچے، آپ ﷺ رکوع میں تھے "**فركع أن يصل إلى الصف**" یہ ابھی صف تک نہیں پہنچے تھے کہ وہیں پیچھے رکوع کر لیا۔

"**فذكر ذالك**" نبی کریم ﷺ سے ان کی یہ بات ذکر کی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا "**زادك الله حرصاً ولا تعد**" اللہ جل جلالہ تمہاری حرص میں اضافہ کرے یعنی یہ جو کچھ کیا اس میں نیت صحیح تھی یعنی جلدی نماز میں شریک ہو جاؤں، یہ تمہاری حرص الی الخیر پر دلالت ہے، اللہ جل جلالہ اس میں اور اضافہ فرمائیں لیکن

---

[۱۷۱] دلائل ملاحظہ فرمائیں: عمدة القاري، ج:۴، ص:۱۵۰، مزید تفصیل وتشریح کے لئے ملاحظہ فرمائیں: درس ترمذی، ج:۱، ص:۵۱۲.

آئندہ ایسانہ کرنا یعنی پیچھے کھڑے رکوع نہ کرنا بلکہ اگلی صف میں آکر باقاعدہ صف میں شامل ہونا۔

اس حدیث سے جمہور نے یہ دلیل پکڑی ہے کہ سب سے پیچھے تنہا کھڑے ہو کر نماز پڑھنا جس کو فقہاء **"صلوٰۃ خلف صف وحدہ"** کہتے ہیں اگرچہ یہ عام حالات میں ناجائز ہے لیکن اگر کوئی اس طرح کرے تو اس کی نماز ہو جائے گی، کیونکہ آپ ﷺ نے حضرت ابوبکرہ ؓ سے فرمایا کہ آئندہ نہ کرنا، آئندہ کرنے سے منع کیا کہ ایسا کرنا درست نہیں لیکن نماز کے اعادہ کا حکم نہیں دیا کہ نماز دہراؤ، معلوم ہوا کہ نماز ہوگئی۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں نماز ہوتی ہی نہیں ہے اور وہ استدلال کرتے ہیں اس حدیث سے جو حضرت وابصہ بن معبد ؓ سے مروی ہے **" أن النبی ﷺ رأی رجلا یصلی خلف الصفّ وحده فأمره أن یعید الصلاة ، أخرجه أصحاب السنن و صححه أحمد و ابن خزیمة .** [۱۷۲]

علامہ عینی رحمہ اللہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس کی سند میں اختلاف ہے، کیونکہ بعض روایات میں **"عن هلال بن یسار عن عمرو بن راشد عن وابصة"** ہے اور بعض میں **"عن هلال عن وابصة"** ہے۔ اسی لئے امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ **"لو ثبت الحدیث لقلت به"** اور حاکم رحمہ اللہ کہتے ہیں: **"لم یخرجه الشیخان لفسا دالطریق إلیه"** اور امام بزار رحمہ اللہ نے فرمایا **"عن عمرو بن راشد لیس معروفا بالعدالة"۔**

"فلا یحتج بحدیثه و هلال لم یسمع من وابصة"۔

اس کے علاوہ حنابلہ ابن ماجہؒ میں حضرت علی بن شیبان ؓ کی روایت سے بھی استدلال کرتے ہیں جس میں یہ الفاظ ہیں:

" ثم صلّینا وراء ہ صلاة أخری فقضی الصلاة فرأی رجلا فرداً یصلی خلف الصف قال: فوقف علیه نبی الله ﷺ حین انصرف ، قال : استقبل صلا تک، لا صلا ة للذی خلف الصف"۔ [۱۷۳]

ابن حبان رحمہ اللہ نے بھی یہ روایت اپنی صحیح میں ذکر کی ہے، مگر علامہ عینی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث علی بن شیبان ؓ سے ان کے بیٹے نے روایت کی ہے اور وہ مجہول ہیں، نیز اس کی سند میں ملازم بن عمرو اور

---

[۱۷۲] وفی مسند احمد، حدیث وابصة بن معبد الاسدی نزل الرقة رضی الله عنه، ج:۴، ص:۲۲۷، رقم: ۱۸۰۲۹، ۱۸۰۳۱، وابن خزیمه، ج:۳، ص:۳۰، رقم: ۱۵۷۰، وعمدة القاری، ج:۴، ص:۵۰۸، وفتح الباری، ج:۲، ص:۲۶۸.

[۱۷۳] سنن ابن ماجة، باب صلاة الرجل خلف الصف وحده، رقم: ۱۰۰۳، ج:۱، ص:۳۲۰.

عبد اللہ بن بدر بھی متکلم فیہ ہیں۔ اور امام طحاوی رحمہ اللہ نے اس کے معنی میں تأویل کی ہے کہ "لانفی کمال" کے لئے ہے اور اعادے کا حکم استحباب کے لئے ہے۔

ظاہر ہے حضرت ابوبکرہ ﷺ کی حدیث اُصح ہے، لہٰذا جمہور نے اسی کو اختیار کیا ہے۔[۱۷۴]

(۱۱۵) باب إتمام التكبير في الركوع،

رکوع میں تکبیر کو پورا کرنے کا بیان

رکوع میں تکبیر کا اہتمام کرنا

امام بخاری رحمہ اللہ بطور نکتہ یہاں باب قائم کیا "**باب إتمام التكبير في الركوع**" آگے باب آرہا ہے "**باب إتمام التكبير في السجود**" آگے پھر باب ہے "**باب التكبير إذا قام من السجود**".

جس طرح یہ کہا ہے "**باب التكبير اذا قام من السجود**" اسی طرح یہاں بھی کہہ دیتے "**باب التكبير في الركوع**" اتمام کہنے کی کیا ضرورت تھی۔

اب شراح حیران و پریشان ہیں کسی نے کچھ کہا، کسی نے کچھ کہا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی توجیہ

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اصل میں امام بخاری رحمہ اللہ کا منشأ یہ ہے کہ آدمی جب قیام سے رکوع کی طرف منتقل ہو تو تکبیر اس طرح کہنی چاہئے کہ جا کر رکوع میں پوری ہو، یعنی اکبر کی راء کا تلفظ حالت رکوع میں ہو اس کو اتمام کہتے ہیں، اسی طرح جب سجدہ میں جائے تو اللہ اکبر کی راء کا تلفظ حالتِ سجدہ میں ہو۔

پہلی بات یہ ہے کہ اگر امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ مقصود ہو تو حدیث میں کہیں بھی اس پر دلالت نہیں ہو رہی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ رکوع و سجود کی کیا خصوصیت؟ جب قیام کی طرف منتقل ہو تب بھی اتمام حالتِ قیام میں ہونا چاہئے اس لئے اس کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کرتے، اس لئے بظاہر یہ لگتا ہے شاید امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ منشأ نہ ہو۔[۱۷۵]

---

[۱۷۴] صحيح ابن حبان، ذكر الموضع الذي يقف فيه المأمون إذا كان وحده من الإمام في صلاته، رقم: ۲۲۰۲، ج: ۵، ص: ۵۷۹، وعمدة القاري، ج: ۴، ص: ۵۰۹.

[۱۷۵] فتح الباري، ج: ۲، ص: ۲۶۹.

علامہ عینی رحمہ اللہ کی توجیہ

علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''اتمام'' سے امام بخاری رحمہ اللہ کی مراد یہ ہے کہ تکبیر کے الفاظ بالکل واضح اور صاف ہونے چاہئیں، تاکہ کوئی حرف بھی نہ چھوٹے۔

پھر اس پر خود ہی علامہ عینی رحمہ اللہ نے اعتراض کیا کہ اگر کوئی یہ کہے کہ اس میں رکوع اور سجود کی کیا خصوصیت ہے اور تکبیرات میں بھی یہی الفاظ استعمال ہونے چاہئیں، تو اس کا جواب دیا کہ رکوع وسجود چونکہ اعظم ارکان میں سے ہیں، لہٰذا اس لئے خاص طور سے رکوع وسجود کا ذکر کیا۔[۱۷۶]

تیسری توجیہ

مجھے ان توجیہات میں سے کسی پر بھی اطمینان نہیں ہوتا، البتہ مجھے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ کی توجیہ کی بنیاد پر جسے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی احتمالاً ذکر کیا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہاں جو ''اتمام'' کا لفظ ذکر فرمایا ہے، یہ ایک اصطلاح کے طور پر ذکر فرمایا ہے اور صورت حال یہ تھی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جب اپنے عہدِ خلافت میں نماز پڑھاتے تھے تو جس طرح ہر آدمی کے نماز پڑھنے کا طریقہ ہوتا ہے، ان کا ایک طریقہ یہ تھا کہ جب وہ قومہ سے سجدے کی طرف جاتے تو اللہ اکبر اتنا آہستہ کہتے کہ پچھلے لوگوں کو آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ چنانچہ بعض لوگ یہ سمجھے کہ عثمان رضی اللہ عنہ سجدہ میں جاتے وقت اللہ اکبر کہتے ہی نہیں ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو حضرات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متبعین اور مقلدین تھے انہوں نے سجدے میں جاتے وقت تکبیر کہنا بالکل ترک کر دیا۔

چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بالکل ترک کر دیا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا تو زیاد بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے بھی ترک کر دیا اور پھر بنوامیہ کے خلفاء کثرت سے ایسا ہی کرتے رہے، بلکہ یہ معاملہ تکبیر رکوع تک بھی پہنچ گیا اور کہنے والوں نے یہ کہہ دیا کہ تکبیر خفض میں نہیں ہے رفع میں ہے یعنی جب آدمی قیام سے رکوع میں جائے تو تکبیر نہیں ہے اور قومہ سے سجدے میں جائے تو یہ بھی خفض ہے اس میں بھی تکبیر نہیں ہے۔[۱۷۷]

اس پر ایک آدھ روایت سے استدلال بھی کیا کہ حضور ﷺ نے تکبیر نہیں فرمایا، چنانچہ ابوداؤد میں حضرت عبدالرحمن بن ابزی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ **''صليت خلف النبي ﷺ فلم يتم التكبير''.**[۱۷۸]

تو بنی امیہ کا جو عمل تھا اس کو اصطلاح میں ''عدم الاتمام'' سے تعبیر کرتے ہیں اور جو جمہور کا عمل تھا کہ

---

۱۷۶ عمدة القاري، ج:۴، ص:۵۰۹.

۱۷۷ فيض الباري، ج:۲، ص:۲۹۶.

۱۷۸ سنن أبي داؤد، باب تمام التكبير، رقم:۸۳۷، ج:۱، ص:۲۲۱.

"تكبير عند كل خفض و رفع" کہ رکوع اور سجدے میں جاتے اور اٹھتے وقت تکبیر کہنا جو مشروع اور مسنون ہے اس کو اتمام سے تعبیر کرتے ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اسی لئے رکوع اور سجدہ کے لئے تو ''اتمام'' کا لفظ استعمال کیا اور آگے **"باب التكبير إذا قام من السجود"** میں نہیں استعمال کیا کہ وہ مختلف فیہ مسئلہ نہیں تھا۔

حقیقت حال یوں ہے کہ حضرت عثمان ﷺ سے یہ بات چلی، لیکن جمہور کا کہنا یہ ہے کہ حضرت عثمان ﷺ نے ترک نہیں کیا تھا، آہستہ کہتے تھے جس کی وجہ سے بعض سن نہیں سکتے تھے۔

جس روایت میں آیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے رکوع اور سجدے میں تکبیر کا ''اتمام'' نہیں فرمایا، تو اوّل تو ابوداؤد طیالسی رحمہ اللہ نے اسے باطل قرار دیا ہے۔

اور امام طبری اور بزار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حسن بن عمران کا تفرد ہے اور وہ مجہول ہیں۔

اور اگر حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو ہوسکتا ہے آپ ﷺ نے بیان جواز کے لئے ایسا کیا ہو، کیونکہ تکبیر تحریمہ کے سوا دیگر تکبیرات میں سے کوئی بھی واجب نہیں ہے اس لئے احیاناً کبھی ترک کرکے جواز کی طرف اشارہ کر دیا ہو، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کو معمول بنا لیا جائے۔ آپ ﷺ کا معمول یہی تھا کہ آپ ﷺ رکوع اور سجدہ میں جاتے ہوئے تکبیر کا اہتمام فرماتے تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''عدم اتمام'' سے مدنہ کرنا مراد ہو۔[۱۷۹]

"قاله ابن عباس عن النبي ﷺ، و فيه مالك بن الحويرث".

حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ اور مالک بن الحویرث ﷺ دونوں کی حدیثیں آگے آرہی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ رکوع کے اندر تکبیر کا ''اتمام'' فرماتے تھے۔

۷۸۴- حدثنا إسحاق الواسطي قال: أخبرنا خالد، عن الجريري، عن أبي العلاء، عن مطرف، عن عمران بن حصين قال: صلى مع علي ﷺ بالبصرة فقال: ذكرنا هذا الرجل صلاة كنا نصليها مع رسول الله ﷺ، فذكر أنه كان يكبر كلما رفع و كلما وضع. [أنظر: ۷۸۶، ۸۲۶].[۱۸۰]

---

[۱۷۹] فان قلت : روى أبو داؤد من حديث عبد الرحمن بن ابزى، قال : صليت .... وهو مجهول، مسند الطيالسي، عبد الرحمن بن ابزى رضي الله عنه، رقم : ۱۲۸۷، ج: ۱، ص: ۱۸۱، والتاريخ الكبير، ج: ۲، ص: ۳۰۰، رقم: ۲۵۴۰، وعمدة القاري، ج: ۴، ص: ۵۱۰، و لامع الدراري، ج: ۱، ص ۳۱۳.

[۱۸۰] وفي صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب اثبات التكبير في كل خفض ورفع في الصلاة إلا رفعه من الركوع، رقم: ۵۹۴، وسنن النسائي، كتاب التطبيق، باب التكبير للسجود، رقم : ۱۰۷۲، وسنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب تمام التكبير، رقم : ۷۱۰، ومسند أحمد، أوّل مسند المصريين، باب حديث عمران بن حصين، رقم: ۱۸۹۹۸، ۱۹۰۳۵، ۱۹۱۰۵، ۱۹۱۴۴.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے بصرہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ نماز پڑھی، نماز پڑھ کر حضرت عمران رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ اس شخص نے ہمیں وہ نماز یاد دلا دی ہے جو ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پڑھا کرتے تھے یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہر خفض و رفع میں تکبیر کہی تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعض متبعین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ وغیرہ تکبیر نہیں کہتے تھے، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ انہوں نے تکبیر کہی ہے تو فرمایا ہمیں رسول اللہ ﷺ کے نماز یاد دلا دی ہے۔ معلوم ہوا حضور اقدس ﷺ کا عام معمول تکبیر کہنے کا تھا۔

۷۸۷ ۔ حدثنا عمرو بن عون قال: حدثنا هشيم عن أبي بشر، عن عكرمة قال: رأيت رجلا عند المقام يكبر في كل خفض و رفع، وإذا قام و إذا وضع؛ فأخبرت ابن عباس رضي الله عنهما فقال: أوليس تلك صلاة النبي ﷺ لا أم لك. [۱۸۱]

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو مقام ابراہیم کے پاس نماز پڑھتے دیکھا جو ہر خفض و رفع میں تکبیر کہہ رہا تھا۔ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تھے۔

میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو بتایا بلکہ آگے آ رہا ہے کہ انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے لئے گستاخانہ جملہ استعمال کیا کہ اس احمق کی نماز کو دیکھا ہے؟ [۱۸۲]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو ان کی اس بات پر غصہ آ گیا اور فرمایا **"ثكلتك أمك"** تمہاری ماں تمہیں کھوئے **"سنة أبي القاسم ﷺ"**.

(۱۱۷) باب التكبير إذا قام من السجود

سجدوں سے جب فارغ ہو کر کھڑا ہو تو اس وقت تکبیر کہنے کا بیان

۷۸۸ ۔ حدثنا موسى بن إسماعيل قال: حدثنا همام، عن قتادة، عن عكرمة قال: صليت خلف شيخ بمكة فكبر ثنتين و عشرين تكبيرة، فقلت لابن عباس: إنه أحمق، فقال: ثكلتك أمك، سنة أبي القاسم ﷺ. [راجع: ۷۸۷]

"وقال موسى: حدثنا أبان قال: حدثنا قتادة قال: حدثنا عكرمة".

---

[۱۸۱] وفي مسند أحمد، ومن مسند بني هاشم، باب بداية مسند عبد الله بن العباس، رقم: ۲۱۳۵، ۲۵۲۴، ۲۸۵۹، ۲۹۳۶، ۲۹۷۳، ۳۱۲۴.

[۱۸۲] مسند أحمد، ومن مسند بني هاشم، باب باقي المسند السابق، رقم: ۲۹۷۳.

"لثنتین و عشرین تکبیرۃ" معجم اسماعیلی کی روایت میں ہے کہ یہ ظہر کی نماز تھی، ہر رکعت میں پانچ پانچ تکبیریں تھیں، تو مجموعہ بیس ہوا۔ پھر ایک تکبیر افتتاح کی اور ایک قعدۂ اولیٰ سے اٹھتے وقت۔ تو مجموعہ بائیس ہوگیا۔[۱۸۳]

(۱۱۸) باب وضع الأکف علی الرکب فی الرکوع

رکوع میں ہتھیلیوں کا گھٹنوں پر رکھنے کا بیان

"وقال أبو حمید فی أصحابه: أمکن النبی ﷺ یدیه من رکبتیه".

۷۹۰ ـ حدثنا أبو الولید قال: حدثنا شعبة، عن أبی یعفور قال: سمعت مصعب ابن سعد یقول: صلیت إلی جنب أبی فطبقت بین کفی ثم وضعتهما بین فخذی، فنهانی أبی وقال: کنا نفعله فنهینا عنه و أمرنا أن نضع أیدینا علی الرکب. [۱۸۴]

"فطبّقت بین کفی" تطبیق کے معنی یہ ہیں کہ دونوں ہاتھ ملا کر رانوں کے درمیان رکھے جائیں۔

حضرت مصعب بن سعد رحمہ اللہ نے یہ عمل حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ کی تقلید میں کیا تھا، کیونکہ ان سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے شاگردوں کو تطبیق کی تلقین فرمائی۔

حضرت سعد ﷺ نے حدیث باب میں اس کو منسوخ قرار دیا ہے، اس کی وجہ سے بعض حضرات نے فرمایا کہ حضرت ابن مسعود ﷺ کو حدیثِ نہی نہیں پہنچی تھی، مگر یہ بات بہت بعید ہے کہ حضرت ابن مسعود ﷺ جیسے أفقہ الصحابہ کو "نسخ" کا علم نہ ہوا ہو، اس لئے ظاہر یہ ہے کہ وہ دونوں طریقوں میں تخییر کے قائل تھے۔

اس کی تائید مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت علی ﷺ کے قول سے ہوتی ہے کہ " **إذا رکعت فإن شئت قلت هکذا یعنی وضعت یدیک علی رکبتیک وإن شئت طبقت**" علامہ عینی

---

[۱۸۳] فتح الباری، ج:۲، ص: ۲۷۲.

[۱۸۴] وفی صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب الندب الی وضع الایدی علی الرکب فی الرکوع ونسخ التطبیق، رقم:۸۳۳، وسنن الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی وضع الیدین علی الرکبتین فی الرکوع، رقم: ۲۴۰، وسنن النسائی، کتاب التطبیق، باب التطبیق، رقم: ۱۰۲۲، وسنن أبی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب وضع الیدین علی الرکبتین، ۷۳۴، وسنن ابن ماجة، کتاب اقامة الصلاۃ والسنة فیها، باب وضع الیدین علی الرکبتین، رقم:۸۶۳، ومسند أحمد، مسند العشرۃ المبشرین بالجنة، باب مسند أبی اسحاق سعد بن أبی وقاص، رقم: ۱۴۸۷، وسنن الدارمی، کتاب الصلاۃ، باب العمل فی الرکوع، رقم: ۱۲۷۰.

رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "اسنادہ حسن، فھذا ظاھر فی أنه ﷺ کان یری التخییر" اور حضرت سعد ﷺ کے ارشاد کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ اس طریقے کی ترجیح منسوخ ہوگئی۔[۱۸۵]

(۱۲۰) باب استواء الظھر فی الرکوع

رکوع میں پیٹھ کے برابر کرنے کا بیان

"وقال أبو حمید فی أصحابه: رکع النبی ﷺ ثم ھصر ظھره، (ھصر ظھره، بفتح الھاء والصاد أعلمه أی أماله".

گذشتہ باب میں تعدیل ارکان نہ کرنے کا بیان تھا، اس میں کرنے کا بیان ہے۔

جمہور کے نزدیک تعدیل کے بغیر نماز بالکل نہیں ہوتی۔ حنفیہ کے نزدیک فرض ادا ہو جاتا ہے، مگر ترک واجب کی وجہ سے نماز واجب الاعادہ رہتی ہے۔

حنفیہ کی دلیل ترمذی شریف میں "**مسئی فی الصلاۃ**" کی حدیث کے آخر میں یہ الفاظ ہیں "**اذا انتقصت من ذالک شیئاً انتقصت من صلاتک**" اس سے صحابۂ کرام ﷺ نے بھی یہی سمجھا۔ چنانچہ ترمذی میں ہے کہ "**وکان ذالک اھون علیھم من الاولیٰ ان من انتقص منھا شیئاً انتقص من صلاته ولم تذھب کلھا**".

(۱۲۴) باب ما یقول الامام ومن خلفه اذا رفع رأسه من الرکوع

امام اور جو لوگ اس کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں جب رکوع سے سر اٹھائیں تو کیا کہیں؟

۷۹۵ ۔ حدثنا آدم قال: حدثنا ابن أبی ذئب، عن سعید المقبری، عن أبی ھریرة قال: کان النبی ﷺ اذا قال: ((سمع اللہ لمن حمده))، قال: ((اللّٰھم ربنا ولک الحمد)) وکان النبی ﷺ اذا رکع واذا رفع رأسه یکبر، واذا قام من السجدتین قال: ((اللہ أکبر)). [راجع: ۷۸۵]

اس سے شافعیہ وغیرہ نے استدلال کیا ہے کہ امام بھی "**اللّٰھم ربنا ولک الحمد**" کہے گا۔

حنفیہ اس کو حالت انفراد پر محمول کرتے ہیں اور اگلے باب کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں "**اذا قال**

---

۱۸۵ مصنف ابن أبی شیبة، من الأنصار یوم القادسیة فقال اذا رکع فلیضع یدیه علی رکبتیه ولیمکن حتی یعلو عجب ذنبه، رقم: ۲۵۳۹، ج: ۱، ص: ۲۲۱، و عمدۃ القاری، ج: ۴، ص: ۵۲۰.

الامام سمع الله لمن حمده فقولوا: اللّٰهم ربنا و لک الحمد" اس میں وظائف کی تقسیم کردی گئی ہے، "**والقسمة تنافی الشركة**".

یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی وہ روایت ہے جو "متون" میں مذکور ہے، لیکن امام صاحب ہی سے دوسری روایت یہ ہے کہ امام بھی تحمید سراً کریگا، اور اسی کو امام فضلی، امام طحاوی اور متاخرین کی ایک جماعت نے اختیار کیا ہے، اور حدیث باب سے مؤید ہونے کی بنا پر یہی روایت قابل ترجیح معلوم ہوتی ہے۔

یہ دوسری روایت علامہ شامی رحمہ اللہ نے "**رد المحتار**" میں نقل کی ہے۔[۱۸۶]

(۱۲۷) باب الاطمأنينة حين يرفع رأسه من الركوع

جب رکوع سے اپنا سر اٹھائے اس وقت اطمینان سے کھڑا ہونے کا بیان

۸۰۲ - حدثنا سليمان بن حرب ....فانصت هنيئة .....

"**فانصت هنيئة**" یعنی اعضاء کو اصلی حالت تک لے آئے، اس کو انصباب سے تعبیر کیا۔

بعض نسخوں میں "**فانصت**" ہے، اس کے معنی واضح ہیں۔

(۱۲۸) باب : يهوى بالتكبير حين يسجد

جب سجدہ کرے تو تکبیر کہتا ہوا جھکے

"**وقال نافع: كان ابن عمر يضع يديه قبل ركبتيه**".

"**كان ابن عمر يضع يديه قبل ركبتيه**" یہ اثر ابن خزیمہ ؓ اور طحاوی رحمہ اللہ وغیرہ نے موصولاً روایت کیا ہے، اس کے آخر میں یہ بھی ہے کہ "**كان النبي ﷺ يفعله**".

مگر امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ عبدالعزیز الدراوردی کا وہم ہے اور محفوظ یہی ہے کہ یہ اثر حضرت ابن عمر ؓ پر موقوف ہے۔

اس سے مالکیہ استدلال کرتے ہیں کہ سجدہ میں جاتے وقت پہلے ہاتھ رکھنے چاہئیں۔ امام محمد رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔

حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک پہلے گھٹنے رکھنا افضل ہے۔[۱۸۷]

---

۱۸۶ رد المحتار، ص: ۳۱۹، ج: ۳، مطبع: فرفور.

۱۸۷ فتح الباری، ج: ۲، ص: ۲۹۱.

ان کی دلیل حضرت ابن مسعودؓ کا اثر ہے کہ وہ پہلے گھٹنے رکھتے تھے۔[۱۸۸]

امام اثرم رحمہ اللہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی ایک حدیث روایت کی ہے **"إذا سجد أحدكم فليبدأ بركبتيه قبل يديه ولا يبرك بروك الفحل"** مگر حافظ رحمہ اللہ نے اس کی سند کو ضعیف بتایا ہے۔[۱۸۹]

تاہم ترمذی کی حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے، **"يعمد أحدكم في صلوته فيبرك في صلوته برك الجمل"**۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے عمل کے بارے میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے بتایا کہ ان کا جسم بھاری ہوگیا تھا اور ان کے پاؤں میں عذر تھا، اس لئے ایسا کرتے ہوں گے۔

ان کے پاؤں میں عذر ہونے کی دلیل آگے **"باب سنة الجلوس إذا تشهد"** میں آرہی ہے کہ وہ تشہد میں چار زانوں بیٹھا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ **"إن رجلىّ لا تحملانی...."** روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ خیبر کے یہود نے ان کو گرادیا تھا، جس سے ان کے ہاتھ پاؤں میں ٹیڑھ پیدا ہوگئی تھی۔

۸۰۵ - حدثنا علي بن عبدالله قال: حدثنا سفيان غير مرة عن الزهري قال: سمعت أنس بن مالك يقول: سقط رسول الله ﷺ عن فرس. وربما قال سفيان: من فرس. فجحش شقه الأيمن، فدخلنا عليه نعوده فحضرت الصلاة فصلى بنا قاعداً و قعدنا. و قال سفيان مرة: صلينا قعودا. فلما قضى الصلاة قال: ((إنما جعل الإمام ليؤتم به فإذا كبر فكبروا و إذا ركع فاركعوا، و إذا رفع فارفعوا وإذا قال: سمع الله لمن حمده، فقولوا: ربنا و لك الحمد. و إذا سجد فاسجدوا)). كذا جاء به معمر؟ قلت: نعم، قال: لقد حفظ كذا. قال الزهري: ولك الحمد، حفظت من شقه الأيمن. فلما خرجنا من عند الزهري قال ابن جريج وأنا عنده: فجحش ساقه الأيمن. [راجع: ۳۷۸]

تشریح

"كذا جاء به معمر؟"

یہ جملہ استفہامیہ ہے، مطلب یہ ہے کہ سفیان رحمہ اللہ نے یہ حدیث علی بن مدینی رحمہ اللہ کو سنا کر ان سے پوچھا کہ کیا امام زہری رحمہ اللہ کے دوسرے شاگرد معمر رحمہ اللہ نے بھی یہ حدیث آپ کو اسی طرح سنائی تھی؟

---

[۱۸۸] عمدة القاری، ج: ۴، ص ۵۳۹.

[۱۸۹] فتح الباری، ج: ۲، ص: ۲۹۱.

اس پر علی بن مدینی رحمہ اللہ نے کہا **"نعم"** سفیان رحمہ اللہ نے کہا **"لقد حفظ كذا"** یعنی معمر رحمہ اللہ نے صحیح یاد رکھا۔ پھر کہا کہ زہری نے **"ربنا ولک الحمد"** واؤ کے ساتھ روایت کیا تھا۔ پھر انہوں نے اپنے اشتیاق کی وجہ بیان کی کہ میں نے علی بن مدینی رحمہ اللہ سے اس لئے توثیق کی کہ بعض اوقات راوی کو وہم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے یہ حدیث **"من شقه الايمن"** کے الفاظ کے ساتھ سُنی تھی، مگر جب امام زہری رحمہ اللہ کے پاس سے نکلے تو ابن جریج نے میری موجودگی میں وہ حدیث **"فجحش ساقه الايمن"** کے الفاظ کے ساتھ سنائی، اس لئے مجھے احتمال ہوا کہ کہیں مجھ سے بھی روایت میں کوئی غلطی نہ ہوگئی ہو، چنانچہ میں نے علی بن المدینی رحمہ اللہ سے پوچھ لیا کہ معمر رحمہ اللہ نے بھی حدیث اسی طرح سنائی تھی یا نہیں؟

(۱۲۹) باب فضل السجود

سجدہ کرنے کی فضیلت کا بیان

۸۰۶ ـ حدثنا أبو اليمان قال: أخبرنا شعيب عن الزهرى قال: أخبرنى سعيد بن المسيب و عطاء بن يزيد الليثى أن أبا هريرة أخبرهما أن الناس قالوا: يا رسول الله هل نرى ربنا يوم القيامة؟ قال: ((هل تمارون فى القمرليلة البدرليس دونه سحاب ؟))قالوا: لايارسول الله قال:((فهل تمارون فى رؤية الشمس ليس دونها سحاب؟)) قالو: لا . قال: ((فإنكم ترونه كذالک. يحشر الناس يوم القيامة فيقول: من كان يعبد شيئاً فليتبع. فمنهم من يتبع الشمس، و منهم من يتبع القمر، و منهم من يتبع الطواغيت، و تبقى هذه الأمة فيها منافقوها، فيأتيهم الله عزو جل فيقول: أنا ربكم فيقولون: هذا مكاننا حتى يأتينا ربنا، فإذا جاء ربنا عرفناه. فيأتيهم الله فيقول: أنا ربكم . فيقولون: أنت ربنا فيدعوهم و يضرب الصراط بين ظهرانى جهنم فأكون أول من يجوز من الرسل بأمته، ولا يتكلم يومئذ أحد إلا الرسل. و كلام الرسل يومئذ: اللهم سلم سلم. وفى جهنم كلاليب مثل شوک السعدان، هل رأيتم شوک السعدان؟ قالوا نعم. قال: فإنها مثل شوک السعدان غير أنه لا يعلم قدر عظمها إلا الله، تخطف الناس بأعمالهم فمنهم من يوبق بعمله، و منهم من يخردل، ثم ينجو حتى إذا أراد الله رحمة من أراد من أهل النار أمر الله الملائكة أن يخرجوا من كان يعبد الله، فيخرجونهم و يعرفونهم بآثار السجود. و حرم الله على النار أن تأكل أثر السجود. فيخرجون من النار فكل ابن آدم تأكله النار إلا أثر

السجود، فيخرجون من النار قد امتحشوا فيصب عليهم ماء الحياة فينبتون كما تنبت الحبة في حميل السيل. ثم يفرغ الله من القضاء بين العباد، و يبقى رجل بين الجنة والنار. وهو آخر أهل النار دخولا الجنة. مقبل بوجهه قبل النار. فيقول: يا رب اصرف وجهي عن النار فقد قشبني ريحها، و أحرقني ذكاؤها. فيقول: هل عسيت إن فعل ذلك بك أن تسأل غير ذالك؟ فيقول: لا و عزتك، فيعطي الله ما شاء من عهد و ميثاق فيصرف الله وجهه عن النار. فإذا أقبل به على الجنة رأى بهجتها سكت ما شاء الله أن يسكت. ثم قال: يا رب قدمني عند باب الجنة. فيقول الله له: أليس قد أعطيت العهود والمواثيق أن لا تسأل غير الذي كنت سألت؟ فيقول: يا رب لا أكون أشقىٰ خلقك. فيقول: فما عسيت إن أعطيت ذلك أن لا تسأل غيره؟ فيقول: لا و عزتك، لا أسالك غير ذلك، فيعطي ربه ما شاء من عهد و ميثاق، فيقدمه إلى باب الجنة. فإذا بلغ بابها فرأى زهرتها وما فيها من النضرة والسرور، فيسكت ما شاء الله أن يسكت: فيقول: يا رب أدخلني الجنة فيقول الله تعالىٰ ويحك يا ابن آدم، ما أغدرك؟ أليس قد أعطيت العهد والميثاق أن لا تسأل غير الذي أعطيت؟ فيقول: يا رب لا تجعلني أشقى خلقك. فيضحك الله عز و جل منه، ثم يأذن له في دخول الجنة. فيقول له: تمن، فيتمنى حتى إذا انقطعت أمنيته، قال الله عزو جل: زد من كذا و كذا، أقبل يذكره ربه عزوجل حتى إذا انتهت به الأماني، قال الله تعالىٰ: لك ذلك و مثله معه)) قال أبو سعيد الخدري لا بي هريرة رضي الله تعالىٰ عنهما: إن رسول الله ﷺ قال: ((قال الله عزو جل: لك ذلك و عشرة أمثاله)) . قال أبو هريرة : لم أحفظ من رسول الله ﷺ إلا قوله: ((لك ذلك و مثله معه)) . قال أبو سعيد الخدري: إني سمعته يقول: ((ذالك لك و عشرة أمثاله)). [أنظر ۶۵۷۳، ۷۴۳۷]. [۱۹۰]

[۱۹۰] وفي صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب معرفة طريق الرؤية، رقم: ۲۶۷، وسنن الترمذي، كتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب ماجاء في الشفاعة، رقم: ۲۳۵۸، وكتاب تفسير القرآن عن رسول الله، باب ومن سورة بني اسرائيل، رقم: ۳۰۷۳، وسنن النسائي، كتاب التطبيق، باب موضع السجود، رقم: ۱۱۲۸، وسنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر الشفاعة، رقم: ۴۲۹۹، ومسند أحمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند أبي هريرة، رقم: ۷۳۹۲، ۱۰۵۹۳، ۱۰۷۲۴، ۱۰۷۷۰، ۱۱۱۰۷، ۱۱۴۶۳، وسنن الدارمي، كتاب الرقائق، باب النظر الى الله تعالىٰ، رقم: ۲۶۸۱.

حدیث کی تشریح

اس باب میں امام بخاری رحمہ اللہ نے جو حدیث ذکر کی ہے اس کو اور بھی متعدد مقامات پر روایت کی ہے، یہاں اس کو سمجھ لینا چاہئے۔

لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ **"ھل نری ربنا یوم القیامة؟"** آپ ﷺ نے فرمایا **"ھل تمارون فی القمر لیلة البدر لیس دونھا سحاب؟"** کیا تم آپس میں چاند کے بارے میں جھگڑا کرتے ہو جبکہ چودھویں رات کا چاند ہو؟

مطلب یہ ہے کہ اگر چودھویں رات کا چاند ہو تو کیا اس کو دیکھنے کے لئے تمہیں دھکم پیل کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے؟ **"ماری یماری مماراة"** کے معنی ہیں جھگڑا کرنا اور ایک روایت میں ہے **"ھل تمارون؟ تماری یتماری"** اس صورت میں مضارع والی "ت" حذف ہو جائے گی اور اس کے معنی ہوں گے کیا تم شک کرتے ہو؟ اور یہ **"مرية"** سے مشتق ہوگا۔ **"تمارون، مراء"** سے اور **"تتمارون، مرية"** سے۔

تو فرمایا کہ کیا تمہیں چودھویں رات کے بارے میں شک ہوتا ہے کہ یہ چاند ہے یا کچھ اور ہے؟

"قالو: لا. قال: فانکم ترونه کذالک" اسی طرح اللہ ﷻ کی زیارت نصیب ہوگی۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے تفصیل بیان فرمائی، فرمایا **"یحشر الناس یوم القیامة فیقول: من کان یعبد شیئا فلیتبع"** جب حشر ہوگا تو اللہ ﷻ فرمائیں گے جو جس چیز کی عبادت کرتا تھا اس کے پیچھے لگ جائے۔

"فمنھم من یتبع الشمس" جو سورج کی عبادت کرتا تھا وہ سورج کے پیچھے لگ جائے گا، جو چاند کی عبادت کرتا تھا وہ چاند کے پیچھے لگ جائے گا، بعض **"طواغیت"** کے پیچھے لگ جائیں گے۔

"طواغیت، طاغوت" کی جمع ہے۔ بعض نے کہا اس کے معنی شیطان کے ہیں۔ بعض نے کہا جن ہیں۔ بعض نے کہا بت ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ یہاں اس سے بت مراد ہیں، یعنی بعض بعض بتوں کے پیچھے لگ جائیں گے۔ **"و تبقی ھذه الامة"** اور یہ امت رہ جائے گی کیونکہ اس نے تو کسی کو اللہ ﷻ کے سوا معبود نہیں بنایا **"فیھا منافقوھا"** اور منافقین بھی ان کے ساتھی ہی ہوں گے یعنی ابھی منافقین کو مخلصین سے الگ نہیں کیا گیا ہوگا، کیونکہ وہ دنیا میں اسلام کا دعویٰ کرتے تھے اور دنیا میں ان کے اوپر تمام احکامات مسلمانوں جیسے جاری ہوتے تھے، آخرت میں بھی وہ مسلمانوں کے ساتھ لگ جائیں گے اور ان کو یہ امید ہوگی کہ یہاں بھی ہمارا دھوکہ چل جائے گا۔

"فیأتیھم اللہ عز و جل فیقول":

یعنی ابھی منافقین بھی مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے کھڑے ہوں گے، جب آگے بڑھیں گے تو اللہ ﷻ

دودھ کا دودھ پانی کا پانی کردیں گے۔ **"فیأتیهم اللہ عزو جل"** اللہ ﷻ اس امت کے جو لوگ کھڑے ہوں گے ان کے پاس آئیں گے **"اتیانا یلیق به"** اس بحث میں خواہ مخواہ پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کیسے آئیں گے؟

خلاصہ یہ ہے کہ ظہور فرمائیں گے، اب تجلی کیسے ہوگی، خواہ مخواہ ان تفصیلات میں جانے کی حاجت نہیں، ہم اس کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے، لہٰذا اتنا کہہ دینا کافی ہے **"فیأتیهم اللہ اتیانا یلیق به أی یلیق بشأنه"**.

"فیقول: انا ربکم" اس وقت امت محمدیہ علی صاحبہا السلام کے لوگ کہیں گے **"هذا مکاننا حتیٰ یأتینا ربنا"** ہم تو اسی جگہ پر رہیں گے جب تک ہمارا پروردگار نہ آجائے۔

دوسری روایت میں تفصیل ہے کہ جب اس مرحلہ پر یہ کہا جائے گا کہ **"أنا ربکم"** تو وہ اللہ ﷻ کو نہیں پہچانیں گے اور اس وجہ سے کہیں گے کہ آپ ہمارے رب نہیں ہیں، جب وہ آئیں گے تو اب پہچان لیں گے۔

اکثر حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ یہ تجلی ایسی صورت سے ہوگی جس کو مسلمان نہیں پہچانتے، اس واسطے جب اس مرحلہ پر یہ کہا جائے گا کہ **"أنا ربکم"** تو وہ پہچاننے سے انکار کردیں گے لیکن جب اللہ ﷻ آئیں گے تو پھر پہچان لیں گے۔

بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اصل میں یہ آخری آزمائش ہوگی، حقیقت میں فرشتہ ظہور کرے گا اور آزمائش کے طور پر ان سے کہے گا **"أنا ربکم"** چونکہ مؤمنین اپنے نور ایمان کی وجہ سے پہچان لیں گے کہ یہ رب نہیں ہے فرشتہ ہے اس لئے پہچاننے سے انکار کردیں گے کہ بھئی! ابھی تو ہم یہیں کھڑے ہیں، جب اللہ ﷻ ہمارے پاس آئیں گے تو ہم خود پہچان لیں گے۔ بعض لوگوں نے یہ معنی بھی بیان کئے ہیں۔

"فإذا جاء ربنا عرفناه" جب ہمارے رب آئیں گے تو ہم خود پہچان لیں گے۔

"فیأتیهم اللہ" اب دوبارہ تشریف لائیں گے **"فیقول: أنا ربکم، فیقولون: أنت ربنا"** اب پہچان لیں گے اور کہیں گے **"أنت ربنا، فیدعوهم"** باری تعالیٰ ان کو بلائیں گے **"و یضرب الصراط بین ظهرانی جهنم"** اور صراط بطور پل کے جہنم کے وسط میں لگا دیا جائے گا **"فأكون أول من یجوز من الرسل بأمته"** حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جتنے انبیاء ہیں ان میں سے سب سے پہلے اپنی امّت کے ساتھ اس پل کو میں قطع کروں گا۔

سوال: اس پر اشکال ہوسکتا ہے کہ اگر آپ ﷺ کی امت بھی آپ ﷺ کے ساتھ پل صراط عبور کر جائے گی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ باقی انبیاء علیہم السلام آپ ﷺ کی امت کے بعد آئیں گے، حالانکہ انبیاء علیہم السلام اس امت سے افضل ہیں۔

جواب: بعض حضرات نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ معنی یہ ہیں انبیاء علیہم السلام میں اس پل کو عبور

کرنے والا پہلا شخص میں ہوں گا اور امتوں سے پل صراط عبور کرنے والی سب سے پہلی امت میری امت ہوگی۔ لہٰذا انبیاء علیہم السلام امت محمدیہ سے پہلے عبور کر جائیں گا۔

بعض حضرات نے کہا کہ اگر آنحضرت ﷺ کے اکرام کی وجہ سے آپ ﷺ کی امت کو بھی اولیت دے دی جائے تو اس میں بھی بعد نہیں، کیونکہ یہ آپ ہی کی فضیلت کی وجہ سے ہوگا، امت کی فضیلت کی بنا پر نہیں۔ [۱۹۱]

"ولا یتکلم یومئذ احد الا الرسل" رعب کا ایسا عالم ہوگا کہ انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی کے اندر بات کرنے کی مجال نہ ہوگی۔ **"وکلام الرسل یومئذ اللّٰھم سلّم سلم"** اور انبیاء بھی جو کلام کریں گے وہ: **"اللّٰھم سلّم"**: اے اللہ! سلامتی عطا فرمائیں، سلامتی عطا فرمائیں، ہوگا۔

"و فی جھنم کلالیب" اور جہنم کے اندر کنڈے لٹک رہے ہوں گے، **"کلالیب، کلوب"** کی جمع ہے جسے آنکڑہ بھی کہتے ہیں، جس کے کنارہ میں اٹھانے کے لئے مڑی ہوئی چیز بھی ہوتی ہے۔ تو جہنم کے اندر آنکڑے لگے ہوں گے **"مثل شوک السعدان"** ''سعدان'' ایک گھاس ہوتی تھی جس پر کانٹے ہوتے تھے، آپ ﷺ نے اس سے تشبیہ دی کہ وہ کلوب سعدان کے کانٹوں کی طرح ہوں گے۔

"ھل رأیتم شوک السعدان؟ قالو: نعم، قال: فانھا مثل شوک السعدان غیر انه لا یعلم قدر عظمھا إلا اللّٰه" ان کی ہیئت تو اگرچہ **"شوک سعدان"** کے مشابہ ہوگی، لیکن جہنم کے کلالیب کے بڑے ہونے کی مقدار سوائے اللہ ﷻ کے کوئی نہیں جانتا کہ وہ کتنے بڑے ہیں۔ العیاذ باللہ، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔ آمین۔

"تخطف الناس باعمالھم" یہ کلالیب لوگوں کے اندر ان کے اعمال کے حساب سے اچک لیں گے۔ **"فمنھم من یوبق بعمله"** ان میں سے کچھ ایسے ہوں گے جو اپنے عمل کی وجہ سے ہلاک ہو جائیں گے۔

"و منھم من یخردل" ان میں سے بعض ایسے ہوں گے جن کو پیس دیا جائے گا، **"خردل یخردل"** کے معنی ہوتے ہیں ٹکڑے کرنا، یعنی ان کا قیمہ بنایا جائے گا (اللہ بچائے) خردل سے نکلا ہے جس کے معنی رائی کے دانے ہیں۔

"ثم ینجو" پھر اللہ ﷻ ان کو نجات بھی دے دے گا، مطلب یہ ہے کہ جن کے عقائد کفر تک پہنچ گئے یا اعمال کفر تک پہنچ گئے یا منافقین جن کے اندر ایمان تھا ہی نہیں، ان کے بارے میں تو یہ فرمایا کہ وہ ہلاک ہو جائیں گے، ان کے لئے جہنم سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے اور بعض ایسے تھے جو سخت گناہ گار تھے لیکن ان کے اندر پھر بھی ایمان کی کچھ شمع روشن تھی تو ان کو مخردل کیا جائے گا، پھر ان کی نجات ہو جائے گی۔

---

[۱۹۱] كذا في لامع الدراري: ج: ۱، ص: ۳۲۴) والله أعلم.

"حتى إذا أراد الله رحمة من أراد من أهل النار" یہاں تک کہ جب اللہ ﷻ رحمت کا ارادہ فرمائیں گے ان لوگوں پر جن پر ارادہ فرمائیں گے اہل نار میں سے تو کیا ہوگا؟ "امر الله الملئكة أن يخرجوا من كان يعبد الله" اللہ ﷻ ملائکہ کو حکم دیں گے کہ جو بھی اللہ کی عبادت کرتا ہو اس کو نکال لاؤ، چاہے عقیدہ میں کتنا ہی فساد ہو لیکن عبادت اللہ ﷻ کی کرتا ہو۔

"فيخرجونهم و يعرفونهم باثار السجود" ان کو نکالیں گے اور سجدہ کے آثار سے ان کو پہچانیں گے، کیوں؟ "و حرّم الله على النار أن تاكل اثر السجود" کہ اللہ ﷻ نے جہنم پر حرام کر رکھا ہے کہ وہ سجدہ کے اثر کو کھائے، لہٰذا جو اعضاء سجود ہیں جیسے پیشانی، ناک وغیرہ ان کو جہنم کی آگ نہیں جلائے گی۔ تو ان کے آثار سجود باقی ہوں گے جس کی وجہ سے ان کو ملائکہ پہچان لیں گے اور ان کو نکالنے میں آسانی ہوگی۔

حدیث کا یہی حصہ ترجمۃ الباب سے متعلق ہے "باب فضل السجود" اس سے سجدہ کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

"فيخرجون من النار" اب یہ جہنم سے باہر نکلیں گے، "فكل ابن آدم تأكله النار إلّا اثر السجود، فيخرجون من النار قد امتحشو" یہ جہنم سے اس حالت میں نکالے جائیں گے کہ یہ جل چکے ہوں گے۔

"أمتحش أى احترق حراقا شديداً"

"فيصب عليهم ماء الحياة" ان کے اوپر آب رحمت ڈالا جائے گا "فينبتون كما تنبت الحبة فى حميل السيل" اس ماء حیات کا ڈالنے سے ان کا جسم اس طرح سے دوبارہ اُگ آئے گا جس طرح سیلاب کے کیچڑ سے صحرائی بیج اگ آ گے ہیں۔

"حبة، بكسر الحاء" اس کے معنی ہیں وہ جنگلی پودوں کے بیج جو صحراؤں میں بکھرے رہتے ہیں، کیونکہ وہ بیج ایسے ہوتے ہیں کہ جب بھی ذرا سی بارش پڑی وہ بیج فوراً پودے کی شکل اختیار کرنا شروع کر دیتے ہیں، تو ان کا اُگنا بہت تیز رفتاری سے ہوتا ہے، عام بیج ڈالیں تو نکلنے میں بہت دن لگیں گے لیکن جو صحرائی بیج ہوتے ہیں یہ معمولی سی بارش سے فوراً اگ آتے ہیں، چہ جائیکہ اگر کہیں سیلاب آئے اور سیلاب کے اندر کیچڑ بھی ہو تو معمولی کیچڑ بھی پودے کے اگنے میں بہت زیادہ مدد دیتا ہے۔

تو فرماتے ہیں جیسے سیلاب کے کیچڑ میں "حبة" اگ آتا ہے اسی طرح جلدی سے ان کا جسم دوبارہ اُگ آئے گا۔

"ثم، يفرغ الله من القضاء بين العباد" پھر اللہ ﷻ بندوں کے درمیان فیصلہ کرنے سے فارغ ہو جائیں گے۔ "و يبقى رجل بين الجنة والنار" اور ایک شخص جنت اور جہنم کے درمیان رہ جائے گا

"وهو آخر أهله النار دخولا الجنة" اور یہ اہل جہنم میں سے وہ شخص ہوگا جو سب سے آخر میں جہنم سے نکالا جائے گا اور سب سے آخر میں جنت میں داخل کیا جائے گا۔

"مقبل بوجهه قبل النار" اس کو جہنم سے تو نکالا گیا مگر اس کا منہ جہنم کی طرف کر کے کھڑا کیا ہوا ہوگا۔

"فيقول: يا رب اصرف وجهي عن النار فقد قشبني ريحها، وأحرقني ذكاء ها" وہ درخواست کرے گا کہ اے رب کریم! میرا چہرہ اس طرف سے پھیر دیجئے کیونکہ اس کی بادسموم نے مجھے زہریلا بنا دیا ہے، **"قشبت"** کا معنی ہے زہریلا بنا دینا۔ یعنی مجھے لولگ گئی ہے **"وأحرقني ذكاؤها"** اور مجھے اس کے شعلوں نے جلا دیا ہے۔ **"ذكاء"** کے معنی ہے بھڑکنا، **"ذكاء النار"** کے معنی ہیں آگ کا بھڑکنا۔ اس کے بھڑکتے ہوئے شعلوں نے مجھے جلا ڈالا ہے۔ باری تعالیٰ فرمائیں گے۔

"هل عسيت ان فعل ذلك بك أن تسأل غير ذلك؟" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر تمہارے ساتھ ایسا کر دیا گیا جیسا کہ تم کہہ رہے ہو کہ چہرہ کو جہنم سے ہٹا دیا جائے تو قریب ہے کہ بعد میں تم اس کے علاوہ بھی سوال کرو گے اور کچھ مانگو گے۔

"فيقول: لا وعزتك" کہ آپ کی عزت کی قسم اور نہیں مانگوں گا۔ **"فيعطي الله ما شاء من عهد و ميثاق فيصرف الله وجهه عن النار"** خوب عہد و میثاق کرے گا کہ اگر آپ نے میرا چہرہ جہنم سے ہٹا دیا تو آگے اور کچھ نہیں مانگوں گا۔ تو اللہ ﷻ اس کا چہرہ جہنم سے ہٹا دے گا۔

"فإذا قبل به على الجنة رأى بهجتها سكت ماشاء الله أن يسكت" اب جب جہنم سے چہرہ پھر گیا تو سامنے جنت آ گئی، وہاں جنت کی بہجت اور شادابی نظر آئے گی تو کچھ دیر خاموش رہے گا پھر کہے گا **"يا رب قدمني عند باب الجنة"** مجھے جنت کے دروازہ کے پاس لے جائیں۔

"فيقول الله له: أليس قد أعطيت العهود والمواثيق أن لا تسأل غير الذي كنت سألت؟" کہ وعدے نہیں کئے تھے کہ اور کچھ نہیں مانگے گا؟

"فيقول: يا رب لا أكون اشقى خلقك" وہ اس کا جواب نہیں دے گا کہ وعدے کیا کئے تھے بلکہ کہے گا اے اللہ! آپ کی مخلوق میں سے سب سے زیادہ شقی تو نہ بنوں، کم از کم اتنا ہو جائے کہ جنت کے دروازہ تک ہی پہنچ جاؤں۔

"فيقول: فما عسيت أن أعطيت ذالك أن لا تسأل غيره؟" کہ اگر یہ دے دیا گیا تو کیا ضمانت ہے کہ اور نہیں مانگو گے؟

"فيقول: لا و عزتك، لا أسأل غير ذالك، فيعطي ربه ماشاء من عهد و ميثاق

فيقدمه إلىٰ باب الجنة" اللہ جل جلالہ جنت کے دروازے تک لے جائیں گے۔

"**فإذا بلغ بأبها فرأى زهرتها وما فيها من النضرة والسرور، فيسكت ما شاء الله أن يسكت**" جب وہاں جنت کے نظارے، وہاں کی شادابی، سرور اور لذتیں نظر آئیں گی تو کچھ دیر تو خاموش رہے گا پھر کہے گا "**يا رب أدخلني الجنة**" اے رب مجھے اب جنت میں داخل کر دیجیے۔

"**فيقول الله تعالىٰ: ويحك يا ابن آدم ما اغدرك ؟**"

اے ابن آدم! تجھ پر افسوس، تو کتنا بے وفا ہے کہ ابھی تو وعدے کر رہا تھا کہ اور نہیں مانگوں گا، یہاں آ کر پھر مانگ رہا ہے۔

"**أليس قد أعطيت العهد والميثاق أن لا تسأل غير الذى أعطيت؟**"

"**فيقول: يا رب لا تجعلني أشقى خلقك**" اے پروردگار! وہ سب وعدے وعید چھوڑ دیجئے، اگر یہیں رہ گیا اور اندر داخل نہ ہوا تو میں "**اشقى خلقك**" ہو جاؤں گا، اس انجام سے مجھے بچا لیجئے۔

"**فيضحك الله عزو جل منه، (ضحكاً يليق بشأنه) ثم يأذن له فى دخول الجنة**" اللہ جل جلالہ جنت میں داخل ہونے کی اجازت دے دیں گے کہ چل تجھے جنت میں داخل کر دیا۔

"**فيقول له تمن**" اب تمنا کر، کیا کرتا ہے اور کیا چاہئے؟ "**فيتمنّى**" جتنی اس کے دماغ میں تمنائیں ہوں گی وہ ساری تمنائیں کرے گا "**حتى إذا أنقطعت أمنيّته**" یہاں تک کہ جن ساری آرزوئیں ختم ہو جائیں گی "**قال الله عزو جل: زد من كذا او كذا**" باری تعالیٰ خود فرمائیں گے یہ بھی بڑھا، یہ بھی بڑھا، یہ تمنا بھی کر لے، یہ تمنا بھی کر لے۔ "**اقبل يذكّر ربه عزوجل**" اللہ جل جلالہ یاد دلانا شروع کریں گے کہ فلاں بات تو تو بھول ہی گیا، اس کو یاد کر اور مانگ۔ "**حتى إذا أنتهت به الأمانيّ**" یہاں تک کہ جب ساری آرزوئیں ختم ہو جائیں گے۔

"**قال الله تعالىٰ: لك ذلك و مثله معه**" باری تعالیٰ فرمائیں گے۔ چل جو کچھ تو نے تمنا کی سب تجھے مل گیا اور اتنا ہی اور بھی۔

"**قال أبو سعيد الخذرى لأبى هريرة رضى الله تعالى عنهما: أن رسول الله ﷺ قال: قال الله عزو جل: لك ذلك و عشرة أمثاله**" اس روایت میں یہ ہے کہ دس گنا اور لے جا۔

"**قال أبو هريرة: لم أحفظ من رسول الله الأ قوله: لك ذلك و مثله معه**".

"**قال أبو سعيد الخذرى: إنى سمعته يقول: ذلك لك و عشرة أمثاله**" تو یہ دس والی روایت بھی پکی ہے۔

جنتی اور جہنمی ہونے کا فیصلہ!

یہ بات یاد رکھیں کہ کسی بھی انسان کو جہنمی نہیں کہنا چاہئے۔ ارے! آپ کون ہوتے ہیں اس کا فیصلہ کرنے والے کہ جنتی کون ہے اور جہنمی کون ہے۔ جس کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے وہی اس کا فیصلہ کرے گا کہ کس کو جنت میں جانا ہے اور کس کو جہنم میں جانا ہے۔ کیا معلوم جسے آپ جہنمی کہہ رہے ہیں اللہ ﷻ اس کے حالات میں تبدیلی پیدا کر کے اس کو جنت میں داخل فرمادے اور آپ دیکھتے رہ جائیں۔ (العیاذ باللہ) کبھی کسی کو جہنمی نہ کہیں، چاہے بد سے بدتر کافر ہی کیوں نہ ہو۔

یہ جو ہم دنیا میں احکام کے مکلّف ہیں کہ فلاں کو کافر کہنا ہے، فلاں کو زندیق کہنا ہے، فلاں کو مرتد کہنا ہے تو یہ ہم کہتے رہتے ہیں اور دنیوی احکام میں ہم اس کے مکلّف ہیں، لیکن ہمارا یہ فیصلہ اللہ ﷻ پر حجت نہیں، ہم نے کسی کو کافر کہہ دیا تو اللہ ﷻ پر حجت نہیں، لہٰذا عین ممکن ہے کہ جس کو کافر کہتے کہتے آپ کی زبانیں تھک گئیں اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے کسی مخفی ایمان کی وجہ سے یا اس کے حالات کی تبدیلی کی وجہ سے اس کو نجات دے دیں۔

دیکھیں وہ آدمی جس کے متعلق بخاری شریف میں کئی جگہ حدیث آئی ہے کہ اگر میں مرجاؤں تو میری لاش جلا کر راکھ کو ہوا اور آندھی میں اڑا دینا، کیونکہ اگر اللہ ﷻ کے قابو میں آ گیا تو وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے **"لئن قدر علی اللہ"** اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے اللہ ﷻ کے قابو سے نکلنے کے لئے یہ تدبیر کی تھی۔

اب ظاہر میں دیکھیں تو یہ صریح کفر ہے، اللہ ﷻ کی قدرت کاملہ کا انکار ہے کہ اگر مجھے اس طرح اڑا دو گے تو اللہ ﷻ مجھے جمع نہیں کر سکیں گے۔ یہ صریح کفر ہے مگر اللہ ﷻ اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ چل جب تو مجھ سے ڈرتا ہے تو میں نے تیری مغفرت کر دی۔ ہم مفتی لوگ ظاہری احکام کے مکلّف ہوتے ہیں کہ ظاہری احکام کو دیکھ کر کہہ دیتے ہیں کہ یہ کافر ہے، وہ کافر ہے۔ لیکن حقیقت میں اللہ رب العزت کی جناب میں کون کافر اور مستحق خلود فی النار ہے، کون نہیں ہے اس کا فیصلہ اللہ ﷻ کریں گے۔

لہٰذا فتویٰ کی بنیاد پر کسی کو جہنمی سمجھنا یہ غلط خیال ہے۔ پتا نہیں اللہ ﷻ کس کس کو جہنم سے نکال دیں۔ پہلے حضور اقدس ﷺ سے کہا جائے گا، شفاعت کریں، آپ ﷺ اپنی شفاعت کے ذریعہ بہت سوں کو نکلوائیں گے۔ پھر ملائکہ سے کہا جائے گا کہ جا کر دیکھو جس کے دل میں **"حبة خردل"** بھی ایمان ہو اس کو بھی نکال لاؤ۔

جب ملائکہ بھی نکال لائے تو پھر اللہ ﷻ خود اپنی مٹھیاں بھریں گے، یعنی یہ وہ تھے جن کے ایمان کی معرفت ملائکہ کو بھی حاصل نہ ہو سکی اور ملائکہ بھی نہ پہچان سکے کہ ان کے اندر ایمان کی کوئی رمق ہے، تو باری تعالیٰ اپنی مٹھیاں بھریں گے۔

بظاہر یہ وہ لوگ ہیں جن پر دنیا میں حکم بالکفر کیا گیا ہو گا ورنہ اگر حکم بالکفر نہ کیا گیا ہوتا تو ان کے ایمان کو

سب پہچانتے۔ اس لئے کوئی فتویٰ کی بنیاد پر کسی کو جہنمی نہیں کہہ سکتے۔ ہاں دنیا میں اس پر احکام کافر یا مرتد کے جاری ہونگے، اور اس کا ظاہر حال یہی ہے کہ وہ جہنم کا مستحق ہے لیکن حتمی طور پر اسے جہنمی کہنا ہمارا کام نہیں۔

(۱۳۴) باب السجود على الأنف

ناک کے بل سجدہ کرنے کا بیان

۸۱۲ ۔ حدثنا معلى بن أسد قال: حدثنا وهيب، عن عبدالله بن طاؤس، عن أبيه، عن ابن عباس رضي الله عنهما قال: قال النبي ﷺ: ((أمرت أن أسجد على سبعة. أعظم: على الجبهة. و أشار بيده على أنفه. واليدين والركبتين وأطراف القدمين، ولا نكفت الثياب والشعر)). [راجع: ۸۰۹]

"اقتصار على الأنف" اور مسلک حنفیہ

عام طور سے مشہور یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک سجدہ میں **"اقتصار على الأنف"** بھی جائز ہے۔

لیکن علامہ شامی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ نے اس مسئلہ میں صاحبین رحمہما اللہ کے قول کی طرف رجوع کرلیا تھا کہ **"اقتصار على الأنف"** کی صورت میں سجدہ نہیں ہوگا۔ ہاں **"اقتصار على الجبهة"** کی صورت میں سجدہ ہو جاتا ہے، اگرچہ ایسا کرنا مکروہ ہے۔

"وأشار بيده على أنفه" آپ ﷺ نے لفظ توجبہۃ کا استعمال فرمایا لیکن اشارہ ناک کی طرف فرمایا۔

اس کی بہترین توجیہ حضرت گنگوہی قدس سرہ نے بیان فرمائی ہے کہ پیشانی پر مکمل سجدہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ناک کو بھی نہ ٹیکا جائے۔ لہٰذا اشارہ فرمادیا کہ پیشانی پر سجدہ اس طرح کرنا چاہئے کہ ناک بھی زمین پر ٹکے۔[۱۹۲]

(۱۳۵) باب السجود على الأنف في الطين

کیچڑ میں بھی ناک کے بل سجدہ کرنے کا بیان

۸۱۳ ـ حدثنا موسىٰ قال: حدثنا همام، عن يحيىٰ، عن أبي سلمة قال: انطلقت

[۱۹۲] فيض الباري، ج: ۲، ص: ۳۰۷.

إلى أبی سعید الخدری فقلت: إلاتخرج بنا إلى النخل نتحدث؟ فخرج. قال: قلت: حدثنی ما سمعت من النبی ﷺ فی لیلة القدر. قال: اعتکف رسول الله ﷺ العشر الأول من رمضان، واعتکفنا معه، فأتاه جبریل فقال: إن الذی تطلب أمامک، فاعتکف العشر الأوسط فاعتکفنا معه. فأتاه جبریل فقال: إن الذی تطلب أمامک، فقام النبی ﷺ خطیبا صبیحة عشرین من رمضان فقال: ((من کان اعتکف مع النبی ﷺ فلیرجع فإنی أریت لیلة القدر وإنی نسیتها وإنها فی العشر الأواخر فی وتر، وإنی رأیت کانی أسجد فی طین وماء)) وکان سقف المسجد جرید النخل وما نری فی السماء شیئا، فجاء ت قزعة فأمطرنا، فصلی بنا النبی ﷺ حتی رأیت أثر الطین والماء علی جبهة رسول الله ﷺ و أرنبته، تصدیق رؤیاه. [راجع: ۶۶۹]

حضرت ابوسلمہ ؓ کہتے ہیں کہ میں حضرت ابوسعید خدری ؓ کے پاس گیا اور جا کر کہا **"إلا تخرج بنا إلى النخل نتحدث؟"** ہمیں ذرا باہر نخلستان کی طرف نکال کر لے جائیے تا کہ وہاں خلوت میں کچھ باتیں کریں۔

"فخرج " حضرت ابوسعید خدری ؓ ہمارے ساتھ چلے گئے، میں نے کہا **" حدثنی ما سمعت من النبی ﷺ فی لیلة القدر، قال اعتکف رسول الله ﷺ فی العشر الأول من رمضان وأعتکفنا معه"** پہلے عشرہ میں ہم نے حضور ﷺ کے ساتھ اعتکاف کیا، جبرئیل علیہ السلام آئے اور آ کر حضور اقدس ﷺ سے عرض کیا کہ **"إن الذی تطلب أمامک"** اعتکاف سے جو چیز حاصل کرنا آپ کا مقصود ہے یعنی لیلۃ القدر وہ آپ کے آگے ہے۔

عشرۂ اولیٰ میں اعتکاف کیا تھا کہ ہوسکتا ہے شب قدر مل جائے لیکن جب عشرۂ اولیٰ پورا ہونے والا تھا تو جبرئیل علیہ السلام نے کہا شب قدر ابھی نہیں آئی، آگے آئے گی۔

پھر آپ ﷺ نے دوسرے عشرے کا اعتکاف فرمایا **" فأعتکفنا معه، فأتاه جبریل فقال: إن الذی تطلب أمامک"** دوبارہ آئے اور وہی بات کہی کہ جس چیز کی آپ کو تلاش ہے وہ آگے آنے والی ہے۔

"فقام النبی ﷺ خطیبا صبیحة عشرین من رمضان قال" بیس رمضان کی صبح کو آپ ﷺ نے خطبہ دیا اور فرمایا **"من کان أعتکف مع النبی ﷺ فلیرجع"** کہ جس نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ اعتکاف کیا ہے وہ اگر چاہے تو چلا جائے **"فإنی أریت لیلة القدر وأنی نسیتها"** کہ مجھے لیلۃ القدر دکھائی گئی تھی کہ کب آئے گی اور ساتھ اس کی معین تاریخ بھلا بھی دی گئی۔

" و إنها فی العشر الأواخر فی وتر" اب اتنی بات معلوم ہوگئی ہے کہ وہ عشرۂ اخیرہ میں ہے اور اس کی طاق رات ہوگی۔ **"وإنی رأیت کأنی أسجد فی طین و ماء"** اور میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ

میں پانی اور کیچڑ میں سجدہ کر رہا ہوں، جو اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اس سال جو شب قدر آنے والی ہے، وہ ایسی رات میں ہوگی جبکہ آپ پانی اور کیچڑ میں سجدہ کریں گے۔

"وکان سقف المسجد جريد النخل" مسجد کی چھت کھجوروں کی شہتیروں کی تھی اور اس وقت آسمان میں بادل نہیں تھے **"فجاء ت قزعة"** اچانک ایک بادل آگیا **"فامطرنا"** بارش ہوئی **"فصلّى بنا النبی ﷺ حتى رأيت اثر الطين والماء على جبهة رسول الله ﷺ"** رات کو جب آپ ﷺ نے نماز پڑھی تو آپ کی پیشانی مبارک پر پانی اور کیچڑ کے اثرات نظر آرہے تھے **"تصديق رؤياه"** آپ ﷺ کے خواب کی تعبیر کے طور پر اس رات آپ نے پانی اور کیچڑ پر سجدہ کیا۔ تو یہ وہی رات تھی یعنی شب قدر اور اکیسویں شب تھی۔

(۱۳۶) باب عقد الثياب و شدها، ومن ضم إليه ثوبه إذا خاف أن تنكشف عورته

کپڑوں میں گرہ لگانے اور ان کے باندھنے کا بیان اور ستر کھلنے کے خوف سے اگر کوئی شخص اپنا کپڑا لپیٹ لے

۸۱۴ ۔ حدثنا محمد بن كثير قال: أخبرنا سفيان، عن أبي حازم، عن سهل بن سعد قال: كان الناس يصلون مع النبي ﷺ وهم عاقدو أزرهم من الصغر على رقابهم، فقيل للنساء: ((لا ترفعن رؤسكن حتى يستوي الرجال جلوسا)). [راجع: ۳۶۲]

یہ حدیث پہلے بھی گزر چکی ہے، یہاں لانے کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ پہلے حدیث میں آیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے **"عن ضم الثياب في الصلوة وإن لا يكف شعره ولا ثوبه......."** تو **"ثياب"** کو جمع کرنے سے منع فرمایا تھا۔ اب اس میں ایک استثنائی شکل بتا رہے ہیں کہ جب کسی شخص کا ازار اتنا وسیع نہ ہو کہ اس کے دونوں پلے اوپر نیچے ڈال کر آدمی آرام سے کھڑا ہو سکے بلکہ تنگ ہو، چوڑائی کم ہو تو ایسی صورت میں اگر اٹھا کر گردن پر باندھ لے تو اس کی اجازت ہے، یہ اس **"ضم الثياب"** میں یا **"ضم الشعر"** یا **"جمع الثياب"** میں داخل نہیں ہے، کیونکہ اس کی ممانعت پہلے آچکی ہے۔

(۱۳۷) باب لا يكف شعرا

نماز میں بال درست نہ کرے

بالوں کو کف کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ان کو لٹکتے ہوئے چھوڑنے کے بجائے کسی ایک جگہ جمع کر لیا جائے

جیسے عورتیں پیچھے جوڑا باندھ لیتی ہیں، پہلے زمانے میں مرد بھی لمبے لمبے بال رکھا کرتے تھے تو وہ بھی اسی طرح جوڑا بنالیا کرتے تھے، اس کی بھی ممانعت آئی ہے کہ نماز میں ایسا نہ کیا جائے۔

علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ ممانعت کراہت تنزیہی ہے، اور علامہ ابن التین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ **"هذا مبني على الاستحباب، فاما اذا فعله فحضرت الصلاة فلا بأس أن يصلي كذالك"**.[۱۹۳]

اصل مقصد یہ ہے کہ جب آدمی سجدہ میں جائے تو سارے اعضاء سجدہ میں ہوں، سارے اعضاء جھکے ہوئے ہوں، اگر پیچھے باندھ لیا ہے تو وہ کھڑے ہیں، بہتر یہ ہے کہ وہ بھی لٹکتے ہوئے ہوں تاکہ وہ بھی سجدہ میں جائیں، لیکن اگر کسی نے ایسے نہیں کیا تو نماز ہو جائے گی۔

خاص طور سے خواتین بعض اوقات اس مقصد کے تحت جُوڑا باندھ لیتی ہیں تاکہ اگر بال کُھلے ہوں گے تو لٹکنے کا اندیشہ ہے اور چونکہ ان کے بال بھی عورت میں داخل ہیں، اس لئے نماز کے فاسد ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اگر اس لئے باندھ لیں تو امید ہے کہ ان شاء اللہ وہ اس ممانعت میں داخل نہیں ہونگی۔

ممانعت کا مقصد یہ ہے کہ کوئی شخص بالوں کو اس سے بچا رہا ہے کہ کہیں نیچے زمین پر نہ لگ جائیں اور مٹی نہ لگ جائے وغیرہ وغیرہ۔ اگر اس مقصد سے جمع کر رہا ہے تو یہ مکروہ ہے کیونکہ حالتِ صلوٰۃ تذلل ہے، اس میں یہ سمجھنا کہ ہمارے کپڑے خراب ہو جائیں گے، بالوں کو مٹی لگ جائے گی وغیرہ وغیرہ، اس فکر میں زیادہ نہیں رہنا چاہئے۔

(۱۳۹) باب التسبيح والدعاء في السجود

سجدوں میں دعا اور تسبیح کا بیان

۸۱۷ - حدثنا مسدد قال: حدثنا يحيىٰ، عن سفيان قال: حدثنا منصور بن المعتمر عن مسلم، عن مسروق، عن عائشة رضي الله عنها أنها قالت: كان النبي ﷺ يكثر أن يقول في ركوعه وسجوده: ((سبحانك اللّٰهم ربنا و بحمدك، اللّٰهم اغفر لي)). يتأول القرآن.[راجع: ۷۹۴]

"يتأول القرآن" کا مطلب یہ ہے کہ آپ سجدہ میں جو پڑھتے تھے وہ قرآن مجید کے حکم **"فسبح بحمد ربك واستغفره"** کی تعمیل میں پڑھتے تھے۔

---

۱۹۳ عمدة القاري، ج:۴، ص ۵۵۷.

(۱۴۰) باب المكث بين السجدتين

دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنے کا بیان

۸۱۸ ـ حدثنا أبو النعمان قال: حدثنا حماد بن زيد عن أيوب، عن أبي قلابة: أن مالك ابن الحويرث قال لاصحابه: ألا أنبئكم صلاة رسول الله ﷺ؟ قال: و ذاك في غير حين صلاة. فقام ثم ركع فكبر، ثم رفع رأسه، فقام هنيّة ثم سجد، ثم رفع رأسه هنيّة فصلى صلاة عمرو بن سلمة شيخنا هذا. قال أيوب: كان يفعل شيئاً لم أرهم يفعلونه. كان يقعد في الثالثة والرابعة.[راجع: ٦٧٧]

ثم رفع رأسه هُنيّه،

مقدار جلسہ بین السجدتین

اس سے امام بخاری رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے کہ جلسہ بین السجدتین معتد بہ ہونا چاہئے۔

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک اس میں کم از کم **"اللّٰهم اغفرلی"** کہنا فرض ہے۔ شافعیہؒ و مالکیہؒ کے نزدیک مسنون ہے۔

حنفیہ ذکر جلسہ کو نوافل پر محمول کرتے ہیں، لیکن یہ بات ثابت ہے کہ آپ ﷺ قومہ میں تقریباً رکوع کے بقدر اور جلسہ میں تقریباً سجدے کے بقدر بیٹھتے تھے اور علامہ شامی رحمہ اللہ نے متاخرین سے نقل کیا ہے کہ اگر مقتدیوں پر بھاری نہ گذرے تو فرائض میں بھی جائز ہے۔

لہٰذا حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے **"فیض الباری"** میں فرمایا کہ احناف کو بھی یہ اذکار پڑھ لینے چاہئیں تاکہ قومہ اور جلسہ سنت کے مطابق ہو جائے۔[۱۹۴]

"قال أيوب": حضرت ایوب نے فرمایا کہ وہ ایک ایسا عمل کرتے تھے جو میں نے کسی اور کو کرتے نہیں دیکھا اور وہ یہ کہ وہ تیسری رکعت میں بیٹھتے تھے یعنی جلسۂ استراحت کرتے تھے۔ راوی کو شک ہے کہ ثالثہ کہا یا رابعہ کہا، حالانکہ جلسۂ استراحت ثالثہ میں ہی ہوتا ہے رابعہ میں تو نہیں ہوتا اور اس نقطۂ نظر سے کہ تیسری رکعت کے ختم اور چوتھی رکعت کے شروع میں ہوتا ہے اس کو کسی راوی نے رابعہ سے تعبیر کر دیا ہوگا۔

۸۲۱ ـ حدثنا سليمان بن حرب قال: حدثنا حماد بن زيد، عن ثابت، عن أنس

---

۱۹۴ انظر للتفصيل: فيض البارى، ج: ۲، ص: ۳۰۸.

ابن مالک قال: إني لا آلو ان أصلي بكم كما رأيت النبي ﷺ يصلي بنا. قال ثابت: كان أنس يصنع شيئاً لم أركم تصنعونه. كان إذا رفع رأسه من الركوع قام حتى يقول القائل: قد نسيي، و بين السجدتين حتى يقول القائل: قد نسيي. [راجع: ۸۰۰]

یہاں ایک اور بات بتائی کہ وہ ایک ایسا کام کرتے تھے جو تم نہیں کرتے کہ قومہ میں اور جلسہ میں طویل وقفہ دیتے تھے۔

(۱۴۲) باب من استوى قاعداً في وتر من صلاته ثم نهض

نماز کی طاق رکعت میں سیدھے بیٹھنے، پھر کھڑے ہونے کا بیان

۸۲۳ ــ حدثنا محمد بن الصباح قال: أخبرنا هشيم قال: أخبرنا خالد الحذاء، عن أبي قلابة قال: أخبرني مالک بن الحويرث الليثي: أنه رأى النبي ﷺ يصلي فإذا كان في وتر من صلاته لم ينهض حتى يستوي قاعداً. [۱۹۵]

جلسۂ استراحت کا حکم

یہ حدیث جلسۂ استراحت کی دلیل ہے، امام شافعی رحمہ اللہ اسی کو اختیار کرتے ہیں اور جلسۂ استراحت کو مسنون کہتے ہیں۔

حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ رحمہم اللہ کے نزدیک اصح القولین میں عام حالات میں جلسۂ استراحت مسنون نہیں ہے۔ البتہ جائز ہے۔

جمہور کی دلیل ترمذی کی روایت ہے: **"عن أبي هريرة ﷺ قال: كان النبي ﷺ ينهض على صدور قدميه".**

اور یہ روایت بہت سارے آثار صحابہؓ سے مؤید ہے اور وہ آثار صحابہؓ مصنف بن ابی شیبہ اور مصنف عبد الرزاق میں موجود ہیں اور طحاوی رحمہ اللہ نے بھی ان کو روایت کیا ہے۔ [۱۹۶]

---

[۱۹۵] وفي سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب النهوض في الفرد، رقم: ۷۱۸.

[۱۹۶] سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب منه أيضا، رقم: ۲۸۸، ج:۲، ص:۸۰، بيروت، ومصنف ابن أبي شيبة، من كان ينهض على صدور قدميه، رقم: ۳۹۷۸ـ ۳۹۸۵، ج:۱، ص:۳۴۶. ومصنف عبد الرزاق، باب كيف النهوض من السجدة الآخرة و من الركعة الأولى و الثانية، رقم: ۲۹۶۶ ـ ۲۹۶۹، ج:۲، ص:۱۷۹، وشرح معاني الآثار، باب مايفعله المصلي بعد رفعه من السجدة الآخرة من الركعة الأولى، ج:۴، ص:۳۵۴.

نعمان بن ابی عیاش جو مشہور تابعی ہیں وہ کہتے ہیں "ادر کت غیر واحد من الصحابة ینهضون علی صدور اقدامهم" اور یہی مذہب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ بیٹھتے نہیں تھے، سیدھے کھڑے ہو جاتے تھے۔

ان سب باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر جلسہ استراحت سنتِ صلوٰۃ ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں متعارف ہوتا، سوائے ایک دو روایات کے کہیں جلسہ استراحت کا ذکر بھی نہیں آیا۔

لہٰذا جہاں جلسہ استراحت کا ذکر ہے وہ حالت عذر پر بھی محمول ہو سکتا ہے کہ جب آپ ﷺ کا جسم مبارک ذرا بھاری ہو گیا تھا اس وقت آپ ﷺ جلسہ استراحت فرمانے لگے تھے، ورنہ فی نفسہٖ مسنون نہیں، لیکن بہر حال جس درجہ میں جلسہ استراحت ہے وہ جائز ضرور ہے اس لئے اگر آدمی بیٹھ جائے تو نماز درست ہو جائے گی۔[۱۹۷]

اور پیچھے گذر چکا ہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس کو بیان جواز پر محمول کیا ہے۔

(۱۴۵) باب سنة الجلوس فی التشهد.

تشہد کے لئے بیٹھنے کا طریقہ

"وكانت أم الدرداء تجلس في صلاتها جلسة الرجل، و كانت فقيهة".

۸۲۷ - حدثنا عبدالله بن مسلمة، عن مالک، عن عبدالرحمٰن بن القاسم، عن عبدالله بن عبد الله أنه أخبره: أنه كان يرى عبدالله بن عمر رضي الله تعالىٰ عنهما يتربع في الصلاة إذا جلس، ففعلته وأنا يومئذ حديث السن فنهاني عبدالله بن عمر. قال: إنما سنة الصلاة أن تنصب رجلك اليمنى، و تثني اليسرى. فقلت: إنک تفعل ذلک؟ فقال: إن رجلي لا تحملاني.[۱۹۸]

تشہد میں بیٹھنے کا مسنون طریقہ

اس باب میں تشہد میں بیٹھنے کا مسنون طریقہ بیان کرنا مقصود ہے۔

پہلے حضرت ام الدرداء رضی اللہ عنہا کا اثر نقل کیا ہے کہ وہ اپنی نماز میں اسی طرح بیٹھتی تھیں جس طرح

---

۱۹۷ عمدة القاری، ج:۴، ص: ۵۶۷.

۱۹۸ وفي سنن النسائي، كتاب التطبيق، باب كيف الجلوس للتشهد الأول، رقم: ۱۱۴۵، وسنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب كيف الجلوس في التشهد، رقم: ۸۲۱، وموطأ مالک، كتاب النداء للصلاة، باب العمل في الجلوس في الصلاة، رقم: ۱۸۷.

مرد بیٹھتا ہے۔ ''**وكانت فقيهة**'' اور وہ فقیہہ بھی تھیں۔

اس میں امام بخاری رحمہ اللہ یہ بیان فرمانا چاہ رہے ہیں کہ مرد اور عورت کی ہیئت جلوس میں کوئی فرق نہیں، جو جلوس مرد کے لئے مسنون ہے وہی عورت کے لئے بھی مسنون ہے۔

علامہ عینی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہی سب فقہاء کا مذہب ہے، یہاں تک کہ انہوں نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب بھی اسی کے مطابق بیان کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک بھی عورت کی جلوس مرد کی جلوس کی طرح ہے۔

لیکن حنفیہ اور حنابلہ کی فقہ کی کتابوں میں صراحۃً لکھا ہوا ہے کہ عورت تورّک کے ساتھ بیٹھے، مرد کے لئے تو ''**نصب الرجل اليمنىٰ والافتراش اليسرىٰ والجلوس على اليسرى**'' یہ مسنون ہے اور عورت کے لئے تورّک مسنون ہے۔ تورک کے معنی ہیں دونوں پاؤں دائیں طرف نکال کر بائیں ورک پر بیٹھے۔

اعتراض

بہت سے حضرات جن کا مبلغ علم صرف بخاری تک ہی محدود رہتا ہے وہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ دیکھیں بخاری نے تو یہ روایت کیا ہے ''**وكانت أم الدرداء تجلس في صلاتها جلسة الرجل**'' اور حنفی حضرات جو کہتے ہیں کہ عورتوں کے بیٹھنے کے لئے الگ طریقہ ہے اور اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

حنفیہ کے دلائل

ایک تو ابوداؤد کے مراسیل میں روایت ہے کہ عورت کے لئے تورّک کا طریقہ ہے۔[199]

دوسرے مصنف بن ابی شیبہ میں متعدد صحابہؓ و تابعینؒ سے یہ بات مروی ہے کہ انہوں نے عورت کے بیٹھنے اور نماز پڑھنے کا طریقہ الگ بیان کیا ہے۔[200]

علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے ''اعلاء السنن'' میں یہ آثار بیان فرمائے ہیں۔[201]

نیز مسند ابوحنیفہؒ میں حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ '' **أنه سئل كيف كان النساء**

۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱ وعندنا: السنة أن يفترش رجله اليسرى ويجلس عليها وينصب اليمنى نصبا في القعدتين جميعا وبه قال الثوري، واستدلوا بحديث عائشة في "صحيح مسلم" قالت: كان النبي ﷺ يفتتح الصلاة ..... إلى أن قالت: وكان يفرش ..... اليمنى ..... الحديث وأما جلوس المرأة فهو التورك عندنا. صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب مايجمع صفة الصلاة وما يفتتح به ويختتم به وصفة الركوع الخ، رقم: ۴۹۸، ج: ۱، ص: ۳۵۷، وعمدة القارى، ج: ۴، ص: ۵۷۲، و اعلاء السنن، ج: ۳، ص: ۴۷، ومسند الطيالسى، ج: ۱، ص: ۲۱۷، رقم: ۱۵۴۷.

يصلين على عهد رسول الله ﷺ قال كن يتربعن ثم أمرن أن يحتفرن"[202]

حنفیہ جو عورت کے لئے تورک کا کہتے ہیں اس کا ثبوت موجود ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ عورتیں رفع یدین بھی اوپر تک نہ کریں، سینے تک کریں "**حذو منكبها يا حذو صدرها**" اور سجدہ بھی سمٹ کر کرے اور بیٹھے بھی تورک کے ساتھ۔ ان تینوں اعمال کے بارے میں مصنف ابن ابی شیبہ میں متعدد صحابہؓ وتابعینؒ سے روایات موجود ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ حنفی حضرات عورتوں کے لیے جو الگ نماز کا طریقہ بتاتے ہیں اس کا کوئی ثبوت نہیں، یہ بات غلط ہے۔

اُم الدرداء کون؟

جہاں تک حضرت ام الدرداء رضی اللہ عنہا کا تعلق ہے بے شک ان کا مذہب تھا کہ وہ مردوں کی طرح بیٹھنے کو درست سمجھتی تھیں لیکن یہ ان احادیث اور آثار کے خلاف حجت نہیں ہے، جو ہم نے پیش کئے ہیں، اس لئے کہ اُم الدرداءؓ یہ حضرت ابوالدرداءؓ کی بیوی تھیں۔

حضرت ابوالدرداءؓ کی دو بیویاں تھیں ایک کبریٰ ایک صغریٰ، کبریٰ صحابیہ تھیں اور صغریٰ صحابیہ نہیں تھیں، تابعیہ تھیں اور حافظ ابن حجر اور علامہ عینی رحمہما اللہ نے تحقیق کر کے بتلایا ہے کہ راجح یہ ہے کہ یہ صغریٰ ہیں اور صغریٰ صحابیہ نہیں تابعیہ ہیں، اس لئے یہ زیادہ سے زیادہ ایک تابعیہ کا عمل ہوا۔

اس کے مقابلے میں حنفیہ نے جن دلائل سے تمسک کیا ہے وہ آثار صحابہؓ ہیں۔ لہٰذا آثار صحابہ کو تابعین کے آثار مقطوعہ پر ترجیح ہوگی۔[203]

(۱۴۶) باب من لم ير التشهد الأول واجبا،

ان کا بیان جنہوں نے پہلے تشہد کو واجب نہیں سمجھا

"لأن النبي ﷺ قام من الركعتين و لم يرجع".

۸۲۹ ـــ حدثنا أبو اليمان قال: أخبرنا شعيب، عن الزهري، قال: حدثني عبدالرحمٰن بن هرمز مولى بني عبدالمطلب. و قال مرة: مولى ربيعة بن الحارث أن عبدالله بن بحينة وهو من أزد شنوءة وهو حليف لبني عبد مناف، وكان من أصحاب

---

۲۰۲ لامع الدراري، ج: ۱، ص: ۳۳۱، ومصنف ابن أبي شيبة، ج: ۱، ص: ۲۴۲، رقم: ۲۷۸۳.

۲۰۳ عمدة القاري، ج: ۴، ص: ۵۷۰.

ہر سلام پر اس کی اقتداء کی جائے اور ہمارے ہاں یہی طریقہ ہے اس واسطے کہ جو ارکان نماز میں دو دو ہیں ان میں امام ایک کام کرتا ہے تو مقتدی اس کو کرتا ہے اور پھر دوسرا کرتا ہے تو مقتدی اس کو کرتا ہے۔ سجدے دو ہیں تو یہ نہیں ہوتا کہ امام دو سجدے کرے پھر مقتدی کرے بلکہ ہر ایک کی اقتداء ساتھ ساتھ ہوتی ہے، تو سلام بھی اس سے مستثنیٰ نہ ہونا چاہئے۔

(۱۵۴) باب لم من یرد السلام علی الإمام، واکتفی بتسلیم الصلاة

بعض لوگ نماز میں امام کو سلام کرنے کے قائل نہیں اور نماز کے سلام کو کافی سمجھتے ہیں

۸۳۹ـ حدثنا عبدان قال: أخبرنا عبدالله قال: أخبرنا معمر الزهری قال: أخبرنی محمود بن الربیع، وزعم أنه عقل رسول الله ﷺ وعقل مجةً مجها من دلو کان فی دارهم. [راجع : ۷۷]

مقصود امام بخاری رحمہ اللہ

اس شخص کے مسلک یا مذہب کی دلیل بیان کرنی منظور ہے جو امام کے سلام کا جواب نہیں دیتے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک سلام کے بارے میں یہ ہے کہ امام تشہد پڑھ رہا ہے تو اس کے سلام کا طریقہ یہ ہے "**السلام علیکم و رحمة الله**" بس ایک سلام ہے یعنی تشہد پڑھ رہا ہے اور جب سلام پر پہنچا تو سامنے ہی کی طرف رخ کرکے کہا "**السلام علیکم و رحمة الله**" یہ طریقہ امام کے لئے ہے اور مقتدی تین مرتبہ کہے گا "**السلام علیکم و رحمة الله، السلام علیکم و رحمة الله، السلام علیکم و رحمة الله**" یعنی مقتدی تین سلام کہے گا۔ دائیں بائیں جو سلام ہے وہ دائیں بائیں مقتدیوں کو سلام کرے اور سامنے والا جو سلام ہے وہ امام کو ہے۔ "**السلام علیکم و رحمة الله**" جو امام نے کہا تھا اس میں مقتدی بھی شامل تھے۔ اس لئے بیچ کا سلام امام کے سلام کا جواب ہے، البتہ بائیں طرف سلام اس وقت ہوگا جب بائیں طرف کچھ مقتدی موجود ہوں، اگر بائیں طرف مقتدی نہ ہوں تو امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک دو ہی سلام ہونگے۔ ایک دائیں طرف اور دوسرے سامنے امام کے سلام کا جواب۔

امام بخاری رحمہ اللہ اس ترجمۃ الباب سے مالکیہ کے اس قول کی تردید کرنا چاہتے ہیں، یعنی تیسرا سلام جو بیچ میں امام کے جواب میں کہا جائے گا اس کی ضرورت نہیں، بلکہ نماز کے دو سلام کافی ہیں۔

اور بعض حضرات نے اس ترجمۃ الباب کا یہ مقصد بتایا ہے کہ مقتدی "السلام علیکم" ہی کہے گا، امام جواب میں "وعلیکم السلام" نہیں کہے گا۔

"**قال ابن شهاب**" امام زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں "**فأری واللہ أعلم**" میرا گمان یہ ہے واللہ اعلم "**ان مکثه لکی ینفذ النساء**" کہ آپ جو تھوڑی دیر ٹھہرتے تھے یہ اس لئے کہ عورتیں اٹھ کر چلی جائیں۔
"**قبل أن یدرکهن من أنصرف من القوم**" قبل اس کے کہ مردوں میں سے وہ لوگ ان کو پائیں جو اٹھ کر جانے والے ہیں، یعنی آپ جو تھوڑی دیر اپنی جگہ پر بیٹھے رہتے تھے اس کا ایک منشأ یہ ہوتا تھا کہ عورتیں چلی جائیں پھر آپ اٹھیں گے، پھر صحابۂ کرام ﷺ اٹھیں گے۔ ورنہ اگر صحابہ بھی اسی وقت اٹھ جاتے تو عورتوں اور مردوں میں اختلاط ہوتا اور یہ پسندیدہ نہیں، اس واسطے آپ ایسا کرتے تھے۔

(۱۵۳) باب: یسلم حین یسلم الإمام

جب امام سلام پھیرے تو مقتدی سلام پھیرے

"**وكان ابن عمر رضى الله عنهما يستحب إذا سلم الإمام أن يسلم من خلفه**".

۸۳۸ ـــ حدثنا حبان بن موسى قال: أخبرنا عبد الله قال: أخبرنا معمر عن الزهرى، عن محمود بن الربيع، عن عتبان بن مالك قال: ((صلينا مع النبى ﷺ فسلمنا حين سلم)). [راجع : ۴۲۴]

ترجمة الباب کا منشأ

اس باب کا منشأ یہ ہے کہ مقتدی کو بھی امام کے ساتھ ساتھ سلام پھیرنا چاہئے، زیادہ دیر نہ کرے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ ساتھ ساتھ سلام پھیرنا نہیں چاہئے، بلکہ جب امام فارغ ہوجائے پھر مقتدی کہے "**السلام عليكم ورحمة الله**" زیادہ تر لوگوں کا کہنا یہی ہے کہ امام جب "**السلام عليكم ورحمة الله**" کہہ چکے تو مقتدی کہے "**السلام عليكم ورحمة الله**" اور یہاں یہ کہہ رہے ہیں کہ ساتھ ساتھ کہے اور استدلال کررہے ہیں کہ "**إذا سلم الإمام أن يسلم من خلفه**"۔ "**اذا**" تقاضا کرتا ہے کہ امام کا سلام پہلے ہو اور مقتدی کا سلام بعد میں، لیکن امام بخاری رحمہ اللہ یہاں اس کو ظرفیت کے معنی میں لے رہے ہیں جسکے معنی یہ ہیں کہ جس وقت امام سلام کہے اس وقت مقتدی بھی کہے۔ بس شرط یہ ہے کہ امام سے پہلے نہ ہو، ساتھ ساتھ ہوجائے یا بعد میں ہوجائے کوئی مضائقہ نہیں، لیکن زیادہ وقفہ نہیں کرنا چاہئے، اگر التحیات مکمل نہیں ہوئی تو مکمل کرے لیکن زیادہ وقفہ نہ کرے۔ اہل عرب میں یہی ہوتا ہے کہ جب امام دونوں سلام پھیر چکے تب مقتدی سلام پھیرتے ہیں۔
یہاں اس بات کی تصریح نہیں ہے کہ دونوں سلاموں کے بعد سلام پھیرے لیکن قیاس کا مقتضی یہ ہے کہ

۸۳۶ ـ حدثنا مسلم بن إبراهيم قال: حدثنا هشام، عن يحيىٰ عن أبي سلمة قال: سألت أبا سعيد الخدري فقال: رأيت رسول الله ﷺ يسجد في الماء والطين حتى رأيت أثر الطين في جبهته.[راجع: ۶۶۹]

کہتے ہیں کہ نماز کے اندر اگر پیشانی پر یا ناک پر مٹی لگ گئی تو اس کو زائل کرنے کی فکر نماز کے اندر کرنا یہ پسندیدہ نہیں۔ نماز تذلل کا وقت ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ مٹی لگ رہی ہے تو لگے یہ تو مصلی کا زیور ہے۔ تو اس کو زائل کرنے کی فکر نہیں کرنی چاہئے۔ آدمی کو یہ چاہئے کہ تذلل سے نماز پڑھے۔ حضرت افلح ﷺ سے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا جب وہ سجدے میں جاتے تو جانے کے وقت پھونک مارتے کہ وہاں جو مٹی لگی ہوئی ہے وہ ہٹ جائے کہ اس جگہ سجدہ کریں تو آنحضرت ﷺ نے منع کیا کہ "أفلح و جهک" اے افلح! اپنے چہرے کو مٹی لگاؤ، لہٰذا اس فکر میں پڑنا کہ میری پیشانی پر مٹی لگ گئی، ناک پر مٹی لگ گئی اسے ہٹالوں، یہ ٹھیک نہیں۔ سوال کرنے کا منشأ یہ ہے اور حدیث لائے ہیں۔

حدثنا مسلم بن إبراهيم قال: حدثنا هشام، عن يحيىٰ عن أبي سلمة: قال سألت أبا سعيد الخدري ﷺ فقال: رأيت رسول الله ﷺ يسجد في الماء والطين.

کہ حضور اقدس ﷺ نے نماز پڑھی "في الماء والطين" اکیسویں شب میں آپ نے نماز پڑھی اور آپ نے سجدہ فرمایا "في الماء والطين".

(۱۵۲) باب التسليم

سلام پھیرنے کا بیان

۸۳۷ ـ حدثنا موسى بن إسماعيل قال: حدثنا إبراهيم بن سعد قال: حدثنا الزهري، عن هند بنت الحارث أن أم سلمة رضي الله عنها قالت: كان رسول الله ﷺ إذا سلم قام النساء حين يقضي تسليمه و مكث يسيراً قبل أن يقوم. قال ابن شهاب: فأرى والله أعلم أن مكثه لكي ينفذ النساء قبل أن يدركهن من انصرف من القوم.[۸۴۹، ۸۵۰]

یہ ہند بنت حارث کہتی ہیں کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ "كان رسول الله ﷺ إذا سلم قام النساء حين يقضي تسليمه" جب آپ ﷺ سلام پھیرتے تو فوراً جو عورتیں پیچھے ہوتی تھیں وہ اٹھ کر چلی جاتی تھیں۔ جب آپ ﷺ اپنا سلام پورا کر چکے ہوتے تھے "ومكث يسيرا" اور آپ ﷺ تھوڑی دیر ٹھہرتے تھے "قبل أن يقوم" کھڑے ہونے سے پہلے۔

عبداللہ قال: کنا إذا کنا مع النبی ﷺ فی الصلاۃ قلنا: السلام علی اللہ من عبادہ، السلام علی فلان و فلان. فقال النبی ﷺ: ((لا تقولوا: السلام علی اللہ، فإن اللہ ھو السلام. ولکن قولوا: التحیات للہ، والصلوات والطیبات، السلام علیک أیھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ، السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین. فإنکم إذا قلتم ذالک أصاب کل عبد فی السماء أو بین السماء والأرض. أشھد أن لا إلہ إلا اللہ، وأشھد أن محمد عبدہ و رسولہ. ثم لیتخیر من الدعاء أعجبہ إلیہ فیدعوا)). [راجع: ۸۳۱]

کہتے ہیں پھر پسند کرے یعنی جو دعا اس کو زیادہ پسند ہو وہ کرے۔

حنفیہ کے نزدیک یہ ہے کہ یا تو ادعیۂ ماثورہ میں سے کوئی دعا ہو یا کوئی ایسی دعا ہو جو الفاظ قرآن کے مشابہ ہو، باقی کوئی ایسی دعا نہ ہو جو نہ دعاء ماثور ہو اور نہ الفاظ قرآن کے مشابہ ہو، مثلاً "**اللّٰھم زوجنی فلانۃ**" وغیرہ تو یہ جائز نہیں۔

لہٰذا یہ جو عوام میں مشہور ہے کہ ایک ہی دعا مقرر کر لی اور سمجھتے ہیں کہ اس کے علاوہ ہو نہیں سکتی، یہ غلط بات ہے، کوئی بھی دعا پڑھ سکتے ہیں اور ضروری نہیں کہ ایک ہی پڑھی جائے، بہت ساری دعائیں پڑھ سکتے ہیں جیسی چاہو مانگ لو، فرائض میں بھی یہ دعائے ماثورہ پڑھ سکتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ التحیات لمبا ہو جائے گا، تو جواب یہ ہے کہ ہونے دو، التحیات تو اتنی ہی ہے جتنی ہے قعود لمبا ہوگا تو اس کو ہو جانے دو، البتہ فرائض کے لئے جو امام ہے اس کو نہیں چاہئے کہ لمبا کرے بلکہ اس کو جتنا ہو سکے مختصر پڑھنا چاہئے۔ بس دو تین دعائیں پڑھ لے، اس سے زیادہ نہ کرے، لیکن سنتیں یا نفلیں اگر پڑھ رہا ہے تو جتنی چاہے دعائیں پڑھے، کیونکہ اس وقت میں دعا مانگنا یہ بلا اختلاف مسنون ہے بخلاف بعد الصلوٰۃ کے کہ اس میں اختلاف ہے لیکن یہاں بلا اختلاف ہے اس لئے جتنی چاہے دعا مانگو۔ دعا پڑھا مت کرو بلکہ مانگا کرو۔ دعا پڑھنے کی چیز نہیں ہوتی بلکہ مانگنے کی چیز ہوتی ہے کہ اس کو دھیان سے اللہ ﷻ سے مانگو اور دعا کا ذوق پیدا کرو۔ اللہ ﷻ ذوق عطا فرمائے۔ دعا بڑی عجیب چیز ہے۔

(۱۵۱) باب من لم یمسح جبھتہ وأنفہ حتی صلی.

اپنی پیشانی اور ناک نماز ختم کرنے تک نہیں پونچھے

"قال أبو عبد اللہ: رأیت الحمیدی یحتج بھذا الحدیث أن لا یمسح الجبھۃ فی الصلاۃ".

کے اوپر گویا کہ کسی نے پلستر کر دیا۔ تو اس وجہ سے اس کو مسیح کہا جاتا ہے۔ تو معنی کے لحاظ سے فرق ہے لفظ کے لحاظ سے فرق نہیں "**ليس بينهما فرق و هما وأحد أحدهما عيسىٰ** علیہ السلام **والآخر دجال**" سے یہ کہنا چاہتے ہیں۔

پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث نقل کی ہے کہ "**سمعت رسول الله** ﷺ **يستعيذ في صلوته من فتنة الدجال**" آنحضرت ﷺ دجال سے بچنے کی پناہ مانگتے تھے۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں مدتوں پریشان رہا کہ حضور ﷺ دجال سے کیوں پناہ مانگتے تھے، اس لئے کہ آپ کو تو یہ بات پتہ تھی کہ دجال آخری زمانے میں آئے گا اور عیسیٰ علیہ السلام اس کو قتل کریں گے۔ تو آپ کی حیات میں تو اس کے نکلنے کا کوئی امکان تھا ہی نہیں، تو پھر آپ اس سے کیوں پناہ مانگتے تھے۔

پھر بعد میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ایک عجیب بات فرمائی ہے جو پوری طرح سمجھ میں نہیں آئی اور ہم جیسوں کو سمجھ میں آنا ضروری بھی نہیں۔ انہوں نے یہ فرمایا کہ بعد میں مجھے یہ بات پتا لگی کہ دجال جو فتنہ ہے وہ صرف احیا پر ہی اثر انداز نہیں ہوگا بلکہ اموات پر بھی اثر انداز ہوگا، جو لوگ مر چکے ہوں گے اور قبروں میں ہوں گے ان پر بھی اس خبیث کا فتنہ اثر انداز ہوگا کس طرح ہوگا واللہ اعلم۔

تو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے یہ بہت بڑی بات لکھ دی ہے کہ مرنے والے پر بھی اثر انداز ہوگا۔
اور وہ کہتے ہیں اسی وجہ سے حضور اکرم ﷺ نے اس کے ساتھ ملا کر ذکر کیا "**اللّٰهم إني أعوذبك من عذاب القبر و أعوذبك من فتنة المسيح الدجال و أعوذبك من فتنة المحيا و الممات**" تو اس واسطے آپ نے اس سے پناہ مانگی ہے، واللہ اعلم۔ "**مغرم**" کے معنی مقروض ہونا۔

۸۳۴ ـ حدثنا قتيبة بن سعيد قال: حدثنا الليث عن يزيد بن أبي حبيب، عن أبي الخير، عن عبدالله ابن عمرو، عن أبي بكر الصديق رضی اللہ عنہ **أنه قال لرسول الله** ﷺ**: علمني دعاء أدعو به في صلاتي: قال: ((قل: اللّٰهم إني ظلمت نفسي ظلما كثيرا ولا يغفر الذنوب إلا أنت، فاغفرلي مغفرة من عندك، و ارحمني إنك أنت الغفور الرحيم)). [أنظر: ۶۳۲۶، ۷۳۸۸]**

یہ تشہد کے بعد پڑھنے کی ادعیہ ماثورہ میں سے ہے۔

(۱۵۰) باب ما يتخير من الدعاء بعد التشهد، وليس بواجب

جو دعا بھی پسند ہو، تشہد کے بعد پڑھ سکتا ہے اور دعا کا پڑھنا کوئی ضروری چیز نہیں ہے

۸۳۵ ـ حدثنا مسدد قال: حدثنا يحيىٰ عن الأعمش قال: حدثني شقيق، عن

فقال له قائل: ما أكثر ما تستعيذ من المغرم؟ . فقال: ((إن الرجل إذا غرم حدث فكذب، ووعد فأخلف)).وقال محمد بن يوسف سمعت خلف بن عامر يقول في المسيح والمسيح ليس بينهما فرق و هما واحد أوهما عيسى علیہ السلام والآخر الدجال[أنظر: ۸۳۳، ۲۳۹۷، ۶۳۶۸، ۶۳۷۵، ۶۳۷۶، ۶۳۷۷، ۷۱۲۹][۲۰۷]

۸۳۳ ـ وعن الزهرى قال: أخبرنى عروة بن الزبير أن عائشة رضى الله عنها قالت: سمعت رسول الله ﷺ يستعيذ فى صلاته من فتنة الدجال. [راجع: ۸۳۲]

یہ دعا حضور اکرم ﷺ نے تلقین فرمائی ہے اور نماز کے اندر تشہد کے بعد پڑھا کرتے تھے اور آگے جو ہے **"وقال محمد بن یوسف"** یہ بخاری کے راوی ہیں جو فربری کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ کہہ رہے ہیں کہ **"سمعت خلف بن عامر يقول"** اپنے استاد خلف بن عامر کو میں نے مسیح کے بارے میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ **"المسيح والمسيح ليس بينهما فرق و هما واحد"** کہنا یہ چاہتے ہیں کہ مسیح لقب ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی اور مسیح لقب ہے دجال کا بھی **"المسيح الدجال"**.

بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ مسیح نہیں ہے بلکہ **"مِسِّیح"** ہے بروزن **"سِکّین"** ہے۔ تو انہوں نے یہ کہا ہے دونوں میں فرق کرنے کے لئے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لیں تو مسیح کہیں۔ تو محمد بن یوسف فربری اپنے استاد سے نقل کرتے ہوئے اس کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ **"المسيح والمسيح ليس بينهما فرق وهما واحد"** یعنی حقیقت میں وہ بھی مسیح کہلاتے ہیں، ان کا لقب بھی مسیح ہے اور اس خبیث کا لقب بھی مسیح ہے لیکن دونوں میں معنوی لحاظ سے فرق ہے، لفظ میں فرق نہیں ہے، معنی کے لحاظ سے فرق یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح کہا جاتا ہے کہ اللہ جل جلالہ نے ان کے **"مَس"** میں شفا عطا فرمائی کہ وہ جب کسی کے اوپر ہاتھ پھیرتے تھے تو اللہ جل جلالہ اس کو شفا دے دیتے تھے اس وجہ سے مسیح کہا جاتا ہے۔

اور مسیح دجال کو مسیح یا تو اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اس کے مسح کا معاملہ الٹا ہے یعنی جہاں وہ ہاتھ پھیر دے گا وہ جگہ ویران ہو جائے گی، یا اس وجہ سے کہ وہ **"ممسوح العين اليمنى"** ہے کہ اس کی دائیں آنکھ

---

[۲۰۷] وفى صحيح مسلم ، كتاب المساجد ومواضع الصلاة ، باب ما يستعاذ منه فى الصلاة ،رقم: ۹۲۵ ، وكتاب الذكر والدعا والتوبة والاستغفار ، باب التعوذ من شر الفتن وغيرها ، رقم: ۴۸۷۷، وسنن النسائى ، كتاب السهو ، باب نوع آخر، رقم: ۱۲۹۲ ، وكتاب الاستعاذة، باب الاستعاذة من المغرم والمأثم ، رقم: ۵۳۵۹، وسنن أبى داؤد ، كتاب الصلاة باب الدعاء فى الصلاة ، رقم: ۷۴۶، وسنن ابن ماجه ، كتاب الدعاء ، باب ماتعوذ عنه رسول الله ، رقم: ۳۸۲۸، ومسند أحمد ، باقى مسند الأنصار، باب حديث السيدة عائشة ، رقم: ۲۳۱۶۶، ۲۴۴۶۸، ۲۴۸۸۱، ۲۵۱۲۲.

کرتے تھے **"السلام علی اللہ من عبادہ"** اللہ پر سلام ہو۔تو آپ نے فرمایا کہ بھئی! اللہ ﷻ کو کیا سلام بھیجتے ہو، اللہ تو خود سلام ہیں۔تو ان کو سلامتی کی دعا دینا اور سلامتی بھیجنا یہ بندے کی طرف سے کوئی معنی نہیں، **"إن اللہ ھو السلام"** بعد از سلام اس طرح مت کہا کرو۔

"فإذا صلی أحدکم فلیقل التحیات للہ والصلوٰت والطیبات، السلام علیک أیھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین فإنکم اذ قلتموھا اصابت کل عبداللہ صالح فی السماء والأرض"

یہ دعا آسمان وزمین کے ہر عبد صالح کو پہنچ جائے گی۔ **"اشھد أن لا إلہ إلا اللہ و اشھد أن محمداً عبدہ و رسولہ"۔**

تشہد کی یہ تفصیل فرمائی۔

ترجمۃ الباب پر سوال

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس روایت میں کہیں یہ مذکور نہیں کہ یہ تشہد آپ نے آخری رکعت میں بتایا مگر امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب بنایا **"باب التشھد فی الآخر"**۔

لیکن حدیث میں کہیں رکعت اخیرہ کا ذکر نہیں ہے۔

جواب: یہی حدیث دوبارہ آگے آرہی ہے **"باب ما یتخیر من الدعا"** وہاں آخر میں یہ ہے:

"ثم یتخیّر من الدعاء اعجبہ إلیہ فیدعو"

کہ اس کے بعد دعا کرو اور دعا آخری رکعت میں ہوتی ہے، لہٰذا اس سے مراد آخری رکعت ہی ہے۔

(۱۴۹) باب الدعاء قبل السلام

سلام پھیرنے سے پہلے دعا کرنے کا بیان

۸۳۲ ـ حدثنا أبو الیمان قال: أخبرنا شعیب عن الزھری قال: أخبرنا عروۃ بن الزبیر عن عائشۃ أخبرتہ أن رسول اللہ ﷺ کان یدعو فی الصلاۃ :

((اللّٰھم إنی أعوذ بک من عذاب القبر، و أعوذ بک من فتنۃ المسیح الدجال، و أعوذ بک من فتنۃ المحیا و فتنۃ الممات. اللّٰھم إنی أعوذ بک من المأثم والمغرم)).

عبدالله: كنا إذا صلينا خلف رسول الله ﷺ قلنا: السلام على جبريل و ميكائيل، السلام على فلان و فلان. فالتفت إلينا رسول الله ﷺ فقال: ((إن الله هو السلام. فإذا صلى أحدكم فليقل: التحيات لله، والصلوات والطيبات، السلام عليك أيها النبي و رحمة الله و بركاته، السلام علينا، و على عباد الله الصالحين. فإنكم إذا قلتموها أصابت كل عبد لله صالح في السماء والأرض. أشهد أن لا إله إلا الله. وأشهد أن محمدا عبده و رسوله)). [أنظر: ۸۳۵، ۱۲۰۲، ۶۲۳۰، ۶۲۶۵، ۶۳۲۸، ۷۳۸۱][۲۰۵]

آخری تشہد کا حکم

اس باب کا مقصد آخری تشہد کا حکم بتانا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک قعدۂ اخیرہ تو رکن ہے، مگر اس میں تشہد پڑھنا واجب ہے۔

امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک تشہد بھی رکن صلاۃ ہے۔

اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک دونوں تشہد سنت ہیں لیکن ان کے نزدیک سنن مؤکدہ کے ترک سے بھی سجدۂ سہو واجب ہو جاتا ہے۔[۲۰۶]

چونکہ فقہاء کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف تھا، اس لئے امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب میں کسی متعین حکم پر جزم نہیں کیا، بلکہ **"باب التشهد فی الآخرة"** کہنے پر اکتفا فرمایا۔

یہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم جب نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، تو یہ کہتے تھے کہ **"السلام علی جبرئیل و میکائیل، السلام علی فلان و فلان"** فرشتوں کا نام لے کر ان پر سلام بھیجا کرتے تھے تو رسول اللہ ﷺ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا **"إن الله هو السلام"** آگے آرہا ہے **"باب ما یتخیر من الدعاو التشهد"** اس میں یہی حدیث دوبارہ آرہی ہے۔ اس میں ہے کہ ہم یوں کہا

---

۲۰۵ وفي صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب التشهد في الصلاة، رقم: ۶۰۹، وسنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ماجاء في التشهد، رقم: ۲۶۶، وكتاب النكاح عن رسول الله، باب ماجاء في خطبة النكاح، رقم: ۱۰۲۳، وسنن النسائي، كتاب التطبيق، باكيف التشهد الاول، ۱۱۵۰، وكتاب السهو، باب تخيير الدعاء بعد الصلاة على النبي، رقم: ۱۲۸۱، وسنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب التشهد، رقم: ۸۲۵، وسنن ابن ماجه، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب ماجاء في التشهد، رقم: ۸۸۹، ومسند أحمد، مسند المكثرين من الصحابة، باب مسند عبد الله بن مسعود رقم: ۳۳۸۱، ۳۶۸۳، ۳۹۶۳، ۴۰۷۸، ۴۱۹۰، وسنن الدارمي، كتاب الصلاة، باب في التشهد، رقم: ۱۳۰۶.

۲۰۶ لامع الدراري، ج: ۱، ص: ۳۳۲.

نہیں ہوتی، البتہ سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے اور اگر جان بوجھ کر چھوڑ دیا اور سجدۂ سہو بھی چھوڑ دیا تو اعادہ واجب ہے۔ تو جس طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے وہ استدلال حنفیہ کے خلاف نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ یہ جو مثال رکوع اور سجدے کی دی ہے تو رکوع اور سجدہ رکن ہے، فرض ہے اس کے چھوڑنے سے اعادہ واجب ہے یعنی اس رکن کا اعادہ نماز میں ضروری ہے اور محض سجدۂ سہو کافی نہیں، ہم ایسا رکن تشہد کو نہیں مانتے بلکہ کہتے ہیں کہ واجب ہے، لہٰذا اگر کوئی غلطی سے چھوڑ دے تو آخر میں سجدۂ سہو کر لے تو تلافی ہو جائے گی۔ عدم وجوب پر دلیل اس وقت بنتی جب یہ ثابت ہوتا کہ نبی کریم ﷺ نے چھوڑا اور سجدہ سہو نہیں کیا۔ جب سجدہ سہو ثابت ہے تو پھر دلیل نہیں بنتی۔

اب حدیث یہ روایت کرتے ہیں کہ:

"حدثنا أبو اليمان....... أن عبد الله ابن بحينة وهو من أزد شنوة وهو حليف لبني عبد مناف الخ".

عبداللہ ابن بحینہ یہ پہلے گزر چکا ہے کہ بحینہ ان کی والدہ کا نام ہے اور والدہ کی طرف منسوب ہے اسی واسطے ابن کا ہمزہ لکھا ہوا ہے (اگر باپ کی طرف منسوب ہوتو ابن کا ہمزہ نہیں لکھا جاتا) اور اسی واسطے ان کو کہا جاتا ہے عبداللہ بن مالک ابن بحینہ تو یہ قبیلۂ ازد شنوءہ سے تعلق رکھتے ہیں **"وهو حليف لبني عبد مناف"**.

(۱۴۷) باب التشهد فی الأولیٰ

پہلے قعدہ میں تشہد پڑھنے کا بیان

۸۳۰ ــ حدثنا قتيبة بن سعيد قال: حدثنا بكر، عن جعفر بن ربيعة، عن الأعرج، عن عبدالله بن مالک ابن بحينة قال: صلى بنا رسول الله ﷺ الظهر، فقام و عليه جلوس، فلما كان في آخر صلاته سجد سجدتين وهو جالس. [راجع: ۸۲۹]

پہلے باب میں مقصود تشہد اول کی رکنیت کی نفی تھی، اس باب میں مقصد یہ حکم ثابت کرنا ہے کہ تشہد اس درجے میں مشروع ہے کہ اس کے ترک سے سجدۂ سہو لازم آتا ہے۔

(۱۴۸) باب التشهد فی الآخرة

آخری قعدہ میں تشہد پڑھنے کا بیان

۸۳۱ ــ حدثنا أبو نعيم قال: حدثنا الأعمش عن شقيق بن سلمة قال: قال

النبی ﷺ : أن النبی ﷺ صلی بهم الظهر، فقام فی الرکعتین الأولیین لم یجلس، فقام الناس معه، حتی إذا قضی الصلاۃ، وانتظر الناس تسلیمه کبر وهو جالس، فسجد سجدتین قبل أن یسلم ثم سلم. [أنظر: ۸۳۰، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۳۰، ٦٦۷۰][٢٠٤]

مقصود بخاری رحمہ اللہ

اس باب میں ان لوگوں کی دلیل بیان کرنا مقصود ہے جو قعدۂ اولیٰ میں بیٹھ کر تشہد پڑھنے کو واجب نہیں سمجھتے، ان لوگوں کی دلیل کا خلاصہ وہ حدیث ہے جو آگے آرہی ہے اس میں نبی کریم ﷺ قعدۂ اولیٰ کو بھول گئے تھے اور تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوگئے، تو آپ ﷺ نے اسی طرح نماز پوری کی اور آخر میں سجدہ سہو کرلیا۔

استدلال بخاری رحمہ اللہ

امام بخاری رحمہ اللہ استدلال اس طرح کر رہے ہیں کہ اگر تشہد واجب ہوتا تو آپ سجدۂ سہو پر اکتفا نہ کرتے بلکہ واپس لوٹ کر آتے اور قعدے کو ادا کرتے، جیسے اگر کوئی شخص رکوع چھوڑ دے یا سجدہ چھوڑ دے تو محض سجدۂ سہو کرنے سے اس کی تلافی نہیں ہوتی، جب تک کہ اس کا اعادہ نہ کرے۔ اسی طرح قعدۂ اولیٰ اگر واجب ہوتا تو آپ ﷺ اس کا اعادہ فرماتے اور محض سجدہ سہو پر اکتفا نہ فرماتے۔ حدیث میں **"لأن النبی ﷺ قام من الرکعتین ولم یرجع"** کا یہی مطلب ہے۔

حنفیہ کا مسلک

حنفیہ کے ہاں قعدۂ اولیٰ بھی واجب ہے اور تشہد پڑھنا بھی واجب ہے، لیکن واجب حنفیہ کی اپنی اصطلاح کے مطابق ہے، فرض نہیں ہے۔ حنفیہ کے ہاں دونوں اصطلاحات الگ الگ ہیں اور دونوں کا حکم جدا جدا ہے۔ قعدۂ اولیٰ ہو یا تشہد ہو فرض نہیں بلکہ واجب ہے اور واجب کا حکم یہ ہے کہ اس کے ترک سے نماز باطل

---

[٢٠٤] وفی صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، باب النهی عن البصاق فی المسجد فی الصلاۃ وغیرها، رقم: ۸۸۵، وسنن الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی سجدتی السهو قبل التسلیم، رقم: ۳۵٦، وسنن النسائی، کتاب التطبیق، باب ترک التشهد الأول، رقم: ۱۱٦۴، وکتاب السهو، باب مایفعل من قام من اثنتین ناسیا ولم یتشهد، رقم: ۱۲۰۷، وسنن أبی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب من قام من ثنتین ولم یتشهد، رقم: ۸۷۱، وسنن ابن ماجة، کتاب إقامة الصلاۃ والسنة فیها، باب ماجاء فیمن قام من اثنتین ساهیا، رقم: ۱۱۹۷، ومسند احمد، باقی مسند الأنصار، باب حدیث عبد اللہ بن مالک بن بحینة، رقم: ۲۱۸۵۱، وموطا مالک، کتاب النداء للصلاۃ، باب من قام بعد الإتمام أو فی الرکعتین، رقم: ۲۰۲، وسنن الدارمی، کتاب الصلاۃ، باب إذا کان فی الصلاۃ نقصان، رقم: ۱۴٦۱.

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے یہ مطلب بتایا ہے کہ مقتدی کا سلام کرتے وقت امام کی نیت کرنا ضروری نہیں۔

اور اس میں روایت نقل کی محمود بن ربیع کی یہ حضرت عبادہ بن صامت ﷺ کے شاگرد ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو حالت سمجھ میں دیکھا ہے **"زعم انه عقل"** کے معنی ہیں سمجھ کی حالت میں دیکھا ہے **"وعقل مجة مجها من دلو"** اور ان کو نبی کریم ﷺ کا ایک ڈول سے جو ان کے گھر میں تھا ایک کلی کرنا یاد ہے۔

حضور اکرم ﷺ ان کے گھر تشریف لائے تھے اور ان کے ڈول سے پانی لے کر خود ان کے اوپر کلی کی تھی۔ **"کتاب العلم"** میں یہ بات گذری ہے۔ تو وہ کہنا یہ چاہ رہے ہیں کہ ان کو حضور اکرم ﷺ کا زمانہ یاد ہے۔ اب آگے حدیث:

۸۴۰ ۔ قال : سمعت عتبان بن مالک الأنصاری، ثم أحد بنی سالم قال: ((کنت أصلی لقومی بنی سالم، فأتیت النبی ﷺ فقلت: إنی أنکرت بصری وإن السیول تحول بینی وبین مسجد قومی ، فلوددت أنک جئت فصلیت فی بیتی مکانا أتخذہ مسجدا فقال :((أفعل إن شاء اللہ)) فغدا علی رسول اللہ ﷺ وأبو بکر معه بعد ما اشتد النهار . فاستأذن النبی ﷺ فأذنت له فلم یجلس حتی قال:((أین تحب أن أصلی من بیتک؟)) فأشار إلیه من المکان الذی أحب أن یصلی فیه. فقام فصففنا خلفه ثم سلم وسلمنا حین سلم. [راجع : ۴۲۴]

یہ حدیث عتبان بن مالک ﷺ کی نقل کی ہے جس میں انہوں نے حضور اقدس ﷺ سے کہا تھا کہ میں مسجد نہیں آسکتا، لہٰذا آپ ﷺ میرے گھر میں آکر نماز پڑھا دیں، تو اس میں آخر میں یہ ہے کہ **"ثم سلم وسلمنا حین سلم"** آپ ﷺ نے سلام کیا تو پھر ہم نے بھی سلام کیا تو اس میں امام کے سلام کا جواب دینے کا تو کوئی ذکر نہیں۔ اس لئے امام مالک رحمہ اللہ کے مسلک کی تردید ہوگئی۔

(۱۵۵) باب الذکر بعد الصلوٰۃ

نماز کے بعد ذکر کا بیان

۸۴۱ ۔ حدثنا إسحاق بن نصر قال: حدثنا عبدالرزاق قال: أخبرنا ابن جریج قال: أخبرنی عمرو أن أبا معبد مولی ابن عباس أخبرہ أن ابن عباس رضی اللہ عنهما أخبرہ: أن رفع الصوت بالذکر حین ینصرف الناس من المکتوبة کان علی عهد رسول

الله ﷺ. وقال ابن عباس: كنت أعلم إذا انصرفوا بذلك إذا سمعته. [أنظر: ۸۴۲][۲۰۸]

یہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ **"أن رفع الصوت بالذكر"** بلند آواز سے ذکر کرنا اس وقت جب کہ لوگ نماز فرض سے فارغ ہوں یہ امر نبی کریم ﷺ کے ہاں تھا بلکہ آگے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ **"كنت أعلم إذا انصرفوا بذلك إذا سمعته"** کہ میں صحابہ کے فارغ ہونے کو اسی سے پہچانتا تھا یعنی **"رفع الصوت بالذكر"** سے، یعنی اگر باہر سے آرہا ہوں تو ذکر کی آواز آتی تھی تو میں سمجھتا تھا کہ نماز ختم ہوگئی۔

تو علماء محققین نے یہ فرمایا ہے کہ یہ **"رفع الصوت بالذكر"** نبی کریم ﷺ کے زمانے میں احیاناً ہوا ہے، لیکن عام معمول نہیں تھا اور بعد میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اس کو اختیار نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ یہ فرما رہے ہیں کہ یہ امر حضور ﷺ کے زمانے میں ہوا کرتا تھا یعنی اس وقت نہیں ہے جس وقت دوسروں کو کہہ رہے ہیں۔

علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے بعض حضرات نے ذکر جہر بعد الصلاۃ کے استحباب پر استدلال کیا ہے۔ ان حضرات میں نمایاں ترین ابن حزم ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو تعلیم پر محمول کیا ہے کہ شروع میں لوگوں کو بتانے کے لئے کہ کیا پڑھنا چاہئے جہر فرمایا، یہ دائمی معمول نہ تھا اور علامہ ابن بطال رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ **"أصحاب المذاهب المتبعة وغيرهم متفقون على عدم استحباب رفع الصوت بالتكبير والذكر حاشا ابن حزم"** علامہ عینی رحمہ اللہ نے ابن بطال رحمہ اللہ کی یہ عبارت نقل کی ہے۔ ابن بطال رحمہ اللہ کی مطبوعہ شرح بخاری میں یہ عبارت نہیں، البتہ مفہوم موجود ہے کہ **"لم أجد أحداً من الفقهاء من يقول بشئ من هذا الحديث إلا ما ذكره ابن حبيب في الواضحة قال يستحب التكبير في العساكر والبعوث."**[۲۰۹]

دلیل اس کی یہ ہے کہ یہ بات براہین کلیہ قطعیہ سے ثابت ہے کہ ذکر اور دعا میں افضلیت اخفا کی ہے **"ادعوا ربكم تضرعا و خفية"** اور **"خير الدعاء خفي"** تو افضلیت اخفا کی ہے۔ اگرچہ ذکر بالجہر جائز ہے ناجائز نہیں لیکن افضل نہیں، افضل ذکر خفی ہے۔ اب بعض عوارض کی وجہ سے اگر ذکر بالجہر کو اختیار کیا جائے تو وہ ایک ابدی حکم نہیں بلکہ ایک عارضی حکم ہے اور اس کی وجہ سے نہ تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ذکر بالجہر ناجائز ہے اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ افضل ہے اور قابل تقلید ہے۔

---

۲۰۸ وفي صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب الذكر بعد الصلاة، رقم: ۹۱۹، وسنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب التكبير بعد الصلاة، رقم: ۸۵۱، ومسند أحمد، ومن مسند بني هاشم، باب باقي المسند السابق، رقم: ۳۲۹۸.

۲۰۹ ابن بطال، ج: ۲، ص: ۴۵۸، وعمدة القاري، ج: ۴، ص: ۲۰۵.

ذکرخفی کی افضلیت

ذکرخفی ہمارے بزرگوں نے اختیار کیا ہے، اول تو اس وجہ سے کہ ذکر میں خفا ہی اولیٰ اور افضل ہے اور دوسرے اس وجہ سے کہ وہ **"ابعد عن الخطرات"** ہے بخلاف ذکر جہر کے کہ اس میں خطرات ہیں:

خطرہ اس میں **"عُجب"** کا بھی ہے اور ریا کا بھی ہے اور خطرہ اس میں بدعت کا بھی ہے، اگر ذکر بالجہر کو افضل سمجھ کر کوئی پڑھنے لگے تو بدعت ہے تو یہ خطرات ہیں۔

ان خطرات کی وجہ سے ہمارے بزرگوں نے ذکر خفی کو ترجیح دی بنسبت ذکر جہری کے، یہاں تک کہ عام حالات میں بھی کہا کہ خفی ہونا چاہئے البتہ اگر اس میں ریا اور عجب نہ ہو، اس کی افضلیت کا اعتقاد نہ ہو، تو جائز ہے۔

۸۴۲ ــ حدثنا علی بن عبدالله قال: حدثنا سفيان قال: حدثنا عمرو قال: أخبرني أبو معبد، عن ابن عباس رضی الله عنهما قال: كنت أعرف انقضاء صلاة النبی ﷺ بالتكبير قال علی حدثنا سفيان، عن عمرو قال كان أبو معبد أصدق موالی ابنِ عباس قال علی واسمه نافذ. [راجع: ۸۴۱]

تکرارروایت کی وجہ

یہ وہی روایت ہے لیکن اس میں ایک نکتہ ہے آخر میں فرمایا **" قال علی حدثنا سفيان عن عمرو"** اس کے کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ یہ روایت عمرو بن دینار نے ابو معبد سے نقل کی ہے۔ ابو معبد نے سنایا اور بعض روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ عمرو بن دینار نے یہ بھی کہا کہ ابو معبد نے یہ حدیث سنائی تھی لیکن بعد میں کسی واقعہ میں میں نے ابو معبد سے کہا کہ آپ نے مجھے یہ حدیث سنائی تھی تو انہوں نے کہا کہ میں نے تو نہیں سنائی تھی بعد میں انہوں نے انکار کر دیا تو یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ اگر مروی عنہ روایت کا انکار کرے، تو وہ روایت قابل قبول ہے کہ نہیں۔

مروی عنہ اپنی روایت کا انکار کرے تو اس کا حکم

قول فیصل اس بات میں ہے کہ اگر مروی عنہ نے بصیغۂ جزم انکار کیا کہ خبردار میری طرف منسوب مت کرنا، میں نے نہیں سنائی ہے اور میں ہرگز اس کو اپنی طرف منسوب کرنے کے لئے تیار نہیں ہو، تب تو اس کا روایت کرنا بھی جائز نہیں اور وہ روایت بھی مقبول نہیں لیکن اگر اس نے بصیغۂ جزم انکار نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ مجھے یاد نہیں آرہا، ہوسکتا ہے کہ میں نے تم کو سنایا ہو۔

اس میں بعض فقہاء کہتے ہیں کہ روایت مقبول ہے اور یہ کہا جائے گا کہ مروی عنہ سنانے کے بعد بھول گیا، بشرطیکہ راوی ثقہ ہو۔ مگر اس صورت میں مروی عنہ جب آگے روایت کرے گا تو اس شاگرد سے روایت کرے گا۔ یہ حدیث آپ ترمذی میں پڑھیں گے **"حدثني علي بن مجاهد عني"** کہ علی بن مجاہد نے مجھے یہ حدیث سنائی خود مجھ سے **"وهو عندي ثقة"** لیکن اگر راوی خود ثقہ نہیں ہے تو پھر اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی یہی مسلک اختیار کیا کہ باوجود یہ کہ حضرت معبد نے انکار کر دیا مگر عمرو بن دینار کو خوب یاد ہے تو وہ روایت قبول ہوگی، کیونکہ عمرو بن دینار بڑے زبردست امام ہیں ان کی وثاقت پر اتفاق ہے تو فرمایا کہ **"قال علي"** علی بن مدینی کہتے ہیں کہ **"حدثنا سفيان عن عمرو"** اور عمرو بن دینار کہتے ہیں **"قال كان أبو معبد أصدق موالي بن عباس"** ابو معبد حضرت عبداللہ بن عباس کے موالی میں سب سے زیادہ سچے آدمی تھے **"قال علي واسمه نافذ"**.

۸۴۳ ۔ حدثنا محمد بن أبي بكر قال: حدثنا معتمر، عن عبيدالله، عن سمي، عن أبي صالح عن أبي هريرة ﷺ قال: جاء الفقراء إلى النبي ﷺ فقالو: ذهب أهل الدثور من الأموال بالدرجات العلى والنعيم المقيم، يصلون كما نصلي، و يصومون كما نصوم. ولهم فضل أموال يحجون بها، و يعتمرون، ويجاهدون، ويتصدقون. فقال: ((ألا أحدثكم بما إن أخذتم به أدركتم من سبقكم ولم يدرككم أحد بعدكم و كنتم خير من أنتم بين ظهرانيهم إلا من عمل مثله تسبحون، وتحمدون و تكبرون خلف كل صلاة ثلاثا و ثلاثين))، فاختلفنا بيننا، فقال بعضنا: نسبح ثلاثا و ثلاثين، ونحمد ثلاثا و ثلاثين، و نكبر أربعا و ثلاثين. فرجعت إليه، فقال: ((تقول سبحان الله والحمد لله والله اكبر، حتى يكون منهن كلهن ثلاثا و ثلاثين)). [أنظر: ۶۳۲۹]

۸۴۴ ۔ حدثنا محمد بن يوسف قال: حدثنا سفيان عن عبدالملك بن عمير، عن وراد كاتب للمغيرة بن شعبة قال: أملى على المغيرة في كتاب إلى معاوية أن النبي ﷺ كان يقول في دبر كل صلاة مكتوبة: ((لا إله إلا الله وحده لا شريك له، له الملك وله الحمد، وهو على كل شئي قدير، اللهم لا مانع لما أعطيت، ولا معطي لما منعت، ولا ينفع ذاالجد منك الجد)). وقال شعبة عن عبدالملك بن عمير بهذا. وقال الحسن: جد: غني .عن الحكم، عن القاسم بن مخيمرة، عن وراد بهذا. [أنظر: ۱۴۷۷، ۲۴۰۸، ۵۹۷۵، ۶۳۳۰، ۶۴۷۳، ۶۶۱۵، ۷۲۹۲]

"جَدٌّ: غَنِيٌّ" جد کے معنی نصیب کے ہوتے ہیں، مراد ہے بے نیاز ہونا، مال والا ہونا۔ **"لا ينفع**

ذاالجد منک الجد" جد کے معنی اصل میں آتے ہیں نصیب اور "**ذو الجد**" کے معنی ہوئے صاحب نصیب، کوئی صاحب نصیب مالدار مراد ہے۔ کوئی مالدار آدمی کسی مالدار آدمی کو نفع نہیں پہنچا سکتا، اس کا مال۔

"**منک**" کا مطلب ہے، "**علی الرغم**" یعنی آپ اس کو عذاب دینا چاہتے ہیں اور کوئی شخص عذاب کی بدولت اس عذاب سے نجات پالے یہ نہیں ہوسکتا۔ "**لا ينفع ذاالجد منک الجد**".

(۱۵٦) باب: يستقبل الإمام الناس إذا سلم

امام لوگوں کی طرف منہ کرلے جب سلام پھیرلے

۸۴۵ ـ حدثنا موسىٰ بن إسماعيل قال: حدثنا جرير بن حازم قال: حدثنا أبو رجاء، عن سمرة بن جندب قال: كان النبي ﷺ إذا صلى صلاة أقبل علينا بوجهه. [أنظر: ۱۱۴۳، ۱۳۸٦، ۲۰۸۵، ۲۷۹۱، ۳۲۳۲، ۳۳۵۴، ۴٦۷۴، ٦۰۹٦، ۷۰۴۷]

۸۴٦ ـ حدثنا عبدالله بن مسلمة، عن مالک عن صالح بن كيسان، عن عبيدالله ابن عبدالله بن عتبة بن مسعود، عن زيد بن خالد الجهني أنه قال: صلى لنا النبي ﷺ صلاة الصبح بالحديبية على إثر سماء كانت من الليل، فلما انصرف أقبل على الناس فقال: ((هل تدرون ما ذا قال ربكم؟)) قالوا: الله و رسوله أعلم. قال: ((أصبح من عبادي مؤمن بي و كافر. فأما من قال: مطرنا بفضل الله و رحمته فذلک مؤمن بي كافر بالكوكب. وأما من قال: بنوء كذا وكذا، فذلک كافر بي و مؤمن بالكوكب)). [أنظر: ۱۰۳۸، ۴۱۴۷، ۷۵۰۳] [۱۰]

بعد السلام امام کو کیا کہنا چاہئے

یہ باب قائم کیا ہے کہ امام کو چاہئے کہ جب وہ سلام پھیرے تو لوگوں کی طرف رخ کر کے بیٹھے اور سمرہ بن جندب ﷺ کی حدیث لائے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب نماز پڑھتے تو "**اقبل علينا بوجهه**" ہماری طرف رخ

[۱۰] وفي صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان كفر من قال مطرنا بالنوء، رقم: ۱۰۴، وسنن النسائي، كتاب الإستسقاء، باب كراهية الإستمطار بالكوكب، رقم: ۱۵۰۸، وسنن أبي داؤد، كتاب الطب، باب في النجوم، رقم: ۳۴۰۷، ومسند احمد، ومسند الشاميين، باب بقية حديث زيد بن خالد الجهني عن النبي، رقم: ۱٦۴۴۴، وموطأ مالک، كتاب النداء للصلاة، باب الإستمطار بالنجوم، رقم: ۴۰۵.

پھیر لیتے تھے۔ اور اگلی حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

حنفیہ کا مؤقف اس باب میں یہ ہے کہ امام کو نماز کے بعد اپنی اسی ہیئت پر زیادہ دیر بیٹھنا مناسب نہیں، جس ہیئت پر وہ نماز سے فارغ ہوا۔ زیادہ سے زیادہ اتنا بیٹھ جائے کہ **"اللّٰھم انت السلام و منک السلام تبارکت یا ذالجلال والاکرام"** یہ پڑھے اور **"اللّٰھم لا مانع لما أعطیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذا الجد منک الجد"** اتنا پڑھ لو۔ اس سے زیادہ اس ہیئت پر بیٹھا مناسب نہیں یا تو کھڑا ہو کر سنتیں شروع کرے اور اگر وہ نہیں پڑھتا تو پھر امام کو چاہئے کہ مقتدیوں کی طرف رخ کر کے اور پھر جو کرنا ہے کرے۔

اختلاف ائمہ

حنفیہ کے ہاں عمل اس پر ہے کہ جن نمازوں میں فرائض کے بعد سنتیں ہیں ان میں تو امام کھڑا ہو کر سنتوں میں مشغول ہو جائے اور مقتدیوں کی طرف رخ کر کے نہ بیٹھے، لیکن جن نمازوں کے بعد سنتیں نہیں ہے جیسے عصر اور فجر تو اس میں مقتدیوں کی طرف رخ کر کے بیٹھنا چاہئے۔[۲۱۱]

حنابلہ اور غیر مقلدین وہ پانچوں نمازوں میں مقتدیوں کی طرف رخ کر کے بیٹھتے ہیں اور اس کو ضروری سمجھتے ہیں اور حدیث باب سے استدلال کرتے ہیں **"إذا صلی صلاۃ اقبل علینا بوجھہ"**.

حنفیہ کی طرف سے جواب

حنفیہ کا کہنا یہ ہے کہ نمازوں میں دونوں باتیں ثابت ہیں۔ بعض جگہ پر یہ بات ثابت ہے کہ **"اقبل بوجھہ"**، یعنی مصلین کا استقبال کیا اور بعض جگہ یہ ثابت ہے کہ فوراً اٹھ کر کھڑے ہو گئے یا تو چلے گئے یا وہیں پر نماز شروع کر دی اور مقتدیوں کا استقبال نہیں کیا۔

۲۱۱، ۲۱۲ وقال أبو حنیفة : کل صلاة یتنفل بعدها یقوم ، وما لا یتنفل بعدها کالعصر والصبح فهو مخیر، وهو قول أبی مجلز : لا حق بن أبی حمید . وقال أبو محمد من المالکیة : یتنفل فی الصلوات کلها لیتحقق المأموم أنه لم یبق علیه شئی من سجود السهو ولا غیره ، وحکی الشیخ قطب الدین الحلبی فی (شرحه) هکذا : عن محمد بن الحسن ، وذکره ابن التین أیضا ، وذکر ابن أبی شیبة عن ابن مسعود وعائشة ، رضی اللہ تعالی عنهما ، قالا : ((کان النبی ﷺ إذا سلم لم یقعد إلا مقدار مایقول : اللهم أنت السلام ومنک السلام ......وقال ابن مسعود أیضا : کان النبی ﷺ إذا قضی صلاته إنتقل سریعا إما أن یقوم وإما أن ینحرف الخ ، عمدة القاری ، ج:۴،ص:۲۲۲ ، ومصنف ابن أبی شیبة ، من کان یستحب إذا سلم أن یقوم أو ینحرف ، رقم : ۳۰۸۰ - ۳۰۹۴ ، ج:۱،ص:۲۶۸ .

علامہ عینی رحمہ اللہ نے مصنف ابن أبی شیبہ کے حوالے سے صحابۂ کرام ﷺ کے بہت سارے آثار نقل کئے ہیں کہ سب صحابۂ کرام ﷺ کا معمول یہ تھا کہ وہ سلام پھیرتے ہی کھڑے ہو جاتے اور نمازیوں کا استقبال نہیں کرتے تھے۔ تو یہ بھی ثابت ہے اور وہ بھی ثابت ہے۔[۲۱۲]

قول فیصل

اصل بات یہ ہے کہ زیادہ دیر اس ہیئت پر بیٹھنا تو مناسب نہیں یا تو سنتوں کے لئے جلدی کھڑا ہو جائے یا چلا جائے اور گھر جا کر سنتیں پڑھے، یا اگر لمبا بیٹھنا ہے تو پھر مقتدیوں کی طرف رخ کر کے بیٹھے۔

دوسری حدیث جس میں یہ آتا ہے کہ آپ رخ کر کے بیٹھے۔ زید بن خالد جہنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

"صلی لنا النبی ﷺ صلاۃ الصبح بالحدیبیۃ".

حدیبیہ میں آپ ﷺ نے فجر کی نماز پڑھائی **"علی إثر سماء کانت من اللیل"** ایک بارش کے بعد نماز پڑھائی جو رات کے وقت میں ہوئی تھی۔

"سماء" سے مراد یہاں بارش ہے۔

"فلما انصرف اقبل علی الناس" جب فارغ ہوئے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے۔

اور فرمایا:

"ھل تدرون ماذا قال ربکم عزو جل"؟ قالوا: اللہ و رسولہ أعلم. قال اصبح من عبادی مؤمن بی و کافر".

کہ آج کی صبح میرے بندوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو مجھ پر ایمان لائے اور کچھ ایسے ہیں جنہوں نے مجھ سے انکار کیا۔

"فاما من قال مطرنا بفضل اللہ و رحمتہ" جس شخص نے یہ کہا کہ اللہ کی رحمت سے ہمارے اوپر بارش ہوئی۔

تو **"فذالک مؤمن بی و کافر بالکوکب"** تو وہ مجھ پر ایمان لایا اور اس نے کواکب (ستاروں) کا انکار کیا اور جس شخص نے یہ کہا کہ **"مطرنا بنوء کذا و کذا"** کہ ہمارے اوپر بارش ہوئی فلاں ستارے کی وجہ سے۔ تو اس نے مجھ سے کفر کیا اور کوکب پر ایمان لایا۔

اہل عرب کے ہاں عقیدہ تھا کہ فلاں ستارہ طلوع ہو تو وہ بارش کی علت ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے اس کی تردید فرمائی اور محکمۂ موسمیات کا کردار اس میں داخل نہیں کیونکہ محکمۂ موسمیات صرف علامت بتاتا ہے کہ علامتیں ایسی ہیں کہ اس میں بارش ہونے کی توقع ہے یا نہیں۔ اس کا تعلق اس سے نہیں ہے کہ فلاں ستارہ بارش کی علت

ہے۔ یہ اہل عرب جو تھے وہ ستارے کو بارش کی علت تامہ مانتے تھے اور علامات سے اندازہ لگانا کہ بھائی آثار ایسے ہو رہے ہیں تو یہ پیشین گوئی اس میں داخل نہیں۔

"السلام علیک" کی توجیہ

تشہد میں کہا جاتا ہے " **السلام علیک أیھا النبی و رحمة اللہ و برکاتہ** " تو اس میں نبی کریم ﷺ کے لئے صیغۂ خطاب ہے، دوسری طرف علماء دیوبند " **الصلاۃ و السلام علیک یا رسول اللہ** " کہنے سے منع کرتے ہیں۔

یہ سمجھ لینا چاہئے کہ تشہد میں جمہور کا راجح قول یہی ہے کہ تشہد کے ساتھ "**السلام علیک أیھا النبی**" اسی صیغہ کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے۔ شروع میں بعض صحابہ اور تابعین سے منقول ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے پاس "**السلام علیک أیھا النبی**" کے بجائے "**السلام علی النبی**" تشہد میں پڑھتے تھے۔ یعنی صیغۂ خطاب سے عدول کرتے تھے اور صیغۂ غائب کا استعمال کرتے تھے "**السلام علی النبی**" لیکن یہ شاذ اقوال ہیں، جمہور امت نے اس پر عمل نہیں کیا۔

اب اس پر تقریباً اجماع ہے کہ تشہد میں "**السلام علیک أیھا النبی**" ہی پڑھنا چاہئے اور اس پر مستزاد یہ کہ فقہاء کرام نے فرمایا اگرچہ یہ التحیات کے الفاظ معراج کے موقع پر منقول ہیں کہ جب اللہ ﷻ کی بارگاہ میں حضور اقدس ﷺ کی حاضری ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا:

" **التحیات للہ و الصلوٰت و الطیبات**".

تو اللہ ﷻ نے فرمایا:

" **التحیات أیھا النبی و رحمة اللہ و برکاتہ**".

پھر حضور نے فرمایا:

" **السلام علینا و علی عباد اللہ الصٰلحین**".

تو یہ "**السلام علیک أیھا النبی**".

یہ درحقیقت اللہ ﷻ نے حضور اقدس ﷺ سے فرمایا تھا، لیکن اب جس وقت ہم التحیات میں یہ جملہ پڑھیں گے تو یہ تصور کریں گے کہ ہم آنحضرت ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ پھر عام طور سے علماء دیوبند " **الصلاۃ و السلام علیک یا رسول اللہ** " کہنے سے کیوں منع کرتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اب ان الفاظ کے ساتھ ایک غلط عقیدہ منسلک ہوگیا ہے اور وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں۔ اس لئے اس فاسد عقیدے سے یا اس کی تائید سے یا اس کی مشابہت

سے بچنے کے لئے اس سے منع کیا جاتا ہے، اور تشہد میں جو سلام ہے اس میں صیغہ نداء مجاز ہے کہ آپ ﷺ کا ذہن میں تصور کر کے سلام عرض کیا جاتا ہے، یہ عقیدہ نہیں ہوتا کہ آپ ﷺ حاضر و ناظر ہیں یا اس موقع پر تشریف لاتے ہیں۔ علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے " البحر الرائق " میں اس کی تصریح فرمائی ہے۔[۲۱۳]

(۱۵۷) باب مکث الإمام فی مصلاہ بعد السلام

امام کا سلام کے بعد اپنے مصلّے پر ٹھہرنے کا بیان

۸۴۸ - وقال لنا آدم: حدثنا شعبة، عن أیوب، عن نافع قال: کان ابن عمر یصلی فی مکانه الذی صلی فیه فریضة و فعله القاسم. و یذکر عن أبی هریرة رفعه: ((لا یتطوع الإمام فی مکانه))، ولم یصح.

امام سنتیں کہاں پڑھے

"**باب مکث الإمام فی مصلاہ بعد السلام**" امام کا سلام کے بعد اپنے مصلی پر ٹھہرے رہنا۔

یہ مسئلہ پیچھے گزر چکا ہے کہ نماز کے بعد اگر امام کو بیٹھنا ہو تو اس صورت میں مقتدیوں کی طرف رُخ کر کے بیٹھنا چاہئے اور اگر بیٹھنا نہیں ہے بلکہ سنتیں پڑھنی ہیں تو پھر جلدی سے سنتوں کے لئے کھڑا ہو جانا چاہئے۔

اب سوال یہ ہے کہ آیا سنتیں اُسی جگہ پر پڑھیں جہاں فرض ادا کئے تھے یا اس سے ہٹ کر پڑھیں؟

حنفیہ اور دیگر فقہاء کا مسلک

حنفیہ کا مسلک یہ ہے اور دوسرے فقہاء بھی یہی فرماتے ہیں کہ جس جگہ فرض ادا کئے ہیں وہاں سے کچھ ہٹ جانا چاہئے، خاص طور سے امام ہٹ جائے۔ امام کو چاہئے کہ جہاں اس نے فرض پڑھائے ہیں ٹھیک اسی جگہ سنتیں پڑھنے کے لئے نہ کھڑا ہو بلکہ پیچھے آجائے، آگے بڑھ جائے یا دائیں بائیں تھوڑا سا فرض والی جگہ سے ہٹ جائے۔

اس پر دلیل یہ پیش کی کہ ابوداؤد اور ابن ماجہ میں حدیث آئی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "**یعجز أحدکم أن یزول عن مکانه بعد ما یصلی**" کیا تم لوگ اس بات سے عاجز ہو جاتے ہو کہ نماز پڑھنے کے بعد اپنی جگہ سے ہٹ جاؤ، ایسا نہیں ہونا چاہئے یعنی عاجز نہیں ہونا چاہئے بلکہ اپنی جگہ سے ہٹ کر سنتیں پڑھنا چاہئے۔

۲۱۳ والحکمة فی أن العبد یسئل اللہ تعالی أن یصلی ولا یصلی بنفسه مع أنه مأمور بالصلاة قصوره عن القیام بهذا الحق کما ینبغی فالمراد من الصلاة فی الآیة سؤالها فالمصلی فی الحقیقة هو اللہ تعالی و نسبتها إلی العبد مجاز.

البحر الرائق، ج: ۱، ص: ۳۲۹.

امام بخاری رحمہ اللہ نے آگے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اثر نقل کیا ہے **"کان ابن عمر یصلی فی مکانه الذی صلی فیه فریضة"** حضرت عبداللہ بن عمرؓ اسی جگہ نماز پڑھتے تھے جہاں انہوں نے فرض نماز پڑھی، یعنی اپنی جگہ سے سنتوں کے لئے نہیں ہٹتے تھے۔

علامہ عینی رحمہ اللہ نے مصنف بن ابی شیبہ کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اثر نقل فرمایا ہے کہ امام کے لئے وہ بھی یہی کہتے تھے کہ اس کو اپنی جگہ سے ہٹ جانا چاہئے۔ لہٰذا ان کا یہ عمل اس صورت میں ہے جب وہ امام نہیں ہوتے تھے بلکہ مقتدی ہوتے تھے۔[۲۱۴]

"فعله القاسم" اور قاسم بن محمد نے بھی ایسا ہی کیا یعنی اُسی جگہ نماز پڑھی جہاں فرض پڑھتے تھے۔

"و یذکر عن أبی هریرة رفعه: لا یتطوع الإمام فی مکانه"۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک مرفوع روایت ہے کہ امام کو اپنی جگہ میں تطوع نہیں پڑھنا چاہئے۔

لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو صحیح قرار نہیں دیا لیکن دوسرے حضرات نے فرمایا کہ اگرچہ صحیح کے اصطلاحی معیار پر نہ ہو لیکن تعدد شواہد کی وجہ سے قابلِ استدلال ضرور ہے۔

۸۴۹ - حدثنا أبو الولید قال: حدثنا إبراهیم بن سعد قال: حدثنا الزهری، عن هند بنت الحارث ، عن أم سلمة: أن النبی ﷺ کان إذا سلم یمکث فی مکانه یسیراً. قال ابن شهاب: فنری. والله أعلم. لکی ینفذ من ینصرف من النساء. [راجع: ۸۳۷]

یہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت نقل کی ہے کہ **"أن النبی ﷺ کان إذا سلّم یمکث فی مکانه یسیرا"** آپ ﷺ جب سلام پھیرتے تو تھوڑی دیر اپنی جگہ پر ٹھہرتے تھے۔

آگے فرمایا:

"قال ابن شهاب: فنری والله أعلم. لکی ینفذ من ینصرف من النساء"۔

آپ ﷺ کے ٹھہرنے کی وجہ یہ ہوتی تھی واللہ اعلم کہ جانے والی عورتیں نکل جائیں۔ یہ پیچھے بھی آیا ہے کہ عورتیں چلی جائیں اور مرد بعد میں جائیں تاکہ مردوں اور عورتوں کا اختلاط لازم نہ آئے۔

۸۵۰ ـ وقال ابن أبی مریم : أخبرنا نافع بن یزید قال : حدثنی جعفر بن ربیعة أن ابن شهاب کتب إلیه قال : حدثنی هند بنت الحارث الفراسیة ، عن أم

---

[۲۱۴] ثم أعلم أن الجمهور على أن الإمام لا يتطوع فی مكانه الذی صلى فيه الفريضة ، وذكر ابن أبی شيبة عن علی رضی الله تعالى عنه : لا يتطوع الإمام حتى يتحول من مكانه أو يفصل بينهما بكلام ، وكرهه ابن عمر للإمام ولم ير به بأسا بالغيره ، وعن عبد الله بن عمر ومثله ، عمدة القاری ، ج:۴،ص:۲۲۳ ، ومصنف ابن أبی شيبة ، من كره للإمام أن يتطوع من مكانه ، رقم : ۶۰۲۱ ، ج:۲،ص:۲۴.

سلمة زوج النبی ﷺ وکانت من صواحباتها قالت: کان یسلم فینصرف النساء فیدخلن بیوتهن من قبل أن ینصرف رسول اللہ ﷺ و قال ابن وهب، عن یونس، عن ابن شهاب: أخبرتنی هند الفراسیة. وقال عثمان بن عمر: أخبرنا یونس عن الزهری: حدثتنی هند القرشیة. و قال الزبیدی: أخبرنی الزهری أن هنداً بنت الحارث القرشیة أخبرته و کانت تحت معبد بن المقداد وهو حلیف بنی زهرة وکانت تدخل علی أزواج النبی ﷺ. وقال شعیب: عن الزهری: حدثتنی هند القرشیة. وقال ابن أبی عتیق: عن الزهری، عن هند الفراسیة. وقال اللیث: حدثنی یحیی بن سعید: حدثه ابن شهاب عن امرأة من قریش، حدثته عن النبی ﷺ. [راجع: ۸۳۷]

"وقال ابن أبی مریم.......... حدثنی هند ابنة الحارث الفراسیّة" جو خاتون حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نقل کر رہی ہیں، ان کا نام ہند بنت حارث ہے، لیکن ان کے قبیلہ کے بارے میں راویوں میں اختلاف ہے۔

بعض نے کہا "فراسیّة" ہے اور بعض نے کہا "قرشیّة" ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے وہ اختلاف نقل کیا ہے کہ دونوں روایات صحیح ہیں یعنی "فراسیّة" والی بھی اور "قرشیّة" والی بھی۔

بعض نے اس طرح تطبیق دی ہے کہ "فراسیّة" کا نسب بھی قریش سے ملتا ہے اور دونوں بنو کنانہ سے تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا یہ "فراسیّة" بھی تھیں اور "قرشیّة" بھی تھیں۔

بعض نے کہا کہ "فراسیّة" اور "قرشیّة" دونوں جمع تو نہیں ہوتے، لیکن یہ نسب کے اعتبار سے "قرشیّة" تھیں اور موالات کے اعتبار سے "فراسیّة" تھیں یا اس کے برعکس، اس واسطے دونوں طرح کہنا درست ہے۔ "قرشیّة" بھی کہہ سکتے ہیں اور "فراسیّة" بھی کہہ سکتے ہیں۔

(۱۵۸) باب من صلی بالناس فذکر حاجة فتخطاهم.

نماز پڑھا چکنے کے بعد اگر کسی کو اپنی ضرورت یاد آئے تو لوگوں کو پھاندتا ہوا چلا جائے

۸۵۱ ۔ حدثنا محمد بن عبید قال: حدثنا عیسیٰ بن یونس، عن عمر بن سعید قال: أخبرنی ابن أبی ملیکة، عن عقبة قال: صلیت وراء النبی ﷺ بالمدینة العصر فسلم فقام مسرعا فتخطی رقاب الناس إلی بعض حجر نسائه، ففزع الناس من سرعته فخرج

علیهم فرأى أنهم عجبوا من سرعته، فقال: ((ذکرت شيئا من تبر عندنا فكرهت أن يحبسني، فأمرت بقسمته)). [أنظر: ۱۲۲۱، ۱۴۳۰، ۶۲۷۵] [۲۱۵]

حضرت عقبہ بن الحارث ﷺ فرماتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کے پیچھے عصر کی نماز پڑھی، آپ ﷺ نے سلام پھیرا اور جلدی سے کھڑے ہو کر لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے اپنی ازواج مطہرات میں سے کسی کے حجرے کی طرف تشریف لے گئے۔

ترجمۃ الباب کا مقصد

اس ترجمۃ الباب کا منشأ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے اور اس کو کوئی حاجت پیش آجائے جس کی وجہ سے وہ جلدی سے گردنیں پھلانگ کر چلا جائے تو یہ جائز ہے۔

"**ففزع الناس من سرعته**" آپ ﷺ کے جلدی تشریف لے جانے کی وجہ سے لوگ گھبرا گئے۔

"**فخرج عیهم**" بعد میں واپس تشریف لائے "**فرأى أنهم عجبوا من سرعته**" دیکھا کہ لوگ آپ کے جلدی تشریف لے جانے پر تعجب کر رہے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا "**ذکرت شيئاً من تبر عندنا**" مجھے یاد آگیا کہ ہمارے گھر میں کچھ سونا پڑا ہوا ہے "**فكرهت أن يحبسني**" میں نے اس بات کو ناپسند سمجھا کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ مجھے روک ڈالے۔

"**يحبسني**" کے معنی یہ ہیں کہ میری توجہ اس کی طرف مشغول ہو جائے اور میں اپنے ذکر و فکر سے رہ جاؤں، گھر میں رہ گیا تو دل اس کی طرف لگا رہے گا اور اللہ ﷻ کی فکر سے غافل ہوگا، "**فأمرت بقسمته**" میں نے اس کو تقسیم کرنے کا حکم دیا کہ اس کو تقسیم کر دو، فلاں کو دے دو۔

غور کیجیے! تھوڑا سا سونا بھی اس وجہ سے گھر میں رکھنا گوارا نہیں کیا۔

۸۵۴ ـ حدثنا عبدالله بن محمد قال: حدثنا أبو عاصم قال: أخبرنا ابن جريج قال: أخبرني عطاء قال: سمعت جابر بن عبدالله قال: قال النبي ﷺ: ((من أكل من هذه الشجرة. يريد الثوم. فلا يغشانا في مسجدنا)). قلت: ما يعني به؟ قال: ما أراه يعني إلا نيئه. وقال مخلد بن يزيد: عن ابن جريج: إلا نتنه. [أنظر: ۸۵۵، ۵۴۵۲، ۷۳۵۹]

"**قال: ما أراه يعني الا نيئه**".

میرا گمان یہ ہے کہ آپ ﷺ کی مراد یہ تھی کہ کچا پیاز یا کچا لہسن کھا کر آنا درست نہیں ہے، کیونکہ اس سے

---

[۲۱۵] وفي سنن النسائي، كتاب السهو، باب الرخصة للإمام في تخطي رقاب الناس، رقم: ۱۳۴۸، ومسند أحمد، أول مسند المدنيين أجمعين، باب حديث عقبة بن الحارث، رقم: ۱۵۵۶۵، ۱۸۶۱۱.

بد بو پھیلتی ہے، اگر پکا ہوا ہو تو پھر مضائقہ نہیں۔

۸۵۵ـ حدثنا سعيد بن عفير قال: حدثنا ابن وهب، عن يونس، عن ابن شهاب: زعم عطاء أن جابر بن عبدالله زعم أن النبی ﷺ قال: ((من أكل ثوما أو بصلا فليعتزلنا، أو فليعتزل مسجدنا أو ليقعد فی بيته)). وأن النبی ﷺ أتی بقدر فيه خضرات من بقول فوجد لها ريحا فسأل فأخبر بما فيها من البقول فقال: ((قربوها))، إلى بعض أصحابه كان معه، فلما رآه كره أكلها قال: ((كل فإنی أناجی من لا تناجی)). [راجع: ۸۵۴،۸۵۳]

وقال احمد بن صالح عن ابن وهب أتی ببدر، قال ابن وهب: يعنی طبقا فيه خضرات. ولم يذكر الليث وأبو صفوان عن يونس قصة القدر، فلا أدری هو من قول الزهری أو فی الحديث.

ایذاءِ مسلم سے بچنے کا اہتمام

حضرت جابر ؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"من أكل ثوماً أو بصلا فليعتزلنا ، أو فليعتزل مسجدنا أو ليقعد فی بيته".

ایسا آدمی جماعت سے الگ رہے، کیونکہ اس سے دوسرے لوگوں کو تکلیف پہنچے گی۔

یہی سے فقہاء کرام نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ جو شخص ایسی حالت میں ہو کہ اس سے بد بو آ رہی ہو اور لوگوں کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو، زخم کی بد بو ہو، منہ کی بد بو ہو یا مجذوم ہو، ایسے شخص کے لئے مسجد میں آنا جائز نہیں ہے۔

لہٰذا اس پر واجب ہے کہ مسجد میں آنے کے بجائے گھر میں نماز پڑھے۔

اس سے اندازہ لگائیں کہ شریعت نے اس بات کا کتنا اہتمام کیا ہے کہ اپنی ذات سے کسی دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے، مسجد میں جا کر با جماعت نماز پڑھنے کی جتنی فضیلت ہے وہ کسی پر مخفی نہیں لیکن دوسروں کو تکلیف سے بچانے کے لئے نہ صرف یہ کہا کہ ترکِ جماعت کا عذر ہے بلکہ فرمایا کہ اس کے لئے مسجد میں آنا جائز نہیں۔

آگے فرمایا:

"أن النبی ﷺ أتی بقدر........" نبی کریم ﷺ کے پاس ایک دیگ لائی گئی جس میں کچھ سبزیاں تھیں، ساگ وغیرہ۔

"فوجد لها ريحا" آپ ﷺ نے اس سے بد بو محسوس فرمائی، **"فسأل"** آپ نے پوچھا، قصہ کیا ہے؟ بد بو کیوں آ رہی ہے؟

"فأخبر بما فيها من البقول".

آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ اس میں فلاں فلاں سبزیاں ہیں۔

"فقال: قرّبوها الى بعض أصحابه كان معه".

فرمایا یہ ان بعض صحابہ ؓ کو دے دو جو آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔

"فلما رآه كره أكلها".

جب حضور ﷺ نے دیکھا کہ وہ صحابی بھی اس کو پسند نہیں کر رہے ہیں اور کھانے سے پرہیز کر رہے ہیں، کیونکہ حضور ﷺ نے اس میں بو محسوس کی اور پسند نہیں فرمایا تو آپ نے فرمایا "کُل" تم کھالو۔

"فانّي اناجي من لا تناجي" کیونکہ میں ایسی ذات سے سرگوشی کرتا ہوں جس سے تم سرگوشی نہیں کرتے، یعنی یا تو اللہ ﷻ سے یا ملائکہ کے واسطے سے اللہ ﷻ سے، لہٰذا اگر میں کھاؤں تو مُنہ سے بدبو آئے گی اور یہ اچھا نہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابھی پیچھے گزرا ہے کہ پیاز اور لہسن اگر پکے ہوئے ہوں تو پھر کوئی مضائقہ نہیں، کچے میں خرابی ہے اور یہاں تو "**قِدر**" یعنی دیگ لائی گئی تھی، جس سے معلوم ہوا کہ پکا ہوا تھا، پھر آپ ﷺ نے اس کو کیوں ناپسند فرمایا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یا تو وہ دیگ پکی ہوئی نہیں ہوگی۔ بعض اوقات ویسے ہی کچی دیگ لے آتے تھے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اچھی طرح بھونی نہ گئی ہو جس کی وجہ سے بو برقرار ہو۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں وہ بو مراد ہو جو بہت ساری ترکاریاں بنا لینے سے عجیب وغریب بو پیدا ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے منع فرمایا۔

(۱۶۱) باب وضوء الصبيان و متى يجب عليهم الغسل والطهور: وحضورهم الجماعة والعيدين والجنائز، و صفوفهم؟

بچوں کے وضو کرنے کا بیان اور ان پر غسل اور طہارت اور جماعت میں اور عیدین میں اور جنازوں میں حاضر ہونا کب واجب ہے؟ اور ان کی صفوں کا بیان

بچوں سے متعلق مسائل

اس باب میں امام بخاری رحمہ اللہ نے بچوں سے متعلق بہت سارے مسائل جمع کر دیئے ہیں، بچوں کا وضو اور غسل، طہارت اور بچوں کا جماعت اور عیدین و جنازہ میں آنا اور ان کی صف کا حکم۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب تک بچے بالغ نہ ہوں اس وقت تک بچے مکلف نہیں ہوتے لیکن ان کے اولیاء مکلف ہیں کہ ان کو عادت ڈلوائیں، وضو کروائیں، نماز پڑھوائیں اور صف میں بھی پیچھے کھڑا کریں، اگر اکیلا بچہ ہو تو ایک کنارہ پر کھڑا کردیں۔

بچوں کو صف میں کھڑا کرنا

اب مفتی بہ قول یہ ہے کہ بچوں کو پیچھے کھڑے نہ کریں، ورنہ وہ بہت شرارت کرتے ہیں، لہٰذا ان کو صفوں میں دائیں، بائیں کھڑا کیا جائے تا کہ وہ شرارت کر کے نماز خراب نہ کریں۔ علامہ رافعیؒ نے یہ فتویٰ دیا ہے۔

اور جماعت اور عیدین میں سات سال سے زیادہ کے بچوں کو لانا ٹھیک ہے لیکن اس طرح کہ لوگوں کو پریشان نہ کرے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے بچوں سے متعلق بہت ساری احادیث یہاں جمع کی ہیں، جن میں سے بیشتر وہ ہیں جو پہلے کہیں نہ کہیں گزر چکی ہیں۔

۸۵۷ ـ حدثنا ابن المثنى قال: حدثني غندر قال: حدثنا شعبة قال: سمعت سليمان الشيباني قال: سمعت الشعبي قال: أخبرني من مر مع النبي ﷺ على قبر منبوذ فأمهم و صفوا عليه فقلت: يا أبا عمرو من حدثک ؟ فقال: ابن عباس.[أنظر: ۱۲۴۷ ، ۱۳۱۹، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۶، ۱۳۳۶، ۱۳۴۰]

اس حدیث کے لانے کا منشأ یہ ہے کہ جب پوچھا کہ آپ کو یہ حدیث کس نے سنائی ہے؟ کہا ابن عباس نے۔ معلوم ہوا کہ جس وقت آپ ﷺ نے قبر کے اوپر امامت فرمائی تھی اس وقت ابن عباس رضی اللہ عنہ موجود تھے اور وہ بچے تھے۔

۸۵۸ ـ حدثنا علي بن عبدالله قال: حدثنا سفيان قال: حدثني صفوان بن سليم، عن عطاء بن يسار، عن أبي سعيد الخدري عن النبي ﷺ قال: ((الغسل يوم الجمعة واجب على كل محتلم)).[أنظر: ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۹۵، ۲۶۶۵]

اس سے پتہ چلا کہ غسل بچوں پر واجب نہیں۔

۸۵۹ ـ حدثنا علي بن عبد الله قال: أخبرنا سفيان عن عمرو قال: أخبرني كريب، عن ابن عباس رضي الله عنهما قال: بت عند خالتي ميمونة ليلة فنام النبي ﷺ، فلما كان في بعض الليل قام رسول الله ﷺ فتوضأ من شن معلق وضوءً خفيفاً، يخففه عمرو و يقلله جدا. ثم قام يصلي فقمت فتوضأت نحوا مما توضأ.

ثم جئت فقمت عن يساره و فحولني فجعلني عن يمينه . ثم صلى ما شاء الله . ثم اضطجع فنام حتى نفخ . فأتاه المنادى يؤذنه بالصلاة ، فقام معه إلى الصلاة فصلى ولم يتوضأ. قلنا لعمرو : إن ناسا يقولون : إن النبي ﷺ تنام عينه و لا ينام قلبه . قال عمرو : سمعت عبيد بن عمير يقول : إن رؤيا الأنبياء وحي ثم قرأ : ﴿ إِنِّي أَرَى فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ ﴾ [الصافات : ۱۰۲] . [راجع : ۱۱۷]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بچوں کا وضو کرنا مشروع ہے، کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی طرح وضو کیا۔

۸۶۱ ۔ حدثنا عبد الله بن مسلمة، عن مالك، عن ابن شهاب، عن عبيد الله بن عبدالله بن عتبة، عن ابن عباس رضي الله عنهما أنه قال: أقبلت راكبا على حمار أتان وأنا يومئذ قد ناهزت الإحتلام و رسول الله ﷺ يصلي بالناس بمنى إلى غير جدار، فمررت بين يدي بعض الصف فنزلت وأرسلت الأتان ترتع و دخلت في الصف فلم ينكر ذلك على أحد. [راجع: ۷۶]

"أتان" مؤنث ہے۔ گدھی کو کہتے ہیں، اس کا مذکر "حمار" ہے۔

۸۶۲ ۔ حدثنا أبو اليمان قال: أخبرنا شعيب، عن الزهري قال: أخبرني عروة بن الزبير أن عائشة قالت: أعتم النبي ﷺ . وقال عياش: حدثنا عبدالأعلى قال: حدثنا معمر، عن الزهري، عن عروة ، عن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: أعتم رسول الله ﷺ في العشاء حتى ناداه عمر. قد نام النساء والصبيان. فخرج رسول الله ﷺ فقال: ((إنه ليس أحد من أهل الأرض يصلي هذه الصلاة غيركم)) ولم يكن أحد يومئذ يصلي غير أهل المدينة. [راجع: ۵۶۶]

یہ حدیث اس لئے لائے ہیں کہ اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا "قد نام النساء والصبيان" معلوم ہوا کہ جماعت میں بچے بھی موجود تھے۔

۸۶۳ ۔ حدثنا عمرو بن علي قال: حدثنا يحيى قال: حدثنا سفيان قال: حدثني عبدالرحمن بن عابس: سمعت ابن عباس رضي الله عنهما قال له رجل: شهدت الخروج مع رسول الله ﷺ و قال: نعم ، ولولا مكاني منه ما شهدته ، يعني من صغره ، أتى العلم الذي عند دار كثير بن الصلت ثم خطب ثم أتى النساء فوعظهن و ذكرهن وأمرهن أن يتصدقن ، فجعلت المرأة تهوى بيدها إلى حلقها تلقي في ثوب بلال، ثم أتى هو و بلال

البیت. [راجع: ۹۸]

یہ حضرت عبدالرحمٰن بن عابس کی روایت ہے فرماتے ہیں، **"سمعت ابن عباس رضی اللّٰہ عنھما"** میں نے حضرت ابن عباس ؓ سے سنا۔

"قال لہ رجل: شھدت الخروج مع رسول اللّٰہ ﷺ؟" خروج سے عید کی نماز کے لئے خروج مراد ہے یعنی جب حضور ﷺ عید کے لئے نکلے تو کیا اس وقت آپ ساتھ موجود تھے؟

"قال : نعم" حضرت عبداللہ بن عباس ؓ نے فرمایا: ہاں۔

"ولو لا مکانی منہ ما شھدتہ" یعنی **"من صغرہ"** اگر میرا حضور ﷺ کے ساتھ قرب کا وہ مرتبہ نہ ہوتا جو تھا تو میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کے ساتھ شامل نہ ہوتا۔

مطلب یہ ہے کہ میں اس وقت اتنا چھوٹا تھا کہ بظاہر حضور ﷺ کے ساتھ جانے کا کوئی سوال نہیں، اتنی کم عمر کے بچوں کو حضور ﷺ اپنے ساتھ نہیں لے کر جاتے تھے، لیکن چونکہ آنحضرت ﷺ مجھ سے محبت فرماتے تھے اور میں آپ ﷺ کے ساتھ قرب کا ایک خاص مقام رکھتا تھا، اس واسطے آپ ﷺ نے مجھے ساتھ رکھنا گوارا فرمالیا۔

حضرت ابن عباس ؓ کے اس جملے کی کئی تفسیریں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں یہ تفسیر راجح ہے جو ذکر کی ہے۔

آگے فرماتے ہیں:

"أتی العلم الذی عند دار کثیر بن الصلت" آپ ﷺ اس نشان کے پاس آئے جو **"کثیر بن الصلت"** کے گھر کے پاس تھا۔

علَم، مینار کو بھی کہتے ہیں اور کوئی خاص واضح اور نمایاں عمارت ہو اس کو بھی کہتے ہیں۔ **"ثم خطب ثم أتی النساء"** پھر عورتوں کے پاس تشریف لائے۔

"فوعظھنّ و ذکّرھن" ان کو وعظ و نصیحت فرمائی **"وامرھن أن یتصدقن"** اور ان کو صدقے کا حکم دیا، **"فجعلت المرأۃ تھوی بیدھا الی حلقھا"** تو ایک عورت اپنے ہاتھوں کو حلق تک لے جاتی تھی **"تلقی فی ثوب بلال"** اور حضرت بلال ؓ کے کپڑے میں ڈال دیتی تھی، یعنی اپنے ہاتھ حلق کی طرف لے جاتی اور جو زیور ہوتا وہ حضرت بلال ؓ کے کپڑے میں ڈال دیتی۔

"ثم أتی ھو و بلال البیت" یہاں **"بیت"** سے بیت اللہ مراد نہیں ہے، بلکہ آنحضرت ﷺ کا اپنا گھر مراد ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ حدیث کتاب العیدین میں **"باب العلم بالمصلی"** کے تحت نکالی ہے، وہاں یہ الفاظ ہیں **"ثم انطلق ھو و بلال الی بیتہ"**.

۸۶۹ - حدثنا عبد اللّٰه بن يوسف قال : أخبرنا مالک ، عن يحيىٰ بن سعيد ، عن عمرة بنت عبدالرحمٰن عن عائشة رضى اللّٰه عنها قالت : لو أدرک النبى ﷺ ما أحدث النساء لمنعهن المسجد كما منعت نساء بنى إسرائيل . قلت لعمرة : أو منعن ؟ قالت : نعم .[۲۱۶]

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر رسول اللہ ﷺ وہ بات پالیتے جواب عورتوں نے پیدا کی ہے تو "**لمنعهن المسجد**" تو آپ ﷺ ان کو مسجد آنے سے روک دیتے جیسے بنی اسرائیل کی عورتوں کو روکا گیا تھا۔

"**قلت لعمرة**": میں نے عمرہ سے کہا، کیا ان کو روک دیا گیا تھا؟

"**قالت: نعم**" انہوں نے کہا: ہاں۔

پیچھے جتنی حدیثیں گزری ہیں، ان سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں خواتین مسجد میں آکر نماز پڑھا کرتی تھیں اور ان کی صف مردوں کی صف کے پیچھے ہوا کرتی تھی۔

عورتوں کا مسجد میں بغرض جماعت آنا

اس میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اگر اللہ کی بندیاں تم سے نماز پڑھنے کی اجازت چاہیں تو اجازت دے دو، لیکن بعد میں حضرت فاروق اعظم ﷺ نے منع کر دیا کہ اب عورتیں نہ آیا کریں اور حضرت فاروق اعظم ﷺ کا یہ عمل صحابۂ کرام ﷺ کی موجودگی میں ہوا اور صحابہ ﷺ میں سے کسی نے اس پر نکیر نہیں فرمائی بلکہ تائید فرمائی، یہاں تک کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ ارشاد جو ماقبل میں ہے کہ جو باتیں عورتوں نے آج اختیار کر رکھی ہیں اگر حضور اقدس ﷺ ان کو دیکھ لیتے تو ان کو مسجد سے اسی طرح روکتے جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کو روکا گیا تھا۔

اس ارشاد کے مطابق گویا حضرت فاروق ﷺ نے جو کچھ کیا وہ حضور ﷺ کی منشأ کے عین مطابق تھا۔[۲۱۷]

---

۲۱۶ وفي صحيح مسلم ، كتاب الصلاة ، باب خروج النساء إلى المساجد إذا لم يترتب عليه فتنة ، رقم : ۶۷۶، وسنن أبي داؤد ، كتاب الصلاة ، باب التشديد في ذلك ، رقم : ۴۸۲ ، ومسند احمد ، باقي مسند الأنصار ، باب حديث السيدة عائشة ، رقم : ۲۳۴۶۱، ۲۴۴۳۲، ۲۴۷۹۰، وموطأ مالک ، كتاب النداء في الصلاة ، باب ماجاء في خروج النساء إلى المساجد ، رقم : ۴۸۱.

۲۱۷ راجع للتفصيل : عمدة القاري ، ج : ۴ ، ص : ۶۴۷ ، و مصنف ابن أبي شيبة ، من كره ذلک ، رقم : ۷۶۱۴ - ۷۶۲۱ ، ج:۲، ص:۲۵۶.

بنی اسرائیل کی عورتوں نے یہ حرکت شروع کردی تھی جیسا کہ **"كتاب الحيض"** کے شروع میں واقعہ گزرا ہے کہ انہوں نے مسجدوں میں جا کر مردوں کو فتنہ میں ڈالنا شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے ان کو روک دیا گیا۔[۲۱۸]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس دور کے بارے میں فرما رہی ہیں کہ عورتوں میں تغیر پیدا ہو گیا جبکہ حضور اقدس ﷺ کو دنیا سے تشریف لے جانے کے ابھی چھ سال بھی نہیں ہوئے تھے، وہ تغیر کس قسم کا تھا؟ میں سمجھتا ہوں وہ تغیر دو قسم کا واقع ہوا تھا۔

ایک تو یہ کہ حضور اقدس ﷺ کے زمانہ مبارک میں عام طور سے خواتین اندھیرے والی نمازوں میں مساجد میں جایا کرتی تھیں جیسے مغرب، عشاء یا فجر کی نماز۔ دوسری طرف یہ بھی آیا ہے کہ **"متلفعات بمروطهن"** اپنی چادروں میں لپٹی ہوتی تھیں۔

تیسری بات یہ کہ زیب و زینت اور خوشبو وغیرہ لگانے کا نہ صرف یہ کہ احتمال نہیں تھا بلکہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے **"ليخرجن تفلات"** یعنی بغیر خوشبو کے میلی کچیلی نکلتی تھیں۔

اللہ ﷻ نے اس وقت کی خواتین کو یہ فہم عطا فرمائی تھی اور ان کی ایسی تربیت تھی کہ وہ اس کا اہتمام کرتی تھیں۔ سرکار دو عالم ﷺ کے دور کے بعد عورت اپنی اصل فطرت کی طرف آ گئی، اس کی فطرت اور جبلت میں یہ بات داخل ہے کہ جب گھر سے باہر جائے تو زیب و زینت کر کے جائے، اچھے کپڑے پہن کر اور خوب بناؤ سنگھار کر کے جائے، یہی صورت وہاں پیش آنے لگی۔

---

۲۱۸ ويستفاد من الأحاديث أن النساء كن يحضرن الجماعات في المكتوبات والعيدين مطلقا وكذا في هذا الكتاب لا تمنعوا إماء الله عن المساجد فهذا عمل وذاك قول، ومع ذلك ذهب الفقهاء إلى التضييق، ومنعهن المتأخرون أن الخروج مطلقا، ويؤيده ماعند أبي داؤد عن عائشة رضي الله عنها قالت: "لو أدرك رسول الله ﷺ ما أحدث النساء لمنعهن المساجد كما منعت نساء بني إسرائيل" وهو عندي عن ابن مسعود رضي الله عنه مرفوعا وقصة عمر رضي الله عنه مع زوجته حيث كانت تذهب إلى المسجد، وهي في البخاري ومرت من قبل وراجع كراهة خروجهن عن ابن المبارك من الترمذي ــــ

واعلم أن ههنا سرا وهو أني لم أر في الشريعة ترغيبا لهن في حضورهن الجماعة وعند أبي داؤد ما يخالفه فعن ابن مسعود رضي الله عنه مرفوعا قال: صلاة المرأة في بيتها أفضل من صلاتها في حجرتها وصلاتها في مخدعها أفضل من صلاتها في بيتها اهـ وهذا يدل على أن مرضي الشرع أن لايخرجن إلى المساجد، وفي حديث آخر: إن كان لا بد لهن من الخروج فليخرجن تفلات بدون زينة فلا يتعطرن فإن فعلن فهن كذا وكذا يعني زوان فهذه إباحة لا عن رضاء منه الخ، فيض الباري، ج: ۲، ص: ۳۲۱.

ایک تغیر یہ آیا کہ پہلے صرف رات کے وقت جاتی تھیں پھر دن کے وقت بھی جانا شروع کر دیا۔

دور نبوی میں خواتین کا مسجد میں آنا

دورِ نبوی میں خواتین کو بے شک مسجد میں آنے کی اجازت تھی لیکن آپ ﷺ نے بار بار تاکید سے یہ بات فرمائی ہے کہ عورت کے لئے افضل یہی ہے کہ اپنے گھر میں نماز پڑھے، مسجد میں آنے کی زیادہ سے زیادہ اجازت ہے جبکہ گھر میں پڑھنا افضل ہے، بلکہ حدیث میں تو یہاں تک فرمادیا کہ عورت کا اپنی کوٹھڑی میں نماز پڑھنا افضل ہے کمرے میں پڑھنے سے، کمرے میں پڑھنا افضل ہے برآمدے میں پڑھنے سے اور برآمدے میں پڑھنا افضل ہے صحن میں پڑھنے سے۔ جتنا چھپ کر نماز پڑھے اتنا ہی بہتر ہے۔[۲۱۹]

تو افضلیت گھر میں پڑھنے میں ہے، اب جو خواتین حضور اقدس ﷺ کے عہد مبارک میں مسجد میں آ کر جماعت سے پڑھتی تھیں، انہیں اس حقیقت کا احساس اور ادراک تھا کہ ہم افضل طریقے کو چھوڑ کر آ رہی ہیں اور اس زمانہ میں فی الجملہ ایک عذر یہ بھی تھا کہ حضور ﷺ کی امامت میں نماز پڑھنا کوئی معمولی بات نہیں تھی، لہذا حضور اقدس ﷺ کے ساتھ ایمانی تعلق اور محبت بھی اس کا سبب بن گئی تھی کہ گھر چھوڑ کر مسجد میں نماز ادا کرتی تھیں۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ایک واقعہ

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اگرچہ افضل ایک عمل ہوتا ہے، لیکن محبت کی وجہ سے دوسرا اختیار کیا جاتا ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ بڑا خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا۔ حضرت شیخ الہند وتر کے بعد دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے جبکہ فقہاء کرام نے صراحت کی ہے کہ وتر کے بعد کی دو رکعتیں بھی عام نوافل کی طرح ہیں، ان کو کھڑے ہو کر پڑھنا افضل ہے اور بیٹھ کر پڑھنا آپ ﷺ کی عادت مبارک تھی۔

کسی نے پوچھا کہ حضرت آپ بیٹھ کر جو پڑھتے ہیں، کیا آپ کا خیال ہے کہ بیٹھ کر پڑھنے میں زیادہ ثواب ہے؟ انہوں نے فرمایا: نہیں بھائی، مسئلہ تو وہی ہے کہ کھڑے ہو کر پڑھنے میں زیادہ ثواب ہے۔

پھر پوچھا۔ آپ بیٹھ کر کیوں پڑھتے ہیں؟ فرمایا: روایت میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، تو جس طرح آپ ﷺ پڑھتے تھے اس طرح پڑھنے میں میرا دل زیادہ لگے بھلے ثواب کم ملے۔ یہ دیوبند کی زبان ہے یعنی چاہے ثواب کم ملے۔ تو یہ بیٹھ کر پڑھنا محبت کی وجہ سے ہوا اگرچہ افضل کھڑے ہو کر پڑھنا ہے۔

اب یہ بات تو طے شدہ ہے کہ عورتوں کے لئے زیادہ ثواب گھر میں پڑھنے میں ہے لیکن حضور ﷺ کی اقامت اور تعلق و محبت کی وجہ سے آتی تھیں، اس لئے اجازت دی تھی۔

---

۲۱۹ عمدة القاری، ج: ۲، ص: ۶۴۷.

اب تغیر یہ ہوا کہ عورتوں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ عورتوں کے لئے بھی مسجد میں نماز پڑھنا افضل ہے اور وہ عذر بھی ختم ہوگیا کہ حضور ﷺ کی امامت یا محبت کی وجہ سے مسجد میں آتی ہیں۔

اس واسطے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر موجودہ زمانہ کی عورتوں کے حالات حضور اقدس ﷺ دیکھتے تو آپ بھی منع فرما دیتے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے زمانہ میں یہ بات کہہ رہی ہیں جو خیر القرون ہے، اب ہمارے زمانے میں تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہے، اس لئے کہتے ہیں کہ عورتوں کے لئے نماز کے لیے مسجد میں جانا مکروہ ہے، پسندیدہ نہیں ہے، روکنا چاہئے۔

لیکن اگر کوئی عورت مسجد کے آس پاس موجود ہے اور جماعت میں شامل ہونے کا موقع ہے اور وہ شامل ہو جاتی ہے تو اس کی نماز بہر حال ہو جائے گی اور اس کو گناہ نہیں کہیں گے۔

پھر حکم حرمین شریفین کا بھی بیان کیا جاتا ہے۔ عورتیں جب یہاں سے حج کرنے کے لئے جاتی ہیں تو وہ بیت اللہ شریف کا طواف کرنے کی غرض سے مسجد حرام جائیں، نماز کی نیت سے نہیں، جب وہاں نماز کا وقت آجائے تو نماز میں شامل ہو جائیں گی۔

عورتوں کا عید کی نماز میں شامل ہونا

سوال: عورتوں کے لئے عید کی نماز میں شامل ہونے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب: حضور اقدس ﷺ نے عید کی نماز میں عورتوں کو لانے کی تاکید فرمائی تھی لیکن بعد میں جس طرح اور نمازوں کے لئے مسجد میں آنے سے منع کیا گیا اسی طرح عید کے لئے بھی منع کر دیا گیا۔[۲۲۰]

عورتوں کا تبلیغی جماعت میں جانا اور مدرسۃ البنات کا حکم

سوال: جب عورتوں کے لئے نماز ادا کرنے کے لئے گھر سے نکلنا منع ہے تو مدرسۃ البنات میں پڑھنے یا پڑھانے کے لئے نکلنا یا جماعت میں دعوت و تبلیغ کے لئے نکلنے کی کیسے اجازت ہوگی؟

جواب: نماز کے لئے نکلنے کی ممانعت کی بنیاد یہ ہے کہ عورت کے لئے نماز با جماعت میں سرے سے فضیلت ہی نہیں ہے بلکہ اس کے حق میں ہمیشہ افضل یہ ہے کہ وہ گھر میں پڑھے، زیادہ سے زیادہ جواز تھا اور اس پر فتنہ کی وجہ سے قدغن لگا دی، لیکن جو امور اصل میں ہی عورت کے لئے مطلوب اور مأمور بہ ہیں اگر ان کی غرض سے نکلنا ہو اور حجاب کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھا جائے تو یہ جائز ہے۔ کیونکہ بضرورت خروج جائز ہے اور

۲۲۰ أنظر للتفصيل : عمدة القاری ، ج:۴، ص: ۶۵۰ .

ضروریات میں وہ امر بھی داخل ہے جس کی تحصیل مامور بہ اور مطلوب ہے، اُن میں سے ایک علم کا حصول ہے۔

حصول علم ایسی چیز ہے جو عورت کے لئے مأ مور بہ ہے، اگر عورت اس کے لئے نکلے بشرطیکہ حجاب کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے نکلے تو جائز بلکہ مأ مور بہ ہے۔

اسی طرح ایک حکم مأ مور بہ تو نہیں ہے لیکن مطلوب فی الدین ہے جیسے دعوت وتبلیغ۔ عورتوں پر وہ فریضہ عائد نہیں ہوتا جو مردوں پر عائد ہوتا ہے۔ عورت کے لئے مأ مور بہ نہیں ہے لیکن فی نفسہ یہ بات دین میں مطلوب ہے کہ مسلمانوں کو حق کی طرف بلایا جائے، **"وتواصو بالحق وتواصو بالصبر"** اگر عورت اس غرض کے لئے حجاب کے تمام تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نکلے، خاص طور پر یہ بات سامنے رکھ کر کہ عورتوں میں بے دینی بہت زیادہ پھیل رہی ہے اور عورتوں کی بے دینی نسلوں کو تباہ کرنے میں زیادہ مؤثر ہو رہی ہے، لہٰذا ان کو متوجہ کرنے کے لئے اگر خواتین حجاب کا خیال رکھتے ہوئے گھر سے نکلیں تو جائز ہے۔

دین کے مزاج کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب ہم جنوبی افریقہ گئے تو دیکھا وہاں یہ حالت ہے کہ عورتیں بازاروں میں بے پردہ پھر رہی ہیں، یہاں تک کہ علماء کی خواتین کی بھی یہی حالت ہے۔ ایسے میں جماعت کے حضرات نے کوشش کی کہ عورتوں میں دعوت کا کچھ کام کیا جائے، چنانچہ کچھ اجتماعات منعقد کئے، ایک صاحب نے وہاں یہ فتویٰ دیا کہ عورتوں کے لئے جماعت میں جانا جائز نہیں ہے، اس واسطے کہ ان کا گھر سے خروج جائز نہیں ہے۔

اب عورتیں بازاروں میں بے پردہ پھر رہی ہے اور اس حالت میں یہ فتویٰ دیا جا رہا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ بازاروں میں جاؤ، ہوٹلوں اور کلبوں میں جاؤ، لیکن جماعت میں نکل کر دعوت کا کام نہ کرو۔ تو یہ وہ بات ہے جس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اللّٰھم اختم لنا بالخیر

كمل بعون الله تعالىٰ الجزء الثالث من "إنعام الباري" ويليه إن شاء الله تعالىٰ الجزء الرابع : أوّله "كتاب الجمعة" ، رقم الحديث : ۸۷٦ .

نسأل الله الإعانة و التوفيق لإ تمامه . و الصلوة و السلام على خير خلقه سيد نا و مولانا محمّد خاتم النبيين و إمام المرسلين و قائد الغر المحجلين و على اله و أصحابه أجمعين و على كل من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين .

آمین ثم آمین، یا رب العالمین۔

☆☆☆☆☆